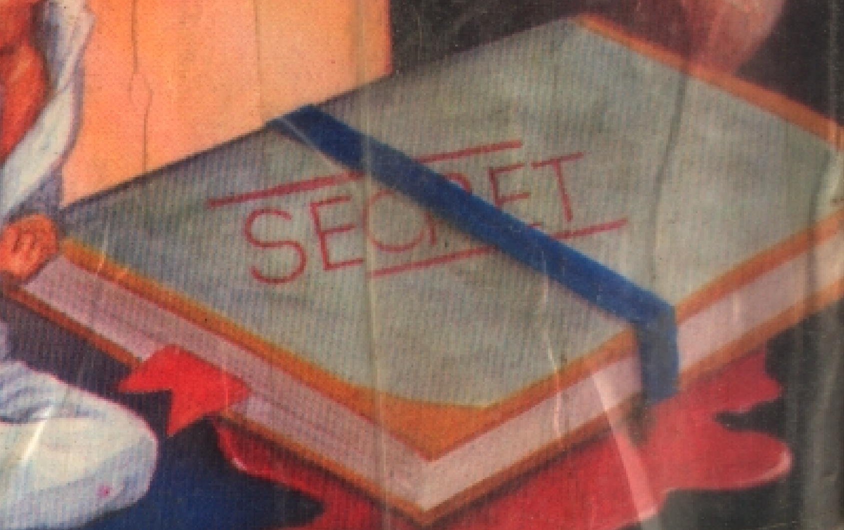
تلاش

حصّہ
اوّل





محمود احمد مودی



"تلاش" میرا ایک ایسا ناول ہے جسے میں نے قلم سے نہیں، دل سے لکھا ہے۔ اس کہانی کی تخلیق میں میرے بیسیوں رت جگے شامل ہیں۔ مقام شکر ہے کہ میری بیشتر تحریریں آج تک پسند ہی کی گئی ہیں۔ لیکن مجھے خود اپنی بہت کم کہانیوں پر فخر ہے۔

"تلاش" انہی کم کہانیوں میں سے ایک ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ آپ کو بھی پسند آئے گی۔ بہت سے انسان ایسے ہوتے ہیں، جنہیں زندگی میں عزت، ذلت، دولت، محبت، وفا اور جفا، دشمن و دلدار، پستی و بلندی سبھی کچھ دیکھنے کو ملتا ہے، مگر ایک تشنگی ہمیشہ ساتھ چلتی ہے اور روزِ آخر تک ساتھ رہتی ہے۔ یہ تشنگی شاید روزِ اول سے انسان کا مقدر ہے اور ابد تک ساتھ رہے گی۔ مگر بہت کم انسانوں کو اس کا احساس ہو پاتا ہے۔ کچھ پر بے حسی غالب آجاتی ہے اور کچھ اسے دوسری مصروفیات اور تفکرات کے انبار تلے دبا لیتے ہیں۔

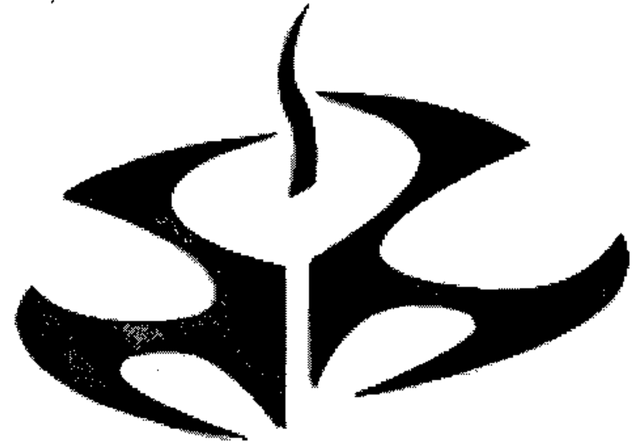
"تلاش" درحقیقت اسی تشنگی کی کہانی ہے مگر اس میں زندگی کے سارے ہی رنگ موجود ہیں۔

پڑھیے اور دعاؤں میں یاد رکھیے!

آپ کا

محمود احمد مودی

ISBN 969-38-0393-0



تلاش

1

محمود احمد مودی

مکتبہ القریش ۔ سرکلر روڈ، اُردو بازار لاہور

تیرے نام!

کسی کو کچھ بھی یہاں حسب آرزو نہ ملا
کسی کو ہم نہ ملے ' اور ہم کو تو نہ ملا

* * *

ناشر محمد علی قریشی نے نیّر اسد پریس سے چھپوا کر مکتبہ القریش لاہور سے شائع کی۔

فرزانہ [illegible] سفر

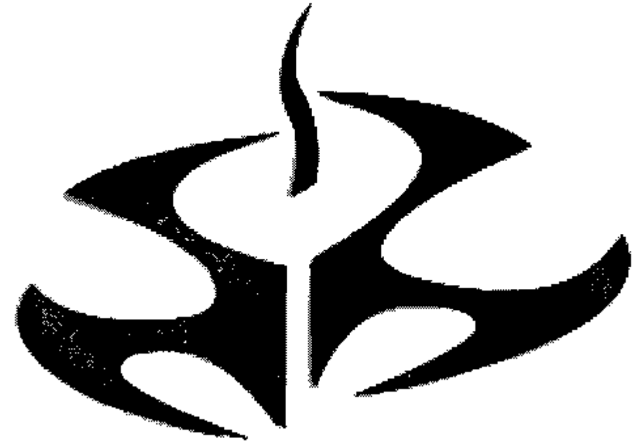
[illegible]

آپ نے کہانیاں' داستانیں اور آپ بیتیاں تو ہزاروں ہی پڑھی ہوں گی۔ کچھ جھوٹی' کچھ سچی اور کچھ نیم سچی۔ ان میں سے کچھ آپ کے ذہن میں نقش ہوں گی۔ کچھ محو ہو چکی ہوں گی اور کچھ کبھی کبھی یوں ذہن میں ابھر آتی ہوں گی جیسے کوئی بھولا بسرا خواب یاد آ جائے یا تصور کی پریاں اڑتے اڑتے کسی دور دیس میں جا پہنچیں۔

ایک زمانہ بیتا جب میں بھی کہانیاں پڑھتا تھا اور میری بھی یہی کیفیت ہوتی تھی۔ پھر یوں ہوا کہ میں خود ایک طویل کہانی کا کردار بن گیا۔ مجھ پر جو کچھ بیتی اس نے قصے کہانیوں کو میرے ذہن سے محو کر دیا۔

آج میں کتاب زندگی کا ورق ورق جوڑنے بیٹھا ہوں تو آنکھیں دھندلا گئی ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا واقعات کی ڈور کو کہاں سے تھاموں اور یہ مجھے کہاں لے جائے گی۔ سینے پر بوجھ بہت بڑھ گیا ہے۔ سوچتا ہوں زندگی نے تجربات و حوادث کی شکل میں جو کچھ مجھے دیا ہے زمانے کو لوٹا دوں۔ گو کہ یہ امانت نہیں' محض میرے شب و روز کا حساب ہے جس میں محبت کی جنوں خیزیاں بھی ہیں اور مظلومیت کی سسکیاں بھی۔ جبروقہر کا دبدبہ بھی ہے اور انتقام کی بربریت بھی۔ جذبوں کی نرم آہٹیں بھی ہیں اور بہتے لہو کی حرارتیں بھی۔ وفاداری کی سحر کاریاں بھی ہیں اور غداریوں کے شاخسانے بھی۔ دوستی کا درد بھی ہے اور دشمنی کی ہولناکی بھی۔

میں یہ سب کچھ اس لئے بھی کسی کو سنانا چاہتا ہوں کہ شاید جسے میں کشمکش حیات کی آخیر سمجھ کر قدرے مطمئن ہو بیٹھا ہوں' دراصل یہ آخیر نہ ہو محض ستانے کی مہلت ہو۔ موت کا ہاتھ آج بھی میری کھوج میں ہے۔ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ ہاں' اندھیرے کی موت سے ڈرتا ہوں' زندگی سے تو میں نے اپنا خراج وصول کر لیا ہے۔ اب ایک ہی خواہش ہے کہ موت آئے تو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر آئے۔ سانپ کی طرح چھپ کر کسی اندھیرے گوشے سے حملہ آور نہ ہو۔



Azam & Ali

aazzamm@yahoo.com
aleeraza@hotmail.com

زندگی کی کہانی کا آغاز عام طور پر بچپن سے کیا جاتا ہے مگر مجھے اپنا بچپن کبھی اتنا دلکش محسوس نہیں ہوا کہ اسے یاد رکھتا۔ البتہ کچھ یادیں ہیں جو ان گرد آلود کھلونوں کی طرح ذہن کے صنم خانوں میں بکھری پڑی ہیں۔ جنہیں آپ گھر کی آرائش کرتے وقت پھینکنے کے لئے اٹھاتے ہیں، مگر پھر بچپن کی یادگاریں سمجھ کر کھوئے کھوئے سے انداز میں ذرا مسکرا کر وہیں چھوڑ دیتے ہیں۔

مجھے یاد ہے جب میں نے ہوش سنبھالا تو میں ایک چھوٹے سے صاف ستھرے مکان میں ایک ادھیڑ عمر عورت کے ساتھ رہتا تھا جو روزانہ مجھے ایک مخصوص وقت پر جگاتی، نہلاتی، کپڑے بدلتی، مخصوص چیزیں کھانے میں دیتی۔ شام کو مجھے پڑھاتی اور پھر مخصوص وقت پر ہی سلا دیتی۔ گو کہ میں نے باہر کی دنیا نہیں دیکھی تھی۔ اس لئے مجھے نہیں معلوم تھا کہ دوسرے لوگ کس طرح زندگی گزارتے ہیں۔ پھر بھی اپنی تمام تر کمسنی کے باوجود نہ جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میں ایک مشین ہوں جس کے مختلف بٹن، مختلف اوقات میں وہ عورت دبا دیتی ہے۔ تاکہ میں اپنا کام انجام دے سکوں۔

اسی عورت نے مجھے باتیں کرنا سکھائی تھیں اور اسی نے مجھے بتایا تھا کہ وہ میری گورنس تھی۔ تقریباً ہر ہفتے ایک دراز قامت اور انتہائی خوبصورت عورت شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد ہمارے ہاں آتی اور آتے ہی یوں بے قراری سے مجھے سینے کے ساتھ چمٹا لیتی جیسے میں اس کا کوئی گمشدہ کھلونا تھا جو مدت کے بعد اسے ملا تھا۔

وہ مجھے بیٹا کہہ کر پکارتی، بے تحاشا چومتی اور کبھی کبھی تو مجھے چومتے وقت اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے۔ میں جب بہت چھوٹا تھا تو مجھے معلوم نہیں تھا کہ بیٹا کسے کہتے ہیں۔ لیکن جب گورنس کی تعلیم و تربیت اور عمر میں اضافے کے ساتھ ساتھ مجھے دنیا کی بہت سی باتوں کا علم ہونے لگا تو میرے دل میں اس عورت کی محبت جاگ اٹھی۔ اب وہ مجھے سینے سے لگاتی تو جیسے مجھے بے پناہ سکون مل جاتا۔

میں بے قراری سے اس کا انتظار کیا کرتا اور ہفتے کے دن تو صبح ہی سے میری آنکھیں گیٹ پر لگی رہتیں۔ حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ دن میں کبھی نہیں آتی۔ گورنس کی تربیت کے علاوہ میری جبلت نے بھی مجھے بتا دیا تھا کہ ماں کیا ہوتی ہے۔ ورنہ پہلے تو میں اسے صرف دور دیس بسنے والی کوئی پری ہی سمجھتا تھا جس کی کہانیاں ...... کبھی کبھار مجھے گورنس سنایا کرتی تھی۔

جب مجھے یہ معلوم ہو گیا کہ ماں کسے کہتے ہیں تو میرا دل بھی اس سے ملنے کو مچلنے لگا۔ مجھے یاد نہیں کہ اس وقت میری عمر کیا تھی، جب میں نے پہلی مرتبہ اس کے گلے میں باہیں ڈال کر کہا تھا۔ "ممی! آپ مجھے اپنے ساتھ کیوں نہیں لے جاتیں۔ کیا میں آپ کو اچھا نہیں لگتا جو آپ مجھے اپنے ساتھ نہیں رکھتیں؟"

اس وقت مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری بات سن کر میری ماں کے حلق سے جو آواز نکلی تھی اسے سسکی کہتے ہیں۔ اس نے معمول سے کہیں زیادہ جوش کے ساتھ مجھے سینے سے چمٹا لیا۔ آنسو اس کی نیلی نیلی بلوریں آنکھوں سے یوں امڈ پڑے تھے جیسے مدتوں سے زیر زمین مچلتا ہوا کوئی چشمہ کسی گوشے کو کمزور پا کر پھوٹ پڑا ہو۔ میں نے ممی کو اس بری طرح روتے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں ڈر گیا کہ شاید میں نے کوئی ایسی نامناسب بات کہہ دی ہے جس سے ممی کو صدمہ ہوا ہے۔

"آئی ایم سوری ممی!" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ممی جو بڑی سی سفید ریشمی چادر پورے جسم پر لپیٹ کر آیا کرتی تھیں۔ اس کے پلو سے انہوں نے اپنے آنسو خشک کئے اور مجھے سینے سے چمٹا کر بولیں۔ "ابھی وقت نہیں آیا بیٹے۔ تمہیں کیا پتا کہ تمہاری ممی تم سے دور رہ کر کس طرح زندگی گزار رہی ہے۔ لیکن ابھی وقت نہیں آیا ...... وقت نہیں آیا ......"

آخر میں ان کا لہجہ خود کلامی کا سا ہو گیا تھا اور آواز گویا ان کے حلق میں گھٹ کر رہ گئی تھی۔ ان کی نظریں میرے چہرے پر نہیں تھیں اور ان کی لمبی لمبی پلکیں یوں ساکت ہو گئی تھیں گویا وہ کوئی دہشت ناک خواب دیکھ رہی ہوں۔

پھر انہوں نے چونک کر گھڑی دیکھی، چادر اپنے جسم پر اس طرح احتیاط سے لپیٹی کہ ان کے لمبے، گھنیرے سیاہ بال اور آدھا چہرہ بھی اس میں چھپ گیا اور وہ جانے کے لئے تیار ہو گئیں۔

ان کے جاتے وقت گورنس شیلا مجھے کمرے ہی میں روک لیتی تھی، لیکن اس روز وہ شاید کچن میں تھی۔ چنانچہ جب ممی مجھے پیار کر کے باہر چلی گئیں تو میں بھی چپکے چپکے ان کے پیچھے چل دیا۔ برآمدے سے اتر کر میں گیٹ کے قریب پہنچا تو میں نے دیکھا، وہ سرمئی رنگ کی ایک بڑی سی کار میں بیٹھ رہی تھیں جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر کوئی ٹوپی والا آدمی بیٹھا تھا۔

"چلو ڈرائیور!" میں نے ممی کی آواز سنی۔ میرا جی چاہا کہ دوڑ کر میں بھی ممی کے ساتھ بیٹھ جاؤں، اگر وہ مجھے نہ بٹھائیں تو میں کھڑکی میں لٹک جاؤں، پھر تو آخر ترس کھا کر وہ مجھے اپنے ساتھ بٹھا ہی لیں گی۔ لیکن عین اس وقت بابا چندن کی نظر مجھ پر پڑ گئی جو ممی کے جانے کے بعد گیٹ بند کر رہا تھا۔

وہ یوں سہم کر میری طرف لپکا جیسے میں کسی گڑھے کے دہانے پر آ پہنچا تھا۔ اور اب میں گرنے ہی والا تھا۔ اس نے مجھے گود میں اٹھایا اور اندر کو دوڑا۔ اندر سے گورنس شیلا میری تلاش ہی میں لپکی ادھر آ رہی تھی۔ بابا چندن نے مجھے اس کے حوالے کیا اور اسے ڈانٹنے لگا کہ وہ میرا خیال نہیں رکھتی۔

یہ بابا چندن کوئی بوڑھا آدمی نہیں تھا۔ اس کے سر میں چند ہی سفید بال تھے۔ لیکن اسے نہ جانے کیوں بابا کہا جاتا تھا۔ حالانکہ وہ اتنا اونچا' لمبا تڑنگا اور طاقتور آدمی تھا کہ کئی بار میں نے اسے باغ میں کام کرتے وقت درختوں کی کئی موٹی موٹی غیر ضروری شاخوں کو ایک ہاتھ سے یوں توڑ مروڑ کر درخت سے جدا کرتے دیکھا تھا جیسے وہ محض جھاڑو کے تنکے ہوں۔

مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ بابا چندن کون تھا اور اس گھر میں کس لئے رہ رہا تھا۔ اور اس کا حقیقی نام کیا تھا؟ کبھی وہ باغ کو سجاتا سنوارتا نظر آتا تھا۔ کبھی مکان میں مرمت وغیرہ کی ضرورت پیش آتی تو وہ بھی اس کے ہاتھوں ہوتی۔ بازار سے سودا سلف بھی وہی لاتا اور ایک بار تو میں نے اسے باغ کے وسط میں گڑھا کھود کر ایک پختہ تالاب بھی بناتے دیکھا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسے دنیا کا ہر کام آتا تھا۔ فارغ وقت میں وہ گیٹ کے قریب دیوار کی آڑ میں ایک گدے دار کرسی پر بیٹھا رہتا تھا۔ عام طور پر وہ صرف دھوتی اور واسکٹ پہنے رہتا تھا۔ واسکٹ کے بٹن اکثر کھلے ہی رہتے تھے اور بالوں سے بھرا اس کا چوڑا چکلا سیاہ سینہ دیکھ کر مجھے اس ریچھ کا خیال آتا تھا جس کی تصویر میں نے اپنی ایک انگریزی کی کتاب میں دیکھی تھی۔

بابا چندن کا سب سے بڑا فریضہ شاید مجھے گھر سے باہر جانے سے روکنا تھا۔ میں باہر جانے کے لئے بہت ہی ضد کرتا تو کبھی کبھی وہ مجھے اپنے ساتھ شام کے اندھیرے میں فٹ پاتھ پر چہل قدمی کرانے لے جاتا' یا پھر اس پارک میں گھمانے لے جاتا جو گھر سے کچھ ہی فاصلے پر واقع تھا۔

اس طرح میں اپنے گردوپیش سے کسی حد تک شناسا ہونے میں کامیاب ہو سکا۔ میں نے دیکھا کہ ہمارے ارد گرد بھی مکانوں کی قطاریں تھیں جو ویسے تو ہمارے ہی مکان کی طرح مختصر تھے لیکن تقریباً" سب ہی مکانوں میں طویل و عریض لان یا باغ تھے۔ ان گھروں میں رہنے والوں کو اپنے گردوپیش سے قطعاً" دلچسپی نہیں تھی۔ میں نے کبھی وہاں زیادہ چہل پہل نہیں دیکھی۔

اس انداز پرورش کا نتیجہ تھا کہ جب پانچ سال کی عمر میں مجھے سکول میں داخل کرانے کے لئے لے جایا گیا تو مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ ہم کونسے شہر میں رہتے ہیں۔ البتہ پرنسپل کی ہدایت پر ایک ٹیچر نے میرا زبانی یا تحریری جو امتحان لیا اس میں میں نے فرفر جواب دیئے یا چند منٹوں کے اندر اندر لکھ دیئے۔ کیونکہ یہ سب کچھ گورنس شیلا مجھے بڑی اچھی طرح پڑھا چکی تھی۔ پرنسپل نے بہ خوشی مجھے داخل کر لیا اور میری زندگی گویا ایک انقلاب سے روشناس ہو گئی۔

مجھے دوسرے بچوں کے ساتھ بولنے' کھیلنے' کودنے اور پڑھنے کا موقع ملا تو میں بڑا خوش رہنے لگا۔ لیکن گورنس شیلا کی مجھے سختی سے ہدایت تھی کہ میں کلاس میں کسی لڑکی یا لڑکے سے زیادہ دوستی نہ بڑھاؤں۔ اور گھر پر تو کسی کو ہرگز مدعو نہ کروں اور نہ ہی کسی کی دعوت پر اس کے گھر جاؤں۔ بابا چندن ایک چھوٹی سی کار میں مجھے سکول چھوڑ کر جاتا اور چھٹی کے وقت لینے آتا۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ وہ کار چلانا بھی جانتا تھا اور یہ کار اب گھر پر ہی رہتی تھی۔ می نے سکول میں میرے داخلے سے چند دن پہلے یہ بھجوائی تھی۔

اب می جب بھی اپنے معمول کے مطابق مجھ سے ملنے آتیں تو گورنس شیلا سے یہ رپورٹ ضرور لیتیں کہ سکول میں میری تعلیمی کیفیت کیسی جا رہی ہے۔ اور یہ سن کر بڑی خوش ہوتیں کہ میں ہر ٹیسٹ میں اول آ رہا ہوں۔ دراصل گورنس شیلا مجھے اتنی اچھی طرح پڑھاتی تھی کہ سکول میں تو مجھے پڑھائی پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔

انہی معمولات کے ساتھ زندگی گزارتے ہوئے میں عمر کے آٹھویں برس میں پہنچا تو مجھ پر کچھ اور مشقتوں کا بوجھ آن پڑا۔ بابا چندن نے باغ کے ایک ایسے گوشے میں جو املی کے درختوں سے گھرا ہوا تھا۔ ایک اکھاڑہ کھود رکھا تھا جس میں وہ صبح شام عجیب و غریب ورزشیں اور اچھل کود کیا کرتا تھا۔

مجھے حکم ملا کہ دونوں وقت میں بھی لنگوٹ کس کر اکھاڑے میں اس کے سامنے حاضری دیا کروں۔ شروع شروع میں مجھے بڑی کوفت ہوئی اور ایک مرتبہ میں نے می سے شکایت بھی کی کہ مجھے صبح شام مٹی میں لوٹ لگانا اور ہاتھا پائی کرنا بالکل پسند نہیں۔ مگر می' نے مجھے چومتے ہوئے بڑے پیار سے سمجھایا۔ "بیٹا! وہ تمہارے بھلے کے لئے سب کچھ کر رہا ہے۔ وہ تمہیں پہلوانی' یوگا اور گتکا سکھائے گا۔ تم خوب لمبے تڑنگے اور طاقتور بن جاؤ گے۔ اس کے علاوہ بھی تمہیں زندگی میں بہت کچھ سیکھنا ہے۔ تمہیں نہیں معلوم بیٹا کہ اس دنیا میں کمزوری اور عزت ایک ساتھ نہیں چل سکتیں۔ کمزور آدمی کا عزت کے ساتھ زندگی گزارنا بہت مشکل ہے۔ کیونکہ یہ اصول تو فطرت ہی نے بنا دیا ہے کہ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو نگل جاتی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم طاقتور بنو۔ بڑی مچھلی بنو تاکہ تمہیں کوئی نہ نگلے۔"

می کا لیکچر تو میری سمجھ میں نہیں آیا تھا لیکن یہ ضرور ہے کہ تھوڑے عرصے بعد مجھے خود اس تربیت میں بڑا لطف آنے لگا تھا۔ اکھاڑے کی مٹی سوندھی سوندھی خوشبو کے ساتھ جب میرے پسینے کی بو سے ہم آہنگ ہوتی تو مجھ پر ایک سرور طاری ہو جاتا۔ بابا چندن سے روز نت نئے کرتب سیکھنے میں مجھے اتنا ہی لطف آتا جتنا سکول میں ہر روز مس داوشا کا لیکچر سننے میں آتا تھا۔ بابا چندن صبح سویرے مجھے یوگا کی مشقیں کراتا' شام کو ورزشیں اور داؤ پیچ سکھاتا۔ میری خوراک بھی اسی کی ہدایت کے مطابق تیار کی جاتی تھی۔

میں دس سال کی عمر میں پہنچا تو مجھے اپنے جسم میں خاصی تبدیلیوں کا احساس ہوا۔ پونا کا کیتھڈرل سکول جہاں میں زیر تعلیم تھا۔ اس دور کا سب سے اونچا سکول تھا اور اس میں ساہو کاروں اور بڑے بڑے سرکاری افسروں کے بچے پڑھتے تھے اور اکا دکا بچوں کو چھوڑ کر سب ہی صحت مند اور تندرست و توانا ہوتے تھے۔ لیکن اب مجھے خود بھی احساس ہوتا تھا کہ میں اپنے ہم جماعتوں میں سب سے نمایاں اور مضبوط نظر آتا تھا۔ تاہم ابھی مجھے صحیح طور پر اندازہ نہیں تھا کہ میں ان سے طاقتور بھی ہوں۔ لیکن ایک واقعہ نے مجھے یہ احساس دلایا۔

ویسے تو کیتھڈرل سکول اپنی ایک الگ ہی کائنات تھی۔ جہاں بچوں کو صرف جدید خطوط پر تعلیم ہی نہیں دی جاتی تھی۔ بلکہ انہیں مجلس کے آداب، گفتگو کا سلیقہ اور مہذب شہرت کے تمام طور طریقے سکھائے جاتے تھے۔ پانچویں کلاس تک پہنچتے پہنچتے یہاں کے بچے بڑوں سے بھی زیادہ مہذب اور سلیقہ مند ہو چکے ہوتے تھے۔ لیکن یہ بھی شاید فطرت ہی کا اصول ہے کہ جہاں بہت سی اچھائیاں جمع ہوں وہاں ایک آدھ خباثت بھی جنم لے لیتی ہے۔ ہماری کلاس کی خباثت کیلاش تھا۔

وہ نائب تحصیلدار کا بیٹا تھا اور ایک آنکھ سے بھینگا تھا۔ ہمیں سبق دیا گیا تھا کہ کسی کے جسمانی نقص کا مذاق اڑانا گناہ ہے۔ اس لئے اسے کبھی کسی نے بھینگا کہہ کر نہیں چھیڑا تھا۔ لیکن خود اس میں شاید ایک رگ زیادہ ہی تھی۔ وہ ہر ایک کے ساتھ کوئی نہ کوئی شرارت کرتا رہتا تھا۔ تاہم کلاس روم میں وہ سنجیدہ ہی رہتا تھا۔ البتہ پلے گراؤنڈ میں وہ اپنی کمینگیوں کا مظاہرہ کرتا تھا۔ کسی کا لنچ بکس چھین لیتا، کسی کی ٹائی کی گرہ کس دیتا، چپکے سے بلیڈ کے ساتھ کسی کا کوٹ کاٹ ڈالتا اور اس قسم کی بہت سی حرکتیں اس کا معمول تھیں۔ اس کی شکایتیں بھی اکثر مس اوشا کو پہنچتی رہتی تھیں۔ جو ہماری کلاس ٹیچر بھی تھیں۔ کیلاش کو اکثر فائن کیا جاتا، اس کے والدین کو شکایتیں جاتیں اور جواب میں اس کے باپ کا معذرتی خط آ جاتا۔

اس روز کیلاش کا دست خباثت میری طرف بھی بڑھا اور اس نے پلے گراؤنڈ میں میرے قریب سے گزرتے وقت فاؤنٹین پین سے مجھ پر سیاہی چھڑک دی۔ میری سفید قمیض پر بڑے بڑے نیلے دھبے پڑ گئے۔ ان کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا جہاں مجھے نمی کا احساس ہوا تھا۔ میرا ہاتھ بھی سیاہی میں لتھڑ گیا۔ یعنی سیاہی میرے چہرے پر بھی پھیل چکی تھی۔ یہ ایک عجیب سی بات تھی جس کا مجھے پہلے بھی کئی مرتبہ تجربہ ہو چکا تھا کہ میں اپنے چہرے کے بارے میں بڑا حساس تھا۔ اور اس پر کسی قسم کی آلودگی برداشت نہیں کرتا تھا۔ اور پھر اس وقت تو کلاس کی لڑکیاں اور لڑکے میری ہیئت کذائی دیکھ کر تمام آداب کو بالائے طاق رکھ کر ہنس رہے تھے۔

کیلاش میری طرف پشت کئے بڑے اطمینان سے جا رہا تھا جیسے اس نے کچھ کیا ہی نہیں۔ میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اس کے قریب پہنچا۔ اسے کالر سے پکڑ کر میں نے اپنی طرف کھینچا اور اس کے منہ پر ایک گھونسا رسید کیا۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر چیختا ہوا الٹ کر گھاس پر جا گرا۔ میں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ جھک کر اسے گریبان اور بیلٹ سے پکڑ کر اٹھایا اور سر سے اونچا کر کے گھاس پر پٹخ دیا۔

وہ وہیں ساکت ہو گیا جہاں میں نے اسے پٹخا تھا۔ مس کرسٹینا جو ایک انگریز خاتون تھیں، ہماری انگریزی کی کلاس لیتی تھیں۔ گراؤنڈ کے قریب سے گزرتے وقت یہ منظر دیکھ رہی تھیں۔ وہ بوکھلائی ہوئی دوڑی دوڑی آئیں۔ پہلے تو انہوں نے حیرت اور خوف سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھا جیسے میں لڑکا نہیں کوئی عجوبہ تھا۔

"اتنے موٹے لڑکے کو تم نے یوں اٹھا کر پٹخ دیا!" انہوں نے انگریزی میں کہا۔ میں نہیں سمجھ سکا۔ کہ یہ ان کا غصے کا اظہار تھا یا حیرت کا۔

"نہیں میڈم!" میں نے جواب دیا اور اپنے چہرے اور قمیض کی طرف اشارہ کیا۔ "ذرا دیکھیں اس نے کیا حرکت کی تھی۔"

"تمہیں مس اوشا سے شکایت کرنی چاہئے تھی۔" وہ اب بھی مجھے سر تا پا گھور رہی تھیں۔

"اس سے پہلے بھی کتنے کلاس فیلوز اور جونیئرز نے اس کی شکایتیں کی ہیں۔ مگر یہ کبھی باز نہیں آیا تھا۔ اب شاید آ جائے۔" مجھے خود بھی حیرت تھی کہ میرے منہ سے ایسا ترکی بہ ترکی جواب کس طرح نکلا۔

مس کرسٹینا جھک کر اس کی نبض دیکھنے لگی اور میں وہاں سے کلاس روم میں چلا آیا۔ کچھ دیر بعد میں نے ایمبولینس کی آواز سنی اور اس کے چند لمحے بعد ہی کلاس شروع ہونے کی بیل بج گئی۔ سب بچے کلاس میں آ گئے۔ سب کے سب چپ سے تھے اور عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ مس اوشا کلاس روم میں آئیں اور انہوں نے مجھے حکم دیا کہ فی الحال میں اپنا بیگ اٹھا کر لے جاؤں اور پرنسپل کے دفتر میں بیٹھوں۔ جب پرنسپل مجھے اجازت دیں گے تو میں دوبارہ کلاس روم میں آ سکتا ہوں۔

میں پرنسپل کے دفتر میں پہنچا تو انہوں نے عینک کے موٹے موٹے شیشوں کے عقب سے مجھے دیکھا اور ایک کونے میں کھڑے ہونے کا حکم دے کر اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ میں کافی دیر بت بنا کونے میں کھڑا رہا۔ بالآخر ٹیلیفون کی گھنٹی نے کمرے کا سکوت توڑا۔ پرنسپل چند لمحے دوسری طرف سے بات سنتے رہے پھر بولے۔ "اچھا ...... بہرحال یہ تو یقین ہے کہ تین چار دن بعد وہ ٹھیک ہو جائیگا؟ فکر کی تو کوئی بات نہیں ہے نا؟" مزید چند لمحے دوسری طرف سے کچھ سننے کے بعد انہوں نے ریسیور رکھ دیا اور ایک گہرا سانس لے

کر بولے۔ "ٹھیک ہے۔ تم کلاس روم میں جاؤ۔"

کیلاش اس واقعے کے تین دن بعد سکول آیا اور پہلے ہی دن اس نے میرے سامنے ایک لڑکے کے ساتھ کوئی شرارت کرنے کی کوشش کی تو وہ جلدی سے بولا۔ "کیا میں منصور سے درخواست کروں کہ وہ ایک بار پھر تمہیں اسی طرح اٹھا کر پٹخے؟" کیلاش نے کھسیانی نظروں سے میری طرف دیکھا اور وہاں سے کھسک گیا۔ اس کے بعد میں نے کبھی اسے شرارت کرتے نہیں دیکھا۔ کم از کم اپنے سامنے۔

گھر پر بابا چندن کی زیر تربیت میری پہلوانی اور یوگا کی مشقیں جاری تھیں۔ میں گیارہویں سال میں پہنچا تو بابا چندن نے مجھے گتکا بھی سکھانا شروع کر دیا۔ ہمارے سکول میں بھی اسپورٹس کے بڑے عمدہ مقابلے منعقد ہوا کرتے تھے۔ لیکن جو کچھ مجھے بابا چندن سکھا رہا تھا اس کی مناسبت سے وہ مجھے آنکھ مچولی سے زیادہ مشکل نہیں لگتے تھے۔ اور چھٹی جماعت تک گھڑ سواری، سومنگ اور جمناسٹک کے تمام انعامات میں جیت چکا تھا۔ بلکہ سومنگ گالا میں تو میں نے سولہ قسم کی تیراکی کا مظاہرہ کیا تھا۔ افسوس کہ تمام بچوں کے والدین یہ مقابلے دیکھنے آتے تھے لیکن میری ممی کبھی نہیں آئیں، تاہم وہ جب بھی گھر پر مجھ سے ملنے آتیں تو میرے کمرے میں ٹرافیوں اور کپوں کی تعداد میں اضافہ دیکھ کر خوشی سے پھولی نہ سماتی تھیں۔ اور میں ان کی یہ خوشی دیکھ کر ہی مطمئن ہو جاتا تھا۔

اب مجھ پر پابندیاں کسی حد تک نرم ہو چکی تھیں۔ بابا چندن کبھی کبھار مجھے گھمانے پھرانے لے جاتا تھا۔ ایک بار وہ مجھے بچوں کی ایک فلم بھی دکھا کر لایا تھا۔ تاہم ممی کا یہ حکم اب بھی برقرار تھا کہ میں اکیلا کبھی کہیں نہ جاؤں اور نہ کسی اجنبی سے کبھی گھلنے ملنے کی کوشش کروں۔ اور نہ ہی کسی کو اپنے متعلق کچھ بتاؤں۔ لیکن مجھے معلوم ہی کیا تھا جو میں بتاتا۔

دفعتہ" گیٹ کی طرف سے ہارن سنائی دیا۔ بابا چندن مجھے سکول سے گھر لا کر چھوڑنے کے بعد دوپہر ہی سے کسی کام سے گیا ہوا تھا۔ وہ لوٹ آیا تھا اور آج کچھ زیادہ ہی جلدی میں معلوم ہوتا تھا کیونکہ اس نے گاڑی گیٹ سے تقریبا" ٹکرا دی تھی۔ میں کھڑکی سے دیکھ رہا تھا کہ گاڑی کی نمبرپلیٹ گیٹ کے نچلے حصے میں لگی ہوئی سلاخوں سے آملی تھی اور ہیڈ لائٹس کے درمیان سیاہ پلیٹ پر سفید ہندسے یوں معلوم ہو رہے تھے گویا کوئی سیاہ رو انسان پلکیں جھپکائے بغیر سلاخوں کے درمیان سے جھانک رہا ہو۔

دوسرے کمرے سے شیلا کی آواز سنائی دی۔ "منصورا! میں باتھ روم میں ہوں۔ ذرا جا کر گیٹ کھول دو۔"

اس دوران دوبارہ ہارن بجا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے بابا چندن بہت بے تاب اور مزید تاخیر ہونے پر گیٹ توڑ کر اندر آ جائے گا۔ یہ انداز بابا چندن کی فطرت کے خلاف تھا۔ وہ

اکثر کہا کرتا تھا۔ "جلد بازوں کو موت بھی جلد آ جاتی ہے۔" میں نے اسے کبھی پریشانی، اضطراب یا عجلت میں نہیں دیکھا تھا۔

میں پنسل میز پر رکھ کر اٹھا اور باہر آیا جیسے ہی میں نے گیٹ کھولا اور ایک طرف کو ہٹا، چھوٹی سی سفید برلینا اس تھکے ہارے خرگوش کی طرح جس کے پیچھے شکاری کتے لگے ہوں، لہراتی ہوئی کمپاؤنڈ میں داخل ہوئی۔ اور ایک جھٹکے کے ساتھ اس عالم میں رکی کہ اس کے دو پہیے پختہ روش سے لان پر اترے ہوئے تھے۔ میں نے جب گیٹ بند کر کے مڑ کے دیکھا تو بابا چندن گاڑی سے اتر چکا تھا۔ مگر اس نے دروازہ بند نہیں کیا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ پسلیوں پر رکھے عجیب سے انداز میں برآمدے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ قدم رکھتا کہیں تھا، پڑتا کہیں تھا۔ میں اس کے قریب پہنچا تو اس نے ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ "مجھے سہارا دو بیٹا۔"

برآمدے کے بلب کی زرد سی روشنی میں میں نے دیکھا کہ اس کا ہاتھ خون میں لتھڑا ہوا تھا۔ میں نے ٹھٹھک کر اس کی طرف دیکھا۔ پسلیوں سے لے کر نیچے تک اس کا کرتہ، پاجامہ اور واسکٹ خون میں تر تھی اور ایک ہاتھ اس نے غالبا" اب بھی پسلیوں پر اسی زخم پر رکھا ہوا تھا جس سے یہ خون بہہ رہا تھا۔

"ڈرو نہیں بیٹا۔" وہ مضمحل سے انداز میں مسکرایا۔

"یہ انسانی خون ہے اور دنیا میں بہت ارزاں ہے۔" وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر برآمدے کی طرف گھسٹنے لگا۔

"ہوا کیا ہے بابا؟" میں نے اسے سہارا دے کر برآمدے کی سیڑھیوں پر چڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"تقریبا" ایک فٹ کی ایک چھری میرے پہلو میں اتر گئی تھی۔" اس نے ایک اکھڑی اکھڑی سانس لے کر کہا۔

"کس نے اتاری تھی؟ کیوں اتاری تھی؟" میں نے اسے اس کے کمرے کی طرف لے جاتے ہوئے پوچھا۔

"میرے ماضی نے یہ چھری میرے پہلو میں اتاری تھی بیٹا! اور اس لئے اتاری تھی کہ ماضی ان لوگوں کو کبھی معاف نہیں کرتا جو اس سے ناتا توڑ کر فرار ہو جاتے ہیں۔ ماضی ان کے تعاقب میں رہتا ہے اور ایک نہ ایک دن انہیں ڈھونڈ نکالتا ہے۔ اور انتقام کی لمبی چھری ان کے سینے میں گھونپ دیتا ہے۔"

"بابا تم اکثر ایسی باتیں کرتے ہو جو میری سمجھ میں نہیں آتیں۔" میں نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔ "یہ ماضی کون ہے۔ اس سے تمہاری کیا دشمنی تھی؟"

"بہت گہری دشمنی تھی بیٹا! میں نے اسے ٹھوکریں مار مار کر اپنی زندگی سے نکال دیا

تھا۔ کیونکہ وہ بہت گندا تھا۔ آج اس نے اپنی ذلت کا انتقام لے لیا۔" وہ بستر پر لیٹ گیا۔ اس دوران شیلا باتھ روم سے نکل آئی تھی اور ہماری آوازیں سن کر بابا چندن ہی کے کمرے میں آگئی تھی۔ اسے خون میں لت پت دیکھ کر شیلا کا چہرہ سفید پڑ گیا اور اس کے ہاتھ سے وہ تولیہ گر گیا جس سے وہ اپنے آدھے سفید اور آدھے سیاہ بالوں کو خشک کر رہی تھی۔

"یہ کیا ......؟" بمشکل اس کے ہونٹوں نے حرکت کی۔

"کوئی سوال کر کے وقت ضائع نہ کرو شیلا! فوراً کوئی ٹیکسی پکڑو اور خانم کو بلا لاؤ۔" بابا چندن نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ اس کی آنکھیں بار بار یوں بند ہونے لگتی تھیں جیسے اسے نیند آ رہی ہو۔ مگر وہ اس طرح بصد کوشش انہیں کھلی رکھنے کی کوشش کر رہا تھا جیسے کوئی بہت ضروری کام ہو۔

"لیکن خانم تو شاید آج بمبئی ......" شیلا نے کہنا چاہا۔

"نہیں۔" بابا چندن نے بے تابی سے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"ابھی وہ یہیں ہیں۔"

شیلا مزید ایک لفظ کہے بغیر مڑی اور دوڑتی ہوئی باہر چلی گئی۔ "وہ تولیہ اٹھا لاؤ۔" بابا چندن نے نقاہت زدہ لہجے میں کہا اور میں فرش پر پڑا وہ تولیہ اٹھا لایا جو شیلا کے ہاتھ سے گرا تھا۔ "میری الماری کھولو۔" بابا نے مزید کہا۔ "اس میں ایک بڑی شیشی رکھی ہو گی جس میں سفید پاؤڈر سا بھرا ہوا ہے وہ شیشی نکال لاؤ اور پاؤڈر میرے زخم پر اچھی طرح چھڑک دو اور یہ تولیہ کسی چیز سے میرے سینے پر خوب اچھی طرح کس کر باندھ دو۔"

میں خاصی مستعدی سے اس کی ہدایت پر عمل کرنے لگا اور اس دوران میں نے پوچھا۔ "تم یہاں آنے کے بجائے پہلے سیدھے ڈاکٹر کے پاس کیوں نہیں چلے گئے بابا؟"

وہی مضمحل سی مسکراہٹ دوبارہ اس کے ہونٹوں پر رینگ آئی۔ "اس نے علاج بعد میں اور تفتیش پہلے کرنی تھی۔ پھر اسے پولیس کیس قرار دیتے ہوئے پہلے مجھے پولیس سرجن کے پاس جانے کا مشورہ دینا تھا اور پولیس سرجن کی رپورٹ تیار ہونے تک تو میری موت واقع ہو ہی جانی تھی۔ اس لئے میں نے سوچا کہ جب مرنا ہی ہے تو کیوں نہ اپنی محسنہ سے چند ضروری باتیں کر کے مروں۔"

میں اس کے گہرے گھاؤ پر وہ سفید سا سفوف چھڑک کر تولیہ اس کے سینے پر باندھ چکا تو اس نے پہلے سے کہیں زیادہ نحیف آواز میں کہا۔ "بیٹا میں جو کچھ تمہیں سکھانا چاہتا تھا وہ سکھا چکا ہوں' اب اس کی مشق اور ورزشیں تمام عمر ترک نہ کرنا۔ تم کبھی بوڑھے نہیں ہو گے۔ کم از کم اس طرح بوڑھے نہیں ہو گے جس طرح عام لوگ ہوتے ہیں۔ اگر

تم نے میری ہدایت پر عمل نہ کیا تو خانم ...... تمہاری ممی تم سے ناراض ہو جائیں گی۔ وہ تمہیں اس کے علاوہ بھی بہت سے جدید فنون سکھانا چاہتی ہیں۔ جس کے انہوں نے انتظامات کر رکھے ہیں۔ تم کبھی ان کے حکم کے خلاف کوئی کام نہ کرنا۔ انہوں نے تمہارے لئے بہت دکھ اٹھائے ہیں۔ وہ تمہیں پڑھائی کے ساتھ ساتھ جو کچھ بھی سکھانا چاہیں پوری دلچسپی سے سیکھنا۔ اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔ وہ تمہیں ہیرا بنا دیں گی۔ ہیرا! جو قیمت بھی بڑی پاتا ہے اور کبھی ٹوٹتا بھی نہیں۔"

میں بت بنا اس کی باتیں سن رہا تھا' اس کی آواز کا تیشہ میرے ذہن کی لوح پر ایک ایک لفظ کندہ کرتا جا رہا تھا۔ دفعتہً اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر سسکی سی لی۔ گھر میں داخل ہونے کے بعد سے اب تک وہ پہلی بار کراہا تھا۔ چند لمحے بعد اس نے بمشکل آنکھیں کھولیں۔ "میری باتوں پر عمل کرو گے نا؟" اس نے سرگوشی سی کی۔ اس کی آواز بیٹھتی جا رہی تھی۔

"آپ کے اور ممی کے حکم کے خلاف تو میں کچھ کرنے کا سوچ ہی نہیں سکتا۔" میں نے بابا کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "آپ دونوں کے سوا دنیا میں مجھے نظر ہی کون آتا ہے ...... میں کس کا ہاتھ تھام کر چل سکتا ہوں۔"

"میرا ہاتھ تو سمجھو تمہارے ہاتھ سے چھوٹ گیا بیٹا! لیکن اپنی ممی کا ہاتھ کبھی نہ چھوڑنا ......" اس کی آواز بالکل ہی بیٹھ گئی اور اس بار وہ کوشش کے باوجود آنکھیں نہ کھول سکا۔ سانس کی مدھم سی خرخراہٹ کے سوا اس کے وجود میں زندگی کی کوئی علامت نہیں تھی۔

میں تیرہ سال کا ایک ناسمجھ لڑکا' سائیں سائیں کرتے اس مکان میں خون میں لت پت ایک جاں بلب انسان کے سرہانے بیٹھا ...... اپنی ماں کا انتظار کر رہا تھا۔ ماں جو نجانے کہاں رہتی تھی۔

میرا انتظار زیادہ طویل ثابت نہ ہوا۔ آدھے گھنٹے بعد ممی شیلا اور ان کے پیچھے پیچھے دو آدمی کمرے میں داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں سیاہ بیگ تھا۔ ممی نے میرا ماتھا چوما اور مجھے ایک طرف ہٹنے کو کہا۔ سیاہ بیگ والا آدمی جھک کر بابا چندن کا معائنہ کرنے لگا۔ بابا چندن اب بالکل بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اس کی سانس کی مدھم خرخراہٹ بھی کچھ دیر پہلے معدوم ہو چکی تھی۔ سیاہ بیگ والا آدمی جس کے گلے میں اسٹیتھو سکوپ نہیں تھا مگر جو غالباً ڈاکٹر ہی تھا' کئی منٹ تک بابا چندن کا معائنہ کرنے کے بعد سیدھا کھڑا ہوا اور اس نے ممی کی طرف دیکھ کر نفی میں سر ہلایا۔ ممی نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا۔ انہوں نے ایک گہری سانس لی۔ ایک لمحہ کے لئے ان کے چہرے پر تلاطم کے آثار

ابھرے، پھر وہ گویا خود پر ضبط کر کے ہمیشہ کی طرح پر سکون ہو گئیں۔

"لاش کو اٹھا کر گاڑی میں ڈالو۔" انہوں نے اپنے ساتھ آئے ہوئے دوسرے آدمی کو حکم دیا۔ اس نے بابا چندن کی گردن اور ٹانگوں کے تلے ہاتھ ڈال کر انہیں اٹھانے کی کوشش کی مگر اس سے اٹھایا نہ گیا۔

"ممی! میں اٹھاؤں؟" میں نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

"تم اٹھا لو گے؟" ممی نے بے یقینی سے کہا۔

"کیوں نہیں۔ میں اکھاڑے میں کئی مرتبہ انہیں کمر پر لاد چکا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ پھر میں کچھ ہچکچایا۔ "لیکن اس وقت یہ خون میں لتھڑے ہوئے ہیں ...."

"تم صرف بازوؤں میں ہاتھ ڈال کر اٹھا لو۔ ٹانگیں وشنو پکڑ لے گا۔" ممی نے دوسرے آدمی کی طرف اشارہ کیا۔ ہم دونوں لاش کو ڈنڈا ڈولی کر کے باہر لائے۔ کمپاؤنڈ میں ممی کی سلور گرے شیور لیٹ کھڑی تھی۔ ہم نے پچھلے دروازے سے لاش کو بمشکل اندر ٹھونسا۔ مجھے بابا چندن کی لاش کے ساتھ یہ سلوک اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ کیونکہ وہ میرے استاد تھے اور انتہائی شفقت اور لگن سے انہوں نے میری جو تربیت کی تھی اس کی اہمیت اب مجھے معلوم ہو چکی تھی۔ اب میں اتنا ناسمجھ نہیں رہا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ اگر بابا چندن نے میری خوراک کی نگرانی نہ رکھی ہوتی، مجھے صبح شام ورزشیں نہ کرائی ہوتیں، زور آزمائی کے تمام گر نہ سکھائے ہوتے تو آج تیرہ سال کی عمر میں میرا سینہ اتنا چوڑا، بازو اتنے مضبوط اور رانوں کی مچھلیاں اتنی ٹھوس نہ ہوتیں۔ میں عام لڑکوں ہی جیسا ایک لڑکا ہوتا جو آدھ گھنٹا ٹیبل ٹینس کھیل کر سمجھتے ہیں کہ انہوں نے بڑا پہاڑ سر کر لیا ہے۔

گاڑی کا دروازہ بند کر کے ممی نے ایک بار پھر میرے ماتھے پر بوسہ دیا۔ وہ ایک دراز قامت عورت تھیں لیکن میرا قد ان سے نکلنے لگا تھا۔ "بابا چندن نے مرنے سے پہلے کیا باتیں کی تھیں بیٹا؟" انہوں نے سرگوشی میں پوچھا۔

میں نے اپنے انداز میں بابا چندن کی تمام گفتگو لفظ بہ لفظ دہرانے کی حتی الامکان کوشش کی۔ ممی نے سب کچھ سن کر پرخیال انداز میں سر ہلایا اور میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولیں۔ "ایک دو دن میں دوسرا ڈرائیور آ جائے گا۔ تب تک تم ٹیکسی میں سکول چلے جایا کرنا۔ اور ہاں ...... تم کسی قسم کی گھبراہٹ تو محسوس نہیں کرو گے؟"

"گھبراہٹ کیسی ممی؟ بابا چندن کہا کرتے تھے کہ انسان کو اگر چاروں طرف سے آدم خور شیر گھیر لیں تب بھی گھبرانا نہیں چاہئے۔ بلکہ یہ سوچنا چاہئے کہ ان کا گھیرا کیسے توڑا جا سکتا ہے۔" میں نے بابا چندن کی نصیحتوں میں سے ایک نصیحت دہرائی۔ "پھر میری آواز میں

خود بخود ایک ہلکی سی اداسی جھلک آئی۔ "البتہ ان کے بغیر اب تنہائی تنہائی محسوس ہو گی۔ وہ بہت اچھی باتیں کرتے تھے۔ اور ہر وقت مجھے مصروف رکھتے تھے۔ میں ان کے ساتھ کبھی بور نہیں ہوا۔"

"مصروفیت تو تمہیں اب بھی اسی طرح رہے گی بیٹا! اگلے مہینے سے تمہیں شام کو ایک خاص کلاس اٹینڈ کرنے کے لئے ایک جگہ جانا پڑے گا۔ مجھے ایک شخص کا انتظار ہے جو جاپان سے آنے والا ہے۔ امید ہے اگلے ماہ کی پہلی تاریخ تک وہ آ جائے گا۔ اس کے آتے ہی تمہاری مصروفیت اور بڑھ جائے گی۔" ممی نے کہا۔

"اس سے مجھے کیا سیکھنا ہو گا ممی؟" میں نے پوچھا۔

"مارشل آرٹس!" ممی نے کہا۔ "اور یہ کیا ہوتے ہیں۔ یہ تمہیں وہی بتائے گا۔ ہندوستان میں ابھی مارشل آرٹس اچھی طرح متعارف نہیں ہوئے۔ ان کے اکا دکا سینٹرز کام کر رہے ہیں۔ لیکن جس شخص کا میں ذکر کر رہی ہوں وہ مارشل آرٹس کا نامی گرامی ماہر ہے۔ ماسٹر شائی تن کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا ٹریننگ سینٹر تو یہاں کھل چکا ہے۔ یکم تک وہ خود بھی پہنچ جائے گا۔ اس کے ہاں صرف سولہ لڑکوں نے داخلہ لیا ہے۔ اور ان میں تم واحد ہندوستانی ہو گے .... اچھا خیر چھوڑو ...... یہ باتیں تو بعد میں ہوتی رہیں گی۔ تم جا کر آرام کرو۔ کسی قسم کی فکر نہ کرنا اور اس بات کا کسی سے تذکرہ نہ کرنا۔" انہوں نے اگلا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

"مجھے گھر کی باتیں باہر کرنے کی عادت ہی نہیں پڑی ممی! اور پھر میرا کوئی دوست ہی نہیں ہے۔ مجھے سب لڑکے اپنے سے بہت چھوٹے اور احمق لگتے ہیں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔ ممی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئیں۔ ڈاکٹر ان کے برابر بیٹھا تھا اور دوسرا آدمی پیچھے بابا چندن کی لاش کے ساتھ پھنس پھنسا کر بیٹھ گیا تھا۔ کھڑکیوں پر پردے کھینچ دیئے گئے تھے۔

"ویسے بائی دا وے ممی!" میں نے دروازے پر جھکتے ہوئے کہا۔ "آپ بابا چندن کی لاش کو کہاں لے جا رہی ہیں؟"

"جس طرح زندہ انسانوں کے کچھ گھر ہوتے ہیں ......" ممی نے ہاتھ بڑھا کر میرا گال تھپکتے ہوئے کہا۔ "اس طرح لاشوں کے بھی کچھ گھر ہوتے ہیں۔ میں اسے اس کے گھر لے جا رہی ہوں۔"

گاڑی اسٹارٹ ہوئی۔ میں نے دروازہ بند کیا اور پیچھے ہٹ گیا۔ گاڑی گیٹ سے نکل گئی تو میں دیر تک گیٹ پر کھڑا اسی طرف دیکھتا رہا جدھر وہ گئی تھی۔ حالانکہ اس کی سرخ بتیاں موڑ پر کب کی میری نظروں سے اوجھل ہو چکی تھیں۔ ایک گہری سانس لے کر میں

نے اپنے دونوں ہاتھ پتلون پر رگڑ کر صاف کئے اور گیٹ بند کر کے واپس آ گیا۔ گورنس شیلا برآمدے میں کھڑی تھی۔ اس کے بال اب بھی بکھرے ہوئے تھے۔ جنہیں کنگھی کرنے کا اسے موقع نہیں ملا تھا۔ اس کا چہرہ اب بھی زرد تھا۔

"تمہیں ڈر نہیں لگ رہا منصور؟" اس نے سر تا پا میرا جائزہ لیتے ہوئے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

"کس بات کا ڈر؟" میں نے قدرے حیرت سے پوچھا کیونکہ مجھے آج تک بتایا ہی نہیں گیا تھا کہ ایسے موقعوں پر خوف زدہ ہوا جاتا ہے۔ بابا چندن کہا کرتے تھے۔ ڈرنا صرف عورتوں کی عادت ہوتی ہے۔ آج بابا چندن مر چکے تھے تو مجھے ان کی ایک ایک بات رہ رہ کر یاد آ رہی تھی۔

"بابا چندن ......!" گورنس شیلا نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ اور دور فضا کی تاریکی میں نہ جانے کس غیر مرئی چیز کو گھورتے ہوئے کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔ "وہ ایک بے مثال انسان تھے۔ ایک احسان کا بدلہ چکانے میں اس نے جس طرح عمر گزار دی' یہ انہی کا کام تھا۔"

"وہ احسان کیا تھا آنٹی شیلا؟ اور کس نے کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ جو کبھی تمہاری ممی تمہیں سنائیں گی۔ اب تم کپڑے بدلو اور سو جاؤ۔" اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ "آج تمہیں بیڈ پر جانے میں ایک گھنٹہ کی تاخیر ہو گئی ہے۔"

میں خاموشی سے اپنے کمرے میں چلا گیا اور کپڑے بدل کر سو گیا۔ دوسرے دن میں ٹیکسی میں سکول گیا۔ تیسرے دن ایک ڈرائیور آ گیا اور زندگی ایک بار پھر اسی یکسانیت اور سکون سے گزرنے لگی۔ بابا چندن کی ناگہانی موت کا واقعہ اب یونہی یاد رہ گیا تھا گویا کسی پرسکون جھیل میں ایک کنکر گرا تھا' چند لہروں کے دائرے نمودار ہوئے تھے اور معدوم ہو گئے تھے۔

نیا ڈرائیور بس نرا ڈرائیور ہی تھا۔ یہ ایک بوڑھا سا عیسائی تھا۔ نام تو اس کا جوزف تھا لیکن جب تک اسے باقاعدہ مسٹر جوزف کہہ کر نہ پکارا جاتا' تب تک بات کا جواب نہیں دیتا تھا۔ بقول اس کے اسے اس کے لڑکوں کی آوارگی نے تباہ کر دیا تھا۔ ورنہ وہ ایک صاحب جائیداد اور متمول آدمی تھا اور کسی زمانے میں بمبئی کے اونچے طبقوں کی پارٹیاں اس کے بغیر مکمل نہ ہوتی تھیں۔ جوزف میں بابا چندن جیسی کوئی بھی بات نہ تھی۔ وہ نہ تو بابا چندن کی طرح سلاخیں موڑ سکتا تھا اور نہ ہی ان کی طرح گدر گھما سکتا تھا بلکہ ہر روز صبح و شام مجھے اکھاڑے میں ورزش کرتے دیکھ کر وہ بے حد پریشان ہوا کرتا تھا۔

"ارے بابا! تم یہ سب کس لئے کرتا ہے؟" وہ تشویش زدہ لہجے میں کہا کرتا۔ "اتنی چھوٹی عمر میں تم اتنا مشقت کرتا۔ اپنی جان کو اتنا تکلیف دیتا۔ اتنا مضبوط بناتا لیکن جب تم مر جائے گا تو مٹی میں اتنا شاندار جسم کو کیڑا مکوڑا کھا جائیں گا۔ میں ٹھیک بولتا ہوں ناں؟ تم کوئی خاندانی پہلوان تو نہیں ہو ناں؟ تم ایک دم فرسٹ کلاس سکول میں پڑھتا ہے۔ پڑھ لکھ کر بیرسٹر بنے گا انجینئر بنے گا' ڈاکٹر بنے گا مگر پہلوان تو نہیں بنے گا ناں؟ پھر یہ پہلوانی کاہے کو کرتا ہے؟ ابھی زیادہ عمر تک ایسے کرے گا تو تمہارا دماغ ایک دم موٹا ہو جائے گا' باریک باریک بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گا۔"

"مجھے سمجھنے کی ضرورت بھی کیا ہے مسٹر جوزف!" میں جواب دیتا۔ "میں صرف یہ جانتا ہوں کہ یہ میری ممی کا حکم ہے اور اب تو مجھے اتنی عادت ہو گئی ہے کہ ایک دن ورزش پوری نہ کروں اور ایک آدھ مشق چھوڑ دوں تو جسم ٹوٹنے لگتا ہے اور حرارت سی ہونے لگتی ہے۔ بالکل ویسی ہی حالت ہو جاتی ہے جیسی تمہاری اس دن ہوتی ہے جب تمہیں وہائٹ ہارس کی بوتل نہ ملے' اور جہاں تک دماغ موٹا ہونے کا تعلق ہے تو معاملہ ابھی تک ٹھیک جا رہا ہے۔ تمہیں شاید علم نہیں کہ میں سکول میں ہر ٹیسٹ میں فرسٹ آتا ہوں۔"

معلوم نہیں میری بات جوزف کی سمجھ میں آئی یا نہیں' لیکن بوتل کا ذکر سن کر وہ ایک ٹھنڈی سانس ضرور لیتا۔ پھر وہ اپنے کوٹ کی جیب سے وہائٹ ہارس کا ایک چپٹا ادھا نکالتا اور ایک گھونٹ بھر کے بوتل کو پرخیال نظروں سے گھورتا ہوا کہتا۔ "اس کمبخت نے ہمارا فیملی تباہ کر دیا۔ ہم گھر میں پیتا تھا۔ ہم کو دیکھ کر ہمارا سب بیٹا بھی پینے لگا۔" ہم ہندوستانی لوگ میں بری عادت یہ ہے کہ ہم اگر پیتا ہے تو پھر آہستہ آہستہ اتنی پینے لگ جاتا ہے کہ سمندر کا سمندر خالی کر جاتا ہے۔ ہم ڈیم فولز!"

پھر وہ انگریزی میں اپنے آپ کو اور اپنے خاندان کو موٹی موٹی گالیاں دینے لگتا۔ جوں جوں گالیاں سنگین ہوتی جاتیں توں توں اس کے پینے کی رفتار بھی تیز ہو جاتی۔ کبھی کبھی بوتل خالی کر کے وہ غصے میں زمین پر پٹخ دیتا اور سرخ سرخ آنکھوں سے مجھے گھورتے ہوئے کہتا۔

"مائی بوائے! تم کبھی مت پینا ورنہ ہم تمہارے دانت توڑ دے گا۔"

وہ میرے دانت توڑنے کی بات کرتا تو اس کے استخوانی ہاتھ دیکھ کر مجھے ہنسی آ جاتی جسے بمشکل ضبط کرتے ہوئے میں کہتا۔ "میرے استاد بابا چندن نے مجھے قسم دے رکھی ہے کہ میں کوئی ایسی چیز نہ کھاؤں پیوں جس کا کوئی فائدہ نہ ہو۔"

"بابا چندن کون تھا۔ کوئی ریفارمر تھا؟" اس نے کئی مرتبہ میرے منہ سے بابا چندن کا

ذکر سننے کے بعد ایک بار پوچھا اور میں نے اسے تفصیل سے بتایا کہ وہ کون تھا اور کس قسم کا آدمی تھا۔

"پھر وہ کدھر گیا؟" آخر میں جوزف نے پوچھا۔

"ایک رات وہ ......" میں روانی میں بتانے ہی لگا تھا۔

کہ ایک رات وہ کس طرح قتل کر دیا گیا تھا لیکن بروقت مجھے ممی کی ہدایت یاد آ گئی اور میں نے جلدی سے کہا "ایک رات وہ ہم سے ناراض ہو کر چلا گیا اور پھر لوٹ کر نہیں آیا۔"

شب و روز یونہی گزرتے رہے۔ ممی حسب معمول ہر جمعرات کی شام کو آتی تھیں اور چند گھنٹے میرے پاس گزار کر چلی جاتی تھیں۔ اب میں اتنا سمجھدار ضرور ہو چکا تھا کہ ممی سے اصرار کر کے پوچھ سکوں کہ آخر وہ مجھے اپنے ساتھ کیوں نہیں لے جاتیں۔ جبکہ وہ مجھے اتنا پیار بھی کرتی ہیں اور میرا بھی ہر وقت ان کے قریب رہنے کو جی چاہتا ہے۔ انہوں نے سمجھایا کہ وہ ایک قصبہ نما شہر میں ملازمت کرتی ہیں اور چونکہ وہاں کوئی اچھا سکول یا کالج نہیں ہے اس لئے وہ مجھے وہاں رکھنا نہیں چاہتیں کیونکہ ان کی خواہش ہے کہ میں نہایت شاندار درسگاہوں میں تعلیم حاصل کروں اور بہت بڑا آدمی بنوں۔

ملازمت وہ اس لئے چھوڑنا نہیں چاہتی تھیں کہ وہ کوئی معمولی ملازمت نہیں تھی اور انہیں بہت بھاری تنخواہ ملتی تھی۔ جس سے وہ اپنا اور میرا اعلیٰ معیار زندگی قائم رکھ سکتی تھیں۔ اور پھر چونکہ میرے والد کا میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی انتقال ہو چکا تھا اس لئے ہمارا کوئی اور ذریعہ گزر اوقات بھی نہیں تھا۔ چنانچہ وہ ملازمت کرنے پر مجبور تھیں۔

"جب تم پڑھ لکھ کر بڑے آدمی بن جاؤ گے ناں۔" ممی نے گویا چشم تصور سے مستقبل میں جھانکتے ہوئے کھوئے کھوئے سے لہجے میں کہا۔ "اور مجھ سے بھی زیادہ کمانے لگو گے تو میں ملازمت ہی نہیں' دنیا کی ہر مصروفیت ترک کر دوں گی۔ بس پھر مرتے دم تک اپنے بیٹے کے پاس رہوں گی۔ ایک لمحے کے لئے بھی تمہیں تنہا نہیں چھوڑوں گی۔"

ان کی شفاف نیلگوں آنکھوں پر لمبی پلکوں کی جھالریں ساکت تھیں۔ اور وہ ہوا میں نہ جانے کس غیر مرئی چیز کو گھور رہی تھیں۔ سفید چادر کے حلقے میں گھرا ہوا ان کا ملکوتی چہرہ آخر شب کے چاند کی طرح روشن مگر کچھ زرد سا تھا۔ کبھی کبھی وہ یونہی تھکی تھکی سی نظر آنے لگتی تھیں۔ اور اب مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ ان کی یہ تھکن یہ پژمردگی بے سبب نہیں ہوتی تھی۔ ملازمت میں انہیں نہ جانے کتنی محنت کرنی پڑتی تھی اور پھر ہر ہفتے وہ خاصا طویل سفر کر کے مجھ سے ملنے آتی تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ وہ قصبہ پونا سے تقریباً سو

میل دور تھا جہاں وہ رہتی تھیں اور کار میں وہاں سے ملنے آتی تھیں۔

بابا چندن کے قتل کو تقریباً ڈیڑھ ماہ گزر چکا تھا جب ایک شام جوزف نے بتایا کہ مجھے اس کے ساتھ ایک جگہ چلنا ہے۔ اسے ممی سے کچھ ہدایات ملی تھیں۔ میں تیار ہو کر اپنے کمرے سے نکلا تو وہ ایک بریف کیس اٹھائے برآمدے میں کھڑا تھا۔ بریف کیس اس نے کار میں پچھلی سیٹ پر رکھا اور ہم ایک انجانی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔ "ہم کہاں جا رہے ہیں مسٹر جوزف؟"

"ماسٹر شیطان کے پاس۔" اس نے جواب دیا۔ "کل سے تم پر ایک اور بوجھ پڑنے والا ہے۔ تمہیں جوڈو کی کلاس اٹینڈ کرنے جانا ہوا کرے گا اور پھر کراٹے سیکھنا ہو گا۔ ہم تو حیران ہے کہ تمہارا ممی تم کو کیا بنانا مانگتا ہے؟"

"وہ مجھ کو بڑی مچھلی بنانا مانگتا۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ میں سمجھ گیا کہ ماسٹر شیطان سے جوزف کی مراد دراصل ماسٹر شائی تن ہے' جس کا ممی نے مجھ سے تذکرہ کیا تھا۔

"ہو ...... ہو ہو ......" جوزف نے ایک بلند آہنگ قہقہہ لگایا۔ "تمہارا ممی تم کو آدمی سے فش بنانا مانگتا۔"





"تقریباً" پندرہ منٹ کے سفر کے بعد ہماری کار ایک ایسی کوٹھی کے پورچ میں داخل ہوئی جس کی چار دیواری کاسنی کے پھولوں سے لدی بیلوں سے ڈھکی ہوئی تھی اور ان بیلوں کے درمیان ایک جگہ سے ایک چھوٹا سا سائن بورڈ جھانک رہا تھا جس پر صرف "مارشل آرٹس" لکھا ہوا تھا پورچ میں پہنچ کر میں نے دیکھا کہ کوٹھی کا لان غیر معمولی طور پر طویل و عریض اور سرسبز تھا اور باہر سے نظر نہیں آتا تھا۔

برآمدے میں پہنچ کر جوزف نے ایک جالی دار دروازے پر لگا ہوا کال بیل کا موٹا سا سفید بٹن دبایا اور چند لمحے بعد دروازہ تھوڑا سا کھل گیا۔ چپٹی ناک والے ایک زرد رو اور پستہ قد آدمی نے باہر قدم رکھے بغیر سوالیہ نظروں سے ہماری طرف دیکھا۔

جوزف نے جیب سے ایک تہہ شدہ کاغذ نکال کر اس کی طرف بڑھایا اور انگریزی میں کہا۔ "یہ ماسٹر شیطان کو دے دو۔" نام کا تلفظ اس نے اب بھی درست نہیں کیا تھا۔ پستہ قد آدمی جو غالباً" جاپانی تھا اور جس کی عمر کا اندازہ لگانا خاصا مشکل تھا' ایک طرف کو ہٹ گیا اور اس کے سامنے سے گزر کر ہم اندر پہنچے تو اپنے آپ کو ایک وسیع مگر سادہ سی نشست گاہ میں پایا۔ پستہ قد جاپانی نے قدیم طرز کے گدے دار آبنوسی کرسیوں کی طرف اشارہ کیا اور خود اندر چلا گیا۔

ماسٹر شائی تن کے متعلق میرا اندازہ تھا کہ وہ بھی چپٹی ناک والا کوئی پستہ قد جاپانی ہو گا مگر جب تقریباً" 6 فٹ قد کے ایک وجیہہ نوجوان نے نشست گاہ میں آکر ہم سے ہاتھ ملاتے ہوئے ماسٹر شائی تن کے نام سے اپنا تعارف کرایا تو کم از کم میں تو بے حد حیران ہوا کیونکہ نہ صرف اس کا قد چھ فٹ سے اوپر تھا بلکہ اس کی ناک بھی ستواں تھی۔ اپنے لب و لہجہ کے علاوہ کسی اعتبار سے جاپانی نہیں لگتا تھا۔

"خانم نے مجھ سے فون پر بات کی تھی۔" اس نے انگریزی میں کہا۔ "میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ اگر وہ دوسرے سب لڑکوں سے الگ تھلگ اپنے بیٹے کو خصوصی تربیت دلوانا چاہتی ہے تو اس کی علیحدہ فیس ہو گی اور وہ بھی ایک سال کی ایڈوانس۔" اس نے ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے ایک گہری سانس لی۔ "میں شاید پیسے کے معاملے پر اتنا زور نہ دیتا لیکن مجھے دراصل اس فن کو ہندوستان میں متعارف کرانے کے لئے پیسے کی ضرورت

ہے گو کہ میں اپنے کام کو بنی نوع انسان کی خدمت سمجھ کر انجام دینا چاہتا ہوں لیکن اس کے لئے بھی دنیا کے کچھ تقاضے پورے کرنے پڑتے ہیں۔ پبلسٹی پر خرچ کرنا پڑتا ہے۔ خصوصاً" مجھے تو بہت محنت کرنا پڑے گی کیونکہ ہندوستان میں ابھی یہ فن صحیح طور پر متعارف نہیں ہوا تاہم مجھے یقین ہے کہ چند سال بعد ایشیا کے تمام پسماندہ ملکوں کا بچہ بچہ اگر جوڈو کراٹے کا ماہر نہیں تو اس سے آشنا ضرور ہو گا۔"

جوزف نے جمائی لے کر ماسٹر شائی تن کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "میں رقم لے کر آیا ہوں مسٹر شیطا ...... شائی تن!" اس نے بریف کیس ماسٹر شائی تن کی طرف بڑھا دیا۔ شائی تن نے اسے گھٹنوں پر رکھ کر کھولا۔ میں نے اس میں نوٹوں کی کچھ گڈیاں دیکھیں۔ شائی تن نے رقم گنے بغیر بریف کیس بند کر کے قالین پر رکھ دیا اس کے چہرے پر اب بشاشت آ گئی تھی۔

"یہ ہے لڑکا۔" جوزف نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "اس کا نام منصور ہے۔ آپ اسے بتا دیں کہ یہ کس روز سے اور کس وقت آنا شروع کر دے۔"

"اوہ ......" شائی تن نے اب بغور میرا سر تا پا جائزہ لیا اور گرم جوشی سے مصافحے کے لئے میری طرف ہاتھ بڑھایا وہ میرے مقابل خاصے فاصلے پر بیٹھا تھا اور بیٹھے بیٹھے ہی اس کا ہاتھ مجھ تک پہنچ گیا تھا۔ اس کا بازو عام انسانوں کی نسبت لمبا تھا اور جب میں نے اس سے مصافحہ کیا تو یہی محسوس ہوا جیسے ہاتھ اچانک کسی ایسے آہنی مجسمے نے اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ جس میں کسی معجزے کے تحت جان پڑ گئی ہو۔

"منصور! تمہارا جسم بتاتا ہے کہ تم نے دیسی ورزشیں بہت کی ہیں' کیا میرا اندازہ درست ہے؟" شائی تن نے پوچھا۔

"جی ہاں ......" میں نے جواب دیا۔ "میں نے تقریباً" پانچ سال پہلوانی وغیرہ کی تربیت حاصل کی ہے۔"

"بہت خوب"۔ شائی تن نے چٹکی بجائی۔ "وہ تمہارے بہت کام آئے گی۔ دیسی ورزشوں سے جسم میں بہت زیادہ قوت برداشت اور لچک پیدا ہو جاتی ہے جو کہ جوڈو کراٹے کے لئے بہت ضروری ہے۔ میرا خیال ہے مجھے تم پر زیادہ محنت نہیں کرنا پڑے گی۔" پھر وہ ایک لمحے کے لئے کچھ سوچ کر بولا۔ "تم ایسا کرو کل شام سے باقاعدگی کے ساتھ 5 بجے آنا شروع کر دو تمہیں یہاں تقریباً" دو ڈھائی گھنٹے لگا کریں گے۔"

"ٹھیک ہے جناب!" میرے بجائے جوزف نے جواب دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ "اب اجازت ...... کل سے منصور آیا کرے گا۔"

باہر آکر کار میں بیٹھتے وقت جوزف نے میرا کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔ "لو بھئی! تمہیں شیطان کی شاگردی مبارک ہو۔"

"دیکھو مسٹر جوزف!" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "وہ اب میرے استاد ہو چکے ہیں۔ اب تم ان کا نام صحیح طریقے سے لیا کرو۔"

جوزف نے اپنے مخصوص انداز میں بے ہنگم قہقہہ لگایا اور کار اسٹارٹ کر دی۔

اگلے روز میں ٹھیک 5 بجے شائی تن کی کوٹھی پہنچا تو وہ میرا منتظر ہی تھا۔ پہلے دن اس نے مجھے ایک ڈھیلی ڈھالی سفید شرٹ اور ایسا ہی ڈھیلا ڈھالا پاجامہ دیا اور بڑے اہتمام کے ساتھ مجھ سے چند خاص خاص باتوں کا عہد لیا مثلاً" یہ کہ اگر میں نے دلجمعی کے ساتھ جوڈو اور کراٹے کے فن پر عبور حاصل کر لیا تو اسے تخریبی مقاصد کے لئے استعمال نہیں کرونگا۔ اپنے سے کمزور پر ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا' اپنی طاقت کو کسی لالچ کے تحت استعمال نہیں کرونگا' کسی کا آلہ کار نہیں بنوں گا وغیرہ وغیرہ۔

اس کے بعد شائی تن نے مجھے ایک طویل لیکچر دیا جس کا مقصد مجھے جوڈو اور کراٹے کی تعریف سمجھانا تھا۔ اس کا مختصر مفہوم یہ تھا کہ یہ دراصل کوئی فن حرب یا لڑائی بھڑائی کا ہنر نہیں بلکہ باقاعدہ ایک علم ہے جس کا تعلق جسم کے ساتھ ساتھ روح' ذہن اور قوت ارادی سے بھی ہے اس کے بعد اس نے مجھے استاد اور شاگرد کی باہمی تعظیم اور اکھاڑے کے آداب سکھائے جو اس فن میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔

یہ سب کچھ ذہن نشین کرانے کے بعد اس نے مجھ سے سوال و جواب کر کے ایک طرح سے میرا ٹیسٹ لیا اور مطمئن ہو کر مجھے چھٹی دے دی۔ اگلے دن سے میری باقاعدہ تربیت شروع ہوئی یہ ایک دلچسپ فن تھا اور اسے سیکھتے ہوئے میری دلچسپی روز بروز بڑھتی گئی۔

انسان ماضی پر نظر ڈالے تو ہر بات' ہر واقعہ' ہر یاد خواب و خیال لگتی ہے۔ ماہ و سال' لمحوں سے بھی مختصر لگتے ہیں۔ پونا میں مجھے اپنی تعلیم و تربیت کا دور اس وقت بہت سست رفتار اور طویل محسوس ہوتا تھا لیکن اب سوچتا ہوں تو ایسا لگتا ہے گویا میں پلک جھپکتے میں عمر کے سولہویں سال میں پہنچ گیا تھا اور یہ وہ وقت تھا جب شائی تن نے مجھے بلیک بیلٹ دینے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت تک اس کا کام خاصا پھیل چکا تھا اور اس کے یہاں 27 شاگرد تربیت کے آخری مراحل میں تھے۔ جن میں ایک انگریز لڑکی بھی شامل تھی۔ آزمائشی مقابلوں میں' میں ان سب کو شکست دے چکا تھا۔

بلیک بیلٹ حاصل کرنے کے لئے مجھے ماسٹر شائی تن سے مقابلہ کرنا تھا' محض نمائشی یا آزمائشی مقابلہ نہیں بلکہ بھرپور اور فیصلہ کن حقیقی مقابلہ ...... شائی تن نے فیصلہ دے دیا تھا کہ یہ مقابلہ ضرور منعقد ہو گا اور نہایت زوروشور سے اس کی تیاریاں شروع کر دی گئی تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ یہ مقابلہ ایک باقاعدہ شو کی طرح منعقد کیا جائے اور شہر کی چیدہ چیدہ ہستیوں اور اخباری نمائندوں وغیرہ کو بھی مدعو کیا جائے۔ اس مقابلے کی تیاریوں کو

آخری شکل دینے کے بعد شائی تن نے شانتا رام آڈیٹوریم کرائے پر لے کر مقابلہ کی تاریخ کا اعلان کر دیا۔

میں مقابلے کے لئے تو تیار تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ میرے دل کے ایک گوشے میں ابھی شائی تن کی دہشت اور دبدبہ برقرار تھا۔ بلاشبہ اس نے اپنا فن مکمل طور پر مجھ میں سمو دیا تھا اور اسے میری ذات پر بے پناہ فخر تھا۔ لیکن اس کی تمام تر دیانتداری کے باوجود مجھے اندیشہ تھا کہ بلی کی طرح تمام داؤ شیر کو سکھانے کے بعد بھی اس نے ایک آدھ داؤ محفوظ نہ رکھا ہو۔ دوسرے یہ کہ اسے پبلک کے سامنے اپنے فن کے مظاہرے کا طویل تجربہ تھا جبکہ میں پہلی مرتبہ اس قسم کے مرحلے سے گزرنے والا تھا۔

ان سب باتوں سے قطع نظر بحیثیت شاگرد ہی نہیں بحیثیت حریف بھی میں شائی تن سے مرعوب تھا۔ وہ اس قدر عجیب و غریب صلاحیتوں کا مالک تھا کہ کبھی کبھی تو مجھے اس پر کسی مافوق الفطرت مخلوق کا شبہ ہونے لگتا تھا۔ کراٹے کے جس وار سے میں ماربل کے تین تین ٹائلز توڑ دیتا تھا۔ انہیں شائی تن اس طرح برداشت کر جاتا تھا کہ اس کے حلق سے ہلکی سی کراہ نہیں نکلتی تھی اور نہ ہی اس کی کوئی ہڈی اپنی جگہ سے کھسکتی تھی۔ قوت برداشت اور وار کو زائل کرنے کی صلاحیت تو مجھ میں بھی اب اتنی تھی لیکن میں وار کرنے کے معاملے میں اپنے آپ کو شائی تن سے کسی قدر کمتر محسوس کرتا تھا جبکہ شائی تن کا کہنا تھا کہ یہ میرا وہم ہے۔ شائی تن جب ہوا میں ہاتھ یا لات گھماتا تو شائیں کی سی آواز پیدا ہوتی تھی جیسے بید ہوا میں گھمایا گیا ہو۔ 03036360959

وہ جب پوری طرح ایکشن میں ہوتا تھا تو اس کے ہاتھ پیروں پر نظر نہیں ٹھہرتی تھی کراٹے کا اس سے بڑا حیرت انگیز مظاہرہ وہ تھا جس میں اس نے تقریباً" دس بارہ فٹ لمبے اور ایک فٹ کی گولائی کے اژدھے کو ہاتھ سے ایک وار سے دو ٹکڑے کر دیا تھا۔ یہ مظاہرہ ایک ماہ قبل میں بھی کر چکا تھا۔ گویا اب ہر لحاظ سے میں اپنے استاد کا مد مقابل تھا اس کے باوجود نہ جانے کیوں دل پر ہلکی سی مرعوبیت طاری تھی۔ بہرحال اس کا فیصلہ بھی اب آخری مقابلے میں ہو جانا تھا کہ یہ مرعوبیت میرے دل پر ہمیشہ مسلط رہے گی یا ختم ہو جائے گی۔

مقررہ تاریخ پر ہم صبح ہی شانتا رام آڈیٹوریم پہنچ گئے تھے اور خالی ہال کے سامنے اسٹیج پر اپنے مظاہروں کی ریہرسل کر رہے تھے۔ مقابلہ دیکھنے کے لئے شام کو ممی بھی آنے والی تھیں۔ دوپہر کو میں نے شائی تن اور اس کے دیگر شاگردوں کے ساتھ ہلکا پھلکا کھانا کھایا اور ہم ریٹائرنگ روم میں ستانے لگے۔ شائی تن ایک کاؤچ پر نیم دراز عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"منصور! تمہاری عمر صرف 16 سال ہے۔" چند لمحے بعد اس نے کہا۔ "اگر مقابلے

میں تم نے مجھے شکست دے دی تو اس کمسنی میں تمہیں بلیک بیلٹ مل جائے گا اور جوڈو کراٹے کی تاریخ میں بلاشبہ یہ ایک ریکارڈ ہو گا لیکن یہ مت بھولنا کہ اس مقابلے میں' میں تمہارے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرونگا اور ذرا سی کوتاہی پر ہم دونوں میں سے کسی کی موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔ جس کے لئے ہم ایک اقرار نامے پر بھی دستخط کر چکے ہیں۔"

"مجھے سب یاد ہے ماسٹر شا!" میں نے آہستگی سے کہا اور اپنے دونوں ہاتھوں کو گھورنے لگا۔ میری آنکھوں میں ممی کا چہرہ ابھر آیا تھا۔ مجھے سب سے زیادہ ان کی نظروں میں سرخرو ہونے کی فکر تھی۔ اپنی جان کی مجھے کوئی خاص پروا نہیں تھی۔ دنیا میں صرف ایک ہی ہستی تھی جس کی توقعات پر پورا اترنے اور جس کی خوشنودی حاصل کرنے کی مجھے لگن تھی اور وہ ہستی میری ماں تھی۔ اس کے علاوہ دنیا کے کسی فرد کی میری نظر میں اتنی اہمیت نہ تھی کہ میں اپنے بارے میں اس کی رائے کی فکر کرتا۔

ٹھیک بجے تیز روشنیوں کے سیلاب میں وسیع اسٹیج کا پردہ اٹھا۔ ہال میں حاضرین کی تعداد زیادہ نہیں تھی کیونکہ عام لوگوں کو مدعو نہیں کیا گیا تھا۔ اسٹیج کنڈکٹر کی مختصر تعارفی تقریر کے بعد ایک گھنٹے تک شائی تن کے 18 شاگردوں نے جوڈو کراٹے کے نمائشی مقابلے پیش کئے اور آخر میں شائی تن اور میں اسٹیج کے چکنے چوبی فرش پر بنے ہوئے رنگ میں اترے۔ ہال میں روشنی بہت مدھم تھی۔ اس لئے میں حاضرین میں ممی کا چہرہ تو نہ دیکھ سکا۔ البتہ ان کی ریشمی سفید چادر کی جھلک میں نے اگلی قطار میں دیکھ لی تھی اور میرا دل دھڑک اٹھا تھا۔

حاضرین کو سلام کرنے کے بعد میں اور شائی تن ایک دوسرے کے مقابل آئے۔ ہم نے تقریباً" رکوع کی سی حالت میں جھک کر ایک دوسرے کو تعظیم دی اور پھر پیچھے ہٹ گئے۔ اسٹیج کے عقب سے ڈھائی ڈھائی فٹ لمبی دو ٹھوس چھڑیاں ہماری طرف اچھالی گئیں۔ یہ چھڑیاں ہم دونوں نے اس طرح کیچ کیں کہ ہمارے ہاتھوں میں آتے ہی یہ پنکھے کے پروں کی طرح تیزی سے گردش کرنے لگیں۔ اس دوران ہم ایک دوسرے کے سامنے چکر کاٹ کر نظروں ہی نظروں میں ایک دوسرے کو تولتے رہے۔ دفعتہ" ہوا میں شائیں کی سی آواز پیدا ہوئی اور میں اچھل کر ایک طرف کو ہٹ گیا نہ جانے کب شائی تن کی چھڑی کی گردش رکی تھی اور کب اس نے وار کیا تھا۔ لیکن بہرحال مجھے اتنا اندازہ ہے کہ اگر چھڑی کی یہ ضرب میری کھوپڑی پر پڑی ہوتی تو اس طرح سر کے پرخچے اڑ جاتے جس طرح کئی من وزنی گرز سے وار کیا گیا ہو اور یوں مقابلہ شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جاتا کیونکہ چھڑی کے یہ کرتب تو درحقیقت صرف خون گرمانے کے لئے ابتداء میں دکھائے جاتے ہیں۔

میں نے بائیں طرف جھکتے ہی اپنی چھڑی سے شائی تن کی پسلیوں پر وار کیا۔ شائی تن نے نہ صرف میرا وار خالی کر دیا بلکہ اس نے چھڑی پر ہاتھ بھی ڈال دیا اور وہ میرے ہاتھ

سے نکل گئی لیکن ساتھ ہی میں نے اس کی کلائی پر کراٹے کا داؤ "کودی گریس" آزمایا اور چھڑی اس کے ہاتھ سے بھی نکل گئی۔ شائی تن ایڑی کے بل گھوما اور الٹے رخ اس کی ٹانگ ہوا میں بلند ہوئی۔ میں پیچھے ہٹ چکا تھا ورنہ یہ وار جسے "چاکی" کہا جاتا ہے' میرے نرخرے کو کچی مٹی کے کھلونے کی طرح پچکا کر رکھ دیتا۔

اس سے پہلے کہ شائی تن کا چہرہ میری طرف ہوتا میں نے "یوپ چار" کو آزمایا۔ یہ ایک سائیڈ کک تھی جس نے شائی تن کو فضا میں اچھال دیا۔ وہ ہاتھوں کے بل چوبی فرش پر آیا اور اس سے پہلے کہ میں کوئی وار کر سکتا' وہ اسپرنگ والے گڈے کی طرح سیدھا ہوا اور دونوں ہاتھ پھیلا کر میری طرف بڑھا۔ کراٹے کا وار کرنے سے پہلے اس نے میری ٹھوڑی پر ٹھوکر رسید کرنے کی کوشش کی جو میں نے ناکام بنا دی۔ لیکن بائیں کندھے پر پڑنے والے کراٹے کے ہاتھ سے میں اپنے آپ کو نہ بچا سکا۔ ایک ثانیے کے لئے مجھے محسوس ہوا کہ میری ہنسلی کی ہڈی اتر گئی ہے۔ لیکن اپنے آپ کو دوسرے وار سے بچاتے ہوئے میں نے جسم کو جھٹکا دیا اور دائیں ہاتھ سے "پیان شان کوت" نامی داؤ مارا۔

تکلیف کے باعث شائی تن کے پتلے پتلے ہونٹ بھنچ گئے اور آنکھیں گویا ابل پڑیں۔ پھر حلق سے ایک مخصوص آواز نکال کر وہ ہوا میں اچھلا۔ اس کی ایک ٹانگ نے مجھے گھما دیا اور دوسری ایڑی پشت پر پڑی۔ یہ وار اچٹتا ہوا پڑا تھا پھر بھی میری ریڑھ کی ہڈی کڑکڑا کر رہ گئی۔ میں نے ایک بار سانپ کی طرح جسم کو لہرا دے کر توازن قائم رکھنے کے ایک طریقے "دایت کیوبی" کی مدد سے اپنے آپ کو بچایا۔

اب میں نے فیصلہ کن وار کرنے کی ٹھانی۔ "زٹ" کی ایک زور دار چیخ کے ساتھ میں فضا میں بلند ہوا اور میرے چاروں ہاتھوں پیروں نے بیک وقت حرکت کی۔ لیکن میرا یہ وار مکمل نہ ہو سکا۔ شائی تن کی ایڑی میری ناف سے ٹکرائی اور میں چت گرتے گرتے بچا اپنے جسم کو کمان کی طرح موڑ کر میں ہاتھ پیروں کے بل گرا اور سیدھا ہوتے ہوتے لات گھمائی اور میری ایڑی کی ضرب شائی تن کے سینے پر پڑی۔ میرے لئے یہ اندازہ کرنا مشکل نہ تھا کہ اس کی کئی پسلیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ مگر بلاشبہ وہ غضب کا آدمی تھا۔ سینے پر ہاتھ رکھ کر صرف ایک لمحے کے لئے جھکا پھر فوراً" ہی سیدھا ہو کر اس نے میرے کندھے پر کراٹے کا ہاتھ مارا۔ اس کے وار میں اب طاقت نہیں تھی۔ میری مدافعانہ کوشش کی وجہ سے یہ ہاتھ اچٹتا ہوا میری پیشانی سے رگڑ کھاتا گزرا اور وہیں سے میری کھال پھٹ گئی۔ خون کی سرخ تہہ نے ایک لمحے کے لئے میری آنکھوں کو ڈھانپ لیا۔ اگر شائی تن کی پسلیاں نہ ٹوٹ چکی ہوتیں تو اس لمحے وہ میرا کام تمام کر چکا ہوتا۔

میں نے بائیں ہاتھ سے خون پونچھا اور شائی تن کی گردن پر کراٹے کا ہاتھ رسید کیا۔ کراٹے کے کسی معمولی کھلاڑی کی گردن اس وار سے ٹوٹ جاتی لیکن میرا مقابلہ اپنے ہی

استاد شائی تن سے تھا۔ جس کا جسم فولاد سے کم نہیں تھا۔ تاہم وہ گر ضرور گیا اور اس بار وہ پہلے کی سی پھرتی سے نہیں اٹھ سکا۔

میں نے اس کے نرخرے پر اس خاص انداز سے پاؤں رکھ دیا کہ اگر وہ ذرا بھی حرکت کرتا تو اس کا نرخرہ کچلا جا سکتا تھا۔ اس نے چوبی فرش پر ہاتھ مار کر مخصوص اشارہ کیا جس کا مطلب تھا کہ اس نے شکست تسلیم کر لی ہے۔ میں نے پاؤں اس کی گردن سے اٹھا لیا اور اس کا ہاتھ تھام کر اسے سیدھا کھڑا کیا' ہم دونوں نے ایک دوسرے کو تعظیم دی۔

شائی تن کا ایک ہاتھ سینے پر تھا مگر اس غیر معمولی انسان کے ہونٹوں پر اب بھی مسکراہٹ تھی۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر بلند کیا اور اکھڑی اکھڑی سی سانسوں کے ساتھ اعلان کیا کہ اس کا شاگرد بلیک بیلٹ کا مستحق ہو چکا ہے۔

اس نے اپنے سفید لبادے پر سے بلیک بیلٹ اتار کر میرے گلے میں ہار کی طرح ڈال دی۔ تالیوں کے شور میں پردہ گرا تو شائی تن میرے کندھے کا سہارا لے کر ونگ کی طرف بڑھا۔ باہر ایمبولینس تیار کھڑی تھی۔ ایمبولینس کے عملے نے آگے بڑھ کر شائی تن کو سنبھالنے کی کوشش کی لیکن اس نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں ہٹا دیا۔ پھر وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ "پسلیاں صرف ٹوٹی ہیں' پھیپھڑوں میں نہیں گھسیں ...... وار کچا تھا۔"

"لیکن یہ بھی تو دیکھیں ماسٹر شا! کہ میں نے کس پوزیشن میں وار کیا تھا۔" میں نے مدافعانہ لہجے میں کہا۔ "بہرحال اب آپ ہسپتال چلیں۔ داؤ پیچ کی باتیں بعد میں ہوتی رہیں گی۔"

ہم اسے تھام کر برآمدے میں کھڑی ایمبولینس کی طرف لے جا رہے تھے۔ جب سیڑھیوں کے قریب میں نے ممی کو کھڑے دیکھا۔ انہوں نے لپک کر مجھے سینے سے لگایا اور بے تحاشا چومنے لگیں۔ برآمدے میں بڑے بڑے گلوب آویزاں تھے' جن کی روشنی میں ممی کا چہرہ معمول سے کہیں زیادہ شگفتہ نظر آ رہا تھا۔ گو کہ اب عمر کے ساتھ ساتھ ان کے بالوں میں کہیں کہیں چاندی کے تار جھلملانے لگے تھے او روشن چہرے پر ایک آدھ شکن نمودار ہو چلی تھی۔ مگر ان تبدیلیوں سے ان کے چہرے کے تقدس' وقار اور متانت میں نمایاں اضافہ ہو گیا تھا۔

"ممی آپ گھر چلیں' میں ماسٹر شائی تن کو ہسپتال پہنچا کر ابھی واپس آتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"تم اطمینان سے سب کام کرو۔" انہوں نے میرا کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔ "میں تو اب واپس جا رہی ہوں۔ صرف اس مقابلے کے لئے وقت نکال کر آئی تھی۔ آج کا دن بلاشبہ میرے لئے ایک ناقابل فراموش خوشی کا دن ہے۔ ایک طویل مدت کے بعد ایسی خوشی

نصیب ہوئی ہے۔ میرا دل تو چاہتا ہے کہ تمہیں کم از کم آج کی رات تو نظروں سے اوجھل نہ کروں' لیکن مجبوری ہے ...... ملازمت کی مجبوری ...... میرے کام کی نوعیت ایسی ہے کہ کسی دن بھی چھٹی نہیں ملتی۔ بہرحال جمعرات کو آؤں گی تو پھر باتیں ہوں گی۔ اب تم جاؤ شاباش ......"

میں بادل نخواستہ ایمبولینس کی طرف بڑھا۔ ماسٹر شائی تن اسٹریچر پر لیٹ کر جانے کے بجائے ہسپتال کے عملے کے دو آدمیوں کا سہارا لے کر اپنے پاؤں پر چل کر ایمبولینس کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اسٹریچر' ایمبولینس میں رکھ دیا گیا تھا۔ اور جب میں گاڑی تک پہنچا تو شائی تن اسٹریچر پر لیٹ چکا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور اب وہ واقعی نڈھال نظر آ رہا تھا۔ میں اس کے ساتھ بیٹھنا چاہتا تھا لیکن ایک اٹینڈنٹ نے مجھے منع کر دیا۔

میں نے پارکنگ لاٹ سے اپنی مورس نکالی اور ایمبولینس کے پیچھے پیچھے روانہ ہو گیا۔ میرا ذہن ان گنت الجھے الجھے خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا اور ان خیالات کا محور و مرکز شائی تن ہی تھا۔ اسے ایمبولینس میں مضمحل لیٹے دیکھ کر مجھے واقعی تکلیف ہوئی تھی اور ساتھ ہی میرا جی چاہا تھا کہ اس کی پیشہ ورانہ عظمت کو سلام کرنے کے لئے اس کے ہاتھوں کو بوسہ دوں۔ وہ چاہتا تو آج کا مقابلہ لی بگٹ کے ساتھ پیش کر سکتا تھا جو ہار جیت کے بغیر یا بے ضرر نتائج کے ساتھ ختم ہو جاتا یا وہ چاہتا تو تربیت کے دوران اپنا فن اور مہارت مکمل طور پر میری ذات میں منتقل نہ کرتا۔ اور آج صرف چار منٹ اور تیرہ سیکنڈ کے اس مقابلے میں میری ہڈیاں علیحدہ کر کے رکھ دیتا لیکن اس نے پوری دیانتداری سے میری تربیت کی تکمیل کی تھی۔ اور اسی دیانتداری کے ساتھ میرا امتحان لیا تھا۔ اور اس کے لئے اپنی جان پر کھیلنے سے بھی دریغ نہیں کیا تھا اگر اس نے کسی بھی مرحلے پر بے ایمانی سے کام لیا ہوتا تو شاید اس کی جگہ میں ایمبولینس میں ہسپتال یا میت گاڑی میں قبرستان جا رہا ہوتا یا پھر وہ جھوٹ موٹ مجھے مقابلہ جتوا سکتا تھا۔

سول ہسپتال سے میری واپسی رات کے تقریباً گیارہ بجے ہوئی۔ ماسٹر شائی تن کو خصوصی توجہ کے وارڈ میں رکھا گیا تھا۔ اگلی صبح 9 بجے اس کا آپریشن ہونا تھا۔ ایکسرے وغیرہ سے پتا چلا تھا کہ اس کی تین پسلیاں ٹوٹی تھیں جن میں ایک اس طرح مڑی ہوئی تھی کہ دائیں پھیپھڑے پر بری طرح دباؤ پڑ رہا تھا۔ اور اسے سانس لینے میں بڑی دشواری پیش آ رہی تھی جس وقت میں ہسپتال سے چلا تھا' اس وقت وہ بے ہوشی کی دواؤں کے اثر میں تھا۔

پونا کی سڑکیں ان دنوں 8 بجے ہی سنسان ہو جایا کرتی تھیں اور جس وقت میں ہسپتال سے نکلا' اس وقت تو بالکل ہو کا عالم طاری تھا جب میں آزاد روڈ پر پہنچا تو چاند بادلوں کے عقب سے نکل آیا تھا۔ آزاد روڈ کے دونوں طرف ماڈل ٹاؤن پھیلا ہوا تھا۔ یہ

پونا کے متمول ترین لوگوں کی عظیم الشان کوٹھیوں اور بنگلوں پر مشتمل بستی تھی۔ ان بڑے بڑے سیٹھوں اور ساہو کاروں میں سے کئی کے کاروبار وغیرہ بمبئی یا کلکتہ جیسے بڑے بڑے شہروں میں پھیلے ہوئے تھے اور وہ یہاں رہتے بھی نہیں تھے۔ سال میں مہینے یا دو مہینے کے لئے آتے تھے اور آرام و عیاشی کر کے چلے جاتے تھے۔ ان کی کوٹھیاں عموماً خالی پڑی رہتی تھیں۔

میں اپنے خیالات میں مگن درمیانی رفتار سے جا رہا تھا۔ دفعتہً ایک کار تیز رفتاری سے میرے قریب سے نکلی اور کچھ آگے جا کر یوں ترچھی ہو کر رک گئی کہ میرے لئے گاڑی نکالنے کا راستہ نہ رہا۔ سڑک کے دونوں طرف سفیدے کے درختوں کی قطاریں تھیں جنھوں نے خاصی جگہ گھیر رکھی تھی۔ میں نے اس کار سے کافی فاصلے پر ہی اپنی گاڑی روک لی۔

وہ گہرے رنگ کی ایک بڑی سی اوپل تھی جس کے ایک دروازے پر پیلے رنگ کا بڑا سا دائرہ بنا ہوا تھا جو خاصا عجیب لگ رہا تھا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے کار کے دروازے کھلتے دیکھے۔ چار افراد کار سے کود کر نکلے۔ وہ تیزی سے میری طرف لپکے تو میں نے دیکھا کہ ان میں سے ایک دراز قامت لڑکی تھی جس کے تراشیدہ بال ایک لمحے کے لئے اس کے کندھوں پر لہرائے تھے' وہ چست' سفید ریشمی بلاؤز اور سیاہ برجیس پہنے ہوئے تھی' پیروں میں فل بوٹ تھے۔ عام طور پر بڑے بڑے سیٹھوں کی بیٹیاں اس حلیے میں شکار پر نکلتی تھیں۔ چاندنی میں اس کا ریشمی بلاؤز چمک رہا تھا۔ تینوں آدمی ڈھیلی ڈھالی سی پتلونوں اور ان سے مختلف رنگوں کے کوٹوں میں ملبوس تھے۔

میں اس وقت بھی اسٹیئرنگ پر ہاتھ رکھے بیٹھا تھا جب وہ میری گاڑی کے قریب پہنچے۔ لڑکی اور ایک مرد ڈرائیونگ سیٹ والی کھڑکی کی طرف تھے اور دو مرد دوسری کھڑکی پر تھے۔ لڑکی میرے قریب کھڑکی پر جھک گئی اور تب میں نے دیکھا کہ وہ کم عمر مگر بے پناہ حسین تھی' موٹی موٹی سیاہ آنکھیں' اونچی ستواں ناک اور بھرے بھرے ہونٹ .... اسے دیکھ کر کسی ایسے رسیلے پھل کا خیال آتا تھا جو وقت سے پہلے پک گیا ہو۔ سر سے پاؤں تک وہ کسی ماہر سنگتراش کا مجسمہ تھی۔

لڑکی کی قومیت کا اندازہ لگانا مشکل تھا بظاہر وہ یوریشین معلوم ہوتی تھی۔ لیکن جب وہ بولی تو اس کا لب و لہجہ خالصتاً ہندوستانی تھا۔

"مسٹر منصور!"۔ اس نے بڑی شائستگی سے کہا۔ "ہم آپ کو ایک چھوٹی سی زحمت دینا چاہتے ہیں۔ یہاں سے چند قدم کے فاصلے پر ایک کوٹھی ہے۔ آپ کو وہاں تک چلنا ہو گا صرف دس منٹ لگیں گے۔"

"اگر تم لوگ مجھے لوٹنے کا ارادہ رکھتے ہو۔" میں نے لڑکی کے ساتھیوں کے چہرے پر

نظر ڈال کر سرسری سے لہجے میں کہا۔ "تو میرا نہایت دیانتدارانہ اور دوستانہ مشورہ ہے کہ کوئی اور آسامی تلاش کر لو۔ میرے پاس اس وقت کوئی خاص رقم موجود نہیں ہے اور نہ ہی میں کوئی امیرزادہ ہوں۔"

لڑکی نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "ہم اتنے معمولی قسم کے اچکے نہیں کہ چند سو یا چند ہزار کی رقموں کے لئے یوں لوگوں کو راستے میں روکتے پھریں یا ان کے تعاقب میں چار چار پانچ پانچ گھنٹے ضائع کرتے پھریں۔"

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تمہیں میرا نام کیسے معلوم ہے؟" میں نے سیٹ پر پہلو بدل کر اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"آج شام شانتا رام آڈیٹوریم میں تمہارا مقابلہ دیکھنے کے لئے ہم بھی موجود تھے۔" لڑکی کا لہجہ اب قطعی دوستانہ سا ہو گیا تھا۔

"اب میں جاننا چاہوں گا کہ تم لوگوں کو مجھ سے کیا کام ہے اور کیا اس کے لئے میرا تمہارے ساتھ اس کوٹھی میں جانا ضروری ہے جس کا تم نے ذکر کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کام ہمیں نہیں ہمارے سیٹھ کو ہے جو بے چینی سے تمہارا انتظار کر رہا ہو گا' تمہارا مقابلہ دیکھنے کے لئے ہم اسی کے ساتھ گئے تھے اور مقابلہ ختم ہوتے ہی اس نے ہمیں ہدایت کی تھی کہ ہم تمہیں اس سے ملنے کی دعوت دیں لیکن اس وقت تم بہت زیادہ بھاگ دوڑ میں مصروف تھے۔ میرا خیال ہے اب ہمیں یوں سڑک پر کھڑے ہو کر باتوں میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے۔" لڑکی نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ "کوئی ادھر آ نکلا تو راستہ بند دیکھ کر خواہ مخواہ تجسس میں مبتلا ہو گا۔"

"تجسس میں تو میں بھی مبتلا ہو گیا ہوں۔" میں نے اپنے بے ترتیب بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ "کہ آخر تمہارے سیٹھ کو مجھ سے کیا کام ہے؟"

"کوئی خاص کام نہیں ...."۔ لڑکی اپنے ساتھی کی طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرائی۔ "دراصل ہمارا سیٹھ بہت نحیف و نزار آدمی ہے نا ...... شاید اسی لئے اسے ہر طاقتور اور خطرناک آدمی سے ملنے کا بڑا اشتیاق رہتا ہے۔"

"ہوں۔" میں نے غیر ارادی طور پر ٹھوڑی کھجائی۔

"فرض کرو کہ میں یہ کہوں کہ میں بہت تھکا ہوا ہوں اور اس وقت صرف اپنے گھر جانا چاہتا ہوں کسی اور کے نہیں تو پھر کیا ہو گا۔"

"پھر یہ ہو گا مسٹر منصور ...." دوسری کھڑکی کی طرف سے لڑکی کے ایک ساتھی کی آواز آئی اور میں نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا اس نے ایک بھدے سے ریوالور کی لمبی نال کھلی کھڑکی پر ٹکا دی تھی۔

"میں دروازہ کھول کر تمہارے برابر بیٹھوں گا اور پھر تم اطمینان سے چلو گے کیونکہ

اس ریوالور کی گولی جوڈو یا کراٹے کے کسی بھی داؤ سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔"

"اوہ!" میں نے بغور اس کی طرف دیکھا۔ اس کی رنگت سیاہی مائل، چہرہ چوڑا اور ہونٹ غیر معمولی طور پر موٹے تھے، اس کے رخساروں پر کئی دن کی بڑھی ہوئی شیو اور آنکھوں میں شاید شب بیداری کی سرخی تھی۔ اس کے چہرے پر زخم کا کوئی نشان نہیں تھا مگر نجانے کیوں اسے دیکھ کر خیال آتا تھا کہ وہ زندگی میں بارہا لڑا ہو گا اور اس نے بہت چوٹیں کھائی ہوں گی۔

"گویا تم لوگ .... ہر قیمت پر مجھے سیٹھ کے پاس لے جانے کا تہیہ کر کے آئے ہو؟" میں نے مسکرا کر پوچھا۔

مجھے خوفزدہ نہ پا کر شاید اسے کچھ مایوسی ہوئی گو کہ اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ میری تربیت نے شاید خوف کا عنصر میری جبلت سے ہی نکال پھینکا تھا۔ اس نے انتہائی بیزار لہجے میں کہا۔ "باتیں اب بہت ہو چکیں اب چلو سیٹھ ہمیں جو حکم دے، ہم اس کی تعمیل کئے بغیر اس کے سامنے جانے کے عادی نہیں ہیں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ ڈالا۔

عین اسی لمحے میرے بائیں ہاتھ نے نظروں کو دھوکا دینے والی تیزی سے حرکت کی اور اس کی ہلکی سی ضرب ریوالور کی نال پر پڑی جس کا بیشتر حصہ کھڑکی کے اندر تھا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے نکلا اور نیم دائرے میں گھوم کر کار کے فرش پر یوں آ گرا گویا کھڑکی کے راستے کسی سیاہ نیولے نے کار میں چھلانگ لگا دی ہو۔ لیکن میری اس حرکت سے صورتحال میں کوئی خاص فرق نہ پڑا۔ دائیں طرف سے لڑکی اور بائیں طرف سے اس کا ایک اور ساتھی انتہائی پھرتی سے پچھلے دروازے کھول کر عقبی نشست پر آ بیٹھے تھے اور اب ایک دوسرے ریوالور کی نال میری گدی سے آ لگی تھی۔

"ہماری خواہش تھی کہ ہم دوستانہ انداز میں چلتے۔" عقب سے لڑکی کی مترنم اور پرسکون آواز سنائی دی۔ "لیکن اب مجبوری آن پڑی ہے تو یوں ہی سہی ......"

"اور یہ خیال رکھنا۔" اس کے قریب سے اس کے ساتھی کی بیٹھی بیٹھی سی آواز سنائی دی۔ "کہ میرے ہاتھ سے ریوالور اتنی آسانی سے نہیں نکلتا جتنی آسانی سے جیکب کے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔"

جیکب بھی اگلا دروازہ کھول کر میرے برابر آ بیٹھا اور اس نے فرش سے اپنا ریوالور اٹھا کر میری پسلیوں سے لگا دیا۔ پچھلی سیٹ پر موجود لڑکی کے ساتھی نے اپنی بات جاری رکھی۔ "اور یہ بھی یاد رکھنا کہ میرے برابر میں جو قتالہ بیٹھی ہے۔ یہ صرف نظروں کے تیر چلانا ہی نہیں جانتی، زہر میں بجھا ہوا خنجر بھی بڑی عمدگی سے چلاتی ہے اور وہ خنجر اتفاق سے اس وقت تمہاری گردن سے صرف ایک سوت کے فاصلے پر ہے اور یہ فاصلہ اس لئے رکھا

گیا ہے کہ بعض اوقات اس خنجر کی محض نوک چھو جانے ہی سے انسان کے جسم میں زہر پھیل جاتا ہے اور شکنتلا تم جیسے کم سن، حسین اور توانا لڑکے کو کم از کم زہر کی موت مارنا پسند نہیں کرے گی۔ بشرطیکہ کوئی کڑی مجبوری نہ آن پڑے۔" وہ عجیب سے انداز میں ہنسا اس کی ہنسی بھی اس کی آواز کی طرح گھٹی گھٹی سی تھی۔

"ہنہ .... ہنہ"۔ میں نے تجسس آمیز لہجے میں کہا۔ "تمہارا انداز گفتگو نہایت نستعلیق ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آغا حشر کاشمیری کے زمانے کا کوئی ہیرو دوسرا جنم لے کر آ گیا ہے۔"

میں نے ونڈ سکرین کے اوپر لگے ہوئے عقب نما آئینے میں اس کے چہرے کی دھندلی سی جھلک دیکھی۔ اس کے چہرے کے عضلات کھنچے کھنچے سے تھے اور پتلے پتلے ہونٹ چوڑے جبڑوں پر کچھ زیادہ ہی پتلے معلوم ہو رہے تھے۔ کار کی چھت پر لگی ہوئی چھوٹی سی لائٹ آن تھی مگر روشنی چونکہ اوپر سے اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی، اس لئے اس کے بالوں کے سائے میں اس کی آنکھیں نظر نہیں آ رہی تھیں۔

"اب تو مجھے مجبوری سے زیادہ تجسس ہو چلا ہے کہ تمہارے سیٹھ سے مل ہی لیا جائے۔" میں نے آہستگی سے گیئر لگاتے ہوئے کہا۔ ان کا چوتھا ساتھی مطمئن ہو کر دوڑتا ہوا اپنی کار کی طرف چلا گیا۔

اگلی کار اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھی تو میں نے اپنی کار اس کے پیچھے لگا دی اسی سڑک پر تقریباً" آدھ فرلانگ چل کر اگلی کار بائیں طرف مڑ گئی۔ چند سیکنڈ بعد ہم ایک اور پتلی سی سڑک پر مڑے جو شارع عام نہیں تھی۔ بلکہ سیدھی لوہے کے ایک بلند و بالا سیاہ گیٹ کی طرف جا رہی تھی۔ یہ گیٹ جس کوٹھی کا تھا، وہ دوسری کوٹھیوں کی قطار سے بہت پیچھے ہٹ کر بنی ہوئی تھی۔ کوٹھی کیا تھی، ایک اچھا بھلا قلعہ تھا۔ مغلوں سے مستعار لئے ہوئے قدیم انگریزی طرز تعمیر کے مطابق .... دور سے یہ کسی پہاڑ کو تراش کر بنایا گیا ایک کوہ پیکر شاہی تاج معلوم ہوتی تھی۔

صنوبر کے بلندوبالا درختوں نے تقریباً" چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا مگر اس کی تکونی برجیاں اور غلام گردشوں کے گنبد دور سے سر اٹھائے ہوئے نظر آتے تھے۔

گیٹ کے سامنے پہنچ کر دونوں کاریں آگے پیچھے رکیں تو میں نے دیکھا کہ کوٹھی کی دور تک پھیلی ہوئی چار دیواری کنکریٹ کی تھی۔ آٹھ نو فٹ بلند اس دیوار پر مزید چار پانچ فٹ کی بلندی تک خاردار تاروں کا جال بچھا ہوا تھا اور یہ خار دار تار عام لوہے کے نہیں تھے۔ چاندنی میں المونیم کی طرح چمک رہے تھے۔ اگلی کار والے نے ہارن پر شاید ہلکا سا ہاتھ مارا تھا۔ سناٹے میں "بپ" کی مختصر سی آواز ابھری۔ دوسرے ہی لمحے گیٹ یوں ہموار اور بے آواز طریقے سے کھلتا چلا گیا گویا کسی عمدہ مشینی نظام کے تحت کام کرتا ہو یا پھر

سناٹے اور نیم تاریکی میں ڈوبی ہوئی اس پر شکوہ عمارت میں بسیرا رکھنے والی کچھ روحوں نے انہیں کھلنے کا اشارہ دیا ہو۔

اگلی کار پختہ روش پر چند گز آگے جا کر رک گئی۔ مجھے بھی گاڑی روکنا پڑی میں نے دائیں بائیں نظر ڈالی۔ پھولوں سے لدی کیاریوں اور سرسبز گھاس کے ہموار تختوں کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ پختہ روش کے دونوں طرف پاپلر کے درخت ایستادہ تھے جن کی بلندی میں بھی ایک ترتیب تھی۔ یعنی گیٹ کے قریب درخت چھوٹے تھے اور اصل عمارت کے برآمدے کی طرف بتدریج بلند ہوتے چلے گئے تھے۔ گیٹ کے قریب ہی اندر کی طرف دیوار کے ساتھ ہٹ نما ایک چھوٹا سا گیسٹ ہاؤس بھی تھا جیسا کہ عام طور پر بڑی بڑی اہم سرکاری عمارتوں میں ہوتا ہے جہاں آنے والوں کو شناخت کے لئے روکا جاتا ہے۔

کاروں کے رکتے ہی دونوں طرف سے دو باوردی محافظ لپکے ان کے ہاتھوں میں رائفلیں اور ٹارچیں تھیں۔ میری کار کی کھڑکیوں پر جھک کر انہوں نے ٹارچوں سے ہم سب کے چہروں پر روشنی ڈالی' معنی خیز انداز میں مسکرائے اور پیچھے ہٹ گئے۔ وہ دونوں ہی مرہٹے معلوم ہوتے تھے اور اونچے اونچے شملوں کے ساتھ ان کے قد سات فٹ سے بھی نکلتے دکھائی دے رہے تھے۔ دونوں کی شکلیں تو مختلف تھیں لیکن ایک ہی جیسی موٹی موٹی خمیدہ نوکیلی مونچھوں کی وجہ سے ان میں بڑی مشابہت نظر آتی تھی وہ دونوں پلٹ کر دوبارہ گیٹ کے قریب جا کھڑے ہوئے جو اب بند ہو چکا تھا۔

اگلی کار کے تعاقب میں چلتے ہوئے ہم پورچ میں پہنچ گئے جہاں کم از کم بیس کاریں کھڑی کرنے کی گنجائش تھی۔ انجن بند کر کے میں شکنتلا اور اس کے دونوں ساتھیوں کے گھیرے میں کار سے اتر آیا۔ اب میرا دھیان ان لوگوں کی طرف کم اور کوٹھی کی طرف زیادہ تھا۔ یہ جگہ واقعی کسی تخیل پرست کے خوابوں کا مسکن معلوم ہوتی تھی۔ سنگ مرمر کی چند سیڑھیاں عبور کر کے ہم برآمدے میں پہنچے۔ شکنتلا کا وہ ساتھی جسے جیکب کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا' سب سے آگے تھا۔ ساگوان کے اونچے منقش اور محرابی دروازے کے قریب ہی ایک سرخ ریشمی ڈوری ہوا میں جھول رہی تھی جیکب نے اس کا خوبصورت پھندنا پکڑ کر اسے ہلکا سا جھٹکا دیا اور اندر کہیں ہلکی سی مترنم گھنٹی گونج اٹھی۔

چند سیکنڈ بعد ایک باوردی ملازم نے دروازہ کھولا اور تب میں نے دیکھا کہ ساگوان کے اس بھاری بھرکم دروازے کی موٹائی کسی قلعے کے دروازے سے کم نہ تھی۔ جیکب کو دیکھ کر ملازم نے جھک کر تعظیم دی اور ایک طرف ہٹ گیا۔

ہم جس کمرے میں داخل ہوئے۔ یہ ایک طویل و عریض نشست گاہ تھی۔ فرش پر بچھے قالین میں پاؤں دھنسے جا رہے تھے۔ اور چھت میں آویزاں بھاری برقی فانوسوں کی جگمگاہٹ سے آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں۔ ہمارے عقب میں باوردی ملازم نے بھاری بھرکم

دروازے کو ہلکا سا دھکا دیا اور وہ کلک کی معمولی سی آواز کے ساتھ بند ہو گیا۔ ملازم نے دروازے کے تالے سے لمبی سی خوبصورت نقرئی چابی نکال کر جیب میں ڈالی اور مڑ کر خصوصاً" میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ شکنتلا نے اب اپنا خنجر اپنے فل بوٹ میں بنی ہوئی کسی خفیہ نیام میں رکھ لیا تھا۔ جیکب اور دوسرے آدمی نے ریوالور جیب میں رکھ لئے تھے۔ شاید اس لئے کہ باہر جانے کا دروازہ مقفل ہو چکا تھا۔

جیکب نے باوردی ملازم کو کوئی اشارہ کیا اور وہ ایک دروازہ کھول کر کسی متصل کمرے میں چلا گیا۔ چند لمحے بعد اس دروازے کے عقب سے جو شخص نمودار ہوا' اسے دیکھ کر ایک لمحے کے لئے مجھے گمان گزرا کہ شاید وہ کسی سرکس کا مسخرہ ہے جو اس وقت سوٹ پہن کر سامنے آگیا ہے۔ اس کا قد بمشکل پانچ فٹ رہا ہو گا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ امیزون کے جنگلات میں رہنے والے بعض قدیم قبائل اپنے دشمنوں کو ہلاک کرنے کے بعد ان کی کھوپڑیوں کو کسی کیمیائی عمل سے چھوٹا کر کے اپنی فتح کی ٹرافیوں کے طور پر محفوظ کر لیتے تھے۔

اس شخص کا چہرہ ایسی ہی کسی کھوپڑی کی زندہ مثال تھا۔ نہایت مختصر سا چہرہ اور سر پر چھوٹے چھوٹے بال جو گلہری کی دم کے بالوں کی طرح سیدھے کھڑے تھے۔ اس کی آنکھیں چہرے ہی کی مناسبت سے چھوٹی چھوٹی اور زرد تھیں لیکن ان میں ایک حیرت انگیز چمک تھی اور ان آنکھوں پر شاید پلکیں تھیں ہی نہیں' اس کے جسم پر سلک کا سیاہ سوٹ تھا جو کئی دن سے پہنا ہوا لگتا تھا یا پھر اس پر اچھی طرح استری نہیں کی گئی تھی' سفید قمیض کے چھوٹے چھوٹے کالر اوپر کو اٹھے ہوئے تھے اور ان کے درمیان ایک چوڑی سی ٹائی جھول رہی تھی۔ اس کا بالائی ہونٹ کسی اعصابی مریض کی طرح ایک لمحے کے بعد پھر اٹھتا تھا اور اس کی نہایت باریک ترشی ہوئی مونچھیں یوں دکھائی دینے لگتی تھیں گویا کسی بچے نے ہلکی روشنائی سے ٹیڑھی میڑھی لکیر لگا دی ہو۔

اس شخص کو دیکھ کر مجھے اتنی حیرت نہیں ہوئی تھی جتنی یہ دیکھ کر ہوئی کہ شکنتلا اور اس کے تینوں ساتھی اس کے احترام میں تقریباً" رکوع کی سی حالت میں جھک گئے تھے۔ کئی لمحے بعد انہوں نے سر اٹھایا اور مجھ سے کافی پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔

"احسان مرزا تمہیں اپنے گھر میں خوش آمدید کہتا ہے نوجوان!"۔ اس شخص کی آواز نے مجھے ایک لمحے کے لئے مزید حیران کر دیا کیونکہ اس کے مختصر وجود کی مناسبت سے مجھے توقع تھی کہ اس کے حلق سے نہایت باریک اور منمناتی ہوئی سی آواز برآمد ہو گی لیکن اس کے برعکس اس کی آواز نہایت پاٹ دار' گونجیلی تھی' چونکا دینے والی اور مرعوب کر دینے والی آواز......

"شکریہ۔" میں نے خشک لہجے میں کہا۔ "لیکن میں اس بلاوے کا مقصد جاننا چاہتا

ہوں۔"

"مقصد بھی معلوم ہو جائے گا۔" اس نے اپنی بے پلک آنکھیں جھپکائے بغیر سر تا پا میرا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ میں ابھی تک اسی ڈھیلے ڈھالے سفید لبادے میں تھا جو میں نے مقابلے کے وقت پہنا تھا۔ "بیٹھو تو سہی۔" اس نے وکٹورین اسٹائل کے ایک شاندار صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ پھر اپنے گرگوں سے مخاطب ہوا۔ "تم لوگ اب جاؤ۔"

وہ چاروں باہر جانے کے بجائے وہی دروازہ کھول کر اس کے عقب میں غائب ہو گئے جدھر سے احسان مرزا آیا تھا۔ احسان مرزا کے دوبارہ کہنے پر میں صوفے پر بیٹھ گیا بلکہ یوں کہیے کہ دھنس گیا اور وہ بھی محض محاورتاً" نہیں حقیقتاً" .... احسان مرزا میرے مقابل بیٹھا تھا ہمارے درمیان شیشے کی ایک بیضوی تپائی تھی جس پر کرسٹل کی ایک بڑی سی ایش ٹرے رکھی تھی جس کے پیندے پر موٹے موٹے حروف میں "فرانس" لکھا تھا۔ فانوسوں کی جھلملاتی روشنی میں یہ ایش ٹرے ایک بڑے سے ہیرے کی طرح جگمگا رہی تھی۔

قریب ہی ایک منقش سگار بکس پڑا تھا۔ احسان مرزا نے اس بکس میں سے ایک موٹا سا سگار اور پتلی سی چمکیلی چھری نکالی۔ سگار کا ایک سرا تراشا اور اسے سلگا کر ایک کش لیتے ہوئے کہا۔

"بات یہ ہے منصور!" اس کا لہجہ ایسا ہی تھا جیسے وہ میرا بڑا پرانا شناسا ہو۔ "کہ مجھے انمول چیزیں جمع کرنے کا بہت شوق ہے جن میں زندہ انمول چیزیں بھی شامل ہیں۔ میرا مطلب ہے انسان ...." وہ سگار کا ایک اور گہرا کش لے کر مسکرایا۔ میں ہونٹ بھینچے خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چھوٹے سے چہرے کے ساتھ بڑا سا سگار نہایت عجیب لگ رہا تھا۔



"بعض لوگ اپنے کمالات کی بنا پر انمول ہوتے ہیں۔" اس نے مزید کہا اور ناک سے یوں سوں کی آواز نکالی گویا اسے پرانا زکام ہو۔ "اور تم بھی انہی میں سے ایک ہو اس کمسنی میں تمہارے جیسی شہ زوری میں نے کہیں نہیں دیکھی۔ حالانکہ مجھے اکثر و بیشتر ایسی چیزیں دیکھنے کا اتفاق ہوتا رہتا ہے جنہیں عام لوگ کم ہی دیکھ پاتے ہیں ...... ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ اپنے کمال فن کی بناء پر تم بھی ایک انمول انسان ہو اور میں اس دنیا میں انمول انسانوں کا سب سے بڑا قدر دان ہوں۔"

"میں کم عمر اور دنیاوی معاملات میں خاصا ناتجربہ کار ہوں۔" میں نے کہا۔ "لیکن جہاں تک میرا خیال ہے ہر انسان انمول ہوتا ہے۔"

"ایسا نہیں ہے۔" اس نے ایک بار پھر ناک سے سوں کی آواز نکالی۔ "اس دنیا میں کثرت ایسے انسانوں کی ہے جن کا متبادل نہایت آسانی سے مل جاتا ہے۔ زید مرجائے تو بکر اس کی جگہ سنبھال لیتا ہے اور بکر کہیں چلا جائے تو کوئی اور اس کا کام انجام دے سکتا ہے۔ انمول وہ ہوتا ہے جس کا ثانی یا تو موجود ہی نہ ہو اور اگر ہو تو بڑی مشکل سے ملے۔"

مجھے اس کی باتوں سے اکتاہٹ ہونے لگی تھی اور پھر اس کی سوں سوں بھی مجھے اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ دفعتہً" اس نے کوٹ کی جیب سے ایک نہایت سستا سا رومال نکالا اور اس سے ناک رگڑنے لگا۔ کمرے میں چنبیلی کی بوجھل خوشبو پھیل گئی۔ غالباً" رومال پر خاصی مقدار میں چنبیلی کا عطر لگا ہوا تھا۔ اب تک میں نے اس گھر میں جو بھی چیز دیکھی تھی وہ نہایت اعلیٰ اور نفیس ذوق کی مظہر تھی لیکن مسٹر احسان مرزا کے لباس، رومال اور اس سے پھوٹتی ہوئی خوشبو کے بوجھل پن نے مجھے بڑا مایوس کیا تھا۔ چنبیلی کی خوشبو استعمال کرنے کا اگر کسی کو اتنا شوق ہی ہو تو اسے کم از کم اتنا تو معلوم ہونا ہی چاہیے کہ یہ خوشبو جتنی ہلکی ہو اتنی ہی بھلی لگتی ہے۔ شاید احسان مرزا کے زکام کی وجہ بھی اس خوشبو کی کثرت تھی۔

"کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ دنیا کی صرف دو ہی چیزیں ایسی ہیں جن پر ابھی تک میرا اختیار نہیں۔" اس نے رومال گود میں رکھتے ہوئے کہا۔

"ایک تو میری بڑھتی ہوئی عمر اور دوسرے میرا زکام۔ میری زندگی کے سترہ برس سمندر میں گزرے ہیں لیکن اس دوران مجھے ایک مرتبہ بھی زکام نہیں ہوا۔ گیارہ سال کی عمر میں میں تین روپے مہینے پر ایک لانچ پر ملازم ہوا تھا اور اس کے بعد سترہ سال تک میری زندگی کے شب و روز سمندر میں گزرے ...... خیر چھوڑو ان باتوں کو ...... یہ بتاؤ کچھ پیو گے؟ اس گھر میں دنیا کا تقریباً" ہر مشروب مل سکتا ہے۔"

"میں یہاں مشروب پینے نہیں آیا۔" میں نے پہلے سے زیادہ اکھڑے اکھڑے لہجے میں کہا۔ "میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ مجھے یہاں کیوں بلایا گیا ہے اور جس انداز سے مجھے یہاں لایا گیا ہے اس میں تمہارے کسی آدمی کی جان بھی جا سکتی تھی۔ اگر میں نہ آنا چاہتا تو ......"

"مجھے یقین ہے۔" اس نے تائید میں سرہلایا۔ "لیکن اس میں میرے آدمیوں کا کوئی قصور نہیں میں نے انہیں حکم دیا تھا کہ میں ہر حال میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"اب کسی گھماؤ پھراؤ اور فلسفے کے بغیر اگر اصل بات ہو جائے تو بہتر ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے کافی دیر پہلے گھر پہنچ جانا چاہئے تھا۔"

"صاف اور سیدھی بات یہ ہے کہ میں تم کو ایک پیش کش کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے اپنا چھوٹا سا سر صوفے کے پشتے پر ٹکاتے ہوئے کہا۔ "اسے تم ایک طرح سے ملازمت کہہ سکتے ہو لیکن تمہیں اتنی عزت اور اتنا پیسہ ملے گا جتنا ملازموں کو تو کیا بعض مالکوں کو بھی نہیں ملتا ...... بیس ہزار روپے ماہانہ۔"

بیس ہزار روپے فی زمانہ اتنی بڑی رقم تھی کہ یہ پیش کش سن کر ایک لمحے کے لئے مجھ جیسے بے نیاز انسان کا منہ بھی حیرت سے کھل سکتا تھا لیکن سردست یہ مجھے مذاق ہی لگا تھا۔ اس لئے میں نے فوری طور پر کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا بلکہ بات کی تہہ تک پہنچنے کے لئے پوچھا۔ "اور میرا کام کیا ہو گا؟"

"بیس ہزار روپے ماہانہ اتنی معقول رقم ہے کہ اس کے بعد کام کے سلسلے میں سوالات کی گنجائش نہیں رہنی چاہئے۔" اس نے پھڑپھڑاتے ہونٹوں سے سگار نکال کر کہا۔ "لیکن تمہاری تسلی کے لئے بتا دوں کہ کسی بھی کام کے لئے تمہاری ضرورت پڑ سکتی ہے تاہم تمہارا بنیادی کام میری حفاظت کرنا ہو گا۔"

"کیا ان بلند و بالا مضبوط دیواروں اور مسلح محافظوں کے درمیان رہ کر بھی تمہیں خوف اور جان کا خطرہ محسوس ہوتا ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"دیواریں جتنی بلند ہوتی جائیں' خوف و خطرات اتنے ہی بڑھتے جاتے ہیں۔ تم نے کبھی کسی جھونپڑی کے دروازے پر دربان نہیں دیکھے ہوں گے۔" اس نے اپنے سوتی رومال سے اپنی پتلون پر سے کوئی غیر مرئی گرد جھاڑی۔ "بیسیوں دیدہ نادیدہ انسان میری

حفاظت کرتے ہیں۔ بڑے بڑے سرکاری افسر مجھے آنے والے خطرات سے قبل از وقت آگاہ کرتے ہیں۔ اس شہر کے ہی نہیں اور بھی بڑے بڑے شہروں کے نامی گرامی بدمعاشوں اور خطرناک ترین آدمیوں کا میرے ہاں سے وظیفہ بندھا ہوا ہے اور ضرورت پڑنے پر ان میں سے کوئی بھی میرے ایک اشارے پر دوڑا چلا آتا ہے۔ بڑے بڑے سیاست دان رات کے اندھیرے میں میری چوکھٹ پر پیشانی رگڑنے آتے ہیں ...... اور اپنی لیڈری چمکانے کے لئے انہوں نے جو مہمیں شروع کر رکھی ہوتی ہیں۔ ان کے سلسلے میں مجھ سے مدد مانگتے ہیں' ان گنت لوگ مجھ سے ڈرتے ہیں' میرا نام سن کر کانپتے ہیں ...... پھر بھی مجھے نہ جانے کس بات کا خوف رہتا ہے۔ تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ میں اندھیرے میں نہیں سو سکتا۔ تیز روشنی میں سوتا ہوں۔ کھانا کھانے لگتا ہوں تو پہلے ہر چیز کا ایک ایک نوالہ کسی خادمہ کو کھلا کر دیکھتا ہوں' مجھے اب بھی اپنی حفاظت کرنے والوں کی تعداد کم لگتی ہے۔ مجھے انوکھی قسم کی طاقتیں رکھنے والے جرات مندوں کی تلاش رہتی ہے۔ آج میں نے تمہارا مقابلہ دیکھا ...... اور یہ اتفاق ہی تھا کہ میں اس مقابلے میں چلا گیا بہرحال وہاں تمہاری طاقت اور پھرتی کا مظاہرہ دیکھ کر مجھے ایک عجیب سی خوشی محسوس ہوئی اور تم پر نہ جانے کیوں کچھ پیار سا آیا جیسے تم میرے بچھڑے ہوئے بیٹے ہو حالانکہ میں نے کبھی شادی ہی نہیں کی اور مجھے اندیشہ ہے کہ اگر میں نے شادی کی تو میری اولاد بھی میری طرح مختصر الوجود اور مضحکہ خیز نہ ہو۔ مختصراً" بات اتنی ہے کہ میں تمہیں اپنے خاص الخاص آدمیوں میں سرفہرست دیکھنا چاہتا ہوں۔ تمہاری تنخواہ اور مرتبہ میرے تمام آدمیوں سے بلند ہو گا۔ بولو کیا کہتے ہو؟"

"اگر اس محل نما گھر کے بجائے وہ مجھے کہیں اور ملا ہوتا تو شاید اس کی باتیں مجھے دیوانے کی بڑ معلوم ہوتیں اس کے لہجے کی صداقت سے زیادہ یہ ماحول کا اثر تھا کہ وہ مجھے سچا لگ رہا تھا لیکن میرے لئے ان باتوں میں کوئی خاص کشش نہ تھی۔ اگر میں عملی زندگی میں آ چکا ہوتا اپنی ضروریات کی ذمے داری مجھ پر ہوتی تو شاید یہ ترغیب اور روپے پیسے کی کشش میرے لئے کوئی اہمیت رکھتی۔"

"مسٹر احسان مرزا۔" میں نے نپے تلے الفاظ میں کہا۔ "بڑی عجیب سی بات ہے کہ ہمارے درمیان اتنی باتیں ہو چکی ہیں مگر مجھے ابھی تک صحیح طور پر یہ معلوم نہیں ہے کہ تم کون ہو اور کیا کرتے ہو؟"

"کیا ......؟" وہ بندر کی طرح اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ "گویا تم احسان مرزا کو نہیں جانتے جسے پورا ہندوستان جانتا ہے؟ کونسے تہہ خانے میں زندگی گزاری ہے تم نے؟" وہ بے چینی سے ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ اس کے استخوانی ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پیوست تھیں۔

"دراصل مجھے کبھی غیر ضروری باتوں پر توجہ دینے کی مہلت نہیں مل سکی۔" میں نے سکون سے کہا۔ "اپنی پڑھائی اور چند ایک فنون کی تربیت حاصل کرنے کے علاوہ میرا دھیان کسی طرف نہیں رہا۔"

"اوہ!" اس نے میری طرف دیکھ کر گہری سانس لی اور دھم سے میرے مقابل دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا اور چند لمحے کی خاموشی کے بعد بولا۔ "ہاں تو پھر میری پیش کش کے سلسلے میں تمہارا کیا جواب ہے؟ یہ بھی یاد رکھنا کہ تنخواہ کے علاوہ دنیا کی ہر آسائش بھی تمہیں میرے ہاں میسر ہوگی۔"

"مجھے افسوس ہے کہ فی الحال میں یہ پیش کش قبول نہیں کر سکتا۔" میں نے آہستگی سے کہا۔ "اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ مجھے آگے پڑھنا ہے۔ دوسرے میرا خیال ہے کہ میری ممی بھی مجھے اس عجیب و غریب قسم کی نوکری کی اجازت نہیں دیں گی۔ ان کا حکم ہے کہ فی الحال میں اپنی پڑھائی اور جسمانی تربیت میں کمال حاصل کرنے کے علاوہ کسی چیز کے بارے میں نہ سوچوں۔"

"بڑا حکم مانتے ہو ماں کا؟" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ "میرا اندازہ ہے کہ ماں کا حکم ماننے میں بھی ایک عجیب سی مسرت پنہاں ہوتی ہوگی گوکہ میں اس مسرت سے ناآشنا ہوں کیونکہ میری ماں دسمبر کی ایک یخ بستہ رات کو بمبئی کے فٹ پاتھ پر مجھے جنم دیتے ہوئے مرگئی تھی۔" قدرے توقف کے بعد اس نے چونک کر پوچھا۔ "کس قسم کی ہے تمہاری ماں؟ کیسی طبیعت پائی ہے اس نے؟"

"فرشتوں جیسی۔" میں نے جواب دیا۔

"پھر اس سے اجازت مت مانگنا، کیونکہ فرشتے احسان مرزا کو کچھ زیادہ پسند نہیں کرتے۔ سوائے موت کے فرشتے کے۔" اس نے رومال سے ناک رگڑی اور ایک لمحے کے توقف کے بعد بولا۔ "اس بات کو یہیں ختم سمجھو اور کسی سے اس بات کا تذکرہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ جب تم خود مختار ہو جاؤ اور میں اس وقت زندہ رہوں تو ایک بار مجھ سے ضرور ملنا یا اس سے پہلے کبھی تمہیں میری ضرورت پڑے تو مجھے ضرور یاد کر لینا۔ میرے گھر کے دروازے تمہارے لئے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔"

"وہ گویا بات ختم کرکے اٹھ کھڑا ہوا ...... میں بھی اس کے ساتھ اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ اس لمحے وہی باوردی ملازم کمرے میں آگیا ہم سے پہلے آگے بڑھ کر اس نے نقرئی کنجی سے دروازے کا تالا کھولا اور ایک پٹ وا کرکے مودبانہ انداز میں ایک طرف کو ہٹ گیا۔ دروازے پر پہنچ کر احسان مرزا نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ میری چوڑی ہتھیلی اور موٹی موٹی انگلیوں کے درمیان اس کا ہاتھ کسی ننھی سی چڑیا کی طرح نرم و نازک ہرگز نہیں تھا، لکڑی کا کوئی تراشیدہ ٹکڑا معلوم ہوتا تھا۔"

میں برآمدے میں نکل آیا اور اس پراسرار کائنات کا دروازہ میرے عقب میں کلک کی ہلکی سی آواز کے ساتھ بند ہوگیا۔ پورچ میں آکر میں اپنی کار کی طرف جا رہا تھا تو میں نے سیڑھیوں کے پرلی طرف المونیم کے رنگ کی ایک رولز رائیس کھڑی دیکھی۔ انڈیا میں رولز رائیس آج بھی شاید چند ہی لوگوں کے پاس ہو۔ اس وقت تو وہ شاذو نادر ہی نظر آتی تھی۔ رولز رائیس کی ساخت بھی عام گاڑیوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوتی تھی لیکن اس کا سائز کچھ بڑا ہوتا تھا اور نہ جانے کیوں وہ سب سے الگ تھلگ ہی نظر آتی تھی۔

اسے دیکھ کر ایک عجیب سے دبدبے کا احساس ہوتا تھا۔ میں نے شہر میں ایسی دو تین گاڑیاں دیکھی تھیں۔ مجھے اور کسی بھی چیز کا کوئی خاص شوق نہیں رہا تھا لیکن نجانے کیوں رولز رائیس دیکھ کر میں مبہوت ہو جاتا اور اکثر سوچا کرتا تھا کہ جب بھی میرے پاس پیسہ آیا سب سے پہلے ایک رولز رائیس خریدوں گا۔ اس وقت مدھم روشنی میں جھلملاتی اس گاڑی کو دیکھ کر ایک لمحے کے لئے میرا دل چاہا کہ دوبارہ اندر جاؤں اور احسان مرزا سے پوچھوں کہ بے شک مجھے اس کی مستقل ملازمت والی پیش کش قبول نہیں لیکن کیا وہ کسی چھوٹے موٹے کام کے عوض ایک عدد رولز رائیس میری خدمت میں پیش نہیں کر سکتا؟

اپنے اس خیال پر میں خود ہی ہولے سے ہنس دیا اور اپنی مورس کی طرف بڑھ گیا۔

ابھی میں نے انجن اسٹارٹ نہیں کیا تھا کہ پچھلی سیٹ سے ایک شناسا آواز سنائی دی۔ "ٹھہر جاؤ، جان من! ایسی بھی کیا جلدی ہے؟"

میں چونک کر مڑا تو پچھلی سیٹ پر شکنتلا ایک ہاتھ سر کے نیچے اور ٹانگ پر ٹانگ رکھے لیٹی نظر آئی۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور وہ پھرتی سے اٹھ بیٹھی۔ میرے کندھے کے قریب سیٹ کے پشتے پر دونوں بازو رکھ کر اور ان پر ٹھوڑی ٹکا کر اس نے سرگوشی سی کی۔ "کچھ بات بنی؟"

"کیسی بات ......؟" میں نے گردن ترچھی کرکے اسے گھورا۔

"اس نے تمہیں ملازمت کی پیش کش کی ہوگی۔ کتنی تنخواہ کہی تھی اس نے؟ اور تم نے کیا جواب دیا؟" اس نے ایک ہی سانس میں کہا۔ اب وہ انگریزی میں باتیں کر رہی تھی۔

"بیس ہزار روپے ماہانہ۔" میں نے بتایا۔ "اور میں نے انکار کر دیا۔"

"بیس ہزار روپے ماہانہ؟" اس کی گویا اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے رہ گئی۔ "اتنی قیمت تو اس نے میری صلاحیتوں کی بھی نہیں لگائی تم نے انکار کیوں کر دیا؟"

"فی الحال مجھے ملازمت کی ضرورت نہیں۔" میں نے تنفرا" کہا۔

"آہ ......" اس نے سر اٹھا کر ایک گہری سانس لی اور اپنے تراشیدہ ریشمی بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ "یہ ضرورت اور عدم ضرورت بھی کیا چیز ہے۔ ضرورت بعض اوقات

انسان کو وہ وقت کی روٹی کے عوض بکنے پر مجبور کر دیتی ہے اور عدم ضرورت کبھی کبھی بیس ہزار روپے ماہانہ کو بھی خاطر میں نہیں لاتی ...... خیر یہ بتاؤ کہ اس نے تمہارا انکار صبر و سکون سے سن لیا اور تمہیں یوں آسانی سے جانے دیا۔؟"

"تو اور وہ کیا کر سکتا تھا؟" میں نے پہلو بدل کر اسے گھورا۔

"اوہ ابھی تم اتنے کم سن اور کم علم ہو کہ تمہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ احسان مرزا کسی کے منہ سے انکار سننے کے بعد کیا کر سکتا ہے۔"

اس نے شاطرانہ شرارت سے میرے رخسار پر انگلی پھیری اور میں نے چہرہ پیچھے ہٹا لیا۔ میرے کانوں کی لویں گرم سی ہو گئیں ...... مجھے بدکتے دیکھ کر وہ دبی دبی آواز میں ہنس پڑی' پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے ایک گہری سانس لی اور بولی۔ "ویسے آ ہی جاتے تو اچھا تھا کم از کم یہاں ایک ترو تازہ چہرہ تو دیکھنے کو ملتا۔ میں تو وہی پرانے' بے ہنگم اور سڑے بسے چہرے دیکھ کر بیزار ہو چکی ہوں اور ان میں سب سے ناقابل برداشت چہرہ احسان مرزا کا ہے۔"

"پھر تم چلی کیوں نہیں جاتیں؟" میں نے سادگی سے کہا ...... لیکن اس سادگی میں خاصی حد تک اداکاری کو دخل تھا۔

"ہائے بھولے بادشاہ!" اس نے سر کو خفیف سا جھٹکا دیا۔ "اچھا ہی ہوا تم نے ان بھول بھلیوں میں قدم نہیں رکھا۔ تم تو بہت ہی معصوم ہو۔"

"مجھے بتاؤ تو سہی آخر یہ چکر کیا ہے؟ احسان مرزا کون ہے اور کیا کرتا ہے' تم کس طرح یہاں آئی تھیں اور اتنی بیزاری کے باوجود یہاں سے کیوں نہیں جاتیں؟" میں نے تجسس سے پوچھا لیکن اس نے میرے تجسس کو ہلکی سی ہنسی میں اڑا دیا۔

"یہ بڑی لمبی کہانی ہے پیارے شہزادے؟ وقت تمہیں رفتہ رفتہ خود ہی ساری کہانیاں سنا دے گا' ساری گتھیاں کھول دے گا۔ دھیرے دھیرے ایسے سب معمے خود بخود تمہاری سمجھ میں آنے لگیں گے۔" اس نے میرے رخسار پر تھپکی دی۔ "اب تم جاؤ اس سے پہلے کہ گھر کا راستہ بھول جاؤ خدا حافظ" اس نے باآواز طریقے سے کار کا دروازہ کھولا اور گویا نیچے پھسل گئی۔

میں نے اسے پورچ کے دوسرے حصے کی طرف جاتے دیکھا پھر یک بیک وہ نہ جانے کہاں غائب ہو گئی۔ گاڑی میں ابھی اس کے وجود کی مدھم سی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ ایک لمحے کے لئے میں ونڈ اسکرین پر نظریں جمائے ساکت بیٹھا رہا۔ پھر میں نے چونک کر ہلکی سی جھرجھری لی اور ہر بات کا خیال کو ذہن سے جھٹک کر گاڑی اسٹارٹ کر کے گیٹ کی طرف چل دیا۔

مین روڈ تک پہنچتے پہنچتے میں فیصلہ کر چکا تھا کہ احسان مرزا سے میری ملاقات محض

ایک بے معنی خواب تھی اور مجھے کسی سے تذکرہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ میری طبیعت بھی کچھ اس قسم کی تھی۔ جب میں کسی بات کو ذہن سے جھٹک دینے اور فراموش کر دینے کا فیصلہ کر لیتا تھا تو پھر وہ واقعی میری سوچوں کی کائنات سے نکل جاتی تھی ...... مجھے پریشان نہیں کرتی تھی۔

میں نے ممی سے بھی اس واقعہ کا تذکرہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ میرا میٹرک کا رزلٹ آیا تو میں نے کالج میں داخلہ لے لیا۔ ممی نے میرے لئے واڈیا کالج کا انتخاب کیا تھا ...... انہی دنوں تقسیم ہند کا اعلان ہو گیا اور ہندوستان کے بیشتر علاقوں میں مسلم کش فسادات کا ایک لرزہ خیز سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہمارا علاقہ فسادات سے تقریباً محفوظ ہی رہا۔ لیکن ہجرت کر کے جانے والوں کے قتل عام اور بربادی کی خبریں سن سن کر دل خون کے آنسو روتا تھا۔ قیام پاکستان کے اعلان سے ایک روز قبل ممی سے میری ملاقات ہوئی اور میں نے ان سے پوچھا تھا کہ ہمیں یہیں رہنا ہو گا یا پاکستان جانا ہو گا۔

"ہمارا یہیں رہنا ضروری ہے بیٹا!" انہوں نے جواب دیا تھا۔

"یہاں ہمارے بہت سے ضروری کام باقی ہیں جنہیں نمٹائے بغیر ہم نہیں جا سکتے' ہمیں چار پانچ سال اور لگیں گے اس وقت تک تم بی اے بھی کر لو گے۔ تمہاری گریجویشن تک میں کوئی قدم اٹھانا نہیں چاہتی۔ اس وقت تک تم اطمینان اور سکون سے سر جھکائے وقت گزارو اور کسی سے بھی الجھنے سے گریز کرو۔ گریجویشن کے بعد تمہیں مزید تعلیم حاصل کرنی ہے۔ لیکن اس وقت تک میرے تفکرات کچھ کم ہو چکے ہوں گے ...... اور تم بتدریج وہ اہم کام شروع کر دو گے جو میں تمہیں بتاؤں گی لیکن سروست میں نہیں چاہتی کہ جو پروگرام میں نے ذہن میں مرتب کر رکھا ہے اس میں کوئی خلل پڑے۔"

"جیسے آپ کا حکم۔" میں نے کہا۔

تقسیم ہند کے بعد تقریباً چھ سات ماہ تک صحیح معنوں میں زندگی معمول پر نہیں آئی۔ کالج تو تقریباً ایک ماہ بعد ہی کھل گئے تھے لیکن ماحول میں بڑی تبدیلی آ چکی تھی۔ تغیرات نے برسوں کا فاصلہ دنوں میں طے کر لیا تھا۔ واڈیا کالج میں بیشتر طلباء و طالبات اور اساتذہ سلجھے ہوئے انسان تھے لیکن ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل ہو چکی تھی۔ بہرحال وقت قدرے ہمواری میں گزر رہا تھا۔

فورتھ ایئر میں آنے تک میری زندگی میں کوئی خاص واقعہ رونما نہیں ہوا۔ کالج کے چھوٹے موٹے ہنگامے' تقریبات اور میرے ذاتی معمولات کے تحت زندگی گزر رہی تھی۔ کالج کی چند ایک تقریبات میں میرے بے حد اصرار پر ممی نے بھی شرکت کی تھی اور میرے کلاس فیلو لڑکے اور لڑکیاں ان سے مل کر بے حد متاثر ہوئے تھے۔ لڑکیاں تو مجھ سے بھی کئی متاثر ہوئی تھیں اور کئی ہاتھ میری طرف بڑھے بھی تھے۔ لیکن نجانے کیا بات تھی

کہ کوئی نظروں میں جچا ہی نہیں تھا۔

کوئی لڑکی مجھے بے وقعت بے ہنگم اور ناسمجھ سی بچی لگتی تھی اور کوئی ہسبنڈ ہنٹنگ پر نکلی ہوئی شکارن لگتی تھی، کوئی محض افسانوی رومان کی متلاشی لگتی تھی۔ کوئی ڈال ڈال پر اڑنے والی تتلی لگتی تھی اور کوئی اپنی ہی ذات کے خول میں بند سہمی ہوئی ہرنی ...... کسی کی صورت ذہن کو نہیں جچتی تھی اور کسی کی عادت، میں کوشش بھی کرتا تو کسی سے گھل مل نہ پاتا۔ چند دن کسی سے گفتگو رہتی اور پھر یک لخت وہ دل سے اتر جاتی۔ کبھی کبھی مجھے خود پر غصہ آتا کہ میں بھی دوسروں کی طرح تعلیم کے ساتھ ساتھ ماحول کی دلکشی سے مستفید کیوں نہیں ہوتا۔

میرے خیالات کی اپنی ہی ایک الگ دنیا تھی جس میں ایک بے عنوان سا سناٹا چھایا تھا۔ کبھی کبھی سوچوں کی پگڈنڈی پر دھندلا سا سایہ لہراتا اور کوئی ان دیکھی سی پائل چھنکا کر غائب ہو جاتا۔ کبھی اس کی بانہوں کی چاندی، کبھی اس کے پلکوں کے سائے، کبھی اس کی آنکھوں کی جھلملاہٹ، کبھی اس کے رخساروں کی آنچ، کبھی اس کے سانسوں کی خوشبو اور کبھی اس کے لہجے کی کھنک میرے حواس پر دستک سی دیتی تھی۔ لیکن اس کی صورت کبھی مکمل نہ ہونے پائی۔ نہ جانے وہ کون تھی، کیسی تھی، کہاں تھی لیکن مجھے اتنا احساس تھا کہ کوئی ایسی ہستی ہے ضرور جس کا مجھے انتظار ہے اور کبھی نہ کبھی آئے گی۔

اسی روز میں نے کلاس روم میں لڑکیوں والی سائیڈ پر ایک ڈیسک پر ایک نئے چہرے کا اضافہ دیکھا اور میرے ذہن میں چھناکا سا ہوا۔ کلاس ابھی شروع ہوئی تھی اور انگلش کے پروفیسر منوہر لال کمرے میں داخل ہوئے ہی تھے انہوں نے مسکرا کر نووارد لڑکی کی طرف دیکھا اور مسکرائے۔ گویا اسے پہلے سے جانتے ہوں۔

"ہیر از اے نیو کمر"۔ انہوں نے لیکچر شروع کرنے کے بجائے کہا۔ "مس ماہتاب"۔ انہوں نے اپنے استخوانی ہاتھ سے نووارد لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ "رسم کے مطابق مس ماہتاب روسٹرم پر آکر اپنا تعارف خود کرائیں گی۔"

لڑکے لڑکیوں نے تالیاں بجائیں، جب وہ پرسکون انداز میں اپنی ڈیسک سے اٹھی اور روسٹرم کی طرف بڑھی تو گویا سب کے دلوں کی دھڑکنیں رک گئیں ...... اس کا قد کم از کم پانچ فٹ دس انچ تھا اور اس کی چال میں ایک ایسا انوکھا پن تھا گویا وہ کسی جھیل میں کھلے ہوئے کنول کے پھولوں پر قدم رکھتی آگے بڑھ رہی ہو اور اس کا وزن روئی کے ایک پھائے سے بھی کم ہو۔

اس نے یونیفارم پر ایک لمبا سا ریشمی گاؤن پہن رکھا تھا اور بالوں پر نیلا اسکارف باندھ رکھا تھا۔ تاہم اس کے لمبے سنہری بال اسکارف کے نیچے تک جھول رہے تھے۔ اور اس کی ہر جنبش قدم کے ساتھ یوں ہلکورے لے رہے تھے گویا پگھلے ہوئے سونے کے کسی

آبشار میں ہوا کی تیزی سے لہریے پڑ رہے ہوں۔

روسٹرم پر پہنچ کر جب اس نے کلاس کی طرف رخ کیا تو میں نے صحیح طور پر اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ واقعی ماہتاب تھی۔ اس کی غزالی آنکھوں میں مصری عورتوں کی طرح قدرتی طور پر کاجل لگا ہوا تھا۔ عام طور پر ایشیائی لڑکیوں میں سے جن کے بال سنہری ہوں، ان کی آنکھیں نیلی یا بھوری ہوتی ہیں مگر اس کی آنکھیں گہری سیاہ تھیں اور یہ ایک عجیب امتزاج تھا ...... اس کی پیشانی محرابی، ناک ستواں اور ہونٹ ایسے ہی تھے جیسے اوس میں بھیگی گلاب کی کسی کلی نے صبح دم سورج کی پہلی کرن کے ساتھ کھلنا شروع کیا ہو۔"

وہ ذرا بھی نروس نہیں تھی۔ اس نے پوری کلاس پر طائرانہ نظر دوڑائی۔ کہنیاں روسٹرم پر ٹکائیں اور مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کے ہونٹوں نے جنبش کی۔ "نام تو میرا آپ کو معلوم ہو ہی گیا ہے۔" میرے خوابوں کے ویران مندروں میں گھنٹیاں سی بج اٹھیں۔ اس کے لہجے کی کھنک تو میرے لئے مانوس تھی۔ "میری عمر انیس سال ہے۔ میں کانپور میں پڑھتی تھی لیکن حال ہی میں ہماری فیملی یہاں منتقل ہو گئی ہے اس لئے میں نے اس کالج میں داخلہ لے لیا ہے اور تو مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آپ لوگوں کو اپنے متعلق کیا بتاؤں ...... آپ پوچھنا چاہیں تو پوچھ لیجئے۔" وہ ایک بار پھر مسکرائی اور کلاس روم میں اجالا سا پھیل گیا۔

"مس ماہتاب! آپ کا اتنا مناسب نام کس نے رکھا تھا؟" مدن موہن نے پوچھا۔ یہ ایک صحت مند اور خوش شکل لڑکا تھا۔

"میرے والد نے، وہ ایک جوہری ہیں اور انہیں ہیروں کی بڑی پرکھ ....."

ایک اجتماعی قہقہہ گونجا جس میں میرے علاوہ سب کی آواز شامل تھی۔

"ماہتاب! آپ نے یہ لمبا سا گاؤن کیوں پہن رکھا ہے؟"

یہ سوال پدما نے کیا تھا جو ایک بنگالی ہندو موسیقار کی بیٹی تھی وہ طالبہ کم ایکٹریس زیادہ لگتی تھی۔

"بعض انسانوں کی آنکھوں میں بھیڑیئے چھپے ہوتے ہیں ان سے بچنے کے لئے۔" ماہتاب نے جواب دیا۔ اس کے ہونٹوں پر اب بھی مسکراہٹ تھی۔

"آپ کا قد کتنا ہے؟" یہ سوال رئیس نے کھڑے ہو کر کیا تھا جو اتنا پستہ قد تھا کہ کھڑا ہوتا تو یہی لگتا تھا کہ کوئی بیٹھا ہوا ہے۔

"آپ کے قد سے دوگنا ...... پانچ فٹ دس انچ۔"

ماہتاب نے جواب دیا ...... اور کلاس میں ایک بار پھر قہقہہ گونج اٹھا ..... رئیس خود بھی اس قہقہے میں شریک تھا۔

"آپ پڑھ کر کیا بنیں گی؟" یہ سوال جرار نے کیا تھا جو نیا ترقی پسند بنا تھا ....

اور حال ہی میں اس نے نہ صرف کھدر کے کپڑے پہننے شروع کر دیے تھے بلکہ عینک بھی لگانے لگا تھا حالانکہ اس کی نظر کمزور نہیں تھی .....

"اس کا زیادہ انحصار اس بات پر ہے کہ میرے ڈیڈی میرے لئے کتنی بڑی سفارش ڈھونڈ کر لا سکیں گے۔" ماہتاب نے بلا تامل جواب دیا۔ سب لوگ ہنسنے لگے ...... لیکن جرار بڑی سنجیدگی سے سر دھنتے ہوئے بولا۔ "واہ واہ مس ماہتاب! معاشرے پر کیا عمدہ طنز فرمایا ہے آپ نے ...... آپ کے اس برجستہ جواب سے معاشرے کے استحصالی طبقوں ......"

ممکن تھا کہ وہ باقاعدہ تقریر شروع کر دیتا مگر اوشا نے اس کی بات کاٹ دی۔ اس نے اٹھ کے ماہتاب سے سوال کیا ...... "آپ کے مشاغل کیا ہیں؟"

"آج کل تو کوئی خاص نہیں ہیں۔ کافی عرصہ پہلے جب ہم کانپور میں رہتے تھے تو کبھی کبھار میں اپنے والد اور چچا کے ساتھ شکار پر جایا کرتی تھی۔" اس بار ماہتاب نے قدرے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"آپ نے کبھی کچھ مارا بھی؟" اوشا نے فوراً پوچھا۔

"جی ہاں ..... ایک دفعہ ایک جنگلی خرگوش مارا تھا لیکن بخدا اس میں میرا کوئی قصور نہیں ...... وہ خود ہی میری بندوق کے سامنے آگیا تھا۔" ماہتاب نے سنجیدگی سے کہا اور کمرہ ایک بار پھر کشت زعفران بن گیا۔

سوائے میرے میں سب سے ماہتاب سے ہر لڑکے اور لڑکی نے کوئی نہ کوئی سوال کیا ...... جب سب خاموش ہو گئے تو سب کے پیچھے ایک ڈیسک پر خاموش اور ساکت بیٹھا تھا ...... چہروں سے ہوتی ہوئی ماہتاب کی نگاہ مجھ پر ایک لمحے کے لئے رک گئی اور وہ لمحہ گویا صدیوں پر محیط ہو گیا۔ شاید وہ منتظر تھی کہ میں بھی کچھ پوچھوں لیکن میں بدستور بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ میری پلکیں تک ساکت تھیں پھر نگاہوں کا یہ ربط مختصر ٹوٹ گیا پروفیسر منوہر لال نے سوال و جواب کا سلسلہ ختم کیا او ماہتاب کے بیٹھ جانے کے بعد لیکچر شروع کر دیا اور کلاس کی سنجیدگی ایک بار پھر لوٹ آئی۔

انٹرول کے دوران میں اسمبلی ہال کے نزدیک سے گزرا تو میں نے راہداری میں ماہتاب کو کھڑے دیکھا۔ مدن اور موہن اور اس کے دو ساتھی لڑکوں نے اسے گھیر رکھا تھا اور وہ ہنس ہنس کر اس سے باتیں کر رہے تھے۔ میں قریب سے گزرا تو ماہتاب نے میری طرف دیکھا۔ ایک بار پھر ایک لمحے کے لئے ہماری نظریں ملیں ...... میرا جی چاہا کہ رک جاؤں اور ان کی گفتگو میں شریک ہو جاؤں لیکن نہ جانے کیوں نہیں رک سکا اور کیفے ٹیریا کی طرف چلا گیا۔

میں نے محسوس کیا کہ ماہتاب کا مدن موہن اور اس کے ساتھیوں کے درمیان

کھڑے ہونا اور ہنس ہنس کر باتیں کرنا مجھے اچھا نہیں لگا اور اس احساس سے مجھے اپنے آپ پر خفیف سی حیرت بھی ہوئی ...... لڑکیوں سے جلد بے تکلف ہونے میں مدن موہن پہلے بھی مشہور تھا۔ وہ اسمارٹ تھا' خوش شکل تھا' بہت امیر باپ کا بیٹا تھا' کالج کی سرگرمیوں میں پیش پیش رہتا تھا۔ لچھے دار گفتگو کرنے میں ماہر تھا۔ ہماری کلاس میں کئی مذاہب کی لڑکیاں تھیں اور تقریباً" سب ہی سے اس کی کسی نہ کسی حد تک شناسائی تھی ...... لیکن اس سے پہلے وہ کبھی مجھے برا نہیں لگا تھا۔ میری نظروں میں نہیں کھٹکا تھا بلکہ میں نے کبھی اس کے وجود پر غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔

دوسرے تمام لڑکوں کی طرح وہ بھی میرے لئے قطعی غیر اہم رہا تھا لیکن نجانے کیوں اچانک وہ کسی عفریت کی طرح چھلانگ لگا کر میرے خیالوں کی دنیا کو اتھل پتھل کرنے آگیا تھا۔

ماہتاب! میں نے لیمونیڈ کا گلاس انگلیوں میں گھماتے ہوئے ذہن ہی ذہن میں یہ نام دہرایا اور غزالی آنکھیں میرے چشم تصور کے سامنے ساکت ہو گئیں ...... پھر ان آنکھوں کے گرد زلف اور لب و رخسار کا حلقہ مکمل ہوا اور یک لخت میرا دل کنپٹیوں میں آکر دھڑکنے لگا۔ یہی تو وہ چہرہ تھا جو بار بار میرے خیالوں کی نیم اندھیری دنیا میں مجھے اپنی جھلک دکھا کر غائب ہو چکا تھا۔ شفاف پانی کی لہروں میں ہلکورے لیتے ہوئے عکس کی طرح میں کبھی اسے واضح طور پر نہیں دیکھ سکا تھا لیکن وہ اچٹتے اچٹتے سے خدوخال میرے ذہن کے نہاں خانوں میں محفوظ تھے۔

یک لخت گلاس پر میری گرفت اتنی سخت ہو گئی کہ اگر میں بیرے کی آواز پر بروقت نہ چونکتا تو شاید وہ میرے ہاتھوں میں کرچی کرچی ہو جاتا۔ عین اسی لمحے مجھے احساس ہوا کہ میں چشم تصور سے جن غزالی آنکھوں کو اپنے سامنے ساکت دیکھ رہا تھا وہ حقیقتاً" مجھ سے کچھ فاصلے پر موجود تھیں۔ ماہتاب نہ جانے کب کیفے ٹیریا میں آگئی تھی۔ مدن موہن اور اس کے دو ساتھی اب بھی اس کے ساتھ چپکے ہوئے تھے البتہ اب ان کی ٹولی میں پدما کا اضافہ ہو چکا تھا۔

ماہتاب کا رخ براہ راست میری طرف تھا۔ پہلے کی طرح ایک بار پھر ہماری نگاہیں ملیں اور ایک لمحے کے لئے ساکت ہوئیں لیکن دوسرے ہی لمحے نظروں کی یہ زنجیر ٹوٹ گئی۔ نہ جانے ہمارے درمیان کونسی دیوار حائل تھی جو مجھے اس کے قریب جانے سے روک رہی تھی۔ شاید یہ انا کی دیوار تھی۔ گو کہ اس سے پہلے میں بھی کسی سے زیادہ گھلتا ملتا نہیں تھا لیکن مجھ میں اس حد تک خود اعتمادی ضرور تھی کہ اگر میں ملنے کا ارادہ کر لیتا تو مجھے کوئی طاقت نہیں روک سکتی تھی اور ماہتاب سے بات کرنے میں تو حقیقتاً" کوئی رکاوٹ بھی نہیں تھی۔ وہ کلاس فیلو تھی ...... نئی نئی آئی تھی ..... ہمارے کالج میں بیشتر لڑکے

لڑکیاں آسودہ حال اور آزاد گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ کوئی بھی مسئلہ نہیں تھا' میں چاہتا تو اٹھ کر سیدھا اس کی میز پر جاتا اور ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے کہتا "مس ماہتاب میرا نام منصور مغل ہے اور میں اپنی کلاس میں آپ کو خوش آمدید کہتے ہوئے آپ کے اعزاز میں یہاں بیٹھے ہوئے تمام ساتھیوں سمیت آپ کو اپنی مرضی کی چیزیں منگوانے کی دعوت دیتا ہوں۔" پھر اس کی طرف جھک کر پوچھتا۔ "فرمایئے! آپ کیا کھانا پسند کریں گی؟ یہ دعوت آپ کے اعزاز میں ہے۔"

لیکن مجھے حیرت تھی کہ میں اپنے اندر ان باتوں کی ہمت نہیں پا رہا تھا۔ میں اپنی جگہ خاموشی سے بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا اور جو کچھ میں سوچ رہا تھا' اس پر عمل شاید مدن موہن کر رہا تھا...... ان کی میز پر بہت سی چیزیں سجی ہوئی تھیں ...... لیکن ماہتاب بڑے تکلف سے ایک آدھ چیز کو ہی ہاتھ لگا رہی تھی اور چائے کی چسکیاں لے رہی تھی۔

میرا جی چاہا کہ اسے بازو سے پکڑ کر اٹھا لاؤں اور اپنے مقابل بٹھا کر کہوں۔ "تمہاری جگہ یہ ہے .... وہ میں ہوں جس نے برسوں تمہارا انتظار کیا ہے اور تم ان عام اور گھٹیا لڑکوں میں گھری بیٹھی ہو۔" لیکن میں یہ بھی نہ کر سکا۔ بس میں تھا اور میرا سکوت ...... میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہمارے درمیان انا کی یہ دیوار کیسے گرے گی۔

چھٹی کے وقت کلاس روم سے نکل کر اس میدان کی طرف جا رہا تھا جہاں کاروں والے طلباء اپنی کاریں کھڑی کیا کرتے تھے میں نے دیکھا کہ ماہتاب گیٹ کی طرف جا رہی تھی .... ہم متوازی چل رہے تھے مگر ہمارے درمیان چند گز کا ناقابل عبور فاصلہ تھا۔ پھر میں نے لڑکوں کی ایک ٹولی سے مدن موہن کو علیحدہ ہو کر اس کی طرف لپکتے دیکھا تھا۔

"آیئے میں آپ کو ڈراپ کر دوں گا۔" لڑکے لڑکیوں کی باتوں کی بھنبھناہٹ کے درمیان میں نے مدن موہن کی مدھم سی آواز سنی۔

"شکریہ!" ماہتاب کی آواز اس کی نسبت صاف اور واضح تھی۔ "ہماری گاڑی گیٹ پر آئی ہوئی ہو گی۔"

"مدن نے پہلے سے نیچی آواز میں کچھ کہا ...... ماہتاب نے نفی میں سر ہلایا اور مدن قدرے مایوسی سے منہ لٹکا کر واپس مڑ گیا۔ برآمدے کے آخری ستون کے پاس پہنچ کر ہماری سمتیں علیحدہ ہو گئیں۔ وہ گیٹ کی طرف چل دی اور میں میدان کی طرف۔ مڑنے سے پہلے اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا ...... اس کی گہری آنکھیں بے تاثر تھیں' مگر میرے لئے یہی اہم تھا کہ اس نے مڑ کر دیکھا تھا۔

میں جب گاڑی نکال کر گیٹ کی طرف آیا تو میں نے دیکھا کہ ماہتاب ایک لمبی سی سیاہ فورڈ میں بیٹھ رہی تھی۔ ایک باوردی ڈرائیور اس کے لئے دروازہ کھولے کھڑا تھا۔ ان کے قریب سے گزرتے وقت ایک لمحے کے لئے میں نے بریک لگایا۔ پھر تیزی سے آگے بڑھ

گیا۔

اس شام جسمانی مشقیں کرتے وقت میرے اعصاب پر ایک عجیب سا تناؤ طاری رہا ...... پھر یہ تناؤ دن بدن بڑھتا گیا۔ میں کالج میں ماہتاب کو دیکھتا' ہماری نظریں ملتیں اور میرے وائلن کے تاروں کی طرح تنے ہوئے اعصاب میں جھنجھناہٹ سی ہوتی اور معدوم ہو جاتی۔ عجیب بات تھی کہ کلاس میں میری سب سے کسی نہ کسی حد تک بات چیت ہوتی تھی سوائے ماہتاب اور مدن کے۔

چند دن بعد موسم بہار کے آغاز پر کالج میں سالانہ تقریبات کی تیاریاں ہونے لگیں۔ ڈرامیٹک سوسائٹی کے انچارج پروفیسر گرو شنکر نے ایک روز مجھے اسٹاف روم میں بلا کر بتایا کہ وہ "قلو پطرہ" کے نام سے ایک انگریزی ڈرامے کی تیاری کر رہے ہیں جس میں قلو پطرہ کا رول کرنے کے لئے ماہتاب نے حامی بھر لی ہے۔

اور جولیس سیزر کے کردار میں میری نظر میں شکل و شباہت اور جسمانی لحاظ سے تم سے زیادہ موزوں لڑکا پورے کالج میں نہیں ہے۔" پروفیسر گرو شنکر نے کہا۔ "اس لئے میں نے اس کردار کے لئے تمہارا نام پیش کر دیا ہے کل تم آ کر مجھ سے اسکرپٹ لے لینا۔ پرسوں سے ریہرسل شروع ہو رہی ہے۔"

ماہتاب کے روبرو بیٹھ کر ریہرسلیں کرنے اور اسٹیج پر اس کے مقابل کام کرنے کے تصور سے میرا دل دھڑک اٹھا۔ ایک لمحے کے لئے میں نہ جانے کونسے دور دیس میں جا نکلا۔ مگر پھر فوراً ہی میں نے سنبھل کر کہا۔ "سر! آپ جانتے ہیں میں اداکاری کے میدان کا آدمی نہیں ہوں۔ تیراکی' گھڑ سواری' نشانہ بازی اور کشتیوں وغیرہ کے مقابلوں میں چیلنج کے ساتھ شریک ہو سکتا ہوں ...... لیکن اداکاری میرے بس کا روگ نہیں ...... میں معذرت چاہوں گا۔"

"اس ڈرامے میں اداکاری کی ضرورت کے پڑے گی برخوردار!" پروفیسر صاحب نے ملائمت سے کہا۔ "یہ ایک گلیمرس پلے ہو گا' ہم نے صرف کاسٹیوم اور گٹ اپ کی مدد سے ناظرین کو مسحور کرنا ہے ...... اور کچھ بھی نہیں۔"

"کچھ بھی ہو سر ...... بہروپ بدلنا میرے بس کا کام ہی نہیں۔" میں نے مدھم سی آواز میں کہا۔ "میری معذرت قبول فرمایئے۔"

پروفیسر گرو شنکر اپنے شاگردوں کے منہ سے کسی معاملے میں انکار سننا پسند نہیں کرتے تھے ...... ان کے چہرے پر ایک لمحے کے لئے میں نے کبیدگی کے آثار دیکھے جنہیں وہ فوراً ہی چھپا گئے .... اور اخبار کی طرف متوجہ ہو کر سپاٹ لہجے میں بولے۔ "تمہاری مرضی' اور کئی لڑکے یہ رول کرنے کے لئے تیار ہیں۔" میں مزید کچھ کہے بغیر باہر آ گیا۔

تیسرے دن مجھے معلوم ہوا کہ ماہتاب نے بھی قلوپطرہ کا رول کرنے سے انکار کر دیا ہے' یہ خبر سن کر ایک لمحے کے لئے مجھے ایک خوشگوار سی حیرت ہوئی۔ کیا اس نے یہ سننے کے بعد انکار کیا ہے کہ میں اس ڈرامے میں شریک نہیں؟ یا پہلے اس نے یہ سن کر حامی بھری تھی کہ جولیس سیزر کا کردار میرے سپرد کیا جا رہا ہے؟ میں نے اپنے آپ سے پوچھا ...... پھر فوراً" ہی میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ یہ قطعاً" ضروری نہیں' اور مجھے کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے۔

میرے اعصاب پر تناؤ اب بھی برقرار تھا اور یہ دیکھ کر اس تناؤ میں اور اضافہ ہو جاتا تھا کہ مدن موہن ماہتاب سے خاصا بے تکلف ہو چکا تھا۔ خالی پیریڈ میں وہ اکثر کالج کے لان یا کیفے ٹیریا میں اکٹھے بیٹھے پائے جاتے۔ میں دور دور سے انہیں دیکھتا اور میرے اعصاب کا سلگتا ہوا فلیتہ کچھ اور مختصر ہو جاتا۔ آگ دن بدن بارود کے نزدیک پہنچ رہی تھی۔

پھر ایک روز سب کچھ میرے بس سے باہر ہو گیا۔ میں لائبریری میں بیٹھا تھا لمبی سی میز کے گرد ...... لڑکے لڑکیاں بیٹھی مطالعہ میں مصروف تھیں لائبریری ایک طویل ہال میں تھی۔ مطالعہ کی میز کے تین اطراف میں دیواروں کے ساتھ کتابوں سے بھری ہوئی شیشے کے دروازوں والی اونچی اونچی الماریاں رکھی تھیں۔ میز سے کافی دور' ہال کے ایک گوشے میں لکڑی کا ایک اونچا سا کٹہرا تھا جس میں ایک ڈائس کے پیچھے لائبریرین' مسز کوپر بیٹھی تھیں جو ایک ادھیڑ عمر پارسی خاتون تھیں ...... مطالعہ کی میز سے کٹہرے کی طرف دیکھنے پر بمشکل ان کا سر نظر آ رہا تھا۔ جو عموماً" ساکت رہتا تھا کیونکہ اکثر و بیشتر وہ خود بھی مطالعہ میں مصروف رہتی تھیں۔

اخبار کو دیکھتے دیکھتے میں اچانک چونک پڑا ...... ایک مانوس سی خوشبو نے مجھے چونکایا تھا ...... میں نے غیر محسوس طور پر گردن اٹھا کر کٹہرے کی طرف دیکھا ...... ماہتاب ہال کی طرف پشت کئے ہوئے کٹہرے کے قریب کھڑی تھی۔ گویا میری حساس قوت شامہ نے مجھے دھوکہ نہیں دیا تھا۔ ماہتاب کی موجودگی کا احساس مجھے اس کی طرف دیکھے بغیر ہی ہو جاتا تھا اس کی خوشبو سے۔

غالباً" وہ کوئی خوشبو نہیں لگاتی تھی بلکہ اس کے وجود سے ہی ایک انوکھی خوشبو پھوٹتی تھی جو شاید مجھے ہی محسوس ہوتی تھی بعض اوقات میں کسی جگہ پہنچتا تو اسی خوشبو کی وجہ سے مجھے معلوم ہو جاتا تھا کہ کچھ دیر پہلے تک ماہتاب وہاں موجود تھی یا وہاں سے گزری تھی۔

چند لمحے بعد میں نے مسز کوپر کو کٹہرے کا دروازہ کھول کر نکلتے دیکھا۔ انہوں نے ایک الماری کا تالا کھول کر انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کی ایک جلد نکال کر ماہتاب کو دی اور واپس

کٹہرے میں چلی گئی۔ چوبی جلد والی یہ ضخیم کتاب اٹھائے ماہتاب مطالعے کی میز کے قریب آئی ...... میرے سامنے کرسی خالی تھی وہ اس پر آ بیٹھی۔ میں نے اخبار سے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا لیکن اس نے میری طرف نہیں دیکھا۔ کتاب کے اوراق الٹ پلٹ کئے چند لمحے وہ کچھ دیکھتی رہی پھر اس نے اپنی کالج فائل کھولی اور سر جھکا کر کتاب سے کچھ نقل کرنے میں منہمک ہو گئی۔

چند منٹ بعد نیا پیریڈ شروع ہونے کی گھنٹی بجی اور آہستہ آہستہ میرے اور ماہتاب کے علاوہ سب اٹھ کر چلے گئے۔ ہمارا یہ پیریڈ بھی خالی تھا۔ اس لئے ہم دونوں میں سے کوئی نہ اٹھا۔ ہمارے سروں پر لمبے پروں والا پنکھا سست رفتاری سے گھوم رہا تھا اس کی مدہم سی سرسراہٹ کے علاوہ ہال میں کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ پھر پنکھے کی سرسراہٹ کے ساتھ گویا میرے خون کی گردش کی آواز بھی شامل ہو گئی۔ یہ آواز رفتہ رفتہ اتنی بڑھی کہ میری کنپٹیوں میں دھماکے سے ہونے لگے اور مجھے کچھ احساس نہ رہا کہ میں کہاں بیٹھا ہوں۔

مجھے اپنے سامنے صرف ماہتاب کا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک بڑے سے سیاہ کینوس پر سیال سونے سے کوئی تصویر بنی ہو۔ نیلے سکارف کی گرفت سے نکلی ہوئی بالوں کی ایک لٹ' جھکی ہوئی پلکیں' نیم وا ہونٹ جن میں گویا دنیا بھر کے گلابوں کا رس سمٹ آیا ہو۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں کتنی دیر تک اس کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ چند لمحوں یا شاید چند صدیوں تک ......

میرے خیال میں آج فیصلے کا لمحہ آن پہنچا تھا!







پھر میں اس کی طرف جھکا۔ "سنو" میں نے سرگوشی کی۔

اس کا سر بدستور جھکا رہا لیکن پلکوں کی جھالریں یوں اٹھ گئیں گویا کسی جوہری نے دو انمول ہیروں پر سے مخملیں غلاف ہٹا دیا ہو۔

"تم مدن سے مت ملا کرو۔" میری آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی بلکہ مجھے خود یوں لگ رہی تھی جیسے ہوا کی دبیز تہوں کو چیرتا کمان سے نکلا ہوا کوئی تیر اپنے ہدف کی طرف جا رہا ہو۔ میرے اچانک تخاطب سے اس کے چہرے پر حیرت کی کوئی لہر نہ ابھری اور نہ ہی اس نے یہ پوچھا' تم مجھے یہ حکم دینے والے کون ہوتے ہو' اس نے صرف ایک لمحے کے لئے مجھے دیکھا پھر دھیرے دھیرے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ طلوع ہوئی۔

"اگر میں یہ حکم ماننے سے انکار کر دوں تو؟" اس کی سرگوشی ابھری۔

"تو میں مدن کو قتل کر دوں گا۔" میں نے بلا تامل کہا۔

"اور اگر اس کے بعد میں کسی اور سے ملنے جلنے لگی؟" اس نے پوچھا۔

"تو میں اسے بھی قتل کر دوں گا۔" میرے الفاظ دیوانوں کے سے اور لہجہ ہوش مندوں کا سا تھا۔

اس کا جھکا ہوا سر اٹھا' قلم اس نے فائل کے درمیان رکھ دیا۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا کر اس نے گہری سانس لی۔ "تو تم میرے لئے اس حد تک جا سکتے ہو؟" اس کی آواز گویا اب میرے ہی وجود سے پھوٹ رہی تھی۔

"اس سے بھی زیادہ۔" میں نے کہا۔

اونچے پشتے کی کرسی سے ٹیک لگا کر وہ ایک بار پھر مسکرائی۔

"یہ غالباً دنیا کا سب سے انوکھا اظہار محبت ہے۔" اس کے ہونٹ تھرتھرائے۔

"یہ اظہار محبت نہیں' اظہار ملکیت ہے۔" میں نے کہا۔ "تم میرے ہی وجود کا ایک حصہ ہو جو شاید سیاروں کی گردش کے ساتھ کبھی علیحدہ ہو گیا تھا۔"

وہ ایک بار پھر مسکرائی اور ایک لمحے کے توقف کے بعد پہلے سے بھی زیادہ مدھم آواز میں بولی۔ "محسوس میں بھی یہی کر رہی تھی لیکن میں منتظر تھی کہ میرے وجود کا بچھڑا ہوا حصہ خود ہی مجھ سے آن ملے۔"

میں خاموش رہا۔ اب کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے پھیلی ہوئی دھند جس کے درمیان مجھے ماہتاب کا صرف چہرہ صاف نظر آ رہا تھا' دھیرے دھیرے چھٹنے لگی۔ خون کی گردش کے ساتھ کنپٹیوں میں گونجنے والے دھماکے معدوم ہو گئے۔ میں نے کرسی کے پشتے سے ٹیک لگا کر بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ "گویا اب تم مدن سے میل جول نہیں رکھو گی؟"

"کیا اب بھی یہ پوچھنے کی ضرورت باقی ہے؟" اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میرا سوال کتنا غیر ضروری تھا۔ اس کے بعد ہم کافی دیر تک خاموش بیٹھے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

اگلے پیریڈ کا گھنٹا بجا تو ماہتاب نے اٹھ کر انسائیکلو پیڈیا مسز کوپر کے حوالے کیا اور ہم لائبریری سے نکل کر اکٹھے کلاس روم میں آئے۔ سب نے حیرت سے ہماری طرف دیکھا۔ ہم اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے مدن موہن تو لیکچر کے دوران بھی مڑ مڑ کر میری طرف دیکھتا رہا لیکن فی الحال اس کی آنکھوں میں تمام جذبوں میں صرف حیرت غالب تھی۔

اس پیریڈ کے بعد انٹرول ہوا تو مدن اور اس کے دو قریبی دوست نرمل اور پرشاد سب سے پہلے اٹھ کر باہر چلے گئے۔ میں اور ماہتاب اکٹھے کلاس روم سے نکلے تو وہ تینوں کہیں دکھائی نہ دیئے۔ ہم کیفے ٹیریا کی طرف چل دیئے۔ وہاں وہ تینوں ایک میز پر بیٹھے تھے اور بڑے جوش و خروش سے کسی بحث میں مصروف تھے۔ ہمیں دیکھ کر تینوں یک لخت خاموش ہو گئے۔ مدن' ماہتاب کی طرف دیکھ کر مسکرایا مگر اس کے چہرے پر سرد مہری دیکھ کر کھسیانا ہو گیا۔

ہم ایک میز پر بیٹھ چکے تو بیرے سے پہلے مدن اٹھ کر ہماری طرف آیا۔ "اب ایسی بھی کیا بے رخی ماہتاب!" اس نے خاصی بے تکلفی سے کہا اور ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ "ایسا لگتا ہے جیسے منصور نے چند لمحے کے اندر اندر تم پر کوئی جادو کر دیا ہے۔"

"مسٹر مدن!" ماہتاب نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "آج سے پہلے تو آپ مجھے آپ کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ یہ آج اتنی بے تکلفی کس سلسلے میں؟"

"حیرت ہے۔" مدن موہن نے قدرے کھسیاہٹ کے ساتھ کہا۔ "آپ ہی تو کہا کرتی تھیں کہ پڑھے لکھے اور نئی نسل کے لوگوں کے درمیان بے جا تکلفات نہیں ہونے چاہئیں۔"

"لیکن صرف اس وقت جب دوسرا فریق اس کی اجازت دے۔ میں نے یہ بھی کہا تھا۔" ماہتاب نے کہا۔ "میں جب پسند کروں گی تو ایک کلاس فیلو کی حیثیت سے آپ کے ساتھ باتیں کروں گی' آپ کی باتیں سنوں گی' ہنسوں بولوں گی' لیکن اس وقت میں منصور سے چند ضروری معاملات پر ڈسکشن کر رہی ہوں۔"

"اس سے پہلے کہ آپ ان معاملات کو طول دیں مس ماہتاب!" مدن موہن نے اچانک بڑے گھمبیر لہجے میں کہا۔ "میں منصور کی موجودگی میں آپ کو صاف طور پر بتا دوں کہ آپ کے معاملے میں میں زندگی اور موت کی حد تک سنجیدہ ہو چکا ہوں مجھے نہیں معلوم کہ آپ کے دل میں میرے لئے کس حد تک جگہ تھی۔ لیکن میں اس حد تک آگے جا چکا تھا کہ میں نے اپنے پتا جی سے شادی کی بات بھی کر لی تھی۔"

"وہاٹ!" ماہتاب گویا سناٹے میں آ گئی چند لمحے تک اس کے حلق سے اور کوئی آواز نہ نکلی۔ بعد مشکل اس نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مائی گاڈ! آج کل کے نوجوان کتنے خوش فہم ہوتے ہیں۔ مسٹر مدن! اچھا ہوا آپ نے جلد ہی اپنی خوش فہمیوں کی پٹاری میرے سامنے کھول دی' میں اس کالج میں اجنبی تھی۔ آپ سب سے پہلے میرے قریب آئے اور میں نے خندہ پیشانی سے آپ کی باتیں سننا شروع کر دیں۔ اس کا یہ مطلب تو ہرگز نہیں مسٹر مدن کہ میں آپ سے شادی کے بارے میں سنجیدہ ہو گئی تھی۔ میں کسی ہندو لڑکے سے شادی کے بارے میں تو سوچ بھی نہیں سکتی۔ اف میرے خدایا! آپ کے دل میں یہ خیال کیونکر آیا مسٹر مدن؟"

"آخر اس میں حرج ہی کیا ہے۔" مدن نے دونوں ہاتھ پھیلا کر کہا۔ "انڈیا میں اب ہندو مسلم خاندانوں میں شادیاں شروع ہو چکی ہیں ...... اور میں تو اس حد تک بھی تیار ہوں کہ اگر مجھے مسلمان ہونا پڑا تو ہو جاؤں گا۔"

"آپ جن خاندانوں کی باتیں کر رہے ہیں' میں انہیں خاندان نہیں' بے ضمیروں کے ٹولے سمجھتی ہوں۔ ایسا سوچنے والی لڑکیوں کو ننگ خاندان سمجھتی ہوں اور میں ننگ خاندان نہیں ہوں۔ میری رگوں میں شاہی خون دوڑ رہا ہے۔ سمجھے آپ؟ اب میں اس قسم کی بے ہودہ گفتگو کا ایک لفظ بھی سننا نہیں چاہتی۔" ماہتاب کا چہرہ سرخ ہو چلا تھا۔

"گرا پڑا تو میں بھی نہیں ہوں مس ماہتاب! میں ایک کروڑ پتی برہمن کا بیٹا ہوں ......" مدن نے ٹائی کی گرہ درست کرتے ہوئے کہا۔ میں بڑی دیر سے خاموش بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ میرا ایک ہاتھ شیشے کے گلاس پر تھا دوسرے ہاتھ سے میں نے مدن کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔ "میرے خیال میں اب تمہاری تسلی ہو جانی چاہئے کروڑ پتی برہمن کے بیٹے' اب اپنی میز پر جاؤ۔"

"تم چپ رہو۔" اس نے حقارت سے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ "بھگوان نے جنہیں چوڑی چھاتی دے دی ہے تو یہ مت سمجھو کہ ہرکولیس ہو گئے۔ ایسے جسم بعض اوقات اپنے وقت سے پہلے بھی دفن ہو جاتے ہیں۔"

مجھے خود صحیح طور پر اندازہ نہیں ہو سکا کہ کب میرا ہاتھ گھوما اور مدن کرسی سمیت الٹ کر دروازے کے قریب جا گرا۔ اس کے دونوں دوست نرمل اور پرشاد غالباً" ایسے ہی

موقع کے لئے تیار بیٹھے تھے۔ وہ دونوں لکڑی کی بھاری کرسیاں اٹھا کر میری طرف لپکے۔ ماہتاب نے ایک عقلمندی کی کہ پھرتی سے اٹھ کر کیفے ٹیریا کے کاؤنٹر کے قریب جا کھڑی ہوئی۔ میں اچھل کر قدرے کھلی جگہ میں آ گیا تھا۔ ان دونوں نے بیک وقت کرسیاں سر سے بلند کر کے یوں گھمائیں گویا مجھے ان کے درمیان پیس ڈالنا چاہتے ہوں۔ میں تو جھکائی دے کر ایک طرف کو ہٹ گیا۔ ان کی کرسیاں اتنے زور سے ٹکرائیں کہ ان کے دو تین پائے ٹوٹ گئے اور وہ اپنے ہی زور میں لڑکھڑا گئے۔ کیفے ٹیریا میں بھگدڑ مچ گئی۔

نرمل خاصا تگڑا اور دراز قد تھا۔ میں نے پہلے اس سے نمٹنا ضروری سمجھا۔ وہ ابھی سنبھلنے نہ پایا تھا کہ میں نے اس کی گردن پر ایک ہلکا سا ہاتھ رسید کیا وہ اوندھے منہ گرا اور اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ پرشاد کرسی سنبھال کر دوبارہ حملہ آور ہوتا' میں نے اس کی پسلیوں میں گھونسا رسید کیا۔ میں کراٹے کا کوئی داؤ استعمال نہیں کر رہا تھا اور نہ ہی زیادہ زور سے وار کر رہا تھا۔ مبادا اس میں سے کوئی مر جائے۔

پرشاد دیکھنے میں زیادہ صحتمند نہیں تھا لیکن جاندار تھا' میرا گھونسا کھا کر ڈکراتا ہوا گرا' مگر فورا" ہی اٹھ کھڑا ہوا' کرسی اس کے ہاتھ سے چھوٹ چکی تھی۔ اس نے ایک میز پر سے تانبے کا بھاری جگ اٹھا لیا۔ جگ اس نے اتنی طاقت سے میری طرف پھینکا کہ اگر میں ایک طرف نہ ہٹ گیا ہوتا تو میرا سر پاش پاش ہو جاتا یا پھر کئی ہڈیاں چکنا چور ہو جاتیں۔ کیونکہ وہ جس میز سے ٹکرایا تھا اس کے ماربل کے ٹاپ کا ایک بڑا سا ٹکڑا علیحدہ ہو گیا تھا۔

ایک لمحے کے لئے میرا جی چاہا کہ دونوں ہاتھوں کی ضرب سے اس کا سر خربوزے کی طرح پچکا ڈالوں۔ کم بخت زخمی درندے کی طرح غیظ و غضب سے پاگل ہو رہا تھا۔ میں نے اپنے آپ پر ضبط کرتے ہوئے اس کی کنپٹی پر گھونسا رسید کرنے پر اکتفا کیا۔ وہ بھی چاروں خانے چت ہو گیا اس دوران مدن سنبھل کر اٹھ کھڑا ہوا۔

ماہتاب کی چیخ نے مجھے اس کی طرف متوجہ کیا۔ وہ پتلے سے پھل کا ایک چاقو لئے میرے عقب سے میری طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ میرے اتنے قریب آ چکا تھا کہ اس کی کلائی پر کراٹے کا ہاتھ رسید کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ ضرب لگتے ہی چاقو اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور زور دار آواز کے ساتھ فرش سے ٹکرایا اور وہ دوسرے ہاتھ سے کلائی تھام کر کراہتا ہوا گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا۔

اپنے کپڑے وغیرہ درست کر کے میں کیفے ٹیریا کے کاؤنٹر کی طرف مڑا ہی تھا کہ باہر شور شرابے کی آواز سنائی دی اور پھر میں نے دیکھا کہ پرنسپل آتما رام جو بڑے مرنجان مرنج اور منحنی سے آدمی تھے اور ہمیشہ سفید براق کرتے پاجامے میں سیاہ واسکٹ میں ملبوس رہتے تھے۔ اپنی دو پلی ٹوپی سنبھالے بہ نفس نفیس کیفے ٹیریا میں بھاگے چلے آ رہے ہیں۔

دروازے سے اندر قدم رکھنے سے پہلے انہوں نے مڑ کر کہا۔ "آپ لوگ خاطر جمع رکھیں ...... کسی قسم کا دنگا فساد نہ کریں ورنہ پولیس کیس بن جائے گا ...... کالج کی ریپوٹیشن تباہ ہو جائے گی۔ میں ابھی جھگڑا کرنے والے لڑکوں سے بات کر کے آپ کو بتاتا ہوں۔ یہ معمولی جھگڑا ہے اس میں ہندو مسلم فساد کھڑا کرنے کی کوئی بات نہیں۔"

کالج میں مسلمان لڑکے اقلیت میں تھے لیکن ایسا لگتا تھا کہ باہر پہنچنے والی چنگاری کو ہوا مل چکی ہے اور کسی بھی لمحے شعلے پکڑ سکتی ہے۔ کیفے ٹیریا سے باہر غالباً" ہندو اور مسلمان لڑکوں کے گروپ پہنچ چکے تھے اور پرنسپل انہی سے مخاطب تھے۔ لیکن اندر سے میں ان لوگوں کو نہیں دیکھ پا رہا تھا۔

اپنی مختصر تقریر ختم کر کے پرنسل نے اندر کا رخ کیا اور کیفے ٹیریا کا دروازہ اپنے عقب میں بند کر دیا۔ اندر آ کر پہلے انہوں نے طائرانہ نظروں سے توڑ پھوڑ کا جائزہ لیا پھر کمانی دار عینک ناک پر صحیح طریقے سے جماتے ہوئے بولے۔ "چھی ...... چھی چھی ...... یہ کالج طلباء کو متمدن اور مہذب شہری بنانے کا دعویدار ہے اور اس کی تاریخ میں کبھی ایسا لڑائی جھگڑا نہیں ہوا۔"

انہوں نے مدن کو سہارا دے کر ایک کرسی پر بٹھایا' مجھے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ایک نظر ماہتاب پر ڈالی اور پھر ہم سے جھگڑے کی تفصیل پوچھنے کی بجائے روشن دین کی طرف بڑھے جو کیفے ٹیریا کا ٹھیکیدار تھا اور اس وقت کاؤنٹر کے پیچھے سہما بیٹھا تھا۔ انہوں نے روشن دین سے ساری تفصیل معلوم کی پھر ہمارے قریب کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے بولے۔ "میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ہمارے کالج میں بھی ایسا واقعہ رونما ہو سکتا ہے۔ چند مہینے بعد تم لوگ گریجوایٹ ہونے والے ہو' مہذب خاندانوں سے تمہارا تعلق ہے اور حرکت تم نے چرسیوں' بھنگیوں اور شرابیوں والی کی ہے۔ میں اب اس پر بحث نہیں کروں گا کہ قصور کس کا ہے؟ باہر دونوں طرف کے لڑکے بپھرے کھڑے ہیں۔ میرے سامنے تین راستے ہیں ایک تو یہ کہ تم دونوں بلکہ چاروں لڑکوں کو بدکرداری کا سرٹیفکیٹ دے کر کالج سے باہر کر دوں اور جھگڑا یہیں ختم کر دوں' دوسرے یہ کہ پولیس کو طلب کر کے سارا معاملہ اس کے ہاتھوں میں دے دوں اور کالج کی ریپوٹیشن کا بیڑا غرق ہونے دوں۔ یہ دونوں طریقے منفی ہیں۔ تیسرا طریقہ یہ ہے کہ میں تم دونوں کو کان سے پکڑ کر باہر لے چلوں۔ سب کے سامنے تم ایک دوسرے سے معذرت کرو اور کہہ دو کہ یہ تمہارا ذاتی اور معمولی نوعیت کا جھگڑا تھا۔ وقتی ابال تھا جو ختم ہو گیا۔ بولو تمہیں کونسا طریقہ پسند ہے؟"

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموشی سے کندھے اچکا کر مدن کی طرف دیکھا۔ میرے خیال میں وہ اس قبیل کا آدمی نہیں تھا جو جلد شکست تسلیم کر لے یا اپنی غلطی کا اعتراف کر لے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ان میں کسی جذبے کی جھلک نہیں تھی لیکن نجانے کیوں مجھے یقین تھا کہ اس کے دل کی گہرائیوں میں نفرت کی تہوں میں لپٹا ہوا کوئی خوفناک منصوبہ کلبلا رہا ہو گا۔ بہرحال مجھے اس کی کوئی خاص پروا نہیں تھی۔

"معافی مانگنی بھی تمہیں ہی چاہئے کیونکہ غلطی تمہاری تھی۔" میں نے کہا۔

پرنسپل آتما رام ہم دونوں کو باہر لائے اور ایک چبوترے پر کھڑے ہو کر سب کے سامنے ہماری صلح کرائی اور ہجوم کو ٹھنڈا کر کے منتشر کر دیا پھر انہوں نے مدن' نرمل اور پرشاد کو ہسپتال بھجوانے کا بندوبست کیا۔ مدن کی کلائی کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی' نرمل اور پرشاد صرف بے ہوش تھے۔ شاید انہیں کوئی اندرونی چوٹ بھی آئی ہو مجھے اندازہ نہیں تھا۔ حالات پر سکون ہوئے تو میں اور ماہتاب گراؤنڈ میں آ گئے۔

"ہماری تو پہلی ملاقات ہی بڑی ہنگامہ خیز ثابت ہوئی۔" وہ میری گاڑی سے ٹیک لگا کر کھڑے ہوتے ہوئے مسکرا کر بولی "یہ اچھا شگون نہیں ہے۔"

"میرے خیال میں تو بڑا اچھا شگون ہے۔" میں نے کہا۔

"لگتا ہے کہ ہماری آئندہ زندگی ہنگاموں ہی سے عبارت ہو گی اور مجھے آج پہلی مرتبہ احساس ہوا ہے کہ ہنگامہ خیزی سے میرے جسم میں نئی زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔"

"اچھا ایک بات تو بتاؤ منصور!" ماہتاب کو جیسے کچھ یاد آ گیا۔ "تم نے ڈرامے میں میرے ساتھ رول کرنے سے کیوں انکار کر دیا تھا جب کہ مجھے امید تھی کہ اس میں میری شمولیت کا سن کر تم ضرور حامی بھر لو گے؟"

"میں خود نہیں جانتا۔" میں نے فائل بونٹ پر رکھتے ہوئے کہا۔ "بس وہ مجھے کچھ فلمی سا لگا۔ آج کل ہماری فلموں میں یہی کچھ ہوتا ہے نا۔ ہیرو اور ہیروئن کالج کے کسی ڈرامے یا ٹیبلو میں اکٹھے کام کرتے ہیں جس میں پینتیس سالہ ہیروئن پندرہ سالہ لڑکی والے نخروں کے ساتھ ایک بازاری رقص بھی ضرور پیش کرتی ہے۔ پھر ہیرو صاحب دو چار دن ہیروئن کے پیچھے دم ہلاتے پھرتے ہیں اور وہ انہیں قطعاً" گھاس نہیں ڈالتی پھر یک لخت ہی اتنی مہربان ہو جاتی ہے کہ بھری پری سڑکوں پر ہیرو کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ڈوئٹ گاتی پھرتی ہے۔ مجھے لگتا تھا کہ اگر میں نے ڈرامے میں کام کیا تو یہ مراسم کا بڑا چیپ سا آغاز ہو گا۔ معلوم نہیں تم میری بات سمجھ رہی ہو یا نہیں۔"

"میں تو اسی وقت سمجھ گئی تھی کہ تمہارے انکار کے پیچھے کونسے محسوسات کام کر رہے ہیں۔" ماہتاب مسکرائی۔ "اور مجھے تمہاری یہ ادا اچھی لگی تھی۔ اگر تم ڈرامے میں کام کرنے کی حامی بھر لیتے تو شاید فلموں کے برعکس بات وہیں اسٹیج پر ہی ختم ہو جاتی اور ہمارے مراسم کا آغاز نہ ہو پاتا۔" پھر اس نے نجانے کیا سوچ کر ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا اور شریر نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "ویسے کیا موجودہ اندازہ تمہیں فلمی نہیں لگا؟"

"قطعی نہیں۔" میں نے کہا۔ "فلموں میں تو ڈھیلے ڈھالے جسم والا ایک صاحب توند ہیرو بڑے بڑے کسرتی جسم والوں کو مار بھگاتا ہے جبکہ حقیقی زندگی میں وہ ایک چوہے کو بھی نہیں مار سکتا جب کہ مجھے دیکھ کر کوئی بھی ذی ہوش اندازہ لگا سکتا ہے کہ میں کیا کچھ کر سکتا ہوں کیونکہ میرے پیچھے تیرہ برس کی ریاضت ہے۔"

"میری گاڑی آگئی۔" ماہتاب نے گیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اب میں چلتی ہوں' فی الحال میں تمہیں افسانوی یا فلمی ہیروئن کی طرح اپنے ماں باپ سے ملانے گھر نہیں لے جاؤں گی کیونکہ وہ گھر پر ہوتے ہی نہیں۔ میرے ابا کو کاروبار سے فرصت نہیں ملتی۔ اور امی کو سیاست کا چسکا ہے۔ دونوں سے رات کے کھانے پر ہی ملاقات ہوتی ہے۔ اچھا خدا حافظ۔"

میں اپنی جگہ کھڑا اسے جاتے دیکھتا رہا۔ چند منٹ بعد میں نے بھی گاڑی نکالی اور گھر روانہ ہو گیا۔ مدن سے ٹکراؤ کی بدمزگی کے باوجود میں آج بہت خوش تھا اور سوچ رہا تھا کہ ممی سے آئندہ ملاقات پر انہیں ماہتاب کے متعلق بتاؤں گا اور ہو سکا تو کسی روز ان کی ملاقات بھی کرا دوں گا اور دیکھوں گا کہ ممی اس کے متعلق کیا رائے ظاہر کرتی ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ وہ بھی اسے بے حد پسند کریں گی۔

اگلے دن مدن کالج نہیں آیا۔ اس کی درخواست آئی تھی۔ اس کے بازو پر پلستر چڑھا تھا اور وہ گھر پر آرام کر رہا تھا۔ نرمل اور پرشاد البتہ آئے تھے لیکن کچھ مضمحل نظر آ رہے تھے اور مجھ سے آنکھ نہیں ملا رہے تھے۔ تین دن تک کوئی خاص واقعہ رونما نہیں ہوا' سوائے اس کے کہ کالج میں میری اور ماہتاب کی جوڑی مشہور ہو چکی تھی۔ اور ہم جدھر بھی اکٹھے نکلتے تھے ہمیں رشک آمیز نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔

اس روز ہمارا تیسرا پیریڈ ختم ہوا ہی تھا کہ پرنسپل کا چپراسی کلاس میں آیا اور پوچھنے لگا کہ مس ماہتاب کون ہیں پھر اس نے ماہتاب کو بتایا کہ پرنسپل کے دفتر میں اس کا فون آیا ہے۔ ماہتاب اس کے ساتھ چلی گئی کچھ دیر بعد وہ واپس آئی تو پیریڈ شروع ہو چکا تھا۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا اس نے اکنامکس کے پروفیسر مہتہ جی کو بتایا کہ اس کے ابا کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے' سول ہسپتال سے فون آیا تھا اور وہ وہاں جا رہی ہے۔

"سر!" میں نے کھڑے ہو کر پروفیسر مہتہ سے کہا "اگر آپ اجازت دیں تو میں ماہتاب کو ہسپتال چھوڑ آؤں؟"

"جاؤ!" مہتہ جی نے حاضری کے رجسٹر سے نظریں اٹھائے بغیر کہا باہر آ کر میں نے ماہتاب سے پوچھا۔ "کیسے ہوا ایکسیڈنٹ؟"

"ہسپتال والوں نے زیادہ کچھ نہیں بتایا صرف اتنا ہی کہا کہ انہیں خون کی ضرورت ہے۔" ماہتاب دوڑتے ہوئے بولی۔ "انہوں نے پہلے گھر فون کیا تھا وہاں امی بھی نہیں تھیں تب

کسی نوکر نے انہیں میرے کالج کا فون نمبر دیا تو انہوں نے مجھے اطلاع دی اور اس چکر میں کافی تاخیر ہو چکی ہے۔"

میں نے گراؤنڈ سے گاڑی نکالی۔ کالج سے نکل کر ہم بمشکل آدھ فرلانگ دور ہی گئے تھے کہ انجن گھرر گھرر کی عجیب سی آواز کے ساتھ بند ہو گیا۔ میں نے اسے اسٹارٹ کرنے کی بہت کوشش کی لیکن ہر مرتبہ وہ ویسی ہی "گھرر گھرر" کی مختصر سی آواز پیدا کر کے خاموش ہو گیا۔

"اسے بھی ابھی خراب ہونا تھا۔" ماہتاب نے مضطربانہ لہجے میں کہا۔ "آؤ کوئی دوسری سواری تلاش کرتے ہیں۔"

ہم ابھی گاڑی سے اترے ہی تھے کہ ایک ٹیکسی سست رفتاری کے ساتھ قریب سے گزرتی دکھائی دی۔ میں نے جلدی سے ہاتھ دے کر اسے روکا۔ اور ہم لپک کر اس میں بیٹھ گئے۔ "سول ہسپتال" میں نے ڈرائیور سے کہا۔ "تیز چلانا' ایک ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔"

دبلے پتلے اور گنجے مدراسی ڈرائیور نے مڑ کر ہماری طرف دیکھا۔ "جتنی آپ بولیں' میں چلاؤں گا صاحب! لیکن اگر ایک اور ایکسیڈنٹ ہو گیا تو آپ کی ذمے داری۔"

اس نے ایکسیلیٹر دبایا اور گاڑی فراٹے بھرنے لگی۔ میں اس وقت چونکا جب میں نے دیکھا کہ ڈرائیور نے گاڑی اسٹیورٹ روڈ کی طرف موڑنے کی بجائے مضافات کی طرف جانے والی سڑک پر ڈال دی تھی۔

"تم اسٹیورٹ روڈ کی طرف سے کیوں نہیں چل رہے؟" میں نے پوچھا۔

"آپ کو نہیں معلوم صاحب؟ گاندھی چوک میں کل سے سڑک کی مرمت کا کام ہو رہا ہے ہمیں اوپر سے گھوم کر آنا پڑے گا۔" ڈرائیور نے سادگی سے کہا۔ کئی منٹ تذبذب کے عالم میں گزر گئے۔ میری چھٹی حس مجھے کسی خطرے سے خبردار کر رہی تھی لیکن میں نے فیصلے پر پہنچنے میں تاخیر کر دی۔ جب ڈرائیور ایک اور صحیح راستے کو چھوڑ کر بدستور سنسان سڑک پر گاڑی بھگاتا رہا تو میں نے اس کی گردن پر ہاتھ ڈال دیا۔ "گاڑی روک لو' ورنہ گردن توڑ دوں گا۔" میں نے اس کی پتلی سی گردن کے منکے پر انگوٹھے سے دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔

"بہت اچھا صاحب!" اس نے سعادت مندی سے کہا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس کی سعادت مندی کی وجہ یہ تھی کہ اسی وقت ایک اور کار ہمارے عقب میں رک چکی تھی میں نے اس کے دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں سن کر مڑ کے دیکھا۔ اس کا اگلا بمپر ٹیکسی کے پچھلے بمپر سے تقریباً ملا ہوا تھا اور چار آدمی اس سے اتر کر ٹیکسی کے دروازے کے قریب پہنچ چکے تھے۔

میں نے ڈرائیور کی گنجی چندیا پر گھونسا رسید کیا اور وہ کراہ کر اسٹیرنگ پر سر رکھ کر ساکت ہو گیا۔ عین اسی لمحے پچھلا دایاں دروازہ کھلا اور ساتھ ہی میں نے ماہتاب کی چیخ سنی۔ کسی نے اسے بے دردی سے باہر گھسیٹ لیا تھا۔ میں نے اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر قدم رکھا ہی تھا کہ میرے سر پر کسی ٹھوس اور وزنی چیز سے ضرب پڑی اور میرا ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔

جب میری آنکھ کھلی تو میرے سر کے پچھلے حصے میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ کئی مرتبہ سر جھٹکنے کے بعد میری آنکھوں کے سامنے پھیلی ہوئی دھند تو چھٹ گئی لیکن سر کا درد کچھ بڑھ گیا۔ میری نظر سب سے پہلے مدن پر پڑی جو پلستر سے ڈھکا ہوا اپنا ایک بازو' گلے میں حمائل پٹی کے حلقے میں لٹکائے مجھ سے کچھ فاصلے پر سامنے ہی کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر ایسی خوفناک مسکراہٹ تھی کہ وہ اپنی عمر سے کہیں بڑا اور خون خوار نظر آ رہا تھا۔

اس کے عقب میں سیڑھیاں تھیں جو اوپر کو جا رہی تھیں اور ان کے وسط میں ایک سیڑھی پر چیچک زدہ چہرے والا ایک سیاہ فام کیم شحیم آدمی بیٹھا چمکیلے پھل والے ایک لمبے سے چاقو کی دھار پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ اس کے جسم پر ڈھیلی ڈھالی شلوار قمیص اور واسکٹ تھی' گلے میں سرخ مفلر لپٹا ہوا تھا۔ میں نے ہاتھ ہلانا چاہے تو احساس ہوا کہ وہ میری پشت پر بندھے ہوئے ہیں۔ یہ غالباً" کوئی تہہ خانہ تھا جس کا فرش اینٹوں کا تھا۔ اور چھت میں ایک لمبی سی تار کے سرے پر ایک بڑا سا بلب جھول رہا تھا لیکن تہہ خانے کی لمبائی چوڑائی کی مناسبت سے اس کی روشنی کم معلوم ہو رہی تھی۔

تہہ خانے میں دو آدمی اور تھے جو اسٹینڈز پر لگی ہوئی دو بڑی بڑی فلڈ لائٹس خاص زاویوں پر کھڑی کر رہے تھے ان لائٹس کے درمیان ایک بیڈ لگا ہوا تھا جس پر بستر اور تکیہ بھی موجود تھا۔ بیڈ کی پائنتی کی طرف اسٹینڈ پر ایک کیمرہ فٹ تھا۔ فلڈ لائٹس روشن نہیں تھی ان کے ساتھ منسلک تاریں سیڑھیوں سے ہوتی ہوئی اوپر کہیں جا رہی تھیں۔ کیمرے کے قریب چھدرے سے بالوں والا ایک پستہ قد بوڑھا کھڑا جلدی جلدی سگریٹ کے کش لے رہا تھا اور متوحش نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ منظر بالکل ایسا ہی تھا جیسے کسی فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہو۔

مجھے ہوش میں آتے دیکھ کر مدن کی مسکراہٹ پھیل گئی۔ تھوڑی سی کوشش کر کے میں اٹھ بیٹھا۔ مدن کچھ اور قریب آ گیا اور ٹانگیں چوڑی کر کے یوں کھڑا ہو گیا گویا کوئی اناڑی شکاری اپنے ہلاک کئے ہوئے شیر کے قریب آ رہا ہو اور سوچ رہا ہو کہ کس پوز میں تصویر کھنچوائے۔ "کیا حال ہے ہیرو؟" اس نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

"حال پوچھنا ہی ہے تو ہاتھ کھول کر پوچھو۔" میں نے کہا۔

"نہیں نہیں۔" اس نے انگلی اٹھا کر شاطرانہ لہجے میں کہا۔ "مجھے ہیرو بننے کا کوئی

شوق نہیں میں تو موقع دیکھ کر وار کرنے کا عادی ہوں' اس وقت موقع میرے ہاتھ میں ہے چھمن دادا یہاں موجود ہے۔" اس نے سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے مکروہ صورت آدمی کی طرف اشارہ کیا۔ "اگر میں تمہارے ہاتھ کھول بھی دوں تو ضرورت پڑنے پر چھمن دادا تمہیں بیچ میں سے لکڑی کی طرح توڑ سکتا ہے لیکن میں خواہ مخواہ شیخی میں آ کر کوئی خطرہ کیوں مول لوں' مجھے کیا ضرورت ہے؟"

"یہاں ایک چھوٹا سا ڈرامہ ہو رہا ہے۔ جس کا نام ہے "بے عزتی کا بدلہ۔" تم چاہو تو اسے ضد کی تکمیل کا نام بھی دے سکتے ہو۔ ماہتاب میری ضد بن چکی ہے اور میں نے ہر قیمت پر اسے حاصل کرنے کا تہیہ کر رکھا ہے۔" اس نے ایک نظر ماہتاب کی طرف دیکھا اور یکلخت اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔ "کچھ دیر بعد یہاں میری اور ماہتاب کی ایسی بہت سی تصویریں بنائی جائیں گی جنہیں مہذبانہ زبان میں قابل اعتراض کہا جاتا ہے۔ بے فکر رہو' ان تصویروں میں میرا یہ پلستر زدہ بازو نظر نہیں آئے گا۔" اس نے اپنے مضروب بازو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نہایت استہزائیہ لہجے میں کہا۔ "یہ بڑے میاں جن کا اصل نام تو کچھ اور ہے مگر ہم انہیں بھولے رام کہتے ہیں' اس قسم کی فوٹوگراف میں بڑے ماہر ہیں' یوں سمجھو اپنے فن کے بادشاہ ہیں۔"

اس نے کیمرے کے قریب کھڑے بدحواس بوڑھے کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ ہندوستان کی کئی ابھرتی ہوئی فلمی ہیروئنوں کی بڑی "نادر" تصاویر بنا چکے ہیں۔ اب تم شاید پوچھو گے کہ میں اتنا تردد کس لئے کر رہا ہوں؟ اگر مقصد صرف ماہتاب کو داغدار کرنا ہی ہے تو وہ میں اب بھی کر سکتا ہوں لیکن ایسا نہیں ہے۔ میں جب کسی چیز کو حاصل کرتا ہوں تو اس وقت تک اپنے قبضے میں رکھنا پسند کرتا ہوں جب تک میرا دل نہ بھر جائے اور ماہتاب کے سلسلے میں بھی ایسا ہی بندوبست کر رہا ہوں۔"

میری کنپٹیوں میں خون ٹھوکریں مارنے لگا [illegible] میں اپنے اندر ہمت نہیں پا رہا تھا کہ مڑ کر ماہتاب کے تاثرات دیکھ سکوں۔

ان تصویروں کے نیگیٹو میرے علاوہ چھمن دادا اور اس کے خاص آدمی کے پاس محفوظ رہیں گے۔" مدن نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "کل سے ہم تینوں معمول کے مطابق کالج اٹینڈ کر رہے ہونگے لیکن امتحان سے فارغ ہوتے ہی میں ماہتاب کے ماں باپ سے ماہتاب کا رشتہ طلب کروں گا اور ماہتاب انہیں مجبور کرے گی کہ وہ یہ رشتہ قبول کر لیں اگر ماہتاب ایسا نہیں کرے گی یا میرے بجائے تم یا کوئی بھی اور لڑکا ماہتاب سے شادی کی کوشش کرے گا تو ان تصویروں کے پرنٹ کالج کے ہر لڑکے کے ہاتھ میں پہنچ جائیں گے جس کلب میں ماہتاب کے ابا بیٹھتے ہیں' اس کے پارکنگ لاٹ اور لان میں اچانک یہی پرنٹ بکھرے پائے جائیں گے اور ماہتاب یا اس کی فیملی کا کوئی جاننے والا ان کے نظارے سے

محروم رہ جائے گا تو اسے بذریعہ ڈاک بھیجے جائیں گے۔ غرضیکہ بے چاری ماہتاب ...... اپنا یہ چاند سا چہرہ کسی کو دکھانے کے قابل نہیں رہے گی۔ کسی جوانمرد میں اسے اپنانے کا حوصلہ نہیں رہے گا اور اس موقع پر بھی صرف آپ کے اس خادم کے دل کا دروازہ کھلا رہے گا اور سماج سے منہ چھپاتی اس برائی کو قبول کرنے کے لئے تیار ہو گا۔"

"بڑا بودا منصوبہ ہے۔" میں نے کہا۔ "تمہارا کیا خیال ہے کہ یہاں سے نکلنے کے بعد میں تمہیں زندہ چھوڑ دوں گا؟ اس ساری کارروائی کے بعد؟"

"تم مجبور ہو گے۔" مدن نے تیزی سے کہا۔ "پرنٹ چھمن دادا کے علاوہ اس کے ایک خاص آدمی کے پاس بھی موجود ہونگے جس کا اتا پتا تمہیں معلوم نہیں۔ اگر مجھے کوئی گزند پہنچا تب بھی پرنٹ اسی طرح پھیل جائیں گے جس طرح میں نے بتایا ہے۔ اگر تم مجھے اور بالفرض کسی طرح چھمن دادا کو بھی مار ڈالو تب بھی یہی ہو گا اس لئے امید ہے کہ تم ماہتاب کی نیک نامی کے لئے ہیرو بننے کی کوشش نہیں کرو گے کیونکہ اس سے فائدے کی بجائے ناقابل تلافی نقصان ہو گا۔"

"منصوبے میں ایک جھول اور ہے۔" میں نے کہا۔ "آخر تمہیں چھمن دادا پر اتنا اعتماد کیوں ہے؟ پرنٹ اس کے قبضہ میں ہونگے اس کی کیا گارنٹی ہے کہ کل کو یہ تمہیں بلیک میل نہیں کرے گا؟"

سیڑھیوں پر بیٹھا چھمن دادا غرایا لیکن مدن نے گویا میری کم عقلی پر قہقہہ لگاتے ہوئے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ "تم بات سمجھ نہیں رہے۔" وہ بولا۔ "ماہتاب میری ضد ہے میری عزت نہیں کہ چھمن دادا مجھے بلیک میل کر سکے اور پھر چھمن دادا بڑا بااصول آدمی ہے مجھے اس پر اس لئے اعتماد ہے کہ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں یہ کسی بھی کام کے منہ مانگے پیسے لیتا ہے مگر پھر معاہدے کی پابندی اس طرح کرتا ہے کہ جان پر بھی کھیلنا پڑے تو دریغ نہیں کرتا۔"

"اگر بات اتنی ہی تھی۔" میں نے کہا۔ "تو مجھے یہاں لانے کی زحمت کیوں کی گئی؟ یہ کام تو صرف ماہتاب کو اغوا کر کے بھی ہو سکتا تھا۔"

"اس کی کئی وجوہات تھیں۔" مدن نے بڑی خوش دلی سے کہا۔ "پہلی بات تو یہ کہ تمہیں لایا نہیں گیا درحقیقت تم خود ہی آ گئے ہو۔ مجھے معلوم تھا کہ ماہتاب جب فون پر اپنے ابا کے فرضی ایکسیڈنٹ کی خبر سنے گی تو اس وقت اس کی گاڑی کالج میں موجود نہیں ہو گی اور تم ہی اسے ہسپتال پہنچانے کے لئے نکلو گے اس لئے میں نے احتیاطاً تمہاری گاڑی کی ٹنکی میں تھوڑی سی چینی ڈلوا دی تھی جب تمہیں ہمارے آدمی کی ٹیکسی سے اترتے وقت بے ہوش کیا گیا تب بھی ہم تمہیں سنسان سڑک پر بے ہوش چھوڑ کر آ سکتے تھے لیکن میری دلی خواہش تھی کہ تم بہ نفس نفیس یہ حسین ڈرامہ دیکھ سکو تاکہ یہ بات

شروع سے تمہاری سمجھ میں آ جائے۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ تمہاری کیفیت سے میں بھی اتنا ہی محظوظ ہو سکوں' جتنا اس روز تم کالج میں میرا بازو توڑ کر اور میرے دوستوں کو بے ہوش کر کے ہو رہے تھے۔" اس کے چہرے کے عضلات میں کھنچاؤ سا آ گیا لیکن زہریلی مسکراہٹ ابھی بھی اس کے ہونٹوں پر منجمد تھی۔

"یہ ساری باتیں مجھے اب بھی بچکانہ سی لگ رہی ہیں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "مجھے تم چودہ سال کے ایسے ناسمجھ لڑکے لگ رہے ہو جس کا دماغ بہرام ڈاکو کے کارنامے پڑھ پڑھ کر خراب ہو گیا ہے۔ سب سے زیادہ حیرت تو مجھے اس بات پر ہے کہ تم سب سے زیادہ انحصار اس چھمن دادا پر کر رہے ہو اور اسی کے برتے پر اچھل رہے ہو' جو مجھے شکل سے ہی پکا خبیث لگ رہا ہے۔ یہ نطفہ ناتحقیق .... کرائے کا بدمعاش......"

میں نے چھمن دادا کو تین چار ننگی ننگی گالیاں اور دے دیں جن کا رد عمل وہی ہوا جو میں چاہتا تھا چھمن دادا چوٹ کھائے اژدہے کی طرح تڑپ کر اپنی جگہ سے اچھلا اور سیڑھیوں سے کود کر پھنکارتا ہوا میری طرف لپکا۔ اس کا چیچک زدہ سیاہ چہرہ شدت غضب سے بالکل ہی مسخ ہو کر رہ گیا تھا اور سرخ سرخ آنکھوں سے اب تو گویا خون ہی ٹپک پڑا تھا۔ چاقو پر اس کی گرفت مضبوط ہو گئی تھی۔

میں اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا میرے لئے اتنا ہی غنیمت تھا کہ میری ٹانگیں بندشوں میں جکڑی ہوئی نہیں تھیں اگر اسے معلوم ہوتا کہ میں درحقیقت جوڈو کراٹے کا ماہر ہوں اور میرے لئے اپنی ٹانگیں بازوؤں سے بھی زیادہ اہم ہیں تو انہیں بھی ضرور بندھوا دیتا۔

"چھمن دادا ......" مدن چیخا۔ "اس کے قریب مت جانا ....."

مگر چھمن دادا ایک روایتی بدمعاش تھا جسے اپنے آپ پر بڑا زعم ہوتا ہے میری مغلظات سن کر وہ رک نہیں سکتا تھا۔ قریب پہنچ کر اس نے اپنی دانست میں میری آنتیں نکال دینے کے لئے چاقو سے وار کیا میں عین اس وقت اس کے سامنے سے ہٹا جب چاقو کی نوک میرے پیٹ سے دو انچ دور رہ گئی تھی۔ چاقو کا پھل پختہ دیوار سے ٹکرایا اور کچھ پلستر اکھڑ کر زمین پر جا گرا۔ چھمن بگڑے ہاتھی کی طرح ذرا سا لڑکھڑایا۔ میں ایڑی کے بل گھوما اور میری لات اس کی پشت پر پڑی۔ اس کا سر توپ کے گولے کی طرح دیوار سے ٹکرایا آدمی سخت جان تھا ورنہ وہیں ڈھیر ہو جاتا۔

اس نے سیدھا ہونے کی کوشش کی لیکن اس سے پہلے میری دوسری لات اس کے منہ پر پڑی۔ اس کا مسخ شدہ چہرہ اور مسخ ہو گیا ایک خوفناک ڈکراہٹ کے ساتھ اس نے غصے میں اندھے ہو کر ہوا میں ہاتھ لہرائے۔ چاقو اس کے ہاتھ سے گر چکا تھا' اور اسے میں نے ٹھوکر کے ساتھ تہہ خانے کے اس حصے میں پہنچا دیا تھا جدھر روشنی بہت کم تھی۔ اسی لمحے میری نظر بروقت مدن پر پڑ گئی جو ریوالور نکال چکا تھا لیکن بائیں ہاتھ سے اسے نشانہ

لینے میں دقت پیش آ رہی تھی میں چھلانگ لگا کر اس کے قریب پہنچا اور اس کے سینے پر ایک لات رسید کی۔ وہ پچھلی دیوار سے ٹکرا کر اوندھے منہ گرا اور اپنے پلستر زدہ بازو کو تھام کر چیخنے لگا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا لیکن اس کے قریب ہی پڑا تھا تاہم اپنی تکلیف میں اسے اس کا ہوش نہیں رہا تھا۔

چھمن دادا میرے قریب پہنچا تھا' اس کا چہرہ خون میں چھپ گیا تھا وہ اب بھی اپنے زعم میں تھا اور کسی طرح مجھے پکڑ لینا چاہتا تھا۔ اگر وہ مجھے پکڑ لیتا تو شاید واقعی کچھ کر گزرتا۔ ایڑی کے بل گھوم کر میں نے ایک بار پھر چاکی داؤ آزمایا اور وہ اس تناور درخت کی طرح فرش پر آ رہا جس کی جڑیں طوفان نے اکھاڑ دی ہوں۔

عین اسی لمحے میں نے دیکھا کہ وہ دو نوجوان جو اسٹینڈز پر لگی ہوئی لائٹس درست کر رہے تھے ان میں سے ایک مدن پر سے پھلانگ کر سیڑھیوں کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔ وہ غالباً" تہہ خانے سے نکل کر دروازہ باہر سے مقفل کرنا چاہتا تھا یا پھر اوپر سے کوئی کمک لینے جا رہا تھا۔ میں لپک کر اس کے پیچھے پہنچا جب وہ تیسری سیڑھی پر قدم رکھ چکا تھا' اس کی ٹانگ میں ٹانگ پھنسا کر میں نے اسے پیچھے کھینچ لیا۔ وہ اوندھے منہ سیڑھیوں پر گرا اور درد سے بلبلایا۔ میں نے اس کی کنپٹی پر ہلکی سی ٹھوکر رسید کی اور وہ نیچے فرش پر آ گرا اور وہیں ساکت ہو گیا۔ دوسرا نوجوان اسٹینڈ سمیت ایک فلڈ لائٹ اٹھا کر میرے سر پر آن پہنچا تھا لیکن اس نے غالباً" دوسروں کے انجام سے سبق حاصل کیا تھا اور اندھا دھند مجھ پر وار نہیں کیا تھا۔

ہم ایک دوسرے کے سامنے نیم دائرے میں گھومنے لگے۔ دفعتہً" اس نے گرز کی طرح لائٹ کو گھمایا۔ میں پیچھے کو لیٹ کر دیوار سے جا لگا اور لائٹ سیڑھیوں سے ٹکرا کر چکنا چور ہو گئی۔ نوجوان نے لائٹ وہیں پھینک دی۔ اس کی نظر اچانک مدن کے ریوالور پر پڑ گئی تھی۔ وہ ریوالور کی طرف لپکا اور جلد بازی میں مار کھا گیا۔ میری ٹھوکر اس کی ناف پر پڑی۔ وہ ہوا میں کئی فٹ اوپر اچھلا اور ایک کربناک چیخ کے ساتھ فرش پر آ رہا۔ میں نے اسے بے ہوش کرنے کے لئے کنپٹی پر ٹھوکر والا طریقہ ہی آزمایا۔

میں نے دیکھا کہ مدن کا کانپتا ہوا ہاتھ ریوالور کی طرف رینگ رہا تھا اس کے قریب پہنچ کر میں نے ہاتھ پر ایڑی سے معمولی سی ضرب لگائی۔ اس نے کراہ کر ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ میں نے ریوالور کو بھی ٹھوکر مار کر تہہ خانے کی پرلی دیوار کے پاس پہنچا دیا۔

دفعتہً" مجھے احساس ہوا کہ بوڑھا فوٹو گرافر نظر نہیں آ رہا۔ میں نے اس کی تلاش میں نظر دوڑائی تو بیڈ کے نیچے مجھے اس کے جوتے حرکت کرتے دکھائی دیئے۔ "باہر آ جاؤ۔" میں نے بیڈ کے قریب پہنچ کر اس کے پیروں پر ہلکی سی ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔ بمشکل تمام وہ رینگتا ہوا بیڈ کے نیچے سے نکل آیا۔ صورت حال اگر کچھ اور ہوتی تو شاید میں اس کی

شکل دیکھ کر ہنسے بغیر نہ رہ سکتا لیکن اس وقت میری حس مزاح میرے جسم میں پھوٹتے پسینے کے ساتھ بہہ گئی تھی۔

"زندہ رہنا چاہتے ہو؟" میں نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔ اس کے نرخرے میں حرکت پیدا ہوئی اور اس نے باقاعدہ "ترچ" کی آواز کے ساتھ تھوک نگلتے ہوئے اثبات میں سرہلایا۔ اس کی دھندلی دھندلی آنکھیں پھیل کر کپ کے پیندے جتنی ہو چلی تھیں۔

"ادھر کہیں فرش پر چاقو پڑا ہے اسے ڈھونڈو۔" میں نے آنکھوں سے تہہ خانے کے اندھیرے گوشے کی طرف اشارہ کیا۔ "میں تمہارے پیچھے ہوں۔ کوئی غلط حرکت کی کوشش نہ کرنا' تم تو ایک ٹھوکر کی مار ہو۔"





وہ ڈگمگاتے قدموں سے اندھیرے گوشے کی طرف بڑھا۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ چاقو کے پھل کی جھلملاہٹ نے بوڑھے سے پہلے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ "وہ پڑا ہے۔" میں نے کہا۔ "اسے اٹھاؤ اور چل کر لڑکی کی بندشیں کاٹو۔ میں ایک بار پھر تنبیہہ کر رہا ہوں کہ کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کرنا ورنہ پچھتانے کی مہلت بھی نہیں ملے گی۔"

میں محض احتیاطاً اسے خبردار کر رہا تھا ورنہ اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ کوئی چالاکی دکھا سکتا اس کے مختصر سے جسم پر لرزا طاری تھا۔

چاقو اٹھا کر وہ ماہتاب کے پاس آیا جس کا چہرہ دہشت سے پیلا پڑا ہوا تھا۔ لیکن اب اس کی آنکھوں میں زندگی کی چمک لوٹ آئی تھی۔ بوڑھا گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس کی رسیاں کاٹنے لگا۔ میری نظر اس کے ہاتھوں کی حرکت پر تھی جو اب بھی اس طرح کانپ رہے تھے کہ مجھے خدشہ محسوس ہونے لگا کہ وہ رسی کی بجائے ماہتاب کے ہاتھ کی کوئی رگ نہ کاٹ دے۔ "سنبھل کر کاٹو۔" میں نے اسے نرم لہجے میں تنبیہہ کی ......

ہاتھ کھلتے ہی ماہتاب اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنی کلائیوں کو مسلنے لگی۔ نازک جلد پر رسیوں نے گہرے سرخ نشان ڈال دیئے تھے۔ "ماہتاب! بوڑھے سے چاقو لے لو اور جلدی سے میری رسیاں بھی کاٹ دو۔"

ماہتاب نے میری بندشیں کاٹ ڈالیں تو میں نے اطمینان کی سانس لے کر اپنی کلائیوں کا جائزہ لیا۔ اچھل کود کے دوران بازوؤں کے عضلات بھی زبردست کھنچاؤ کا شکار رہے تھے اور رسیوں کی رگڑ سے میری کلائیاں چھل چکی تھیں۔ ماہتاب سے چاقو لے کر میں نے اسے بند کر کے جیب میں ڈالا۔ پھر دوسرے گوشے میں جا کر ریوالور تلاش کیا اور اسے بھی جیب میں رکھ لیا۔ میں واپس مڑا تو بوڑھا خبط الحواسوں کی طرح راستے میں کھڑا تھا۔ میں نے گریبان سے پکڑ کر اسے فرش سے اوپر اٹھا لیا۔ وہ کٹھ پتلی کی طرح ہوا میں ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔

"تمہیں کتنے پیسے ملے تھے اس کام کے؟" میں نے پوچھا۔

"چار ہزار۔" وہ خرخراتی آواز میں بولا۔ "دو ہزار ایڈوانس اور دو ہزار بعد میں ملنے

تھے۔"

میں نے اسے فرش پر کھڑا کیا اور اس کا کیمرہ اٹھا کر فرش پر دے مارا' حالانکہ اس حرکت کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ابھی تو کیمرہ استعمال بھی نہیں ہو پایا تھا۔ لیکن میرے اندر جو غصہ ابل رہا تھا' اسے نکاس کو کوئی راستہ نہیں مل رہا تھا۔ مدن نے اگر بات میری ذات تک محدود رکھی ہوتی تو شاید میری یہ کیفیت نہ ہوتی۔ لیکن اس نے ماہتاب پر ہاتھ ڈالنے کے لئے جو گھٹیا اور غلیظ منصوبہ بنایا تھا اس پر میرا دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ تہہ خانہ میں موجود تمام افراد کے سر ایڑیوں سے کچل دوں تاکہ یہ زہریلے سانپ آئندہ معاشرے میں رینگنے کے قابل نہ رہیں لیکن میری عقل سرد ست مجھے قتل اور خونریزی سے دامن بچائے رکھنے پر مجبور کر رہی تھی۔ اس لئے میں نے ہر ممکن کوشش کی تھی کہ میرے کسی وار سے کوئی مرنے نہ پائے' صرف وقتی طور پر ناکارہ ہو جائے۔ البتہ پھمن دادا پر مجھے مجبوراً خطرناک وار کرنا پڑا تھا کیونکہ میرے ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور کسی دوسرے طریقے سے اس کا میرے قابو میں آنا مشکل تھا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی اور مجھے امید نہیں تھی کہ وہ دوبارہ اپنے پیروں پر چلنے کے قابل ہو سکے گا۔

کیمرے کے ٹکڑے ادھر ادھر بکھر چکے تھے۔ میں نے بوڑھے کی طرف مڑتے ہوئے کہا ...... "جو دو ہزار روپے تمہیں مل چکے ہیں' ان سے دوسرا کیمرہ خرید لینا اور آئندہ ایسا کام نہ کرنا۔ اس بڑھاپے میں تمہیں ایسے کام زیب نہیں دیتے۔"

میں مدن کے قریب پہنچا اور گردن سے پکڑ کر اسے اٹھایا وہ بری طرح کراہ رہا تھا۔ میں نے اس کے منہ پر الٹے ہاتھ کا تھپڑ رسید کیا۔ وہ الٹ کر دیوار کے ساتھ جا لگا۔ اس کے ہونٹوں سے خون کی پتلی سی لکیر بہہ نکلی۔

"یہ دوسرا اور آخری موقع ہے کہ میں تمہیں زندہ چھوڑ رہا ہوں۔ خارش زدہ کتے!" میں نے اپنے سینے میں بھڑکتی ہوئی آگ کو بمشکل دباتے ہوئے کہا۔ "لیکن آئندہ تم نے ایسی جرات کی تو میں نتائج کی پروا کئے بغیر کم از کم تمہارا پتا تو صاف کر ہی دوں گا ......"

میں نے اس کے گھٹنے پر ٹھوکر رسید کی۔ "اوپر کتنے آدمی ہیں؟"

"کوئی نہیں ......" وہ کراہا۔

میں نے ماہتاب کا ہاتھ پکڑا اور سیڑھیوں کی طرف چل دیا۔ وہ ابھی تک گویا ایک عالم خواب میں چل رہی تھی۔ سیڑھیوں کے اختتام پر چھوٹا سا دروازہ تھا۔ میں نے اس سے سر نکال کر ادھر ادھر دیکھا۔ ہمارے سامنے ایک وسیع ہال تھا جس میں کوئی فرنیچر وغیرہ نہیں تھا۔ دیواروں کا پلستر بھی جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔ اس ہال سے گزر کر ہم ایک کمرے میں آ گئے۔ یہ بھی خالی تھا۔ مدن نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اوپر کوئی نہیں ہے۔ اس کمرے سے گزر کر ہم برآمدے میں آ گئے اور تب میں نے دیکھا کہ یہ شہر کے مضافات میں واقع ایک

چھوٹا سا مکان تھا جو غالباً" مدت سے غیر آباد تھا۔ اس کے چھوٹے سے لان پر جھاڑ جھنکار پھیلا ہوا تھا اور دیواروں پر سیلن زدہ سیاہی سی جمی ہوئی تھی۔

برآمدے کے قریب مدن کی گاڑی کھڑی تھی۔ اس کے اگنیشن میں چابی نہیں تھی۔ میں چاہتا تو واپس جا کر مدن سے چابی لا سکتا تھا مگر میں نے مناسب نہیں سمجھا۔ "سڑک پر چلتے ہیں۔" میں نے ماہتاب سے کہا میرا خیال ہے اس علاقے سے شہر کے لئے ہمیں کوئی بس مل جائے گی۔"

"منصور!" ماہتاب نے میرا ہاتھ تھام کر چلتے ہوئے کہا۔ "مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا کہ ہم اس مصیبت سے نکل آئے ہیں۔" اس کے ہاتھ میں اب بھی ہلکی لرزش تھی۔

"اب تو یقین کر ہی لو ڈیئر!" میں نے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ میں نے اسے پہلی مرتبہ ڈیئر کہا تھا۔ اس کے رخساروں پر زندگی کے گلاب ایک بار پھر کھل اٹھے۔ چند قدم چل کر وہ جیسے کچھ سوچ کر غصیلے لہجے میں بولی .... "میں ابو سے کہہ کر اس خبیث مدن کو مزہ چکھاؤں گی۔"

"نہیں۔" میں نے کہا۔ "سارا مسئلہ تو یہی ہے کہ میں اس معاملے کی ہوا بھی کسی کو لگنے نہیں دینا چاہتا۔ بات خوامخواہ پھیل کر بتنگڑ بن جاتی ہے اور تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ ہمارے معاشرے میں بعض اوقات افواہوں سے لڑکیوں کا مستقبل برباد ہو جاتا ہے۔ مدن میں اگر ذرا سی بھی عقل ہو گی تو آئندہ وہ کوئی حماقت نہیں کرے گا۔"

"میں تو اس کالج میں آ کر پھنس ہی گئی۔" ماہتاب نے اپنا سکارف درست کرتے ہوئے کہا۔ "میں اب سنجیدگی سے سوچ رہی ہوں کہ کسی اور کالج میں داخلہ لے لوں۔"

"اگر تم اس کالج میں نہ آئی ہوتیں تو مجھ سے تمہاری ملاقات کیونکر ہوتی؟" میں نے کہا۔

"ملاقاتیں اگر آسمان پر لکھ دی گئی ہوں تو وہ ہو کر ہی رہتی ہیں۔ مقامات کی تبدیلی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" وہ مسکرائی۔

"بڑا فلسفہ بولا جا رہا ہے۔" میں نے آہستگی سے اس کا ہاتھ دبایا۔

"فلسفہ نہیں یہ حقیقت ہے۔" اس نے شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ پھر یک لخت سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔" وہ بات بیچ ہی میں رہ گئی.. مجھے واقعی مدن سے خوف آنے لگا ہے۔ وہ ایک آسیب کی طرح میرے پیچھے پڑ گیا ہے۔"

"آج میرے ہاتھوں اس کا اور اس کے کرائے کے بدمعاشوں کا حشر دیکھنے کے بعد بھی تمہیں اس سے خوف آ رہا ہے؟" میں نے کہا۔ "اس کا معاملہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ تم اب میری ذمے داری ہو۔"

"ابھی سے؟" وہ شرارت سے مسکرائی۔ "ابھی تو تم میرے ابو سے بھی نہیں ملے۔"

"آج مل ہی لیتے ہیں۔ اب تو سچویشن بھی پیدا ہو گئی ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ تو ٹھیک ہے۔" اس نے مسکراہٹ کے ساتھ اثبات میں سر ہلا دیا۔ ہم اب مین روڈ پر آ پہنچے تھے۔ سورج ڈھلنے لگا تھا۔ میں نے سڑک پر کھڑے ہو کر انتظار کرنے کے بجائے چلتے رہنا بہتر سمجھا۔ کچھ دیر بعد ہم نے پیچھے سے آتی کسی گاڑی کی آواز سنی۔ ہم نے مڑ کر دیکھا وہ کوئی انگریز جوڑا تھا۔ میں نے فوراً" لفٹ کے لئے اشارہ دیا۔ انگریز نے کار روک لی۔

لفٹ لے کر راستے میں ہم انگریز جوڑے سے جھوٹی سچی باتیں کرتے ڈیوڈ لین تک آئے اور شکریہ ادا کر کے اتر گئے۔ وہاں سے ماہتاب کے گھر کا فاصلہ ایک فرلانگ کا تھا۔ کچھ دیر بعد میں ماہتاب کی رہنمائی میں جس بنگلے میں داخل ہوا وہ زیادہ طویل و عریض تو نہیں لیکن خوبصورت ضرور تھا۔ لان پر ایک ادھیڑ عمر آدمی چھڑی لئے بے چینی سے ادھر ادھر ٹہل رہا تھا۔ یہ غالباً" ماہتاب کے ابو تھے۔ حالانکہ ابھی سردی مکمل طور پر نہیں آئی تھی لیکن انہوں نے تھری پیس سوٹ پہن رکھا تھا۔ سر پر ترکی ٹوپی تھی اور ناک پر موٹے موٹے عدسوں کی کمانی دار عینک۔ تقریباً" انہی کی عمر کی ایک سجی سنوری میانہ قد خاتون جن کے جسم پر ایک کامدار ساڑھی بڑے سلیقے سے لپٹی ہوئی تھی' ان کے قدم سے قدم ملا کر ٹہلنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ وہ دونوں تیز تیز لہجے میں کوئی بات کر رہے تھے۔

"ماہتاب!" ہم پر نظر پڑتے ہی وہ بے تابی سے چلائے اور پھر دونوں ہماری طرف لپکے۔ دونوں نے بیک وقت ماہتاب کو لپٹا لیا۔

"تم کہاں تھیں بیٹی اب تک؟" بڑے میاں نے عینک سنبھالتے ہوئے کہا۔ "ڈرائیور تمہیں لینے گیا تو تمہاری ایک کلاس فیلو نے بتایا کہ تمہیں فون ...."

"ہاں ابو! نجانے کن بدمعاشوں نے میرے لئے یہ جال پھیلایا تھا۔" ماہتاب بولی۔ "وہ تو شکر ہے کہ منصور مجھے اپنی گاڑی میں چھوڑنے چل پڑے تھے۔ راستے میں چار بدمعاشوں نے مجھے اغوا کرنے کی کوشش کی لیکن منصور نے ان سب کو مار بھگایا .... منصور میرے کلاس فیلو ہیں۔" اس نے میری طرف اشارہ کیا۔ "اور یہ میرے ابو ہیں۔ نواب زادہ سراج علی خان۔"

"اوہ .... تو اب دن دھاڑے ایسی غنڈہ گردی ہونے لگی ہے۔ کون تھے وہ بدمعاش؟ میں انہیں چھٹی کا دودھ یاد دلا دوں گا۔" نوابزادہ سراج علی خان نے میری طرف مطلق توجہ دیئے بغیر ہوا میں چھڑی لہراتے ہوئے کہا۔ "یہ ضرور اس کم بخت فیروز خان کی شرارت ہو گی۔ وہ اب ان طریقوں سے میری دولت ہتھیانا چاہتا ہے۔ میں تو سوتیلا ہونے کے باوجود اس کا لحاظ کرتا ہوں .... اسے ہمیشہ بھائیوں جتنی عزت دیتا رہا ہوں لیکن ...."

"تقریر بعد میں کرتے رہنا ...." بیگم سراج نے ناگواری سے مداخلت کی۔ "بچے ہلکان ہو رہے ہیں۔ ذرا دیکھو تو کیا ذرا ذرا سے منہ نکلے ہوئے ہیں۔ چلو اندر چلو۔"

"ارے ہاں بھئی ...." سراج صاحب نے میری طرف مصافحے کے لئے پہلے چھڑی اور پھر چونک کر اسے بغل میں دبا کر ہاتھ بڑھایا .... "کیا نام بتایا تھا ان کا بیٹی؟" انہوں نے ماہتاب سے پوچھا۔

"منصور!" ماہتاب نے میری طرف دیکھ کر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"ہاں تو منصور! بہت بہت شکریہ بھئی کہ تم نے ہماری جان کے لئے اپنی بیٹی کو میرا مطلب ہے ہماری بیٹی کے لئے اپنی جان کو خطرے میں ڈالا۔ آج کل کون کسی کے لئے اتنی تکلیف کرتا ہے۔ زمانے سے مہر مروت تو ...."

"پھر تقریر؟" بیگم سراج نے آنکھیں نکالیں .... "تمہیں تو جوہری کے بجائے لیڈر ہونا چاہئے تھا۔"

"وہ ہمیں اندر لائیں۔ ملازمہ کو ایرانی قہوہ لانے کا حکم دیا اور اطمینان سے بیٹھنے کے بعد سارا قصہ پوچھا۔" ماہتاب نے کافی ترامیم کے بعد نامعلوم غنڈوں کی کوشش اور میری بہادری کا قصہ سنایا۔ جس کے دوران سراج صاحب بار بار لقمہ دیتے رہے کہ یہ اس بدمعاش فیروز کے علاوہ کسی کی حرکت نہیں ہو سکتی اور ان کی بیگم بار بار ان کی تردید کر کے انہیں چپ کراتی رہیں۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ فیروز خان کے پاس تو شراب کا ادھا خریدنے کے لئے دس روپے نہیں ہوتے وہ کرائے کے بدمعاشوں کی خدمات کیسے حاصل کر سکتا تھا۔

"میں تو پولیس کو اطلاع دینے والا تھا ...." ماہتاب کے خاموش ہونے پر سراج صاحب بولے .... "ایس پی سریندر ناتھ میرا لنگوٹیا ہے شہر کے سارے بدمعاشوں کو لائن حاضر کرا دیتا تھا میں نے۔"

"میں تو کہتی ہوں چلو جو کچھ ہوا سو ہوا لیکن خدا نے کرم یہ کیا کہ اس بچے کو فرشتہ رحمت بنا کر ماہتاب کے ساتھ بھیج دیا۔" بیگم سراج جھرجھری لیتے ہوئے بولیں۔ پھر وہ میرے اور میرے گھربار کے متعلق کرید کرید کر پوچھنے لگیں۔

میں نے انہیں بتایا کہ میرے والد کا میرے بچپن ہی میں انتقال ہو چکا ہے۔ والدہ دستکاری کا ایک ادارہ چلاتی ہیں۔ جس کا مالک کوئی اور ہے' باپ کا چھوڑا ہوا تھوڑا سا اثاثہ موجود ہے۔ جس سے میری والدہ گریجویشن کے بعد مجھے بزنس کرانا چاہتی ہیں۔"

"ماشاء اللہ .... ماشاء اللہ۔" میرے خاموش ہوتے ہی سراج صاحب بول اٹھے .... "بھئی ہمارا ارادہ تو گریجویشن کے بعد ماہتاب کو ولایت بھیجنے کا ہے۔ لیکن اس سے پہلے اس کے ہاتھ پیلے ضرور کر دیں گے .... پھر اگر ان کے میاں کی مرضی ہوئی تو وہ بھی

ساتھ چلے جائیں گے ہم نے تو سوچ رکھا ہے لڑکا خواہ کیسا ہو اور اس کے حالات کیسے بھی ہوں مگر بس وہ غیرت مند اور خاندانی ہو .... دیکھو نا میاں .... مالی حالات کا کیا ہے۔ یہ تو بدلتے ہی رہتے ہیں۔ آج کوئی انسان پانچ ہزار کماتا ہے کل کو پانچ لاکھ بھی کما سکتا ہے لیکن خاندان نہیں بدلتا۔ سچ آج بھی سچ ہے کل بھی سچ رہے گا چاہے اس کے پاس لاکھوں روپیہ آ جائے اور نجیب الطرفین ہمیشہ نجیب الطرفین ہی رہے گا خواہ اس کی جیب خالی ہو .... کیوں بیگم؟" انہوں نے تائید طلب نظروں سے بیگم کی طرف دیکھا۔ ماہتاب نے کچھ زیادہ ہی سر جھکا لیا تھا اور قہوے کی چسکیاں لینے لگی تھی۔

"تم تو ہمیشہ فضول کی باتیں لے کر بیٹھ جاتے ہو۔" بیگم نے مصنوعی خفگی سے کہا اور پھر مجھ سے مخاطب ہوئیں "تمہاری ذات کیا ہے بیٹے؟"

"ہم لوگ مغل ہیں۔" میں نے کہا۔ فون 03036360459

"دیکھا .... مجھے تو پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ لڑکے کی رگوں میں جوشیلا خون دوڑ رہا ہے۔" سراج صاحب نے بات اچک لی۔ "بھئی چار بدمعاشوں کو تن تنہا بھگا دینے والا مغلوں ہی کی نسل سے ہو سکتا ہے۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔ "لیکن میاں مغلوں کے انجام سے دل چھوٹا مت کرنا .... بادشاہوں کے ساتھ اونچ نیچ ہوتی ہی رہتی ہے۔ اب ہم مغلوں کی تاریخ ...."

"خان صاحب ...." بیگم سراج نے اپنے میاں کو گھورا اور وہ دبک کر قہوے کی طرف متوجہ ہو گئے۔

ماہتاب کے والدین سے ملاقات بڑی دلچسپ رہی رات کو جب میں گھر لوٹا تو میرا موڈ تمام تر تھکن کے باوجود نہایت خوشگوار تھا۔ ماہتاب کے والدین نے مجھے پسند کیا تھا اور حسین مستقبل کی خوشبو میرے قریب آ چلی تھی۔ اگلی صبح میں جلدی گھر سے نکلا اور گاڑی میکینک کے ہاں پہنچا کر کالج چلا گیا۔

اس دن سے میرا تقریباً" معمول ہی بن گیا کہ کالج سے واپسی کے بعد شام کو میں ماہتاب کے ہاں چلا جاتا اس کے والدین کی موجودگی میں ویسی باتیں تو نہیں ہو سکتی تھیں جیسی دو چاہنے والے کیا کرتے ہیں۔ پھر بھی وقت اچھا گزر جاتا تھا۔

مدن ان دنوں کالج نہیں آ رہا تھا .... تقریباً" دس دن بعد وہ کلاس میں نمودار ہوا بڑا ہشاش بشاش نظر آ رہا تھا۔ اس کے چوٹوں کے نشان مندمل ہو چکے تھے لیکن بازو پر بدستور پلستر تھا۔ پہلا پیریڈ مہتہ جی کا تھا وہ حاضری لینے لگے تو مدن کی آواز سن کر چونکے۔ "سناؤ بھئی تمہاری صحت ٹھیک ہو گئی ہے؟" انہوں نے محتاط لہجے میں کہا۔ پھر مدن کو کھڑے ہوتے دیکھ کر بولے۔ "بھئی تم تو پہلے سے زیادہ صحت مند نظر آ رہے ہو .... لگتا ہے اتنے دن خوب آرام کیا ہے۔"

"آرام کہاں سر!" مدن مسکرا کر بولا۔ "میں تو بڑی بھاگ دوڑ میں لگا ہوا تھا اور
بھگوان کی کرپا سے میری بھاگ دوڑ بڑی نتیجہ خیز ثابت ہوئی۔ مجھے ایک ایسے راز کا پتہ چلا
ہے جس کا جاننا شاید پوری کلاس کے لئے مفید ہو اور خاص کر مس ماہتاب کے لئے۔"
اس نے چبھتی ہوئی نظروں سے ماہتاب کی طرف دیکھا اور اس کی نظروں کے تعاقب سے
سب کی نظریں ماہتاب پر مرکوز ہو گئیں۔
مہتہ جی نے کوئی سوال نہیں کیا لیکن مدن نے بات جاری رکھی۔ "مس ماہتاب کو یہ
سن کر خوشی ہو گی کہ مسٹر منصور' جنہیں وہ اپنا جیون ساتھی بنانے کے خواب دیکھ رہی ہیں'
ایک طوائف کے بیٹے ہیں۔"
پوری کلاس پر چھایا ہوا سناٹا یک لخت کچھ اور گہرا ہو گیا ...... ایک لمحے کے لئے تو
گویا کائنات کی گردش تھم گئی ...... میرے جسم سے شاید کسی نے روح کھینچ لی تھی کہ میں
کچھ بولنا تو درکنار' پلک تک نہیں جھپکا رہا تھا ...... شاید میرے قدموں تلے کوئی ڈائنا
میٹ پھٹ گیا تھا۔ میرے چیتھڑے اڑ چکے تھے اور میری روح اس وقت عالم فانی اور عالم
بالا کے درمیان کہیں معلق تھی۔ میں چیخنا چاہتا تھا اور اس کائنات کو تہہ و بالا کر دینا چاہتا
تھا۔ لیکن اس وقت جسم کا ایک رواں بھی شاید میرے اختیار میں نہیں تھا۔
پھر جیسے دھماکے سے اڑتی ہوئی گرد ذرہ ذرہ کر کے دوبارہ زمین پر آ جمع ہوئی۔ میرا
بکھرا ہوا وجود یکجا ہوا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس عمل میں چند صدیاں لگی تھیں یا چند لمحے۔
جب مدن کا چہرہ میری نظروں میں صاف ہوا تو میں اٹھ کر اس تک پہنچا۔ میں نے اس کا
گریبان اس سختی سے پکڑا کہ اس کے پاؤں زمین سے چند انچ اوپر اٹھ گئے۔ کلاس روم میں
اس قدر گہرا سناٹا تھا کہ مجھے کسی کی موجودگی کا احساس ہی نہیں ہو رہا تھا۔
"تمہیں یہ کہنے کی جرات کس طرح ہوئی غلاظت کے کیڑے؟" میرے ہونٹوں سے
الفاظ' سانپ کی پھنکار کی طرح نکلے ...... "کیا تمہیں اپنی زندگی بالکل عزیز نہیں؟"
"مجھے مار کر تم حقیقت کو تو نہیں بدل سکتے۔" مدن نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔ "
آج نہیں تو کل لوگوں کو معلوم ہو ہی جائے گا کہ کل کی طوائف اور آج کی نائیکہ خانم جو
بمبئی کے فارس روڈ پر وہاں کا سب سے بڑا کوٹھا آباد کئے بیٹھی ہے وہ تمہاری ماں ہے۔"
میں نے اسے ڈیسک پر پٹخ دیا ...... وہ چوٹ کی پروا کئے بغیر بولا۔ "تم تو ایسے بن
رہے ہو جیسے تم کو اس حقیقت کا علم ہی نہیں تھا ...... کیا کسی بیٹے سے ماں کی اصلیت بھی
چھپی رہ سکتی ہے؟"
میں شاید اسے اسی وقت اور اسی جگہ ختم کر دیتا لیکن میرے ذہن کے کسی چور
دروازے سے شک کا سپولیا اندر رینگ آیا تھا۔ کوئی بغیر کسی بنیاد کے اس طرح منہ بھر کر
اتنی بڑی بات تو نہیں کہہ دیتا اور پھر بچپن سے میرے ذہن کے کسی تاریک گوشے میں پڑا

ایک بھولا بسرا سا سوال میرے سامنے یک لخت عفریت بن کر آ کھڑا ہوا تھا ...... آخر
ممی نے آج تک مجھے اپنے ساتھ کیوں نہیں رکھا تھا؟ پھر مجھے اپنی تنہائی زدہ بچپن کی وہ
رات یاد آئی جب میں نے ممی کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا تھا۔ "ممی! آپ مجھے اپنے
ساتھ کیوں نہیں لے جاتیں؟ کیا میں آپ کو اچھا نہیں لگتا جو آپ مجھے اپنے ساتھ نہیں
رکھتیں؟"
مجھے یاد تھا کہ اس سوال پر وہ کس طرح بلک بلک کر روئی تھیں۔ مجھے آج بھی یاد
تھا' انہوں نے کہا تھا ...... "ابھی وقت آیا نہیں بیٹے؟ تمہیں کیا معلوم کہ تمہاری ممی تم
سے دور رہ کر کس طرح زندگی گزار رہی ہے۔ ابھی وقت نہیں آیا ...... وقت نہیں آیا
......"
انہیں کس وقت کا انتظار تھا؟ کیا ملازمت پیشہ مائیں اپنے بچوں کو ساتھ نہیں
رکھتیں۔ کیا وہ اپنے بچوں کو میری طرح الگ گھر میں نوکروں کے ساتھ رکھ کر اتنے ہی
اخراجات کا بوجھ اٹھاتی ہیں؟ شک کے سپولئے نے آن کی آن میں ایسے بیسیوں سوالوں کا
زہر میری نس نس میں پھیلا دیا۔ میرے دانت اتنی سختی سے نچلے ہونٹ پر جمے ہوئے تھے کہ
رستے ہوئے خون کا کھارا پن زبان پر محسوس ہونے لگا تھا۔
میں نے ایک بار پھر مدن کو گریبان سے پکڑ کر اٹھایا۔ اس کی اٹکتی ہوئی سانسیں
میرے چہرے سے ٹکرا رہی تھیں۔ "سنو مدن!" میں نے اپنی روح کی تمام تر بچی کھچی توانائی
مجتمع کر کے بیٹھی بیٹھی سی آواز میں کہا۔ "اگر یہ بات غلط ہوئی تو یاد رکھنا کہ میں اسی جگہ
تمہیں ذبح کر کے تمہاری لاش کا ریشہ ریشہ الگ کر دوں گا۔"
"اگر یہ بات جھوٹ ہوئی تو میں خود ہی اپنی گردن اتار کر تمہارے ہاتھ میں دے
دوں گا۔" مدن نے اپنا گریبان چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ...... "اور اگر درست
ہوئی تو یہاں واپس مت آنا ...... کس منہ سے آؤ گے؟"
میں نے اسے ڈیسک پر پٹخا اور تیزی سے باہر چل دیا۔ میں نے اپنے عقب میں
ماہتاب کی آواز سنی لیکن یہ مجھے بہت دور کی آواز محسوس ہوئی۔ ہزاروں بدروحوں کے قہقہے
میرا تعاقب کر رہے تھے' ان میں ماہتاب کی آواز دب کر رہ گئی۔ طوفانی ہوا کے تھپیڑے
مجھے دھکیلے لئے جا رہے تھے۔ گراؤنڈ میں پہنچ کر میں نے گاڑی نکالی۔ اب نہ جانے کیوں
یک لخت ہی میرے ذہن و دل پر گہرا سناٹا چھا گیا تھا۔ ماحول پر بھی گویا موت کا سا سکوت
طاری تھا۔ گراؤنڈ میں درختوں پر اکا دکا پرندوں کی آوازیں مجھے قبرستان سے بلند ہونے
والے نوحوں سے مشابہ محسوس ہو رہی تھیں۔
گیٹ پر پہنچ کر ایک لمحے کے لئے گاڑی روک کر میں نے پیچھے دیکھا۔ ستونوں والے
برآمدے پر ایک برجی میں نصب گھڑیال کسی بیضوی چہرے والے عفریت کی طرح جھانک رہا

تھا۔ میں نے کالج کی پروقار عمارت پر ایک الوداعی نظر ڈالی۔ میں اپنی متاع حیات' اپنی محبت یہاں چھوڑے جا رہا تھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ میں واپس بھی آ سکوں گا یا نہیں؟ برآمدے میں میں نے ایک بھاگتی ہوئی لڑکی کی جھلک دیکھی شاید وہ ماہتاب ہی تھی۔ میں نے گاڑی تیزی سے آگے بڑھا دی۔ میں اس کا سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھ میں جرات ہی نہیں تھی۔

پونا سے بمبئی کا فاصلہ تقریباً" سو میل تھا۔ اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ کالج کی طرف سے تفریحی یا تعلیمی دوروں پر ہم کئی لڑکے' لڑکیاں سڑک کے راستے بمبئی گئے تھے اور کئی مرتبہ لڑکوں سے دبی دبی زبان میں' میں نے فارس روڈ کا تذکرہ سنا تھا لیکن کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایک روز دل پر ہزاروں اندیشوں کا بوجھ لئے ادھر کا رخ کرنا پڑے گا۔

میرا جی چاہ رہا تھا کہ سو میل کا یہ سفر کبھی ختم نہ ہو تاکہ اس سفر کے اختتام پر اگر کوئی ہولناک حقیقت واقعی میری منتظر ہے تو میں اس کا سامنا کرنے سے پہلے موت کی آغوش میں پہنچ جاؤں مگر فاصلہ گھٹتا گیا میں اس مجرم کی طرح ڈوبتے دل سے بمبئی کے قریب پہنچ رہا تھا جسے کسی ناکردہ جرم کی سزا میں پھانسی کے تختے کی طرف لے جایا جا رہا ہو

....

بمبئی پہنچ کر مجھے فارس روڈ پہنچنے کے لئے کئی جگہ راستہ دریافت کرنا پڑا۔ ہر شخص نے ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ مجھے راستہ بتایا۔ جب میں وہاں پہنچا تو بازار حسن میں شام اتر رہی تھی۔ یہ ایک لمبی سی خم دار سڑک تھی۔ جس کے اطراف میں نجانے کتنی گلیاں دائیں بائیں نکل رہی تھیں۔ بنی سنوری طوائفوں کے جھرمٹ ابھی اپنی رہائش گاہوں سے نکل کر اپنے اپنے کوٹھوں کی طرف آ رہے تھے۔ اکثر کوٹھوں کے دروازے کھلے تھے .... اور سازندے ابھی اپنے ساز درست کر رہے تھے۔ کہیں کہیں سے طبلے کی ادھوری تھپ تھپ' یا ہارمونیم کی "روں روں" کسی زخمی کراہ کی طرح ابھرتی اور معدوم ہو جاتی۔

کسی کسی بالا خانے پر کوئی طوائف سج بن کر آ کھڑی ہوئی تھی اور غالباً" چڑھتی رات کے ریلے میں بہہ کر آنے والے اپنے خریداروں کا انتظار کر رہی تھی۔ پان سگریٹوں اور خوشبویات کی دکانوں والے اپنی دکانوں کو آخری رنگ دے رہے تھے۔ یہاں کی دکانیں بھی شاید طوائف دکانیں تھیں' ان کے مالکوں نے شام ڈھلے ہی ان کی تزئین و آرائش شروع کر رکھی تھی۔

پھولوں کے گجروں والے قدم قدم پر کھڑے تھے اور ہر آنے والے کو روک رہے تھے۔ بازار میں خاصی چہل پہل تھی اور مجھے گاڑی چلانے میں دقت ہو رہی تھی۔ ایک چھوٹی سی گلی میں میں نے کئی گاڑیاں کھڑی دیکھیں تو اپنی گاڑی بھی انہی کے ساتھ کھڑی کر

دی اور پیدل چلنے لگا۔ تب عجیب و غریب حلیوں کے انسان میرا تعاقب کرنے لگے۔

ان میں کوئی ناٹا تھا' کوئی لمبا کوئی مجہول تھا اور کوئی خوب گٹھا ہوا' کوئی سیاہ فام تھا اور کوئی خوب گورا چٹا' کوئی داڑھی مونچھ سے بے نیاز اور کوئی گھنی مونچھوں والا' کسی کی باچھوں سے پان کی پیک بہہ رہی تھی تو کسی کی آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ کوئی تن کر چل رہا تھا تو کسی کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ لیکن ایک بات ان سب میں مشترک تھی اور وہ یہ کہ سب بیٹھی بیٹھی سی آواز میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ کبھی ایک میرے قریب آتا اور بظاہر لاتعلقی سے میرے ساتھ چلتے ہوئے کہتا .... "میاں نوابزادے!؟ میرے ساتھ تشریف لائیے۔ رقص ملاحظہ فرمانا ہو چاہے شب باشی کا ارادہ ہو' بندہ آپ کو فردوس ارضی میں لے چلے گا .... فدوی کا دعویٰ ہے کہ آپ دنیا کو بھول جائیے گا۔"

میں اسے گھور کر دیکھتا تو وہ وہیں رک جاتا اور دوسرا میرے ہم قدم ہو جاتا......... "صاحبزادے! میرے ساتھ چلئے.......... آپ کو پندرہ سال کی اس اچھوتی چھیل چھبیلی بانکی نار کے روبرو لے چلوں جس کے حسن بلاخیز نے پوری بمبئی میں تہلکہ مچا دیا ہے .... جس کے دروازے پر فلم والوں کی قطار لگی رہتی ہے مگر وہ کہتی ہے فلم والے مجھے کیا دیں گے؟ دو چار لاکھ ماہوار؟ میرے تو ایک جلوے' ایک ایک ادا کی قیمت لاکھوں سے اوپر ہے۔ میں آپ سے سچ کہہ رہا ہوں' وہ صرف آپ جیسے خوبرو نوجوان نوابزادوں کی قدر دان ہے۔"

میرا جی چاہا کہ چیخ کر اس سے کہوں .... میں نوابزادہ نہیں ہوں .... میں .... میں تو شاید ایک طوائف زادہ ہوں .... مگر میرے حلق سے آواز نہ نکل سکی۔

وہ میری خاموشی سے مایوس ہو کر پیچھے رہ گیا .... تو ایک اور میرے شانہ بشانہ چلنے لگا .... "آپ کو غالباً" نیلم بائی انبالی والے کی تلاش ہے........ ہاں صاحب! وہ تو ہے ہی نیلم کا ٹکڑا......... حسن کے قدر دان بڑی دور دور سے اس کی تلاش میں آتے ہیں۔ میرے ساتھ آیئے......... آپ شاید اجنبی ہیں۔ میں آپ کی رہنمائی کی خدمت انجام دیتا ہوں۔"

یہ سرگوشیاں جب پیچھے رہ گئیں تو میں تھک کر رک گیا۔ اس طرح تم کہاں جا رہے ہو؟ میں نے اپنے آپ سے پوچھا......... میرے دونوں ہاتھ میرے نیلے بلیزر کی جیبوں میں تھے۔ میں ایک چبوترے کے کنارے بنی ہوئی چھوٹی سی جالی دار دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ خشکی سے میرے ہونٹ چٹخنے لگے تھے۔ میں نے ان پر زبان پھیری' تو سامنے کچھ بلندی پر ایک طویل و عریض کمرے کے وسط میں چاندنی پر بیٹھی ایک لڑکی مسکرائی۔ شاید وہ یہی سمجھی تھی کہ میں نے اسے دیکھ کر ہونٹوں پر زبان پھیری ہے۔

اس کمرے میں اتنی تیز روشنی تھی کہ آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں۔ ایک طرف دیوار

کے ساتھ چھ سات سازندے بیٹھے اپنے ساز درست کر رہے تھے۔ ان کے قریب ہی ایک فربہی مائل سانولی سی نائیکہ ایک بڑا سا نقرئی پاندان سامنے رکھے گلوری بنا رہی تھی۔ کمرے کے عین وسط میں بڑے فانوس تلے وہ لڑکی تھی۔ اس کی ناک پر نازک سی کمانی نظر کی عینک ٹکی ہوئی تھی۔ اگر وہ اس کے کوٹھے پر نہ بیٹھی ہوتی تو اپنے معصوم سے بیضوی چہرے اور نظر کی عینک کے ساتھ کوئی ٹیچر یا سوشل ورکر معلوم ہوتی۔ میری طرف مسکرا کر دیکھنے کے بعد اس نے عینک اتار کر نائیکہ کو تھما دی اور پیروں میں گھنگرو باندھنے لگی۔ میں وہاں سے آگے بڑھ گیا۔

مجھے احساس تھا کہ اگر اس کوٹھے کا، جس کی مجھے تلاش تھی واقعی کوئی وجود ہے تو وہ یوں گھومتے پھرتے رہنے سے مجھے نہیں ملے گا۔ میں سگریٹ پان کی ایک دکان پر رک گیا۔ اس دکان پر کوئی گاہک نہیں تھا۔ دکاندار نے شاطرانہ سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ عزیز خانم کا کوٹھا کس طرف ہے لیکن یہ الفاظ میرے حلق میں اٹک کر رہ گئے تھے۔

"فرمایئے صاحب! کیا پیش کروں؟ پان سگریٹ، لیمن یا کچھ اور۔" آخری دو لفظوں پر اس نے زور دیا تھا۔ مجھے خاموش دیکھ کر وہ ایک آنکھ دبا کر بولا......... "اگر اچھا وقت گزارنا ہے تو یہ بغل والی گلی میں چلے جایئے بڑی طرحدار اور انوکھی لڑکیاں ہیں۔ باقی سب کو بھول جایئے گا۔"

"ایک لیمن دے دو۔" بالآخر میں نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا .... قدرے مایوسی کے ساتھ اس نے آئس بکس سے لیمن کی ایک بوتل نکال کر کھولی اور میری طرف بڑھا دی۔ تلخ و ترش لیمن کی پوری بوتل تقریباً ایک ہی سانس میں، میں نے معدے میں انڈیل لی۔ حلق کچھ تر ہوا تو پیسے دینے کے بعد اٹک اٹک کر پوچھا۔ "عزیز خانم .... کا ...... کوٹھا .... کس طرف ہے؟"

"اوہ ...." دکاندار نے سرتاپا میرا جائزہ لیا .... "تو آپ کو ان کی تلاش ہے۔ میں تو پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ آپ کوئی نوابزادے ہیں۔ چھوٹے موٹے لوگ تو عزیزہ خانم کے کوٹھے کی سیڑھیاں ہی نہیں چڑھ سکتے۔ آپ یوں کیجئے .... سیدھے چلے جایئے تقریباً بیس قدم چل کر دائیں ہاتھ پر پانی کی ایک سبیل نظر آئے گی۔ اس کے ساتھ ہی مڑ جایئے۔ دائیں ہاتھ پر ہی سبز اور گلابی رنگ و روغن والی ایک عمارت دور سے چمکتی نظر آئے گی۔ بالکونی میں مغلیہ طرز کے جھروکے ہوں گے جن سے رنگ برنگی روشنیاں پھوٹ رہی ہوں گی۔ اس عمارت کی اوپر کی پوری منزل پر عزیز خانم کا بالا خانہ ہے۔"

میں نے جب اس سے سوال کیا تھا تو میرے ذہن کے کسی گوشے میں یہ موہوم سی امید مدھم سے سانس لے رہی تھی کہ وہ جواب میں کہے دے گا ...... "عزیزہ خانم نام کی

عورت پورے بازار حسن میں نہیں ہے ....." لیکن نہیں ...... جس کا دھڑکا تھا، اس نے وہی جواب دیا۔ اس کی آواز زہریلے تیر کی طرح میرے کانوں کے پردوں کو چھید رہی تھی۔ میں تیزی سے اس کی بتائی ہوئی سمت میں بڑھ گیا۔

اس عظیم الشان بالا خانے کے سامنے کھڑے ہو کر میں نے اوپر دیکھا۔ بالکونی میں بھی فانوس لٹکے ہوئے تھے اور ان کی جھلملاہٹ جھروکوں سے پھوٹتی رنگ رنگا روشنیوں میں مدغم ہو رہی تھی۔ بالکونی میں، میں نے ایک سرو قد لڑکی کو زرق برق لباس میں ایک دروازے سے دوسرے دروازے کی طرف جاتے دیکھا۔ اس کے بالوں کے اونچے سے جوڑے میں جھلملاتے موتیوں کی مالا لپٹی ہوئی تھی اور دور سے ایسا لگتا تھا جیسے اس نے سر پر تاج رکھا ہوا ہو۔ بالکونی میں چلتے چلتے اس نے ایک عجیب شان بے نیازی سے گلی پر اچٹتی سی نظر ڈالی اور دوسرے دروازے کے پیچھے غائب ہو گئی۔

میں نے سر جھٹک کر اپنے حواس پر چھائی دھند سے چھٹکارا پانے کی کوشش کی، اپنی توانائیوں کو مجتمع کیا اور بالا خانے کی سیڑھیوں پر قدم رکھ دیا۔ سیڑھیوں کے اختتام پر ایک وسیع پختہ برآمدہ تھا۔ برآمدے میں کھڑی دو خادمائیں میری طرف لپک کر آئیں۔ ایک نے میری بلائیں لیتے ہوئے، ماہرانہ اور شاطرانہ لہجے میں مجھے خوش آمدید کہتے ہوئے ایک ننھی سی شیشی سے کوئی خوشبو میرے لباس پر لگائی۔ دوسری نے موتیے کی کلیوں کی ایک مالا میرے گلے میں ڈالی اور میری جوتیاں لینے کے لئے میرے پیروں کی طرف لپکی۔ میں نے مالا گلے سے نکال کر اس کے کندھے پر ڈال دی اور پاؤں پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا .... "یہ تکلیف نہ کرو بڑی بی! میں مجرا دیکھنے نہیں آیا ...." دیر تک خاموش رہنے کے بعد میری جو آواز نکلی وہ خود مجھے بھی اجنبی سی محسوس ہوئی۔

میں سامنے ہال کے دروازے کی طرف بڑھا تو دائیں طرف ایک چھوٹے سے کمرے میں چار پانچ لحیم شحیم آدمی تاش کھیلتے نظر آئے۔ انہوں نے میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ ہال کے دروازے پر پہنچ کر میں رک گیا۔ طویل و عریض ہال میں چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ دیواروں کے ساتھ گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ ایک طرف سفید براق چاندنی پر آٹھ دس سازندے بیٹھے اپنے سازوں کے سر تال درست کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک کے سامنے وہی لڑکی جسے میں نے بالکونی میں دیکھا تھا سرخ آتشیں جمپر اور چوڑی دار پاجامے میں دو زانو بیٹھی کسی غزل کی مشق کر رہی تھی۔ دیوار کے ساتھ دو اور نو عمر لڑکیاں ایک مجلّہ کتاب کھولے بیٹھی تھیں اور آپس میں کچھ بحث کر رہی تھیں۔

یک لخت ساز خاموش ہو گئے اور اس کے ساتھ ہی باتوں کی بھنبھناہٹ بھی ختم ہو گئی۔ ایک لمحے کے لئے گویا کائنات خاموش ہو گئی۔ وہ لڑکی جو غزل کی مشق کر رہی تھی، اٹھی اور فرشی سلام کرتے ہوئے بولی۔ "تشریف لایئے سرکار ....!"

"عزیزہ خانم کہاں ہیں؟" میرے حلق سے شاید کسی اور کی آواز نکلی۔ "وہ آج تشریف نہیں لائیں۔" لڑکی نے مترنم آواز میں کہا۔ "ان کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔ گھر پر ہی آرام کر رہی ہیں۔"

"گھر کہاں ہے؟" میں نے اکھڑے اکھڑے لہجے میں پوچھا۔

"پچھواڑے ہی میں ہے۔ لڑکی نے الجھن آمیز نظروں سے میرا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "اگر کوئی ضروری کام ہے تو پیغام بھجوا دیتے ہیں۔ آپ تشریف رکھئے۔"

"مجھے گھر پہنچوا دیجئے۔ میں ان کے لئے ایک ضروری پیغام لے کر آیا ہوں۔" اس بازار میں گھستے ہی مجھے مصلحت کوشی اور دروغ گوئی آگئی تھی۔

"بی مغلانی!" اس لڑکی نے باآواز بلند پکارا .... میرے عقب سے وہی بڑھیا لپکی آئی جس نے میرے کپڑوں پر خوشبو لگائی تھی۔ "انہیں خانم کے پاس لے جاؤ۔" لڑکی نے اسے حکم دیا۔ بڑھیا نے مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ بالا خانے سے اتر کر ہم گلی میں آئے۔ چند قدم چل کر بڑھیا دائیں طرف مڑ گئی اور ہم بالا خانے کے پچھواڑے آگئے۔

بڑھیا ایک ایسے مکان کی سیڑھیاں چڑھنے لگی جس کی دیواروں کا پلستر کہیں کہیں سے اکھڑ رہا تھا .... سیڑھیوں کے اختتام پر منقش لکڑی کا ایک بلند اور محرابی دروازہ تھا جس کی چوکھٹ کے ساتھ دائیں بائیں دو چھوٹے چھوٹے ستونوں پر پتھر سے تراشیدہ دو شیر بیٹھے تھے۔ خادمہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ ڈیوڑھی سے گزر کر ہم ایک وسیع لان میں پہنچے جہاں چاروں طرف کمروں کے دروازے نظر آ رہے تھے۔ ایک دروازہ کھلا تھا اور اس پر حریری پردے لہرا رہے تھے جن سے دودھیا روشنی چھن چھن کر دالان میں آ رہی تھی۔

"وہ خانم کی خواب گاہ ہے۔" بڑھیا نے دور ہی رک کر اشارے سے مجھے بتایا۔ "تم دروازے پر دستک دینا۔ اگر وہ اجازت دیں تو اندر چلے جانا۔" وہ واپس جانے کے لئے مڑ گئی۔

میں نے آگے بڑھ کر کھلے دروازے پر دستک دی اور دوسرے ہی لمحے میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا جب میں نے ممی کی آواز سنی "کون ہے؟ آ جاؤ۔"

ایک ہاتھ سے پردہ اٹھا کر میں نے اندر قدم رکھا۔ وہ میری طرف پشت کئے' کشادہ کھڑکی کی چوکھٹ پر کہنیاں ٹکائے کھڑی تھیں۔ ان کے جسم پر مصری عورتوں کا سا ڈھیلا ڈھالا ریشمی لبادہ تھا اور سفیدی مائل سنہرے بال کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ ان کی کمر کسی انجانے بوجھ سے جھکی ہوئی تھی۔ بڑی آہستگی سے وہ میری طرف مڑیں اور میرا دل یک لخت کرب کے عمیق سمندر میں ڈوب گیا۔

☆☆☆☆

چند دن قبل میں نے انہیں دیکھا تھا۔ اس وقت وہ مضمحل نظر آ رہی تھیں مگر اب تو ان کا چہرہ بالکل ہی زرد پڑ چکا تھا اور آنکھوں کے گرد حلقے نمودار ہو چکے تھے۔ اب مجھے دیکھ کر ان کے چہرے سے زندگی کی آخری رمق تک معدوم ہو گئی۔ نہ جانے کتنی دیر تک ہم ساکت کھڑے' پلکیں جھپکائے بغیر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر انہوں نے یوں لڑکھڑا کر اونچی مسہری کے سرہانے کے تختے کا سہارا لیا۔ گویا ان کی ٹانگوں نے ان کا بوجھ سہارنے سے انکار کر دیا ہو۔

0303 6360959 سیلسی فون

"مجھے پہلے ہی اندیشہ تھا۔" ان کے کپکپاتے ہونٹوں سے آواز نکلی جو کمرے کے پردوں کی سرسراہٹ سے بھی مدہم تھی کہ ایک نہ ایک روز تم یونہی اچانک اپنی آنکھوں میں ہزاروں سوال لئے میرے سامنے آ کھڑے ہو گے۔"

"ممی ......!" اس ایک لفظ کے ساتھ ہی میری آواز رندھ کر رہ گئی۔ اس ایک لفظ میں میری زندگی کا تاسف' تحیر اور کرب سمٹ آیا تھا۔ میں کہنا چاہتا تھا' ممی! اتنے بڑے راز زندگی بھر کے لئے تو چھپائے نہیں جا سکتے تھے پھر آپ نے کیا سوچ کر اپنے جگر گوشے کو اب تک ایک دور افتادہ اندھیری دنیا میں رکھا اور اس کے معصوم یقین اور کنواری خواہشوں کا سرمایہ بھرے بازار میں لٹوا دیا؟ یہ رسوائی بچپن ہی سے ساتھ چلتی تو شاید اتنی گراں نہ گزرتی مگر اس اچانک انکشاف نے تو میرا حال اسی چکور کا سا کر دیا جو چاند کی طرف اڑتے اڑتے یک لخت کھائی میں آ گرا ہو۔

اچانک ممی نے سینے پر ہاتھ رکھ لیا اور کسی اندرونی تکلیف سے ان کے چہرے کے عضلات کھنچ کر رہ گئے۔ گردن کی نسیں پھول گئیں وہ مسہری کی پٹی پر بیٹھ گئیں۔ کانپتے ہاتھ سے انہوں نے سرہانے کی طرف رکھی ایک تپائی سے ایک چوبی صندوقچی اٹھائی' کوئی کھٹکا دبا کر اسے کھولا اور اس میں سے چمڑے کی سیاہ جلد والی ایک چھوٹی سی کتاب نکالی۔ پھر مجھے اشارے سے قریب بلایا مگر میں اپنی جگہ کھڑا رہا۔ تب وہ مسہری پر ڈھیر ہو گئیں ان کے چہرے پر پسینے کے قطرات نمودار ہو رہے تھے اور سینے پر بائیں ہاتھ کی گرفت سخت ہوتی جا رہی تھی۔ گویا کوئی انجانا اور ناقابل برداشت درد ہو رہا ہو۔ تب میں ان کے قریب چلا گیا۔ انہوں نے وہ کتاب سی میری بلیزر کی جیب میں ڈال دی۔

"اس نوٹ بک میں .... میں نے اپنی زندگی کی کل کہانی رقم کر رکھی ہے منصور! انہوں نے ٹوٹتے سے لہجے میں کہا .... "اور یہ سب کچھ میں نے تمہارے ہی لئے لکھا تھا ...... سوچا تو میں نے کچھ اور تھا لیکن پھر....... اسی خیال سے یہ سب کچھ .... لکھ کر رکھ لیا تھا ...... کہ شاید قبل از وقت اسی طرح .... تم میری دہلیز پر آن پہنچو .... کچھ کہنے سننے کا وقت نہ ہو یا تمہارے ذہن پر غیظ و غضب کا غلبہ ہو۔ میری اس خود نوشت

میں تمہیں اپنے ہر سوال کا جواب مل جائے گا اور پھر شاید میں تمہاری نظروں میں ...... گنہگار نہ رہوں۔ اس میں میری وصیت بھی لکھی ہے جو تمہارے لئے بہت بھاری ذمہ داری ہو گی ...... لیکن اگر تم نے اس پر عمل نہ کیا ...... تب بھی مجھے تم سے کوئی شکوہ نہ ہو گا البتہ میری روح بے چین رہے گی ...... آسمانوں میں بھٹکتی پھرے گی ...... آہ ...... یہ دل کا درد ....

ان کی گردن کی نسیں اور زیادہ پھول گئیں اور سانس گویا سینے میں اٹکنے لگی۔ ذرا سانس آئی تو وہ آنکھیں کھول کر مضمحل سے انداز میں مسکرائیں اور مجھے اپنے اوپر جھکا دیکھ کر ڈوبتی آواز میں بولیں ...... "مجھے یوں اجنبیت سے نہ دیکھو بیٹا ...... میرے سینے پر سر رکھ دو ...... میں اب بہت تھک گئی ہوں ...... مجھے معاف کر دینا بیٹا ...... میں تمہیں منزل پر نہیں پہنچا سکی۔"

غیر ارادی انداز میں' میں نے ان کے سینے پر سر رکھ دیا۔ ان کا ہاتھ سینے سے ہٹ کر میرے سر پر ٹک گیا۔ ایک لمحے کے لئے میں سب کچھ بھول گیا۔ میری آنکھوں سے آنسوؤں کا رکا ہوا سیلاب امڈ پڑا۔ دفعتہً ممی کا جسم یک بارگی زور سے کپکپایا اور میرے بالوں میں رینگتا ہوا ان کا مرتعش ہاتھ پھسلا اور پھر بازو مسہری سے نیچے جھول گیا۔

میں ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا ...... ممی کی نیم وا آنکھیں ساکت ہو چکی تھیں ...... اور ہونٹوں پر ایک مجروح مسکراہٹ منجمد تھی۔ میں نے انہیں جھنجھوڑا تو ان کی گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی پھر میں نے ان کی دھڑکن سننے کی کوشش کی دھڑکن بھی معدوم تھی۔ ایک لمحے کے لئے میں اس بچے کی طرح کھڑا رہ گیا جسے کوئی لق و دق صحرا میں تنہا چھوڑ گیا ہو۔ کمرے کی اونچی چھت میرے لئے دھوپ کا سائبان بن گئی اور قالین تلے دبا ہوا فرش ریگزار ......

اس ایک ہی لمحے میں مجھے احساس ہو گیا کہ ماں کے مرنے کے بعد انسان دنیا میں کتنا بے اماں رہ جاتا ہے خواہ ماں طوائف ہی کیوں نہ ہو۔ خواہ وہ ہفتے میں صرف ایک ہی بار ملنے کیوں نہ آتی ہو' چند لمحے پہلے میں یہ سوچ کر آیا تھا کہ اگر ماں کی پیشانی پر اس بازار کا داغ میرے لئے ناقابل برداشت ہوا تو اسے قتل کر دوں گا اور اب میرا جی چاہ رہا تھا کہ دہاڑیں مار مار کر روؤں۔

دفعتہً پردہ ایک جھٹکے سے ایک طرف کو سمٹا اور منہ زور سانڈوں کی طرح دندناتے ہوئے چار لحیم و شحیم افراد کمرے میں گھس آئے یہ غالباً وہی تھے جنہیں میں نے بالا خانے پر تاش کھیلتے دیکھا تھا ان کے چوڑے چکلے چہرے آگ پر رکھی تانبے کی پلیٹوں کی طرح دمک رہے تھے اور آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ ان میں سے ایک لپک کر ممی کے قریب

آیا اس نے ان کی نبض دیکھی۔ پپوٹے الٹ کر آنکھوں کی پتلیاں دیکھیں' ناک پر ہاتھ رکھ کر سانس محسوس کرنے کی کوشش کی' پھر میری طرف مڑا اور خون خوار لہجے میں بولا۔ "تم نے خانم کو کیوں مار دیا؟"

میں نے کوئی جواب نہ دیا میں دیوار سے لگا کھڑا تھا اور دنیا کی ہر چیز مجھے بے معنی و بے وقعت محسوس ہو رہی تھی۔ ان چاروں کا وجود بھی نہایت غیر اہم لگ رہا تھا۔ سوال کرنے والے نے آگے بڑھ کر مجھے گریبان سے پکڑ کر جھٹکا دیا۔ "بولتے کیوں نہیں ...... کیوں مارا ہے تم نے خانم کو؟" وہ دہاڑا اس کے موٹے موٹے سرخ ہونٹ نم آلود تھے۔

میں نے اس کی موٹی سی کلائی پر مضبوطی سے ہاتھ ڈالا اور گریبان سے اس کا ہاتھ آہستگی سے ہٹا دیا۔ میں حیران تھا کہ کیا اسے میرے چہرے پر ماں کی موت کا دکھ یا آنسوؤں کی نمی نظر نہیں آ رہی تھی جو وہ مجھے قاتل سمجھ رہا تھا۔ شاید میرے آنسو خشک ہو چکے تھے اور چہرہ پتھرا گیا تھا۔

"میں نے انہیں نہیں مارا۔" میرے جسم کے شکستہ ساز سے بالآخر آواز نکلی۔ "میں انہیں مار بھی کیسے سکتا ہوں ...... میں ان کا بیٹا ہوں۔"

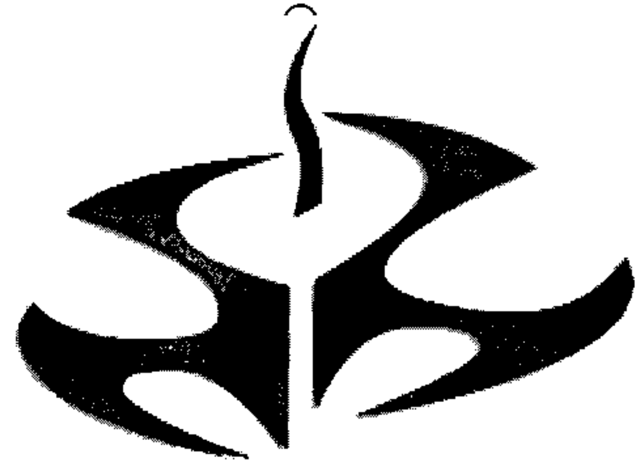
"بیٹا؟" اس نے دہرایا اور دنیا بھر کی بے یقینی اس کے لہجے میں سمٹ آئی۔ "اس بازار کی عورتوں میں بیٹوں کو جنم دینے کا رواج نہیں آیا۔ سچ سچ بتاؤ تم کس کے آدمی ہو یک لخت وہ گرج اٹھا اور اس نے ساتھ ہی میرے منہ پر الٹے ہاتھ کا تھپڑ رسید کیا یہ تھپڑ کسی عام آدمی کو پڑا ہوتا تو وہ تیورا کر گر جاتا۔

میرے نچلے ہونٹ پر حرارت آمیز سی نمی پھوٹ پڑی۔ میں نے ہونٹوں پر زبان پھیری تو خون کی نمکینی کا احساس ہوا۔ رخسار پر ہاتھ رکھے رکھے میں نے اب گویا حقیقت کی دنیا میں لوٹ کر ان کا جائزہ لیا۔ ان میں ایک دروازے پر جا کھڑا تھا۔ ایک مسہری کے قریب تھا ایک نے کھلی جگہ سنبھال رکھی تھی۔ میرے جسم کی کسی خفتہ شریان سے چنگاریاں سی پھوٹیں اور خون کے بہاؤ کے ساتھ گویا کنپٹیوں میں جمع ہونے لگیں ...... اور دوسرے ہی لمحے ذہن میں جیسے کوئی بارود خانہ پھٹ پڑا۔ میں نے اتنی قوت سے اپنے مقابل کی پیشانی پر گھونسا رسید کیا کہ اس کی جگہ کوئی عام جثے کا آدمی ہوتا تو دوسری سانس نہ لیتا۔ اس نے ایک بار پیچھے کو جھکولا کھایا پھر کٹے ہوئے شہتیر کی طرح ڈھیر ہو گیا۔

باقی تینوں عجیب و غریب آوازیں نکالتے مجھ پر جھپٹے ان میں سے ایک کے بال خاصے لمبے تھے۔ ان بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر میں نے اس کا سر دیوار سے ٹکرا دیا۔ وہ مجھ سے بری طرح لپٹ پڑے تھے۔ ان میں سے ایک میری کمر کے گرد شکنجہ ڈال کر مجھے گویا خشک ٹہنی کی طرح درمیان سے توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ان کے حلق سے مجنونانہ غراہٹیں

خارج ہو رہی تھیں۔

میرے پاؤں زمین سے اکھڑنے لگے تو میں نے ان کے کندھے پر کراٹے کا ہاتھ مارا۔ میری کمر تو اس کی گرفت سے چھوٹ گئی لیکن عین اسی لمحے میں نے دوسرے کو نیفے سے ایک لمبا سا خوفناک چھرا نکالتے دیکھا۔ میں یک لخت پیچھے ہٹ کر دیور کے ساتھ لگ گیا۔ پھر میں نے وہ چھرا اسی کے ساتھی کے پیٹ میں پیوست ہوتے دیکھا اگر میں درمیان سے نہ ہٹتا تو اس کا ہدف میں ہی بنتا۔ کمرے میں ایک دلدوز چیخ گونجی۔ چھرے والے نے چھرا جلدی سے واپس کھینچ لیا ...... اور سکتے کے عالم میں اس کے خون آلود پھل کو گھورنے لگا دوسرا شخص دونوں ہاتھوں سے پیٹ تھامے اوندھے منہ قالین پر ڈھیر ہو گیا۔ اسی لمحے کسی نے پردہ ہٹا کر اندر جھانکا اور فورا" ہی غائب ہو گیا۔ ساتھ ہی باہر شور بلند ہونے لگا ...... " خون ...... قتل ..... دوڑو ..... بھاگو ...... سرفروش قتل ہو گیا۔"



میں باہر کو لپکا تو وہ شخص گویا تنویمی سی کیفیت سے جاگ اٹھا اور وحشیانہ انداز میں چھرے سے گویا ہوا کو کاٹتے ہوئے مجھ پر جھپٹا۔ اس پر خون سوار ہو چکا تھا۔ میں نے جھکائی دے کر اس کا ایک وار خالی کر دیا اور وہ اپنے زور میں اوندھا جا گرا۔ اپنے عقب میں میں نے ایک بھیانک خرخراہٹ سنی۔ اس لمحے میں دروازے پر پہنچ چکا تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ شخص نے جانے کس طرح اوندھے منہ گرا تھا کہ اس کا چھرا اس کے حلق میں گھس کر گدی سے نکل آیا تھا۔ وہ بری طرح ہاتھ پاؤں پٹخ رہا تھا۔

باہر سیڑھیوں پر بہت سے جوتوں کی دھپ دھپ سنائی دینے لگی تھی۔ پھر سپاہیوں کی وسلیں گونجنے لگیں۔ میں نے پردہ ہٹایا ہی تھا کہ سیڑھیوں پر لال ٹوپیوں کی جھلک دیکھ کر پلٹ پڑا۔ اس افراتفری کے عالم میں بھی میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ بازار حسن میں پولیس کتنی مستعد ہوتی ہے۔

وسیع کمرہ اس وقت میرے لئے ایک چوہے دان بن چکا تھا میں دوڑ کر کھڑکی تک آیا اور نیچے جھانک کر دیکھا۔ دس بارہ فٹ نیچے ایک دیوار کے ساتھ ہی ایک کچی چھت آگے کو نکلی ہوئی تھی۔ معمولی سی چوڑائی کی یہ چھت دیوار کے ساتھ ساتھ کافی دور تک چلی گئی تھی اور اندھیرے میں نجانے کس عمارت کے ساتھ ملی ہوئی تھی۔ میں اچک کر کھڑکی پر چڑھا اور پنجوں کے بل اس چھت پر کود گیا۔ میں بائیں طرف دوڑ پڑا۔ دائیں طرف جانے میں اندیشہ تھا کہ میں بالاخانے کے آس پاس نہ جا پہنچوں۔

تقریبا" بیس قدم دوڑنے کے بعد میں ملگجی روشنی میں آگیا۔ میرے دائیں طرف نشیب میں ایک گلی شروع ہو گئی تھی جس کی دکانوں کی روشنی اوپر تک پہنچ رہی تھی۔ میں دیوار کے ساتھ چپک کر چلنے لگا۔ دفعتہ" میرا پاؤں کسی خلاء میں اتر گیا۔ اگر میں فورا" نہ سنبھلتا تو بری طرح اوندھے منہ گرتا۔ یہ چھت میں بنا ہوا کسی تاریک کمرے کا چھوٹا سا روشن دان تھا۔ اسے پھلانگ کر میں چند قدم آگے پہنچا تو کسی مکان کی دیوار سامنے آگئی۔ دیوار زیادہ اونچی نہیں تھی۔ میں نے اچک کر منڈیر پر ہاتھ جمائے اور جسم کو بل دے کر اوپر پہنچ گیا۔ یہ ایک پختہ چھت تھی جس پر ایک طرف، کبوتروں کا ڈربہ بنا ہوا تھا۔ دیوار کے ساتھ بانس پر کبوتروں کا اڈہ بھی لگا ہوا تھا۔

ڈربے پر چڑھ کر میں دوسری چھت پر کود گیا۔ اس سے آگے کوئی مکان نہیں تھا۔ سامنے گلی آگئی تھی۔ میرے عقب میں دور کہیں وسلیں گونج رہی تھیں۔ ان کی بہت مدہم سی آواز یہاں تک پہنچ رہی تھی تاہم اس سے مجھ پر کوئی خاص گھبراہٹ نہیں تھی اور نہ ہی سانس پھولی ہوئی تھی۔ یہ بھاگ دوڑ میرے لئے معمولی سی ورزش تھی۔

ملگجے اندھیرے میں میں نے چھت کا جائزہ لیا۔ یہاں لوہے کے دو پلنگ اور چند بھدی سی کرسیاں پڑی تھیں۔ الگنی پر چند کپڑے لٹکے ہوئے تھے جو مدھم سی ہوا میں سرسرا رہے تھے۔ آنگن کے قریب ہی سے سیڑھیاں نیچے جا رہی تھیں۔ میں نے ایک نظر نیچے جھانکا اور سیڑھیاں اترنے لگا۔ ایک منزل نیچے آکر سیڑھیاں اچانک ہی ختم ہو گئیں۔ اور میں نے اپنے آپ کو ایک ایسے کمرے میں کھڑا پایا جس میں کئی کھڑکیاں تھیں اور ان پر چقیں لٹکی ہوئی تھیں۔ ایک گوشے میں ایک مسہری پر ایک لڑکی گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ میری آہٹ سن کر اس نے کتاب بڑے اطمینان سے چہرے کے سامنے سے ہٹائی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ مجھے یوں اچانک کمرے میں پاکر نہ تو اس کے ہاتھ سے کتاب چھوٹ کر گری اور نہ ہی اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلیں۔ کتاب اس نے نہایت سکون سے ایک طرف رکھ دی اور میرا سرتاپا جائزہ لینے لگی۔

وہ عجیب سی لڑکی تھی۔ اس کے حسن میں پکے آموں کا سا رسیلا پن تھا۔ بھرا بھرا سا چہرہ۔ موٹی موٹی سیاہ نشیلی سی آنکھیں' مسہری سے نیچے تک لٹکی ہوئی چمکیلے سیاہ بالوں کی موٹی سی چوٹی فربہی مائل جسم' لیکن اس فربہی میں بھی عجیب غضب کا تناسب تھا۔ مسہری پر لیٹی وہ خاصی طویل القامت لگ رہی تھی لیکن جب اٹھ کر بیٹھی تو گولائیوں میں سمٹ گئی۔

"کیا کر کے آئے ہو؟" اس نے شرارت بھری مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔ اس کی آواز میں گلوکاراؤں والی کھنک تھی۔

"کچھ نہیں۔" میں نے ایک لمحے کے توقف سے جواب دیا۔ "البتہ اگر نہ بھاگتا تو شاید جرم بے گناہی میں پھنس جاتا"۔

"پھنس تو اب بھی سکتے ہو۔" میں حیران تھا کہ وہ اب بھی مسکرا رہی تھی۔

"فی الحال مجھے یہ اندیشہ محسوس نہیں ہو رہا ہے۔" میں نے لاپروائی سے کہا اور میری یہ لاپروائی اداکاری پر مبنی نہیں تھی۔ لیکن تم نے مجھے دیکھتے ہی یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں کچھ کر کے آیا ہوں؟ میرا خیال ہے میرا حلیہ کچھ ایسا بگڑا ہوا تو نہیں ہے۔"

"بات حلئے کی نہیں اتفاقات کی ہے۔" اس نے کہنی گاؤ تکیے پر ٹکا لی۔ "اب تو مجھے یوں محسوس ہونے لگا ہے جیسے میں کسی کہانی کا کردار ہوں۔ یہ تیسرا موقع ہے کہ کوئی اس طرح سیڑھیوں کے راستے میرے کمرے میں آیا ہے۔ ایک مرتبہ لکھنؤ کا ایک بانکا آیا تھا جس نے ایک طوائف کو گلا گھونٹ کر مارنے کی کوشش کی تھی اور اس کے شور مچانے پر

بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ ایک مرتبہ ایک مارواڑی سیٹھ آیا تھا جس نے نشے میں کسی تماش بین کو قتل کر دیا تھا۔ خون دیکھ کر اس کا سارا نشہ ہرن ہو گیا تھا اور اس نے نہ جانے کہاں سے بھاگنے کا راستہ ڈھونڈ لیا تھا۔ اب تیسرے تم آئے ہو۔ عجیب اتفاق در اتفاق نہیں ہے کہ ان تین موقعوں پر میں اسی مسہری پر موجود تھی؟ حالانکہ عام طور پر میں روزانہ اس وقت اس کمرے میں نہیں ہوتی۔ مجھے لگتا ہے کہ آئندہ میں جب بھی اس وقت یہاں لیٹا کروں گی تو مجھے انتظار رہا کرے گا کہ ابھی کوئی ہانپتا کانپتا سیڑھیوں کے راستے آجائے گا۔" پھر وہ خود ہی گویا اس تصور سے ہنس پڑی۔

"مجھ سے پہلے آنے والوں کا کیا انجام ہوا تھا؟" میں نے دونوں ہاتھ بلیزر کی جیبوں میں ٹھونستے ہوئے پوچھا۔

"پکڑے گئے تھے۔ میں نے انہیں پکڑوایا تھا۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

"لیکن مجھے پکڑوانے کی کوشش نہ کرنا۔" اب میں بھی مسکرا دیا۔ "کیونکہ میں نے کچھ نہیں کیا اور نہ میں ہانپتا کانپتا آیا ہوں اور مجھے ایسے لوگ بالکل پسند نہیں جو گیہوں کے ساتھ گھن کو بھی پیسنے کی کوشش کریں۔" پھر میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "ویسے بائی دے وے تم کون ہو؟"

"اس بازار میں موجود عورت کیا ہو سکتی ہے؟" اس نے گویا میری کم عقلی پر ماتم کرتے ہوئے کہا۔

"اگر تم اس بازار کی ہو تو اس وقت کمرے میں لیٹی کیا کر رہی ہو؟ تمہیں تو اس وقت کوٹھے پر ہونا چاہیے تھا۔" میں نے اپنے سوال کا جواز پیش کیا۔

"میں ابھی زیر تربیت ہوں اور مہینے پر کچھ دن میرے آرام کے ہوتے ہیں۔ سمجھے؟ اور تم کون ہو؟" اس نے ایک بار پھر گہری نظروں سے میرا جائزہ لیا۔

"طوائف زادہ۔" میں کہنے لگا تھا لیکن میری زبان نے ساتھ نہ دیا۔ میرے حلق میں یک لخت کڑواہٹ سی گھل گئی اور میرے حواس پر ایک بار پھر اس صدمے کی یخ بستگی چھا گئی جس سے میں گزر کر آیا تھا۔ میں نے مدھم سی آواز میں کہا۔ "میں بلندیوں کی دنیا کا مسافر تھا مگر اچانک میرے قدموں سے زمین کھینچ لی گئی ہے۔"

"پھر تو ہماری ایک سی کہانی ہے۔" وہ بدستور مسکرا رہی تھی...... شاید مسکراہٹ اس کے ہونٹوں ہی کا ایک حصہ تھی۔

دفعتہ" نیچے کہیں قریب ہی سے پولیس کی وسل سنائی دی مجھے پولیس والوں کی یہ ادا بہت اچھی لگی کہ وہ دور ہی سے اپنے مطلوبہ آدمی کو خبردار کر دیتے تھے کہ وہ اپنی حفاظت کا بندوبست کر لے۔

"بھاگنا چاہتے ہو؟" لڑکی نے پوچھا۔ پھر جواب ، کا انتظار کئے بغیر بولی۔ "بہتر ہے کہ

بھاگ ہی جاؤ۔ نہ جانے کیوں میرا دل کہتا ہے کہ وہ اس گھر کی تلاشی ضرور لیں گے۔"

مجھے پکڑواؤ گی تو نہیں؟" میں نے غیرارادی طور پر پوچھا۔

"تمہیں پکڑوانے کو جی نہیں چاہ رہا۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ "بلکہ اگر تم ان حالات میں نہ آئے ہوتے تو شاید ایک رات کے لئے میں خود ہی تمہیں گرفتار کر لیتی۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔ جھرجھری سی لے کر اپنی ناگن سی چٹیا کو پشت پر پھینکا اور میرا ہاتھ تھامتے ہوئے بولی...... "میرے ساتھ آؤ۔" اس کا نرم و گداز ہاتھ بجلی کا ننگا تار تھا۔ جس نے مجھے سر سے پاؤں تک ہلا کر رکھ دیا۔ اپنے جسم میں ایک ہلکا سا ارتعاش لئے میں اس کے ساتھ چل دیا۔ اس نے گویا اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ویسے میں بھی کسی کے ساتھ ایک وعدہ کر چکی ہوں۔ ویسے ہم لوگ زندگی میں وعدہ نہیں کرتیں اور کرتی ہیں تو آخری سانس تک نبھاتی ہیں۔" پھر وہ گہری اور سرد سانس لے کر بولی۔ "کاش تم مجھے چند دن پہلے نظر آئے ہوتے۔"

"پھر کیا ہو جاتا؟" میں نے پوچھنا چاہا لیکن نجانے کیوں خاموش ہی رہا۔ کمرے سے نکل کر ہم ایک چھوٹی سی ٹیرس نما جگہ پر آ گئے۔ یہاں سے تنگ سی سیڑھیاں نیچے جا رہی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق یہ مکان زیادہ اونچا نہیں تھا۔ لیکن جب اس کی رہنمائی میں میں نے سیڑھیاں اترنا شروع کیں تو یوں لگا جیسے ہم کنویں کی تہہ کی طرف جا رہے ہیں۔ سیڑھیوں کے اختتام پر ایک مختصر اور تنگ سی ڈیوڑھی تھی جس کی دیوار کے ساتھ نجانے کیا کیا کاٹھ کباڑ پڑا تھا۔ چھت میں ایک چھوٹا سا بلب نصب تھا جو گرد و غبار سے اس قدر دھند لایا ہوا تھا کہ اس کی روشنی چراغ سے بھی کم تھی۔ اوپر کونوں میں مکڑیوں نے جالنے تان رکھے تھے۔ نیچے ایک کونے میں نل تھا جس سے بوند بوند پانی ٹپک رہا تھا۔

اس ڈیوڑھی سے ہم سیڑھیوں کی مخالف سمت میں مڑ گئے اور ایک ڈربے نما کمرے میں پہنچ گئے۔ ان مکانوں کی ساخت میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ نہ جانے کس کی چھت کس سے ملی ہوئی تھی۔ اور کس کے دروازے کن کن گلیوں میں نکلتے تھے۔ اس ڈربے نما کمرے میں گندے میلے کچیلے کپڑوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اس کمرے کے پچھلے دروازے پر رک کر وہ میری طرف مڑی۔

"اس دروازے سے تم عقبی گلی میں نکلو گے تو سامنے ہی دو عمارتوں کے درمیان ایک تاریک خلاء نظر آئے گا۔" وہ مجھے سمجھاتے ہوئے بولی۔ "اس میں گھس جانا اور سیدھے ہی چلتے رہنا۔ راستے میں دو جگہ چھوٹے چھوٹے چوراہے آئیں گے۔ دوسرے چوراہے سے ذرا آگے بائیں ہاتھ پر ایک بہت اونچی دیوار ہو گی۔ وہ میجسٹک سینما کا پچھلا حصہ ہو گا۔ اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا آہنی دروازہ ہو گا۔ اس میں داخل ہو کر سینما کے کمپاؤنڈ سے گزر کر تم فارس روڈ کی حدود سے باہر پہنچ جاؤ گے وہاں سے جدھر سینگ

سمائیں بھاگ جانا۔ اب زیادہ وقت ضائع نہ کرنا۔ اگر پولیس کی نفری آ گئی تو شاید وہ بازار کی ناکہ بندی کی کوشش کریں۔ اب یہ پوچھنے کا وقت نہیں ہے کہ کیا ہوا تھا۔ لیکن معاملہ کافی سنگین ہی لگتا ہے۔ بڑی بھاگ دوڑ کی آوازیں آ رہی ہیں۔ اچھا خدا حافظ۔"

میں دروازہ کھول کر تیزی سے نکل گیا۔ یہ ایک تنگ اور نیم تاریک سی گلی تھی۔ لیکن اتنی زیادہ سنسان نہیں تھی۔ پراسرار ہیولوں کی طرح خاصی تعداد میں لوگ ادھر ادھر جاتے دکھائی دے رہے تھے۔

میں نے محتاط نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور تیزی سے سڑک عبور کر کے سامنے دو عمارتوں کے درمیان خلاء میں داخل ہو گیا۔ یہ ایک متعفن اور تنگ تاریک بے قاعدہ سی گلی تھی۔ قدم قدم پر کوڑے کرکٹ کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ زمین کچی اور اونچی نیچی تھی۔ اندھیرے میں سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتے مجھے اگلے چوراہے تک پہنچنے میں کافی دیر لگ گئی۔ چوراہے سے آگے گلی کچھ کشادہ ہو گئی اور یہاں کچھ روشنی بھی نظر آنے لگی۔ یہ روشنی در حقیقت کچھ مکانوں کی عقبی کھڑکیوں کے شیشوں سے چھن چھن کر آ رہی تھی۔ میں تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔

راستے میں میں نے کوڑے کا بڑا سا ڈرم دیکھا جس کے ارد گرد بھی کوڑا بکھرا ہوا تھا۔ ڈرم سے آگے چار چھ سیڑھیاں تھیں۔ یہاں سے گلی اونچی ہو گئی تھی۔ میں تیزی سے سیڑھیاں چڑھ رہا تھا کہ سامنے سے تیزی سے سیڑھیاں اترتا ہوا کوئی شخص مجھ سے ٹکرا گیا۔ وہ لڑکھڑا کر دھپ سے سیڑھی پر گرا اور اس کے ہاتھ سے کوئی چیز چھوٹ کر پتھریلی سیڑھیوں سے گری اور لڑھکتی ہوئی کوڑے کے ڈرم کے قریب تاریکی میں چلی گئی میں سنبھلا اور رک گیا وہ شخص فوراً" اٹھ کر دیوانوں کی طرح ڈرم کی طرف لپکا۔

"کہاں گئی..... کہاں گئی؟" وہ با آواز بلند مجھ سے پوچھ رہا تھا۔

"کیا چیز؟" میں نے ملائمت سے پوچھا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا اور میری طرف پیٹھ کیے گھٹنوں کے بل زمین پر گر کر اندھیرے میں یوں ہاتھ مارنے لگا گویا اس کی عمر بھر کی کمائی کھو گئی ہو۔ میں چاہتا تو اسے اس کے حال پر چھوڑ کر آگے چل دیتا لیکن غیرارادی طور پر رک گیا شاید تجسس کے تحت۔

اندھیرے سے کوئی چیز اٹھا کر وہ سیدھا کھڑا ہوا اور جب اس کا ہاتھ قدرے روشنی میں آیا تو میں نے دیکھا وہ ایک ٹوٹی ہوئی لمبی سی سرنج تھی۔ وہ آنکھوں کے قریب لا کر اسے دہشت زدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ چوڑے چکلے ڈھانچے کا ایک طویل القامت ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ اس کے جسم پر ایک میلا کچیلا' پرانا اور ڈھیلا ڈھالا شکن آلود کوٹ تھا جو غالباً" اس زمانے کا تھا جب اس کی جسم پر گوشت موجود رہا ہو گا۔ اس کے گال پچکے ہوئے تھے اور آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ ان میں ایک عجیب دھندلی دھندلی سی نمی چمک

رہی تھی۔ رخساروں پر کئی دن کی بڑھی ہوئی شیو تھی۔ اس کے استخوانی مگر بڑے سے ہاتھ میں ہلکی سی لرزش تھی۔

"توڑ دی ...... خبیث ...... کتے...... کمینے تو نے میری سرنج توڑ دی.... بھری بھرائی سرنج توڑ دی....." وہ بڑبڑایا.... "معلوم ہے آج کل مارفیا کا کیا بھاؤ ہے...."

اگر میں اس کی بات صحیح طور پر سمجھ پاتا تو شاید میں اسے کچھ پیسے دے دیتا لیکن اس نے مجھے اس کی مہلت ہی نہیں دی اور اچانک اس سرنج سے مجھ پر حملہ کر دیا جس کے ایک سرے پر اب شارک کی دانتوں کی طرح نوکیں نکلی ہوئی تھیں۔ مجھے اس شکستہ حال اور زندہ درگور انسان سے حملے کی توقع نہیں تھی ۔ وہ سرنج کو خنجر کی طرح پکڑ کر یک لخت ہی مجھ پر جھپٹا تھا اور میں نے غیر ارادی طور پر بائیں بازو کی آڑ لے کر اس کے وار سے بچنے کی کوشش کی تھی فورا" ہی مجھے احساس ہو گیا تھا کہ یہ میری غلطی تھی حواس کی ذرا سی بھی بھول چوک بعض اوقات بڑی مہلک ثابت ہوتی ہے۔ ذرا دیر پہلے میں چار تخیم شحیم اور پیشہ ور مسلح لڑاکوں سے بچ کر نکل آیا تھا لیکن اسی شئی کے سامنے غلطی کر گیا۔

سرنج کی نوکیں کہنی سے نیچے کپڑوں سے گزر کر میرے بازو میں پیوست ہو گئیں اور کئی انچ تک چیرتی چلی گئیں۔ اگر میرے جسم پر بلیزر نہ ہوتا تو شاید نیچے تک میری کلائی پر لمبے زخموں کی گہری لکیریں پڑ جاتیں۔ تکلیف سے میرے دانت بھنچ گئے۔ شئی نے دوسرا بازو میری کمر میں ڈال دیا تھا اور مجھے سیڑھیوں سے نیچے گرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اس کی کنپٹی پر ایک ہاتھ رسید کیا..... اور وہ اچھل کر کوڑے کے ڈرم کے قریب جا گرا اور وہیں ساکت ہو گیا۔

میں نے ایک نظر اپنے بائیں بازو پر ڈالی۔ زخموں سے خون ابل پڑا تھا اور دھیرے دھیرے دبیز بلیزر کی آستین سے رسنے لگا تھا۔ فی الحال اس کا کوئی علاج نہیں تھا۔ میں نے دائیں ہاتھ سے کہنی سے ذرا اوپر بازو کو سختی سے تھاما اور دوڑ پڑا۔ اس وقت بڑی شدت سے مجھے اپنی گاڑی کا خیال آرہا تھا۔ کاش کسی طرح میں اس تک پہنچ سکتا۔ لیکن اب مجھے سمتوں کے لحاظ سے اندازہ نہیں رہا تھا کہ میں نے گاڑی کہاں کھڑی کی تھی اور یہ موقع ایسا نہیں تھا کہ میں غیر یقینی طور پر گاڑی کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکنے کا خطرہ مول لیتا۔

دوسرا چوراہا عبور کرنے کے بعد میں لڑکی کی بتائی ہوئی نشانیوں کے مطابق سینما کے چھوٹے سے عقبی گیٹ پر پہنچ گیا۔ میرے بازو سے اب خون کی بوندیں ٹپکنے لگی تھیں۔ گیٹ سے گزر کر میں نیم تاریک احاطے میں پہنچا اور پارکنگ لاٹ کے قریب سے گزر کر سینما کی عمارت کے پہلو میں چلنے لگا۔ کمپاؤنڈ کا اگلا حصہ روشن تھا۔ سامنے دائیں ہاتھ پر دیوار کے ساتھ کینٹین اور پان سگریٹ کی دکان نظر آرہی تھی جن پر کاؤنٹر کے پیچھے دو تین آدمی اونگھ رہے تھے۔ کمپاؤنڈ میں ویرانی تھی۔ میں نے گھڑی دیکھی سوا دس بج رہے تھے۔

غالبا" آخری شو شروع ہو چکا تھا۔ اس لئے کمپاؤنڈ میں کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔

کینٹین کے سامنے پہنچ کر میں برآمدے میں ہو گیا کیونکہ کاؤنٹر کے پیچھے اونگتا ہوا آدمی کچھ چونک کر میری طرف دیکھنے کے بعد سنبھل کر بیٹھ گیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کی نظر میرے بازو پر پڑے۔ جس کی آستین اب خون میں بھیگ چکی تھی۔ برآمدے سے گزرتے وقت میری نظر بکنگ کی کھڑکیوں پر پڑی ایک کھڑکی کے پیچھے ابھی روشنی نظر آرہی تھی۔ گیلری کے ٹکٹ ابھی ختم نہیں ہوئے تھے اور بکنگ کلرک ایک ہاتھ پر ٹھوڑی ٹکائے بیٹھا متوقع نظروں سے باہر دیکھ رہا تھا۔ بجلی کے کوندے کی طرح ایک خیال میرے ذہن میں لپکا کہ اگر میں ٹکٹ لے کر اندر جا بیٹھوں تو ہال کے اندھیرے میں ایک تو میں اپنے بازو پر اطمینان سے کوئی رومال وغیرہ باندھنے کی کوشش کر سکتا ہوں۔ دوسرے مجھے سکون سے کچھ سوچنے کی مہلت مل جائے گی کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔

بکنگ ونڈو خاصی اونچی تھی کلرک وہاں سے میرے بازو پر نظر نہیں ڈال سکتا تھا۔ میں نے خاموشی سے پیسے اس کی طرف بڑھا کر ٹکٹ لیا اور کھڑکیوں کے ساتھ ہی گیلری کی طرف رہنمائی کرنے والا ایک تیر کا نشان دیکھ کر سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آگیا۔ یہاں روشنی تھی۔ میں نے بائیں بازو کو بالکل پہلو سے ملا کر ہاتھ جیب میں ٹھونس لیا اور گیٹ کیپر کو ٹکٹ دے کر آدھا حصہ واپس لے کر جلدی سے دروازہ کھول کر اندر گھس گیا۔ گیٹ کیپر نے مشینی انداز میں اپنا کام انجام دیا تھا اور میری طرف قطعا" توجہ نہیں دی تھی۔

اندر پہنچ کر میں چند لمحے تو دروازے سے ٹیک لگائے ہی کھڑا رہا اور جب آنکھیں ہال کے اندھیرے سے کچھ مانوس ہوئیں تو میں نے کرسیوں کی قطاروں کا جائزہ لیا۔ پردے پر جب کوئی زیادہ روشن سین آتا تو کرسیوں پر موجود اونچے نیچے انسانی ہیولے نظر آنے لگتے تھے۔ بائیں طرف کی پچھلی قطار تقریبا" خالی ہی تھی۔ میں اس کی آخری کرسی پر جا بیٹھا۔ مجھ سے آگے بھی کئی کرسیاں خالی تھیں۔ قدرے اطمینان کا سانس لینے کے بعد میں نے جیب سے رومال نکالا۔ مگر مجھے اندازہ ہوا کہ اس کی لمبائی کچھ زیادہ نہیں تھی دوسری چیز ٹائی ہی تھی جو اس مقصد کے لئے موزوں تھی۔ میں نے ٹائی کھولی اور اسے کہنی سے اوپر بازو پر دو تین چکر دے کر ایک ہاتھ اور دانتوں کی مدد سے حتی الامکان سختی سے گرہ لگا لی۔ زخم کی تکلیف تو یک لخت بڑھ گئی لیکن مجھے امید تھی کہ کچھ دیر بعد خون کا بہاؤ بہت کم ہو جائے گا۔

بازو کی طرف سے توجہ کچھ ہٹی تو خیالات نے یک لخت ذہن پر یلغار کر دی۔ کالج کا تصور ماہتاب کی یاد' ماں کی موت کا دکھ سب کچھ آج کی باتیں تھیں مگر زندگی گویا پلک جھپکتے ہی وقت کی بہت بڑی خلیج پھلانگ کر کہیں سے کہیں نکل گئی تھی۔ اب سوچا تو یک لخت ہی آنکھوں میں آنسوؤں کا غبار سا پھیل گیا اور پہلو میں نجانے کتنے زخموں کے منہ

کھل گئے۔ بیٹھے بٹھائے یہ کیا ہو گیا تھا اور میں کس اندھی کھائی کے دہانے پر آکھڑا ہوا تھا؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

ایک بات تو بہرحال طے تھی کہ میں اب لوٹ کر پونا نہیں جا سکتا تھا۔ کم از کم ان لوگوں کے حلقے میں نہیں جا سکتا جن کی مجھ سے ذرا سی بھی شناسائی تھی۔ مدن نے یا پھر شاید میری اپنی ہی تقدیر نے مجھے ان لوگوں کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ بمبئی میں بھی کم از کم اس وقت میں خطرات کے جنگل میں بھٹک رہا تھا۔ پولیس یقیناً" میری تلاش میں سرگرم ہو چکی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں نے جائے وقوع سے فرار ہو کر صحیح قدم اٹھایا تھا یا غلط۔ مگر وہاں ٹھہرنا بھی یقیناً" میرے لئے کوئی اچھے حالات کا پیغام لے کر نہ آتا اور ویسے بھی اب جو کچھ ہو چکا تھا اسے بدلنا تو میرے اختیار میں نہیں تھا۔

مجھے یہ بھی یقین تھا کہ جھگڑے میں جو دو افراد زندہ بچے تھے انہوں نے اپنے دو ساتھیوں کے قتل کا الزام مجھ پر ہی ڈالنا تھا اور ان دونوں کے علاوہ بالا خانے میں جس لڑکی سے میرا سامنا ہوا تھا اور جو خادمہ مجھے ممی کے پاس لے کر گئی تھی وہ پولیس کو میرا حلیہ خاصی تفصیل سے بتا سکتی تھی۔ اس لڑکی اور خادمہ کے رویے سے ویسے بھی میں نے شروع ہی میں محسوس کیا تھا کہ انہیں میری آمد کا انداز خاصا مشکوک لگا تھا۔ اور میری طرف سے کھٹک سی گئی تھیں۔ اور تو اور میری اپنی ماں کے قتل کا الزام بھی مجھ پر آسکتا تھا۔

ان کا بیمار دل مجھ سے یوں سامنا ہونے کے اثرات شاید برداشت نہیں کر سکا تھا مگر کون یقین کر سکتا تھا کہ اس ملاقات کے صدمے نے ان کی دھڑکنیں چھین لی تھیں۔ کسی کو صدمے کی نوعیت کا علم ہی نہیں تھا۔ کسی کو معلوم ہی نہیں تھا کہ انہوں نے اپنی اصلیت کو میری نظروں سے اوجھل رکھنے کے لئے بیس سال تک مجھے ایک علیحدہ دنیا میں رکھا تھا مگر ان کی ساری جدوجہد اکارت گئی تھی۔

صورت حال کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ دو تین افراد کے قتل کی یہ کہانی اگر اخبارات میں آجاتی تو مدن نے بھی میرے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کے لئے پولیس کو میرے بارے میں ہر وہ بات بتانی تھی جو اس کے علم میں ہوتی۔ میرے گھر کے بارے میں پولیس کو مطلع کرنا تھا تاکہ میں وہاں بھی پناہ نہ لے سکوں۔ اس نے تو ویسے ہی میری زندگی کا کوئی کمزور پہلو ڈھونڈنے کے لئے نہ جانے کتنی محنت کی تھی۔ مجھ سے دشمنی شروع ہونے کے بعد اس نے یقیناً" میرے گھر کی نگرانی کی تھی اور اس دوران ممی مجھ سے ملنے آئی تھیں تو مدن یا اس کے کسی گرگے نے یقیناً" ان کا تعاقب کیا تھا اور جو بات مجھے بیس برسوں میں معلوم نہیں ہو سکی تھی وہ اس نے چند دنوں میں معلوم کر لی تھی۔ دشمن تھا نا..... گھات میں لگا ہوا تھا۔

تصور ہی تصور میں اس کی شکل دیکھ کر میرے جسم کا رواں رواں شعلہ بن گیا اور بے یقینی اور بے امانی کے اس لمحے میں بھی میں نے یہ ضرور سوچا کہ اس فساد کے پتلے کو بھی ضرور پیروں تلے روند کر چھوڑوں گا۔ مجھے بربادی کے جہنم میں دھکیل کر اسے نہ جانے کیا ملا تھا۔ ماہتاب کو تو وہ اب بھی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ اتنا مجھے یقین تھا۔ میرے ساتھ تو اب جو بھی ہونا تھا سو ہونا تھا لیکن میں اپنی بربادی کے بعد اسے زندگی سے لذتیں کشید کرنے کے لئے نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ دل ہی دل میں اس فیصلے سے مجھے ایک گونہ سکون نہ ملا تھا۔

سسپنس فون 03036360959

پھر مجھے اس ڈائری کا خیال آیا جو ممی نے میری جیب میں ڈالی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ اس میں میرے ہر سوال کا جواب موجود ہے۔ جو میں دل میں لئے ان کے دروازے پر پہنچا تھا۔ افسوس کہ یہاں اندھیرے میں ڈائری کا مطالعہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں نے اضطراب سے پہلو بدلا اور میرے بازو میں ایک بار پھر ٹیس اٹھی۔

"میری طرح تمہارا دھیان بھی فلم میں ہرگز نہیں ہے۔"

میں اپنے کان کے قریب سے سرگوشی سن کر تقریباً" اچھل پڑا۔ وہ لڑکی نجانے کب میرے برابر والی سیٹ پر آبیٹھی تھی۔ ملگجے اندھیرے میں میں نے اس کے خدوخال کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔

اس کے بال کٹے ہوئے تھے۔ گھٹنوں کے نیچے تک کے اسکرٹ پر اس نے پھولی پھولی سی اون کی جرسی پہن رکھی تھی۔ اس کی عمر بیس سال سے زیادہ نہیں ہو گی۔ اس کے رخسار بھرے ہوئے اور پلکیں لمبی تھیں۔ فلم کے پردے سے منعکس ہونے والی مدھم روشنی میں اس کے ہونٹوں پر لگی ہوئی لپ اسٹک چمک رہی تھی۔

اس کی رنگت کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ پھولی پھولی جرسی میں اس کا جسم یوں قید تھا گویا چھوٹے جال میں بڑی مچھلی آن پھنسی ہو۔ اس کے کپڑوں سے کوئی سستی سی خوشبو پھوٹ رہی تھی تاہم بری نہیں لگ رہی تھی۔

میرے سینے سے ایک طویل سانس خارج ہوئی پھر میں نے آہستگی سے کہا..... "ہاں ..... فلم کی طرف واقعی میرا دھیان نہیں تھا۔"

"کیوں؟ کیا تمہیں ان فلمی ہیروئنوں سے کوئی دلچسپی نہیں جن کے عشق میں آج کل کے نوجوان مرے جا رہے ہیں؟" اب اس نے گردن گھما کر میری آنکھوں میں جھانکا اور اس کی سانسوں کی خوشگوار حرارت مجھے اپنے رخساروں پر محسوس ہوئی۔

مجھے کوئی جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔ ایک بار تو میرا جی چاہا کہ اٹھ کر بھاگ لوں لیکن پھر میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ یہ تو زیادہ ہی مشکوک بننے والی بات تھی۔ "میرا ذہن دراصل کہیں اور پہنچا ہوا تھا۔" بالآخر میں نے کہا۔

"کیا اسے کچھ اور چیزوں پر دھیان دینے کے لئے بھی واپس نہیں لایا جا سکتا؟" وہ مسکرائی۔

"مثلاً؟" میں نے پوچھا۔

"مثلاً ایک چھوٹے مگر پرسکون اور آرام دہ کمرے میں کسی کی میزبانی میں رات گزارنا' دنیا بھر کی پریشانیوں سے نا آسودگی سے بے نیاز ہو جانا وغیرہ۔" اس نے بدستور مسکراتے ہوئے سرگوشی کی۔

"کہاں اور کیسے؟" میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔ میرے ذہن کے کسی گوشے میں اچانک ایک خیال نے سر ابھارا تھا۔ لڑکی یک لخت مجھے بہت اہم محسوس ہونے لگی تھی۔

"یہاں سے کچھ ہی دور۔ ایک کمرے میں۔" اس نے جواب دیا اور وہاں پینے پلانے کو بھی کچھ مل سکتا ہے بشرطیکہ اس کی قیمت علیحدہ سے ادا کر سکو۔"

"پینے پلانے کو چھوڑو۔" میں نے تھوک نگل کر کہا۔ "مجھے منظور ہے۔"

"تو آؤ پھر چلیں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا رخ اگلے دروازے کی طرف تھا۔ میں نے ایک قدم بڑھا کر اسے روک لیا۔

"پچھلے دروازے سے ہی سے چلتے ہیں۔ میں نے کہا۔

"کیوں ڈر لگ رہا ہے؟" اس نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"نہیں ..... دراصل...." میں کچھ ہچکچایا۔ دراصل ایک جھگڑے میں میرا بازو زخمی ہو گیا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اس کی طرف کسی کی توجہ مبذول ہو۔"

ایک لمحے کے لئے وہ یوں ساکت کھڑی رہی گویا کسی سوچ میں پڑ گئی ہو۔ پھر اپنے تراشیدہ بالوں کو خفیف سا جھٹکا دے کر بولی۔ "خیر ٹھیک ہے..... زخمی بازو سے میرے کاروبار پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔"

ہم پچھلے دروازے سے باہر آ گئے۔ گیٹ کیپر کہیں غائب ہو چکا تھا نیچے آکر سینما سے نکلنے کے بعد ہم فٹ پاتھ پر چلنے لگے۔ چند قدم آئے فٹ پاتھ کے ساتھ کئی بگھیاں ٹیکسیاں اور سائیکل رکشا کھڑے تھے۔ ایک ٹیکسی کی کھڑکی میں ہاتھ ڈال کر لڑکی نے اونگھتے ہوئے ڈرائیور کو بلایا۔ "اے ..... لیکسن اسٹریٹ چلو۔" اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا اور میرا ہاتھ پکڑ کر پچھلا دروازہ کھول کر خود بیٹھنے کے بعد مجھے بھی اندر کھینچ لیا۔

کچھ دیر بعد اس نے جس عمارت کے سامنے ٹیکسی رکوائی اس کی زرد اور سیم زدہ دیواروں پر کہیں کہیں سیاہ کائی جمی ہوئی تھی۔ سامنے ہی بغیر دروازے کے ایک خاصی کشادہ لابی سی تھی جس کے ایک طرف سے چکردار چوبی زینہ اوپر جا رہا تھا۔ کھٹ کھٹ کرتے کرتے اس زینے سے چڑھ کر ہم پہلی منزل کی راہ داری میں آئے جہاں دونوں طرف کمروں

کی قطاریں تھیں۔ ہر کمرے کا دروازہ سیاہ رنگ کا تھا جو کبھی سلیٹی رہا ہو گا۔ لڑکی نے بائیں طرف کے آخری کمرے کا دروازہ کھولا اور لائٹ آن کر کے یوں ایک طرف کھڑی ہو گئی گویا مجھے کمرے کا معائنہ کرا رہی ہو۔

عمارت جتنی پرانی خستہ حال نظر آ رہی تھی۔ اس کی نسبت کمرہ اندر سے خاصا صاف ستھرا تھا۔ حتیٰ کے دیواروں پر تازہ سفیدی بھی نظر آ رہی تھی۔ فرش صاف ستھرے ٹائلز کا تھا۔ ایک گوشے میں مسہری لگی ہوئی تھی جس پر صاف ستھرا بستر تھا۔ اس کے قریب چھوٹی سی تپائی اور ایک کرسی تھی۔ تپائی پر چند کتابیں رسالے اور المونیم کی ایک کیتلی اور کپ رکھا ہوا تھا۔

ایک کونے میں کھڑکی کے قریب بڑی سی کارنس تھی جس پر اسٹوو اور چند برتن پڑے تھے۔ کارنس کے قریب ہی واش بیسن تھا۔ ایک طرف اونچی سی دیوار گیر الماری تھی۔ جس کے ایک پٹ پر خاصا بڑا آئینہ لگا ہوا تھا قریب ہی ایک چھوٹی سی سنگھار میز رکھی ہوئی تھی۔

لڑکی نے دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھا دی اور مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں بیٹھ چکا تھا تو اس نے پھولی پھولی سی اون والی جرسی اتار کر مسہری پر پھینک دی اب میں نے دیکھا کہ وہ اتنی زیادہ جسیم نہیں تھی جتنی جرسی میں نظر آ رہی تھی۔

"اب بتاؤ پہلے تمہارے زخمی بازو کا بندوبست کیا جائے یا نا آسودہ خواہشوں کا؟ اس نے دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر ایک ادا سے بالوں کو جھٹکا دے کر پوچھا۔ چھت میں تار کے سرے میں لٹکے ہوئے بلب کی روشنی میں اس کی صندلی رنگت میں عجیب سی چمک پیدا ہو گئی تھی۔

"زخمی بازو کا علاج پہلے ہونا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "میرا کافی خون ضائع ہو چکا ہے۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور سنگھار میز کی طرف بڑھ گئی۔ اس کی تینوں درازوں میں ہاتھ مارنے کے بعد بالآخر اس نے چوڑی پٹی کا ایک پتلا سا رول اور ٹنکچر آیوڈین کی ایک شیشی نکالی اور بولی۔ "بلیزر اتار کا واش بیسن پر آجاؤ"

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ اس نے قمیض کی آستین کو تہہ در تہہ اوپر کو الٹنے کے بعد زخم کا معائنہ کیا اور اس کے ہونٹ سیٹی بجانے کے انداز میں سکڑ گئے۔ زخم واقعی میری توقع سے بھی بڑا تھا بلکہ یہ ایک نہیں کئی زخم تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ کئی شاخہ چاقو سے بازو کا حصہ چیر دیا گیا ہو۔ اس نے پٹی کا کچھ حصہ پھاڑ کر ٹنکچر آیوڈین میں بھگویا اور اسے زخم پر تھپکنے لگی۔ میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

"ارے.... اس میں تو شیشے کے ذرے بھی ہیں۔" وہ بازو پر جھکتے ہوئے بولی۔

"کسی طرح انہیں نکال دو۔" میں نے زخم پر سے نظر ہٹاتے ہوئے کہا۔ اس نے ماچس کی ایک تیلی پر ذرا سی پٹی لپیٹی اور اسے آیوڈین میں بھگو کر دوبارہ بازو پر جھک گئی۔ اس نے حتی الامکان احتیاط کے ساتھ زخم کی گہرائیوں میں سے تمام ذریے نکالے اور میں دانت پر دانت جمائے کھڑا رہا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ نرسنگ عورت کی بنیادی خصوصیت ہوتی ہے اور اس کے لئے اسے کسی تربیت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کا عملی مظاہرہ میں نے آج دیکھ لیا تھا۔

شیشے کے ذرے نکالنے کے بعد اس نے زخم کو صاف کیا اور اس پر مزید آیوڈین لگا کر خوب اچھی طرح کس کر کئی چکر دے کر پٹی باندھ دی اور ہاتھ دھونے لگی۔ پٹی کی بندشیں اس قدر سخت تھیں کہ میرے ہاتھ کی پشت پر نیلی رگیں ابھر آئی تھیں تاہم اب آیوڈین کی جلن اور زخم کی اذیت کافی حد تک ختم ہو گئی تھی اور مجھے کچھ سکون سا ہو گیا تھا۔

دوبارہ کرسی پر بیٹھنے کے بعد میں نے کئی گہری گہری سانسیں لی۔ وہ مسہری کی پٹی پر آبیٹھی تھی۔ دونوں ہاتھ پیچھے کو ٹکا کر وہ ترچھی بیٹھی گہری گہری نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں طلب تھی پیاس تھی۔ میرے کانوں کی لوئیں تپنے لگیں۔ دفعتہ" اس نے اپنی طلب اور پیاس پر سرد مہری کا پردہ ڈال کر قدرے آگے کو جھک کر ہاتھ پھیلاتے ہوئے خالص کاروباری لہجے میں کہا۔ "پیسے پیشگی نکال دو۔"

میں نے سو سو کے دو نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھائے اب میرے پاس کل چار سو روپے رہ گئے تھے۔ اس نے ایک نوٹ بڑی نفاست کے ساتھ تکیے کے نیچے رکھا اور دوسرا نوٹ مجھے واپس کرنے لگی۔ میں اس کے کھرے حساب کتاب پر حیران رہ گیا۔

"رکھ لو تم نے میری پٹی بھی کی ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ میں نے انسانیت کے ناطے کی ہے۔" اس نے سادگی سے کہا۔" پیشہ اپنی جگہ ہے۔ انسانیت بھی تو کوئی چیز ہے۔" اس نے نوٹ میری گود میں پھینک دیا اور پھر اٹھ کر مجھ پر آجھکی۔ بلاشبہ وہ اپنے پیشے میں بہت ماہر تھی یا پھر شاید میں ہی نو آموز تھا۔ آنا فانا" اس نے مجھے بازو کی تکلیف بھلا دی۔

ابھی میں جھجک اور گھبراہٹ کے پھندے سے نکلا ہی تھا کہ باہر بھاری جوتوں کی دھمک سنائی دی۔ پھر کسی نے زور سے دروازے پر دستک دی۔ میرے سینے میں پھڑکتا سانس کا پنچھی یک لخت ساکت ہو گیا۔ لڑکی گھبرا کر سیدھی کھڑی ہو گئی اور متوحش نظروں سے دروازے کو دیکھنے لگی۔

"تم جلدی سے کہیں چھپ جاؤ۔" اچانک اس نے سرگوشی کی۔ میں ہکا بکا اس کی شکل دیکھنے لگا۔ یہ کمرہ سر چھپانے کے لئے موزوں تھا مگر چھپنے کے لئے نہیں۔ لے دے کے

ایک مسہری تھی مگر وہ اتنی نیچی تھی کہ اس کے نیچے میرا جسم نہیں سما سکتا تھا۔ یہ سوال بھی میرے ذہن میں ابھرا تھا کہ اگر اس کا پیشہ یہی تھا تو وہ اس بیوی کی طرح کیوں گھبرا گئی تھی جس نے شوہر سے چوری چوری اپنے کسی آشنا کو بلا رکھا ہو۔ لیکن پھر مجھے خفیف سا اندیشہ یہ محسوس ہوا کہ شاید دروازے پر پولیس ہو۔ راستے میں ٹپکنے والی میرے خون کی بوندوں نے ان کی یہاں تک رہنمائی کر دی ہو۔ یا شاید ٹیکسی ڈرائیور نے کسی گشت کرنے والے سپاہی کو میرے متعلق بتا دیا ہو۔ کیونکہ ٹیکسی سے اترتے وقت میری تمام تر احتیاط کے باوجود اس کی نظر میری خون میں بھیگی ہوئی آستین پر پڑ گئی تھی اور اس نے شک آلود سی نظروں سے مجھے گھورا تھا۔ یہی اندیشے تھے جنہوں نے مجھے ہڑبڑا کر اٹھنے پر مجبور کر دیا۔

"الماری میں چھپ جاؤ۔" لڑکی نے سرگوشی کی۔ "اس میں کافی جگہ ہے۔"

میں الماری کی طرف لپکا اور دروازہ کھول کر اندر گھس گیا۔ ہینگروں پر لٹکے ہوئے اور اسی مانوس سی خوشبو میں رچے ہوئے بہت سے کپڑے میرے چہرے سے ٹکرائے۔ الماری کے فرش پر اونچی ہیل والی جوتیوں کے کئی جوڑے رکھے تھے۔ ان پر پاؤں پڑنے سے میں لڑکھڑا بھی گیا۔ بہرحال سنبھل کر میں نے کپڑے ادھر ادھر ہٹائے اور الماری کی پچھلی دیوار سے پشت ٹکا کر کھڑا ہو گیا۔ لڑکی نے جھپٹ کر دروازہ بند کر دیا اور تاریکی نے مجھے اپنی پناہ میں لے لیا۔

"دروازہ کھولو شوبھا!" باہر سے ایک گونجیلی آواز سنائی دی اور اس مرتبہ دروازہ باقاعدہ دھڑ دھڑایا گیا۔ چند لمحے بعد میں نے دروازہ کھلنے کی آواز سنی پھر قدموں کی دھمک سے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی بھینسا کمرے میں گھس آیا ہو۔

"تم آج بہت جلدی آگئے سریندر!" میں نے شوبھا کی میٹھی میٹھی سی آواز سنی اب مجھے اپنے آپ پر حیرت ہو رہی تھی کہ اتنے مرحلے طے کرنے کے بعد بھی میں نے لڑکی کا نام نہیں پوچھا تھا اور وہ مجھے اب معلوم ہوا تھا۔ اس کی غالبا" یہ وجہ تھی کہ اس نے بھی میرا نام نہیں پوچھا تھا۔

"بڑی دیر لگائی تم نے دروازہ کھولنے میں؟" میں نے سریندر کی بھاری آواز سنی۔ آواز سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ گرانڈیل آدمی ہو گا۔ مجھے حیرت تھی کہ شوبھا اس سے یہ کیوں نہیں کہہ رہی تھی اس وقت میرے پاس کوئی موجود ہے۔ تم چلے جاؤ پھر کسی وقت آنا۔ لیکن پھر مجھے احساس ہوا کہ وہ میرا جیسا نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ شوبھا نے اس سے پہلا سوال یہی کیا تھا۔ "تم آج بہت جلدی آگئے سریندر۔"

"میں ...... میں.... دراصل وہ مجھے اونگھ آگئی تھی۔" میں نے شوبھا کی آواز سنی۔

"اور اونگھ ہی اونگھ میں تمہاری ساری لپ اسٹک خراب ہو گئی۔" سریندر کی آواز میں طنز کی کاٹ تھی۔ ایک لمحے کے توقف سے اس کی آواز دوبارہ گونجی۔ "اور یہ تم نے

لڑکوں والے بلیزر کب سے پہننے شروع کر دیئے۔"

"بلیزر....." شوبھا کی گھٹی گھٹی سی آواز ابھری۔

"اوہ ..... ہاں.... وہ میں نے پلمبر لڑکے کو بلایا تھا..... شاید وہ بھول گیا ہے.... پائپ لیک کر رہا تھا..... اس لئے میں نے لڑکے کو بلایا تھا۔

"پانی کے پائپ سے غالباً" خون لیک ہونے لگا تھا جو پلمبر کی آستین اور واش بیسن پر پھیل گیا..... ہے نا؟" سریندر کا لہجہ زہر میں بجھا ہوا تھا۔ "میں نے تم سے کتنی مرتبہ کہا ہے کہ جلدی مجھے کوئی کام مل جائے گا تم اپنی یہ حرکتیں بند کر دو....."

"ایک سال تو ہو گیا ہے مجھے یہ سنتے ہوئے کہ جلد ہی کام مل جائے گا.... جلد ہی کام مل جائے گا۔" میں نے شوبھا کو پھٹ پڑنے والے انداز میں کہتے سنا۔ "مجھ سے نہیں برداشت ہوتے فاقے اور نہ میں روز روز مالک مکان سے بے عزتی کرا سکتی ہوں....."

"چٹاخ" میں نے زور دار طمانچے کی آواز سنی۔ شوبھا کے گرنے اور پھر ہولے ہولے سسکیاں لینے کی آواز سنائی دی۔ ساتھ ہی سریندر گرجا۔ "کہاں ہے وہ مردود؟ پھر وہ خود ہی اپنے سوال کا جواب دیتے ہوئے بولا۔ "الماری میں ہو گا اور کہاں ہو سکتا ہے۔"

میں نے بھاری قدموں کی دھمک الماری کی طرف بڑھتے ہوئے محسوس کی۔ یہ اندازہ تو مجھے پہلے ہی ہو چکا تھا کہ سریندر کوئی بھاری تن و توش کا شخص ہے میں نے اپنے چہرے کے سامنے سے کپڑے ہٹائے۔ ہاتھ سیدھا کیا اور سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔

دروازہ کھلتے ہی میں نے ایک لحہ ضائع کئے بغیر دروازہ کھولنے والے کی کنپٹی پر ایک گھونسا رسید کیا۔ وہ چیخ مار کر الٹ پڑا اور فرش پر جا گرا میں نے دیکھا' وہ ایک قد آور نوجوان تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا مگر بھاری ڈنڈا تھا اور وہ فرش سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اس کی کنپٹی پر ٹھوکر رسید کی اور وہ ہچکی سی لے کر اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔ روتی ہوئی شوبھا اپنے چہرے سے ہاتھ ہٹا کر تیزی سے اس کی طرف جھپٹی اور فرش پر بیٹھ کر اسے جھنجھوڑنے لگی۔ "سریندر....." پھر وہ میری طرف مڑ کر غضب ناک لہجے میں بولی۔ "دفع ہو جاؤ یہاں سے ..... ورنہ میں ابھی چیخ چیخ کر لوگوں کو جمع کر لوں گی۔"

میرے خیال میں لوگوں کو جمع کرنے کے لئے چیخنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کی آواز پہلے ہی بہت بلند تھی اور سریندر بھی خوب غل مچا چکا تھا۔ اڑوس پڑوس میں کچھ ہلچل کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔

○

"اگر تمہیں اپنے خاوند کا اتنا ہی ڈر تھا تو مجھے یہاں لائی کیوں تھیں؟" میں نے قدرے غصیلے لہجے میں کہا۔

"یہ میرا خاوند نہیں بھائی ہے۔" وہ چلائی پھر قدرے نیچی آواز میں بولی..... اور جب بھی اسے شراب نہیں ملتی اس کی غیرت جاگ اٹھتی ہے۔ بہرحال یہ جیسا بھی ہے لیکن میں برداشت نہیں کر سکتی کہ کوئی یوں بے دردی سے اسے مارے..... جاؤ..... دفع ہو جاؤ۔ گم کر لو شکل میری آنکھوں کے سامنے سے ورنہ میں.....

میں نے اس کی آواز مزید بلند ہونے کا انتظار نہیں کیا اور تیزی سے باہر آ گیا۔ اڑوس پڑوس کے دروازے کھلنے لگے تھے سیڑھیوں کے قریب ایک نوجوان نے میرا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ سینے پر ہاتھ مار کر میں نے اسے ایک طرف دھکیلا اور تیزی سے سیڑھیاں اتر گیا۔

ایک بار پھر میں ایک مسافر بے اماں تھا اور گلی کوچوں کی خاک چھان رہا تھا۔ کل رات تک میرے سر پر ایک پر آسائش گھر کی چھت تھی مجھے مہکتی زلفوں کی چھاؤں میسر تھی اور آج کہیں سایہ دیوار میں بھی مجھے پناہ نہیں مل رہی تھی۔

میرے دل کو دھڑکا سا لگا ہوا تھا کہ جیسے کوئی نادیدہ ہاتھ میرے تعاقب میں ہے۔ گلیاں اجنبی تھیں اور وقت نا مہربان۔ لمحے پہاڑ تھے اور دل ناتواں' تقدیر نے اچانک ہی پلٹا کھایا تھا' کہاں تو عملی زندگی کی کسی تلخی سے واسطہ ہی نہیں پڑا تھا اور کہاں زمین و آسمان نے ایک دم ہی بے مہری کے تمام ہتھیار آزمانا شروع کر دیئے تھے۔

بازو میں ایک بار پھر چس چس ہونے لگی تھی۔ ایک الیکٹرک پول کے قریب رک کر میں نے بازو کا جائزہ لیا۔ کسی ہوئی پٹی پر آیوڈین کی پیلاہٹ کے درمیان خون کی سرخی نمودار ہونے لگی تھی۔ خون دھیرے دھیرے رس رہا تھا۔ مجھ پر اب تھکن اور نقاہت کا غلبہ تھا۔ اعصاب اب آرام مانگ رہے تھے جسم کو پناہ کی طلب تھی۔ رات اب گہری ہو چلی تھی تاہم کچھ گلیوں اور بازاروں میں اب بھی رونق تھی اور میں ان سے بچتا بچاتا سنسان اور نیم تاریک گلیوں میں چلنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ایک بار میں نے سوچا کہ کسی طرح پونا واپس چلا جاؤں۔ کم از کم آج کی رات تو

میرا گھر محفوظ تھا لیکن معلوم نہیں تھا اس وقت کوئی ٹرین اس طرف جاتی تھی یا نہیں اور پھر مجھے اسٹیشن جیسی پر ہجوم جگہ پر جانے کے تصور سے بھی خوف آ رہا تھا۔

چلتے چلتے مجھے بہت دیر ہو چکی تھی اور میں نہ جانے کہاں سے کہاں نکل آیا تھا اب میں ایک ایسے علاقے میں پہنچ چکا تھا جہاں مکمل طور پر ویرانی تھی۔ خالی خالی عمارتیں تھیں۔ کچھ آگے چل کر مجھے سڑک کے بائیں ہاتھ ایک میدان سا نظر آیا۔ اس میدان میں کئی منزلہ تین عمارتیں زیر تعمیر تھیں۔ میں سڑک چھوڑ کر ان عمارتوں کے درمیان چلنے لگا۔ ایک عمارت تقریباً" مکمل ہی تھی۔ ایک میں لکڑی کا کام باقی تھا۔ دروازوں پر چوکٹیں بھی لگی ہوئی تھیں اور کہیں کہیں پٹ بھی لگ چکے تھے۔ باہر کچی زمین پر دو تین اڈے بھی لگے ہوئے تھے جن پر بڑھئی کام کرتے ہیں اور ان کے ارد گرد لکڑی کا بہت سا برادہ اور چھلی ہوئی کھپچیاں وغیرہ بکھری ہوئی تھیں۔

میں نے ایک بے پٹ کے دروازے سے اندر جھانک کر دیکھا۔ سناٹا اور تاریکی! میں نے احتیاط سے اندر قدم رکھا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ کچھ فاصلے پر ایک اور دروازے کا دھندلا سا خلا نظر آ رہا تھا۔ اس سے گزر کر میں ایک کشادہ حصے میں پہنچ گیا جہاں چھت نہیں تھی اور اندھیرا کچھ کم گہرا تھا۔ اچانک میں اچھل پڑا۔ کسی نے میرے قریب ہی ماچس کی تیلی جلائی۔ اس کی سرسراہٹ مجھے بم کے دھماکے سے زیادہ بلند محسوس ہوئی تھی۔

"کون ہے بے؟" تیلی کا شعلہ میرے چہرے کے قریب آ گیا۔ لرزتی زرد روشنی میں میں نے اپنے مخاطب کو بھی دیکھ لیا۔ وہ گٹھے ہوئے جسم کا ایک میانہ قد آدمی تھا۔ اس کے سیاہ چہرے پر چکنائی سی چمک رہی تھی۔ اس کے بائیں ہاتھ میں ایک بندوق تھی۔

"تم چوکیدار ہو؟" میں نے سنبھل کر پوچھا۔ میرے ذہن میں اچانک ہی خیال ابھرا تھا کہ اسے پانچ دس روپے دے کر آج کی رات کے لئے اس عمارت میں کہیں پڑے رہنے کی اجازت لینے کی کوشش کروں گا۔

"چوکیدار؟" اس نے دہرایا اور زور سے ہنسا۔ اس کے پیلے پیلے دانت ایک لمحے کے لئے چمکے اور پھر تیلی بجھ گئی۔ اس لمحے میرے دل میں آئی کہ اسے چوپٹ ہی کر دوں یا کم از کم اس کی بندوق تو اچک ہی لوں پھر سوچا کہ اگر وہ میرے لئے الجھن کا باعث نہ بنے تو بلا وجہ ہنگامے کی کیا ضرورت ہے۔

اس نے بڑی پھرتی سے دوسری تیلی جلائی اور بندوق دوبارہ سنبھال لی۔ "میں سمجھ گیا.... میں سمجھ گیا۔" اس نے لمبوترا سا سر ہلا دیا۔ "پناہ کی تلاش میں ہو۔ میرے ساتھ آجاؤ۔" اس کی آواز کھردری لیکن لہجہ دوستانہ تھا۔ اس کا رخ سیڑھیوں کی طرف تھا۔

"آجاؤ..... آجاؤ۔" اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ "ہم بھی تمہارے ہی بھائی بند ہیں۔" میں اس کے پیچھے چل دیا۔ سیڑھیاں چڑھ کر ہم پہلی منزل پر آئے اور بے پٹ کے

ایک دروازے سے گزر کر میں نے اپنے آپ کو ایک ہال میں پایا۔ یہاں کا منظر دیکھ کر میں ٹھٹھکا۔ دیوار کے ساتھ دو میلے کچیلے گدے بچھے ہوئے تھے اور ان پر پانچ افراد موجود تھے۔ کوئی نیم دراز تھا کوئی آڑا ترچھا بیٹھا تھا۔ ان میں سے دو سگریٹ پی رہے تھے اور ہال میں چرس کی بو پھیلی ہوئی تھی۔

ایک طرف دو اینٹوں پر لالٹین رکھی تھی۔ گدوں سے کچھ دور لوہے کی ایک انگیٹھی رکھی تھی جس میں کوئلے دہک رہے تھے۔ انگیٹھی پر ایک دیگچی دھری تھی جس سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ ان پانچوں میں ایک قدرے ہٹ کر بیٹھا تھا۔ اس نے سرہانے رکھی ایک گٹھڑی سی پر کہنی ٹکا رکھی تھی۔ جسامت کے اعتبار سے وہ پورا دیو کا دیو تھا۔ اس کے سر کے جھاڑ جھنکاڑ بال اور داڑھی مونچھیں آپس میں یوں مدغم تھیں کہ چہرے کی جلد بہت کم نظر آ رہی تھی۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں اس کی سرخ انگارہ سی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اس کے ہاتھ کے قریب ہی ایک لمبی سی نال کا ریوالور اور گولیوں کی پیٹی پڑی تھی۔

"ایک مہمان آیا ہے سردار!" مجھے ساتھ لانے والے نے دیو زاد کو مخاطب کیا۔ اس کی باچھیں نہ جانے کیوں کھلی جا رہی تھیں۔

"آجا.... آجا... ابے آگے آجا... ڈرتا کیوں ہے۔" دیو زاد نے مجھے اشارہ کیا۔ نہ جانے کیوں اسے خوش فہمی ہوئی تھی کہ میں ڈر رہا تھا۔

میں ذرا قریب چلا گیا جہاں انگیٹھی پر دیگچی میں کچھ ابل رہا تھا۔ چرس کی بو کے درمیان ہی چائے کی مہک میرے نتھنوں سے ٹکرائی۔

"بیٹھ جاؤ۔" دیو زاد نے اشارہ کیا۔ میں وہیں بیٹھ گیا جہاں کھڑا تھا۔ وہ سب عجیب سی نظروں سے مجھے سرتاپا گھور رہے تھے۔ شاید نظروں ہی نظروں میں تول رہے تھے۔ میں بھی ان کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ سب میلی کچیلی شلوار قمیضوں میں ملبوس تھے۔ دیو زاد کے جسم پر موٹی سی واسکٹ بھی تھی۔ ان میں سے ایک دبلا اور طویل قامت تھا۔ اس کی ناک کے قریب ایک موٹا سا مسا تھا۔ ایک ناٹا مگر چوڑا چکلا اور مضبوط آدمی تھا۔ تیسرا بھی جسامت میں تقریباً" اتنا ہی تھا مگر اس کے چہرے پر چیچک کے گہرے داغ تھے چوتھے کی مونچھیں بھوری اور رنگت گوری تھی۔ اگر وہ کچھ صاف ستھرا ہوتا اور اس کا لباس قرینے کا ہوتا تو وہ کسی معزز گھرانے کا فرد لگتا۔ پانچویں کی شکل لومڑی سے مشابہ تھی مگر جسم بیل کی طرح مضبوط نظر آتا تھا۔ مجھے اوپر لانے والے آدمی کو ملا کر وہ چھ آدمی تھے اور ان میں سے کوئی بھی کم خطرناک نہیں لگتا تھا۔ ان کی نظریں میرے جسم میں چبھ رہی تھیں۔

"گھر سے بھاگ کر آیا ہے کیا؟ ہیرو بننے؟" دیو زاد نے پوچھا اور بالوں میں گھرے ہوئے اس کے موٹے موٹے ہونٹ پھیل گئے۔ شاید وہ مسکرایا تھا۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔

"کسی سے جھگڑا کر کے آیا ہے؟" اس نے کھردری آواز میں پوچھا۔ میں نے اس بار بھی نفی میں سرہلا دیا۔

"تو پھر یہ بازو کسی شیر کے منہ میں دے دیا تھا کیا؟" اس نے میرے بازو کی طرف اشارہ کیا جس کی پٹی اب خون میں پوری طرح بھیگ چکی تھی۔

میں نے ایک بار پھر نفی میں سرہلایا تو وہ کچھ چڑ کر بولا۔

"منہ میں زبان نہیں ہے کیا جو یہ دھڑی بھر کا سرہلائے جا رہا ہے؟؟"

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "نہ میں گھر سے بھاگ کر ہیرو بننے آیا ہوں نہ میرا کسی سے جھگڑا ہوا ہے۔" میں نے ملائمت سے کہا۔ "میں کسی کی تلاش میں نکلا ہوا ہوں اور یہ بازو .....یہ ایک مشین پر کام کرتے ہوئے زخمی ہو گیا تھا۔"

"ابے پہلے جھوٹ بولنے کا ڈھنگ تو سیکھ لے پھر استادوں کے سامنے زبان چلائیو۔" دیو زاد نے سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس کے ساتھیوں نے ہم آہنگ ہو کر قہقہہ لگایا پھر ان میں سے چیچک زدہ چہرے والا بولا۔ "دیکھ کہیں وہ آدمی ہم میں تو نہیں جس کی تجھے کھوج ہے؟" اس نے اپنا مکروہ چہرہ آگے کر دیا۔

باقیوں نے بھی اس کی تقلید کی۔ میں خاموش رہا۔ ان کی ابے تبے مجھے ناگوار گزر رہی تھی۔ انہوں نے ایک بار پھر ہم آہنگ ہو کر قہقہہ لگایا اور گردنیں سیدھی کر لیں۔ ان کا قہقہہ ویران عمارت میں اس طرح گونجا تھا جیسے کسی کھنڈر میں سینکڑوں بدروحیں چلا اٹھی ہوں۔ دیوزاد نے اب اپنا ریوالور اٹھا لیا تھا اور اسے کھلونے کی طرح بار بار ہاتھ میں اچھال رہا تھا۔

لومڑی کی شکل والے نے ایک میلے کپڑے سے دیگچی پکڑ کر انگیٹھی سے اتاری اور قریب رکھی اکلوتی پیالی میں چائے انڈیلی۔ "چائے پیئے گا؟" اس نے دیگچی واپس انگیٹھی پر رکھ کر مجھ سے پوچھا اور تب مجھے اچانک احساس ہوا کہ بہت دیر سے میرے معدے میں جو ٹیسیں اٹھ رہی تھیں وہ دراصل بھوک کی تھیں۔ میں نے صبح ناشتہ کیا تھا اور اس کے بعد سے اب تک کچھ نہیں کھایا تھا۔ تبھی مجھے چائے کی مہک اتنی اچھی لگ رہی تھی۔ بھوک کے احساس سے یک لخت مجھ پر نقاہت سی طاری ہو گئی۔ تھوک نگل کر میں نے چائے کی پیالی کی طرف دیکھا اور اثبات میں سرہلایا۔

"قیمت ادا کرنی پڑے گی۔" لومڑی کی شکل والے نے کہا۔

"میرے پاس تھوڑے سے پیسے ہیں۔" میں نے کہا "کیا قیمت لو گے؟"

"تم جیسے نئی عمر کے چھوکروں سے ہم قیمت پیسوں میں نہیں لیتے۔" چیچک زدہ چہرے والے نے کہا اور ایک بار پھر انہوں نے قہقہہ لگایا اور تب میں نے محسوس کیا کہ اتنی بھوکی نظروں سے میں چائے کی پیالی کو نہیں دیکھ رہا تھا جتنی بھوکی نظروں سے وہ مجھے گھور

رہے تھے۔ پہلی بار خوف کی ایک ہلکی سی لہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔ اب میں نے ایک نئے زاویہ نگاہ سے ان کا جائزہ لیا۔ لومڑی کی سی شکل والا میرے سب سے قریب تھا اور ان کا سردار مجھ سے سب سے زیادہ فاصلے پر تھا اور اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور یہی ایک چیز میرے لئے سب سے زیادہ خطرناک تھی۔ خصوصاً" ایسے وقت میں جب کہ میرے زخمی بازو' بھوک' تھکن اور اعصابی توڑ پھوڑ نے میری آدھی سے زیادہ جان کھینچ رکھی تھی۔

"چپ کیوں ہو گیا؟ لے چل پی لے۔" لومڑی کی سی شکل والے نے چائے کی پیالی اٹھا کر میری طرف بڑھائی۔

"رہنے دو.... مجھے نہیں چاہیے۔" میں نے کہا۔

"ڈر گیا بے چارا۔ "چیچک زدہ چہرے والے نے کہا۔

"ابے زیادہ نخرے نہ دکھا...... چل .... پی۔" لومڑی نما آدمی نے سخت لہجے میں کہا اور پیالی دوبارہ میری طرف بڑھائی۔ میں نے پیالی لے لی۔ ایک چسکی لینے سے میرے خشک ہونٹ کچھ نم ہوئے اور میرا جی چاہا کہ ایک ہی سانس میں یہ ابلتا ہوا سیال معدے میں انڈیل لوں تاکہ جسم میں کچھ تو زندگی کی حرارت دوڑے۔ بمشکل میں نے اپنے آپ کو اس خواہش کی تکمیل سے باز رکھا۔ یہ گرم سیال اس وقت میرے لئے بہت اہم تھا۔

چسکی لے کر میں نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ وہ سب ساکت بیٹھے میری ہی طرف دیکھ رہے تھے گویا میں کوئی دلچسپ تماشا پیش کر رہا تھا۔

پیالی ہتھیلی پر سنبھال کر میں نے دوبارہ چسکی لینے کے لئے سر جھکایا لیکن اس بار میں نے چسکی لینے کے بجائے پیالی سردار کے منہ پر کھینچ ماری۔

حتی الامکان پھرتی سے اٹھتے ہوئے میں نے انگیٹھی کو ٹھوکر رسید کی۔ انگاروں کے بکھرنے اور دیگچی کے الٹنے کا منظر میں نے نہیں دیکھا اور دروازے کی طرف چھلانگ لگا دی۔ وحشیانہ چیخیں اور دیو زاد کی دہاڑ میں نے اپنے عقب میں سنی لیکن میں دروازہ پار کر چکا تھا۔

اندھیرے میں تیزی سے سیڑھیاں عبور کرنا خطرناک کام تھا۔ تاہم میں نے جنگلے پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ میں آخری سیڑھی پر تھا جب میرے عقب میں سڑھیوں پر دھڑ دھڑ کی آوازیں آنا شروع ہوئیں اور پھر ایک فائر ہوا۔ دھماکہ گو میرے کان کے قریب ہی ہوا تھا تاہم گولی سے میں بچ گیا تھا میں تیزی سے اس راستے کی طرف بھاگا جس سے اس دام عذاب میں داخل ہوا تھا۔

"چھوڑوں گا نہیں سالے کو..... میں نے اب کافی فاصلے پر دیو زاد کی گونج سنی۔ دروازے سے نکل کر میں ناک کی سیدھ میں بھاگتا چلا گیا۔ پیچھے کچی زمین پر ان کے قدموں

کی دھپ دھپ سنائی دے رہی تھی۔ دوسری زیر تعمیر عمارت کے گرد چکر کاٹنے کے بعد میں یک لخت کھلے میدان میں پہنچ گیا۔ جہاں ملگجی روشنی تھی۔ میدان میں بھاگنے کی صورت میں مجھے بڑی آسانی سے گولی ماری جا سکتی تھی۔ چنانچہ میں بائیں طرف مڑ گیا اور عمارت کی عقبی دیوار کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگا۔ قدموں کی آوازیں میرے تعاقب میں تھیں۔ تاہم دیو زاد نے دوسرا فائر نہیں کیا تھا۔ میں اپنی تمام تر شکستہ حالی کے باوجود حتی الامکان تیزی سے بھاگ رہا تھا۔

دفعتہ" کچی زمین ختم ہو گئی اور میں سڑک پر آپہنچا سڑک تیزی سے عبور کر کے میں ایک گلی میں گھس گیا۔ گلی کافی طویل تھی اور اس میں روشنی بھی تھی۔ قدموں کی آوازیں گو کہ کافی پیچھے رہ گئی تھیں لیکن وہ لوگ میرا پیچھا چھوڑنے پر تیار نظر نہیں آتے تھے۔ دائیں بائیں مجھے کوئی جائے پناہ نظر نہیں آ رہی تھی اور اگر میرے گلی عبور کرنے سے پیشتر وہ پچھلے موڑ پر پہنچتے تو آسانی سے میرا نشانہ لے سکتے تھے۔

بھاگتے بھاگتے اچانک میری نظر الیکٹرک پول کے عین قریب پتھریلی سڑک کے وسط میں موجود مین ہول کے ڈھکن پر پڑی۔ زنگ آلود اور گرد سے اٹا ہوا آہنی ڈھکن سڑک کے سینے پر پیوند کی طرح چمک رہا تھا میں نے جھک کر ڈھکن کے ہک میں انگلیاں پھنسائیں اور اسے اوپر کو کھینچا جو کناروں پر آئی ہوئی مٹی میں خاصی سختی سے پیوست تھا لیکن میرے مجنونانہ جھٹکے پر بہرحال نکل آیا۔

میں نے مین ہول میں جھانک کر دیکھا میری توقع کے مطابق ایک کونے میں اوپر سے لے کر نیچے تک لوہے کی سلاخیں پیوست تھیں جو سیڑھیوں کا کام دیتی تھیں۔ میں نے ڈھکن ایک طرف کھسکا کر رکھا اور اندر لٹک کر ان سلاخوں پر پیر رکھتا نیچے اتر گیا۔ سر بھی سطح زمین کے نیچے آجانے کے بعد میں نے ایک ہاتھ سے ڈھکن کھسکا کر دوبارہ مین ہول کے دہانے پر رکھا لیا اس عمل میں مجھے بہت کم وقت لگا تھا لیکن اگر اس دوران وہ لوگ گلی کے موڑ پر پہنچ چکے تھے اور انہوں نے مجھے مین ہول میں اترتے دیکھ لیا تھا تو پھر یہی غلیظ کنواں میری قبر بننے والا تھا۔ غیر ارادی طور پر میں کچھ اور سیڑھیاں نیچے اتر گیا بھل بھل بہتا متعفن پانی اب میرے پیروں سے "غالبا" چند انچ ہی نیچے رہ گیا تھا۔ سیلن، گھٹن اور سڑیند سے سانس لینی دو بھر ہو رہی تھی۔ چنانچہ میں نے سانس روک لی تھی۔

یوگا کی مشقوں سے استفادہ کرنے کا یہ بہترین موقع تھا ایک بار میرا ہاتھ مین ہول کی دیوار سے مس ہو گیا۔ میری انگلیوں نے ایک ایسی کائی کا لمس محسوس کیا جس کے تصور ہی سے مجھے الٹی سی آنے لگی تھی اگر میں نے سانس نہ روکی ہوتی تو یقینی طور پر قے آجاتی۔

میں ایک ہاتھ سے سلاخ تھامے اور نیچے ایک سلاخ پر دونوں پاؤں جمائے ساکت کھڑا تھا۔ چند سیکنڈ بعد میں نے قدموں کی دھپ دھپ سنی۔ یہ آوازیں تیزی سے قریب

آگئیں اور میری دھڑکنیں تیز تر ہوتی گئیں۔ اس وقت میں نے اپنے سینے میں مقید سانس کو دھیرے دھیرے آزاد کیا۔ جب دھپ دھپ کی یہ آوازیں مین ہول کی ڈھکن پر گونجنے کے بعد آگے بڑھتی چلی گئیں۔ کچھ دیر بعد یہ آوازیں معدوم ہو گئیں لیکن میں نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ میرا خیال تھا کہ میری تلاش میں ناکام ہونے کے بعد غالبا" وہ اسی راستے سے واپس آئیں گے۔ اس وقت تک کے لئے میرا اس کمین گاہ کو چھوڑنا مناسب نہیں تھا۔ میں نے ایک بار پھر سانس روکی اور انتظار کرنے لگا۔

عین اس لمحے مجھے ایک تکلیف دہ احساس ہوا۔ میرے زخمی بازو پر بندھی ہوئی پٹی میں اب خون کو مزید جذب کرنے کی گنجائش نہیں تھی اور خون کی بوندیں اب غلیظ پانی میں ٹپک رہی تھیں۔

"خدایا۔ کیا اس زخم کے راستے میں میرے جسم کا تمام خون بہہ جائے گا؟" میں نے ڈوبتے دل سے سوچا۔ گو کہ مجھے خون کے ٹپکنے کا صرف احساس تھا اور میں اسے دیکھ نہیں پا رہا تھا پھر بھی میں نے یوں آنکھیں بھینچ لیں گویا اس طرح یہ تکلیف دہ احساس گھٹ جائے گا۔

کچھ دیر بعد میں نے چیں چیں کی ایک مکروہ سی آواز سن کر آنکھیں کھولیں۔ میرے پیروں کے قریب ہی دو گول گول نقطے سے چمک رہے تھے۔ چیں چیں کی مکروہ آواز دوبارہ مین ہول میں گونجی اور تب مجھے احساس ہوا کہ وہ ایک چوہا تھا اور غالبا" خون کی بو پا کر کہیں سے آن پہنچا تھا۔ دنیا میں مجھے سب سے زیادہ کراہت چوہے سے آتی تھی اور پھر غلیظ گٹر کا چوہا۔ میرا دل متلانے لگا۔ اس سے پہلے کہ میں اسے ٹھوکر رسید کرتا وہ میری پتلون پر چڑھ آیا۔ میں نے ٹانگ کو جھٹکا دیا مگر وہ بری طرح چمٹ چکا تھا۔ میری ٹانگ ساکت ہوتے ہی وہ کچھ اور اوپر چڑھ آیا۔ مجھے اپنی ٹانگ پر اس کا باقاعدہ وزن محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی جسامت بلی سے شاید کچھ ہی کم تھی۔

میں اسے ہاتھ لگانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن اس وقت نہ جانے کس طرح میں نے زخمی بازو والے ہاتھ سے اسے ہٹا پھینکنے کی کوشش کی غلاظت میں لتھڑی ہوئی لجلجی اور بالوں بھری کھال کے لمس سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ چوہا ٹانگ پر سے تو ہٹ گیا لیکن پٹی میں لپٹے ہوئے بازو سے چمٹ گیا۔ میں نے زخمی بازو کو دیوانہ وار جھٹکے دیئے اور ہر جھٹکے پر میرے حلق سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی لیکن چوہا گویا پٹیوں کے ساتھ ہی لپٹ گیا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے میں نے سلاخ پکڑ رکھی تھی۔ اسے چھوڑنے پر میں سیدھا نیچے غلاظتوں کے دھارے میں گر جاتا۔

یک لخت اس متعفن کنوئیں میں میرا دم گھٹنے لگا اور آنکھیں گویا بینائی کھونے لگیں میرا سر بری طرح گھوم رہا تھا۔ میں نے مین ہول کی محبوس ہوا میں پے در پے لمبی لمبی

سانسیں لی تھیں۔ پھر چوہے کے دانت سوئیوں کی طرح میرے زخمی بازو میں اترتے چلے گئے۔ اب میں اپنی چیخ کو نہ روک سکا۔ معلوم نہیں میری آواز باہر تک گئی تھی یا اسی چاہ عذاب میں گھٹ کر رہ گئی تھی۔ بہرحال اب مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ چوہے کے دانت مشین کی سی تیزی سے میرے زخمی بازو کو چھید رہے تھے مجھے محسوس ہوا کہ اگر میں مزید ایک لحہ بھی مین ہول میں رہا تو بے ہوش ہو کر گر پڑوں گا۔

میں اندھا دھند سیڑھیاں چڑھنے لگا میرے خون کے پیاسے گلی میں واپس آئے تھے یا نہیں مجھے اب اس کی بھی کوئی پروا نہیں تھی۔ میرے ہوش و حواس مختل ہو چکے تھے۔ میرا سر مین ہول کے ڈھکن سے ٹکرایا اور میں نے مزید ایک سیڑھی چڑھ کر سر ہی سے اسے اوپر کو الٹ دیا اور اس سانپ کی طرح تیزی سے باہر نکل آیا جس کے بل میں آگ بھر گئی ہو۔ تازہ ہوا میرے نتھنوں سے ٹکرائی لیکن میرے حواس کو سنبھالا نہ دے سکی۔

میں پاگلوں کی طرح گلی میں ادھر ادھر بھاگنے لگا۔ نہ جانے کتنی دیر میں یونہی چکراتا رہا۔ پھر مجھے ایک دیوار نظر آئی اور میں نے اپنے بازو کو اس پر دے مارا۔ ایک بار دوبار تین بار ہر ضرب پر چوہا دیوار کے ساتھ کچلا گیا۔ آخر کار اس کے دانت میرے گوشت کی تہوں سے نکل آئے اور وہ پٹ سے زمین پر آگرا اور ساکت ہو گیا لیکن اس کی لمبی سی مکروہ دم اب بھی جھٹکے لے رہی تھی۔

دھندلائی ہوئی نظروں سے میں نے دیکھا چوہا واقعی جسامت میں کسی اوسط درجے کی بلی سے کم نہیں تھا اور وہ پورا کا پورا سیاہ تھا صرف اس کی تھوتھنی کا کچھ حصہ سرخی مائل بھورا تھا۔

میرا زخمی بازو اب بے جان انداز میں میرے پہلو میں جھول رہا تھا۔ لیکن مجھے یہی محسوس ہو رہا تھا جیسے اسے کاٹ کر میرے جسم سے علیحدہ کر لیا گیا ہے۔ میں چند لمحے دیوار کے سہارے سنبھلنے کی کوشش کرتا رہا پھر تیورا کر گرا اور لامتناہی اندھیرے نے مجھے آغوش میں لے لیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو سب سے پہلا احساس مجھے یہی ہوا کہ مجھے قبر میں اتارا جا چکا ہے۔ وہ جگہ اتنی ہی تنگ اور سیلن زدہ تھی۔ پھر مجھے اپنا خیال بدلنا پڑا۔ میں ایک جھلنگا سی چارپائی پر لیٹا ہوا تھا اور میری آنکھوں کے عین اوپر چھت میں ایک چھوٹا سا بلب نصب تھا۔ جس کی زرد سی روشنی یوں تو نہ ہونے کے برابر تھی لیکن اس وقت میری آنکھوں میں چبھ رہی تھی۔ قبر میں چارپائی اور بلب نہیں ہو سکتا تھا۔ تو پھر میں کہاں تھا؟ میں نے سو اور اسی دوران میں کھسر پھسر کی آواز سنی۔ ذرا سی گردن موڑ کر میں نے آواز کی سمت نظر دوڑائی۔ سفید بنیان اور چار خانے کی دھوتی پہنے ایک دبلا اور سانولا سا نوجوان گھریلو عورتوں کے سے سلیقے کے ساتھ اینٹوں کے فرش پر جھاڑو دے رہا تھا اور بڑی محنت

اینٹوں کی درمیانی ریخوں سے بھی مٹی نکال رہا تھا۔

مجھے ہوش میں آتے دیکھ کر وہ جھاڑو رکھ کر میری طرف لپکا اور قریب آکر گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر جھکتے ہوئے بولا۔ "کیوں شہزادے اب کیسی طبیعت ہے؟"

"میں کہاں ہوں؟" میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے پوچھا۔

"عاشق علی عرف طبلہ کے گھر میں۔" اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کچھ اور جھکتے ہوئے کہا۔

"طبلہ؟" میں نے حیرت سے دہرایا۔

"یہ میرا فلمی نام ہے" اس نے انتہائی سادگی سے جواب دیا۔ اس کے بالائی ہونٹ پر اتنی مختصر مونچھیں تھیں کہ پہلی نظر میں گمان گزرتا تھا کہ شاید دو مکھیاں بیٹھی ہیں۔

"تو تم فلمی ہیرو ہو؟" میرے منہ سے اچانک نکلا۔ درحقیقت میں پوچھنا چاہتا تھا کہ کیا وہ فلموں میں کام کرتا ہے۔

"ہیرو؟" اس نے بیٹھی بیٹھی سی آواز میں اتنا طویل قہقہہ لگایا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ یہ قہقہہ نہیں شاید اپنے حال پر خود ہی رو دینے والے کسی انسان کی طویل چیخ تھی۔

"ہیرو کھولیوں میں رہتے ہیں کیا؟" اس کے سینے کی گہرائی سے زخمی سی آواز نکلی۔ وہ تو جوہو' ماہم اور باندرہ پر رہتے ہیں۔ میں تو ایکسٹرا ہوں' ایکسٹرا! دنیا میں بھی ایکسٹرا اور فلموں میں بھی ایکسٹرا۔ یعنی اگر میں نہ بھی ہوتا تب بھی دونوں کا کام چلتا رہتا۔ کبھی کبھار کسی فلم میں کام مل جاتا ہے تو بیس تیس روپے دہاڑی مل جاتی ہے۔ جب میں نے تمہیں گلی میں بے ہوش پڑے دیکھا تو اپنی رحم دلی کی عادت سے مجبور ہو کر تقریباً" گھسیٹتا ہوا اپنی کھولی میں لے آیا۔ حالانکہ یہ بمبئی ایسا شہر ہے کہ اگر راستے میں کسی کو لاش بھی پڑی نظر آجائے تو وہ اسے پھلانگ کر اور زیادہ تیزی سے گھر کی طرف چل دیتا ہے۔

وہ میرے قریب ہی فرش پر چوکڑی مار کر بیٹھ گیا۔ "لیکن یہ جو اپنا دل ہے نا سالا!" اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "یہ موم کا بنا ہوا ہے۔ میں جب تم کو یہاں لایا تو تمہارے بازو سے اتنا خون بہہ رہا تھا جتنا سرکاری نل سے پانی بھی نہیں آتا۔ میں دوڑا دوڑا ڈاکٹر تنکا کے گھر گیا۔ اب تم شاید اس نام پر بھی حیران ہو گے۔ نام تو اصل میں اس کا ڈاکٹر ایشور ناتھ ہے لیکن وہ دبلا اتنا ہے کہ ہم سب کھولیوں والے اسے اتفاق رائے سے ڈاکٹر تنکا کہتے ہیں۔ لیکن بھائی.... ہے بڑا کمال آدمی۔ اس نے تمہارے زخموں پر صرف ایک سرخ سی دوا لگائی۔ پھر ایک پاؤڈر بھر دیا اور خون یوں رک گیا جیسے روتے ہوئے بچے کو مٹھائی ملنے پر اس کے آنسو رک جاتے ہیں۔"

میں نے اپنے بازو پر نظر ڈالی۔ اس پر اب کوئی پٹی وغیرہ نہیں تھی۔ بس سرخ سرخ

لکیروں کے درمیان سفید پاؤڈر بھرا ہوا تھا اور وہ بالکل خشک تھا۔ بازو میں اب کوئی تکلیف بھی نہیں تھی۔

نوجوان باتونی معلوم ہوتا تھا۔ اپنی دھن میں مگن کہہ رہا تھا۔ "باکمال ہونے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر تنکا میری طرح رحم دل بھی خاصا ہے اب یہی دیکھ لو کہ رات کے وقت گھر سے آنے کی فیس تیس روپے سے کم نہیں لیکن میرے پاس کل انتیس روپے تھے وہی صبر شکر کر کے لے گیا۔ ایک روپیا معاف کر گیا۔" اس نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ کر ایک گہری سانس لی۔ تو یہ تھی بھائی کل کی کہانی اب تم ہوش میں آگئے ہو۔ یقیناً" بھوکے بھی ہو گے اور کچھ کھانے کو بھی مانگو گے۔ تو اس سلسلے میں عرض یہ ہے وہی انتیس روپے اپنی کل پونجی تھی۔ گھر میں کھانے پکانے کا سلسلہ نہیں ہے اور ہوٹل والا ملباری ادھار نہیں کرتا۔ کم از کم مجھ سے تو نہیں کرتا۔"

"کیا اتنی رات گئے ہوٹل کھلا ہو گا؟" میں نے پوچھا۔ کھانے کا نام سن کر اچانک میرے معدے میں ایک بار پھر ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔

"رات گئے؟" طبلہ ایک بار پھر خود استہزائی کے انداز میں ہنسا۔ "بھائی یہ دوپہر کا وقت ہے۔ کھولی میں جلتے ہوئے بلب پر نہ جاؤ۔ یہ غریب آدمی کا گھر ہے۔ یہاں سے روشنی کا گزر کم ہی ہوتا ہے۔

نقاہت کے سے عالم میں میں نے ذرا پہلو بدلا اور جیبیں ٹٹول کر پتلون کی جیب سے بٹوا نکال کر فرش پر پھینکتے ہوئے کہا۔ "اس میں کچھ پیسے ہیں بھائی طبلہ جتنی جلدی ممکن ہو اپنے اور میرے لئے اچھے سے اچھے کھانے کا انتظام کرو۔"

"یعنی ..... گویا... تمہاری طرف سے اجازت ہے؟" اس نے جھجکتے ہوئے پرس اٹھایا۔

"کیسی باتیں کر رہے ہو یار! تم نے مجھ پر اتنا بڑا احسان کیا ہے کہ اب اگر تم مجھے اٹھا کر بیچ بھی آؤ تو مجھے کوئی شکوہ نہیں ہو گا۔" میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"جیو یار!" اس نے باقاعدہ ہاتھ اٹھا کر نعرہ لگایا۔ "تم بھی اپنی طرح کھلے دل کے آدمی ہو۔" اس نے بٹوا کھول کر اس میں سے پچاس کا ایک نوٹ نکالا اور اٹھ کر اس دروازے سے باہر چلا گیا جو پہلی نظر میں محض روشن دان معلوم ہوتا تھا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے لیٹے لیٹے گردو پیش پر نظر دوڑائی۔ کھردری اور بغیر پلاستر کے سیلن زدہ دیواروں والی یہ کوٹھڑی بس اتنی ہی بڑی تھی کہ دو پلنگ اس میں سما سکیں۔ فرنیچر کے طور پر اس میں صرف یہی جھلنگا سی چارپائی تھی جس پر میں لیٹا ہوا تھا۔ پرلی دیوار کے ساتھ چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ ایک کونے میں صراحی اور اس پر المونیم کا گلاس اوندھا رکھا ہوا تھا۔ ایک طرف سیمنٹ کا دو انگل اونچا چبوترا تھا جس پر بالٹی اور لوٹا رکھا

تھا۔ یہ غالباً" نہانے کی جگہ تھی۔ ایک طرف دیوار پر فلموں کے دو تین پوسٹر لگے ہوئے تھے اور ان کے قریب ہی کیلوں پر چند کپڑے لٹکے ہوئے تھے۔ فرش پر چٹائی کے قریب ٹین کا ایک سیاہ ٹرنک رکھا تھا۔ جس پر ایک میلی رضائی نہایت سلیقے سے تہہ کر کے رکھی گئی تھی۔

چند منٹ بعد ہی طبلہ بڑی شان سے ایک ہاتھ سے دھوتی کی لڑ سنبھالے کھولی میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے پیچھے گیارہ بارہ سال کا ایک مفلوک الحال لڑکا دونوں ہاتھوں پر کھانے کی ٹرے اٹھائے آرہا تھا۔ ٹرے فرش پر رکھوانے کے بعد طبلہ نے اسے حکم دیا۔ "دس منٹ بعد کڑک چائے کے دو گلاس بھی لے آنا۔" لڑکا اثبات میں سر ہلا کر ایک اچٹتی سی نظر مجھ پر ڈال کر باہر چلا گیا۔

میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو بے پناہ نقاہت محسوس ہوئی۔ طبلہ نے سہارا دے کر مجھے چارپائی سے اتارا اور ہم چٹائی پر بیٹھ کر کھانا کھانے لگے۔ پہلے دو ایک لقمے تو گویا حلق کو چیرتے ہوئے معدے میں اترے۔ اس کے بعد میں مر بھکوں کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ یہ میری زندگی کا لذیذ ترین کھانا تھا اور کھانے کے بعد صراحی کے ٹھنڈے پانی اور گرم گرم کڑک چائے نے گویا حواس کی بند آنکھیں کھول دیں۔ ساری کلفت اور نقاہت دور ہو گئی۔ اب جو تھوڑی بہت کمزوری باقی تھی وہ غالباً" خون ضائع ہو جانے کی وجہ سے تھی۔

"واہ مولا! رزق دینے والا بے شک تو ہی ہے۔" طبلہ نے چائے کا گلاس ایک طرف رکھ کر دونوں ہاتھ دعائیہ انداز میں اٹھا کر بڑے صوفیانہ لہجے میں کہا اور دیوار سے ٹیک لگالی۔ میری رگ و پے میں بھی چند لمحے کے لئے بجلی سی دوڑی تھی لیکن اب عجیب سا خمار طاری ہو رہا تھا۔ شاید یہ گندم کا خمار تھا۔ میں نے بھی دیوار سے ٹیک لگالی۔

"اب کیا پروگرام ہے بھائی؟" طبلہ نے نیم وا آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "میں تو اسٹوڈیو جانے کی سوچ رہا تھا۔ ایکسٹرا سپلائر نے بلایا تھا۔ شاید کوئی کام نکل آئے۔ شوٹنگ تو کئی فلموں کی چل رہی ہے۔"

"ٹھیک ہے تم ہو آؤ۔" میں نے کہا۔ "میں اتنی دیر آرام کر لوں گا۔ اگر تم اجازت دو گے تو چند دن میرا قیام یہیں رہے گا۔

"اس کے لئے اجازت کی نہیں پیسوں کی ضرورت پڑے گی میرے بھائی اگر میری دہاڑی لگتی رہی تب تو فکر کی کوئی بات نہیں۔ ویسے زیادہ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ابھی تک تو مولا کا کرم رہا ہے کہ کبھی فاقے کی نوبت نہیں آئی لیکن اگر آجائے تو حوصلہ مت ہارنا۔" اس نے اٹھ کر کھونٹی پر لٹکے ہوئے کپڑوں میں ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"فاقے کی نوبت نہیں آئے گی۔" میں نے وثوق سے کہا۔ "چند دن کے گزارے کے تو میرے پاس پیسے موجود ہیں اور اگر زیادہ ہی کوئی مسئلہ ہوا تو میرے پاس یہ بھی ہے۔"

میں نے گلے میں پڑی ہوئی سونے کی زنجیر اسے دکھائی جو ڈھائی تین تولے سے کم نہیں
تھی۔
"بس پھر تو فکر کی کوئی بات نہیں۔ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے یوں کنگلے
دو۔" وہ اپنی انگلی سے پتلون پہنتے ہوئے گنگنایا پھر سنجیدہ ہو کر بولا۔ "ایک دوسرے کی
داستان غم پھر کبھی فرصت میں بیٹھ کر سنیں سنائیں گے۔ اب میں چلتا ہوں۔ تم بے فکر ہو
کر لمبی تان کر سو جاؤ' اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو دروازے سے نکل بائیں ہاتھ پر
سیڑھیاں چڑھ کر سامنے ہی گلی میں ملباری کے ہوٹل چلے جانا۔ پیسے ملباری کے منہ پر مارنا
اور وہ تمہاری مطلوبہ چیز فوراً" باہر والے کے ہاتھ بھیج دے گا۔ پیسوں کے ذکر پر یاد آیا'
ذرا بس کے کرائے وغیرہ کے لئے پانچ روپے تو عنایت فرماؤ۔"
بٹوا' چٹائی کے قریب ہی پڑا تھا۔ میں نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "غیر
دوستانہ قسم کی باتیں کیوں کرتے ہو یار! جتنے پیسوں کی ضرورت ہو اس میں سے نکال لو۔"
وہ اٹنگی سی پتلون پر ایک شکن آلود قمیض پہن چکا تھا اور دیوار پر لٹکے آئینے کے
سامنے کھڑا تیل میں چپڑے ہوئے بالوں کو بڑے سلیقے سے پیشانی پر جما رہا تھا۔ میں اس کی
طرف دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اس کے جانے کے بعد اطمینان سے لیٹ کر اس ڈائری کا
مطالعہ کروں گا جو ممی نے مجھے دی تھی اور جس میں بقول ان کے میری زندگی کے تمام اہم
ترین سوالوں کے جواب موجود تھی اور تب اچانک جیسے میرے ذہن میں دھماکا سا ہوا۔
ڈائری تو بلیزر کی جیب میں تھی اور بلیزر اس وقت میرے آس پاس کہیں موجود نہیں تھا۔
مجھے یاد آیا کہ بلیزر تو میں عجلت میں اس لڑکی شوبھا کے کمرے ہی میں چھوڑ آیا تھا جو مجھے
گاہک بنا کر ساتھ لے گئی تھی۔
طبلہ اس وقت میرے پرس میں پانچ کا نوٹ ڈھونڈ رہا تھا۔ میں نے گھبرائے ہوئے
انداز میں اسے بازو سے جا پکڑا۔ وہ خوف سے اچھل پڑا۔ "کیا بات ہے؟ تمہارا ارادہ بدل
گیا ہے کیا؟" اس نے پوچھا۔
"طبلہ ! اس علاقے کا نام کیا ہے؟" میں نے اس کے سوال پر دھیان دیئے بغیر کہا۔
"آدرش نگر۔ اس نے گہری سانس لے کر کہا۔ "لیکن نام سے کسی غلط فہمی میں
مبتلا نہ ہونا۔ یہاں زیادہ تر وہی لوگ رہتے ہیں جن کا ایک بھی آدرش پورا نہیں ہوا۔ اب
مجھ ہی کو لے لو....."
"لیکسن اسٹریٹ؟" اس نے ذہن پر زور دیا پھر چٹکی بجاتے ہوئے بولا۔ "ہاں ..... یاد
آگیا۔ کافی دور ہے یہاں سے ..... کیوں بات کیا ہے؟"
"وہ بات دراصل یہ ہے طبلہ! کہ میں وہاں ایک لڑکی کے گھر اپنا کوٹ بھول آیا
ہوں۔ کوٹ میں کچھ ضروری کاغذات ہیں۔" میں نے مضطربانہ لہجے میں کہا۔ "تم ذرا میرے

ساتھ چلو۔ ٹیکسی میں چلتے ہیں..... دراصل میں یہاں اجنبی ہوں۔"
"اوہ!" اس نے گویا اطمینان کی سانس لی۔ "شکر ہے تم تو کوٹ ہی بھول آئے ہو۔
ہمارے ایک ڈائریکٹر صاحب ہیں۔ وہ کسی لڑکی کے ہاں جاتے ہیں تو بنیان ہی بھول آتے
ہیں۔ ویسے استاد! داستان تمہاری بھی کچھ پر پیچ ہی معلوم ہوتی ہے لیکسن اسٹریٹ پر لڑکی
کے ہاں کوٹ بھول آنا..... اور پھر فیکٹری ایریا میں ایک گلی میں زخمی حالت میں پڑے پائے
جانا..... ہوں....." وہ خود کلامی کے سے لہجے میں بولا پھر قدرے چونک کر پوچھنے لگا۔ "لڑکی
کے بھائی آپہنچے تھے کیا؟"
"نہیں ..... نہیں....." میں نے جلدی سے کہا۔ "وہ ایسی ہی تھی..... پیشہ ور قسم کی۔
میرے زخمی ہونے کا چکر دوسرا تھا۔ اب وقت ضائع نہ کرو۔ میرے ساتھ چلو۔"
"چلو بھائی!" اس نے ٹھنڈی سانس لے کر ایک بار پھر آئینے میں اپنا جائزہ لیا اور
دروازے کی طرف بڑھا دفعتہ" مجھے اپنی قمیض کا خیال آیا جس کی آستین کندھے تک خون
میں لتھڑ کر خشک ہو چکی تھی۔
"یار طبلہ! تمہارے پاس کوئی دوسری قمیض نہیں ہو گی؟" میں نے پوچھا۔
"قمیض؟" اس نے ناقدانہ نظر سے میرا سرتا پا جائزہ لیا۔ "قمیض تو ہو گی لیکن
سوال یہ ہے کہ کیا میری قمیض تمہیں آجائے گی؟ یہ ہرن کی کھال گھوڑے پر منڈھنے والی
بات ہے..... لیکن ٹھہرو..... میں نے پانچ چھ سال پہلے کی ایک قمیض بطور ثبوت سنبھال کر
رکھی ہوئی ہے۔ اسے اچانک یاد آیا۔
"کس بات کے ثبوت پر؟" میں نے غیر ارادی طور پر پوچھا۔ "کہ کبھی میں بھی
صحت مند تھا۔" اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا اور صندوق کی طرف بڑھ گیا۔ رضائی ہٹا
کر اس نے صندوق کھولا اور ڈھونڈ ڈھانڈ کر اس میں سے ایک پرانی اور مسلی ہوئی سی زرد
قمیض نکالی۔ یقین نہیں آتا تھا کہ یہ قمیض طبلہ ہی کی رہی ہو گی۔ یہ مجھے کچھ ڈھیلی ہی
رہی۔

قمیض پتلون میں اڑسنے کے بعد میں نے ادھر ادھر دیکھا اور جھجکتے ہوئے پوچھا۔
"تمہارے پاس یقیناً" کوئی ٹوپی اور سیاہ شیشوں والی عینک بھی ہو گی؟"
"بات کیا ہے یار؟" اس نے شک آلود سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "پولیس
سے بھاگے ہوئے تو نہیں ہو؟"
"ایسی کوئی بات نہیں یار!" میں نے اس کا کندھا تھپکا۔ "بس وہ ذرا ایک لڑکی کے
معاملے میں کچھ ٹٹ پونجیے میرے دشمن بنے ہوئے ہیں۔ اب ان سے سامنا ہونے کا کوئی
امکان تو نہیں لیکن میں فی الحال احتیاط ہی سے کام لینا چاہتا ہوں۔ بازو زخمی ہے اس لئے
لڑائی بھڑائی سے پرہیز ہی رکھوں تو بہتر ہے۔"

"ایک رات کی دوستی میں مروانہ دیتا یار!" وہ بڑبڑایا پھر قدرے بلند آواز میں بولا۔ "دونوں چیزیں ہیں تو سہی میرے پاس لیکن انہیں پہن کر اچھے بھلے کارٹون لگو گے۔"

"پروا نہیں۔ تم نکالو تو سہی۔" میں نے بیتابی سے کہا۔ وہ ایک بار پھر جا کر عمرو عیار کی زنبیل سے مشابہ اس صندوق پر جھک گیا۔ اور گویا سمندر میں غوطہ لگا کر مراد کے موتی نکال لایا۔ سیاہ مخمل کی دوپلی ٹوپی اور ایک سستا سا دھوپ کا چشمہ لگا کر میں نے دیوار پر آویزاں دھندلے سے آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ میری ہیئت یکسر بدل چکی تھی۔

"میرا خیال غلط تھا۔" طبلہ نے میرا سرتا پا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "کہ میری قمیض ٹوپی اور عینک کے ساتھ تم کارٹون لگو گے۔" وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ "بات یہ ہے بھائی!" اس نے ایک بار پھر ٹھنڈی سانس لی۔ "کہ خوبصورت لوگ ہر حال میں خوبصورت لگتے ہیں۔ آؤ چلیں۔"

کھولی سے نکل کر وہ درووازے میں تالا ڈالتے ہوئے بولا۔ "تمہاری معلومات کے لئے بتاتا چلوں کہ یہ تالا محض ہاتھی کا دانت ہے' بغیر چابی کے کھلتا ہے۔ آئندہ جب کبھی میری عدم موجودگی میں آنا پڑے تو چابی کے تردد میں نہ پڑنا' ایک ہلکا سا جھٹکا دینا اور بس کھل جا سم سم!"

میں نے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ یہ ایک بہت بڑا احاطہ سا تھا۔ جس کی چھت گنبد نما تھی اور دیوار کے ساتھ چاروں طرف اسی قسم کی کھولیاں بنی ہوئی تھیں۔ مغلوں کے زمانے میں اس طرز پر اصطبل بنائے جاتے تھے۔ بائیں ہاتھ پر دو دیواروں کے درمیان ایک تنگ سا راستہ تھا۔ اس سے گزر کر ہم چند ناپختہ سیڑھیوں تک پہنچے۔ جن کے اختتام پر بڑا سا دروازہ تھا۔ اس دروازے کی جڑوں میں اتنی مٹی جم چکی تھی کہ اب اس کے پٹ اپنی جگہ سے بال برابر بھی جنبش نہیں کر سکتے تھے۔ دروازے سے گزر کر ہم سڑک پر آ گئے۔

بڑی بارونق گلی تھی دونوں طرف اچھے بھلے اونچے اونچے پختہ مکانوں کی قطاریں تھیں جن کے نچلے حصوں میں دکانیں تھیں۔ کھولیاں زمین کی سطح سے کم از کم آٹھ نو فٹ نیچے تھیں اور ان کے اوپر بھی مکانات نہ جانے کس حساب سے بنے ہوئے تھے۔

"بارش میں تو پانی کھولیوں میں چلا جاتا ہو گا؟" میں نے طبلہ کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

"شکر ہے بمبئی میں زیادہ بارشیں نہیں ہوتیں۔ وہ بولا۔ "جب سے میں یہاں آیا ہوں تب سے ایک ہی زور دار بارش ہوئی ہے۔ شکر ہے اس روز میں چٹائی پر نہیں سویا ہوا تھا ورنہ ڈوب ہی جاتا۔ میری تو نیند بھی کمبخت ایسی ہے۔ پتہ ہی نہیں چلا کہ کب بارش ہوئی اوور کب کھولیوں میں گھٹنوں گھٹنوں پانی بھر گیا" دفعتہً وہ چونک کر بولا۔

"روک لوں؟"

"کسے؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"وہ ایک ٹیکسی آ رہی ہے۔" اس نے سادگی سے کہا اور سامنے اشارہ کیا۔

"فوراً" روکو۔" میں نے خود ہی ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ ٹیکسی ہمارے قریب آ رکی۔

"جمشید جی روڈ کی طرف چلو۔" طبلہ نے پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے ڈرائیور کو ہدایت کی۔ "آگے میں راستہ بتاؤں گا لیکسن اسٹریٹ چلنا ہے۔"

تقریباً" پچیس منٹ بعد ہم لیکسن اسٹریٹ پہنچے اور مطلوبہ عمارت کو پہچاننے کے بعد میں نے ٹیکسی رکوائی۔ "تم یہیں گاڑی میں ٹھہرو۔ میں ابھی آیا۔" میں نے طبلہ سے کہا اور چکر دار چوبی سیڑھیاں پھلانگتا اوپر پہنچا۔

مطلوبہ کمرے کے سامنے پہنچ کر میرا دل دھک سے رہ گیا۔ دروازے پر تالا لٹک رہا تھا چند لمحے تو میں گم صم کھڑا رہا' پھر میں نے اپنے آپ کو تسلی دی کہ رات کے وقت چکر لگاؤں گا۔ اس وقت شاید لڑکی اور اس کا بھائی دونوں ہی کہیں نکلے ہوئے تھے میں واپس جانے کے لئے مڑا تو احساس ہوا کہ برابر والے دروازے میں کھڑی ایک سوکھی سی عورت چبھتی نظروں سے مجھے گھور رہی تھی۔ اس کے بال تو سیاہ تھے مگر چہرے پر بڑی بوڑھیوں کی طرح جھریاں تھیں۔ اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ پوچھنے کی جرات کرتا وہ خود ہی بول پڑی۔

"شوبھا کے گاہک ہو کیا؟" اس نے کرخت اور زہریلے لہجے میں پوچھا۔

"گاہک؟" میں نے بوکھلا کر کہا۔ "نہیں..... نہیں تو ..... میں تو ایک دکان دار ہوں۔ کل سریندر میرے پاس کچھ دوائیں لینے آیا تھا تو سردی سے ٹھٹھر رہا تھا۔ میں نے ترس کھا کر اسے اپنا کوٹ دے دیا تھا۔ میں وہ کوٹ واپس لینے آیا تھا۔ اس نے تو وعدے کے مطابق صبح نہیں پہنچایا۔ کہاں گیا ہے وہ؟"

"بھاڑ میں۔" بڑھیا نے جل کر کہا۔ "صبح مالک مکان نے انہیں دھکے دے کر نکال دیا۔"

"نکال دیا؟" میں نے دہرایا اور میرا دل بیٹھ سا گیا۔



"نکالتا نہیں تو اور کیا کرتا۔" بڑھیا باقاعدہ ہاتھ نچا کر بولی۔ "اچھے بھلے سب شریف لوگ آباد ہیں اس بلڈنگ میں۔ اس اکیلی لڑکی نے گند ڈال رکھا تھا۔ ایک مچھلی سارے جل کو گندا کرتی ہے۔ یہاں بہت سے بہو بیٹیوں والے بھی رہتے ہیں۔ سب کب سے دباؤ ڈال رہے تھے مالک مکان پر۔ ایک تو شوبھا کے لچھن ہی کچھ کم نہیں تھے' اوپر سے اس کا وہ بے غیرت بھائی روز ٹھرا پی کر آجاتا تھا اور رات بھر غل غپاڑا مچا کر دن میں سوتا رہتا تھا۔ کل بھی اس نے یہاں وہ اودھم مچایا کہ خدا کی پناہ۔ آخر مالک مکان کو غیرت آہی گئی...... اور وہ بھی شاید اس لئے کہ ان پر اب تیسرے مہینے کا کرایہ بھی چڑھ گیا تھا۔"

بڑھیا کے الفاظ میرے پردہ سماعت کو چھید رہے تھے۔ اس کا اصلاح سماج کا جوش کچھ کم ہوا تو قدرے نرم پڑتے ہوئے بولی۔ "کیا بتایا تھا تم نے؟ دکاندار ہو تم؟ تمہارا کوٹ مانگ کر لایا تھا سریندر؟"

"جی ...... جی ہاں۔" میں نے تھوک نگل کر کہا۔ پیروں کے ساتھ ساتھ گویا میری زبان بھی پتھر کی ہو گئی تھی۔

"نیلا روئیں دار سا کوٹ تھا نا؟ اس کے سامنے والی جیب پر سنہرے دھاگے سے ایک چڑیا سی کڑھی ہوئی تھی؟" بڑھیا کی آنکھوں میں چمک سی لہرائی گویا وہ مجھے کوٹ کے متعلق کوئی اہم بات بتانے لگی ہو۔ کوٹ کی جیب پر کڑھے ہوئے عقاب کو اس نے چڑیا بنا دیا تھا لیکن بہرحال اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ بڑھیا نے کوٹ دیکھا تھا۔

"جی ہاں' جی ہاں۔ بالکل وہی کوٹ تھا۔" میں نے دھڑکتے دل سے کہا۔

"وہی کوٹ تو سریندر نے اس وقت پہنا ہوا تھا جب مالک مکان کے آدمیوں نے اسے دھکے دے کر نکالا۔" بڑھیا نے اطمینان سے کہا۔ "سامان کی گٹھڑی سر پر لدی ہوئی تھی اور وہ ساری بلڈنگ والوں کی لعنت ملامت سنتا وہی کوٹ پہنے یوں ڈھٹائی سے اکڑتا ہوا جا رہا تھا جیسے شاہی خلعت پہن رکھی ہو اور رعایا اس کی شان میں قصیدے پڑھ رہی ہو۔"

"کچھ اندازہ ہے وہ دونوں کہاں گئے ہوں گے؟" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"مجھے کیا پتا؟ بڑھیا نے گویا برا مان کر کہا۔ "گئے ہوں گے کسی ایسے محلے میں جہاں ان کا دھندا اچھی طرح چمک سکے۔"

"مالک مکان سے کہاں ملاقات ہو سکتی ہے؟ دراصل مجھے کوٹ کی تو اتنی پروا نہیں لیکن غلطی سے اس کی جیب میں میری ایک حساب کتاب کی ڈائری آگئی تھی۔ میں ذرا کمرہ کھلوا کر دیکھنا چاہتا تھا۔ شاید سریندر وہ ڈائری کمرے میں ہی چھوڑ گیا ہو۔" میں نے امید بھرے لہجے میں کہا۔

بڑھیا نے بڑے وثوق سے نفی میں سر ہلایا۔ "کمرے میں تو ان کا ایک تنکا بھی نہیں رہا۔ میں خود دروازے میں کھڑی دیکھ رہی تھی۔ بلڈنگ والوں ہی نے ان کا سارا سامان باندھ باندھ کر ان کے منہ پر مارا تھا۔ مجھے تو کہیں کوئی ڈائری نظر نہیں آئی تھی۔ اگر ہو گی تو کوٹ کی جیب ہی میں ہو گی۔" اس نے میری آخری امید کو بھی لفظوں کے بے رحم قدموں تلے کچل کر رکھ دیا تھا۔

میں نے ڈوبتی نظروں سے آخری بار بند کمرے کے دروازے پر مصلوب تالے کو دیکھا اور پیروں کو گھسیٹتا سیڑھیوں کی طرف چل دیا۔ لوگ بھی عجیب ہوتے ہیں۔ رات کی رات' آن کی آن میں کسی کی کائنات اجاڑ کر رکھ دیتے ہیں سب کچھ تہہ و بالا کر دیتے ہیں۔ اب میں کہاں ڈھونڈوں گا سریندر کو؟ کہاں ملے گی مجھے اس بیکراں شہر میں وہ ننھی سی ڈائری؟ اور کیسے سلجھاؤں گا میں اس الجھی ہوئی داستان کا تانا بانا جس کی کھوج نے مجھے ایک رات میں کہاں سے کہاں لا پھینکا تھا؟

نیچے آکر میں ٹیکسی میں طبلہ کے قریب کٹے ہوئے شہتیر کی طرح ڈھیر ہو گیا۔ اس نے پر تشویش نظروں سے میری طرف دیکھا اور پوچھا۔ "خیر تو ہے؟"

میں نے *مختصراً* اسے بتایا کہ جس چیز کی تلاش میں میں یہاں آیا تھا وہ کس طرح میری دسترس سے کہیں دور نکل گئی ہے۔

میں واپس اپنی گلی میں پہنچ کر ٹیکسی سے اتر گیا اور طبلہ مجھے گھر جانے کی ہدایت کر کے خود اسٹوڈیو روانہ ہو گیا۔ میں اس جگہ سے کچھ دور ہی اتر گیا تھا جو اب میرا مسکن تھی۔ راستے میں ایک جگہ فٹ پاتھ پر مجھے کچھ اخبار اور رسالے رکھے نظر آئے۔ میں نے انگریزی ہندی اور اردو کے کئی اخبارات خرید لئے اور کھولی میں آکر بے چینی سے ان کی ورق گردانی کرنے لگا۔ صرف تین اخباروں میں بازار حسن میں ہونے والی قتل کی دو وارداتوں کے بارے میں مختصر خبریں چھپی تھیں۔ پولیس کی تفتیش کے مطابق ممی کی موت تو طبعی تھی۔ البتہ ان کی رائے میں ممی کی موت کے بعد نامعلوم قاتل اور دلالوں کے درمیان کوئی جھگڑا ہوا تھا جس میں دو دلال مارے گئے تھے۔ پولیس کے خیال میں اس جھگڑے کے پیچھے در حقیقت کسی اور کا ہاتھ تھا اور مجھے انہوں نے کرائے کا قاتل قرار دیا تھا۔ خوش قسمتی سے تفتیش کے دوران میری کوئی خاص شناخت متعین نہیں ہو سکی تھی۔

وہ رقاصہ لڑکی جس سے میں نے بالا خانے پر ممی کے متعلق پوچھا تھا میرے متعلق

صرف اتنا بتا سکی تھی کہ وہ ایک وجیہہ اور دراز قد سا لڑکا تھا۔

بہرحال یہ کوئی زیادہ اطمینان بخش صورت حال نہیں تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ خبریں جب مدن کی نظر سے گزریں گی تو وہ پولیس کو میرے بارے میں ہر ممکن معلومات فراہم کرنے کی کوشش کرے گا۔ میرے لئے فی الحال روپوش رہنا ناگزیر تھا۔

دو دن بعد میرے پاس پیسے ختم ہو گئے۔ طبلہ اس دوران پچاس ساٹھ روپے کما لایا تھا لیکن میں نے اس پر بوجھ بننا مناسب نہ سمجھا اور اس کے ہاتھوں اپنی سونے کی زنجیر بازار بھجوا کر بکوا دی۔ ڈیڑھ ہزار روپے مل گئے جو کھولی کے معیار زندگی کے مطابق کم از کم ایک ماہ کے لئے ہم دونوں کو کافی تھے۔ میں نے اپنے لئے دو جوڑے کپڑے بھی خرید لئے۔

طبلہ دن چڑھے اسٹوڈیو چلا جاتا تھا اور رات گئے لوٹتا تھا۔ میرا معمول بس یہی تھا کہ اس کے جانے کے بعد میں لیٹا اخبار رسالے پڑھتا رہتا۔ ڈاکٹر تنکا سے میں بازو کی مرہم پٹی بھی کروا رہا تھا۔ دسویں دن زخم پر کھرنڈ آ گئے۔ بازو اب بالکل صحیح طور پر کام کرنے لگا تھا۔ پندرھویں دن یہ کھرنڈ بھی اتر گئے۔ اس عرصہ میں' میں نے دانستہ طور پر شیو نہیں بنائی تھی اور اب میرے چہرے پر مختصر سی داڑھی مونچھوں کا اضافہ ہو چکا تھا۔ ہیر اسٹائل بھی میں نے بدل لیا تھا۔

طبلہ اور میں اب گہرے دوست بن چکے تھے۔ وہ ایک دلچسپ آدمی تھا اور اس کی صحبت میں میرا بہت اچھا وقت گزرتا تھا۔ گوشہ نشینی میں مجھے پچیس دن گزر گئے تو دل ڈوبنے لگا۔ بیکار پڑے پڑے میری جان تختہ بن گئی تھی۔ گو کہ اب میں نے ورزشیں بھی شروع کر دی تھیں لیکن کھولی کی سیلن زدہ فضا میں رہتے رہتے اب مجھے اپنا وجود ایک چمگادڑ سے مشابہ معلوم ہونے لگا تھا۔

"اس طرح کب تک گزرے گی؟" ایک روز میں نے طبلہ سے کہا۔ "میں تو بیکار پڑے پڑے مفلوج سا ہو گیا ہوں۔"

"میرے ساتھ اسٹوڈیو چلا کرو۔" اس نے کھولی کے چبوترے پر اپنی اکلوتی ڈھنگ کی پتلون دھوتے ہوئے کہا۔ "شوٹنگ دیکھنا یوں تو کوئی خاص دلچسپی کا کام نہیں لیکن بیکار پڑے رہنے سے بہتر ہے اور پھر شاید اسٹوڈیو میں تمہیں بھی کوئی کام مل جائے۔ مجھے تو یہ ڈائریکٹر ترقی کرتے دیکھنا نہیں چاہتے ہمیشہ ایکسٹراؤں کے ہجوم میں سب سے پیچھے کھڑا کر دیتے ہیں۔ جہاں اتفاقاً" ہی میں کبھی کبھار کیمرے کی زد میں آتا ہوں۔ ایک دفعہ ایک فلم میں میرا پورے ایک منٹ کا پارٹ تھا۔ میں بڑے فخر سے اپنے دو تین دوستوں کو اپنا کام دکھانے سینما ہاؤس لے گیا۔ فلم ختم ہو گئی مگر میری شکل کہیں نظر نہ آئی بعد میں میں نے ڈائریکٹر سے جا کر پوچھا تو لاپروائی سے کہنے لگا۔ "وہ حصہ ہم نے ایڈیٹنگ میں نکال دیا تھا۔" وہ

میری زندگی کا طویل ترین پارٹ تھا۔ ویسے تو ایک اور فلم میں بھی میں نے تقریباً" ایک منٹ کا رول کیا تھا لیکن اس میں میں ڈاکوؤں کا ساتھی تھا اور میرے منہ پر نقاب تھی۔"
اس نے پتلون کو بالٹی میں پھینک کر ایک آہ بھری.... "کیا فائدہ ہے ایسی زندگی کا۔"

"یار! تجویز تو تمہاری اچھی ہے۔" میں نے چارپائی پر اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "صبح مجھے بھی ساتھ لے کر چلنا۔"

صبح تیار ہو کر اس کے ساتھ روانہ ہوتے وقت میں نے آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ چہرے پر بھوری مختصر سی داڑھی' ہلکی ہلکی مونچھوں دھوپ کے چشمے اور بدلے ہوئے ہیر اسٹائل نے کم از کم ان لوگوں کے لئے تو میری شناخت تقریباً" ناممکن بنا دی تھی جنہوں نے پہلے مجھے دیکھا تھا۔ مطمئن ہو کر میں طبلہ کے ساتھ باہر آ گیا۔

بس میں بیٹھ کر ہم ایف ایم اسٹوڈیو پہنچے۔ طبلہ نے دروازے پر موجود چوکیدار سے لے کر اندر فلور تک ہر ملنے والے شخص کو اتنے خوشامدانہ انداز میں جھک جھک کر سلام کیا کہ مجھے اس کے ساتھ چلتے ہوئے شرم محسوس ہونے لگی۔

"طبلہ! ایک بات کہوں' برا تو نہیں مناؤ گے؟" میں بولے بغیر نہ رہ سکا۔

"یار! اب ہم ایک دوسرے کی باتوں کا برا منانے کے اسٹیج سے گزر چکے ہیں۔ البتہ اگر تم نے آئندہ اتنے تکلفات کے ساتھ گفتگو کی تو میں ضرور برا مناؤں گا۔" اس نے کہا۔

"تم لوگوں کے ساتھ اتنے خوشامدانہ انداز میں پیش نہ آیا کرو۔ میرے خیال میں تمہاری ناکامی کی وجہ یہی ہے ورنہ تم ایکسٹرا کے بجائے اچھے بھلے کامیڈین بن سکتے تھے۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔ "تمہاری صلاحیتیں تو رہیں ایک طرف۔ میرے خیال میں تو تمہارے کامیڈین بننے کے لئے تمہاری مونچھیں ہی کافی ہیں۔ ہماری فلموں میں کامیڈین صرف منہ بگاڑنے اور الٹی سیدھی اچھل کود کرنے کے علاوہ کرتا ہی کیا ہے؟"

"لیکن یار! مجھے تو ایک پرانے گرگے نے بتایا تھا کہ فلمی دنیا میں کامیابی کا مختصر ترین راستہ خوشامد ہے۔" طبلہ نے سوچ میں ڈوبتے لہجے میں کہا۔

"اور تم اس (مختصر ترین) راستے پر چھ سال سے چل رہے ہو۔ کہاں تک پہنچے؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "خوشامد کسی کسی کو راس آتی ہے تم تھوڑے سے انا پرست بن کر دیکھو۔"

"میں ایک انا پرست کو بھی جانتا ہوں۔ ایک سال پہلے تک وہ ہیرو تھا۔ کل اسے سینی ٹوریم میں داخل کرانے کے لئے چندہ جمع کیا جا رہا تھا۔" طبلہ کے الفاظ تلخ مگر لہجہ بالکل سپاٹ تھا۔ کم بخت بڑی سے بڑی بات سپاٹ لہجے میں کرتا تھا۔

"بہرحال اس نے عروج تو دیکھا نا!" میں استدلال پر تلا ہوا تھا۔ "باقی رہا اس کا درد ناک انجام۔ تو شاید اس کی وجہ اس کی اپنی بے اعتدالیاں رہی ہوں۔"

"ہاں۔ یہ بات تو ہے۔" اس نے تسلیم کیا۔ "عروج کے دنوں میں وہ ہر ایک کو گندی گندی گالیاں دیتا تھا۔ دن رات شراب کے نشے اور شباب کے سمندر میں غرق رہتا تھا۔ کوئی بات مرضی کے خلاف ہو جاتی تو چلتی شوٹنگ چھوڑ کر سیٹ کو ٹھوکر مار کر چلا جاتا تھا۔"

یہ باتیں کرتے کرتے ہم ایک فلور کے دروازے پر پہنچ چکے تھے۔ طبلہ حسب عادت دروازے پر کھڑے نو عمر سے چوکیدار لڑکے کو جھک کر سلام کرنے ہی لگا تھا کہ شاید اسے میری نصیحت یاد آگئی۔ اس نے بڑے باوقار انداز میں سلام کیا اور گیٹ کھول کر اندر جانے لگا تو لڑکے نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ دیا۔ "کرشنا جی کی شوٹنگ چل رہی ہے۔" اس نے گویا خبردار کیا۔ "انہوں نے کہا تھا کہ کوئی فالتو آدمی سیٹ پر نہ آئے۔"

"ابے ہٹ۔ بڑا آیا کرشنا جی کا چچہ!" طبلہ نے اسے لتاڑا۔ میری نصیحت کچھ زیادہ ہی اثر کر گئی تھی۔ "آج تک کسی سیٹ پر کسی لونڈے لپاڑے نے طبلہ کا راستہ نہیں روکا۔ تو اپنی اوقات بھول گیا ہے یا تجھے ہمارا فلمی دنیا میں آنے کا سن یاد نہیں رہا... ایں؟" لڑکا ہکا بکا رہ گیا اور طبلہ میرا ہاتھ پکڑ کر اندر پہنچ گیا۔

یہ بہت اونچی چھت والا ایک سیٹ نما ہال تھا۔ چھت سے کافی نیچے بانسوں کی مدد سے ایک جال سا پھیلا کر گویا ایک اور چھت بنائی گئی تھی۔ جس میں بڑی بڑی فلڈ لائٹس فٹ کی جا رہی تھیں۔ فی الحال صرف ایک ہی لائٹ روشن تھی اور رات کا سا سماں تھا۔ لائٹ مین اوپر بانسوں کے جال پر چڑھے ہوئے تھے اور الیکٹریشن سوئچ بورڈ اٹھائے تاریں گھسیٹتے ادھر ادھر آجا رہے تھے۔ ایک طرف چبوترے پر بارہ دری کا سیٹ لگا ہوا تھا جس کے تخت میں ابھی کیلیں ٹھونکی جا رہی تھیں اور ہتھوڑی کی ہر ضرب کے ساتھ سنگ مرمر کی بارہ دری لرز رہی تھی کیونکہ یہ سنگ مرمر محض ہارڈ بورڈ پر سفید رنگ کر کے تیار کیا گیا تھا۔ چبوترے سے کچھ دور ایک حوض بھی بنا ہوا تھا۔ جس میں چار چھ انچ گہرائی تک گندا پانی بھرا ہوا تھا۔

حوض کے دونوں طرف نیم ٹنڈ منڈ چند درخت بھی کھڑے تھے جن کی جڑیں زمین میں پیوست نہیں تھیں بس وہ کٹے ہوئے تنوں پر ہی کھڑے تھے اور ذرا سے اشارے سے گر سکتے تھے۔ بارہ دری کے وسط میں کاغذ کا ایک فانوس جھول رہا تھا۔ بارہ دری میں فانوس میں پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا۔ ایک طرف روشنی میں لوہے کی چند کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ان میں ایک پر ایک ادھیڑ عمر آدمی سر پر سفید پی کیپ رکھے تقریباً نیم دراز تھا۔ اس کی توند غالباً اسے سیدھا بیٹھنے کی اجازت نہیں دے رہی تھی۔ چھدرے سے بالوں والا ایک نوجوان کلپ بورڈ پر لگے ہوئے کچھ کاغذوں کا پلندہ تھامے مودبانہ انداز میں جھکا اسے کچھ سنا رہا تھا۔

"یہ ڈائریکٹر کرشناجی ہیں۔" طبلہ نے اشارے سے مجھے بتایا۔ "اور وہ نوجوان کھڑا انہیں اسکرپٹ پڑھ کر سنا رہا ہے ان کا اسسٹنٹ ہے۔ کرشنا جی بڑے مشہور ڈائریکٹر ہیں۔ تم نے ان کی فلم "چاندنی رات" تو دیکھی ہی ہو گی یا کم از کم اس کا شہرہ تو ضرور سنا ہو گا۔ مشہور ہیرو بالم کو انہوں نے ہی متعارف کرایا تھا۔"

وہ میرا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھا۔ روشنی میں پہنچ کر اس نے کرشنا جی کو سلام کیا۔ کرشناجی نے گویا غنودگی سے چونک کر بھنویں اچکا کر اس کی طرف دیکھا اور سر کی خفیف سی جنبش سے جواب دے کر بھاری آواز میں پوچھا۔ "کیسے ہو بھئی طبلہ؟"

"بس آپ کی نظر کرم کا منتظر ہوں۔" طبلہ نے سعادت مندانہ انداز میں کہا اور ایک طرف کو کھڑا ہو گیا۔ میں اس سے ذرا پیچھے ہٹ کر کھڑا تھا۔

"آتے جاتے رہا کرو۔" کرشناجی نے طبلہ کو ہدایت کی۔ "شاید اگلے مہینے کی شوٹنگوں میں تمہاری ضرورت پڑے۔ شہزادی کے شکار پر نکلنے کے کچھ سین ہیں۔"

"گستاخی معاف کرشناجی!" طبلہ نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "کسی سین میں آپ مجھے کھال پہنا کر بارہ سنگھا بنانے کا ارادہ تو نہیں رکھتے' جیسا آپ نے "ادھوری وفا" میں میرے ساتھ کیا تھا؟"

"ارے نہیں بھئی!" کرشناجی کی توند میں معمولی سی ہلچل پیدا ہوئی۔ "وہ تو عین وقت پر بارہ سنگھا نہیں ملا تھا اس لئے تم سے کام چلایا تھا۔ اس مرتبہ ہم تمہیں شہزادی کا مہاوت بنائیں گے۔"

"شہزادی کا مہاوت بننے میں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں کرشناجی۔" طبلہ نے بڑی سادگی سے کہا۔ "البتہ ہاتھی پر بیٹھتے ہوئے مجھے خوف آتا ہے۔"

"بہت باتیں بنانے لگا ہے بدمعاش!" کرشناجی کی توند ایک بار پھر ہلی۔ "منجھ رہا ہے' بس اب کچھ بن ہی جائے گا۔"

"آپ نے ہی مجھے طبلہ بنایا تھا حضور! لیکن یہ طبلہ بس ایک ہی بار بج کر خاموش ہو گیا۔" طبلہ نے عاجزانہ لہجے میں کہا۔

"فکر نہ کر۔ کبھی نہ کبھی تیرے سارے شکوے دور کر دیں گے۔" کرشناجی نے کہا اور اپنے اسسٹنٹ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ "ہاں تو اگلا شاٹ کیا تھا؟"

طبلہ نے مڑ کر سرگوشی نما لہجے میں مجھے بتایا۔ "کرشناجی کی ایک فلم میں کلب کے سین میں' میں نے بڑے جھوم جھوم کر چند سیکنڈ کے لئے طبلہ بجایا تھا تب سے میرا نام طبلہ پڑ گیا ہے۔"

"شکر ہے تم نے تان پورہ نہیں بجایا تھا۔" میں نے سرگوشی میں کہا۔ "یہ نام تو تم پر بالکل نہ جچتا۔"

اس دوران سیٹ تیار کرنے والوں نے اپنا کام ختم کر لیا اور اپنے اوزار سمیٹ کر باہر چلے گئے۔ اس کے چند ہی سیکنڈ بعد عجیب و غریب حلیوں والے چھ آدمیوں کی ٹولی اندر آئی۔ ڈھیلے ڈھالے سفید لبادوں' پگڑیوں اور نقلی مونچھوں کی مدد سے غالباً" انہوں نے ڈاکوؤں کا روپ دھارنے کی کوشش کی۔ ان کی کمروں کے گرد لپٹے ہوئے کپڑے میں ٹین کی تلواریں بھی اڑسی ہوئی تھیں۔ ان میں سے سب سے آگے پکی سی رنگت والا ایک نوجوان گیٹ اپ میں نہیں تھا۔ اس کا قد درمیانہ تھا لیکن جسم خاصا گٹھا ہوا تھا۔ موسم خاصا خنک تھا لیکن اس نے آدھی آستینوں کی' نائیلون کی چست شرٹ پہن رکھی تھی۔ غالباً" اپنے بازوؤں کی ابھری ہوئی مچھلیاں دکھانے کے لئے۔ اس کی آنکھ کے قریب زخم کا ایک لمبا سا نشان تھا اور نچلا ہونٹ نسبتاً کچھ زیادہ ہی موٹا تھا۔

"یہ فائٹ انسٹرکٹر غازی شاہ ہے۔" طبلہ نے سرگوشی میں مجھے بتایا۔

مریل اور مجہول سے "ڈاکو" کرشنا جی کو دور ہی سے سلام کر کے ایک نیم تاریک گوشے میں کھڑے ہو گئے اور غازی شاہ کرشناجی کے قریب آکر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"تم نے کل فائٹ کی اچھی طرح ریہرسل کر لی تھی نا؟" کرشناجی نے پوچھا۔

"ہاں جی۔ میں نے ان کی تسلی کرا دی تھی۔" غازی شاہ نے کرشنا کے اسسٹنٹ کی طرف اشارہ کیا۔ "مولا کے کرم سے پہلے ہی شاٹ میں اوکے ہو گا سین ..... بشرطیکہ میڈم روپا اپنے ڈایلاک نہ بھول گئیں۔" اس نے بڑی ادا سے اپنی سگریٹ کا گل جھاڑا۔

"روپا کے ڈایلاگ ہیں ہی کون سے۔" کرشناجی نے جیب سے ایک عینک نکال کر ناک پر جماتے ہوئے کہا۔ "ہائے اللہ اوئی اللہ ہی تو کرنا ہے اس نے۔"

"پھر ٹھیک ہے۔ اس قسم کی آوازیں نکالنے میں تو میڈم بڑی ماہر ہیں۔" غازی شاہ شاطرانہ انداز میں مسکرایا۔

میں چپ چاپ ایک طرف کھڑا مصنوعی دنیا کی یہ تیکھی طرار باتیں سن رہا تھا۔ دفعتہ بانس کے جال پر چڑھے ہوئے ایک لائٹ مین نے ہانک لگائی۔ "ٹیسٹنگ..... لائٹس آن۔"

بانسوں پر لٹکی ہوئی فلڈ لائٹس روشن ہو گئیں اور بارہ دری کا سیٹ' تالاب اور درخت تیز روشنی میں جگمگا اٹھے۔ لائٹ مین نے ایک دو لائٹوں کا زاویہ درست کیا پھر اوپر سے ہانک لگائی۔ "ٹھیک ہے کرشناجی؟"

کرشناجی نے ناقدانہ نظروں سے سیٹ کا جائزہ لیا پھر آواز دے کر کسی سے پوچھا۔ "ٹھیک ہے اجیت؟"

فلور کے کسی اندھیرے گوشے سے ایک پتلا دبلا معمر آدمی برآمد ہوا اور درختوں کے قریب ٹرالی پر رکھے ہوئے کیمرے پر جھک گیا۔ "اوکے" چند لمحے بعد اس نے سر اٹھا کر

کہا۔ فلڈ لائٹس ایک بار پھر بجھ گئیں۔ صرف ایک لائٹ آن رہی۔

"چلو بھئی..... شروع کرو۔ روپا کو بلواؤ ..... اور وہ ایکسٹرا لڑکیاں کہاں ہیں؟" کرشناجی با آواز بلند اپنے اسسٹنٹ سے مخاطب ہوئے۔ فلور پر یک لخت ہل چل سی مچ گئی۔ بھاگ دوڑ سی شروع ہو گئی۔ اندھیرے گوشوں سے مزید بہت سے افراد برآمد ہوئے۔ اسسٹنٹ نے کسی کو باہر دوڑایا اور ساتھ ہی کرشناجی کو بتانے لگا۔ "ایکسٹرا لڑکیاں تو کب سے تیار ہو کر کینٹین میں بیٹھی ہیں۔ میڈم روپا کا میک اپ ہو رہا ہے۔ آپ نے انہیں چٹیا گوندھنے کو کہا تھا لیکن وہ بال کھلے رکھنے پر اصرار کر رہی تھیں۔ بڑی مشکل سے میں نے انہیں سمجھایا تھا۔"

"اس جاہل عورت نے کبھی تاریخ پڑھی ہو تو اسے پتا ہو کہ شہزادیاں بال کھلے نہیں رکھتی تھیں۔" کرشنا جی نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ "کمل رائے کے ایک سیٹ پر تو میں نے دیکھا تھا کہ رومن ملکہ بنی بیٹھی تھی اور کلائی پر تازہ ترین ماڈل کی ویسٹ اینڈ گھڑی بندھی ہوئی تھی۔ اب میں کمل رائے تو نہیں ہوں نا..... کہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر دھیان نہ دوں۔ میں ان منہ زور ہیروئنوں کو اشاروں پر چلانا جانتا ہوں۔"

جوش جذبات سے کرشناجی اٹھ کھڑے ہوئے غالباً" سیٹ کا معائنہ کرنے چل دیئے۔ جلدی میں ایک درخت سے ان کا ہاتھ ٹکرا گیا اور درخت فوراً" زمین پر آرہا۔ غنیمت تھا کہ درخت زیادہ لمبا چوڑا نہیں تھا۔ ورنہ کرشناجی بھی اس کی لپیٹ میں آجاتے۔ دو لڑکے فوراً" آلپکے اور انہوں نے درخت کو اٹھا کر دوبارہ سیدھا کھڑا کر دیا۔

کرشناجی سیٹ پر پہنچے تو دس بارہ ایکسٹرا لڑکیاں بھی آپہنچیں۔ وہ حتی المقدور بنی سنوری تھیں۔ ان میں سے دو تین خوب کھلی کھلی سی تھیں۔ چار چھ مرجھائی ہوئی سی تھیں اور ایک دو تو بالکل ہی مدقوق تھیں لیکن گھٹیا قسم کے میک اپ سے ان سب کو حتی الامکان خوبصورت بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔

وہ رنگ برنگے پرانے مگر زرق برق فراکوں میں اور چوڑی دار پاجاموں میں ملبوس تھیں۔ وہ سب کرشناجی کے پاس جا کر کھڑی ہوئیں۔ کرشناجی نے مختصراً انہیں کچھ سمجھایا اور وہ بارہ دری کے چوبی فرش پر بچھے ہوئے ایک چھوٹے سے غالیچے کے گرد گھیرا ڈال کر بیٹھ گئیں۔ ان میں چند ایک آپس میں کچھ باتیں کرتے ہوئے بے ڈھنگے پن سے ہنس رہی تھیں۔ اب غالباً" صرف ہیروئن کا انتظار تھا۔ کرشناجی سیٹ سے اتر آئے اور مختلف لوگوں کو کچھ ہدایات دینے لگے۔

فلور پر غلغلہ سا برپا ہوا۔ "میڈم آرہی ہیں..... میڈم آرہی ہیں....." پھر دروازہ کھلا اور فلور پر سکوت سا چھا گیا۔

میڈم روپا روشنی کی حدود میں آئیں تو میں نے اسے دیکھا۔ وہ ایک دراز قد عورت

تھی۔ اس کے حسن میں صباحت بھی تھی اور ملاحت بھی شیرینی اور نمکینی کا امتزاج۔ غالباً یہ بنگالی خون کی آمیزش کا نتیجہ تھا۔ موٹی موٹی سیاہ آنکھیں جن میں اگر کاجل نہ لگایا ہوتا تب بھی وہ شاید ایسی ہی نظر آتیں۔ بھرے بھرے ہونٹ سانولی اور بے پناہ پرکشش رنگت اور تقریباً گھٹنوں تک پہنچے ہوئے بال۔ یہ اس کی دل کشی کی بنیادیں تھیں۔

میں نے اس کی ایک آدھ فلم دیکھی تھی۔ ان کے نین نقش تو ظاہر ہے وہی تھے جو فلم کے پردے پر نظر آتے تھے مگر اس کی شخصیت اس امیج سے مختلف تھی جو اسے پردے پر دیکھ کر ذہن میں ابھرتا تھا۔ لفظی طور پر وہ اپنے عکس سے کم خوبصورت تھی مگر احساس کے پیمانے سے ناپا جاتا تو وہ حقیقی زندگی میں زیادہ پرکشش تھی۔ اپنے تمام تر مصنوعی پن کے باوجود اس نے سفید ساٹن کا ایک عجیب سا چمکیلا لبادہ پہن رکھا تھا جس میں اس کے جسم کی شاک گل کی سی لچک ہر ہر قدم پر کچھ زیادہ ہی نمایاں ہو رہی تھی۔ اگر اس نے بالوں کی چٹیا نہ بنا رکھی ہوتی تو یقیناً یہی گمان گزرتا کہ گھٹائیں ہلکورے لیتی اس کے ساتھ ساتھ چل رہی ہیں۔

ہلکے سے احساس تفاخر سے اٹھی ہوئی گردن اور چہرے پر پھیلی ہوئی ایک عجیب سی یاس آمیز سنجیدگی نے اس کے خدوخال کے گرد گہری گمبھیرتا کا ہالہ سا بنا رکھا تھا۔ بقول کرشناجی کے اگر وہ جاہل اور ان پڑھ تھی تب بھی اس کی ایک ایک جنبش میں صدیوں کے تمدن کا قرینہ تھا۔ وہ چیپ عورت بہرحال نہیں لگتی تھی۔ اس لائق ضرور تھی کہ اسے مجسم متوجہ ہو کر محسوس کیا جاتا۔

اس کے پیچھے ایک خادمہ تھی جس نے اس کی شال اور ہینڈ بیگ وغیرہ اٹھا رکھا تھا۔ ایک نو عمر لڑکا تھا جس نے بڑا نفیس قسم کا بیوٹی بکس اٹھا رکھا تھا۔ وہ دونوں کرسیوں کے قریب ہی رک گئے اور روپا سیدھی کرشناجی کے سامنے پہنچ گئی۔ کرشناجی نے ایک میٹھی مسکراہٹ سے اسے نمسکار کیا۔ اب ان کے چہرے پر جارحانہ پن کا کہیں نام و نشان تک نہیں تھا۔ روپا نے بھی خاصی گرم جوشی سے انہیں نمسکار کیا۔ مگر اس کی گرم جوشی میں بھی ایک ٹھہراؤ تھا۔ وہ دونوں سیٹ پر چلے گئے۔

کرشنا جی کا اسسٹنٹ بھی ان کے پاس پہنچ گیا۔ وہ دونوں خاصی دیر تک روپا سے باتیں کرتے رہے۔ غالباً سین سمجھا رہے تھے۔ روپا وقفے وقفے سے تفہیمی انداز میں سر ہلاتی رہی۔ پھر ایکسٹرا لڑکیوں کے جھرمٹ میں غالیچے پر جا بیٹھی اور کرشناجی اور اسسٹنٹ سیٹ سے اتر آئے۔ معمر کیمرہ مین ٹرالی پر کیمرے کے قریب سٹول سنبھال کر بیٹھ چکا تھا۔ ایک قلی ٹرالی کو دھکا لگانے کے لئے تیار کھڑا تھا۔

"سائیلنس پلیز۔ لائیٹس آن۔" کرشنا جی کی آواز گونجی۔ فلڈ لائٹس روشن ہو گئیں اور فلور پر موجود افراد کی بھنبھناہٹ تھم گئی۔ "کلیپ" کرشناجی کی آواز گونجی ایک آدمی نے

آگے بڑھ کر ایک سیاہ تختی کیمرے کے سامنے کر دی اور ساتھ ہی باآواز بلند کہا۔ "شاٹ تھری ایٹ۔۔۔۔ ٹیک ون" تختی پر بھی چاک سے یہی لکھا تھا۔ کیمرے کی مدھم سی گھوں گھوں سنائی دینے لگی۔ کیمرے کی زد سے کافی دور ایک اونچے اسٹینڈ پر ایک زنگ آلود سا مائیک ہوا میں جھول رہا تھا۔

سیاہ لبادوں میں ملبوس ڈاکو تالاب کے کناروں پر پہنچ چکے تھے۔ تختی کیمرے کے سامنے سے ہٹتے ہی انہوں نے نہایت بازیگرانہ انداز میں تالاب کو پار کرنے کے لئے چھلانگیں لگائیں۔ دو تو بڑی عمدگی سے چھلانگ لگا گئے۔ ایک تالاب کے پرلی طرف پہنچ کر لڑھک گیا اور خاصی بلند آواز میں کراہ اٹھا۔ چوتھا تالاب ہی میں گر گیا۔ میں بڑی دلچسپی سے ان کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہا تھا۔

"کٹ ۔" کرشناجی کی غصہ بھری آواز گونجی۔ غازی شاہ لپک کر آگے آیا تو کرشناجی نے بگڑتے ہوئے کہا۔ "یہ ریہرسل کرائی تھی تم نے؟"

"کل تو ٹھیک ٹھاک کام کیا تھا ان کم بختوں نے۔" غازی شاہ نے کہا اور اپنے آدمیوں پر بگڑنے لگا۔ گرنے والے اٹھ کھڑے ہوئے تھے لیکن جو تالاب میں گرا تھا اس کی مونچھ پانی میں بھیگ کر ڈھلک گئی تھی۔ ایک میک اپ مین نے آکر اس کی مونچھ درست کی۔ غازی شاہ نے انہیں ڈانٹ ڈپٹ کے ساتھ مزید ہدایات دیں۔ خود چھلانگ لگا کر دکھائی۔ وہ واقعی اس قسم کے کاموں میں ماہر معلوم ہوتا تھا لیکن گرنے والے دونوں آدمی اس تیکنیک پر عمل نہیں کر پا رہے تھے۔

میرے خیال میں انہیں ایک دوسری تیکنیک سے چھلانگ لگوانے کی ضرورت تھی لیکن غازی شاہ اپنے ہی طریقے پر اصرار کئے جا رہا تھا۔ آخر ایک بار چاروں نے صحیح طریقے سے قلابازی لگا کر چھلانگ لگائی تو سین دوبارہ شوٹ ہونے لگا۔ اس بار پھر ایک آدمی گر پڑا۔ اس طرح یہ سین پانچ مرتبہ ٹیک ہوا لیکن اوکے نہ ہو سکا۔ کرشناجی کا پارہ چڑھ گیا تھا اور وہ غازی شاہ کو جلی کٹی سنا رہے تھے غازی شاہ انہیں دگنی کر کے اپنے آدمیوں کی طرف منتقل کر رہا تھا۔

ایک بار تو میں نے روپا کی مترنم آواز بھی سنی۔ وہ کرشناجی کو آواز دے کر کہہ رہی تھی۔ "آپ سیدھے سادے انداز میں چھلانگ کیوں نہیں لگوا لیتے۔انہیں قلابازیاں کھلانی ضروری ہیں؟"

"اس کے بغیر سارا ڈرامہ ختم ہو جائے گا۔ تمہیں کیا معلوم پردے پر یہ سین کس طرح آتا ہے۔" کرشنا جی نے چیخ کر جواب دیا۔ "سیدھے سادے طریقے سے تو میں بھی چھلانگ لگا سکتا ہوں میں نے ان "مایہ ناز" فائٹروں کو دو سو روپے دیہاڑی پر کس لئے بلایا

ہے..... گدھوں کی طرح دولتیاں جھاڑنے کے لئے؟"

مجھ سے نہ رہا گیا مجھے فلمی دنیا کے طور طریقوں وغیرہ کا تو کچھ زیادہ علم نہیں تھا' بس یونہی لا ابالی انداز میں آگے جا پہنچا۔

"میرے خیال میں تم صحیح طریقہ نہیں آزما رہے۔" میں نے غازی شاہ سے کہا۔

"تم کون ہو میاں؟" وہ پلٹ کر دھاڑا۔ "اور کہاں سے آئے ہو مجھے طریقہ سمجھانے؟"

"میں تمہاری طرح فائٹر تو نہیں۔ میں تو دوستانہ طور پر مشورہ دینا چاہتا تھا کہ اگر تم ایک اور طریقہ استعمال کرو تو یہ چاروں اس سے بھی زیادہ اونچی چھلانگ لگا کر تالاب کے پار پہنچ سکتے ہیں۔" میں نے ملائمت سے کہا۔

وہ بری طرح کھسیایا ہوا تھا اور ساری جھنجلاہٹ شاید مجھ پر نکالنا چاہتا تھا۔ استہزائیہ انداز میں اس نے سب کو مخاطب کیا۔ "ایک تو ہر لونڈا لپاڑا استاد بنا پھرتا ہے۔" پھر وہ انگلیوں سے میرے ٹھوڑی چھوتے ہوئے خالص فلمی انداز میں بولا۔ "میں چاہوں تو ایک ٹھوکر میں تمہیں بھی تالاب کے پار پہنچا سکتا ہوں۔"

اس نے جھنجلاہٹ کے ساتھ لیکن بڑے ماہرانہ انداز میں ٹانگ گھمائی میں نے قدرے پیچھے ہٹ کر اسی ٹانگ سے پکڑ کر اسے تالاب کے پار اچھال دیا۔ وہ پیٹھ کے بل دوسرے کنارے پر جا گرا۔ سر کے بل گرتا تو بھیجا باہر آجاتا ایک بار تو اس کی ریڑھ کی ہڈی کے تمام منکے جھنجھنا اٹھے ہوں گے۔ شاید وہ سمجھ ہی نہیں سکا تھا کہ اس کے ساتھ ہوا کیا ہے۔

چند لمحے تک وہ چت پڑا آنکھیں جھپکاتا رہا۔ پھر کمر پر ہاتھ رکھ کر اٹھا اور تالاب کے پانی میں چھپ چھپ کرتا' لنگڑاتا ہوا میرے سامنے آیا ایک لمحے کے لئے تو وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا رہا گویا فیصلہ کر رہا ہو کہ میری گستاخی کی مجھے کیا سزا دے۔ پھر اس نے بجلی کی سی پھرتی سے میرے کندھے پر پنچ رسید کرنے کے لئے ہاتھ گھمایا۔ یہ بڑا عامیانہ وار تھا میں نے اپنی جگہ سے حرکت کئے بغیر بازو پر یہ وار روک لیا۔

وہ کوئی اور وار کرنے کے لئے اچھلا لیکن اسی لمحے کرشناجی بیچ میں آگئے۔ "بند کرو یہ کتھا کلی۔" انہوں نے غازی شاہ کو جھاڑا۔ "اگر کام نہیں آرہا اور کوئی بتا رہا ہو تو سیکھ لینا چاہیے مگر تم بناسپتی فائیٹروں کو اتنی توفیق نہیں ہوتی۔ چار داؤ سیکھ کر مینڈک کی طرح سینہ پھلا کر آجاتے ہو اسٹوڈیو میں ...... اندھوں میں کانا راجا..... یہاں کسی بیچارے نے خواب میں بھی اکھاڑے کی شکل نہیں دیکھی ہوتی..... جاؤ جا کر کرسی پر بیٹھو اور چار مینار کا ایک سگریٹ پیو۔ اتنی دیر میں میں اس بانکے کی مدد سے سین شوٹ کر لوں۔ چلو .....

شاباش..." انہوں نے غازی شاہ کو پرے دھکیلا۔

وہ خاموشی سے کرسیوں کی طرف بڑھ گیا۔ تو کرشناجی میری طرف متوجہ ہوئے۔

"ہاں تو بھئی تم کونسی تیکنیک بتا رہے تھے؟ ذرا سمجھاؤ تو۔ ہنومان جی کے ان ناکام پجاریوں کو۔" انہوں نے ڈاکوؤں کی طرف اشارہ کیا جو چھلانگ لگا کر بے حال ہو چکے تھے۔

کرشنا جی کا انداز تخاطب ایسا تھا گویا وہ بڑی دیر سے مجھ سے ہم کلام تھے اور میں انہی کے عملے کا کوئی رکن تھا۔ میں نے ڈاکوؤں کو اپنے قریب کھڑا کیا اور پہلے خود انہیں چھلانگ لگا کر دکھائی جب میں تالاب کے دوسرے کنارے پر پہنچ کر سیدھا کھڑا ہوا تو میں نے دیکھا روپا ایکسٹرا لڑکیوں کے جھرمٹ سے نکل کر بارہ دری کی سیڑھیوں پر کھڑی عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کی گہری کالی آنکھوں میں دلچسپی کی چمک تھی۔ ایک لمحے کے لئے ہماری نظریں ملیں۔ بنگال کا سحر رکھنے والی ان آنکھوں کے پھندے سے میں نے بمشکل اپنے آپ کو چھڑایا اور الٹی چھلانگ لگا کر تالاب کی دوسری طرف آگیا۔

میں نے محسوس کیا کہ کتنی ہی ساکت آنکھیں مختلف سمتوں سے مجھے گھور رہی تھیں۔ میں نے اب ڈاکوؤں کو چھلانگ لگانے کا دوسرا طریقہ سمجھایا اور وہاں سے ہٹ آیا۔

طبلہ بڑے جوش سے میری طرف لپکا اور میرا ہاتھ بھینچتے ہوئے بولا۔ "تم تو چھپے رستم نکلے یار! تمہیں تو اسٹوڈیو میں بڑا کام مل سکتا ہے۔"

"مگر مجھے یہاں کام کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

میں نے کہا۔ "میرا یہاں دم گھٹ رہا ہے۔ آؤ چلیں۔"

"چلتے ہیں۔ ذرا ٹھہر جاؤ۔" طبلہ نے مجھے روکا۔ کرشناجی نے ڈاکوؤں کے آنے' روپا کے چیخنے چلانے اور اس کی سہیلیوں کے تتر بتر ہونے کا سین شوٹ کر لیا اور فارغ ہوتے ہی سیدھے میری طرف آئے۔ مجھے کرسی پیش کی اور میرے سامنے بیٹھتے ہوئے بولے۔

"نوجوان تم کون ہو' کیا کرتے ہو اور کہاں سے آئے ہو؟"

"جی میں کوئی بھی نہیں ہوں' کچھ بھی نہیں کرتا اور کہیں سے بھی نہیں آیا۔" میں نے سادگی سے جواب دیا۔

"بہت خوب..... بہت خوب۔" ان کی مخصوص خاموش ہنسی کے ساتھ ان کی توند تھلتھلائی۔ "بتانا نہیں چاہتے۔ خیر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں تو دوستانہ طور پر تمہیں مشورہ دینا چاہتا تھا کہ تم فلموں کے لئے فائٹ انسٹرکٹر کے طور پر کام کیوں نہیں شروع کر دیتے؟"

"اس میں مجھے کیا مل جائے گا۔" میں نے بلا تکلف پوچھا۔

"کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ اب فلم کمپنیوں میں ملازم رکھنے کا رواج تو کم ہو گیا ہے۔

سب لوگ آزادانہ طور پر کام کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے سارے خرچے وغیرہ نکال کر تمہیں تین ہزار روپے مہینہ تو بچ ہی جایا کرے گا اور بعض اوقات فلموں کی ایسی لائن لگتی ہے کہ آدمی دونوں ہاتھوں سے کماتا ہے۔" کرشناجی نے بتایا۔

"میں معذرت چاہوں گا کرشناجی! دراصل اسٹوڈیوز میں کام کرنا میری طبیعت سے مطابقت نہیں رکھتا۔" میں نے دو ٹوک لہجے میں کہا اور پھر اجازت طلب کر کے طبلہ کے ساتھ فلور سے باہر آگیا۔ وہاں روشنیاں بجھ چکی تھیں اور نہ جانے کیوں میرا اس ماحول میں واقعی دم گھٹ رہا تھا۔

"تم نے اچھا نہیں کیا یار!" طبلہ نے باہر میرے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ "کرشناجی کی مدد سے کام شروع کر دیتے۔ کسی دھندے سے تو لگتے۔ پھر کہو گے کہ بیکار پڑے پڑے بدن ٹوٹنے لگتا ہے۔"

"تم بے فکر رہو طبلہ! مجھے لگتا ہے کہ میں اب زیادہ عرصے بیکار نہیں رہوں گا۔ میں کسی اور قسم کا راستہ چاہتا ہوں۔ ٹٹ پونجیا قسم کے کام مجھے پسند نہیں۔"

ہم راستے میں ایک فوارے کے قریب دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔ کچھ دور ایک لان میں شوٹنگ ہو رہی تھی۔ ایک صاحب گھوڑے پر بیٹھے بار بار اس کی لگام کھینچ کر زبردستی اس کی گردن ہلا رہے تھے۔ گھوڑے کے دائیں طرف کینوس کا ایک بڑا سا ڈرم ایک روٹیٹر پر گھمایا جا رہا تھا۔ ڈرم پر رنگ برنگے مناظر' پہاڑ اور درخت بنے ہوئے تھے اور اسے گھما کر یہ تاثر دیا جا رہا تھا کہ گھوڑا ایک ہی جگہ نہیں کھڑا بلکہ تیزی سے بھاگ رہا ہے۔ درختوں اور پہاڑوں کو پیچھے چھوڑتا جا رہا ہے۔ شوٹنگ میں یہ دشواری پیش آرہی تھی کہ گھوڑا بار بار گردن جھکا کر لان کی گھاس چرنے لگتا تھا۔

کھلی ہوا میں چند گہری گہری سانسیں لے کر ہم آگے بڑھے ہی تھے کہ کسی نے عقب سے آواز دی۔ "ذرا سنئے!" میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہی کمسن سا لڑکا ہماری طرف لپکا آرہا تھا جسے میں نے میڈم روپا کا بیوٹی بکس اٹھائے دیکھا تھا۔

"میڈم روپا آپ کو بلا رہی ہیں۔" قریب آکر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ میں نے طبلہ کی طرف دیکھا۔

"خدا خیر کرے۔" وہ کندھے اچکا کر بولا۔

"کہاں ہے وہ؟" میں نے لڑکے سے پوچھا۔

"اپنے میک اپ روم میں۔" لڑکے نے جواب دیا۔ "میرے ساتھ آجایئے"

ان ساحر آنکھوں کے تصور میں میری دھڑکنیں کچھ تیز ہو گئیں۔ "مل لینے میں کیا حرج ہے؟" میں نے مشورہ طلب نظروں سے طبلہ کی طرف دیکھا۔ اس نے ایک بار پھر

کندھے اچکائے۔

لڑکے کی رہنمائی میں ہم چھوٹے چھوٹے کمروں کی ایک قطار کے قریب پہنچے ایک کمرے کے دروازے پر رک کر لڑکے نے انتہائی شائستہ اور معذرت خواہانہ لہجے میں طبلہ سے کہا۔ "آپ باہر ہی ٹھہریئے گا۔ میڈم اکیلے میں ان سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتی ہیں۔" لڑکا خود بھی باہر ہی رک گیا اور اس نے مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ میں دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔

وہ ایک مختصر سا چوکور کمرہ تھا۔ دیوار کے ساتھ ایک بہت بڑی سنگھار میز تھی جس پر میک اپ کا انواع و اقسام کا سامان بکھرا پڑا تھا اور اس کے سامنے ایک اونچی کرسی پر وہ سکڑی سمٹی بیٹھی تھی۔ اس کی شال کرسی سے نیچے جھول رہی تھی۔ سنگھار میز کے آئینے پر دو بڑے بڑے بلب نصب تھے۔ ان کی روشنی آئینے سے بھی منعکس ہو رہی تھی اور چھوٹا سا کمرہ کچھ زیادہ ہی روشنی سے بھرا بھرا لگ رہا تھا۔

میڈم روپا کے بال کھلے ہوئے تھے اور اب وہ پہلے سے کچھ مختلف سی لگ رہی تھی۔ اس کے قریب ہی اس کی خادمہ کھڑی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ سنگھار میز پر ٹکا ہوا تھا اور ایک ہاتھ میں سبز جلد کی ڈائری تھی۔ اس ڈائری کو دیکھ کر میرے ذہن میں سیاہ جلد والی اس ڈائری کا خیال ایک درد کی طرح ابھر آیا جو ممی نے مجھے دی تھی اور جو میرے لئے اب ایک متاع گم گشتہ بن چکی تھی۔ اس کی گمشدگی کا ناسور فراموشی کے پھاہے تلے ایک بار پھر رس اٹھا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے محسوس ہوا کہ شاید ممی کی روح اب بھی فضائے بسیط میں کہیں بے چین و بے قرار پھر رہی ہے کہ انہوں نے سربستہ رازوں کی جو کائنات میرے سپرد کی تھی میں اس سے آشناہی نہ ہو سکا۔

دل سے اٹھنے والی بے عنوان سی ہوک کو دبا کر میں نے روپا کی طرف دیکھا۔ مخروطی انگلیوں والے اس کے ہاتھ کرسی کے ہتھوں پر جمے ہوئے تھے اور وہ ساکت بیٹھی میرا سر تا پا جائزہ لے رہی تھی۔

"بیٹھ جاؤ۔" بالآخر اس کے ہونٹوں نے حرکت کی۔ میں اس کے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھ گیا جو قدرے نیچی تھی۔ "تم باہر جاؤ۔" اس نے خادمہ کو حکم دیا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" خادمہ کے جانے کے بعد اس نے پوچھا۔ اس کی آواز سرگوشی سے بلند نہیں تھی۔ مگر یہ سرگوشی گویا میرے کان کے قریب ہی ابھری تھی۔

"منصور مغل!" میں نے ایک لمحے کے توقف سے کہا۔ میں نے اسے اپنا نام بتانے میں کوئی حرج محسوس نہیں کیا۔

"بڑا شاہی سا نام ہے۔ حلق پر زور دے کر بولنا پڑتا ہے۔" اس کے لبوں پر

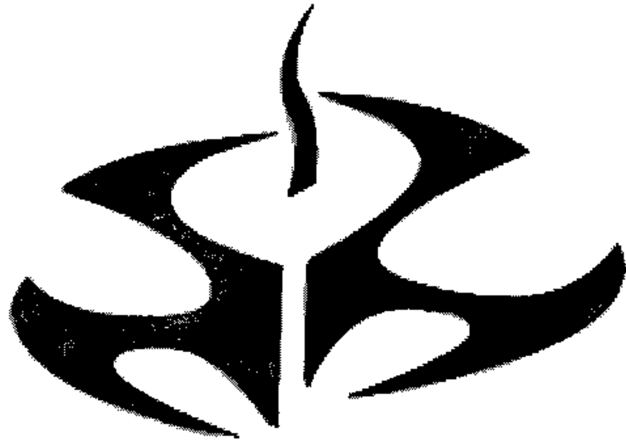
مسکراہٹ صبح کی پہلی کرن کی طرح دھیرے دھیرے طلوع ہو رہی تھی۔ "بات یہ ہے منصور!" اس نے سر کرسی کے پشتے سے ٹکا لیا۔ "کہ میں بڑی مشہور بڑی..... دولت مند لیکن نہایت کمزور عورت ہوں۔ وہ عورت بہت ہی کمزور ہوتی ہے جو دنیا میں تنہا ہو۔ میرے ارد گرد انسانوں کا ہجوم ہے مگر میں تنہا ہوں اور کچھ لوگ میرے دشمن ہیں میری گھات میں ہیں۔ میری جان کے درپے ہیں۔ جب میں مرنا چاہتی تھی تو کوئی مجھے نہیں مارتا تھا اور اب مجھے زندگی سے کچھ انسیت ہو گئی ہے اور میں سہمی ہوئی بچی کی طرح زندگی کے دامن سے چمٹی ہوئی ہوں تو کچھ لوگ یہ نعمت مجھ سے چھین لینا چاہتے ہیں۔" اس نے ایک طویل سانس لی۔ "میں چاہتی ہوں کہ کوئی مضبوط اور بے جگر مرد جو سائے کی طرح میرے ساتھ رہے' اس وقت تک میری حفاظت کرے جب تک زندگی میرے لئے دوبارہ بے وقعت نہیں ہو جاتی۔ لیکن وہ شخص محض تنخواہ اور چند آسائشوں کی خاطر اس فریضے' کو اس طرح نہ نبھائے جس طرح پیشہ ور چوکیدار راتوں کو ڈنڈا لے کر گلیوں میں گھومتے ہیں لیکن اپنے سے طاقتور چوروں کو دیکھ کر کنی کترا جاتے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ کوئی میری اس طرح حفاظت کرے جس طرح اپنی جان کی کی جاتی ہے اور وہ اس کا اہل بھی ہو۔ گزشتہ دو سال میں میں نے یکے بعد دیگرے چار آدمیوں کو ملازموں کی طرح نہیں' اپنوں کی طرح رکھا۔ بڑی ڈینگیں مارتے تھے بڑے لڑاکے مشہور تھے بڑی بے جگری کی باتیں کرتے تھے' بڑے لمبے چوڑے جوان تھے لیکن جب میری خواب گاہ کا دروازہ توڑا گیا' جب میری کار پر بیچ سڑک پر گولیاں چلائی گئیں' جب مجھ پر تیزاب پھینکنے کی کوشش کی گئی تو میرے کسی محافظ سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ حملہ آوروں میں سے ایک آدھ کو ہی قابو کر سکتا۔ تاکہ میں اپنے دشمن کے خلاف پولیس کو کوئی ثبوت تو دے سکتی۔ مجھے معلوم ہے میرا دشمن کون ہے مگر میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی کیونکہ میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے....." وہ خاموش ہو گئی اور نیم وا آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ شاید وہ چاہتی تھی کہ میں کچھ بولوں۔

"اگر تم کمزور اور تنہا ہو تو شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟ کوئی مضبوط سہارا ڈھونڈ کر۔" میں نے پہلی بار ہی اسے تم کہہ کر مخاطب کیا۔

وہ دھیرے سے ہنسی اس کی ہنسی ہچکی سے مشابہ تھی۔ "شادی میں میرے لئے کوئی کشش نہیں رہی۔ میں فلمی دنیا میں آنے سے پہلے شادی شدہ تھی۔ اب کچھ سرمایہ دار ہیں جو مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ان کی دو دو تین تین قانونی بیویاں پہلے ہی موجود ہیں۔ غیر قانونی بیویوں کی تعداد کا مجھے علم نہیں۔ میں کسی کا ذائقہ بدلنے کی خاطر اس کی خوابگاہ کی زینت بننا نہیں چاہتی۔ کچھ مخلص ہیں مگر وہ کمزور ہیں اور ایک کمزور کو

دوسرے کمزور کا سہارا اور بھی بزدل بنا دیتا ہے.... اور سنو میں نے تمہیں مشورہ لینے کے لئے نہیں بلایا۔ دینا چاہتے ہو تو مجھے اپنی بے جگری دے دو' شہ زوری دے دو' پناہ دو' تحفظ دو' میں ان کی قیمت تو نہیں دے سکتی مگر دنیاوی ضروریات کے لئے دس ہزار ماہانہ دے سکتی ہوں۔ کھانا میرے ساتھ دسترخوان پر کھاؤ گے' رہائش میرے بنگلے کی انیکسی میں ہو گی جس میں اس غرض سے ٹیلی فون بھی موجود ہے۔ کہ کسی بھی وقت ضرورت پڑنے پر تمہیں بلایا جا سکے۔ اگر تم ویسے ہی ثابت ہوئے جیسا میں تمہیں دیکھنا چاہتی ہوں تو پھر میرے اور تمہارے درمیان کوئی حساب نہیں ہو گا۔ جو میری بساط میں ہو گا تمہارے لئے کر دوں گی۔ فلموں میں آنا چاہو گے تو میں تمہاری سفارش کر دوں گی اور فی الحال فلمی دنیا میں میری سفارش چلتی ہے اور نہ بھی چلے تو میں تمہارے لئے ذاتی فلم اناؤنس کر دوں گی' اور تمہارا کوئی مسئلہ ہو گا تو دامے' درمے سخنے اس میں مجھے اپنے ساتھ پاؤ گے' بولو کیا کہتے ہو؟"





"فلموں میں آنے کا مجھے کوئی شوق نہیں۔" میں نے کہا۔ "تمہارے انداز سے پتہ چلتا ہے کہ بات ملازمت کی نہیں دو اجنبیوں کے درمیان ایک بے نام رفاقت کے رشتے استوار کرنے کی ہو رہی ہے۔"

"ہاں" اس نے بلا تامل کہا اور اس کی آنکھیں گویا کسی خواب کے بوجھل پن سے نکل آئیں۔

"یہ بات مجھے پسند آئی ہے۔ لیکن تم نے کیا سوچ کر اتنی وضاحت اور یقین و اعتماد کے ساتھ مجھ سے باتیں کی ہیں؟ جب کہ تم نے مجھے پہلی دفعہ دیکھا ہے۔ تمہیں میرے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں اور تم نے پوچھا بھی نہیں۔"

"زندگی میں ان گنت ٹھوکریں کھا کر ایک ہی فن تو سیکھا ہے۔" اس کے ہونٹوں پر ادھوری سی مسکراہٹ ابھری۔ "ذات کی پہیلیاں بوجھنے کا فن.... میں نے تمہیں فلور پر دیکھا تھا اور اب خاصی دیر سے تم سے باتیں کر رہی ہوں۔ اس تمام وقت میں تمہیں بوجھ رہی تھی۔ یوں تو انسان کی ذات کا سارا حساب کتاب اس کے خدوخال پر لکھا ہوتا ہے۔ مگر آنکھیں تو خصوصاً ذات کا دروازہ ہیں۔ میں نے تمہارے خدوخال پر لکھی ہوئی کہانی کسی حد تک پڑھی ہے اور آنکھوں کے دروازے سے اتر کر تمہاری ذات کی بھول بھلیوں کی تھوڑی سی سیر بھی کی ہے۔ کہو تو مختصراً کچھ بتاؤں؟"

"بتاؤ" میں نے قدرے دلچسپی سے کہا۔

"تمہاری رگوں میں شاہی خون دوڑ رہا ہے۔" اس نے گویا نوک زبان سے ذات کی گرہیں کھولنا شروع کیں۔

"پڑھے لکھے ہو۔ آج کل کسی مسئلے سے دو چار ہو۔ تمہارا کچھ کھو گیا ہے شاید کوئی قیمتی چیز یا کوئی عزیز از جان ہستی۔ لیکن ان سب باتوں میں کوئی زیادہ دلچسپی نہیں۔ مجھے سب سے زیادہ جس چیز نے متاثر کیا وہ یہ کہ تمہاری ذات کی بھول بھلیوں میں کہیں کسی خوف کا نام و نشان نہیں ہے۔ تم ایک بے خوف انسان ہو اور یہ انسانوں کی ایک نایاب قسم ہے۔ ہر انسان کے شعور یا لاشعور میں کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی خوف کا سنپولیا رینگ رہا ہوتا ہے۔ بتاؤ کیا مجھ ان پڑھ عورت کا یہ مطالعہ درست ہے؟" اس نے کرسی کے پشتے سے

سر ہٹا لیا۔

"خطرناک حد تک۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

"تو پھر میری پیشکش کے جواب میں کیا کہتے ہو؟" اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔

"مجھے سوچنے کے لئے کچھ وقت چاہیے۔" میں نے جواب دیا۔

"میری قوت مشاہدہ تو بتاتی ہے کہ فیصلہ تم نے کر لیا ہے۔ لیکن خیر.... اگر تکلفات پورے کرنے چاہتے ہو تو تمہاری مرضی۔" اس نے شال کندھوں پر کھینچ لی۔

"میں اس اسٹوڈیو میں چھ بجے تک شوٹنگوں میں مصروف ہوں۔ تم اس دوران گھومو پھرو' سوچنے کو کچھ باقی ہے تو سوچو۔ کسی سے مشورہ کرنا ہے تو کر لو۔ میں چھ سے سات بجے تک اسی میک اپ روم میں انتظار کروں گی۔ اگر فیصلہ بدل نہ لو تو آجانا۔"

میں اٹھا اور باہر آگیا۔ طبلہ برآمدے میں ایک ستون کے قریب بیٹھا آتے جاتے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے کسی خاص تجسس یا اشتیاق کا اظہار نہیں کیا' خاموشی سے اٹھ کر میرے ساتھ چل دیا۔ فوارے کے قریب پہنچ کر ہم لان پر بیٹھ گئے۔

"کیا بات تھی؟" اب اس نے مدھم لہجے میں پوچھا۔ میں نے نے بلا کم و کاست اسے سب کچھ بتا دیا اور آخر میں پوچھا "تم کیا مشورہ دیتے ہو؟"

"تم نے کیا سوچا ہے؟" اس نے الٹا سوال کیا۔

"میں نے سوچا ہے کہ اس پیش کش کو قبول کر لوں۔"

میں نے ایک لمحے کے توقف سے کہا۔ "اس پیش کش میں وہ تمام چیزیں آجاتی ہیں جن کی فی الحال مجھے ضرورت ہے۔ میں نے مستقبل کے بارے میں کچھ اہم پروگرام بنا رکھے ہیں جن کے لئے ایک اچھا آغاز چاہیے۔"

"ایک بار پھر سوچ لو۔" طبلہ نے مدھم لہجے میں کہا۔ روپا یہاں پڑھے لکھے لوگوں میں "ساحرہ" اور ان پڑھوں میں خطرناک عورت کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے ساتھ رہنے میں ایک نقصان یہ ہے کہ لوگ منہ پر تو تمہاری بڑی عزت کریں گے لیکن پیٹھ پیچھے بڑی تحقیر کریں گے' مذاق اڑائیں گے۔"

"پیٹھ پیچھے تو لوگ بادشاہوں کو بھی گالیاں دیتے آئے ہیں۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے تو یہ دیکھنا ہے کہ اس کام میں مجھے میری ضرورت کی ہر چیز مل رہی ہے۔"

"تمہاری مرضی۔" اس نے کندھے اچکائے۔ "تجربہ کر کے دیکھ لو۔ وہ اب تک تم جیسے کئی ہینڈسم اور صحت مند نوجوان کو کسی نہ کسی بہانے ملازم رکھ چکی ہے مگر زیادہ دن اس کی کسی سے نہیں بنی.... بہرحال....." اس نے ایک لمحے کے توقف سے کہا۔ "اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنی بات منوانا جانتی ہے۔"

چند لمحے خاموشی رہی پھر میں نے کہا۔ "مستقل طور پر تو مجھے بھی اس کام کی ضرورت نہیں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میری منزل تو درحقیقت کچھ اور ہے جو نہ جانے مجھے کب ملے گی۔ فی الحال تو مجھے صرف سنبھلنے کی مہلت چاہیے۔"

"ٹھیک ہے پیارے۔" طبلہ نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ "تمہیں یہ سارا مبارک ہو۔ کبھی کبھار ملتے رہا کرنا۔ بیس پچیس دنوں ہی میں تم سے کچھ ایسی انسیت ہو گئی ہے جیسے تم بچپن کے دوست ہو لنگوٹیے ہو۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو یار؟" میں نے خلوص سے اس کا ہاتھ دبایا۔ "تم صرف چند دن ٹھہر جاؤ۔ پھر دیکھنا میں تمہارے لئے کیا کرتا ہوں۔ ہمیں صرف ملتے ہی نہیں رہنا ہے، مل کر کچھ پروگرام بھی بنانے ہیں جن میں تم میرے شانہ بشانہ رہو گے۔"

اس کے بعد کچھ وقت ہم نے مختلف شوٹنگز وغیرہ دیکھنے میں گزارا۔ پانچ بجے کے قریب طبلہ کو ایک سین میں کچھ کام مل گیا اور وہ گیٹ اپ کرانے کے لئے میک اپ روم میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ سیٹ پر آیا تو اس کے آدھے بال سفید ہو چکے تھے۔ چہرے پر جھاڑ جھنکار داڑھی تھی۔ جسم پر ایک پیوند زدہ لبادہ تھا۔ وہ سیٹ پر کسی صوفیانہ سے نغمے کے چند بول پکچرائز کرانے لگا۔ اس وقت سوا چھ بج چکے تھے۔ میں نے اس سے اجازت طلب کی اور اسے کام میں مصروف چھوڑ کر روپا کے میک اپ روم میں آگیا۔ وہ میری منتظر تھی۔ اس کے چہرے پر بہت ہلکا سا میک اپ تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ پرکشش لگ رہی تھی۔

"تمہارا کہیں کوئی سامان تو موجود نہیں جسے تم ساتھ لینا چاہو؟" اس نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔ وہ چلنے کے لئے تیار تھی۔

"نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ گو کہ طبلہ کی کھولی میں میرے دو جوڑے کپڑے تھے لیکن ایک تو اس وقت وہ مجھے نہایت غیر اہم محسوس ہو رہے تھے۔ دوسرے میں روپا کے ساتھ کھولی کی طرف جانا نہیں چاہتا تھا۔

ہم میک اپ روم سے نکل آئے۔ کمسن لڑکا اور خادمہ ہمارے پیچھے پیچھے آرہی تھی۔ پارکنگ لاٹ تک آتے آتے رستے میں بیسیوں آدمیوں نے روپا کو جھک کر سلام کیا۔ پارکنگ لاٹ میں وہ قرمزی رنگ کی ایک کنورٹیبل شیور لیٹ کے قریب رکی۔ "تمہیں ڈرائیونگ آتی ہے؟" اس نے مڑ کر مجھ سے پوچھا۔ میں نے اثبات میں سرہلا دیا۔

"تو پھر تم ہی چلاؤ۔" اس نے چابیاں میری طرف بڑھائیں۔ "میرے سینے پر سے جیسے کوئی بوجھ سا اتر گیا ہے۔ میں ذرا ریلیکس کرنا چاہتی ہوں۔"

وہ اگلی سیٹ پر میرے برابر بیٹھ گئی اور شال تہہ کر کے ڈیش بورڈ پر رکھتے ہوئے بولی۔ "میں نے ڈرائیور رکھنے کا جھنجھٹ ختم کر دیا ہے۔ پچھلے دنوں میرے نئے ڈرائیور نے مجھے اغوا کرنے کی کوشش کی تھی میری شاید قسمت ہی اچھی ہے کہ میں اب تک بچ

رہی ہوں..... لیکن قسمت کب تک آدمی کا ساتھ دیتی ہے؟"

میں نے کوئی تبصرہ نہ کیا۔ اسٹوڈیو سے نکل کر میں نے کہا۔ "راستہ بتاتی جانا"

بیس پچیس منٹ کے بعد ہم جس سڑک پر پہنچے وہ دو رویہ پام کے درختوں سے گھری ہوئی تھی۔ اسی سڑک سے ایک بغلی سڑک پر مڑ کر روپا نے اوسط درجے کے ایک بنگلے کے سامنے گاڑی رکوائی۔ میں نے ہارن بجایا تو ایک ادھیڑ عمر بندوق بردار چوکیدار نے آکر گیٹ کھولا۔ پورچ میں جا کر میں نے گاڑی روکی اور انجن بند کر دیا۔

"بہت اچھی ڈرائیونگ کرتے ہو تم۔ لگتا ہے عرصے سے کر رہے ہو۔" اس نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا۔

"جب راستوں سے شناسائی ہو جائے گی تو اس سے بھی اچھی کرنے لگوں گا۔" میں نے مسکرا کر کہا اور گاڑی کا دروازہ بند کر کے گردو پیش کا جائزہ لیا۔ پختہ روش کے دونوں طرف مختصر سا لان تھا اور کناروں پر پتلے پتلے پول ایستادہ تھے جن پر زرد گلوب لگے ہوئے تھے۔ نہ جانے کس طرف سے کاسنی کے پھولوں کی ایک بیل آکر پورچ کی چھت سے نیچے جھول رہی تھی۔ بائیں طرف لان پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر سیمنٹ کے گول گول پیوند لگے ہوئے تھے۔ ان پختہ ٹکڑوں کی قطار عمارت کے پیچھے کی طرف جا رہی تھی۔

"آشا تمہیں انیکسی میں لے جائے گی۔" روپا مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "وہاں تمہاری ضرورت کی ہر چیز موجود ہو گی۔ اگر کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتا دینا اب جا کر نہا دھوؤ اور آرام کرو۔ میں بھی ذرا تازہ دم ہو لوں۔ تمہاری ضرورت ہو گی تو میں فون کر لوں گی۔"

"آیئے۔" خادمہ نے مجھے اشارہ کیا اور میں چابیاں روپا کو دے کر اس کے پیچھے چل دیا۔ لان پر بنے ہوئے پختہ دائروں پر سے ہوتے ہوئے ہم عمارت کے پہلو میں پہنچے۔

انیکسی دو خوبصورت آراستہ و پیراستہ کمروں اور چھوٹے سے برآمدے پر مشتمل تھی۔ خوابگاہ سے ملحق باتھ روم بھی تھا۔ انیکسی میں واقعی ہر وہ چیز موجود تھی جس کی ضرورت رہائش اختیار کرنے کے سلسلے میں پڑ سکتی تھی۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد جب کہ میں نہا دھو کر اپنا حلیہ درست کر کے بیڈ پر لیٹا نیم دھیانی کے ساتھ ایک انگریزی رسالے کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔

"کھانا کب کھانا پسند کرو گے؟" دوسری طرف روپا کی بوجھل سی سرگوشی سنائی دی۔

"جب تم کھاؤ گی۔" میں نے کہا۔

"تو پھر تم آہی جاؤ۔ میں کھانا کھانے کی تیاری کر رہی ہوں۔" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ میں نے اٹھ کر رسالہ سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں جائزہ

لیا۔ عمدہ صابن سے نہانے اور آرام کرنے سے میری رنگت کچھ اور نکھر آئی تھی۔ میری داڑھی اور سر کے بھورے بال چمک رہے تھے۔ کپڑوں کی شکنیں درست کر کے میں کمرے سے نکل آیا۔ آشا مجھے بنگلے کے اندرونی دروازے پر ملی۔ اس نے سیڑھیوں تک میری رہنمائی کی اور بتایا کہ روپا اوپر ٹیرس پر بیٹھی ہیں۔

ٹیرس پر ایک ننھا سا رنگین بلب روشن تھا۔ وسط میں شیشے کے ٹاپ کی ایک میز اور لوہے کی چند خوبصورت 'گدے دار کرسیاں پڑی تھیں۔ ان میں سے ایک کرسی پر روپا نیم دراز تھی۔ اس کے ہاتھ میں گلاس تھا اور بوتل تپائی پر رکھی تھی۔ روپا کے جسم پر ایک ڈھیلا ڈھالا سفید اونی فراک تھا۔ کھلے بال ٹیرس کے فرش تک پہنچ رہے تھے۔

اس دھندلی دھندلی سی شبیہہ کو دیکھ کر دل میں سویا ہوا ایک درد جاگ اٹھا۔ وہ میری مہربان میری حاصل حیات ماہتاب نہ جانے کس حال میں تھی۔ میرے متعلق کیا سوچ رہی تھی اور آیا سوچ بھی رہی تھی یا اس نے مجھے بھلا دیا تھا؟ محبت کے نقوش بے شک بہت گہرے تھے مگر زمانہ بھی تو بلا کا برق رفتار تھا پیچھے رہ جانے والوں کی طرف مڑ کر دیکھنے کی رسم تو ٹوٹ چکی تھی مگر نہ جانے مجھے کیوں امید تھی یا خوش فہمی کہ وہ مجھے کبھی نہیں بھول سکتی۔

"بیٹھ جاؤ۔" روپا نے گلاس سے بڑا سا آخری گھونٹ بھرنے کے بعد کہا۔ اس کے پیچھے ایک کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ غالباً" اس کی خواب گاہ تھی۔ کمرے میں بھی دھندلی سی روشنی تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ کمرے کی جو دیوار میرے سامنے تھی اس پر مختلف گول مٹول صحت مند اور خوبصورت بچوں کی رنگ برنگ فریم شدہ تصویریں آویزاں تھیں۔ یہ تصویریں غالباً" کیلنڈروں اور رنگین رسالوں وغیرہ سے کاٹ کر فریم کی گئی تھی۔

روپا نے اپنے گلاس کے علاوہ ایک اور گلاس میں بھی وہسکی انڈیلی۔ چینی کے خوبصورت باؤل سے برف کے ٹکڑے نکال کر ان میں ڈالے اور اپنا گلاس اٹھا کر دوسرا میری طرف کھسکاتے ہوئے بولی۔ "پیو۔"

"شکریہ - میں نہیں پیتا۔" میں نے آہستگی سے کہا۔ وہ مزید کچھ نہ بولی۔ خاموشی سے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرنے لگی۔ میں نے پشتے کے کشن سے سر ٹکا دیا۔ ہوا میں خاصی تندی تھی اور دور کہیں سے آنے والی سمندر کی مخصوص بو خوشگوار محسوس ہو رہی تھی۔

اس نے آدھا گلاس حلق سے نیچے انڈیلنے کے بعد نیم وا آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ بڑی بڑی ساحر آنکھیں خمار کے سمندر میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ اس کی آواز پر بھی خمار کا غلبہ تھا۔ "میرا جی چاہ رہا تھا کہ تم سے ان گنت باتیں کروں۔" وہ بولی۔ "لیکن اب سامنے آ بیٹھے ہو تو کوئی بات نہیں سوجھ رہی۔ دوسروں کے لکھے ہوئے ڈائیلاگ بول بول

شاید میں اپنی باتیں بھول گئی ہوں۔"

میں خاموش رہا تو وہ ایک اور گھونٹ بھر کر بولی۔ "تم ہی کچھ بولو نا۔"

"میں ..... میں بہت کم بولتا ہوں۔" میں نے اس کے سادہ مگر مخمور حسن کی سحرکاری سے اپنے آپ کو آزاد کراتے ہوئے کہا۔ "سننے میں مجھے زیادہ لطف آتا ہے۔"

"یہ بھی تمہارے نایاب ہونے کی ایک اور نشانی ہے ورنہ ہر انسان چاہتا ہے کہ صرف وہی بولتا رہے۔ مسلسل بھونکتا رہے اور دوسرے سنتے رہیں۔ ہر ایک کو اپنی ذات کے اظہار کا مسئلہ درپیش ہے۔ کوئی کسی کی سننا نہیں چاہتا۔" اس نے گلاس میز پر رکھ کر سگریٹ کا پیکٹ اٹھایا اور ایک سگریٹ نکال کر لمبے سے ہولڈر میں لگا کر سلگائی۔ ایک گہرا کش لے کر وہ کرسی پر کچھ اور سمٹ گئی۔ پھر اس کی آواز گویا دور افتادہ جزیرے سے آئی۔ "منصور! تمہیں معلوم ہے پہلی مرتبہ میں کس قیمت میں بے آبرو ہوئی تھی؟"

میں خاموش رہا۔ سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

"صرف ایک وقت کی روٹی کے عوض۔" اس نے سسکی سی لی۔ پھر اس نے گلاس اٹھا کر ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔ ایک ہاتھ سے آنکھوں کو مسلا اور سر کو ہلکا سا جھٹکا دے کر بولی۔ "انسان سارے درندوں سے لڑ سکتا ہے مگر پیٹ کے عفریت کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔" ایک لمحہ خاموش رہ کر وہ بولی۔ "میں نے بھی بہت مقابلہ کیا بہت لڑی لیکن چوتھے دن فاقوں سے شکست کھا کر اس عورت کے پاس چلی گئی جو ایک عرصے سے مجھے ایک راستہ دکھا رہی تھی اور پھر رفتہ رفتہ سب کچھ میرے قدموں میں ڈھیر ہوتا گیا۔" اس کے لہجے میں ایسی کاٹ تھی جو میرے دل کو لہو لہو کر رہی تھی۔ موضوع بدلنے کی خاطر میں نے پوچھا۔ "تمہارے دشمن کون کون ہیں؟"

جواب دینے سے پہلے اس نے ایک اور گلاس بھرا۔ میں نے دیکھا بوتل تقریباً" آدھی خالی ہو چکی تھی۔ "مجھے ایک طوائف نے ہی ہیروئن بنایا تھا۔ میں ایک طرح سے اس کی غلام تھی۔ جب میں اپنے پیروں پر کھڑی ہوئی تو میں نے اس سے بغاوت کر دی۔ اس وقت اس نے کہا تھا کہ وہ مجھے چین سے نہیں جینے دے گی۔"

دھیمے لہجے میں بولتے بولتے اسے ہلکی سی کھانسی آئی اور اس کا گلاس چھلک پڑا۔ اس کا کہنا تھا کہ میں نے اس کی ساری محنت برباد کر دی ہے' اسے دھوکا دیا ہے حالانکہ میں اس کے پاس بہت کچھ چھوڑ کر آئی تھی جو اس کی "محنت" کے معاوضے سے کہیں زیادہ تھا۔ لیکن دراصل اس کی انا کو ٹھیس لگی تھی۔ وہ بہت طاقتور اور بار رسوخ عورت ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ آج کل وہ کہاں رہتی ہے لیکن میں اتنا ضرور جانتی ہوں کہ مجھ پر جتنے بھی حملے ہوئے ہیں ان کے پیچھے اسی کا ہاتھ ہے۔ وہ مجھ سے انتقام لینا چاہتی ہے۔"

روپا عجیب سے انداز میں ہنسی۔ "مجھے ہر طرح سے برباد کر کے بھی اسے چین نہیں۔

وہ سمجھتی ہے یہ عروج یہ دولت یہ شہرت بہت بڑی نعمتیں ہیں جو اس کی بدولت مجھے ملی ہیں..... وہ مجھے کہیں ملے تو میں اس سے کہنا چاہتی ہوں کہ یہ سب کچھ مجھ سے لے لے اور میرا وہ چھوٹا سا کچا گھر مجھے لوٹا دے جس میں میرے معصوم بچے کی قلقاریاں گونجتی تھیں اور جہاں میرا نابینا مگر محبت کرنے والا شوہر انتظار کیا کرتا تھا....."

دفعتہً اسے زور کی کھانسی آئی۔ چھلکتا ہوا گلاس اس نے میز کے شیشے پر پٹخ دیا اور برابر والی کرسی پر پڑے اپنے بیگ سے ایک شیشی نکال کر اس میں سے ایک گولی نکالی اور منہ میں ڈال کر چوسنے لگی۔ چند لمحے بعد وہ کچھ پرسکون ہوئی تو میں نے دیکھا اس کے رخساروں پر آنسوؤں کی لکیریں چمک رہی تھیں۔ کچھ کہے بغیر وہ اٹھنے لگی مگر کرسی سے الجھ کر بری طرح لڑکھڑا گئی۔

میں نے اٹھ کر اسے سہارا دیا۔ اس کا جسم بری طرح تپ رہا تھا۔ "تمہیں بخار ہے کیا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ میرے جسم میں ماضی کی چتا جل رہی تھی۔" وہ مضمحل انداز میں مسکرائی۔ "مجھے بیڈ روم میں پہنچا دو۔"

میں اسے سہارا دے کر بیڈ روم میں لایا۔ بیڈ روم کی باقی دو دیواروں پر بھی بچوں ہی کی رنگ برنگی تصویریں آویزاں تھیں۔ "تمہارا بچہ کہاں گیا روپا؟" میں نے غیر ارادی طور پر پوچھا حالانکہ میں اس کے زخموں کو کریدنا نہیں چاہتا تھا۔

"نمونیے سے مر گیا تھا۔" اس نے اختصار سے جواب دیا۔ گویا یہی کل داستان تھی؟ یہی آغاز' یہی انجام۔

"اور تمہارا شوہر....؟" میری سمجھ میں نہیں آیا کہ سوال کیسے مکمل کروں۔

"ایک حادثے میں اس کی آنکھیں ضائع ہو گئی تھیں اور آنکھوں کے ساتھ ہی گویا اس کی ساری قوت برداشت حوصلہ اور جوانمردی چلی گئی تھی۔ مصائب سے گھبرا کر وہ ایک روز گھر سے نکلا اور پھر لوٹ کر نہیں آیا۔" روپا نے کہا اور میرے بازو کا سہارا چھوڑ کر دھم سے بستر پر ڈھیر ہو گئی اور یوں سکڑ سمٹ کر لیٹ گئی گویا اسے گرد و پیش سے خوف آ رہا ہو۔

"کھانا نہیں کھاؤ گی؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ تم جا کر کھا لو اور مجھے تنہا چھوڑ دو۔" اس نے ڈوبتی سی آواز میں کہا اور تکیہ رخسار پر رکھ لیا۔ میں نے کمبل اس کی ٹانگوں پر ڈالا' کھڑکیوں کے پردے کھینچے اور کمرے سے نکلنے ہی لگا تھا کہ اس نے پکارا۔ "سنو"

میں پلٹ کر اس کے قریب گیا۔ اس نے رخسار سے تکیہ ہٹا لیا تھا اور تھکی تھکی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ "تم بہت سلجھے ہوئے نوجوان ہو منصور! مجھے محسوس

ہو رہا ہے کہ رفتہ رفتہ تم مجھے اور میرے درد کو سمجھ لو گے۔

مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے یہ دیکھ کر کہ مجھے مدہوش اور غمزدہ پا کر تم نے ہمدردی جتانے اور دلاسے دیتے دیتے میرے بستر میں گھسنے کی کوشش نہیں کی۔ اس سے پہلے میں نے جسے بھی روکا اس نے موقع پاتے ہی ایک ہی ساعت میں تمام مرحلے طے کرنے کی کوشش کی۔۔ ان کے خیال میں میرے انداز و اطوار کھلی دعوت کے اشارے تھے...... میں نے یکے بعد دیگرے انہیں رخصت کر دیا اور فلم انڈسٹری میں میں عیاش مشہور ہو گئی۔ ..... میں ..... میں عیاش نہیں ہوں منصور!" 0303636095

اس کے لہجے میں شدت آ گئی اور چہرہ یوں سرخ ہو گیا گویا میں نے ہی اس پر کوئی الزام لگایا ہو اور وہ اس کی تردید میں اپنا زور بیان صرف کرنا چاہتی ہو۔ "میں ..... مجھ میں عیاشی کی سکت ہی نہیں ہے۔ مجھ میں تو عشق کی سکت بھی نہیں ہے۔۔ مجھے اپنا آپ کھوکھلا کھوکھلا سا لگتا ہے اور عدم تحفظ کا احساس مجھے اور بھی ہولائے رکھتا ہے ..... اور .... اس لئے میں اب تک ایک مضبوط سہارے کی تلاش میں تھی.... ایک دوست جو مجھے دنیا والوں کی نظر سے نہ دیکھے۔ میری اپنی آنکھ سے دیکھے..... میرے خالی خالی دل میں پھنکاریں مارتے خوف کو نکال پھینکے..." اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے ابھر آئے تھے اور وہ اپنے سینے میں مچلتا سارا غبار بے ربط جملوں کی شکل میں اگل دینا چاہتی تھی۔

"وضاحتوں کی ضرورت نہیں۔" میں نے نرمی سے اس کا کاندھا تھپکا۔ "اب سو جاؤ اور ساری الجھنیں اور پریشانیاں ذہن سے جھٹک دو۔ گو یہ ممکن تو نہیں مگر کوشش ضرور کرو۔ فرض کر لو کہ میں ہی وہ شخص ہوں جس کی تمہیں تلاش تھی۔ رفتہ رفتہ شاید تمہیں یقین بھی آ جائے۔ اب بس سو جاؤ۔" میں نے اسے کروٹ دلائی۔

"مجھے یقین آتا جا رہا ہے۔" وہ بڑبڑائی اور آنکھیں بند کر کے خاموش ہو گئی۔ باہر نکلنے سے پیشتر میں نے دروازے کا جائزہ لیا اس کا پیتل کا تالا نہایت عمدہ اور آٹو میٹک تھا۔ اندر سے لیور دبانے سے کھل سکتا تھا جب کہ باہر سے اسے صرف چابی سے کھولا جا سکتا تھا کوئی ہینڈل وغیرہ نہیں تھا۔ میں نے کمرے پر الوداعی نظر ڈالی اور باہر آ کر دروازہ بند کر دیا۔ کلک کی ہلکی سی آواز کے ساتھ تالا بھی بند ہو گیا۔

اگلی صبح ڈائننگ روم میں ناشتے کی میز پر روپا سے سامنا ہوا۔ وہ گزشتہ روز کی نسبت کہیں زیادہ تر و تازہ اور ہشاش بشاش نظر آ رہی تھی۔ لیکن اس کی آنکھوں کے گرد ہلکے سیاہ حلقے تھے۔ یہ حلقے میرے اندازے کے مطابق خاصے پرانے تھے لیکن کل میک اپ کی تہہ میں مجھے نظر نہیں آئے تھے۔

"رات میں پھولوں آبشاروں اور تتلیوں کے خواب دیکھتی رہی۔" اس نے میز مگ میں کافی انڈیلتے ہوئے ایک معصومانہ سی مسرت کے ساتھ مجھے بتایا۔ "اس سے

مجھے ہمیشہ بڑے ڈراؤنے خواب آتے تھے۔"

"تم نے خواہ مخواہ اپنی ذات کو پیچیدہ اور اپنے مسائل کو گھمبیر بنا رکھا ہے۔" میں نے مگ اپنی طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔ "دنیا میں تم سے بھی کہیں زیادہ دکھی ان گنت لوگ پڑے ہیں جنہیں یہ سہولت بھی میسر نہیں کہ کسی کے سامنے لب کھول کر دل کا بوجھ ہلکا کر سکیں۔ اگر موازنہ کرنے بیٹھو تو لاکھوں انسانوں سے اپنے آپ کو آسودہ پاؤ گی۔"

"اپنی عمر سے بڑی بڑی باتیں نہ کیا کرو۔" اس نے گویا مجھے ڈانٹا مگر اس ڈانٹ میں پیار بھی تھا۔ شوخی بھی اور احساس تفاخر بھی۔ اس نے بالوں کی دو چوٹیاں بنا کر سینے پر ڈال رکھی تھیں۔ اس ہیر اسٹائل اور کچھ اس کی شگفتگی کی بدولت اس کی عمر کئی برس کم معلوم ہو رہی تھی۔

چند لمحے بعد کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے اس نے بتایا۔ "ابھی تھوڑی دیر بعد ٹیلر ماسٹر آکر تمہارا ناپ لے جائے گا اور تین چار روز میں ہی تمہارے چند سوٹ وغیرہ سل کر آجائیں گے۔" پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی۔ "میرے پاس اعشاریہ تین دو کا ریوالور ہے۔ وہ اپنے پاس رکھا کرو۔ اس کا لائسنس علی جان کے نام پر ہے لیکن تم بہرحال ضرورت پڑنے پر اُسے بلا خوف و خطر استعمال کر سکتے ہو۔ نتائج مجھ پر چھوڑ دینا۔ اس کے علاوہ تمہاری انیکسی کی ایک الماری میں شارٹ رینج رائفل بھی رکھی ہے۔ اس کا کوئی لائسنس وغیرہ نہیں ہے لیکن اس کے استعمال کے سلسلے میں بھی تمہیں قطعاً جھجکنے کی ضرورت نہیں۔"

اس نے ایک اور خادمہ جس کا نام وکیلہ تھا کو اشارہ کیا اور وہ اثبات میں سرہلا کر کمرے سے چلی گئی۔ چند لمحے بعد وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھوں میں ہولسٹر میں محفوظ ایک ریوالور تھا۔ میں اس وقت پتلون بش شرٹ میں ملبوس تھا میں نے ریوالور لوڈ کر کے بیلٹ میں اڑس لیا۔ کچھ فاضل گولیاں جیبوں میں ڈال لیں اور ہولسٹر خادمہ کو واپس کر دیا۔

"اسٹوڈیو میں مجھے زیادہ خطرہ محسوس نہیں ہوتا۔" روپا نے مگ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ "تاہم میں جس فلور پر بھی شوٹنگ کے لئے جاؤں تم یا تو سیٹ پر ہی موجود رہا کرو یا کم از کم فلور کے آس پاس ہی کہیں نہ کہیں موجود رہا کرو۔ میرے دل کو تقویت رہے گی۔" وہ میری طرف دیکھ کر ہولے سے مسکرائی۔ "بظاہر تمہاری حیثیت میرے مینیجر کی ہو گی کسی کو یہ علم نہ ہونے پائے کہ میری حفاظت تمہارے ذمے ہے۔"

میں نے خاموشی سے اس کی ہدایات سنیں۔ پھر ہم ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد درزی آگیا۔ اسے ناپ دے کر ہم اسٹوڈیو روانہ ہو گئے۔

اس روز میں کئی فلموں کے سیٹوں پر روپا کے ساتھ رہا۔ کوئی خاص واقعہ رونما نظر نہ آیا اور میرا زیادہ وقت بوریت میں گزرا۔ تاہم یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ ہر سیٹ پر

مختلف فلمسازوں وغیرہ کے دفتروں میں روپا نے میرا تعارف میری حیثیت کو خوب بڑھا چڑھا کر کرایا تھا۔ میرے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اعلیٰ نسب ہونے کا خصوصی ذکر کیا تھا اور تاثر یہی دیا تھا کہ میں نے اس کے نہایت اصرار پر اس کی ملازمت قبول کی ہے۔ خود اپنی ذات کے لئے روپا کا انکسار میرے لئے باعث حیرت تھا۔

ایک عام اور بے حیثیت عورت کو بھی اپنی ذات پر بڑا گھمنڈ ہوتا ہے اور اگر قدرت اسے کسی کو ملازم رکھنے کی توفیق دے دے تو اس میں رانیوں جیسی نخوت آجاتی ہے لیکن روپا فلمی دنیا میں اپنے تمامتر مرتبے کے باوجود بے حد منکسر المزاج تھی اور اس کی یہی خصوصیت مجھے اس کے ساتھ وابستہ رکھ سکتی تھی۔ اس کا یہ انداز مصلحت تھا یا عادت بہرحال اس سے مجھے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ ہر شخص مجھ سے نہایت احترام سے پیش آیا۔ دن بھر اسٹوڈیوز میں میں جہاں جہاں بھی رہا میری آنکھیں طبلہ کی تلاش میں مصروف رہیں لیکن حیرت کی بات تھی کہ وہ مجھے کہیں نظر نہ آیا۔

نائٹ شفٹ میں روپا کام نہیں کرتی تھی۔ سات بجے کے بعد کا وقت وہ کسی فلمساز کو نہیں دیتی تھی اور سیدھی گھر آتی تھی۔ دن بھر وہ بلا تکان کام کرتی تھی اور اگر پانچ منٹ کے لئے بھی ستانے کا موقع میسر نہ آیا تب بھی قطعاً پروا نہیں کرتی تھی۔ تین چار دن میں مجھے اس کے معمولات اور عادات کو سمجھنے کا اچھی طرح موقع ملا۔ پانچویں دن اس کی دو فلموں کی بیک وقت آؤٹ ڈور شوٹنگ شروع ہو گئی۔

ایک فلم کے لئے ہمیں بمبئی کے ایک نواحی علاقے میں جانا پڑتا تھا جہاں خشک ریتیلا میدان اور بے آب و گیاہ ٹیلے میسر تھے اور دوسری فلم کے لئے ہمیں ماہم کریک کے ایک خطرناک حصے میں جانا پڑتا تھا۔

مصروفیت بہت زیادہ بڑھ گئی اور ساتھ ہی میری ذمے داری بھی۔ ان دونوں علاقوں میں آؤٹ ڈور شوٹنگ کے دوران مطلوبہ حصے کے گرد خار دار تاریں لگائی جاتی تھیں مگر ارد گرد سے آنے والے سینکڑوں افراد شوٹنگ دیکھنے کے لئے آ جمع ہوتے۔ ان میں زیادہ تعداد ملاحوں اور مزدوروں کی ہوتی تھی اور ان میں سے بہت کم لوگ یونٹ کے منتظمین کی ہدایت کی پروا کرتے تھے۔ روپا کے دشمن اس ہجوم میں شامل ہو کر اگر کچھ کر گزرتے تو ان کا سراغ لگانا بے حد مشکل ہوتا۔ مجھے ہمہ وقت روپا پر نظر رکھنا پڑتی۔

اسی ایڈونچر نما مصروفیت میں پندرہ دن گزر گئے۔ اس دوران ایک ہدایت کار وجے میرا گہرا دوست بن گیا۔ وہ ایک زندہ دل نوجوان تھا اور حال ہی میں اس کی دو فلمیں اوپر تلے باکس آفس پر ہٹ ہوئی تھیں جنہوں نے اس کے لئے کامیابیوں کے دروازے کھول دیئے تھے۔ آؤٹ ڈور شوٹنگ کے دوران فرصت ملتے ہی وہ اکثر مجھے کھینچ کر اپنے ٹینٹ میں لے جاتا بوتل کھول کر بیٹھ جاتا اور بے تحاشا باتیں کرتا۔

مجھے اس کی ایک خصوصیت پسند تھی کہ زندگی کے بارے میں اس کا مشاہدہ بے پناہ تیز تھا اور اس کم عمری ہی میں اس نے اپنے سینے میں جگر خراش تجربات کا خزینہ جمع کر رکھا تھا۔ اب یوں لگتا تھا گویا وہ ان گنت کامیابیوں کے جھرمٹ میں گھر کر زمانے سے اپنی تمام گزشتہ ناکامیوں' تلخیوں اور تشنگی کا انتقام لے رہا ہے۔ ضرورت سے زیادہ خود اعتماد ہو گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اسے زوال بھی جلد ہی آئے گا۔ دوڑتے دوڑتے اوندھے منہ گرے گا۔ اسے خود بھی اس حقیقت کا ادراک تھا مگر وہ پروا نہیں کرتا تھا۔ کہتا تھا کہ عروج خواہ ایک دن کا ہو اس میں اپنی تمام حسرتیں پوری کر لینی چاہئیں۔ بہرحال اپنی تمام تر خامیوں سے قطع نظر وہ دوست بہت اچھا تھا۔

آؤٹ ڈور شوٹنگوں سے فارغ ہو کر دو دن تک روپا اسٹوڈیو نہیں گئی۔ دوسرے دن مجھے طبلہ سے ملنے کی خواہش نے بیقرار کیا۔ روپا نے صبح ہی بتا دیا تھا کہ وہ اسٹوڈیو نہیں جائے گی۔ میں نے اس سے دو تین گھنٹے کے لئے اجازت طلب کی۔ وہ لان پر بیٹھی تھی۔

"اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے منصور!" وہ مسکرائی۔ "تم مرضی کے مالک ہو۔ تاہم جلدی آنے کی کوشش کرنا۔ تم ادھر ادھر ہوتے ہو تو مجھے بے اطمینانی سی رہتی ہے۔"

کار کی چابیاں میرے ہی پاس تھیں۔ میں اٹھنے لگا تو جیسے اسے کچھ یاد آگیا۔ "ذرا یہیں ٹھہرو۔" اس نے کہا اور اٹھ کر اندر چلی گئی۔ چند لمحے بعد واپس آئی تو ہینڈ بیگ اس کے ہاتھ میں تھا کچھ نوٹ نکال کر اس نے گن کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ چار ہزار رکھ لو۔ شاید تمہیں ضرورت پڑ جائے"

"فی الحال تو مجھے ضرورت نہیں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "جب ہو گی تو مانگ لوں گا۔"

"میں کہتی ہوں رکھ لو۔" اس نے ڈانٹنے کے سے انداز میں کہا۔

"ہاں ...... مجھے یاد آیا۔" میں نے کچھ چونک کر کہا۔ "ایک دوست کے لئے مجھے شاید ان کی ضرورت پڑ جائے۔" میں نے نوٹ لے کر کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لئے۔ میرا ہاتھ ریوالور سے مس ہوا جسے اب میں بغلی ہولسٹر میں رکھنے لگا تھا۔ آؤٹ ڈور شوٹنگوں کے دوران میں نے ریوالور کو ہولسٹر سے نکالنے اور نشانہ لگانے کی اتنی مشق کر لی تھی کہ اب میں پلک جھپکتے میں یہ عمل دہرا سکتا تھا۔

"آورش نگر پہنچنے کے لئے مجھے صرف ایک جگہ راستہ پوچھنا پڑا۔ کچھ دیر بعد میں نے اس تنگ سی گلی میں گاڑی روکی اور اتر کر پیدل آگے بڑھا۔ ہوٹل والے ملباری نے بڑے سے دیگچے سے سالن نکالتے نکالتے حیرت سے میری طرف دیکھا پھر سر جھٹک کر دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

طبلہ کی کھولی کا دروازہ کھلا ہی تھا۔ میں سیدھا اندر چلا گیا۔ وہ رضائی لئے جھلنگا سی

چارپائی پر دراز تھا۔ میری آہٹ سن کر اس نے آنکھیں کھولیں۔ کمزور تو وہ پہلے ہی تھا' اب کچھ زیادہ ہی نحیف نظر آرہا تھا۔

"آؤ میرے یار؟ تم نے تو عیش و عشرت میں ہمیں بھلا ہی دیا۔" اس نے رضائی پھینک کر لیٹے ہی لیٹے دونوں بازو پھیلائے۔ میں نے اس کی گردن کے نیچے ہاتھ ڈال کر کچھ اوپر اٹھا کر اسے سینے سے لگایا۔

"تم کس غم میں اپنی ارتھی سجائے پڑے ہو؟" میں نے اس کے قریب بیٹھ کر تاریک شیشوں کی عینک اتارتے ہوئے پوچھا۔

"تین دن سے طبیعت کچھ خراب ہے یار!" اس نے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اس سے پہلے اسٹوڈیو میں کئی مرتبہ تمہارا پتہ کیا۔ معلوم ہوا کہ تم آؤٹ ڈور شوٹنگوں میں روپا کے ساتھ ہی مصروف ہو۔" پھر وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "پہلے میں چائے کا آرڈر دے آؤں۔ پھر باتیں ہوں گی۔"

"تم بیٹھے رہو۔ میں خود کہہ آتا ہوں۔" میں نے اسے روکا۔

"نہیں ۔ آج میری طبیعت بہت بہتر ہے بلکہ میں تو اسٹوڈیو جانے کا بھی ارادہ کر رہا تھا۔" اس نے ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر وہ چونکا اور پلٹ کر مسکراتے ہوئے بولا۔ "ملباری کی سڑی ہوئی چائے پی لو گے؟"

"جاتے ہو یا دھپ رسید کروں؟" میں نے فرش پر پاؤں مار کر کہا۔ وہ ہنستا ہوا باہر چلا گیا۔

چائے کے دوران ہم ایک دوسرے کو اپنی اپنی مصروفیات کا احوال سناتے رہے۔ پھر میں نے دو ہزار کے نوٹ نکال کر اس کی گود میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "یار طبلہ! میں چاہتا ہوں تم اس کھولی کو چھوڑ کر کسی اچھی جگہ منتقل ہو جاؤ۔"

وہ یک لخت سنجیدہ ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں گہری سرد مہری عود آئی۔ "اس قسم کی حماقتوں کی ضرورت نہیں منصور ڈیئر!" اس نے اجنبی سے لہجے میں کہا۔ "ان امدادی کارروائیوں کے بغیر بھی میں تمہارا دوست ہی رہوں گا۔"

"لیکن انہیں قبول کر لینے میں تمہیں کیا تکلیف ہے؟" میں نے خفگی سے کہا۔ وہ جواباً" خاموش رہا تو میں نے اس کا کندھا پکڑ کر ہلایا۔ "بولو نا!"

"سچ کہہ دوں ۔ مارو گے تو نہیں؟" اس نے بدستور سنجیدگی سے کہا۔

"مرے ہوئے کو کیا مارنا۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ کی رمق تک نہ ابھری اس نے عجیب سی نظروں سے میرا سرتاپا جائزہ لیا۔ میرے نئے سوٹ کو دیکھا چمکتے جوتوں پر نظر ڈالی اور مدھم لہجے میں کہا۔ "منصور! تم مجھے اس وقت مرد طوائف لگ رہے ہو۔ تمہاری کمائی کھانے کو میرا دل نہیں مان رہا۔"

ایک شعلہ سا میری کنپٹیوں سے ابھرا اور پیروں کے ٹخنوں تک لپک گیا۔ میں نے بمشکل اپنے آپ پر قابو رکھا۔ اگر میں اسے ایک ہاتھ بھی مار دیتا تو اس کی گردن ٹوٹ جاتی۔ چند لمحے بعد بمشکل میرے حلق سے آواز نکلی۔ "ہماری فرسودہ سوسائٹی میں عورتوں کے متعلق افسانے تراشنے کا رواج بڑا پرانا ہے لیکن مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی کہ مجھ سے ضروری تفصیل پوچھے بغیر تم روپا کے اور میرے تعلق کے بارے میں اتنی بڑی بات کہہ دو گے۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ اس کے ساتھ میرے شب و روز کس طرح گزرے ہیں۔ پھر خود ہی فیصلہ کرنا کہ میں اس کے لیے کیا ہوں۔ میں تو کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔"

پھر میں نے اسے روپا کے ساتھ گزرے ہوئے دنوں کے ایک ایک لمحے کی تفصیل کم و کاست سنا دی جس میں کہیں رنگین راتوں اور مہکتی خلوتوں کا ذکر نہیں تھا۔ "لیکن تمہاری تسلی کے لئے بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں کہ یہ سب کچھ لفظ بہ لفظ سچ ہے۔"

"مجھے اعتبار آیا اور میں تم سے معافی مانگتا ہوں۔" اس نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ "میں اپنے جاہلانہ تبصرے پر سخت شرمندہ ہوں۔ میں تمہارے دیئے ہوئے یہ پیسے اپنے لئے دوستی کا اعزاز سمجھ کر رکھ رہا ہوں لیکن رہوں گا میں اسی کھولی میں۔"

"کیوں۔" میں نے پوچھا۔ میرے دل سے غصے کا غبار چھٹ گیا تھا۔

"میں تمہارے کہنے پر اچھی جگہ منتقل ہو جاؤں۔ جب تک تم یہاں ہو مجھے عیاشیاں کراتے رہو گے لیکن تمہارا کیا بھروسہ؟ تم مجھے سیلانی سے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ کل کلاں کو کہیں چلے گئے تو مجھے عرش سے فرش پر آنے میں بڑی تکلیف ہو گی۔ نہ بابا۔" اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ "میں اس کھولی میں رہ کر جتنا جی چاہے معیار زندگی بلند کر لوں گا لیکن رہوں گا یہیں۔ اس کا کرایہ چالیس روپے ماہوار ہے جو میں برے وقت میں بھی آسانی سے دے سکتا ہوں۔"

اس کی بات میرے دل کو لگی۔ میں نے مزید اسرار نہیں کیا۔ پیسے اس نے رکھ لئے۔ کچھ دیر گپ شپ کے بعد میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ گاڑی تک مجھے چھوڑنے آیا۔

اگلے دن شام کو اسٹوڈیو میں میں روپا کو شوٹنگ میں مصروف چھوڑ کر وجے کے دفتر میں آبیٹھا جو اس فلور سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا جہاں روپا کام کر رہی تھی۔ وجے جوتے اتارے دونوں ٹانگیں میز پر رکھے ریوالونگ چیئر پر نیم دراز تھا اور سہگل کا وہ گانا گنگنا رہا جو کبھی بے حد مقبول تھا۔

غم دیئے مستقل کتنا نازک ہے دل' یہ نہ جانا

وجے کی یہ خاص عادت تھی جب بہت خوش ہوتا تھا تو المیہ گانے گاتا تھا۔

"بڑے خوش نظر آرہے ہو۔" میں نے صوفے پر ڈھیر ہوتے ہوئے کہا۔ "آوٹ ڈور

کی تھکن اتر گئی کیا؟"

"ہاں۔ آتے ہی اتر گئی تھی۔" اس نے دونوں ہاتھ گدی کے پیچھے رکھ کر کچھ اور پھیلتے ہوئے کہا۔ "کل ہیروئن بننے کی امیدوار ایک لڑکی آئی تھی اور معلوم ہے اسے لے کر کون آیا تھا؟ اس کا بھائی!" وجے دونوں پاؤں میز سے اتار کر اچانک سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ "یار! کبھی کبھی مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے گو کہ یہ تماشا میرے لئے نیا نہیں رہا..... کہ شہرت دولت اور آسائشوں کی طلب انسان کو کتنا بے غیرت بنا دیتی ہے۔ میں نے لڑکی کے بھائی کو سگریٹ لینے بھیج دیا اور وہ بھلا مانس میرا مطلب سمجھ کر پورے ایک گھنٹے میں سگریٹ لے کر واپس آیا۔ اس دوران میں نے پیچھے ریٹائرنگ روم میں نہایت اطمینان سے لڑکی کا اسکرین ٹسٹ لیا۔"

"پھر تو وہ بھلا مانس پہلے ہی سے تربیت یافتہ بے غیرت ہو گا۔ شہرت اور دولت کے لالچ میں نیا نیا بے غیرت نہیں بنا ہو گا۔" میں نے کہا تم نے انہیں جواب کیا دیا؟"

"یہی کہ ابھی میں کچھ فیصلہ نہیں کر سکتا۔ کل پھر آنا۔" وجے نے جواب دیا۔ "آج وہ پھر آئیں گے بلکہ آنے والے ہیں۔ یار! جب وہ آئیں تو براہ مہربانی تم بھی رخصت ہو جانا۔" اس نے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔

"میں ابھی چلا جاتا ہوں۔ میں نے مسکرا کر کہا۔

"نہیں ..... نہیں۔" اس نے میرا ہاتھ پکڑا۔ "مستقبل کی ہیروئن کے درشن کر کے جانا۔" پھر وہ قدرے سنجیدگی سے بولا۔ "یار! ویسے سچی بات یہ ہے کہ لڑکی میں ہیروئن بننے کے گنس ہیں کل سے یہی سوچ رہا ہوں کہ ..... " چپراسی کو اندر آتے دیکھ کر وہ خاموش ہو گیا۔ چپراسی نے ایک چٹ اس کے سامنے رکھ دی۔

"بھیج دو۔" وجے نے چٹ پر نظر ڈال کر کہا اور ٹائی کی گرہ درست کر کے بیٹھ گیا۔ چند لمحے بعد پھولے پھولے سے گالوں والی ایک لڑکی ایک لمبے تڑنگے نوجوان کے ساتھ دفتر میں داخل ہوئی۔ انہیں دیکھتے ہی مجھے بجلی کا شاک سا لگا اور میں اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ شوبھا اور سریندر تھے۔

انہوں نے مجھے نہیں پہچانا تھا۔ سریندر نے تو خیر اس رات میری شکل ہی نہیں دیکھی تھی جب میں نے اسے بے ہوش کیا تھا۔ شوبھا اس لئے نہیں پہچان پائی تھی کہ اب میرے چہرے پر فرنچ کٹ داڑھی تھی اور آنکھوں پر تاریک شیشوں کی عینک تھی۔ انہوں نے قدرے ٹھٹھک کر میری طرف دیکھا اور وجے کا اشارہ پا کر اس کے سامنے بیٹھ گئے۔

اس سے پہلے کہ وجے ان سے بات شروع کرتا میں ان کے سامنے میز پر جھک گیا۔ ایک ہاتھ میز پر ٹکا کر دوسرے ہاتھ سے عینک اتار کر میں نے براہ راست شوبھا کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "مجھے پہچانتی ہو شوبھا؟"

اس نے قدرے پیچھے کو ہٹ کر سہمی سہمی سی نظروں سے مجھے دیکھا پھر ہچکچاہٹ آمیز انداز سے اثبات میں سر ہلایا۔ "مجھے وہ بلیزر چاہیے جو اس رات میں تمہارے کمرے میں بھول گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "اس ڈائری سمیت جو اس میں موجود تھی۔"

"ان دونوں چیزوں کے متعلق اس سے پوچھو۔ مجھے کوئی علم نہیں۔" شوبھا نے اپنے بھائی کی طرف اشارہ کیا۔

تم وہی ہو جس نے اس رات کپڑوں کی الماری سے مجھے گھونسا مارا تھا؟"
سریندر بول اٹھا۔

"ہاں۔ میں وہی ہوں۔" میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ "اور اگر تم نے وہ ڈائری مجھے واپس نہ کی تو میں تمہیں ایک اور گھونسا ماروں گا اور وہ تمہاری زندگی کی آخری چوٹ ہو گی۔"

"ناراض ہونے کی ضرورت نہیں بابو جی!" سریندر نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ "آپ وجے بابو کے دوست ہیں تو ہمارے بھی دوست ہیں۔ وہ ڈائری اس وقت بھی میرے پاس موجود ہے۔ اس میں ڈھیر سارے ورقوں پر تو اردو میں لکھا ہوا تھا۔ اردو مجھے پڑھنا نہیں آتی لیکن میں نے ڈائری کو اس لئے اپنے پاس رکھا ہوا ہے کہ اس میں کافی ورق خالی تھے۔ ان پر میں اپنا اور شوبھا کا خرچ پانی کا حساب کتاب لکھتا ہوں۔ بہرحال ڈائری تمہاری امانت ہے۔ ابھی لے لو کوٹ میرے گھر پڑا ہے۔ کہو تو ابھی لا دوں اور کہو تو کل یہیں پہنچا دوں۔" اس نے اپنی واسکٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا۔

"کوٹ کو گولی مارو۔ ڈائری نکالو۔" میں نے بیتابی سے کہا۔

جس وقت میں نے ڈائری اس کے ہاتھ سے لی میرا دل اس شدت سے دھڑک رہا تھا جیسے ابھی سینے سے باہر آجائے گا۔ ڈائری جیب میں رکھ کر میں وجے کی طرف مڑا جو دم بخود بیٹھا تھا۔

"وجے! اس لڑکی کے لئے میری بھرپور سفارش ہے۔" میں نے شوبھا کی طرف اشارہ کیا۔ "ہو سکے تو اسے کچھ نہ کچھ بنانے کی کوشش ضرور کرنا۔ بے وقوف بنانے کے علاوہ!"

وجے کو کچھ کہنے کا موقع دیئے بغیر میں اس کے دفتر سے نکل آیا۔ روپا مجھے برآمدے میں ملی۔ وہ لباس تبدیل کرنے جا رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ اگلے سین کی شوٹنگ ملتوی ہو گئی ہے کیونکہ ہیرو صاحب ابھی تک نہیں پہنچے۔

گھر پہنچتے پہنچتے ہمیں نو بج گئے۔ راستے میں روپا کو تین تقسیم کاروں کی دفتروں سے اپنے معاوضے کی قسطوں کے چیک لینے تھے۔ ان دفتروں میں ادھر ادھر کی باتوں میں خاصی دیر لگ گئی۔ گھر پہنچتے ہی ہم کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ دوسری ایکٹریسوں کے برعکس روپا سیٹ پر پروڈیوسروں کی طرف سے منگایا گیا کھانا نہیں کھاتی تھی خواہ وہ کتنے ہی اعلیٰ ہوٹل سے

کیوں نہ منگوایا جاتا۔

آج اسے کام کم کرنا پڑا تھا اس لئے خاصی تازہ دم نظر آ رہی تھی۔ کھانے کی میز پر ہی بیٹھے بیٹھے کافی دیر تک باتیں کرتی رہی۔ آج میرا اس کی باتوں میں دھیان بہت کم تھا۔ مجھے بار بار جیب میں رکھی ڈائری کا خیال آ رہا تھا۔ میں جلد از جلد اپنے بیڈ روم میں جا کر اس کا مطالعہ کرنا چاہتا تھا۔ تقریباً گیارہ بجے روپا نے جمائی لی اور بغور میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "اب سونا چاہیے۔ تم بھی کچھ گم صم سے نظر آ رہے ہو۔"

"دراصل میں ..... کچھ خطوط لکھنا چاہتا ہوں۔ دن میں تو وقت نہیں ملتا۔" میں نے بہانہ کیا۔ "خطوط پر یاد آیا کہ ہیما بھی دو دن سے نہیں آ رہی۔ کافی جواب طلب خطوط جمع ہو گئے ہیں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ہیما اس کی سیکرٹری تھی۔ اگر وہ کل بھی نہ آئی تو کچھ اہم خطوط کے جواب لکھ دینا پلیز!"

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور گویا قید سے چھوٹ کر انیکسی کی طرف بھاگا۔ بیڈ روم میں پہنچ کر میں نے کپڑے بدلے۔ ریوالور سرہانے رکھا اور بیڈ لیمپ جلا کر لیٹ گیا۔ جس ڈائری کے کھو جانے کا مجھے اتنا قلق تھا اب اسے کھولتے ہوئے نہ جانے کیوں خوف آ رہا تھا۔ کافی دیر تک میں اسے دونوں ہاتھوں میں تھامے بے حس و حرکت لیٹا رہا پھر آہستگی سے اسے کھولا۔

دفعتہً ٹیلیفون کی گھنٹی سن کر میں یوں اچھل پڑا گویا میرے قریب ہی بم پھٹا ہو۔ یک لخت جھنجھلاتے ہوئے اعصاب پر قابو پا کر میں نے ڈائری سرہانے رکھی اور کہنی کے بل اٹھ کر ریسیور اٹھایا۔

"منصور ..... !" روپا کی سرگوشی نے مجھے چونکا دیا۔ "کوئی میرے بیڈ روم کی کھڑکی توڑنے کی کوشش کر رہا ہے..... جلدی آؤ..... جلدی....." اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔



میں نے ڈائری تکیے کے نیچے رکھی اور ریوالور لے کر روپا کی خوابگاہ کی طرف دوڑا۔ سیڑھیاں عبور کرکے میں ٹیرس پر پہنچا تو چست' سیاہ اور چمڑے کی جیکٹ میں ملبوس ایک شخص دروازے کے تالے پر جھکا نظر آیا۔ میری طرف اس کی پشت تھی۔ میں دبے قدموں اس کے قریب پہنچا۔ وہ پیچ کش نما ایک آلے سے تالا کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں اس کی کنپٹی پر ریوالور کا دستہ رسید کرنے ہی لگا تھا کہ اسے غالبا" میری موجودگی کا احساس ہوگیا۔ اپنے اوزار کو تالے ہی میں پھنسا چھوڑ کر وہ بجلی کی سی تیزی سے پلٹا اور ایک ہاتھ سے اس نے میرے پیٹ میں گھونسا رسید کیا۔ گھونسا کیا لوہے کا ایک وزنی ہتھوڑا تھا جس نے پیٹ میں گویا میری آنتوں کو کچل کر رکھ دیا۔ ابکائی لے کر میں لڑکھڑایا۔

دھندلاتی نظروں سے میں نے دیکھا اس شخص کے آدھے چہرے پر نقاب تھی۔ تنگ پیشانی کے نیچے اس کی غیر معمولی طور پر گول گول آنکھیں نہایت بھیانک لگ رہی تھیں اور اس سے بھی بھیانک وہ مشین پسٹل تھا جو اس کے دوسرے ہاتھ میں تھا۔ یوگا کی ایک مش ے کام لیتے ہوئے میں سانس روک کر سنبھل گیا لیکن اس سے پہلے کہ میں فائر کرسکتا اس نے مشین پسٹل سے ایک برسٹ مارا۔

میری قسمت اچھی تھی کہ ابھی میں سیدھا نہیں ہوپایا تھا ورنہ گولیوں کی بوچھاڑ سے شاید میرا اوپری دھڑ جسم سے علیحدہ ہو جاتا۔ مشین پسٹل سے "ٹرٹ ٹررٹ" کی نہایت ہلکی سی آواز برآمد ہوئی تھی۔ غالبا" اس پر سائیلنسر لگا ہوا تھا۔ یہ گن بھی نہایت جدید تھی لیکن نقاب پوش بھی نہایت اعلیٰ تربیت یافتہ گوریلا معلوم ہوتا تھا۔ اس کے مقابلے میں معمولی چوک سے بھی میرے پرخچے اڑ سکتے تھے۔ موت کے خوف سے تو میں ناآشنا تھا لیکن انسانی جبلت میں جان کی حفاظت کا جو احساس کار فرما ہوتا ہے اس نے میری تمام خفیہ صلاحیتوں اور طاقتوں کو بیدار کردیا۔

قلابازی کھا کر میں نے اس کی ٹھوڑی کے نیچے ٹھوکر رسید کی اور سیدھا ہوتے ہوئے اس کی کلائی پر کراٹے کا ایک ہاتھ رسید کیا۔ مشین پسٹل سے دوسرا برسٹ مارا لیکن اس کے ساتھ ہی پسٹل اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ گولیوں کی بوچھاڑ کا رخ نیچے رہا۔ پختہ فرش سے سیمنٹ کے ان گنت ٹکڑے اکھڑ کر ہوا میں بکھر گئے۔

نقاب پوش کا بازو بے جان ہوکر جھول گیا تھا۔ میں نے فورا" ہی دوسری ٹھوکر اس کی ناف کے نیچے رسید کی۔ یہ ضرب اس کے لئے ناقابل برداشت تھی وہ زخمی اونٹ کی طرح بلبلایا اور دیوار سے جا ٹکرایا۔ میں نے دھپ سے اسے فرش پر گرتے دیکھا۔ عین اسی وقت کوئی چمکیلی سی چیز سنسناتی ہوئی میرے کان کے قریب سے گزری اور دروازے کی چوکھٹ میں پیوست ہوگئی۔

پلٹ کر دیکھے بغیر بھی مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ ایک خنجر تھا۔ یہ خنجر ایک دوسرے نقاب پوش نے پھینکا تھا جو کمرے کی پرلی دیوار سے نمودار ہوا تھا۔ وہ غالبا" اس طرف کھڑکی کھولنے میں مصروف عمل تھا اور جھڑپ کی آواز سن کر ادھر آیا تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ میں لوہے کی تقریبا" دو فٹ لمبی ایک سلاخ اب بھی موجود تھی۔

خونخوار چیتے کی طرح اس نے مجھ پر زقند لگائی اور ساتھ ہی سلاخ اس تیزی سے گھمائی کہ اس کی ضرب شاید پتھر کی سل کو بھی دو ٹکڑے کر دیتی مگر میں اس کے ہدف سے ہٹ چکا تھا۔ وہ گھٹنوں کے بل گرا اور اس سے پہلے کہ وہ سنبھل سکتا میری لات اس کی پشت پر پڑی اور وہ قلابازی کھا گیا۔ وہ ٹیرس کی ریلنگ کے قریب پہنچ چکا تھا۔

دوسرے ہی لمحے وہ اٹھا اور ریلنگ سے نیچے کود گیا۔ اس کے ساتھ ہی دوسرا نقاب پوش بھی فرش سے اچھلا اور زقند لگا کر ریلنگ سے کود گیا۔ اب تک میری کوشش نجانے کیوں یہی رہی تھی کہ مجھے فائر نہ کرنا پڑے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اعشاریہ تین دو کا جو پرانی ساخت کا ریوالور میرے پاس تھا۔ توپ کی طرح گرجتا تھا۔ لیکن اب چھلانگ لگا کر میں ریلنگ تک پہنچا۔

لان پر کچھ دور تک ہلکی روشنی تھی۔ اس روشنی میں میں نے دو سایوں کو آگے پیچھے دوڑتے دیکھا میں نے اندھا دھند چار فائر کیے لیکن دونوں سایوں کی رفتار میں کوئی فرق نہ آیا۔ پھر وہ اندھیرے کے شکم میں اتر گئے۔ چند لمحے بعد میں نے ان میں سے ایک سائے کو لان کی عقبی دیوار پر نمودار ہوتے دیکھا۔ میں نے ایک اور فائر کیا لیکن وہ سایہ بروقت جھک گیا۔

میں نے دیکھا وہ اپنے ساتھی کو سہارا دے کر دیوار پر چڑھا رہا تھا اپنے ساتھی کو دیوار پر چڑھاتے ہی وہ خود دیوار کی دوسری طرف کود گیا۔ دوسرا بھی کودنے ہی لگا تھا کہ میں نے ایک فائر اور کیا۔ گولی غالبا" اس کی ٹانگ میں لگی تھی۔ وہ کودنے کی بجائے بے جان سے انداز میں دوسری طرف لڑھک گیا۔ پھر میں نے انہیں گرتے پڑتے سڑک پار کرتے دیکھا۔ دوسری طرف تاریکی میں غالبا" کوئی گاڑی کھڑی تھی۔ میں نے ایک بار پھر ٹریگر دبایا لیکن ریوالور سے محض "کلک" کی آواز برآمد ہوئی۔ ریوالور خالی ہوچکا تھا۔

میرے عقب میں ایک دھماکا ہوا۔ میں نے ہڑبڑا کر مڑ کے دیکھا۔ کوٹھی کا چوکیدار

اشفاق خان بوکھلاہٹ کے عالم میں سیڑھیاں چڑھتا آرہا تھا اور اس نے اپنی رائفل سے ہوائی فائر کیا تھا۔

"کیا ہوا کدھر گیا۔ کون تھا صاحب جی؟" اس نے میرے قریب پہنچ کر ہانپتے ہوئے پوچھا اور جواب کا انتظار کئے بغیر دوسرا فائر کرنے لگا تھا کہ میں نے اسے روک دیا۔

"کچھ نہیں ہوا۔" میں نے ریوالور جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ "تم گیٹ پر ہی رہو ..... اور چوکس رہنا۔"

وہ متوحش نظر سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا واپس چلا گیا۔ میں نے خواب گاہ کے دروازے پر دستک دی۔ "کون؟" فوراً ہی دروازے کے عقب سے اس کی مدھم اور لرزتی سی آواز سنائی دی۔

"منصور۔" میں نے جواب دیا۔ "دروازہ کھولو۔ خطرہ ٹل گیا ہے۔"

روپا نے ایک گہری سانس لی جس کا ہنکارہ مجھے باہر بھی سنائی دیا۔ پھر کلک کی آواز کے ساتھ دروازہ کھل گیا۔ روپا ایک ہاتھ سے پیٹ تھامے میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ہلکے سے خوف کی پرچھائیاں تھیں۔ زلفوں کی بے ترتیب شام رخساروں اور کندھوں پر سایہ فگن تھی۔

بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے اس نے انہیں پشت پر پھینکا اور ہموار لہجے میں بولی۔ "کتنے تھے وہ؟"

"دو۔" میں نے جواب دیا۔ "دونوں فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے مگر ان کے ہتھیار یہیں رہ گئے۔ وہ دروازے کی چوکھٹ سے باہر آئی۔ پھر اس نے چوکھٹ میں پیوست خنجر اور ٹیرس پر پڑا مشین پسٹل دیکھا۔

"بڑی عمدہ چیز ہے۔" میں نے مشین پسٹل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس پر سائیلنسر بھی لگا ہوا ہے۔"

"اگر تمہیں پسند ہے تو رکھ لو۔" وہ یوں شفقت سے مسکرائی گویا میں ایک بچہ تھا اور وہ مجھے کھلونے دلوانے بازار لائی تھی۔

"پولیس کو اس کے متعلق بتانا تو ضروری نہیں!" اس نے جھک کر مشین پسٹل اٹھایا۔ الٹ پلٹ کر دیکھا اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے خوابگاہ میں لے آئی۔

سنگھار میز کی دراز کھول کر اس نے پسٹل رکھا اور دروازہ بند کرتے ہوئے بولی۔ "صبح مجھ سے لے لینا۔"

پھر اس نے پلٹ کر اچانک مجھے بستر پر دھکا دیا اور میری بانہوں میں آگئی۔ "منصور! میرے پیارے ... میرے دوست۔" وہ بے ترتیب سانسوں کے درمیان گھٹے گھٹے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ "تم نہ ہوتے تو آج نہ جانے کیا ہوتا ...... منصور مجھے کبھی چھوڑ کر نہ جانا

..... کوئی تو ہو جو زندگی بھر میرا ساتھ نبھائے۔ مجھے بھیڑیوں سے بچائے۔"

دفعتہً باہر سیڑھیوں پر جوتوں کی دھپ دھپ سنائی دی۔ روپا اپنے وجود کے آتش نشاں کو سمیٹ کر ہٹی۔ میں بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ آنے والا اشفاق خان تھا۔ ٹیرس پر دور ہی رک کر ہماری نظروں سے اوجھل رہتے ہوئے اس نے پکارا "بی بی جی۔ بی بی جی۔"

"کیا بات ہے؟" روپا نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بہ آواز بلند کہا۔ اس کے پیچھے پیچھے میں بھی دروازے پر پہنچا۔

"وہ جی پولیس کی جیپ آئی ہے۔" اشفاق نے بتایا۔ "گشت کے دوران انہوں نے فائرنگ کی آوازیں سنی تھیں۔ وہ پوچھ رہے ہیں۔ "کیا چکر ہے؟"

"انہیں یہیں لے کر آؤ تاکہ چکر کے آثار وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔" روپا نے کہا۔

03036360959

کچھ دیر بعد چار پولیس والے یوں بندوقیں سنبھالے اوپر آئے۔ گویا میدان جنگ میں انہیں زبردستی کسی مورچے سے باہر دھکیلا گیا ہو۔ ان میں ایک انسپکٹر تھا جو تینوں کانسٹیبلوں سے پیچھے رہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ مجھے اور روپا کو اطمینان سے ٹیرس پر کھڑے دیکھ کر ان کی جان میں جان آئی۔ انہوں نے بندوقیں جھکالیں اور انسپکٹر صاحب سینہ قدرے تان کر مسکراتے ہوئے آگے آئے۔

"نمستے روپا جی" اس نے ریوالور ہولسٹر میں رکھ کر دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ "یہ کیا چکر تھا ..... فائرنگ وغیرہ ....."

"وہی پرانا چکر ہے بسواس جی۔" روپا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ..... "البتہ اب آپ کی راجدھانی میں ان کی ہمت اتنی بڑھ گئی ہے کہ آج گھر پر بھی چڑھائی کر دی۔"

پھر روپا نے انہیں ٹیرس کے ایک گوشے میں پڑی کرسیوں پر بٹھایا اور تمام واقعہ سنایا جو نہایت مختصر تھا۔ "..... پھر یہ میرے مینجر صاحب آپہنچے۔" آخر میں روپا نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اور وہ دونوں نقاب پوش بھاگ گئے۔ فائر انہوں نے ہی کئے تھے۔"

انسپکٹر ایک ڈائری میں سب کچھ لکھتا رہا۔ روپا کے خاموش ہونے کے بعد اس نے اٹھ کر جائے واردات کا معائنہ کیا۔ پھر ایک کانسٹیبل کو نقشہ تیار کرنے کو کہا جس نے کافی دیر تک شرقاً غرباً کی گردان کرنے کے بعد بالآخر ایک کاغذ پر کچھ دائرے اور چند آڑی ترچھی لکیریں کھینچ لیں۔ پھر وہ لوگ میرے ساتھ لان اور سڑک پر بھی آئے۔

جہاں جہاں میں نے نقاب پوشوں کو دوڑتے دیکھا تھا وہاں سڑک پر ہمیں خون کے دھبے بھی دکھائی دیئے اور ایک جگہ درختوں کے قریب کسی کار کے ٹائروں کے تازہ نشان بھی نظر آئے۔ معائنے کے دوران میں نے دیکھا کہ اردگرد کی کئی کوٹھیوں میں روشنی نظر آنے

گی تھی مگر کوئی شخص باہر آتا دکھائی نہیں دیا۔ کانسٹیبل نے تمام نشانات وغیرہ کی تفصیل نوٹ کی اور ہم ٹیرس پر آگئے۔ روپا نے اس دوران اسکاچ کی ایک بند بوتل اور چار گلاس میز پر لا رکھے تھے۔

"شوق فرمایئے انسپکٹر صاحب۔" روپا نے کہا۔

"شکریہ روپا جی ..... لیکن آپ کو تو علم ہے کہ میں پیتا نہیں ہوں۔" انسپکٹر بسواس نے للچائی نظروں سے بوتل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور اس وقت تو میں ویسے بھی ڈیوٹی پر ہوں۔ گھر پر کبھی کبھی مہمان آجائیں تو ایک آدھ پیگ کا شغل ہو جاتا ہے۔"

"تو پھر میری طرف سے مہمانوں کے لئے رکھ لیجئے۔ میں بھی مہمانوں ہی کے لئے رکھتی ہوں۔" روپا نے مسکرا کر کہا اور پھر اشفاق خان کو بلا کر کہا۔ "یہ بوتل اخبار میں لپیٹ کر انسپکٹر صاحب کی گاڑی میں رکھ دو۔"

"آپ خوامخوہ تکلیف کر رہی ہیں۔" انسپکٹر نے مزاحمت سے عاری لہجے میں کہا۔ "خیر آپ اصرار کرتی ہیں تو رکھ لیتا ہوں۔ آپ جیسی ہستی سے ملی ہوئی چیز تو ویسے بھی نشانی کے طور پر رکھی جاسکتی ہے۔" پھر اشفاق خان کے جاتے ہی اس نے خود بھی اٹھتے ہوئے کہا۔ "اگر زحمت نہ ہو تو اپنے مینجر صاحب کو میری ساتھ پولیس اسٹیشن بھیج دیجئے۔ یہ ایف آئی آر پر دستخط کر دیں گے۔"

"ایف آئی آر کی کوئی ضرورت نہیں بسواس جی۔" روپا نے ہاتھ اٹھا کر فیصلہ کن لہجے میں کہا۔" پانچ ایف آئی آر تو درج ہو چکی ہیں۔ دو آپ کے علاقے میں اور تین دوسرے علاقوں میں انہی کا آج تک کچھ نہیں بنا۔ خواہ مخواہ رجسٹر کالے کرنے سے کیا فائدہ ؟ میں اب مزید کوئی ایف آئی آر درج نہیں کراؤں گی۔"

"تو پھر آپ نے پہلے ہی کیوں نہ منع کر دیا ؟ میں نے خواہ مخواہ ہی اتنی سرکھپائی کی۔ انسپکٹر نے نہایت ہی خفیف سے احتجاج کے ساتھ کہا۔

"میں سوچ رہی تھی کہ چلو آپ تفتیش کا شوق ہی پورا کرلیں۔" روپا نے مسکراتے ہوئے کہا اور جواباً" انسپکٹر بھی قدرے بے بسی سے مسکرا کر رہ گیا۔ انہیں رخصت کرنے میں اور روپا سیڑھیوں تک گئے اور وہیں سے پلٹ آئے۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ نو بج رہے تھے۔

"نیند آرہی ہے۔" میں نے ایک مصنوعی جماہی لیتے ہوئے کہا۔ "اب میں چلتا ہوں۔" میرے ذہن پر ایک بار پھر ڈائری سوار تھی۔ جسے میں تکیے تلے رکھ آیا تھا۔

"مجھے ڈر لگے گا۔ میں سو نہیں سکوں گی۔" اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

بستر پر لیٹے لیٹے روپا نے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا اور انٹر کام کا سوئچ آن کرکے تین نمبر کا بٹن دبایا۔ جس سے آشا کے کمرے میں لگے ہوئے سیٹ کی گھنٹی بجتی تھی۔ چند

لمحے کے توقف کے بعد وہ بولی "آشا! جب ہیما آئے تو اس سے کہنا کہ ڈائری میں آج کی شوٹنگیں دیکھ کر ڈائریکٹروں کو اطلاع دے دے کہ آج میں نہیں آسکوں گی ...... نہیں نہیں ......

میری طبیعت خراب نہیں ہے ...... بلکہ میری طبیعت تو مدتوں بعد آج ٹھیک ہوئی ہے ..... ہاں ...... ٹھیک ہے ؟ اوکے۔"

ریسیور رکھ کر وہ کروٹ لے کر میری طرف مخمور نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکرائی اور تکیہ رخسار تلے دبا کر آنکھیں موند کرلیٹ گئی۔ چند لمحوں کے بعد وہ بے سدھ ہوگئی۔

اس کے کمرے کا دروازہ بند کرکے میں انیکسی میں آیا اور کپڑے بدلنے کے بعد اپنے بستر پر جالیٹا۔ تکیے تلے سے ڈائری نکالتے وقت ایک بار پھر میری رگ و پے میں اضطراب سا دوڑ گیا۔ بیتی شب کی سرشاری اور خمار کافور ہوگیا۔ ڈائری کھولتے ہی میری نظر پہلے صفحے پر پڑی جس پر صرف ایک سطر لکھی تھی۔

"میرے بس میں ہوتا تو اس داستان زندگی کا ایک ایک لفظ اپنے لہو سے لکھتی۔"

میں نے ورق پلٹا۔ مہین اور شکستہ سے الفاظ کا ایک جال میرے سامنے پھیلا ہوا تھا۔ لکھا تھا۔

آج میں اپنی لہو لہو زندگی کا کل احوال کاغذ کے ان بے جان ٹکڑوں پر منتقل کر دینا چاہتی ہوں۔ کچھ پھل دار باغ ایسے ہوتے ہیں جنہیں محافظ میسر نہیں آتے۔ لیکن جب بھی کسی کو ان کی حفاظت کا فریضہ سونپا جائے تو اس کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ ماضی کے ایک ایک پہلو سے آگاہ ہو۔ اسے جاننا چاہیے کہ اس کے باغ کے کس کس بوٹے کو کس کس نے اجاڑا' روندا اور برباد کیا۔

اسے لٹیروں اور ان کے مظالم کی ایک ایک تفصیل سے آگاہی ہونی چاہئے کیونکہ باغوں کو اجاڑنے والے لٹیرے اپنے مظالم سے کبھی باز نہیں آتے۔ وہ لوٹ کر نہ بھی آئیں تو بھی نئے باغوں کو اجاڑنے کی دھن میں رواں دواں رہتے ہیں۔ انہیں تلاش کرنا اور ان کے کئے کی سزا دینا انسان کی زندگی کا بہترین مصرف ہے۔ میری نظر میں۔

بیٹے! میں نے اپنی کہانی تمہارے علم میں لانے کے لئے کاغذ اور قلم کا سہارا اس لئے لیا ہے کہ اسے تمہارے سامنے بیان کرنے کا مجھ میں حوصلہ نہیں۔ اس میں کئی پہلو اتنے شرمناک ہیں جنہیں کوئی بھی ماں اپنے بیٹے کے روبرو لفظوں کا قالب نہیں دے سکتی۔ تحریر میں یہ کام آسان ہے اور میں یہ سب کچھ اس لئے تمہارے علم میں لانا چاہتی ہوں کہ میں اپنے اوپر ہونے والی ایک ایک زیادتی کا بلاکم و کاست تذکرہ کئے بغیر اس ذمے داری کی تکمیل کی امید نہیں رکھ سکتی جو میں تم پر عائد کرنا چاہتی ہوں۔

تم تاخیر سے پہنچنے والے وہ محافظ ہو جسے لٹیروں سے ان کے ایک ایک ظلم کا

حساب لینا ہے۔ میں ایک کمزور عورت تھی اس لئے لٹ گئی۔ لیکن میں تمہیں کمزور نہیں رہنے دوں گی۔ میں تمہیں ہر طرح کی طاقت کا مالک بناؤں گی۔ جسمانی طاقت' دولت کی طاقت اثر و رسوخ کی طاقت' دنیاوی طاقتوں میں یہی تین بڑی طاقتیں ہیں۔ میں تمہیں اس لئے طاقتور بناؤں گی کہ تم اپنے فرض سے عہدہ برآ ہونے میں کوئی عذر نہ کرسکو۔ تم یہ نہ کہہ سکو کہ تمہاری راہ میں فلاں مجبوری حائل تھی۔ دنیا بھر کی مجبوریوں سے میں گزر چکی ہوں۔ میں تمہیں مجبور نہیں رہنے دوں گی۔

میری کہانی کا آغاز موسم بہار کی ایک رات سے ہوتا ہے۔ ریاست کھتولی سے تقریباً" بیس میل کے فاصلے پر تیس چالیس دیہات پر مشتمل ایک وسیع جاگیر پھیلی ہوئی تھی جسے ناگپور کہا جاتا ہے۔ وجہ تسمیہ تو شاید اس کی یہ تھی کہ وہاں سانپ بہت پائے جاتے تھے لیکن وہاں بسنے والے انسانوں پر سانپوں کی خصوصیات قطعاً" اثر انداز نہیں ہوئی تھیں۔ وہ بہت معصوم' محبت کرنے والے اور اپنے محسنوں کے وفادار تھے۔

تمہاری نانی یعنی میری والدہ میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی سانپ کے ڈسنے سے عین جوانی میں اس دنیا سے ناتا توڑ چکی تھیں لیکن اس علاقے میں بسنے والے انسانوں کی مہر و محبت اور باپ کی شفقت نے کبھی مجھے ان کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا۔

ناگپور کی جاگیر کسی نواب شرافت علی کی ملکیت تھی اور تمہارے نانا میرے والد اس زمین کے ایک حصے کے نگراں تھے لیکن انہوں نے تو کیا اس جاگیر پر بسنے والوں میں سے کسی نے بھی نواب صاحب کو نہیں دیکھا تھا۔ ہر فصل اٹھنے کے موقع پر نواب شرافت علی کا منیجر بیلا رام آتا۔ وہ تمام منتظمین سے حساب لیتا۔ فصلیں اٹھواتا اور منتظمین اور کاشتکاروں میں ان کا حق محنت تقسیم کرتا اور چلا جاتا۔

کوئی بھی مسئلہ کھڑا ہونے پر اسے ہی بلایا جاتا۔ وہی تمام معاملات طے کرتا گویا وہی مختار کل تھا۔ جاگیر میں بسنے والا ہر فرد اسے جانتا تھا اور نواب صاحب کا نام تو لوگوں کو محض کسی کہانی کے کردار کی طرح یاد تھا۔ کہا جاتا تھا کہ ان کی اور کئی مقامات پر اس سے بھی زیادہ بڑی جاگیریں تھیں جہاں کبھی ایک آدھ بار ان کی شکل دیکھی گئی تھی لیکن ناگپور شاید ان کے لئے اتنا اہم نہیں تھا کہ کبھی وہ بہ نفس نفیس یہاں آتے۔ سننے میں آیا تھا کہ انگریزوں سے ان کے آباؤ اجداد کے خاص الخاص تعلقات تھے اور ان کی تمام جاہ و حشمت اور جاگیرداری ان کے وراثت سے زیادہ انگریزوں کی نوازشات ہی کی رہین منت تھی۔

اباجی کی تنخواہ قلیل ہی تھی لیکن سال بھر کے لئے اناج وغیرہ مل جاتا تھا۔ رہائش کے لئے ایک نیم پختہ مگر خاصا وسیع مکان ملا ہوا تھا۔ گھر میں مال مویشی سب کچھ تھا اس لئے گزر بسر بڑی عمدگی سے ہو جاتی تھی اور اباجی اس پر قانع تھے۔ ان کے ہاتھ میں جو نظم و نسق تھا۔ وہ چاہتے تو معمولی سی ہیرا پھیری سے ان گنت دنیاوی آسائشیں اپنے قدموں

میں ڈھیر کرسکتے تھے لیکن شاید وہ زمانہ اچھا تھا کہ حرص و ہوس کے موسموں نے زور نہیں پکڑا تھا یا پھر شاید اباجی خدا کے ان پسندیدہ بندوں میں سے ایک تھے جو نایاب ہوتے جا رہے ہیں۔

ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ میری کہانی کا آغاز موسم بہار کی ایک رات سے ہوتا ہے۔ کائنات سکوت میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میں اس وقت عمر کے بارہویں برس میں تھی اور یہ عمر وہ ہے جب لڑکیوں کی نیندیں گہری ہونے لگتی ہیں۔ دفعتہ" میں گہری نیند سے جاگ اٹھی۔ میں نے دیکھا اباجی اپنے پلنگ سے اٹھ چکے تھے اور طاق میں رکھی لالٹین کی بتی اونچی کر رہے تھے اور مکان سے باہر کہیں دور وقفے وقفے سے دھماکے گونج رہے تھے۔

"یہ آوازیں کیسی ہیں اباجی؟" میں نے سہم کر پوچھا۔

"گولیاں چل رہی ہیں بیٹا؟" اباجی نے جواب دیا۔ "تم گھبراؤ نہیں' اپنے بستر میں لیٹی رہو۔ میں دیکھتا ہوں۔" لیکن وہ باہر جانے کی بجائے طاق سے لالٹین اتار کر کافی دیر تک اپنی جگہ ساکت کھڑے رہے۔ اس دوران دھماکے معدوم ہو چکے تھے۔ اباجی شاید خوفزدہ تھے یا شاید وہ آوازوں کی سمت متعین کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

ہمارا ڈیرہ ناگپور کے سلسلہ دیہات کے پہلے دیہہ میں تھا۔ ہمارے مکان کے دروازے سے ہی عین سیدھ میں پگڈنڈی کھیتوں کی طرف جاتی تھی۔ دائیں طرف کھلا میدان تھا اور عقب میں ایک بہت بڑا جوہڑ تھا۔ جس کی پرلی طرف ایک کشادہ مگر کچی سڑک تھی جو آگے کہیں سے کھتولی جانے والی بڑی سڑک سے ملتی تھی۔

اس کچی سڑک کے پار ایک طویل و عریض جنگل تھا۔ یہ جنگل میلوں میں پھیلا ہوا تھا اور میں نے سنا تھا کہ اس کے دوسرے سرے پر کہیں کوئی شاندار شکار گاہ تھی۔ اس شکار گاہ سے کبھی فائروں وغیرہ کی آوازیں یہاں تک نہیں پہنچی تھیں۔ درمیانی فاصلہ غالباً" میلوں کا تھا۔

اباجی نے ہچکچاہٹ آمیز انداز میں قدم اٹھایا اور آگے بڑھ کر دروازہ ذرا سا کھول کر باہر جھانکا دفعتہ" صحن میں دھم کی سی آواز پیدا ہوئی جیسے کوئی بھاری بھرکم آدمی دیوار سے اندر کودا ہو۔ مکان کی چار دیواری زیادہ اونچی نہیں تھی کیونکہ اس زمانے میں لوگ نیچی چار دیواری میں بھی اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے تھے۔ خصوصاً" غریب لوگ۔

اباجی نے پلٹ کر کونے میں کھڑی لاٹھی اٹھائی اور بائیں ہاتھ میں ح لئی آواز نکالنے کو لپکے۔

"کون ہے ؟" چند لمحے بعد میں نے ان کی گونجیلی آوا ں ایکڑ اراضی تمہیں ٹھیکے پر

قابو نہ رکھ سکی اور قدرے خوفزدہ ہونے کے باوجود سلیپر نے تو ہمیں ویسے ہی غلام بنا

جھری سے باہر جھانکنے لگی۔ آدھے چاند کی مدھم سی چ

رہا ہے۔ لیکن معذرت چاہوں گا... میں اس نگرانی کے کام میں ہی ٹھیک ہوں۔" ابا
بدستور ہاتھ باندھے کھکھیائے۔ "ٹھیکے میں نفع کے ساتھ ساتھ نقصان کا بھی ذمے دار
پڑتا ہے.... میری گزر بسر تو اس لگے بندھے میں ہی بڑی اچھی طرح ہو جاتی ہے۔"

"اچھا ..... ہم تمہاری بھلائی کے لئے کچھ اور بہتر طریقہ سوچیں گے۔" نوا
صاحب بغور انہیں دیکھتے ہوئے مسکرائے اور گاؤ تکیے پر سر ٹکا کر لیٹ گئے۔

"لیکن حضور ..... !" اباجی نے جھکتے ہوئے کہا۔ "باتوں باتوں میں اصل بات تو رہ
گئی۔ آپ کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا جو اس وقت اس عالم میں .....؟ انہوں نے ج
نامکمل چھوڑ دیا۔

"شکار پر نکلے ہوئے تھے ہم۔ "نواب صاحب کی آواز دھیمی پڑ گئی۔ "رات کو کیم
کی طرف واپس جا رہے تھے کہ کچھ نقاب پوش گھڑ سواروں نے حملہ کردیا۔ وہ اندھا د
فائرنگ کر رہے تھے۔ ہمارے ساتھ صرف تین محافظ تھے۔ ایک زخمی ہوکر گر گیا۔ ایک
گھوڑے کو گولی لگی۔ ہمارے گھوڑے کی بھی گردن پر گولی لگی اور وہ بدک گیا۔ نہ جا
کدھر کدھر کئی گھنٹے بھاگتا رہا۔ پھر یہ پچھواڑے کے جنگل میں آنکلا اور گردن کے زخم
بے دم ہوکر گر پڑا۔ گھڑ سوار وہاں تک ہمارے تعاقب میں آئے تھے لیکن جنگل میں بھ
گئے اور ہم جان بچا کر نکل آنے میں کامیاب ہوگئے۔ بندوق بھی کہیں گر گئی۔"

پھر انہوں اپنے لمبے لمبے گرد آلود بالوں میں انگلیاں پھیریں ان میں سے خاصے
سفید تھے۔ "ہماری پگڑی بھی کہیں گر گئی۔ اس میں بڑا قیمتی ہیرا اور موتی جڑے ہو
تھے۔"

"لیکن حضور۔" اباجی نے گویا ڈرتے ڈرتے کہا۔

"آپ کے علاقے میں ڈاکوؤں کی یہ دیدہ دلیری ؟ ہم نے تو کبھی ان اطراف
ڈاکوؤں کا نام و نشان ....."

"ہم اس وقت اپنے علاقے میں نہیں تھے اور نہ ہی وہ گھڑ سوار ڈاکو تھے۔" نواب
صاحب کے لہجے میں قدرے تندی آگئی۔" ہم جانتے ہیں وہ چند چھوٹے موٹے زمیندار
کے سر پھرے لڑکے ہیں۔ طالب علم ہیں۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے نا آج کل ہندوستان
انگریزوں کو نکالنے کی تحریک ایک بار پھر زور پکڑ رہی ہے اور یہ لونڈے لپاڑے ہمیں غ
کہتے ہیں۔ انگریزوں کا ایجنٹ سمجھتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انگریزوں سے ہمار
مراسم گہرے ہیں۔ ہم دو مرتبہ انگلستان میں گئے ہیں۔ پولٹیکل ایجنٹ بھی ہر معاملے میں
سے مشورہ کرنے آتا ہے مگر اس بناء پر ہمیں غدار قرار دینا تو شرافت نہیں ہے۔ ہ
انگریزوں سے بنا کر رکھنا پڑتی ہے۔ اس کے بغیر تو ہماری جاگیرداری نہیں چل سکتی ناں۔
زرعی اصلاحات کے نام پر اپنی زمینیں تو نہیں چھنوا سکتے ناں۔ جب آزادی کی تحریک

پکڑے گی تو دیکھا جائے گا کہ ہم کس کا ساتھ دیں۔ ادھر دہلی میں جن چھ آدمیوں کو پھانسی
دی گئی' اس کا ذمے دار بھی یہ لوگ ہمیں گردانتے ہیں کہ ہم نے مخبری کی تھی۔ حالانکہ
بات صرف اتنی ہے کہ دلی سے کچھ لونڈے لپاڑے طالب علموں کا ایک گروہ ہمارے پاس
آیا تھا۔ وہ لوگ ہم کو بولتے تھے کہ تحریک چلانے کے لئے ہم ان کے فنڈ میں پانچ لاکھ روپیہ
دے دیں۔ ہم نے انکار کر دیا۔ تب سے کچھ لوگ ہمارے کھون کے پیاسے ہوگئے۔ پانچ
لاکھ بڑی رقم ہوتی ہے میاں۔ کوئی پتہ نہیں کون لوگ تحریک کے ذمہ دار ہوں گے کیا کام
لیا جائے گا اس پیسے سے ...... اور ہم ایسے ہی اٹھا کر اتنی بڑی رقم تو انہیں دے دیں' ہم
کو پاگل کتے نے کاٹا ہے ؟ اور پھر ایسی باتیں انگریزوں سے چھپی تو نہیں رہتی ناں۔
انگریزوں کے جاسوسوں کا تو ہمیں پتا ہے ناں۔"

نواب صاحب جوش میں بولے جا رہے تھے اور اباجی دم سادھے کھڑے تھے۔
نواب خاموش ہوگئے تو ان کی گردن کی پھولی ہوئی رگیں اعتدال پر آئیں۔ انہوں نے
دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھ کر چھت کی کڑیوں کو گھورتے ہوئے کچھ بدلے بدلے اور
ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ "لیکن ان طفلان مکتب کو شرافت علی سے دشمنی مہنگی پڑے
گی۔ ہم ان کو کھوج نکالیں گے اور ان کے سرپرستوں کو بھی اور ان کا حشر دنیا دیکھے گی۔
ان کو ہماری طاقت کا علم نہیں ہے۔"

"بے شک ..... بے شک حضور!" اباجی نے قدرے دھیمی آواز میں کہا۔ "ارے۔"
نواب صاحب ان کی طرف دیکھ کر قدرے چونکے۔ "تم ابھی تک کھڑے ہی ہو' بیٹھ جاؤ۔
بیٹھ جاؤ۔"

"کوئی بات نہیں سرکار ..... میں ٹھیک ہوں۔" اباجی گڑبڑا کر بولے۔ "میں تو یہ سوچ
رہا ہوں کہ آپ زخمی نظر آرہے ہیں۔ آپ کے لئے کوئی دوا یا مرہم پٹی وغیرہ کا بندوست
سب سے پہلے کرنا چاہئے تھا لیکن یہاں ایسا کوئی انتظام نہیں ہے۔ اگلے ڈیرے پر ایک
حکیم صاحب رہتے ہیں۔ آپ حکم فرمائیں تو انہیں....."

"نہیں ۔ نہیں۔" نواب صاحب یک لخت اٹھ بیٹھے۔ ان کے پہاڑ سے جثے تلے
پلنگ ایک بار پھر چرچرا کر رہ گیا۔

کسی کو بلانے کی ضرورت نہیں۔ کسی کو یہاں ہماری موجودگی کا علم نہیں ہونا
چاہیے۔ اس حالت میں ہم کسی کے سامنے آنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ محکوموں کے
دل سے رعب اٹھ جاتا ہے۔ تم بس اتنا کرو کہ گرم گرم دودھ میں ذرا سی ہلدی حل کرکے
منگوا دو۔ علاج ہے تو ناگوار۔ لیکن فی الحال یہی غنیمت ہے۔ ہم طبیعت پر جبر کرکے پی لیں
گے۔"

"جاؤ بیٹے۔" اباجی مجھ سے مخاطب ہوئے۔ "آگ جلا کے دودھ گرم کرو اور ایک

گلاس میں ذرا سی پسی ہوئی ہلدی ملا کر لے آؤ۔"

اب نواب صاحب یوں میری طرف متوجہ ہوئے گویا اب تک میری موجودگی سے لاعلم رہے ہوں۔ میں ان کے سرہانے کھڑی تھی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ بری طرح چونک اٹھے۔

"یہ کون ہے بھئی ؟" انہوں نے مبہوت سا ہو کر اباجی سے پوچھا۔

"میری بچی ہے حضور ! اکلوتی بچی۔ "اباجی نے جواب دیا۔

"بہت کھوب۔" نواب صاحب کی آنکھیں گویا جھپکنا بھول گئی تھیں۔

"ماشاء اللہ۔ چاند اترا ہوا ہے تمہارے آنگن میں اتی کھوبصورت بچی برسوں بعد نظر سے گزری ہے اور وہ بھی اس کٹیا میں۔ ادھر آؤ بھئی۔ کیا نام ہے تمہارا ؟" انہوں نے بازو میری طرف بڑھایا۔ نہ جانے کیوں میرے پاؤں زمین میں گڑ گئے۔

"ارے بھئی یہ کیا بدتمیزی ہے۔" اباجی نے مجھے گھڑکا۔ "آگے آؤ نا نواب صاحب بلا رہے ہیں۔"

بمشکل تمام اور بادل نخواستہ میں آگے بڑھی۔ میرے پیروں میں چاندی کی چھوٹی سی پازیب تھی ۔ میرے ہر جھجکتے قدم کے ساتھ یہ پازیب معمول سے کچھ زیادہ ہی چھنک چھنک اٹھی۔ میں پلنگ کی پٹی کے قریب جا کھڑی ہوئی۔

نواب صاحب نے میرے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور اس ہاتھ کے بوجھ سے میری گردن خم سا کھا گئی۔ میں بال عموماً کھلے رکھتی تھی اور یہ کولھوں سے بھی نیچے تک آتے تھے۔ اس وقت میرے سر پر دوپٹہ نہیں تھا۔ نواب صاحب کا ہاتھ میرے بالوں کے ریشم سے پھسلتا ہوا کمر تک چلا گیا۔ میں کچھ سمٹ کر رہ گئی۔ انہوں نے ہولے سے میری کمر پر تھپکی دی۔ "ہم نے تمہارا نام پوچھا تھا نہیں بتاؤ گی کیا ؟"

"عزیزہ۔" میں نے ہولے سے جواب دیا۔ عجیب لرزتی ہوئی سی آواز میرے حلق سے نکلی۔

"نہایت نا مناسب نام ہے۔" نواب صاحب کے بھدے ہونٹوں کے عقب سے زرد دانت جھانک اٹھے۔ "تمہارا نام تو حور بانو ہونا چاہئے تھا۔ ہم تمہارا یہی نام تجویز کرتے ہیں کیوں خدا داد خان ؟ تمہیں پسند ہے یہ نام ؟"

"یہ تو حضور کی نوازش ہے جو ذرے کو آفتاب بنا رہے ہیں۔ "اباجی نے مدھم لہجے میں کہا۔ "عزت افزائی ہے ہم غریبوں کی۔"

"اپنے آپ کو غریب مت کہو خدا داد خان ! تم تو پارس کے مالک ہو۔" نواب صاحب کی چندھی چندھی آنکھیں کچھ اور سکڑ گئیں۔ میری کمر سے ہاتھ ہٹا کر انہوں نے خاکی کوٹ کی ایک بڑی سی جیب کا بٹن کھولا اور بڑے بڑے سرخ نوٹوں کی ایک گڈی نکال

کر اس میں سے کچھ نوٹ علیحدہ کر کے انہوں نے میرے ہاتھ میں تھمانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "یہ رکھ لو عزیزہ عرف حور بانو ! ہم پہلی مرتبہ تمہارے گھر آئے ہیں۔ اگر قصداً آئے ہوتے اور ہمیں تمہاری موجودگی کا علم ہوتا تو تمہارے شایان شان کوئی تحفہ لاتے۔"

جب انہوں نے دیکھا کہ میرا ہاتھ نوٹوں کو گرفت نہیں لے رہا۔ تو اباجی کو مخاطب کیا۔ "بھئی تم ہی اسے سمجھاؤ کہ آداب کا تقاضا کیا ہے ؟"

"...... وہ تو ٹھیک ہے حضور والا۔ " اباجی نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "لیکن اتنی بڑی رقم کی کیا ضرورت ہے۔ کوئی روپیہ دھیلا عنایت فرما دیجئے۔"

مجھے خود بھی احساس تھا کہ ہر فصل پر اباجی کو جب بیلا رام چھ ماہ کی اکٹھی تنخواہ دیتا تھا تب بھی ان کے پاس اتنے نوٹ نہیں ہوتے تھے۔ نواب صاحب نے نوٹ میرے پیروں کے پاس پھینک دیئے اور قدرے خفگی آمیز لہجے میں کہا۔ "اٹھاؤ ۔ اٹھاؤ۔ جلدی کرو۔ شاباش۔"

پھر انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر مجھے جھکانے کے لئے ہلکا سا دباؤ ڈالا۔ میرے جسم سے یکلخت وہ مخصوص شاخ گل کی سی لچک مفقود ہو گئی اور لڑکپن کا تناؤ ابھر آیا۔ تب نواب صاحب کے شہتیر نما بازو کا دباؤ بڑھ گیا اور میں جھکنے پر مجبور ہو گئی۔

"اٹھاؤ۔ اٹھالو بیٹے!" اباجی کے لہجے میں شکست تھی۔ میں نے نوٹ اٹھالئے۔

"جاؤ۔ اب جلدی سے دودھ بنالاؤ۔ "نواب صاحب نے کہا اور مجھے بازو کے بوجھ سے آزاد کر دیا۔ میں بھاگ کر کمرے سے باہر آگئی۔

"خوبصورت' چاند کا ٹکڑا' حور' پری چہری۔" یہ وہ الفاظ تھے جو میں بچپن سے اپنے متعلق سنتی آئی تھی اور بچپن کی تمام تر ناسمجھی اور پھر لڑکپن کی معمولی سی سمجھ داری کے دور میں بھی انہیں سن کر میرے لانبی گردن ایک ہلکے سے تفاخر سے تن جاتی تھی لیکن آج نجانے کیوں ان الفاظ نے مجھے سن کر کے رکھ دیا تھا۔ میری ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑگئے تھے اور جسم سے گویا جان نکل گئی تھی۔

کچھ دنوں سے اباجی اکثر مجھے تلقین کرنے لگے تھے۔ "اب تو سیانی ہو رہی ہے۔ دوپٹہ اچھی طرح اوڑھا کر۔ یوں کد کڑے لگاتی نہ چلا کر۔ ہر کسی سے پٹاخ پٹاخ باتیں نہ کیا کر۔ "لیکن ان سب ہدایات کو میں نے کبھی در خور اعتنا نہ سمجھا تھا۔ صرف استانی خالہ کے ہاں اردو فارسی اور عربی کا درس لینے کے لئے جاتے وقت دوپٹہ صحیح طرح لیتی تھی۔

لیکن ابا کی ہدایات کے بغیر ہی جب میں نواب صاحب کے لئے ہلدی والا دودھ لے کر واپس کمرے میں پہنچی تو دوپٹہ میرے سر اور سینے پر اچھی طرح لپٹا ہوا تھا۔

نواب صاحب اباجی سے باتیں کر رہے تھے۔ اباجی اب ان کے پائنتی ایک کرسی پر بیٹھ چکے تھے۔ میرے پہنچتے ہی نواب صاحب نے خاموش ہو کر گہری نظروں سے میرا سر تاپا

جائزہ لیا۔ ان کی موٹی موٹی نوکیلی مونچھیں پھڑپھڑا کر رہ گئیں گویا وہ کچھ کہنے لگے ہوں مگر پھر ارادہ ملتوی کر دیا ہو۔

میرے ہاتھوں میں دبی ہوئی طشتری سے گلاس اٹھا کر انہوں نے ہونٹوں سے لگایا اور ایک سانس میں خالی کر دیا۔ مونچھوں پر لگا ہوا دودھ صاف کر کے انہیں بل دے کر ایک ڈکار لے کر ...... وہ دوبارہ اباجی کی طرف متوجہ ہوگئے۔

"...... بس صبح اندھیرے ہی تم ہمارے لئے گھوڑا گاڑی کا بندوبست کر دینا۔ کھتولی پہنچ کر ہم کار کا بندوبست کرلیں گے۔ کوچوان گھوڑا گاڑی واپس لے آئے گا۔ اب تم جا کر چند گھنٹے آرام کرلو۔" پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولے..... "اور جو باتیں میں نے سمجھائی ہیں ان کا دھیان رکھنا۔ ان پر عمل کرنا ہم نے تمہارے ہی بھلے کو یہ سب کچھ کہا ہے۔"

"آپ بالکل فکر نہ کریں حضور! یہ تو آپ کی بندہ پروری ہے کہ آپ نے ہمیں اس قابل سمجھا کہ مشوروں سے نوازیں۔" اباجی نے کہا تاہم ان کے لہجے میں اب پہلے کا سا خوشامدانہ جوش و خروش نہیں رہا تھا۔

"ٹھیک ہے ۔ بس اب جاؤ ۔ میں بھی سونے کی کوشش کرتا ہوں۔" نواب صاحب نے کہا اور بستر پر لیٹ کر پائنتی رکھا ہوا کمبل سینے پر کھینچ لیا۔

میں اور اباجی اپنے کمرے میں آگئے۔ اباجی نے دوسری لالٹین روشن کرکے طاق میں رکھ دی اور ہم دونوں اپنے اپنے بستروں پر لیٹ گئے۔ میں نے نواب صاحب کے دیے ہوئے نوٹ اباجی کے تکیے کے قریب ہی رکھ دیئے تھے۔ لیکن انہوں نے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا اور نہ ہی کوئی بات کی۔ میں بھی خاموش رہی۔

دھندلی روشنی میں' میں نے انہیں رضائی سے سر نکالے' چت لیٹے' چھت کو گھورتے دیکھا اور کچھ دیر بعد کروٹ بدل لی۔ رفتہ رفتہ میری رگ و پے کی یخ بستگی دور ہوگئی۔ جسم میں اتری ہوئی غیر مرئی برف دھیرے دھیرے پگھلتی گئی اور لہو کی حرارت لوٹ آئی۔ اس مخصوص خمار گرفتہ حرارت کی آغوش میں بالآخر مجھے نیند آگئی۔

اگلی صبح خلاف معمول میری آنکھ دن چڑھے کھلی۔ نواب صاحب نہ جانے کب رخصت ہوچکے تھے۔ اباجی گھر پر ہی تھے۔ اور زمینوں پر جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ روزانہ صبح کو ہمارے ہاں ایک ملازمہ اور اس کا چودہ پندرہ سال کا لڑکا رحیم آتا تھا۔ ملازمہ گھر کا کام کاج کرتی تھی۔ اباجی کو ناشتہ بنا کر دیتی تھی۔ اور رحیم بھینسوں کے لئے چارہ وغیرہ تیار کرتا تھا۔ انہیں نہلاتا تھا۔

میں نے دیکھا کہ اس کی ماں تو گھر کے کام کاج میں مصروف تھی لیکن رحیم کہیں نہیں آرہا تھا۔ بھینسوں کا چارہ بھی تیار نہیں ہوا تھا۔ جانے سے پہلے ابا نے تیار شدہ

چارے کے بجائے ویسے ہی کچھ پتے اٹھا کر بھینسوں کے سامنے ڈال دیئے اور وہ بے دلی سے ان پر منہ مارنے لگیں۔ تب میں نے ابا سے پوچھا۔ "آج رحیم نہیں آیا کیا؟"

ابا نے ٹھٹھک کر گہری نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "نہیں میں نے اسے منع کر دیا ہے۔" انہوں نے اپنے مخصوص مدھم لہجے میں کہا۔

"کیوں اباجی ؟" میں نے صحن میں پڑی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"اب تو سیانی ہو رہی ہے عزیزہ!" انہوں نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ "اور جس گھر میں لڑکی سیانی ہو رہی ہو وہاں جوان لڑکے کا آنا جانا ٹھیک نہیں ہوتا۔"

"یہ بات آپ کو نواب صاحب نے بتائی ہے کیا؟" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

اباجی نے بری طرح چونک کر پلٹ کر میری طرف دیکھا گویا کسی چھوٹے منہ سے بہت بڑی بات سن لی ہو۔ حقیقتہً مجھے خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ بلا سوچے سمجھے میرے منہ سے یہ بات کیسے نکل گئی تھی۔ ایک لمحے کے لئے تو مجھے یہی محسوس ہوا تھا گویا میرے منہ میں کسی اور کی زبان پھڑک اٹھی ہو۔

"کسی نے بھی بتائی ہو۔" اباجی نے خشک لہجے میں کہا۔ "بات ہے کام کی .... اس لئے میں نے پلے باندھ لی ہے۔"

"اور بھینسوں کا کام کون کرے گا؟" میں نے بالوں کی چوٹی بناتے کھولتے اور پاؤں کے انگوٹھے سے کچے صحن کی مٹی کریدتے ہوئے پوچھا۔

"میں بابا بندو کو بھیج دوں گا۔ وہی کیا کرے گا۔ اباجی نے دروازے کی طرف قدم بڑھاتے بڑھاتے رک کر کہا۔ "اور اسی کے ساتھ خالہ کے ہاں جایا کرو گی۔ وہی تمہیں وہاں سے لے کر آیا کرے گا۔"

وہ باہر نکل گئے۔ میں نے بھی اٹھنے کے لئے چپلوں میں پاؤں پھنسائے لیکن اٹھ نہ سکی۔ نہ جانے کس احساس کے بوجھ تلے دبی بیٹھی رہی۔ میرا ذہن اب تک ایک کورا کاغذ تھا۔ جس کی زیر تعمیر عمارت میں دھیرے دھیرے قدم جماتے جذبوں کے رنگ کبھی کبھی شاید اس کاغذ پر ابھرتے تھے۔ لیکن مجھے آج تک ان کا کچھ احساس نہیں ہوا تھا۔ سب کچھ میرے لئے محض ایک سوالیہ نشان تھا۔ لیکن آج یہی سوالیہ نشان ذہن کے کورے کاغذ پر بہت زیادہ پھیل گیا تھا۔ معصوم تجسس کی کائنات دھیرے دھیرے اتھل پتھل ہو رہی تھی۔

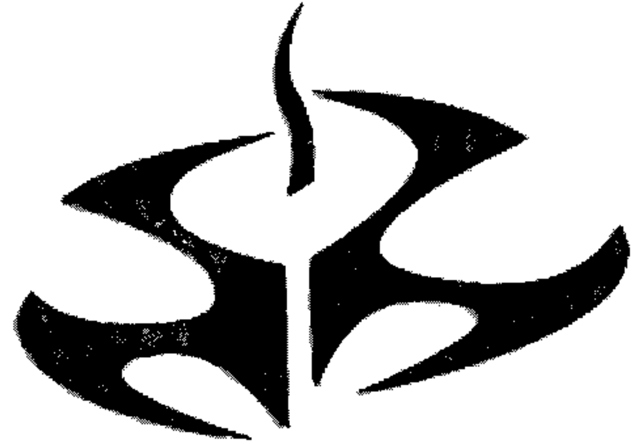
مجھے ابا کا بدلا بدلا سا انداز کچھ اچھا نہیں لگا تھا۔ شاید اس لئے کہ الفاظ ان کے تھے مگر ہدایات کسی اور کی۔ اس گھر میں رہتے ہوئے میرا ذہن بچپن سے کچھ ایسے سانچے میں ڈھل گیا تھا کہ اس میں کسی تیسرے فرد کی مداخلت کی گنجائش نہیں تھی۔ اگر ایک رات پہلے نواب صاحب کی ذات شریف کا نزول اس گھر میں نہ ہوا ہوتا تب شاید ابا کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ مجھے یوں اجنبی اجنبی نہ لگتے۔

جس رحیم کو اباجی نے جوان لڑکا کہا تھا مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس میں جوانوں والی کیا بات تھی۔ میرے خیال میں جوان تو کسی لمبے تڑنگے اور مونچھوں والے آدمی کو کہا جاسکتا تھا۔ رحیم بے چارہ تو ابھی لڑکا بلکہ شاید بچہ تھا۔ پتلا دبلا میانہ قامت۔ اس کی تو ابھی مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں۔ میں نے کبھی اس کے وجود پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی اور نہ ہی ہمارے درمیان کبھی زیادہ دیر تک گفتگو ہوئی تھی۔ میرا رویہ اس کے ساتھ ایک طرح سے حاکمانہ ہوتا تھا۔ بہرحال آج اباجی کی گفتگو سن کر رحیم مجھے کچھ پراسرار سی مخلوق محسوس ہوا۔ شاید اس کی مٹھی میں کوئی راز بند تھا جس سے ابا خوف زدہ تھے۔

سیانی .... جوان لڑکا .... یہ کچھ اور سوالیہ نشان تھے جو میرے ذہن کے کورے کاغذ پر ثبت ہوگئے تھے۔ بہرحال شب و روز کچھ نئے ڈھب سے گزرنے لگے۔

اور پھر ایک شام ایک کار ہمارے دروازے پر آکر رکی۔

○



غیر متوقع طور پر بیلا رام اندر آیا۔ اس کے پیچھے دو مزدور چند تھیلے اٹھائے ہوئے تھے۔ لا رام نے بتایا کہ تھیلوں میں خشک میوے اور کچھ دیگر تحائف ہیں جو نواب صاحب نے وائے ہیں۔ ابا جی بھی کچھ متحیر نظر آرہے تھے' بہرحال انہوں نے بیلا رام کو بیٹھک میں ایا۔

ان دنوں میں مہمانوں کی تواضع عام طور پر دودھ اور پھلوں وغیرہ سے کی جاتی تھی۔ جب یہ چیزیں طشتری میں رکھ کر بیٹھک میں گئی تو بیلا رام ابا سے کہہ رہا تھا۔ "تم لوگ ب کھایا پیا کرو' جان بنایا کرو۔ نواب صاحب نے یہ چیزیں اسی لیے بھیجی ہیں۔"

پھر اس نے اپنی کمانی دار عینک اچھی طرح ناک پر جما کر شیشوں کے اوپر سے میری ف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس بچی کا تو بہت ہی خیال رکھا کرو۔ ایشور عمر دراز کرے۔ بڑی ار بچی ہے۔" نہ جانے اس پر میری ہونہاری کا کب اور کیونکر انکشاف ہوا تھا کیونکہ سے پہلے تو اس نے کبھی میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی کبھی بات تھی۔

اس کے بعد کچھ معمول سا بن گیا۔ ہر مہینے دو مہینے بعد نواب صاحب کی طرف سے نہ کچھ تحائف موصول ہوتے۔ ان میں زیادہ تر مہنگے یا کمیاب قسم کے پھل اور میوے ہوتے تھے یعنی ایسی چیزیں جو ہمارے علاقے میں مشکل ہی سے ملتی تھیں۔ ظاہر ہے یہ چیزیں گھر میں ہوتی تھیں تو اڑوس پڑوس اور جاننے والوں میں بھی بٹتی تھیں۔ ابا کی اہ بھی بغیر مطالبے کے بڑھ چکی تھی اور فصلوں میں بھی زیادہ حصہ ملنے لگا تھا۔ میں وس کرتی کہ عنایات کے اس تسلسل نے اباجی کو کچھ پریشان سا کر دیا تھا لیکن وہ اس وم اور بے عنوان سی پریشانی کو دبائے پھرتے تھے۔

میری عمر اب چودہ سال ہو گئی تھی۔ دیکھنے والیاں کہتی تھیں' بڑا روپ نکالا ہے لڑکی نے۔ ہم عمر لڑکیوں میں شاید ہی کسی نے مجھ سا قد پایا ہو' شاید ہی کسی کی رنگت میرے خساروں کے گلابی رنگ سے میل کھاتی ہو' شاید ہی کسی کی زلفوں نے یوں ریشم کو مات کیا ہو۔ گھریلو محفلوں اور مجلسوں میں کوئی عورت سر سے پاؤں تک ایک نظر ڈالتی اور ایک بت آمیز رشک سے کہتی۔ "جس گھر میں جائے گی' اجالا کر دے گی۔"

کوئی سرد و گرم چشیدہ خاتون گزرے لمحوں کی راکھ میں انگلیاں مار کر کسی مدفون چنگاری کو ہوا دیتے ہوئے کہتی۔ "کیا منہ زور عمر ہے! لگام ڈالنے والا بھی کوئی جوڑ کا ہو تو بات بنتی ہے۔"

.......اور کوئی صرف دیکھتی اور دیکھتی ہی رہ جاتی۔ کسی مرد کی نظر سہنے کا اتفاق شاذو نادر ہی ہوتا تھا کیونکہ اب میرا گھر سے نکلنا تقریباً موقوف تھا۔ نکلنا ہوتا بھی تو سر سے پاؤں تک نوگزی چادر میں لپٹ کر۔ اس زمانے میں کم از کم گاؤں دیہات میں رہنے والے مردوں کی نظریں اتنی بھوکی نہیں ہوتی تھیں کہ بس چلے تو سات پردوں کو چیر کر جسم کے پار نکل جائیں۔ کسی کی نظریں تعاقب بھی کرتیں تو ہچکچاہٹ، جھجک اور بے کسی کی تہوں میں لپٹی ہوئی میٹھی طلب لے کر۔

پھر ایک روز عجیب حادثہ ہوا بلکہ شاید یہ حادثوں کا نقطہ آغاز تھا۔ ہمارے دروازے پر موٹر آکر رکی اور ابا جی دروازے پر پہنچے تو بیلا رام موٹر سے اتر کر ان کے ساتھ اندر آیا اور اس کے پیچھے تین ڈومنیاں بھی گھر میں داخل ہو گئیں۔ ان کے سروں پر بڑے بڑے تھال تھے جو گوٹے کناری والے سرخ ریشمی کپڑوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ تھال انہوں نے صحن میں رکھ دیئے اور میری بلائیں لے کر ایک طرف مودب کھڑی ہو گئیں۔ بیلا رام نے چاندی کا ایک روپیہ اور ایک ٹکا ابا جی کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"یہ کیا ہے بیلا رام؟" ابا جی نے ہکا بکا ہو کر پوچھا۔ "منگنی کا ٹکا روپیہ ہے۔" بیلا رام نے سر جھکا کر بڑی سادگی سے جواب دیا۔ "نواب صاحب نے تمہاری لڑکی کو پسند کر لیا ہے۔ اسی چاند کی چودھویں کو وہ بارات لے کر آئیں گے۔ رسم بڑی سادگی سے ہوگی۔ ان کے ساتھ کل آٹھ دس باراتی ہوں گے۔ کوئی خاص اہتمام کرنے کی ضرورت نہیں۔ ساری خوشیاں دلہن کے محل میں پہنچنے کے بعد کی جائیں گی۔ بہرحال تم اگر کوئی انتظام وغیرہ چاہو تو اس کے لیے یہ رقم رکھ لو۔"

اس نے بڑی صفائی سے نوٹوں کی ایک گڈی ابا کی واسکٹ کی جیب میں ٹھونس دی۔ اس نے سب کچھ اتنی روانی سے کہا تھا گویا کوئی لکھا لکھایا مضمون پڑھ رہا ہو۔ ابا جی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے گویا اپنے خلاف ناکردہ گناہوں کی طویل فرد جرم سن رہے ہوں۔ پھر وہ یوں آہستگی سے صحن میں پڑی ہوئی بڑی سی چارپائی پر گئے گویا زمین ان کے پیروں تلے سے سرک گئی ہو۔

میں باورچی خانے کے دروازے میں کھڑی تھی۔ ایک لمحے کے لیے تو مجھے یہ سب آخر شب کا خواب محسوس ہوا۔ پھر نجانے کیوں میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا۔ میں نے چوکھٹ کا سہارا لینے کی کوشش کی لیکن میرا ہاتھ اس سے رگڑ کھاتا ہوا آتا گیا اور پھر میں نے اپنے آپ کو چوکھٹ پر بیٹھے پایا۔ میری آنکھوں کے سامنے رقص

رتے تاریکی کے دائروں سے گویا لاتعداد عفریت نکل کر میری طرف رینگ رہے تھے اور ہر عفریت کا چہرہ نواب شرافت سے مشابہ تھا۔ دو برس پہلے دیکھا ہوا وہ چہرہ مجھے بھولا نہیں تھا۔

"بیلا رام۔" بالآخر میں نے ابا کی ڈوبتی سی آواز سنی۔ "کیا میں اسے مذاق سمجھوں؟ یہ سب کیا ہے.....یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"کیا اس سے پہلے میں نے کبھی تم سے مذاق کیا ہے؟" میں نے بیلا رام کی آواز سنی۔ "اب ہم چلتے ہیں۔ سمجھو منگنی کی رسم ادا ہو گئی۔ چاند کی چودہ تاریخ یاد رکھنا۔"

میری بصارت دھیرے دھیرے لوٹ آئی۔ میں نے بیلا رام اور ڈومنیوں کو دروازے کی طرف بڑھتے دیکھا، جہاں بہت سے بچے آن جمع ہوئے تھے اور متجسس نظروں سے اندر جھانک رہے تھے۔ کچھ بچے دروازے کے سامنے کھڑی موٹر کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے تھے۔ بیلا رام نے انہیں ڈانٹا اور وہ تتر بتر ہو گئے۔ موٹر دروازے کے سامنے سے غائب ہو گئی۔

میں چوکھٹ کا سہارا لے کر اٹھی، جسم گویا پتھرا گیا تھا۔ بمشکل تمام قدم اٹھاتی میں ابا کی طرف بڑھی، وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"ابا!" میرے حلق سے ایک دلخراش چیخ نکلی اور میں ان سے جا لپٹی۔ میں کچھ کہنا چاہتی تھی مگر مجھے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ میری ہچکی بندھ گئی تھی اور آنسو گویا صرف آنکھوں سے نہیں ہر مسام سے پھوٹ رہے تھے۔ ابا کے جسم میں بھی لرزش تھی۔

"رو مت بیٹے۔" بالآخر ابا کی آواز نہ جانے کن گہرائیوں سے ابھری۔ "ایسا نہیں ہوگا.....میں نہیں ہونے دوں گا۔ تو تسلی رکھ.....مجھے سوچنے دے....." وہ ہولے ہولے مجھے تھپکنے لگے۔ مجھے کچھ حوصلہ ہوا۔ میرے آنسو تھمنے لگے۔

میں اس وقت بھی ان کے سینے سے لگی کھڑی تھی جب بستی کی عورتوں کی ایک ٹولی گھر میں داخل ہوئی۔ "ارے بھئی بڑے چھپے رستم نکلے خداداد خان! چپ چپاتے ہی بیٹی کی منگنی کر دی اور ہمیں کانوں کان خبر نہیں ہونے دی۔" ایک عورت نے کہا۔

"اب ایسی بھی کیا رازداری۔ ہمیں غیر سمجھتے ہو ناں۔" دوسری نے لقمہ دیا اور سب کی سب ہمارے گرد گھیرا ڈال کر کھڑی ہو گئیں۔ مجھے ان سے خوف آرہا تھا۔ حالانکہ ان میں سے کئی وہ تھیں جنہوں نے مجھے گود کھلایا تھا۔

"ارے بھئی مانا کہ نوابوں کے ساتھ رشتہ جڑ گیا ہے مگر ابھی سے اتنی غیریت تو نہیں برتنی چاہیے تھی۔ ہم ہی تمہارے دکھ سکھ کے ساتھی ہیں۔" کرخت آواز والی ایک عورت بولی۔

پھر ایک اور عورت دوسری عورتوں کو پیچھے ہٹا کر ابا کے قریب ہوئی۔ "بھئی یہ تو بتاؤ یہ بیل کیسے منڈھے چڑھی۔ ہم نے تو نواب صاحب کو کبھی یہاں نہیں دیکھا، ان کے قصے ہی

سنے ہیں۔"

ابا جی نے مجھے آہستگی سے ایک طرف ہٹایا۔ پھر عورتوں کے حلقے کو توڑ کر دیوانوں کی طرف بیٹھک کی طرف دوڑتے چلے گئے۔ کمرے میں گھس کر انہوں نے دروازہ بند کر لیا۔ ان کے جاتے ہی کئی عورتوں نے بیک وقت مجھے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ "ارے دیکھو بچی کیسے زرد ہو رہی ہے۔ خوشی ہونے کے بجائے رو رو کر آنکھیں سجا لی ہیں۔" کسی نے کہا۔

"کمسنی میں منگنی بیاہ کے موقع پر یہی حال ہوتا ہے۔" کسی نے ہانک لگائی۔

"ارے یہ نگوڑی کیسی منگنی ہے۔ نہ ڈھولک' نہ گیت' نہ شیرینی' نہ سنگھار۔" کوئی چیخ کر بولی۔ "اری چلو لڑکیو کچھ میٹھے گانے کا بندوبست کرو۔ بچی کا جی پرچاؤ۔"

آناً فاناً کہیں سے دری ڈھونڈ کر صحن میں بچھا دی گئی۔ عورتوں نے مجھے بیچ میں بٹھا لیا۔ دوپٹے سے میرا گھونگھٹ نکال دیا اور تالیوں کی لے پر بے سری آوازوں میں جانے کیا کیا گانے لگیں۔ پھر کسی نے چیخ کر کہا۔ "ارے بھئی ڈھولک لاؤ' یوں مزا نہیں آرہا۔"

دو تین عورتیں اٹھ کر باہر کو بھاگیں۔ مجھے ان کی شکلیں دھندلی دھندلی دکھائی دے رہی تھیں اور آوازیں یوں سنائی دے رہی تھیں گویا کھنڈروں میں ہزاروں چڑیلیں جمع ہو کر چیخ و پکار کر رہی ہوں۔

پھر ڈھولک آگئی۔ ہجوم کچھ اور بڑھ گیا۔ میرے قریب باتوں کی بھنبھناہٹ جاری تھی۔ "لڑکی کے نصیب کھل گئے مگر ایک بات بڑی غلط ہے۔"

"وہ کیا؟" دوسری نے بے تابی سے پوچھا۔

"سنا ہے نواب صاحب تیس بتیس بیویوں کو تو اب تک طلاق دے چکے ہیں' دس پندرہ اب بھی محل میں موجود ہیں' کنیزیں وغیرہ اس کے علاوہ ہیں۔" عورت نے کہا۔

"ہائے اللہ۔ اتنی بیویوں کا وہ کیا کرتے ہوں گے؟" ایک حیرت بھری آواز ابھری۔

"سوال یہ نہیں .... سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ اتنی ساری بیویاں کیا کرتی ہوں گی؟" ایک عورت نے کہا اور بے ساختہ کئی قہقہے بلند ہوئے۔

"ارے بھئی یہ کوئی پریشانی کی بات نہیں۔ نوابوں کے ہاں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔" پاس بیٹھی کسی عورت نے گویا بالواسطہ مجھے تسلی دی۔

پھر ڈھولک پر تھاپ پڑنے لگی اور سب عورتیں گیتوں میں شریک ہو گئیں۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اذیت سے میرے دماغ کی نسیں پھٹ جائیں گی۔ میں نے سختی سے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے اور قریب تھا کہ میں پھیپھڑوں کی تمام تر طاقت کے ساتھ چلا اٹھتی کہ ایک جھٹکے سے بیٹھک کا دروازہ کھلا۔

"بھولے بابل یہ کیسا ستم ڈھایا رے ....." گیت کا بول یک لخت سکوت میں ڈوب

گیا۔ ابا لمبے لمبے ڈگ بھرتے صحن میں آگئے۔ ان کے ہاتھ میں لاٹھی تھی۔ جسم کی کپکپاہٹ دور سے بھی دکھائی دے رہی تھی۔

"بند کرو یہ بکواس۔" وہ دھاڑے۔ "ابھی کوئی منگنی ونگنی نہیں ہوئی' صرف پیغام آیا ہے اور تم لوگوں نے یہاں ڈھول ڈھمکے شروع کر دیئے .... دفع ہو جاؤ اپنے گھروں کو...." غصے کی شدت سے ان کی آواز پھٹ گئی۔ انہوں نے لاٹھی ہوا میں لہرائی۔ عورتوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ سب اٹھ کر باہر کو دوڑیں۔

"توبہ.....توبہ....." ایک عورت میرے قریب سے اٹھ کر دوڑتے ہوئے چلائی۔ "ایسی بے ہودہ تقریب دیکھی نہ سنی۔" صحن میں رکھے ہوئے تھال الٹ پلٹ ہو گئے اور ڈھیروں مٹھائیاں ادھر ادھر بکھر گئیں۔ پیروں تلے کچلی گئیں۔

ابا میرے قریب آئے۔ "اٹھو بیٹے! تم یہ سب کچھ ذہن سے نکال دو..... بالکل نکال دو۔" انہوں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "نواب شرافت علی کی ایسی کی تیسی ......تم اٹھ کر آرام سے کھانا کھاؤ اور سو جاؤ' سب کچھ مجھ پر چھوڑ دو۔ میں سب ٹھیک کر لوں گا۔ میں اپنی پھول سی بچی کو اس خبیث کی بھینٹ نہیں چڑھنے دوں گا۔ چلو شاباش اٹھو۔"

ان کے لہجے کے اعتماد نے مجھے یکلخت گویا پاتال سے نکال کر کہکشاں پر لا بٹھایا۔ میں نے اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا اور باورچی خانے سے کھانا نکالا جو ملازمہ زیبو تیار کرکے رکھ گئی تھی۔ تھوڑا بہت کھانا زہر مار کرکے ہم سرشام ہی سونے کے لیے جا لیٹے۔ اب میں الگ کمرے میں لیٹی ہوئی تھی' اس لیے مجھے نہیں معلوم کہ ابا سونے میں کامیاب ہو گئے تھے یا نہیں' بہرحال مجھے رات گئے تک نیند نہ آئی۔ ابا کی باتوں سے گو کہ کافی ڈھارس بندھ چکی تھی مگر نہ جانے کیوں دل ڈوب ڈوب جاتا تھا۔

اگلی صبح منہ اندھیرے ہی ابا نے مجھے جگایا۔ دروازوں اور کھڑکیوں کی کنڈیاں وغیرہ اچھی طرح لگا کر رکھنے کی ہدایت کی اور خود نجانے کہاں چل دیئے۔ صرف اتنا کہہ گئے۔ "میں دیر سے آؤں گا۔ شاید دوپہر تک ...."

دن چڑھے تک ملازمہ زیبو نہ آئی اور سارا کام کاج میں نے خود ہی کر لیا۔ یوں کچھ دیر کے لیے دھیان بٹ گیا۔ بھینس اب ہمارے ہاں ایک ہی تھی۔ گیارہ بجے کے قریب چرواہا آکر اسے لے جاتا تھا۔ اس بے زبان کی موجودگی سے بھی احساس تنہائی کچھ کم ہو جاتا تھا۔ اس کے جانے کے بعد گھر کاٹنے کو دوڑ رہا تھا۔

ایک جاں گسل انتظار کے بعد ابا دوپہر ڈھلے واپس آئے۔ ان کے چہرے پر گہری تھکن اور درماندگی تھی۔ دھول سے جوتیاں اٹی ہوئی تھیں۔ آنکھوں میں ویرانی تھیں۔ خلاف معمول انہوں نے آتے ہی منہ ہاتھ نہیں دھویا۔ کھانے کو بھی منع کر دیا اور سیدھے کمرے میں جا لیٹے۔ میں ان کے پاس جا بیٹھی۔

دیر تک اعصاب شکن سکوت طاری رہا- پھر وہ یک لخت خود کلامی کے سے لہجے میں بول اٹھے- "میری نظر میں تمہارے لیے تیرہ لڑکے تھے- میں ساری انا اور اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر سب کے گھر ہو آیا- سب کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں- لوگوں کو یہاں تک معلوم ہو چکا ہے کہ اس بدبخت نواب نے ہمارے ہاں منگنی کا ٹکا روپیہ بھی بھجوا دیا ہے- ان سب کا ایک ہی جواب تھا کہ حضور والا کے انتخاب پر کون ہاتھ ڈال سکتا ہے- والدین تو والدین' خود لڑکوں میں بھی کوئی ایسا جری جوان نہیں نکلا جو میری لاج رکھ لیتا ...... حتیٰ کہ میں اس نوکرانی زیبو کے گھر بھی گیا ......رحیم کے لیے ......جسے میں نے گھر میں آنے سے منع کر دیا تھا ......وہ غلام زادہ بھی رضامند نہیں ہوا......" آنسوؤں میں الجھ کر ان کی آواز رندھ گئی- "کوئی تم سے شادی کے لیے تیار نہیں ہوا-"

میں پلنگ کی پٹی پر ساکت بیٹھی فرش کو گھور رہی تھی- میں یہ سب باتیں سننا نہیں چاہتی تھی- اٹھ کر بھاگ جانا چاہتی تھی لیکن کہاں جا سکتی تھی؟ ایک بار پھر سکوت چھا گیا- ایسا سکوت جس کا ایک ایک لمحہ صدیوں پر محیط تھا-

"اب ہمارے سامنے ایک ہی راستہ ہے-" دفعتاً" ابا جی اٹھ بیٹھے اور انہوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا- آنکھوں میں مجروح سوال لیے میں نے ان کی طرف دیکھا' منہ سے کچھ نہ بولی-

ہم یہاں سے بھاگ چلتے ہیں' کہیں دور-" ان کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی- میرے نیم مردہ دل میں امید کی نئی کرن دوڑ گئی- اس سے اچھی تجویز کیا ہو سکتی تھی- خدا کی زمین بہت وسیع تھی- ناگپور کے سانپوں نے تو ہمیں آج تک نہیں ستایا تھا لیکن انسانوں کے پھن ہماری طرف لپکنے لگے تھے- اب یہاں سے نکل چلنا ہی بہتر تھا-

"بیل گاڑی ہمارے پاس ہے-" ابا نے کہا- "کھتولی پہنچ کر کسی ٹرین میں سوار ہو جائیں گے- لکھنؤ' غازی آباد' دلی کہیں بھی نکل جائیں گے- تم صرف نقدی' زیور اور چند ایک خاص خاص کپڑے ٹرنک میں بھر لو- ہم آدھی رات کو خاموشی سے نکل جائیں گے- ٹھیک ہے؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا- اثبات میں سرہلاتے ہوئے ان کے سینے سے لگ کر رو دی- "بیٹی کتنا بڑا بوجھ ہوتی ہے ابا جی!" میں نے ان کے ہاتھوں کو جن سے وہ میرے آنسو پونچھ رہے تھے' چومتے ہوئے کہا-

"بیٹی سے بڑا بوجھ وعدہ ہوتا ہے جان پدر!" انہوں نے میرا سر سینے سے لگا لیا- "تمہاری مرحوم ماں نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں تمہیں حسب توفیق پڑھاؤں لکھاؤں گا اور تمہاری شادی کرتے وقت تمہاری پسند اور پھر اپنی منشا کو پیش نظر رکھوں گا .... اور یہ سودا تو ہم دونوں ہی کی مرضی کا نہیں.... خیر....یہ بڑی بڑی باتیں تمہارے سوچنے کی نہیں-

ابھی میں زندہ ہوں- چلو تم آہستہ آہستہ تیاری کرو' چلنے سے پہلے کچھ آرام کرنے کی بھی کوشش کریں گے-"

آدھی رات کو ہم اپنے ہی گھر سے چوروں کی طرح نکلے- ابا نے بیل جوت کر گاڑی تیار کھڑی کر رکھی تھی' میں نے ٹرنک گاڑی پر رکھا اور اس نیم پختہ مکان پر الوداعی نظر ڈالی جس کی بنیادوں میں' میں اپنے ان گنت معصوم اور اچھوتے خوابوں کا لہو دے کر جا رہی تھی- اس مکان کے در و دیوار بارہا میرے ساتھ ہنسے تھے اور بارہا میرے ساتھ روئے تھے- بے جان در و دیوار! یہاں میرا بچپن بیتا تھا- اس کے چپے چپے میں میرے جسم کا لمس رچا ہوا تھا' اس کی مٹی میں میرے وجود کی مہک تھی-

یہاں میں نے ہجولیوں کے ساتھ گڑیوں کے بیاہ رچائے تھے- اس کے طویل و عریض صحن میں ایک طرف شہتوت اور جامن کے جو گھنے درخت کھڑے تھے' ان کی قلمیں میں نے اپنے ہاتھوں سے لگائی تھیں- میرے سینے سے ہوک سی اٹھی اور آنکھیں آنسوؤں سے دھندلا گئیں- میں نے ابا کی طرف دیکھا- وہ بت بنے دوسری طرف دیکھ رہے تھے- نہ جانے ان کی کیا کیفیت تھی- ان لہلہاتی فصلوں' خم دار پگڈنڈیوں' اس دھرتی اور اس مکان سے ان کا رشتہ' ان کی وابستگی تو مجھ سے کہیں پرانی تھی-

میں جلدی سے ہودے میں سمٹ کر بیٹھ گئی- اگلا پردہ میں نے اٹھایا تاکہ ابا مجھے نظر آتے رہیں- ابا نے بیلوں کو ہلکا سا ٹھوکا دیا اور وہ بے زبان رفیق ہمارا بوجھ اٹھائے گردن جھکائے خاموشی سے چل پڑے- مکان کے سامنے سے گھوم کر ایک چھوٹے سے نالے کی پلیا سے گزر کر ہم مکان کے عقب میں کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد کچے لیکن ہموار راستے پر آ گئے جس کے ایک طرف جنگل' دوسری طرف جوہڑ اور اس سے آگے غیر آباد زمین تھی-

میرا رواں رواں نجانے کیوں غیر معمولی طور پر مضطرب تھا- اس صورتحال میں اضطرابی کیفیت تو فطری تھی لیکن اس اضطراب کی نوعیت کچھ عجیب تھی- مجھے ایک عجیب سا احساس ستا رہا تھا- جیسے چاروں طرف سے کچھ غیر مرئی آنکھیں ہماری جانب نگراں ہوں- بظاہر تاروں کی برائے نام سی روشنی میں چاروں طرف کوئی ذی روح نظر نہیں آ رہا تھا- گاؤں کے دو چار کتے بھی نجانے کہاں سوئے ہوئے تھے- کبھی کبھی ابھرنے والی جھینگروں اور مینڈکوں کی مکروہ سی آوازیں زندگی کا احساس دلاتی تھیں ورنہ چاروں طرف موت کا سا سکوت تھا-

اچانک جنگل کی طرف سے دو آدمی نمودار ہوئے- وہ چہل قدمی کے سے انداز میں گاڑی کے قریب آئے اور ساتھ ساتھ چلنے لگے- ابا کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ ان کے لیے اجنبی ہیں- وہ خوفزدہ ہو چکے تھے- میری رگوں میں بھی خون جمنے لگا تھا- میں نے ہودے

میں پیچھے کو کھسک کر پچھلا پردہ اٹھایا' دو آدمی گاڑی کے پیچھے پیچھے بھی آ رہے تھے۔ ان کی شکلیں صاف نظر نہیں آ رہی تھیں لیکن ان میں سے ایک کے ہاتھ میں بندوق اور دوسرے کے کندھے پر کلہاڑی کی جھلک ضرور دیکھ لی۔ میں گھبرا کر ابا کی طرف متوجہ ہو گئی۔

گاڑی کے ساتھ چلتے ہوئے دونوں آدمیوں میں سے ایک نے نیفے میں ہاتھ ڈال کر ایک بدہیت سا پستول نکالا اور اسے ہاتھوں میں اچھالتے ہوئے بڑے سرسری سے لہجے میں بولا۔ "کہیں جا رہے ہو خداداد خان؟"

ابا نے کوئی جواب نہ دیا۔ انہوں نے بیلوں کی نکیل کھینچ کر جھٹکا دے کر انہیں دوڑانے کی کوشش کی لیکن دوسرے آدمی نے رسی پر ہاتھ ڈال دیا۔

"اتنی رات گئے کہیں جانا اچھا نہیں ہوتا۔" ریوالور والے نے ریوالور کا گھوڑا کھینچتے ہوئے کہا۔ ابا نے اب بھی کوئی جواب نہ دیا۔ اس شخص نے بیلوں کی رسی اتنی طاقت سے کھینچی کہ وہ بلبلا کر ایک دو قدم اٹھا کر رک گئے۔

"میں کہتا ہوں واپس گھر جاؤ۔" وہ شخص گرجا اور ابا کی طرف منہ کر کے تن کر کھڑا ہو گیا۔ ابا نے نہایت غیر محسوس طریقے سے ہاتھ پیچھے لا کر گاڑی میں چھپے ہوئے گدیلے کے نیچے سے کلہاڑی نکالی اور گاڑی پر کھڑے ہو کر اس شخص پر وار کرنے کے لیے کلہاڑی کو تیزی سے ہوا میں گھمایا لیکن وہ شخص اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔

"سنو خداداد.....!" وہ خوفناک لہجے میں غرایا۔ "میں آخری بار کہہ رہا ہوں کہ گھر واپس ....."

ابا نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے نیچے چھلانگ لگا دی اور ایک بار پھر کلہاڑی گھمائی۔ اس شخص نے وار خالی دیا اور اسی لمحے ایک بھیانک دھماکہ ہوا۔ میرے حلق سے گھٹی گھٹی سی چیخ نکلی۔ ابا سینہ تھام کر نشیب میں لڑھک گئے تھے۔ گولی پیچھے سے آئی تھی۔ ریوالور والے نے فائر نہیں کیا تھا۔ پیچھے سے ان کے دونوں ساتھی بھی دوڑتے ہوئے کے قریب آ پہنچے۔ میں دہشت سے سن بیٹھی دیکھ رہی تھی کہ نشیب میں ابا چاروں شانے چت پڑے تھے۔ ان کے جسم میں زندگی کی کوئی علامت نہیں رہی تھی۔

"تم بڑے جلد باز ہو۔" ریوالور والے نے بندوق بردار سے کہا۔

"میں سمجھا تھا تمہیں کلہاڑی لگ گئی ہے۔" بندوق بردار نے لاپروائی سے کہا۔ اس نے ابا کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ اچانک میرا سکتہ ٹوٹا اور میں پوری سے چیخنے لگی' مسلسل اور بے تکان..... ان میں سے ایک اچھل کر گاڑی پر چڑھا۔ طرح عقاب فاختہ کو دبوچتا ہے' اس طرح اس نے مجھے دبوچا اور ایک ہاتھ مضبوطی پر رکھ دیا۔

"گاڑی تم نے کہاں کھڑی کی تھی؟" دوسرے نے بیل گاڑی پر چڑھتے ہوئے

ساتھی سے پوچھا۔ اس کے لہجے میں ذرا بھی گھبراہٹ یا اضطراب کی جھلک نہیں تھی۔

"چودھری کریم کے ڈیرے پر۔" دوسرے نے جواب دیا۔

"چلو جلدی کرو۔ یہ مریل بیل پتہ نہیں کتنی دیر میں وہاں تک پہنچائیں گے۔" ایک بولا۔ وہ چاروں بیل گاڑی پر چڑھ چکے تھے۔ ایک نے رسی تھامی اور بیلوں کو درشتی سے ہانکنا شروع کیا۔

میں بری طرح مچلنے لگی۔ میں کہنا چاہتی تھی۔ "ظالمو! میرے باپ کی لاش تو ساتھ لے لو۔" لیکن میرے ہونٹوں پر سے سخت بے رحم ہاتھ کا بند نہ ٹوٹ سکا۔ میں زیادہ مچلی تو ریوالور والے نے ریوالور کا بھاری دستہ میری کنپٹی پر رسید کیا اور میرے حواس کی عمارت ڈھے گئی۔ آنکھوں کے سامنے نیلے پیلے دائرے بکھرے اور پھر گہری تاریکی چھا گئی۔

جب مجھے ہوش آیا تو سب سے پہلے میری نظر ایک بہت بڑے فانوس پر پڑی جو میرے پیروں کی سیدھ میں اونچی سی چھت میں جھول رہا تھا اور اس کے ان گنت پہلوؤں میں رنگ برنگی روشنیاں جھلمل جھلمل کر رہی تھیں۔ پھر مجھے ان بہت سی عورتوں کی موجودگی کا احساس ہوا جو میرے چاروں طرف بیٹھی تھیں۔ ان میں سے ایک میرا سر دبا رہی تھی اور کنپٹیوں پر کچھ مسل رہی تھی۔

دو عورتیں میرے تلوے اور دو عورتیں ہتھیلیاں سہلا رہی تھیں۔ دو عورتیں میرے جسم پر تیز خوشبو والے کسی سیال کی مالش کر رہی تھیں۔ مجھے اپنا وجود نہایت ہلکا محسوس ہو رہا تھا۔ ہوا میں ایک عجیب مہک رچی ہوئی تھی .....پھر اچانک مجھے اپنی بے لباسی کا احساس ہوا۔ میں نے سمٹنے کی کوشش کی لیکن عورتوں نے مجھے جنبش نہ کرنے دی۔

"میں کہاں ہوں؟" میں شاید کچھ اور پوچھنا چاہتی تھی لیکن میرے ہونٹوں پر یہ سوال آ گیا۔ سب عورتوں نے ایک دوسری کی طرف دیکھا' گویا فیصلہ کر رہی ہوں کہ کون جواب دے گی۔ وہ سب ہی جوان العمر تھیں اور خاص حد تک خوبصورت بھی لیکن ان کے چہروں پر عجیب سا پھیکا پن تھا۔ صرف ایک عورت جو میرے پہلو میں دائیں طرف بیٹھی تھی' قدرے بڑی عمر کی تھی۔ چہرے مہرے سے سب کی سب شوخ طبع اور افسردہ لگتی تھیں۔

"اپنی خواب گاہ میں اور کہاں۔" قدرے بڑی عمر کی عورت نے کہا۔

"میری..... میری تو کوئی خوابگاہ نہیں۔ یہ کونسی جگہ ہے؟" میرے حلق سے کمزور سی آواز نکلی حالانکہ میں نقاہت محسوس نہیں کر رہی تھی۔

"نواب صاحب کی زنانہ محل سرا۔" اسی عورت نے ملائمت سے کہا۔ "تمہیں گھبرانے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہاں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی' ہر آرام ملے گا۔"

"مجھے میرے گھر پہنچا دو۔ میرے ابا۔" میں نے دونوں ہاتھ منہ پر رکھ کر رونا چاہا لیکن

ہتھیلیاں سہلانے والیوں نے میرے ہاتھ نہ چھوڑے۔

"اب یہی تمہارا گھر ہے لڑکی! سب کچھ بھول جاؤ۔ چند دن میں تمہارا یہاں خوب دل لگے گا۔" عورتوں نے ناصحانہ لہجے میں کہا۔

"مجھے جانے دو۔" میں چلا اٹھی اور ساتھ ہی میں نے یک لخت اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی۔ میرے سر کے نیچے رکھے ہوئے تکیے اتنے ملائم تھے جیسے ہوا نے ریشم کا روپ دھار لیا ہو' بستر بھی ایسا ہی نرم اور گدیلا تھا۔ عورتوں سے اپنے آپ کو چھڑانے کی میری جدوجہد میں یہ سب کچھ اتھل پتھل ہو گیا۔ میرے ساتھ ساتھ ان کے چہرے پر بھی پسینے کی بوندیں ابھر آئیں۔

"بیکار میں اپنی جان ہلکان مت کرو۔" بڑی عمر کی عورت نے اپنی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "یہاں آنے کے ہزار راستے ہیں مگر جانے کا کوئی راستہ نہیں۔"

ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے میرے پہلو میں بیٹھی ہوئی عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس کا نام قدسیہ ہے۔ یہ بھی کم و بیش تمہارے ہی جیسے حالات میں یہاں آئی تھی۔ اس نے بھی بڑا واویلا کیا تھا۔ بعد میں ٹھیک ہو گئی تھی۔ صرف چار مرتبہ نواب صاحب نے اسے شرف خلوت بخشا اور بس' اتنے میں اس سے دل بھر گیا تو اسے انعام کے طور پر ایک کارندے کو بخش دیا۔ وہ نکاح پڑھوا کر لے گیا۔ دس ماہ گھر میں رکھا' پھر کسی بات پر اس سے ناراض ہوا۔ صرف تین مرتبہ اونچی آواز میں طلاق' طلاق' طلاق کہا اور دھکا دے کر گھر سے باہر کیا۔ پھر خود بھی جاگیر سے باہر کہیں بھاگ گیا۔ اسے باہر کہیں اور پناہ نہ ملی' خود ہی یہیں لوٹ آئی۔"

میں نے اس عورت کی طرف دیکھا' وہ باقیوں کی نسبت کم عمر تھی۔ اس کی پلکیں لمبی اور ناک ستواں تھی۔ رخسار دھنسے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود وہ اب بھی خوش شکل تھی۔ اس کے ہاتھ تو بہت ہی خوبصورت اور گداز تھے جن سے وہ میری مالش کر رہی تھی لیکن ان ہاتھوں میں حرارت نہیں تھی۔ میرے جسم کی حرارت بھی ان میں منتقل نہیں ہو رہی تھی۔ شاید ان میں اب حرارت جذب کرنے کی صلاحیت بھی نہیں رہی تھی۔ وہ بدستور اپنی خوبصورت لمبی پلکیں جھکائے یوں اپنے کام میں مصروف رہی گویا بات کسی اور کی ہو رہی ہو۔

"اور یہ دونوں بہنیں ہیں۔" بڑی عمر کی عورت نے میری پائنتی بیٹھی دو عورتوں کی طرف اشارہ کیا۔ "عذرا اور بشریٰ۔ ان کی ماں نے بھی یہیں جوانی گزار دی تھی' اب یہ بھی گزار رہی ہیں بلکہ یوں سمجھو کہ گزار چکی ہیں اور یہ جو تمہارے سرہانے بیٹھی ہے' اس کا نام سروری ہے۔ یہ اپنی مرضی سے یہاں آئی تھی۔ پہلے بڑی بیگم کے پاس ہوتی تھی۔

ایک روز پانی کا گلاس دینے یہاں نواب صاحب کے کمرہ خاص میں آئی' پھر واپس نہیں جا سکی۔ باقی رہی میں ......تو میں ذرا مختلف حالات سے ہوتی ہوئی یہاں آئی تھی۔ مجھے میرے سوتیلے باپ نے چند روپوں کے عوض بیچ دیا تھا۔ میرا نام نورجہاں ہے۔ تمہیں معلوم ہے ایک نورجہاں ملکہ بھی ہوتی تھی۔"

"تم سب کون ہو؟" میں نے وحشت زدہ ہو کر پوچھا۔

"کنیزیں۔" اس نے سادگی سے جواب دیا۔

"اور بیگمات کہاں ہیں......؟" میں نے پوچھا۔

"چار تو اسی محل کے مختلف حصوں میں رہتی ہیں۔ بڑی بیگم قریب ہی علیحدہ حویلی میں رہتی ہیں' باقیوں کا پتہ نہیں۔ بہت عرصہ ہو گیا ہے یہاں سے باہر گئے۔" نورجہاں نے جواب دیا۔ "تمہارے لیے بھی محل کا یہ علیحدہ حصہ مخصوص کیا گیا ہے۔"

احساس بے بسی سے میری آواز گھٹ کر رہ گئی۔ میں نے کچھ بولنا چاہا مگر نہ بول سکی۔ آنکھوں سے آنسو امڈ کر رخساروں پر ڈھلکنے سے پہلے کنپٹیوں پر سے ہوتے ہوئے تکیے میں جذب ہو گئے۔ نورجہاں نے ایک ملائم اور دبیز رومال سے میری آنکھیں پونچھیں اور جہازی مسہری سے اترتے ہوئے بولی۔ "اب اٹھ کر غسل کر لو اور لباس تبدیل کرو۔ طبیعت سنبھل جائے گی۔"

میں اٹھ بیٹھی۔ اپنے سراپا پر نظر پڑی تو مجھے اپنے آپ سے بھی حجاب آگیا۔ عورتوں میں سے کسی نے میرا بازو تھاما' کسی نے کمر میں ہاتھ ڈالا۔ میں اپنے پیروں پر چل رہی تھی لیکن انہوں نے بڑے محتاط انداز میں میرے گرد گھیرا ڈال رکھا تھا۔ طویل و عریض کمرے کے وسط میں ریشمی پردے جھول رہے تھے۔ انہیں ایک طرف کو سمیٹ کر دوسری طرف لے جایا گیا۔

سامنے دیوار میں دروازہ تھا۔ دائیں طرف دیوار کے ساتھ سیاہ لکڑی کی ایک عظیم الشان سنگھار میز لگی ہوئی تھی جس کا آئینہ دیوار کے تقریباً اس پورے حصے پر پھیلا ہوا تھا جو پردے کی حد فاصل سے پیچھے تھا اور یہ اتنا بڑا آئینہ بالکل بے جوڑ تھا۔ سنگھار کے سامان سے میز بھری پڑی تھی۔

نورجہاں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ غسل خانہ بھی طویل و عریض تھا' کمرے سے کچھ ہی کم تھا۔ فرش اور دیواریں چمکدار ٹائلوں سے مزین تھیں۔ سامنے کی دیوار پر اونچائی پر ٹینکی بنی ہوئی تھی جس کے نچلے حصے میں ٹونٹیاں اور فوارے نصب تھے۔ دیوار کے سامنے ہی سفید پتھر کی سیڑھیاں ٹینکی کے دہانے تک جا رہی تھیں۔ ایک طرف لمبی سی کارنس پر رنگ برنگے ولایتی صابن رکھے ہوئے تھے۔ کھونٹیوں پر چھوٹے بڑے سفید براق تولیے ٹنگے تھے۔

نورجہاں اور ایک دوسری عورت جس کا نام اس نے سروری بتایا تھا' میرے ساتھ ہی اندر آگئیں۔ میں نے انہیں باہر جانے کو کہا تو نورجہاں بولی۔

"دیہات سے آئی لگتی ہو۔ ایک دفعہ نہانے کا سلیقہ سیکھ لو' پھر یہ کام خود ہی کر لیا کرنا۔"

.....اور جس طرح انہوں نے مجھے نہلایا' اس طرح مجھے نہانے کا واقعی سلیقہ نہیں تھا۔ پانی نیم گرم اور خوشبودار تھا۔ اس سے گلاب کی مہک میرے جسم میں رچ گئی۔ پھر وہ مجھے غسل خانے کے دوسرے حصے میں لائیں جہاں دیوار کے ساتھ بنے ہوئے خانوں میں چند ملبوسات تہہ کیے رکھے تھے۔ انہوں نے میرے لیے سرخ سرخ زرتار جمپر اور ویسا ہی غرارہ منتخب کیا۔ یہ لباس میرے جسم پر یوں پورا رہا جیسے میرے لیے ہی سیا گیا تھا۔ پھر انہوں نے مجھے باہر لا کر سنگھار میز کے سامنے بٹھا دیا۔ نورجہاں دروازے پر گئی اور پٹ کھول کر باہر جھانکا' پھر نجانے کس سے کہا۔ "مشاطہ کو بھیج دو۔"

کچھ دیر بعد ادھیڑ عمر کی ایک چوڑی چکلی عورت اندر آئی جس نے اپنی **مشاطگی** کے تمام ہنر اپنے اوپر بھی جی بھر کے آزما رکھے تھے۔ نورجہاں سنگھار میز کے قریب کھڑی رہی' باقی کنیزیں باہر چلی گئیں۔ مشاطہ نے ایک لفظ منہ سے نکالے بغیر مشینی انداز میں میرا سنگھار شروع کر دیا۔

آج تک مجھے دلہن بنی ہوئی ہر لڑکی خوبصورت لگی تھی لیکن مشاطہ کی تقریباً پون گھنٹے کی مصروفیت کے بعد جب میں نے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا تو خودستائشی سے قطع نظر آج تک دیکھی ہوئی تمام دلہنیں اپنے سامنے ہیچ نظر آئیں۔ اپنے عکس پر مجھے اعتبار نہ آیا۔ کیا واقعی یہ میں تھی؟

"چشم بددور۔" نورجہاں نے بلائیں لیتے ہوئے کہا۔ "ہماری آنکھیں چکا چوند ہو رہی ہیں' نواب صاحب کا تو نجانے کیا حال ہوگا۔ اس محل میں چاند تو بڑے اترے لیکن آفتاب آج اترا ہے۔"

میرے کانوں میں اپنے گاؤں کی کسی عورت کے الفاظ گونج اٹھے۔ "جس گھر میں جائے گی اجالا کر دے گی۔" مگر یہ گھر تو نہیں تھا جہاں قسمت نے مجھے پہنچا دیا تھا۔ میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ حسن و نسوانیت کا یہ مذبح خانہ میرا مقدر ہوگا۔ میں نے تو ایک چھوٹے سے گھر کے خواب دیکھے تھے جہاں میرا راج ہوتا۔ ایک محبت کرنے والے کے سپنے دیکھے تھے جس کی میں عزت ہوتی۔ جو میرا' صرف میرا ہوتا۔ جس کے دم سے میری ہستی' سنورتی۔ کیا میرا حسین ہونا اتنا ہی بڑا جرم تھا کہ باپ اپنی زندگی دے کر مجھے سزا سے نہ بچا سکا.....؟

میرا معصوم ذہن نجانے کیا کیا سوچتا رہا اور شل ہو گیا۔ مشاطہ کب کی جا چکی تھی۔

میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ نورجہاں بازو سے تھام کر مجھے مسہری تک لائی اور گاؤ تکیوں کے سہارے بٹھاتی ہوئی بولی۔ "اب تم یونہی بنی سنوری رہا کرو۔ نواب صاحب کی آمد و رفت اب ادھر ہی رہے گی۔" پھر وہ کمرے پر الوداعی نظر ڈالتے ہوئے بولی۔ "اب میں چلتی ہوں کسی چیز کی ضرورت ہو تو مسہری کے قریب یہ لٹکی ہوئی ڈوری کھینچ دینا' خادم آجائے گا۔ مجھے بلوانا ہو تو اس سے کہہ دینا۔ کھانا وغیرہ یہیں آجائے گا.....اور دیکھو' ابھی چند دن تک باہر نکل کر ادھر ادھر جانے کی کوشش نہ کرنا' خوامخواہ الجھن میں پڑو گی۔" وہ مضمحل سے انداز میں مسکرائی اور رخصت ہو گئی۔

اس کے قدموں کی آواز معدوم ہوتے ہی میں مسہری سے اتر کر کھڑکی کی طرف بڑھی جس پر باریک پردے پڑے ہوئے تھے اور ان میں سے معمولی سی روشنی چھن چھن کر اندر آرہی تھی۔ میں نے بے تابی سے پردے ہٹائے لیکن یہ دیکھ کر دل بجھ گیا کہ کھڑکی میں سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ باہر سرسبز گھاس کا فرش' پھولدار پودوں کی کیاریاں اور دور ایک جگہ حوض کے درمیان فوارہ چلتا نظر آرہا تھا۔ باغیچے میں دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ میں کم از کم چھ سات گھنٹے بے ہوش رہی تھی۔

میں کھڑکی سے ہٹی تو دیوار کے ساتھ لگی ہوئی میز پر نظر پڑی۔ اس میز پر طشتریوں میں مختلف پھل سجے ہوئے تھے۔ مجھے بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے ایک سرخ سیب اٹھایا۔ چھری قریب ہی رکھی تھی لیکن میں سیب کو کاٹے بغیر کھانے لگی۔ آدھے سے زیادہ سیب کھا کر باقی میں نے کھڑکی کے راستے باغ میں پھینکا اور کمرے کا دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔

دروازہ ایک بیضوی ہال میں کھلتا تھا جو بالکل خالی تھا۔ اس میں صرف قالین بچھا ہوا تھا۔ اس کے دونوں سروں پر ایک ایک دروازہ تھا۔ میں دائیں طرف والے دروازے پر پہنچی اور اس کا لٹو گھما کر اسے کھولنے کی کوشش کرنے لگی۔ دروازہ باہر سے بند تھا۔ میری زور آزمائی سے تھوڑی سی آواز پیدا ہوئی اور فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔ میں باہر قدم رکھنے ہی لگی تھی کہ کسی نے بازو سے رستہ روک لیا۔ میں نے گردن نکال کر دیکھا' باہر ایک نوجوان مستعد کھڑا تھا۔ پہلی نظر میں تو مجھے اس پر عورت کا گمان گزرا تھا کیونکہ اس کی داڑھی مونچھیں چٹ تھیں اور وہ عورتوں جیسی گلابی گھیردار قمیض اور سبز چوڑی دار پاجامہ پہنے ہوئے تھا۔ کانوں میں بالیاں تھیں' کمر میں پٹکا بندھا ہوا تھا جس کے ساتھ چھوٹی سی نیام میں ایک خنجر جھول رہا تھا۔

"براہ کرم باہر تشریف نہ لائیں۔" اس نے مودبانہ لہجے میں کہا۔

"کیوں؟" میں نے حتی الامکان بارعب آواز میں پوچھا۔

"نواب صاحب کا حکم ہے۔" اس نے سر جھکا کر جواب دیا اور دروازہ بند کرنے لگا۔

مجھے پیچھے ہٹنا پڑا۔ میں نے اب دوسرے دروازے کا رخ کیا۔ یہاں بھی میرا سامنا اسی قسم کے ایک نوجوان سے ہوا۔ اس کا لباس بھی ویسا ہی تھا البتہ جسمانی لحاظ سے یہ اچھا خاصا تنومند تھا۔

میں کمرے میں لوٹ آئی اور پلنگ پر ڈھیر ہو گئی۔ پھر میری آنکھوں میں اباجی کا سراپا ابھر آیا اور بے اختیار میرے آنسو بہنے لگے۔ روتے روتے میری ہچکی بندھ گئی لیکن بلند و بالا سنگلاخ دیواروں والے اس مقبرے میں میری سسکیاں سننے والا اور میرے زخم دل پر پھاہا رکھنے والا کوئی نہ تھا۔ روتے روتے نجانے کب میری آنکھ لگ گئی۔ کسی نے میرا کندھا ہلایا تھا جس سے میری آنکھ کھلی۔ میں کروٹ لے کر سیدھی ہوئی تو دیکھا نورجہاں تھی۔

"ارے تو نے تو رو رو کر سارا کاجل خراب کر لیا ہے۔" وہ بولی۔

"بھاڑ میں گیا تمہارا کاجل۔ زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" میں چلا اٹھی۔

اس نے گویا میری بات سنی ہی نہیں۔ ایک رومال کا کونہ گیلا کر کے لائی اور میرے پپوٹے پونچھ دیئے۔ "کھانا کھا لو۔" اس نے ملائمت سے کہا اور میز کی طرف اشارہ کیا۔ میں مضمحل انداز میں اٹھ بیٹھی۔ میز پر کئی قسم کے کھانے رکھے ہوئے تھے۔ "اور کسی خاص چیز کی ضرورت ہو تو بتا دینا۔"

میں نے زخمی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے خاموشی سے گردن جھکا لی۔ چند لمحے خاموشی رہی' دفعتاً میں نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "تم کسی طرح مجھے یہاں سے نہیں نکال سکتیں؟"

اس نے سر اٹھا کر سپاٹ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "میں نے کہا ناں کہ یہاں آنے کے تو ہزاروں راستے ہیں' جانے کا کوئی راستہ نہیں۔" پھر ایک لمحے خاموش رہ کر بولی۔ "ایک مرتبہ ایک کنیز نے ایک لڑکی کو فرار ہونے میں مدد دی تھی۔" "پھر۔" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"اس کے سارے ناخن زنبور سے کھینچ لیے گئے تھے۔ ہنٹروں سے کھال ادھیڑ دی گئی تھی۔ پھر اس کے کمرے کے دروازے پر مردوں کی قطار لگا دی گئی تھی۔ وہ نوجوان تھی' پھر بھی یہ اذیتیں برداشت نہ کر سکی۔ کچھ دنوں بعد خون تھوکتی مر گئی۔ میری تو اب ایسی عمر بھی نہیں رہی۔"

یہ سب کچھ اس نے سپاٹ اور ہر جذبے سے عاری لہجے میں کہا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں دھواں ہی دھواں پھیل گیا تھا۔ میں نے جھرجھری لی تو وہ بولی۔ "اور سب سے تکلیف دہ بات تو یہ ہے کہ جس لڑکی کو اس نے بھگایا تھا' اسے آدھے گھنٹے سے بھی کم وقت میں ڈھونڈ کر محل میں حاضر کر دیا گیا تھا۔ نواب صاحب کے محافظوں کے پاس شکاری کتے ہیں اور خود محافظوں کی ناکیں ان کتوں سے بھی زیادہ تیز ہیں۔ جوان لڑکی کی خوشبو تو

انہیں دور ہی سے آجاتی ہے۔"

اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور قدرے بلند آواز میں بولی۔ "چلو کھانا کھا لو۔"

میں نے بمشکل چند لقمے زہرمار کیے اور واپس مسہری پر آکر لیٹ گئی۔ میرا اب بولنے' ہاتھ پاؤں ہلانے حتیٰ کہ سوچنے تک کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ میرے حواس شل ہو چکے تھے۔ کچھ دیر بعد دو کنیزیں آئیں اور برتن طشتریوں میں رکھ کر لے گئیں۔ نورجہاں بھی ان کے ساتھ چلی گئی۔

مجھے وقت کا احساس نہیں رہا تھا۔ نہ جانے کتنی دیر میں تاریک خلاؤں میں معلق رہی۔ جب میں نے ہاتھ پاؤں ہلانے اور سوئی ہوئی حسیات کو جگانے کی کوشش کی تو احساس ہوا کہ کمرے میں تاریکی پھیل رہی تھی۔ میں نے اٹھ کر بتی جلانے کا ارادہ کیا مگر دیر تک نہ اٹھ سکی۔ اندھیرا اور گہرا ہو گیا۔ نورجہاں ایک بار پھر کمرے میں آئی۔ وہ کچھ عجلت میں تھی۔ اس نے بتیاں روشن کیں اور کمرہ جگمگا اٹھا۔

"نواب صاحب تشریف لا رہے ہیں۔" اس نے اعلان کیا۔

میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ "ایسی تیسی تمہارے نواب صاحب کی۔" میں یک لخت پھٹ پڑی۔

اس نے متوحش نظروں سے میری طرف دیکھا اور تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔ کئی منٹ گزر گئے۔ بالآخر دروازہ کھلا اور پھر میں نے اس عفریت کو دروازہ پر کھڑے دیکھا۔ میری رگوں میں دوڑتا لہو نفرت کا لاوا بن گیا۔ ان کی رنگت پہلے سے زیادہ تاریک' پپوٹے پہلے سے زیادہ بھاری اور شکل پہلے سے زیادہ منحوس نظر آ رہی تھی۔ چہرے پر سرخ سرخ آنکھیں یوں دکھائی دے رہی تھیں جیسے توے پر دو انگارے پڑے ہوں۔ یہ آنکھیں ایک ٹک گھور رہی تھیں' جھپکنا بھول گئی تھیں۔ پھر دھیرے دھیرے ان کے بھدے ہونٹوں پر مکروہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"ہم نے ذہن میں نقشہ باندھا تھا کہ اس عمر میں تم نے کیا روپ نکالا ہو گا۔" انہوں نے وہیں کھڑے کھڑے بھاری آواز سے میرے پردہ سماعت کو چھیدتے ہوئے کہا۔ "لیکن تم نے تو ہمارے اندازوں کو مات کر دیا ہے۔ ماشاء اللہ ....ماشاء اللہ۔"

وہ ہاتھی کی طرح تھل تھل کرتے آئے اور مسہری کی پٹی پر بیٹھ گئے۔ میں اپنی جگہ پر اور سمٹ کر بیٹھ گئی۔

"تمہیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی حور بانو؟"

"میرے ابا کو قتل کروانے کے بعد آپ پوچھ رہے ہیں کہ مجھے کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔" میں نے جلتی آنکھوں سے انہیں گھورتے ہوئے زہریلے لہجے میں کہا۔

"بخدا ہم نے کوئی ایسا حکم نہیں دیا تھا۔" انہوں نے تیزی سے اپنے بیلچہ نما ہاتھ ہلائے۔ "یہ ایک حادثہ تھا۔ تمہارے ابا کی بیوقوفی کا نتیجہ.....بہرحال اب تم سب کچھ بھول جاؤ۔ ہم تمہاری ہر تکلیف کی تلافی کر دیں گے۔ تمہیں سونے میں تول دیں گے۔"

انہوں نے بڑے محبت بھرے انداز میں میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں نے ان کا ہاتھ جھٹک دیا۔ ان کی تنی ہوئی مونچھوں تلے سے مکروہ مسکراہٹ یک لخت غائب ہو گئی۔ ایک لمحے کے لیے انہوں نے سخت نظروں سے مجھے گھورا۔ میں بھی ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتی رہی۔

دھیرے دھیرے ان کی مسکراہٹ لوٹ آئی اور وہ کچھ آگے کھسکتے ہوئے بولے۔ "اس ناراضگی اور اکڑفوں سے فائدہ؟"

"آپ تو مجھ سے شادی کر رہے تھے۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

"اوہ۔" ان کے ہونٹ پھیل گئے۔ "کمسن مگر چالاک ہو۔ شادی سے بھلا کیا فرق پڑتا ہے۔ قبولیت تو یہاں ہونی چاہیے۔" انہوں نے دل پر انگلی رکھی۔ "جن سے شادی کر رکھی ہے' ان کے پاس جانے کو جی نہیں چاہتا.....بہرحال تمہیں اتنی ہی فکر ہے تو شادی بھی کر لیں گے' یہ کونسا مشکل کام ہے۔" انہوں نے بند گلے کے کوٹ کے اوپری بٹن کھول کر اس بار نہایت بے تابی سے دونوں ہاتھ میری طرف بڑھائے۔

میری تمام تر نفرت اور کراہت گویا اب ایک نقطے پر مرتکز ہو چکی تھی جس نے مجھے ہر خوف سے بے نیاز کر دیا تھا۔ میں نے پوری طاقت سے نواب صاحب کے منہ پر گھونسہ رسید کیا۔ وہ گوشت کا پہاڑ اپنی جگہ سے ہلا تو نہیں البتہ گردن جھٹکے سے پیچھے کو جھک گئی۔ جب گردن سیدھی ہوئی تو میں نے دیکھا کہ نواب صاحب کا نچلا ہونٹ درمیان سے پھٹ گیا تھا اور خون کی ایک پتلی سی لکیر ٹھوڑی پر پھسل آئی تھی۔

"لڑکی۔" وہ دھاڑے اور ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ٹھوڑی پر انگلی پھیر کر انہوں نے ایک نظر خون کی سرخی دیکھی اور اس انگلی سے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے غرائے۔ "یہ خون تمہیں اپنی زبان سے چاٹنا پڑے گا گستاخ۔"

انہوں نے مجھے تھپڑ رسید کرنے کے لیے ہاتھ گھمایا لیکن میں پھرتی سے ہٹی اور مسہری سے اتر گئی۔ وہ میرے پیچھے دوڑے' ہم مسہری کے گرد چکر کاٹنے لگے۔ میں نے بری طرح چیخنا شروع کر دیا۔ تب نواب صاحب بڑے اطمینان سے مسہری پر یوں بیٹھ گئے اور تکیہ کہنیوں کے نیچے کھینچ کر یوں دیکھنے لگے گویا کوئی دلچسپ تماشا ہو رہا ہو۔

"چیخو' خوب چیخو۔ کوئی نہیں سنے گا۔" انہوں نے پھولی سانسوں کے درمیان کہا۔

میں دروازے کی طرف دوڑی اور ایک موہوم سی امید کے ساتھ اسے کھولنے کی کوشش کی۔ وہ باہر سے بند تھا۔ دروازے سے ٹیک لگا کر میں نے بے بسی سے چاروں طرف دیکھا اور پہلی مرتبہ مجھے اس پنچھی کے محسوسات کا اندازہ ہوا جسے شکاری جال پھینک کر پکڑتے ہیں۔ چند لمحے خاموشی رہی۔ نواب صاحب دور بیٹھے فاتحانہ نظروں سے مجھے دیکھتے رہے' پھر انہوں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور اٹھ کر دونوں بازو پھیلا کر میری طرف بڑھے۔ میں نے دیوار کے ساتھ کھسکنا شروع کر دیا۔ کونے میں پہنچ کر میں گر گئی۔ نواب صاحب نے جھپٹ کر مجھے اٹھایا اور مسہری پر لا پٹخا۔

"ہم نے بڑی بڑی منہ زور گھوڑیوں کے گھٹنے ٹکوا دیے ہیں' تم کیا چیز ہو ننھی بلبل!" انہوں نے بڑے فخر سے کہا لیکن آدھے منٹ کی کشمکش اور ہاتھا پائی کے بعد وہ تھکے ہوئے

کتے کی طرح ہانپنے لگے۔ پر مجھے موقع ملا اور میں نے دونوں پاؤں جوڑ کر ان کے
پوری طاقت سے ضرب لگائی' وہ مسہری پر چت ہوگئے۔

عین اسی لمحے میرا ہاتھ قریب ہی میز پر رکھی ہوئی پھلوں کی ایک طشتری سے ٹکرا
طشتری الٹی تو مجھے اپنے ہاتھ پر کسی پتلی سی ٹھوس چیز کے لمس کا احساس ہوا۔ ایک ام
سے میرا دل اچھل کر گویا حلق میں آگیا۔ یہ پھل کاٹنے والی چھری تھی۔

نواب صاحب اٹھ کر ایک بار پھر مجھ پر جھپٹے تو میں نے اپنی بچی کھچی توانائی مجتمع کر
چھری سے ان کے پہلو پر وار کیا لیکن میری یہ کوشش ناکام رہی۔

نواب صاحب کا کوٹ نہایت دبیز کپڑے کا تھا اور چھری کا پھل نوکدار نہیں تھا' ا
سے گول تھا۔ تاہم نواب صاحب کو اتنی تکلیف ضرور پہنچی کہ ان کے حلق سے ہلکی سی
نکل گئی۔ ذرا پیچھے ہٹ کر انہوں نے میری کلائی پر ہاتھ ڈالا اور مجنونانہ انداز میں اسے
دیا۔ چھری میرے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جا گری۔ میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ جب
تک میرے دم میں دم ہے' شکست نہیں مانوں گی۔ مزید ایک آدھ منٹ کی کشمکش
نواب صاحب بے دم ہو گئے۔

"تو تم یوں نہیں مانو گی۔" انہوں نے اچانک مجھے چھوڑ دیا اور قریب ہی دیوار کے
ساتھ لٹکی ہوئی ڈوری کو جھٹکا دیا۔ میں نے مسہری سے اترنے کی کوشش کی تو انہوں
مجھے بالوں سے پکڑ لیا جو اب بری طرح بکھر چکے تھے۔ چند لمحے بعد دروازے پر دستک ہوئی

"سرداراں کو بھیج دو۔" نواب صاحب نے ہانپتے ہوئے بہ آواز بلند کہا۔ میری جدو
اب بھی جاری تھی۔ چند لمحے بعد بڑی آہستگی سے دروازہ کھلا اور کوئی اندر آگیا۔ درو
اس کے عقب میں بند ہو گیا۔ نواب صاحب نے اب خود ہی مجھے فرش پر دھکیل د
قدرے تھکے تھکے انداز میں سر اٹھا کر میں نے دروازے کی طرف دیکھا اور میرے لرز
جسم میں ایک نئے خوف کی سرد لہر دوڑ گئی۔ ایسا خوف مجھے نواب صاحب کو دیکھ کر بھی
محسوس نہیں ہوا تھا۔

آنے والی تھی تو عورت لیکن میں تصور تک نہیں کر سکتی تھی کہ کوئی عورت ا
بھی ہو سکتی ہے۔ اس کا قد کم از کم چھ فٹ تھا۔ زیادہ لحیم شحیم نہیں تھی مگر اس کا
مردوں کی طرح چوڑا چکلا تھا۔ رنگت گہری سانولی اور رخساروں کی ہڈیاں بہت ابھری ہو
تھیں۔ پتلے پتلے سفاک ہونٹ یوں سختی سے ایک دوسرے پر جمے ہوئے تھے کہ دہانے
جگہ محض ایک لکیر سی نظر آ رہی تھی۔

اس کی عمر کا اندازہ لگانا مشکل تھا' تاہم بال سیاہ ہی تھے جنہیں اس نے سختی سے اوپر
کھینچ کر سر کے بیچ میں جوڑا بنا رکھا تھا کہ اس کی پتلی پتلی بھنویں کمان ہو کر رہ گئی تھیں۔
وہ کسی سیاہ کھردرے کپڑے کا مردوں جیسا کرتا پاجامہ پہنے ہوئے تھی۔ آستینیں چڑ

ہوئی تھیں اور اس کی چوڑی چوڑی کلائیوں پر بال نظر آ رہے تھے۔ اس کے سراپا میں
خوفناک ترین چیز اس کی آنکھیں تھیں۔ میرے جسم میں دوڑنے والی سرد سی لہر کا باعث یہ
آنکھیں ہی تھیں۔ ان میں ایک عجیب سی پیاس تھی۔ خون کی پیاس سے بھی زیادہ خوفناک
اور یہ آنکھیں شاید جھپکنا تو جانتی ہی نہیں تھی۔

"سرداراں!" میرے عقب سے نواب صاحب کی آواز سنائی دی۔ "مدتوں بعد ایک
بڑھی کھیر آئی ہے۔"

"ہاں......مدتوں بعد.....!" عورت کے پتلے پتلے ہونٹوں میں جنبش ہوئی اور الفاظ ایک
سسکاری کی طرح برآمد ہوئے۔ اس کی نظریں بدستور مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر "شڑاپ۔"
کی ایک زوردار آواز سنائی دی اور تب میں نے دیکھا کہ عورت کے ہاتھ میں ہنٹر تھا۔
بمشکل تمام میں نے اپنی لرزتی ٹانگوں پر اپنے جسم کا بوجھ اٹھایا اور کھڑی ہو گئی۔

دفعتاً" مجھے خیال آیا کہ اگر میں دوڑ کر غسل خانے تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاؤں تو
اندر گھس کر کنڈی بند کر سکتی ہوں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس اقدام سے مجھے کیا فائدہ
پہنچے گا لیکن میرے ذہن میں ایک ہی صدا گونج رہی تھی۔ مزاحمت' مزاحمت!

ابھی میں غسل خانے کی طرف دوڑنے بھی نہ پائی تھی کہ شائیں کی آواز کے ساتھ ہنٹر
میری کمر میں آلپٹا اور اس سے پہلے کہ اس کا گھیرا کھل پاتا' سرداراں نے اپنی جگہ کھڑے
کھڑے ایک جھٹکے سے یوں مجھے اپنی طرف کھینچ لیا جیسے بنسی کو جھٹکا دے کر کانٹے میں
پھنسی ہوئی مچھلی کو کھینچا جاتا ہے۔

میں سیدھی اس کے سینے سے جا ٹکرائی لیکن اس نے میرا گریبان پکڑ کر مجھے اپنے سے
چند انچ کے فاصلے پر روک لیا۔ ہنٹر کو چھوڑ کر اس نے میرے گال پر زناٹے کا تھپڑ رسید
کیا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ سرداراں کا ہاتھ گویا لوہے کا ایک وزنی
پنجہ تھا۔ پھر اس نے گریبان کو نہایت مشاقانہ جھٹکا دیا اور میرا جمپر نیچے تک دو حصوں میں
تقسیم ہو گیا۔

سرداراں نے گھٹنے سے میرے پیٹ پر ضرب لگائی اور جونہی میں ابکائی سی لے کر آگے
کو جھکی' اس کی کہنی میری گدی پر پڑی۔ اس نے بالوں سے پکڑ کر مجھے اٹھایا اور دور پھینک
دیا۔ شڑاپ کی آواز ایک بار پھر گونجی۔ ہنٹر شاید میرے ہی جسم پر پڑا تھا مگر میری حسیات
اب جواب دے چکی تھیں۔ اچھا ہی تھا کہ ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا۔ اب یہی ایک
گوشہ عافیت تھا میرے لیے۔

مجھے نہیں معلوم کہ بے خبری کا یہ وقفہ کتنا طویل تھا۔ جب آنکھ کھلی تو جسم پھوڑے کی
طرح دکھ رہا تھا۔ جہاں تک نگاہ گئی' میں نے اپنے آپ کو خراش خراش پایا۔ یوں محسوس
ہو رہا تھا کہ میں غلاظت کی ایک دلدل سے نکلی ہوں جس میں ہزاروں سانپ' بچھوؤں نے

مجھے ڈسا ہے اور ان گنت جونکوں نے میرا لہو چوسا ہے۔

نورجہاں اور سروری میری مسہری پر دائیں' بائیں موجود تھیں اور ایک بار پھر خوشبودار چکنے سیال سے میری مالش کر رہی تھیں۔ میں نے یکے بعد دیگرے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ دونوں نے نظریں جھکا لیں اور اپنی مسیحائی میں مصروف رہیں۔ میرے دل میں ایک بے نام سناٹا چھا چکا تھا۔ کچھ کہنے' سننے یا جاننے کی خواہش مرگئی تھی بلکہ اندر سے شاید میں خود بھی مرچکی تھیں۔ آہستگی سے میں نے کروٹ لے لی۔ بستر کی چادر بدلی جا چکی تھی۔ میں نے ایک بازو پھیلا کر چہرہ چھپا لیا اور آنکھیں موند لیں۔ میرے حلق سے سسکی نہ نکلی' جسم میں کوئی حرکت نہ ہوئی۔ بس خاموشی سے آنکھوں سے آنسو بہہ کر تکیے میں جذب ہونے لگے' حتیٰ کہ میرے رخسار کے نیچے تکیہ بھیگ گیا۔ شاید میرا وجود ہی آنسو بن گیا تھا۔ تاسف اور شکست کا آنسو.....!

دونوں عورتیں خاموشی سے میری تیمارداری میں مصروف رہیں۔ وہ کچلے مسلے پھول پتیاں جوڑ رہی تھیں۔ نہ جانے کتنی دیر بعد میں نے نورجہاں کی آواز سنی۔ "اٹھو غسل کر لو۔" غسل میں خود ہی کرنا چاہ رہی تھی' ان دونوں کا سہارا لے کر اٹھ بیٹھی۔ غسل خانے تک چلنے میں بھی مجھے ان کے سہارے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

غسل کرنے اور نئے کپڑے پہننے کے بعد تن کی درماندگی تو دور ہوگئی' من کا پتھریلا پن جوں کا توں رہا۔ ایک کنیز کھانا لے کر آئی تھی۔ نورجہاں نے تقریباً زبردستی چند نوالے میرے حلق میں ٹھونسے' نہایت میٹھا اور گاڑھا سا کوئی شربت مجھے پلایا اور آرام کرنے کی تلقین کر کے چلی گئی۔

تیسرے دن پامال زمین پر اپنی فتح کا جھنڈا گاڑنے نواب صاحب پھر آئے۔ زمین کو اب اپنا مقدر معلوم ہو گیا تھا۔ اس لیے اس کی کوکھ سے کوئی زلزلہ نہ پھوٹا۔ نواب صاحب نے جب مزاحمت کے کوئی آثار نہ دیکھے تو بے حس دھرتی پر ان کے جھجکتے قدم کچھ تیز ہو گئے۔ مفتوح کی لاش پر فتح کا جشن رات بھر جاری رہا۔

اس کے بعد زندگی اس ڈھب پر آ گئی۔ غلاظتوں کی دلدل میں ہاتھ پاؤں مارنے کی بھی میں سکت نہ رہی۔ نواب صاحب پہلے پہلے تو ہر دوسرے تیسرے دن آتے تھے۔ پھر یہ وقفہ طویل ہوتا گیا۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ میں نے پورے ایک مہینے بعد ان کی شکل دیکھی۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ غلاظت کی دلدل میں میں کتنی گہرائی تک جا چکی تھی لیکن دل میں نفرت کی چنگاری اب بھی روشن تھی۔ اس شخص سے مجھے آج بھی روز اول ہی جتنی نفرت تھی لیکن یہ ایک مجبور نفرت تھی جسے اپنے ردعمل کے اظہار کا موقع نہیں ملتا جو اندر ہی اندر بس گھولتی رہتی ہے۔ انسان کے اعصاب کو ریزہ ریزہ کرتی رہتی ہے مگر کوئی راستہ

نہیں بھاتی۔

تقریباً پانچ ماہ بعد میں نے آئینے میں بغور اپنی شکل دیکھی۔ میری آنکھوں کے گرد حلقے نمودار ہو چکے تھے۔ سرخ و سفید رنگت پیلاہٹ میں بدل چکی تھی اور ہاتھ پاؤں ہر وقت سوئے سوئے رہتے تھے حالانکہ اونچی اونچی دیواروں والے اس شاہانہ قید خانے میں میرے لیے آسائشوں اور خدمت گاروں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ میرے لیے انواع و اقسام کے کھانے پکتے تھے اور میں اب انہیں کھاتی بھی تھی۔

میرے کمرے کی الماریاں ایک سے ایک انوکھے اور قیمتی ملبوسات سے بھری ہوئی تھیں۔ میری سنگھار میز پر ہیرے موتیوں کے زیورات کے کئی ڈبے موجود تھے۔ مجھے اب محل کے اس مخصوص حصے میں باہر نکلنے اور باغ میں جانے کی بھی آزادی تھی لیکن ایسے موقعوں پر کہیں نہ کہیں سے کسی نہ کسی کی آنکھیں میری طرف نگراں رہتی تھیں۔ کوئی نہ کوئی خواجہ سرا' کوئی نہ کوئی کنیز میرے آس پاس موجود رہتی تھی۔

میں چاہتی تو اس صورتحال کو اپنی شکست کا حرف آخر سمجھ کر سب کچھ سوچنا چھوڑ دیتی۔ جسم کے پامال کھنڈر کو اس کے حال پر چھوڑ دیتی مگر میرے سینے میں کوئی زخم تھا جو اندر سے مجھے مرنے نہیں دیتا تھا اور اس زندگی سے مجھے کوئی سمجھوتا بھی نہیں کرنے دیتا تھا۔ میں سوچتی رہتی تھی حتیٰ کہ ذہن شل ہو جاتا اور خیالوں کی بھول بھلیوں میں بھٹکتے بھٹکتے آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا تھا۔

کبھی کبھی میں تعین کرنے کی کوشش کرتی کہ میں کیا سوچتی ہوں؟ کیا میں اس پرتعیش قید خانے سے نکلنا چاہتی ہوں؟ لیکن فرار ہو کر میں کس کے پاس جاؤں گی؟ بے سہارا عورت کے لیے تو باہر کی دنیا بھی بھیڑیوں سے بھرا جنگل ہوتی ہے۔ ایک بھیڑیئے سے بھاگ کر میں کہیں ان گنت بھیڑیوں کے نرغے میں تو نہیں گھر جاؤں گی؟ لیکن ان تمام اندیشوں کے باوجود بہرحال میں اس فیصلے پر پہنچی کہ میں فرار ہونا چاہتی ہوں اور صرف فرار ہونا ہی نہیں چاہتی بلکہ اس بھیڑیئے کا سر بھی کچلنا چاہتی ہوں جس نے مجھے بھری پری دنیا سے یوں آسانی سے اٹھا کر اپنی خواہشوں کے کھونٹے سے باندھ دیا تھا اور کسی نے اس کی طرف انگلی تک نہیں اٹھائی تھی۔ کیا میں کسی بھیڑ بکری جتنی وقعت بھی نہیں رکھتی تھی؟ آخر میرا کیا جرم تھا؟

اپنی خواہش انتقام کبھی کبھی مجھے ایک ہوائی قلعہ لگتی اور میں سوچا کرتی کہ وہ سب عورتیں جو اس عشرت کدے میں زندہ دفن ہیں' ان سب نے یا ان سب میں سے بیشتر نے بھی شروع شروع میں میری ہی طرح سوچا ہوگا۔ قفس کی دیواروں سے بہت سر ٹکرایا ہوگا لیکن رفتہ رفتہ بال و پر نچ گئے ہوں گے۔ خواہش پرواز مرگئی ہوگی اور ذلتیں راس آگئی ہوں گی لیکن نہیں..... میں لرز کر سوچتی۔ میں تو اس ڈگر پر زندگی کی شام ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔

اب میں کھانا کھانے کے لیے کبھی کبھار کھانے کے کمرے میں بھی چلی جاتی تھی۔ یہاں کھانا کھانے کے لیے جو میز لگی ہوئی تھی' اس پر تیس افراد کے بیٹھنے کی گنجائش تھی لیکن عموماً مجھے تنہا ہی کھانا پڑتا۔ کبھی کبھار میں نورجہاں یا کسی اور کنیز کو اپنے ساتھ بٹھانے کی کوشش کرتی تو وہ بڑے ادب سے انکار کر دیتی۔

"ارے میں کونسا بیگمات میں سے ہوں جو تم یوں حد ادب قائم رکھتی ہو۔" میں زخمی مسکراہٹ کے ساتھ کہتی۔

"وہ تو ٹھیک ہے خانم! مگر آپ کا مرتبہ بیگمات والا ہی ہے۔" کنیز جواب دیتی۔

میں نے کئی مرتبہ نواب صاحب کو شادی کا وعدہ یاد دلایا تھا لیکن ہربار انہوں نے بات ٹال دی تھی۔ حالانکہ میرے خیال میں اب اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔ عزت اور توقیر کی متاع گم گشتہ تو اب واپس نہیں آسکتی تھی۔ پھر بھی نجانے کیوں میں نے کئی مرتبہ اصرار کیا تھا' شاید اپنی نسوانیت کی سربریدہ لاش پر پھاہا رکھنے کے لیے.....اور نجانے کیوں نواب صاحب ٹال مٹول سے کام لیتے تھے۔ حالانکہ یہ ان کے لیے بہت سہل کام تھا۔ جب چاہتے حق مہر کے بتیس روپے آٹھ آنے ہاتھ میں تھما کر طلاق' طلاق' طلاق کہہ کر محل سے رخصت کر سکتے تھے۔ جیسا کہ نجانے کتنی مرتبہ کر چکے تھے۔

پھر مجھے کسی نے بتایا کہ نواب صاحب کی بڑی بیگم جو ایک نوابزادی ہی تھیں اور جن کے پاؤں خاصے مضبوط تھے' خاصا ہنگامہ کھڑا کرکے نواب صاحب کے شادیوں کے شغل کو مزید جاری رہنے سے روک چکی تھیں۔ وجہ یہ نہیں تھی کہ اب اس عمر میں ان کے جذبہ رقابت نے انگڑائی لے لی تھی بلکہ بات صرف یہ تھی کہ اب وہ دولت و جائیداد کا مزید کوئی حصے دار پیدا ہوتے دیکھنا نہیں چاہتی تھیں۔

نواب صاحب کی اولاد رکھنے والی بیگمات علیحدہ علیحدہ حویلیوں میں رہتی تھیں۔ ان حویلیوں میں سے کبھی کبھار کوئی ادھر بھی آنکلتا۔ ایک بار میں باغ میں افسردہ بیٹھی گلاب کے پودوں پر مصلوب ان کلیوں کو دیکھ رہی تھی جو عنقریب کھلنے والی تھیں' دفعتاً ایک کنیز دوڑی دوڑی آئی۔ اس نے مجھے اطلاع دی جس کا مفہوم یہ تھا کہ نواب صاحب کے چوبیس عدد چھوٹے سرکاروں میں سے ایک سرکار تشریف لا رہے تھے۔ وہ یہ اطلاع دے کر الٹے قدموں لوٹ گئی۔

میں بھی اپنے کمرے میں جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی لیکن میں ابھی فوارے کے قریب ہی پہنچی تھی کہ بیس بائیس سال کا ایک خوش شکل سا لڑکا اچانک ہی سامنے آگیا۔ ایک کنیز کی گردن میں بازو ڈالے وہ یوں چل رہا تھا گویا تنہا چلنے کی اس میں سکت نہ ہو۔ سر پر چھوٹی سی مخصوص پگڑی تھی اور گلے میں موٹے موٹے جھلملاتے موتیوں کی مالا تھی۔ دور ہی سے اس کی نگاہ مجھ پر جم گئی تھی۔ اس کے نین نقش میں باپ کی جھلک قطعاً نہیں

تھی۔ میں اس کے قریب سے گزرنے لگی تو اس نے موٹی موٹی سرخ آنکھوں سے گھورتے ہوئے اچانک میری کلائی پر ہاتھ ڈال دیا۔

"یہ مغرور حسینہ کون ہے جس نے ہمیں آداب کرنے کی بھی زحمت نہیں کی؟" اس نے بدستور مجھے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"حضور!" کنیز نے مضطربانہ لہجے میں کہا۔ "یہ عزیزہ خانم ہیں' بڑے سرکار کی پسند۔ ان کی طرف ہاتھ بڑھانا آپ کو زیب نہیں دیتا۔"

"کیوں بھلا؟" نوابزادے نے دوسرا ہاتھ کنیز کے کندھے سے ہٹا کر لاپروائی سے ہلاتے ہوئے کہا۔ "داشتہ ہی تو ہے' کوئی منکوحہ تو نہیں ہے۔"

میرے پہلو میں جیسے کسی نے برچھی سی اتار دی۔ میں نے جھٹکا دے کر کلائی چھڑانا چاہی لیکن اس کی گرفت بے حد مضبوط تھی۔ وہ ایک طاقتور نوجوان تھا۔ میں نے دوسرا جھٹکا دیا اور اس بار میں اپنے جسم کی طاقت سے تو نہیں البتہ اپنی نفرت کی طاقت سے اس کی گرفت سے کلائی چھڑانے میں کامیاب ہوگئی۔ میں دوڑتی ہوئی اپنے کمرے میں پہنچی اور بستر پر گر کر بلک بلک کر رونے لگی۔ اتنی تذلیل اور اتنی بے وقعتی' میں نے کرب سے سوچا۔ اس سے تو بہتر ہے میں مرجاؤں۔

پھر میں دیر تک یہی سوچتی رہی کہ کس طریقے سے اپنی زندگی کا خاتمہ کر سکتی ہوں؟ اپنے آپ سے نفرت کا دھارا دھیرے دھیرے نواب صاحب کی طرف بہنے لگا۔ میں نے تہیہ کیا کہ جب مرنا ہی ہے تو کیوں نا اس عفریت کو بھی مار کر مروں۔ شاید میری اس قربانی سے مزید بہت سی زندگیاں برباد ہونے سے بچ جائیں لیکن مسئلہ یہی تھا کہ یہ کام کیسے کروں؟ مجھے تو اپنے آپ کو ہلاک کرنے کا ہی کوئی طریقہ نہیں سوجھ رہا تھا' اس عفریت کو موت کے گھاٹ اتارنا تو اس سے کہیں زیادہ دشوار تھا۔

قد کاٹھ کے اعتبار سے تو میں ایک بھرپور عورت تھی لیکن میری عمر پندرہ سال تھی۔ میرا دامن تجربے سے خالی تھا۔ اب تک صرف ایک ہی لرزہ خیز تجربے سے بار بار گزر رہی تھی .....اور یہ اپنی بربادی کا تجربہ تھا۔ ظلم اور جبر کے خلاف میرا کل اثاثہ میری نفرت تھی۔ میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا اور اگر ہوتا بھی تو مجھے کسی بھی ہتھیار کے استعمال کا تجربہ نہ تھا لیکن یہ بعد کی بات تھی۔ پہلا مسئلہ تو ہتھیار کے حصول کا تھا۔

کمرے میں کوئی ایسی چیز نہ تھی جسے میں ہتھیار کے طور پر استعمال کر سکتی۔ زہر مجھے کہیں سے مل نہیں سکتا تھا۔ پھر ایک خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں کوندا۔ ایک امید کے ساتھ میں بستر سے اٹھی۔ منہ ہاتھ دھویا اور کمرے سے نکل گئی۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ نوابزادے نے میرے کمرے کا رخ نہیں کیا تھا ورنہ اسے اندر آنے سے شاید کوئی نہ روک سکتا۔ دروازے میں اندر کی طرف کوئی کنڈی وغیرہ نہیں تھی' صرف باہر سے بند ہوتا

تھا اور جب بھی نواب صاحب آتے تھے' ایک خواجہ سرا بلا تاخیر اسے باہر سے بند کر دیتا تھا۔

ٹہلتی ٹہلتی میں کھانے کے کمرے میں پہنچی اور اس سے گزر کر پچھواڑے میں واقع باورچی خانے میں داخل ہوئی۔ میں پہلی مرتبہ باورچی خانے میں آئی تھی۔ یہاں تین باورچنیں ابھی سے رات کے کھانے کی تیاریوں میں مصروف تھیں۔ مجھے دیکھ کر وہ مودبانہ انداز میں اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"بیٹھی رہو' بیٹھی رہو۔" میں نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ "میں تو بس ویسے ہی وقت گزاری کی خاطر یہ دیکھنے آگئی تھی کہ رات کے کھانے میں تم کیا کچھ تیار کر رہی ہو۔" میں ان کے قریب ہی ٹہلنے لگی۔ وہ مجھے ان پکوانوں کے نام گنوانے لگیں جن کی وہ تیاری کر رہی تھیں۔

ان کے الفاظ پر میرا قطعاً دھیان نہیں تھا۔ ٹہلنے کے دوران غیر محسوس طور پر میری نظریں وسیع و عریض باورچی خانے کے مختلف گوشوں پر بھٹک رہی تھیں۔ ایک دیوار پر مجھے اوپر تلے لوہے کی کئی کھانچے دار پٹیاں سی نظر آئیں۔ ان پٹیوں پر پچاسوں چھوٹے بڑے چمچے اور کفگیر وغیرہ لٹکے ہوئے تھے اور انہی پٹیوں میں سے ایک پر مجھے اپنے مطلب کی چیز نظر آگئی۔ یہ سبزی کاٹنے کی ایک جیسی چار چھریاں تھیں۔ ان میں سے صرف ایک چھری مجھے درکار تھی جو سب سے زیادہ چمکیلی اور تیز دھار معلوم ہوتی تھی۔ چھری زیادہ بڑی اور مضبوط نہیں تھی لیکن اگر صحیح جگہ اور صحیح طریقے سے وار کیا جاتا تو مہلک ثابت ہو سکتی تھی۔ اب مسئلہ اسے دیوار سے اتارنے کا تھا۔

تینوں عورتیں ایک میز پر اپنے سامنے کئی تھال رکھے بیٹھی تھیں۔ ان میں سے ایک کا چہرہ اسی دیوار کی طرف تھا جس پر میرا گوہر مراد آویزاں تھا۔ بظاہر تو تینوں ہی عورتیں سر جھکائے اپنے اپنے کام میں مصروف تھیں لیکن مجھے احساس تھا کہ تھوڑے تھوڑے وقفے بعد وہ کن انکھیوں سے میری طرف ضرور دیکھ لیتی تھیں۔

میں ٹہلتے ٹہلتے دیوار تک جاتی تو میری ان کی طرف پشت ہو جاتی' ان کی طرف پشت کیے میں دیوار سے چھری اتارنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔ عین ممکن تھا کہ اس لمحے ان میں سے کوئی یا شاید تینوں کی تینوں ہی میری طرف دیکھ رہی ہوں۔ کئی منٹ تک ادھر ادھر ٹہلنے کے بعد مجھ پر مایوسی طاری ہونے لگی۔ ویسے بھی میری موجودگی اب بے جواز سی لگنے لگی تھی۔ میں خوامخواہ مختلف چیزوں میں مصنوعی دلچسپی ظاہر کر کے وقت گزار رہی تھی۔

دفعتاً میرے لیے امید کی کرن پیدا ہوئی۔ وہ عورت جو میری مطلوبہ دیوار کی طرف منہ کر کے بیٹھی تھی' چاولوں کا تھال لے کر اٹھی اور کونے میں اپنے پیچھے کافی فاصلے پر لگی

ہوئی پانی کی ٹینکی کے نیچے انہیں دھونے چلی گئی۔ میں جلدی سے دیوار کے عین قریب اس طرح کھڑی ہوگئی کہ دیوار پر لگی ہوئی لوہے کی کئی کھانچے دار پٹیاں میرے پیچھے چھپ گئیں۔

وہ عورت چاول دھونے لگی تو میں نے با آواز بلند کہا "ارے....دیکھو چاول گر رہے ہیں۔" حالانکہ جہاں میں کھڑی تھی' وہاں سے چاولوں کا تھال مجھے نظر ہی نہیں آرہا تھا۔ غیر ارادی طور پر باقی دونوں عورتیں بھی اسی طرف دیکھنے لگیں۔ میں نے اندازے سے اپنی مطلوبہ چیز کی طرف پیچھے ہاتھ بڑھایا۔ میری انگلیوں نے اس کے پھل کا لمس محسوس کیا اور دوسرے ہی لمحے میں نے اسے کھانچے سے باہر کھینچ لیا۔ اس سے پہلے کہ عورتیں میری طرف متوجہ ہوتیں' میں نے چھری اپنے کرتے تلے نیفے میں اڑس لی۔

"چاول دھوتے ہوئے چند دانے تو گر ہی جاتے ہیں خانم!" چاول دھونے والی عورت نے فرش کا جائزہ لینے کے بعد پلٹ کر ایک نظر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں سمجھی تھی زیادہ گر گئے ہیں۔" میں نے اپنی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ پھر چند سیکنڈ ادھر ادھر کی ہانکنے کے بعد میں باورچی خانے سے نکل آئی۔

اپنے کمرے میں آکر میں سیدھی غسل خانے میں پہنچی اور دروازہ بند کر کے چھری نکال کر اس کا جائزہ لیا۔ خاصی نوکیلی اور تیز تھی۔ اس کا لکڑی کا دستہ چھوٹا تھا۔ اچھی طرح گرفت میں نہیں آتا تھا۔ پھل بھی زیادہ لمبا نہیں تھا۔ نواب صاحب جیسے سانڈ کو ختم کرنے کے لیے کافی تھا۔ وہ میرے کمرے میں آتے تھے تو قربتوں کا ایک مرحلہ تو ایسا ضرور ہوتا تھا جب ان کا دبیز ملبوس اس چھری کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتا تھا۔

کمرے میں آکر چھری میں نے مسہری کے گدے تلے پٹی کے قریب چھپا دی اور ایک خاص زاویئے سے لیٹ کر کئی بار مشق کر کے دیکھا کہ ضرورت کے وقت میں غیر محسوس طریقے سے اسے نکال سکوں۔ مطمئن ہو کر میں آرام سے لیٹ گئی' اب مجھے صرف انتظار کرنا تھا۔

گیارہ دن گزر گئے اور نواب صاحب نہیں آئے۔ پہلے ان کی آمد کے تصور سے ہی میرا دل متلی کرنے لگتا تھا لیکن اب مجھے بے تابی سے ان کا انتظار تھا اور دن گویا صدیوں کے برابر ہو گئے تھے۔ بارھویں دن وہ آئے۔ بڑے ہشاش بشاش نظر آرہے تھے۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ موقع آیا جس کا مجھے انتظار تھا۔ میرا ہاتھ رینگتا ہوا گدے کے نیچے پہنچا۔ نواب صاحب اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ میرے ہاتھ کی یہ حرکت دیکھ سکتے۔

چھری ہاتھ میں آتے ہی میرا جسم سرد پڑ گیا۔ میں نے دستے پر گرفت مضبوط کی اور گوشت کے اس متحرک پہاڑ کے پہلو میں اتار دی اور چھری پر سے میری گرفت ہٹ گئی۔ میں اسے نواب صاحب کی پسلیوں سے نکال کر اپنے سینے میں گھونپنا چاہتی تھی لیکن اس

تھل تھل کرتے جسم میں یک لخت گویا پارہ بھر گیا تھا۔ گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر انہوں نے سب سے پہلے دیوار کے ساتھ لٹکی ہوئی ڈوری کھینچی' پھر میرا وہ ہاتھ پکڑ لیا جسے میں چھری کے دستے تک پہنچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ دستے کے اردگرد انہوں نے دوسرا ہاتھ سختی سے جما رکھا تھا جس سے خون کا بہاؤ رکا ہوا تھا۔

وہ اس بکرے کی طرح چیخ رہے تھے جسے نامکمل طور پر ذبح کر کے چھوڑ دیا گیا ہو۔ یہ زندگی اور موت کی کشمکش تھی جس میں مجھے زندگی نہیں' موت چاہیے تھی ان کی بھی اور اپنی بھی۔ مچھلی کی طرح تڑپ کر میں اٹھی اور اپنی کلائی چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے ان پر ٹوٹ پڑی۔ وہ پشت کے بل بستر پر گرے لیکن عین اسی لمحے انہوں نے میرے پیٹ میں لات رسید کی۔ میں مسہری سے کچھ دور فرش پر جا گری۔

اس سے پہلے کہ میں پیٹ پر پڑنے والی ضرب کی اذیت کو پی کر اٹھتی اور دوبارہ ان پر جھپٹتی' دروازہ کھلا۔ ایک خواجہ سرا نے اندر جھانک کر پہلے تو پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے فرش سے اٹھتے دیکھا' پھر اس کی نظر چیختے تڑپتے نواب صاحب پر پڑی اور اچانک اسے گویا صورتحال کا اندازہ ہوا۔ لپک کر اس نے ٹانگ پھنسا کر مجھے دوبارہ فرش پر گرایا اور میری گدی پر گھونسا رسید کیا۔ میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ دوسرے ہی لمحے اندھیرا چھٹا تو میں نے بمشکل گردن موڑ کر دیکھا' وہ میری کمر پر اپنا گھٹنا رکھے' اپنی پگڑی کھول کر میرے ہاتھ پشت پر باندھ چکا تھا۔ پھر وہ مجھے چھوڑ کر نواب صاحب کی طرف لپکا۔

''ڈاکٹر کو بلاؤ....اور حکیم کو بھی.....جلدی.....'' وہ خرخراتی آواز میں بولے۔ ''اور سرداراں کو بھی....بھیجنا.....اسے کہنا....اس خبیث اور ناشکری لڑکی کو خاص سزا دے...... آج سے اس پر .....ہمارا عتاب ہے۔''

خواجہ سرا باہر کو دوڑ گیا۔ میں نے اوندھے پڑے پڑے فرش سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوئی۔ میری حالت غیر ہو چکی تھی۔ بمشکل تمام میں کروٹ لے کر سیدھی ہوئی لیکن میرے بازو اس طرح میرے نیچے دب گئے کہ کندھوں میں شدید ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ ابھی میں اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ دو خواجہ سرا اور کئی کنیزیں دوڑتی ہوئی کمرے میں آئیں۔ خواجہ سرا نواب کی طرف متوجہ ہوگئے اور کنیزیں میری طرف۔

ایک خواجہ سرا نے نواب صاحب کے پہلو سے چھری نکالی اور زخم پر سختی سے ہاتھ رکھ دیا۔ دوسرے نے ایک چادر کی کئی تہیں کر کے اسے زخم پر جمایا۔ زیادہ خون بہنے نہیں پایا تھا۔ وہ عفریت ابھی ہوش میں تھا۔ مجھے غلیظ گالیاں بھی دے رہا تھا۔ چھری کی نوک یقیناً نواب صاحب کے دل تک نہیں پہنچی تھی۔ ان کے مجرب جسم نے انہیں بچا لیا تھا یا پھر شاید میں صحیح وار ہی نہیں کر سکی تھی۔

پھر سرداراں کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے جسم پر وہی مخصوص لباس' آنکھوں میں

وہی درندوں کی سی چمک اور ہاتھ میں وہی ہنٹر تھا۔ چہرہ اس وقت بھی ہر تاثر سے عاری تھا۔ نہایت پرسکون انداز میں اس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ کنیزوں کے جھرمٹ میں ''ہائے ہائے'' کرتے نواب صاحب کی نظر اس پر پڑی تو قدرے کمزور آواز میں بولے ''سرداراں! لے جاؤ اس....کو...''

سرداراں نے تفہیمی انداز میں سر کو نہایت ہلکی سی جنبش دی۔ اس کے پتلے پتلے سانولے ہونٹ سختی سے ایک دوسرے پر جمے ہوئے تھے۔ پھر وہ مجھ پر جھکی' اس کی موٹی موٹی انگلیوں والا پھیلا ہوا ہاتھ میرے سر کی طرف بڑھا۔ یہ ہاتھ کسی دیو پیکر عقاب کا پنجہ معلوم ہوتا تھا۔

میرے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر ایک جھٹکے سے اس نے مجھے فرش سے اٹھا لیا اور گھسیٹتی ہوئی کمرے سے باہر لے چلی۔ ہال سے نکلنے کے بعد وہ مجھے ایک ایسی سمت لے چلی جدھر جانے کی اس سے پہلے مجھے اجازت نہیں تھی۔ میں رکنے کی کوشش کرتی تو وہ مٹھی میں جکڑے ہوئے بالوں سے گردن کو ایسا جھٹکا دیتی کہ مجھے گردن ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوتی۔ ساتھ ہی وہ اپنے بھاری' مردانہ بوٹ سے میرے ٹخنے پر ایسی ٹھوکر رسید کرتی کہ میں بلبلا اٹھتی۔

ایک عظیم الشان اور آراستہ و پیراستہ ہال سے گزرنے کے بعد ہم ایک دروازے پر پہنچے جس پر بھاری تالا لگا ہوا تھا۔ ایک ہاتھ سے اپنی جیب سے چابیوں کا گچھا نکال کر سرداراں نے تالا کھولا۔ یہ ایک چھوٹا سا خالی کمرہ تھا جس کے کونے میں مکڑیوں نے جالے تان رکھے تھے۔ سرداراں نے دروازہ بھیڑنے کے بعد میری کمر پر گھٹنا مار کر مجھے ایک طرف دھکیلا اور تب میں نے دیکھا' اس طرف فرش میں چوکور خلاء تھا۔ یہاں سے سیڑھیاں نیچے جا رہی تھیں۔ گہرائی میں بتدریج تاریکی گہری ہو رہی تھی۔

سرداراں نے دیوار پر موجود ایک سوئچ دبایا اور سیڑھیوں میں روشنی ہو گئی۔ سیڑھیاں خاصی گہرائی تک چلی گئی تھیں اور اس کے اختتام پر لوہے کی موٹی موٹی سلاخوں والا ایک دروازہ تھا۔ سرداراں نے مجھے سیڑھیوں کی طرف دھکیلا۔

''نہیں۔'' پہلی مرتبہ میرے حلق سے دہشت بھری چیخ نکلی۔ میں نے پاؤں مضبوطی سے فرش پر جما لیے۔ میرے ٹخنے پر ایسی ٹھوکر پڑی کہ لڑکھڑا کر پہلی سیڑھی پر جا ٹکی۔ اگر میرے بال اس کی مٹھی میں نہ ہوتے تو یقیناً میں قلا بازیاں کھاتی نیچے پہنچ چکی ہوتی۔

''خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو.....معاف کر دو.....'' میں بلک اٹھی۔ اس نے میری ریڑھ کی ہڈی پر گھٹنا رسید کیا۔ میری چیخ نکل گئی اور پاؤں اگلی سیڑھی پر جا ٹکے۔ میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور جسم لرز رہا تھا۔

نیچے پہنچ کر اس نے ایک ہاتھ سے سلاخوں والے دروازے کا تالا کھولا اور مجھے اپنے

آگے آگے اندر دھکیلنے کے بعد اندر کی طرف تالا لگا لیا اور مڑ کر میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرائی۔ یہ مدھم سی مسکراہٹ اتنی خوفناک تھی کہ میرے جسم کی لرزش کچھ اور بڑھ گئی۔

یہ ایک طویل و عریض تہہ خانہ تھا۔ فرش' دیواریں اور چھت پتھر کی سلوں کی تھیں۔ اس کے باوجود یہاں سیلن تھی۔

چھت کے وسط میں تار کے سرے پر بلب جھول رہا تھا۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ کوٹھڑیوں کی قطار تھی۔ کوٹھڑیاں کیا بڑے بڑے پنجرے تھے۔ بمشکل چار فٹ اونچے دروازے لوہے کی سلاخوں والے ہی تھے۔ پنجرہ نما یہ تمام کوٹھڑیاں خالی تھیں لیکن انہیں دیکھ کر دہشت آتی تھی شاید اس تصور سے کہ ان میں انسانوں کو بند رکھا جاتا رہا ہوگا کیونکہ ہر پنجرے میں ایک ایک گھڑا اور ایک ایک ٹین کا ڈبہ موجود۔ شاید غلاظت کے لیے۔

سرداراں نے بالوں کو جھٹکا دے کر مجھے دور دھکیل دیا۔ میں پتھریلے فرش پر جا گری۔

"شڑاپ" ہنٹر کی آواز گونجی لیکن یہ میرے جسم پر نہیں پڑا تھا۔ سرداراں نے ہوا ہی میں گھمایا تھا۔ ہتھیلیاں ٹھنڈے فرش پر جما کر میں نے اپنے کپکپاتے جسم کو سنبھالا دینے کی کوشش کی اور اٹھنے ہی لگی تھی کہ **شڑاپ** کی آواز کے ساتھ ہنٹر کمر پر پڑا۔ میں بلبلا کر فرش پر لوٹ گئی۔ ایسا محسوس ہوا تھا جیسے کسی نے کند چھری سے پشت کا گوشت کھرچ دیا ہو۔

"خدا کے لیے سرداراں! مجھے معاف کر دو.....مجھ پر رحم کرو.....میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں....." میں نے بمشکل سر اٹھا کر آنسوؤں سے دھندلائی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ بڑی آہستگی سے وہ ایک ایک قدم اٹھاتی میری طرف بڑھی۔ میرے قریب پہنچ کر جوتوں کی ٹھک ٹھک رک گئی۔ میں اوندھی پڑی تھی۔ ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ بمشکل میں نے گردن کچھ اوپر اٹھا کر دیکھا۔ سرداراں میرے سر پر ٹانگیں چوڑی کیے تنی کھڑی تھی۔ دفعتاً وہ ہنٹر گلے میں لٹکا کر جھکی اور میرے ہاتھ کھولنے لگی' شاید اسے مجھ پر رحم آگیا تھا لیکن نہیں.....یہ میری خوش فہمی تھی۔

ہاتھ کھول کر اس نے ایک بار پھر بالوں سے پکڑ لیا اور ایک جھٹکے سے مجھے سیدھا کھڑا کر دیا۔ میری لرزتی ہوئی ٹانگیں جسم کا بوجھ اٹھانے سے قاصر تھیں لیکن سرداراں کی طرف سے رحم کی توقع نے کچھ سہارا دیا۔ اس نے میری آنکھوں میں جھانکا اور دوسرے ہی لمحے الٹے ہاتھ کا تھپڑ میرے منہ پر رسید کر دیا۔ میں ایک بار پھر فرش پر جا گری۔

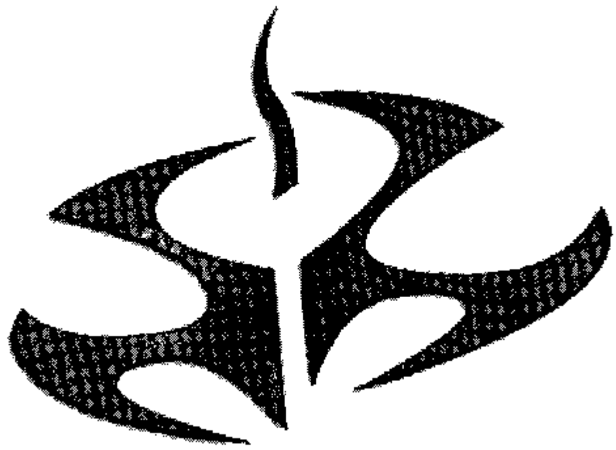
نفرت کی تپش میرے سینے میں تمام تر قوت کے ساتھ جاگ اٹھی۔ سرداراں سے رحم کی توقع عبث تھی۔ مجھے اپنے دفاع کے لیے کوشش کرنی چاہیے' میں نے اپنے آپ کو سمجھایا۔ میرے ہاتھ اب کھلے تھے اور سرداراں بے شک کتنی بھی غیر معمولی تھی لیکن بہرحال ایک عورت تھی۔ میں نے اپنی بچی کھچی توانائی کو مجتمع کیا اور اس بار جیسے ہی

سرداراں نے بالوں سے پکڑ کر مجھے اٹھایا' میں نے پوری قوت سے اس کے پیٹ میں لات رسید کر دی۔ میرا پاؤں جیسے لوہے کے کسی ستون سے ٹکرایا اور جھنجھنا کر رہ گیا۔ فوراً ہی میں نے اس کے سینے پر دونوں ہاتھوں سے گھونسے رسید کیے مگر اس نے اپنی جگہ سے جنبش تک نہ کی اور نہ ہی اس کے حلق سے کوئی آواز خارج ہوئی۔

میں نے سہمی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں شعلے ناچ رہے تھے۔ میرا جسم ایک بار پھر لرز اٹھا۔ وہ غیر معمولی نہیں شاید مافوق الفطرت عورت تھی۔

"تمہاری حملہ کرنے کی عادت گئی نہیں۔" وہ زخمی شیرنی کی طرح غرّائی۔ "بہرحال فکر نہ کرو۔ میں بڑے بڑے سورماؤں میں سے یہ عادت نکال دینے میں مشہور ہوں۔"

یک لخت اس نے میرے گریبان میں ہاتھ ڈالا اور چرر کی آواز کے ساتھ میری قمیض جو اس وقت میرا کل لباس تھی' میرے جسم سے علیحدہ ہوگئی۔



ایک جھٹکے سے اس نے مجھے نیچے گرا دیا اور مجھ پر ٹوٹ پڑی۔ اب وہ مجھے پیٹ نہیں رہی تھی بلکہ دانتوں سے میرے جسم کے مختلف حصوں کو چبا رہی تھی۔ میں اس بکرے کی طرح فرش پر تڑپنے لگی جسے باندھے بغیر ذبح کیا جا رہا ہو۔ تڑپتے تڑپتے میں نہ جانے کہاں سے کہاں جا پہنچی لیکن سرداراں بدستور آسیب کی طرح مجھ سے چمٹی ہوئی تھی۔

کئی بار میں نے تڑپ کر اٹھنے کی کوشش کی لیکن اس کی کلائی میرے حلق پر سختی سے آجمی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ مجھے زندہ چبا جانا چاہتی تھی لیکن نہیں ....وہ جسم کے ہر حصے کو دانتوں تلے تھوڑا سا کچل کر چھوڑ دیتی تھی اور پھر کسی اور حصے پر دانت گاڑ دیتی۔

بالآخر اذیت میری برداشت سے باہر ہو گئی اور چیختے چیختے میں بے ہوش ہو گئی۔ اذیت کا مدھم مدھم سا احساس اب بھی باقی تھا لیکن پھر رفتہ رفتہ ذہن پر چھائی ہوئی تاریکی گہری ہوتی گئی۔ آخری احساس مجھے یہی ہوا کہ شاید میں موت کی آغوش میں اتر رہی ہوں۔

پھر نجانے کتنی دیر بعد حسیات بیدار ہوئیں لیکن کئی مرتبہ آنکھیں جھپکنے کے باوجود نظر کچھ نہ آیا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کسی یخ بستہ سمندر کی تہہ میں پڑی ہوں۔ جسم سن تھا اور چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی۔ احساس اور بیدار ہوا تو یہ تاریکی دھیرے دھیرے چھٹنے لگی اور اس کے ساتھ ہی گویا جسم میں ہزاروں پھوڑوں کی دکھن ابھر آئی۔ جسم کا ہر ریشہ گویا زخم بنا ہوا تھا۔

دھیرے دھیرے میری آنکھیں اس زرد روشنی کو محسوس کرنے کے قابل ہوئیں اور تبھی مجھے وہ سلاخیں نظر آئیں جو میرے پیروں کے قریب سے چار فٹ اونچی چھت تک پہنچ رہی تھیں۔ میری ٹانگیں سکڑی ہوئی تھیں۔ میں نے انہیں حرکت دینے کی کوشش کی تو اذیت ناک ٹیسوں کے ساتھ دوسرا احساس یہ ہوا کہ میں انہی پنجرہ نما کوٹھریوں میں سے ایک میں بند ہوں جنہیں میں کچھ دیر قبل دیکھ چکی تھی۔ اس کوٹھری کی ساخت ایسی تھی کہ انسان نہ تو سیدھا لیٹ سکتا تھا اور نہ ہی سیدھا کھڑا ہو سکتا تھا۔

کئی منٹ کی جدوجہد کے بعد میں اٹھ کر بیٹھنے میں کامیاب ہوئی اور اس عمل کے دوران غیر ارادی طور پر میرے حلق سے نہ جانے کتنی گھٹی گھٹی چیخیں نکل گئیں۔ سانس کچھ معمول پر آئی تو میں نے اپنا جائزہ لیا۔ میرے جسم پر اب بوری کی طرح موٹے اور

کھردرے کپڑے کا موٹا اور ڈھیلا ڈھالا لبادہ تھا۔ اسے الٹ پلٹ کر میں نے اپنے آپ کو دیکھا۔ میری حالت اس خرگوشنی سے مشابہ تھی جسے کئی شکاری کتے جھنجھوڑنے کے بعد محض اس لیے چھوڑ کر آگے بڑھ گئے ہوں کہ وہ پہلے ہی سے شکم سیر تھے۔ جسم پر جا بجا گڑے ہوئے دانتوں کے نشان نیلے پڑ چکے تھے اور ان سے خون رس رس کر کھرنڈ کی طرح جم گیا تھا۔

میں رونا چاہتی تھی لیکن آنسوؤں کے سوتے شاید خشک ہو چکے تھے۔ حلق سے صرف گھٹی گھٹی چیخیں یا اذیت بھری سسکاریاں نکلتی تھیں۔ قریب ہی لکڑی کی ایک ٹرے پڑی تھی جس میں دو تندوری روٹیاں جو محض دیکھنے سے ہی لکڑی کی طرح اکڑی ہوئی لگتی تھیں اور دال کا ایک پیالہ رکھا تھا۔ نہ جانے میں کتنی دیر بے ہوش رہی تھی اور یہ ٹرے کب سے میرے پاس رکھی تھی اور مجھے کچھ کھائے ہوئے بھی نہ جانے کتنا وقت گزر چکا تھا لیکن بھوک کا کوئی احساس نہیں تھا۔ بے پناہ سردی اور روئیں روئیں سے اٹھتی ہوئی ٹیسیں ہر احساس پر حاوی تھیں۔

جانے کتنی دیر تک میں ساکت بیٹھی سلاخوں کو گھورتی رہی۔ ایک موہوم سی امید کے سہارے کہ یہ سب کچھ شاید ایک بھیانک خواب ہے اور ابھی منظر بدل جائے گا لیکن کچھ بھی نہ بدلا۔ سلاخیں بدستور ایستادہ رہیں' سامنے پھیلا ہوا طویل و عریض ہال اور اس کا پتھریلا فرش اور دیواریں جوں کی توں رہیں۔ چھت کے وسط میں لٹکا ہوا دھندلا دھندلا سا بلب بھی وہیں موجود رہا۔

جب مجھے یقین ہو گیا کہ یہ منظر بدلنے والا نہیں تو میں سلاخوں کو تھام کر بصد مشکل اٹھ کھڑی ہوئی۔ جسم پر گویا پھر ان گنت زخموں کے منہ کھل گئے مگر اب یہ اذیت شاید جسم کا ہی ایک حصہ بن گئی تھی۔ میں نے سلاخوں پر مشتمل دروازے کو ہلانے کی کوشش کی لیکن وہ صرف ذرا سا کھڑکھڑا کر رہ گیا۔ تب میں نے دیکھا کہ باہر موٹی سی کنڈی میں ایک زنگ آلود تالا جھول رہا تھا۔ میرے ہاتھ بے جان سے ہو کر سلاخوں پر نیچے کو پھسلتے چلے گئے اور میں ایک بار پھر دھپ سے سنگی فرش پر بیٹھ گئی۔

اب مجھ پر نیم بے ہوشی سی طاری تھی۔ ایک دھندلا سا احساس تھا کہ شاید قریب ہی میں نے کہیں لوہے کے دروازے کی کھڑکھڑاہٹ سنی تھی' پھر جیسے کسی نے میرا سر تھوڑا سا اوپر کر اٹھا کر کسی گداز چیز پر رکھ دیا۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا' ایک اجنبی عورت مجھ پر جھکی ہوئی تھی اور میرا سر اس کے زانو پر تھا۔

"عزیزہ خانم! میری آواز سن رہی ہو۔" اس نے سرگوشی کی اور نہایت آہستگی سے میرا کندھا ہلایا۔ میں نے ہولے سے اثبات میں سر ہلانے کی کوشش کی تو سر پھوڑے کی طرح دکھ اٹھا۔ اس عورت نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے مٹی کے پیالے سے تھوڑا سا پانی میرے

حلق میں ٹپکایا۔ حلق کچھ تر ہوا تو میں نے اشارے سے اور پانی مانگا۔ اس نے پیالا میرے ہونٹوں سے لگایا تو احساس ہوا کہ میرے ہونٹ بھی کٹے پھٹے اور سوجے ہوئے تھے۔ چار گھونٹ پینے کے بعد میری نظروں کی دھندلاہٹ کچھ کم ہوئی اور جسم میں زندگی کی رمق محسوس ہوئی۔

"میں زیادہ دیر یہاں نہیں رک سکتی۔" عورت نے سرگوشی کی۔ "پہلے بھی میں کھانا لے کر آئی تھی تو تمہیں ہوش میں لانے کی کوشش کی تھی لیکن کامیابی نہیں ہوئی تھی۔" اس نے گریبان میں ہاتھ ڈال کر ٹین کی ایک گول ڈبیا نکالی۔"

"یہ نورجہاں نے بھیجی ہے۔" اس نے ڈبیا میرے پاس رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ ایک خاص مرہم ہے۔ نورجہاں نے کسی بہانے سے بڑے حکیم سے حاصل کیا ہے۔ اسے اپنے زخموں پر ضرور لگا لینا۔ نورجہاں کہہ رہی تھی کہ انسانی دانتوں کے زخم بہت زہریلے ثابت ہوتے ہیں۔"

"کیا نورجہاں یہاں آئی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ اسے تو یہاں آنے کی قطعاً اجازت نہیں ہے کیونکہ سرداراں یہی سمجھتی ہے کہ وہ تم پر کچھ نہ کچھ مہربان ہے۔" عورت نے جواب دیا۔

"تو پھر اسے میرا حال کیسے معلوم ہوا؟" میں نے نحیف آواز میں پوچھا۔

"اسے خوب اچھی طرح اندازہ تھا کہ سرداراں نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا ہوگا اور کچھ میں دیکھ کر گئی تھی۔ میں نے اسے بتایا تھا۔" عورت بولی۔

"اور تم کون ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میں؟ میں بھی کنیز ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ آپ سے میرا سامنا صرف ایک مرتبہ ہی ہوا ہے۔ اچھا اب میں چلتی ہوں۔ اس نے میرا سر زانو سے ہٹا کر بڑی احتیاط سے پتھریلے فرش پر ٹکا دیا۔

"اس مردود.... خبیث.... نواب کا کیا حال ہے؟ کیا وہ زندہ بچ گیا؟" میں نے اپنی ناہموار سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔" اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ خون کافی بہا ہے لیکن نواب صاحب کی حالت خطرے سے باہر ہے۔ بڑے حکیم صاحب کا کہنا ہے کہ وہ چند دنوں تک بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔

تنگ کوٹھری میں بمشکل سمٹ سمٹا کر وہ اٹھی اور جھکی جھکی ہی آہنی دروازہ کھول کر نکل گئی۔ تالا لگا کر اس نے سلاخوں کے درمیان سے جھانکتے ہوئے کہا۔ "ہو سکے تو کچھ کھانے کی کوشش کرنا۔ مجھے افسوس ہے کہ فی الحال میں تمہیں اس سے بہتر کھانا فراہم نہیں کر سکتی' نگرانی بہت سخت ہے۔" پھر وہ مڑی اور تیزی سے ہال کے بڑے گیٹ کی طرف چلی

دی جو چھوٹے سے بلب کی کمزور سی روشنی کی زد سے دور تھا۔

اس تہہ خانے میں زندگی کی رفتار کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ وقت گویا اپنی جگہ تھما رہتا تھا۔ دن یا رات کا کوئی پتا نہ چلتا۔ مجھے نہیں معلوم کہ کتنی دیر بعد معدے میں اٹھنے والی ٹیس سے مجھے بھوک کا احساس ہوا۔ میں نے سوکھی روٹی کو دال میں بھگو کر کھانے کی کوشش کی۔ چند لقمے تو پیٹ میں چلے ہی گئے جس سے مجھے اپنی نقاہت میں کچھ کمی محسوس ہوئی۔

اب میں نے مرہم کی ڈبیا کھولی۔ یہ سفیدی مائل بے رنگ سی چیز تھی۔ میں نے زخموں کا جائزہ لیا تو ان کا گویا کوئی شمار ہی نہ تھا۔ پورا جسم ہی زخموں سے بھرا ہوا تھا اور مرہم ان کے لیے ناکافی تھا۔ بہرحال میں نے ہر زخم پر تھوڑا تھوڑا لگانا شروع کیا۔ انگلی کے لمس سے ہر زخم میں اذیت کی ایک نئی لہر دوڑ جاتی تھی۔

اس کام سے فارغ ہو کر مجھے ایک گونہ سکون کا احساس ہوا۔ مرہم واقعی جادو اثر تھا کہ زخموں کی اذیت یک لخت ہی معدوم سی ہو گئی تھی۔ میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں گویا مفقود ہو گئی تھیں۔ شاید یہ شکست کی علامت تھی۔ جب تک میری روح نے ہتھیار نہیں ڈالے تھے' میں کچھ نہ کچھ سوچتی رہتی تھی۔ نجات کا کوئی طریقہ' بغاوت کا کوئی انداز' چھٹکارے کی کوئی تدبیر' لیکن اب دل میں محض ایک بے نام سناٹا طاری تھا۔ اندیشے' امیدیں' خواہش اور جرات سب کچھ ہی ختم ہو چکا تھا۔

دفعتاً" اس خالی الذہنی کے عالم میں پہلی مرتبہ میں نے محسوس کیا کہ تہہ خانے ہی کے کسی دور افتادہ اور نظر نہ آنے والے حصے سے وقفے وقفے سے کچھ آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ کبھی یہ آوازیں درندوں کی غراہٹ سے ملتی جلتی محسوس ہوتی تھیں اور کبھی انسانوں کی بڑبڑاہٹ سے۔ کبھی کبھی کوئی کراہ سنائی دیتی تھی اور کبھی کوئی گھٹی گھٹی اور بہت ہی مدھم سی چیخ۔

احساس تنہائی نے اتنا خوفزدہ نہیں کیا تھا جتنا ان آوازوں نے۔ میں نے اپنی جگہ سے حرکت کیے بغیر اس سمت دیکھا جدھر سے یہ آوازیں آتی تھیں۔ بائیں طرف جہاں تہہ خانہ بظاہر ختم ہوتا دکھائی دیتا تھا' وہاں دیوار میں لوہے کا ایک بڑا سا جالی دار دروازہ تھا۔ اس دروازے کے عقب میں اندھیرا تھا لیکن دیکھنے پر احساس ہوتا تھا کہ شاید تہہ خانے کا ایسا ہی ایک حصہ اس طرف بھی ہے جو مجھے اپنی جگہ سے نظر نہیں آ رہا تھا۔

اگلی مرتبہ کنیز وہی دال روٹی پر مشتمل کھانا لے کر آئی تو میری حالت پہلے سے بہت بہتر تھی۔ میرے پوچھنے پر اس نے جھجکتے ہوئے بتایا کہ دروازے والی دیوار کے پرلی طرف واقعی تہہ خانے کا دوسرا حصہ ہے اور اس طرف آمد و رفت کا راستہ دوسرا ہے' وہاں مرد قیدیوں کو رکھا جاتا ہے۔

اس کی زبانی مجھے یہ سن کر کوئی خاص حیرت نہ ہوئی کہ ان مردوں میں سے بعض پندرہ پندرہ برس سے وہاں قید تھے اور ان میں سے اگر کسی کے لواحقین موجود تھے تو انہیں ان کے بارے میں قطعاً کوئی علم نہ تھا۔ وہ ان بے چاروں پر صبر کر چکے تھے۔ یہ قیدی نواب صاحب یا ان کے خاندان کے کسی نہ کسی فرد کے معتوب تھے اور انہیں ان مویشی خانے نما زندان میں ڈلوانے کے بعد کسی کو ان کا نام تک یاد نہیں رہا تھا۔ مجھے یہ سن کر اس لیے حیرانی نہیں ہوئی کہ مجھے تو بہت پہلے ہی احساس ہو چکا تھا کہ اندھیر نگری میں کچھ بھی بعید نہیں۔ خدا کی دھرتی پر یہ ایک علیحدہ ہی خدائی تھی۔

اس پنجرے میں میرے اندازے کے مطابق مجھے چھ یا سات دن گزر چکے تھے۔ جب سرداراں کی مکروہ صورت ایک بار پھر مجھے دکھائی دی۔ میرا دل ڈوب سا گیا۔ اس عورت سے مجھے واقعی خوف آنے لگا تھا۔ ایک ایسا خوف جو ہڈیوں تک میں اتر جاتا ہے۔ اتنا خوف میں نے کبھی نواب صاحب کی صورت دیکھ کر بھی محسوس نہیں کیا تھا یا شاید اس کی نوعیت مختلف تھی۔

کوٹھری کا دروازہ اس نے پورا کھول دیا اور دونوں ہاتھ کولہوں پر ٹکا کر تن کر میرے سامنے کھڑی ہوگئی۔ ہنٹر اب بھی اس کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ سرخ سرخ آنکھوں سے وہ مجھے ایک ٹک گھور رہی تھی اور اس کی نظریں گویا میرے جسم کے پار ہوتی جا رہی تھیں۔ میں اس مختصر سی کوٹھری میں اور سمٹ سکڑ گئی۔ سرداراں کے چہرے سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ یہاں بلامقصد یا محض مجھے دیکھنے نہیں آئی بلکہ میرے خیال میں تو وہ بلا مقصد یا چھوٹے موٹے کام سے تو کہیں بھی نہیں آتی تھی۔ وہ عورت نہیں بلکہ شاید خاص کاموں کے لیے سدھایا ہوا درندہ تھی۔

کھڑے کھڑے یک لخت وہ جھکی اور میرے الجھے الجھے بالوں کو اپنے خاص انداز میں مٹھی میں جکڑ کر اس نے جھٹکے سے مجھے کوٹھری سے باہر کھینچ لیا۔ میرے بالوں کی جڑوں میں گویا سینکڑوں زخموں کے منہ کھل گئے تھے۔ سرداراں نے پہلے جتنی مرتبہ یوں مجھے بالوں سے پکڑ کے اٹھایا تھا، ابھی اس کی دکھن ختم نہیں ہوئی تھی۔

"تو اب بھی خاصی ترو تازہ نظر آرہی ہے۔" میرا چہرہ اپنے چہرے کے قریب لاتے ہوئے وہ سانپ کی طرح پھنکاری۔ "میں تجھے کچلی اور مسلی ہوئی دیکھنا چاہتی ہوں۔ جیسا میں تجھے چھوڑ کر گئی تھی۔"

"سرداراں!" میں نے لرزتی آواز میں کہا۔ "کیا تجھے مجھ پر رحم نہیں آتا؟ آخر تو بھی ایک عورت ہے۔ مجھے معاف کر دے۔" میں نے جھک کر اس کے پیروں کو چھونا چاہا لیکن اس کا وہ ہاتھ ساکت رہا جس سے اس نے میرے بال جکڑے ہوئے تھے، اس لیے میں جھک نہ سکی، کراہ کر رہ گئی۔

"عورت.....!" اس کی پھنکار کچھ اور زہریلی ہو گئی۔ "تجھے کس نے کہہ دیا کہ میں عورت ہوں.....؟ مجھے کبھی عورت نہیں سمجھا گیا.....اور مجھے نفرت ہے اس لفظ سے.....عورت ہونہہ.....عورت تو تو ہے، کمزور، بے بس، رحم کی بھکاری!"

"لیکن اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں سرداراں!" میں نے گڑگڑا کر کہا۔ "میں تو تجھے عورت ہی سمجھتی ہوں اور مجھے کمزور، بے بس تو حالات نے بنا دیا ہے۔"

"قصور؟" اس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر بے حد مدھم مگر نہایت سفاک مسکراہٹ ابھری۔ "تیرا قصور یہ ہے کہ تو کمزور اور بے بس ہو کر اپنی مرضی کی زندگی گزارنا چاہتی ہے، الو کی بچی!!" اس نے نفرت سے مجھے فرش پر دے مارا۔ میرا سر ہل کر رہ گیا۔ کوشش کے باوجود میں فوری طور پر اٹھ نہ سکی۔

"آج نواب صاحب کی طبیعت کچھ سنبھلی ہے۔" سرداراں نے گویا مجھے اطلاع دی۔ "اور انہوں نے پہلی بات مجھ سے یہی پوچھی تھی کہ میں نے تجھے صحیح سبق دے دیا ہے کہ نہیں۔ تب مجھے یاد آیا کہ میں تو اپنا کام ادھورا چھوڑ کر گئی تھی۔"

"نہیں..... نہیں....." میں بے اختیار چلا اٹھی۔ اس کے پتلے پتلے ہونٹوں کے عقب سے جھانکتے ہوئے نوکیلے سے دانتوں کی جھلک دیکھ کر میرے جسم میں سوئی ہوئی اذیتیں جاگ اٹھیں لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس بار سرداراں اپنی مشق ستم دہرانے کا ارادہ نہیں رکھتی بلکہ درندگی کا ایک نیا ہی باب رقم کرنے آئی ہے۔ اس نے ایک بار پھر میرے بال مٹھی میں جکڑے اور مجھے گھسیٹتی ہوئی ایک طرف کو لے کر چلی۔

میں نے مزاحمت کی، فرش پر ہاتھ پاؤں مارے مگر سپاٹ پتھریلے فرش پر کوئی ایسی چیز نہ تھی جسے میں تھام سکتی۔ جب وہ رکی تو میں نے دیکھا، وہ تہہ خانے کے وسط میں حد فاصل کا کام دینے والے دروازے پر کھڑی تھی۔ میرے بال چھوڑ کر اس نے پھرتی سے یوں میرے نرخرے پر پاؤں رکھ دیا گویا کوئی بھیڑیا اپنے نیم جاں شکار کو تڑپتے پھڑکتے دیکھ کر محظوظ ہو رہا ہو۔ میری گردن اس نے کچھ اس انداز سے بھاری بوٹ تلے دبائی تھی کہ جونہی میں نے اس کے نیچے سے نکلنے کی کوشش کی، مجھے فوراً محسوس ہوگیا کہ اگر میں نے ذرا بھی مزید حرکت کی تو میری گردن ٹوٹ جائے گی یا نرخرہ پچکنے سے سانس کی آمد و رفت موقوف ہو جائے گی۔

اسی عالم میں اس نے نہایت اطمینان سے چابیوں کا گچھا نکال کر آہنی دروازے کا تالا کھولا اور مجھے ایک بار پھر بالوں سے پکڑ کر اٹھایا اور اندر کی طرف سے دوبارہ تالا لگا چکی تھی۔ میں نے ارد گرد دیکھا، یہاں اتنا اندھیرا نہیں تھا جتنا دور سے نظر آتا تھا۔ میرے عقب میں کافی فاصلے پر اسی طرح ایک دھندلا سا بلب چھت میں لٹکا ہوا تھا، جس طرح اس حصے میں تھا جہاں میں مقید تھی۔ یہی نہیں بلکہ تہہ خانے کا یہ حصہ ہوبہو ویسا ہی تھا۔ فرق

صرف یہ تھا کہ اپنے حصے میں قیدی صرف میں ہی تھی اور یہاں شاید کوئی پنجرہ خالی نہیں تھا۔

سرداراں نے اچانک میرے پیٹ پر لات رسید کی اور میں بلبلا کر لڑھکتی ہوئی روشن حصے میں پہنچ گئی۔ میرے دائیں طرف پنجروں کی قطار تھی۔ ہر پنجرے میں کوئی نہ کوئی قیدی یا تو اکڑوں بیٹھا تھا یا سلاخوں کو تھامے کھڑا تھا اور متجسس انداز میں سلاخوں کے درمیان سے جھانک رہا تھا۔ ان میں ہر عمر کے مرد تھے اور سب کی داڑھیاں اور سر کے بال جھاڑ جھنکاڑ کی طرح بڑھے ہوئے تھے۔ آنکھیں دھنسی ہوئیں اور رخساروں کی ہڈیاں مردوں کی طرح ابھری ہوئی تھیں۔ ان کے غلیظ جسموں پر چیتھڑے جھول رہے تھے۔ وہ زمانہ غار کے انسان معلوم ہوتے تھے۔ لاغر جسموں سے قطع نظر ان کے چہروں پر وہی حیوانیت اور آنکھوں میں وہی وحشت تھی جس کا تصور زمانہ غار کے انسان کے حوالے سے کیا جا سکتا ہے۔

"کیا حال ہے گیدڑو! سرداراں نے ہنٹر کو ہوا میں جھٹکا دے کر کہا۔ "تم سب زندہ ہو؟ کوئی مرا تو نہیں؟؟"

کسی پنجرے سے کوئی جواب نہ آیا۔ سب سہمی سہمی نظروں سے سرداراں کی طرف دیکھ رہے تھے گویا کوئی عفریت ہو اور وہ اس کی زبان سمجھنے سے قاصر ہوں۔

"میں تالے کھولنے لگی ہوں۔ تم سب باہر آکر قطار میں کھڑے ہو جاؤ۔" سرداراں نے ہنٹر لپیٹ کر نیفے میں اڑس لیا اور ڈھیلے ڈھالے لبادے کی جیب سے لمبی نال کا ایک خوفناک ریوالور نکال لیا۔

دائیں ہاتھ میں ریوالور سنبھال کر اس نے بائیں ہاتھ میں موجود چابیوں کے گچھے سے صرف ایک چابی منتخب کرکے سارے تالے کھول دیئے۔ چودہ پنجروں میں قیدی تھے' صرف ایک پنجرہ خالی تھا۔ تالے کھولنے کے بعد سرداراں پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ شکار پر نکلے ہوئے چیتے کی طرح چوکنی نظر آ رہی تھی۔

"اب باہر آجاؤ۔" اس نے حکم دیا۔ تمام قیدی فرمانبردار غلاموں کی طرح باہر آئے اور پنجروں کے سامنے ہی قطار میں کھڑے ہو گئے۔ میں ان کے سامنے تھی اور سرداراں میرے عقب میں ریوالور سنبھالے کھڑی تھی۔ "آج تمہاری دعوت شیراز ہے۔" سرداراں نے قیدیوں کو مخاطب کیا اور تب میرے ذہن میں چھناکا سا ہوا۔ اسکا مطلب سمجھ کر میں سر سے پاؤں تک لرز کر رہ گئی۔ میرے حلق سے گھٹی گھٹی چیخ نکلی۔ میں نے راہ فرار کی تلاش میں ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ میرے دائیں بائیں بڑے بڑے آہنی دروازے تھے۔ عقب میں بلند و بالا دیوار تھی اور سامنے پنجروں کی قطار۔

دہشت کے ان لمحوں میں بھی ایک ثانیے کے لیے مجھے ان مردوں پر حیرت ہوئی جو

پنجروں سے باہر آکر بھی بھوکی نظروں سے ایک ٹک صرف مجھے دیکھ رہے تھے۔ ان کے ذہنوں میں اس خیال کا شاید گزر تک نہیں تھا کہ وہ کوشش کریں تو اس اکیلی عورت سرداراں کو قابو کر سکتے ہیں اور اپنی رہائی کی تدبیر کر سکتے ہیں۔ شاید انہیں یاد ہی نہیں رہا تھا کہ آزادی بھی کوئی چیز ہے یا شاید سرداراں کی ہیبت مجھ سے زیادہ ان پر تھی۔

کوئی راہ فرار نہ پانے کے باوجود میں دوڑ پڑی۔ جیسے دیواریں یا کوئی آہنی دروازہ خود بخود مجھے راستہ دے دے گا۔ اپنے عقب میں سرداراں کا بھیانک قہقہہ سن کر میرے شکستہ اعصاب جھنجھنا اٹھے۔ پھر میں نے اس کی بلند آواز سنی جس میں ایک عجیب سی کھنک شامل ہو چکی تھی۔ "گیدڑو! وہ دیکھو..... خرگوشنی بھاگ رہی ہے..... کھڑے منہ کیا تک رہے ہو!؟"

پھر جیسے تہہ خانے میں غیر انسانی غراہٹوں' مسرت بھری اور دیوانگی آمیز سی چیخوں کا طوفان مچ گیا اور بھیڑیوں کا ایک غول میرے تعاقب میں دوڑ پڑا۔ میں زیادہ دیر تک نہیں دوڑ سکی۔ انہوں نے چاروں طرف سے مجھے گھیر لیا اور بھوکے کتوں کی طرح مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ چیختے چیختے میری آواز معدوم ہو گئی اور ہوش و حواس نے میرا ساتھ چھوڑ دیا۔ آخری آواز جو میں نے سنی' وہ سرداراں کے دیوانہ وار قہقہوں کی تھی۔

اس بار جب میری آنکھوں میں روشنی لوٹ کر آئی تو میں اپنی کوٹھری ہی میں تھی لیکن میرا وجود شاید ہزاروں چٹانوں تلے پس کر ریزہ ریزہ ہو چکا تھا یا ان گنت آریوں سے کاٹ کر اسے ریشہ ریشہ کر دیا گیا تھا۔ جب مجھے صحیح طور پر احساس ہوا کہ میں زندہ ہوں تو اس زندگی پر بے حد ندامت ہوئی۔ نہ جانے کیوں قدرت نے میرے اندر اتنی قوت برداشت رکھ دی تھی۔ کاش میں مر چکی ہوتی۔

اپنے آپ سے ندامت اور نفرت کے ان جاں گسل لمحات میں اپنے دریدہ بدن اور شکستہ دل کی ٹیسوں کو جھیلتے ہوئے میں نے صرف ایک ہی بات سوچی کہ آئندہ جب بھی میرا سرداراں سے سامنا ہوا تو خواہ میرا حال کچھ بھی ہو' میں اس پر ٹوٹ پڑوں گی اور اسے مجبور کر دوں گی کہ وہ محض مار پیٹ کر مجھے ایک بار پھر نیم جاں کرکے نہ چھوڑ جائے بلکہ موت کے گھاٹ اتار دے۔ دل میں یہ مصمم ارادہ کرکے مجھے قرار سا آگیا۔

لیکن اس کے بعد دن پر دن گزرتے گئے اور سرداراں تہہ خانے میں دوبارہ دکھائی نہ دی۔ وقت کے ساتھ ساتھ جیسے میرا احساس فنا ہو گیا۔ مجھے شاید صحیح طور پر یاد بھی نہ رہا تھا کہ میں کون تھی اور کس طرح یہاں تک پہنچی تھی۔ جانوروں سے بھی زیادہ غلیظ اور مکروہ زندگی گویا میرے وجود میں رچ بس گئی۔ میرا ذہن شاید میرے تن سے جدا ہو کر کہیں پیچھے رہ گیا تھا یا شاید اس بری طرح شل ہو چکا تھا کہ سوچنا' محسوس کرنا اس کے بس کی بات نہیں رہی تھی۔ مجھے زندہ صرف اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ میرے جسم میں سانسوں کی آمد

د رفت جاری تھی ورنہ معنوی اعتبار سے شاید میں مرچکی تھی۔

میرے ہاتھوں کی لکیروں میں میل اس طرح جم چکی تھی کہ اب بے تحاشہ بڑھے ہوئے ناخنوں سے بھی نہیں نکلتی تھی۔ اگر لکیروں سے تقدیر کا واقعی کوئی تعلق ہوتا ہے تو وہ یقیناً اس میل میں دفن ہو چکا تھا۔ میری جلد کی اصل رنگت بھی میل کے نیچے چھپ چکی تھی اور عجیب بات یہ تھی کہ مجھے اب اپنے آپ سے گھن بھی نہیں آتی تھی۔ میں نے کہا ہے نا کہ معنوی اعتبار سے شاید میں مرچکی تھی۔ کھانا لانے والی کنیز نے ایک بار بتایا کہ مجھے اس قید میں اترے دو سال گزر چکے ہیں تب بھی مجھے کوئی خاص حیرت نہ ہوئی۔

اس کے چند دن بعد ایک عورت بدحواسی کے سے عالم میں تہہ خانے میں آئی۔ کانپتے ہاتھوں سے اس نے کوٹھری کا دروازہ کھولا۔ چابیوں کا گچھا اس کے ہاتھ سے گر گر جا رہا تھا۔ میں آڑی ترچھی لیٹی لاتعلقی سے اسے دیکھتی رہی۔ اس کی شکل مجھے کچھ شناسا سی محسوس ہو رہی تھی۔

"عزیزہ! اٹھو.... جلدی سے باہر آؤ۔" اس نے دروازہ کھول کر گھبرائی ہوئی سی آواز میں کہا۔ ایک لمحے کے لیے تو گویا مجھے یاد ہی نہ آیا کہ عزیزہ میرا ہی نام ہے۔ پھر میں سست سے انداز میں اٹھ بیٹھی۔

غالباً میری آنکھوں میں لاتعلقی کی جھلک دیکھ کر وہ تیزی سے اندر آئی اور گھٹنوں کے بل میرے قریب بیٹھ کر مجھے بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے بولی۔ "آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟" اور اس سوال کے ساتھ میرا سرتاپا جائزہ لیتے ہوئے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

"میں نورجہاں ہوں۔" اس نے گلوگیر آواز میں کہا اور تب جیسے کچھ بھولی بسری سی پرچھائیاں میرے ذہن میں روشن ہو گئیں' یادداشت کا کوئی گم شدہ حصہ جیسے لوٹ آیا۔

"آج کھانے کی میز پر نواب صاحب اور ان کے بڑے بیٹے کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔" نورجہاں نے ہانپتے ہوئے بتایا۔ "بیٹے نے باپ پر گولی چلا دی۔ محل میں بھگدڑ مچی ہوئی ہے۔ افراتفری میں سرداراں سے چابیوں کا گچھا گر گیا۔ میرے دل میں پہلا خیال یہی آیا کہ شاید قدرت نے مجھے تمہاری مدد کرنے کا موقع فراہم [illegible] ہے۔ اس سے پہلے کہ سرداراں کو چابیوں کے گچھے کی عدم موجودگی کا احساس ہو' میں تمہیں محل سے نکالنا چاہتی ہوں لیکن تم بھی کچھ ہمت کرو۔ یوں بت بن کر نہ بیٹھو۔"

اس نے بازو سے پکڑ کر مجھے اٹھایا اور ساتھ لے کر تہہ خانے کے بڑے دروازے کی طرف دوڑی لیکن میں دوڑنے کے بجائے اس کے ساتھ تقریباً گھسٹ رہی تھی۔ میرے پاؤں چلنا بھول چکے تھے اور میں یوں لڑکھڑا رہی تھی گویا ہموار فرش کے بجائے پتھروں کے ڈھیر پر دوڑنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ کوٹھری سے نکل آنے کے باوجود میری کمر کبڑوں کی طرح جھکی ہوئی تھی۔ دو سال میں نے اس کوٹھری میں گزارے تھے جہاں سیدھے ہونے کی

گنجائش ہی نہیں تھی اور سر جھکائے بیٹھ بیٹھ کر میری ریڑھ کی ہڈی میں مستقل خم پڑ گیا تھا' شاید میں چوپایہ بن گئی تھی۔

نورجہاں نے تہہ خانے سے نکلتے وقت کوٹھری اور بڑے دروازے کا تالا دوبارہ لگا دیا تھا۔ سیڑھیوں کے دروازے سے نکل کر ہم طویل راہداری میں آئے جہاں ملگجا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ نورجہاں اندھا دھند دوڑ رہی تھی۔ کافی دیر تک اس کے ساتھ گھسٹنے کے بعد میرے قدم سیدھے پڑنے لگے تھے لیکن کمر کو اب بھی سیدھا کرنے کی کوشش کرتی تو ریڑھ کی ہڈی میں درد محسوس ہوتا۔ اب ہم باغ میں دوڑ رہے تھے جو ختم ہونے میں نہیں آرہا تھا۔ میں بری طرح ہانپ رہی تھی لیکن نورجہاں مجھے سانس درست کرنے کا موقع نہیں دے رہی تھی۔

خدا خدا کرکے ہم ایک دیوار تک پہنچے۔ نورجہاں نے رک کر چند گہری سانسیں لیں اور اپنا بڑا سا دوپٹا اتار کر مجھے دیتے ہوئے بولی۔ "یہ رکھ لو۔ تن ڈھانپنے کے کام آئے گا۔ یہ ٹاٹ کی قبا تو آگے سے بالکل کھلی ہے۔"

پھر وہ مجھے راستہ سمجھاتے ہوئے بولی۔ "یہ دیوار پھاند کر تم جس سڑک پر پہنچو گی' اسے پار کرکے میدان میں بھاگتی جانا۔ آگے نہر آئے گی' اس کا پل عبور کرکے جنگل شروع ہو جائے گا۔ پل کی سیدھ میں جنگل کو عبور کرنا۔ آگے چند فرلانگ پر ایک بستی ہے۔ کسی طرح وہاں تک پہنچ جانا' اس کے بعد کیا ہوگا یا تمہیں کیا کرنا ہوگا' میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ اب جاؤ' خدا حافظ!"

پھر وہ چاروں ہاتھ پیروں پر جھک گئی۔ "میری کمر پر چڑھ کر دیوار پھلانگ لو' جلدی کرو۔" اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔

میں اس کی بات سمجھنے کے باوجود چند لمحے تک تو عمل کرنے سے قاصر رہی۔ اس نے میری پنڈلی پر زور سے گھونسا مارا تو میں گویا کسی تنویمی سی کیفیت سے چونک اٹھی اور اس کی کمر پر چڑھ گئی۔ دیوار سے پرلی طرف زمین خاصے نشیب میں نظر آرہی تھی' تاہم میں نے خالی الذہنی کے سے عالم میں [illegible] ندھیرے میں چھلانگ لگا دی۔

ایک لمحے کے لیے تو گویا میرا منجمد دماغ ہل کر رہ گیا۔ سنبھل کر میں نے اردگرد دیکھا۔ چاروں طرف ویرانی کا راج تھا۔ سامنے پتلی سی سڑک اندھیرے میں مدغم نظر آرہی تھی۔ یہ سڑک پار کرکے میں ریتیلے میدان میں بھاگنے لگی۔ بھاگتے بھاگتے میں دو مرتبہ بے دم ہو کر گری لیکن کھلی ہوا کے لمس نے گویا جسم میں آزادی کی مردہ طلب کو نئی زندگی دے دی تھی۔ اس لیے میں تھک ہار کر پڑی رہنے کی بجائے ہر مرتبہ ایک نئے حوصلے سے اٹھ کر دوڑنے لگی۔ میری تمام حسیات ایک طویل مدت تک خوابیدہ رہنے کے بعد بیدار ہو چکی تھیں۔

میدان ختم ہوا تو میرے سامنے نہر آگئی۔ اس وقت تک اندھیرا گہرا ہو چکا تھا اور مجھے اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ پل پر پہنچنے کے لیے مجھے دائیں جانا چاہیے یا بائیں؟ خوش قسمتی سے تھوڑے ہی فاصلے پر مجھے پل نظر آگیا۔ پل عبور کرنے کے بعد میں جنگل میں داخل ہوئی۔ شروع میں درختوں کا سلسلہ گنجان نہیں تھا۔ گنجان حصہ شروع ہوا تو ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

کئی مرتبہ میں درختوں سے ٹکرائی اور مجھے یہ بھی اندازہ نہیں رہا کہ میں سیدھی جا رہی ہوں یا میرے سفر کی سمت تبدیل ہو گئی ہے۔ حسیات بیدار ہوئی تھیں تو اندر کا خوف بھی جاگ اٹھا تھا۔ اب خشک پتوں کی چرچراہٹ یا کبھی کبھی کہیں دور دراز سے سنائی دینے والی کسی جانور کی ہلکی سی آواز سے دل دہل جاتا تھا۔

پھر مجھے یہ احساس بھی نہ رہا کہ جنگل میں بھٹکتے ہوئے مجھے کتنی دیر ہو چکی ہے۔ میرے پاؤں شدید زخمی ہو چکے تھے کیونکہ اب ہر قدم پر ان میں ٹیسیں سی ابھر رہی تھیں۔ اس تصور سے مجھے ہول آرہا تھا کہ اس طرح نہ جانے کب تک میں بھٹکتی رہوں۔ ایک جگہ میں نہ جانے کس چیز سے ٹھوکر کھا کر گری۔ درختوں کی کچھ خشک ٹہنیاں میرے بوجھ تلے چرچرائیں۔ عین اسی لمحے کانوں کے پردے پھاڑ دینے والا دھماکہ ہوا اور ایک انگارہ سا سنسناتا ہوا میری ناک سے چند انچ کے فاصلے سے گزر گیا۔ بے اختیار میرے حلق سے ایک فلک شگاف چیخ نکلی اور میں اپنی جگہ پڑے پڑے تھر تھر کانپنے لگی۔ پھر کہیں بلندی سے روشنی کا ایک فوارہ سا پھوٹا۔ اس کا رخ میری ہی طرف تھا۔ میری آنکھیں چندھیا کر رہ گئیں۔

چند سیکنڈ تک روشنی کا یہ دائرہ دھیرے دھیرے حرکت کرتا رہا' پھر غائب ہو گیا۔ گرد و پیش پر ایک بار پھر وہی گھٹا ٹوپ اندھیرا اور سناٹا چھا گیا۔ میرا جی چاہا کہ اٹھ کر بھاگ لوں لیکن جسم میں گویا سکت ہی نہ رہی تھی۔ چند لمحے بعد دھپ کی سی آواز سنائی دی گویا کوئی بلندی سے کودا ہو۔ پھر خشک پتے اور ٹہنیاں چرچرانے لگیں۔ کوئی میری طرف آرہا تھا' خوف سے میری گھگھی بندھ گئی۔

روشنی کا سیلاب ایک بار پھر امڈا اور میں اس میں نہا گئی۔ میں نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ چند لمحے سکوت طاری رہا تو میں نے ڈرتے ڈرتے آنکھوں سے ہاتھ ہٹایا اور تب مجھے احساس ہوا کہ وہ ایک طاقتور ٹارچ تھی جس کی روشنی مجھ پر مرکوز تھی لیکن جس شخص نے اسے تھام رکھا تھا' اس کا چہرہ مجھے نظر نہیں آرہا تھا۔ صرف ٹارچ پر جما ہوا اس کا ہاتھ اور نیچے دو بے ہنگم جوتوں کی جھلک دکھائی دی۔

"تم کیا مخلوق ہو بھئی۔" بالآخر اس شخص کی بھاری اور بارعب آواز ابھری۔ "چڑیل' ڈائن یا پگلی؟"

"میں.....میں عزیزہ ہوں۔" بے اختیار میرے حلق سے لرزتی سی آواز نکلی۔

"عزیزہ؟" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "کس کی عزیزہ.....؟" پھر وہ خود کلامی کے سے انداز میں بولا۔ "جوگی اور سنیاسی تو بہت دیکھے تھے لیکن سنیاسن آج پہلی مرتبہ دیکھی ہے۔" پھر وہ ڈپٹ کر بولا۔ "اگر تم صحیح الدماغ ہو تو سچ سچ بتاؤ تم کون ہو؟"

"میں ایک.....مصیبت زدہ عورت ہوں۔" میری آواز خودبخود بھرا گئی۔ "خدا کے لیے میری مدد کرو۔" میں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"میں نے ابھی جس شیرنی کے دھوکے میں تم پر گولی چلائی تھی' اگر وہ نشانے پر لگ گئی ہوتی تو تمہاری ساری مصیبتوں کا خاتمہ ہو جاتا اور عین ممکن ہے کہ وہ شیرنی اب بھی اس طرف آنکلے اور تمہارے ساتھ ساتھ میری مصیبتوں کا بھی خاتمہ ہو جائے۔" اس شخص نے اب قدرے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ویسے بائی دی وے میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

اس سوال کا مجھے کوئی جواب نہ سوجھا۔ حقیقتاً مجھے خود بھی معلوم نہیں تھا کہ مجھے کس قسم کی مدد کی ضرورت ہے۔ میں خالی خالی نظروں سے چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ ٹارچ کی روشنی کے عقب میں اب مجھے اس کے دھندلے دھندلے خدوخال نظر آنے لگے تھے۔ وہ چوڑے کندھوں والا ایک دراز قد اور جسیم آدمی تھا۔ عمر اور نقوش کا کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کیونکہ اس کے سر پر ہیٹ موجود تھا' تاہم اس کی گھنی مونچھوں کی جھلک نظر آرہی تھی۔

میں نے اپنے زنگ آلود ذہن پر بہت زور دیا کہ مجھے اس کے سوال کا کیا جواب دینا چاہیے۔ بالآخر میرے منہ سے نکلا۔ "مجھے چند دن کے لیے پناہ دے دو.....کہیں چھپا لو۔"

اس نے ٹارچ کی روشنی کا زاویہ بدلا اور غالباً ایک بار پھر میرا سرتاپا جائزہ لیا اور ہنکارا سا بھرتے ہوئے کہا۔ "کہاں سے بھاگ کر آئی ہو؟"

میں مختصراً اسے بتانے ہی لگی تھی کہ میں کہاں سے اور کس طرح آئی ہوں کہ یک لخت میرے نوبیدار ذہن نے مجھے خبردار کیا کہ یہ شخص مجھے پکڑ کر دوبارہ محل میں نہ پہنچا دے۔ ایک لمحے کے لیے میں گڑبڑا سی گئی' پھر سنبھل کر بولی۔ "میں.....میں دراصل ایک بے سہارا عورت ہوں اور اپنے کچھ عزیزوں کے ظلم و ستم سے تنگ آکر فرار ہو گئی ہوں اور بھٹک کر ادھر آنکلی ہوں.....تم دیکھ رہے ہو' انہوں نے مجھے کس حال کو پہنچا دیا ہے۔"

"ہم!" اس نے بار پھر ہنکارا بھرا' گویا سوچ میں پڑ گیا ہو۔ پھر اس نے ٹارچ بجھا دی۔ میرا وجود ایک بار پھر بحر ظلمات میں ڈوب گیا.....محض چند لمحوں تک تیز روشنی کا سامنا کرنے سے میری آنکھوں میں درد سا ہونے لگا تھا۔ اندھیرے میں اس شخص کے گہری گہری سانسیں لینے کی آواز مجھے سنائی دے رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ ہوا میں کچھ سونگھنے کی

کوشش کر رہا تھا۔

"اٹھو میرا ہاتھ پکڑ لو۔" بالآخر اندھیرے کی آغوش سے اس کی گونجیلی آواز ابھری مگر اس کا ہاتھ ہی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے خود ہی جھک کر مجھے بازو سے پکڑ کر اٹھایا، پھر مضبوطی سے میرا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا۔ "میرے ساتھ چلتی آؤ۔"

اس کی رہنمائی میں میرا سفر شروع ہو گیا۔ تقریباً ایک گھنٹہ چلتے رہنے کے بعد چھدرے درختوں کا سلسلہ شروع ہوا اور تب مجھے معلوم ہوا کہ آسمان پر پورا چاند نکلا ہوا تھا۔ چھدرے درختوں کا سلسلہ جلد ہی ختم ہو گیا اور ہم ایک پگڈنڈی پر آ گئے جس کے دونوں طرف کہیں جھاڑیاں، کہیں جوہڑ اور کہیں اکا دکا درخت تھے۔ اب اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور میں اس کے برابر چلنے لگی۔

ایک دو بار ہم نے خالی خالی نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر اپنے اپنے دھیان میں چلنے لگے۔ بظاہر وہ کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا لیکن نہ جانے کیوں بڑا چوکنا اور گرد و پیش سے باخبر معلوم ہوتا تھا۔ اس کی عمر تیس اور پینتیس کے درمیان ہو گی۔ رنگت تانبے جیسی تھی۔ آنکھیں بھوری تھیں اور دھندلی دھندلی سی چاندنی میں بھی بلا کی چمکیلی نظر آتی تھیں۔ وہ مٹیالے سے رنگ کی ایک کھردری، چست پتلون اور بند گلے کا چمڑے کا کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ ایک ہاتھ میں بندوق تھی۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں؟" میں نے محض سکوت توڑنے کے لیے پوچھا۔

اس نے گردن گھما کر یوں میری طرف دیکھا جیسے میرا سوال اسے نہایت احمقانہ لگا ہو، پھر مدھم آواز میں کہا۔ "جہاں میں ٹھہرا ہوا ہوں۔" پھر ایک لمحے کے توقف سے بولا۔ "یہاں سے تقریباً ایک کوس کے فاصلے پر تنولی ریاست کا گاؤں گڑھی محراب ہے۔ اس سے تقریباً ایک فرلانگ پہلے وہ مکان آتا ہے جہاں میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ اس سے پہلے کہ تم مزید سوالات کرو، میں تمہیں خود ہی بتا دوں۔ میرا نام شوکت محسن ہے اور میں اصل رہنے والا کلکتہ کا ہوں۔ ایک آدم خور شیرنی کا چرچا سن کر تقریباً ایک ماہ پہلے یہاں آیا تھا، تب سے اب تک میرا خیال ہے کہ میں جنگل کے سارے جانوروں کو مار چکا ہوں، سوائے اس شیرنی کے۔ پہلے تو مجھے اس کے وجود کا یقین ہی نہیں تھا کیونکہ اس علاقے میں شیر نہیں پائے جاتے لیکن یہ شیرنی تمہاری طرح نہ جانے کہاں سے بھٹکتی ہوئی آ نکلی ہے۔ بہرحال اب مجھے اس کے وجود کا یقین آ گیا ہے کیونکہ پرسوں میں نے اسے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور میری گولی سے شاید اس کی ایک پچھلی ٹانگ بھی زخمی ہوئی ہے لیکن اس کے بعد ہی سے وہ غائب ہو گئی ہے۔ کوئی سراغ نہیں مل رہا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ زیادہ زخمی ہو گئی ہو اور کسی کھوہ میں پڑی موت کا انتظار کر رہی ہو۔"

اس کا انداز گفتگو خاصا شگفتہ اور دوستانہ تھا لیکن اس کا آخری جملہ نہ جانے کیوں مجھے

تکلیف دہ محسوس ہوا۔

"تم اسے کیوں مارنا چاہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔ اس نے ایک بار پھر یوں میری طرف دیکھا گویا اسے ایسے احمقانہ سوال کی قطعاً توقع نہ رہی ہو۔

"اس لیے کہ میں ایک شکاری ہوں۔" ایک گہری سانس لے کر اس نے گویا سمجھاتے ہوئے کہا۔ "شوقیہ شکاری۔ گو کہ میں کوئی نوابزادہ نہیں ہوں لیکن بس اس شوق میں پڑ گیا ہوں اور اس سے پہلے میں نے کوئی شیر یا شیرنی نہیں ماری۔ ویسے بہتر ہوتا کہ تم مجھ سے یہ سوال کرنے کے بجائے اس شیرنی کو ڈھونڈ کر اس سے پوچھتیں کہ وہ گڑھی محراب کے تمام لکڑہاروں کو ہڑپ کرنے پر کیوں تلی ہوئی ہے۔"

پھر اس نے چلتے چلتے بندوق کندھے سے لٹکا کر ایک لمحے کے لیے ہیٹ اٹھا کر سر کھجایا۔ تب میں نے دیکھا کہ اس کے بال بھورے اور لمبے تھے اور کھلنڈرے لڑکوں کی طرح بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے ہیٹ دوبارہ سر پر رکھ کر گہری گہری نظروں سے میری طرف دیکھا، پھر راستے کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے ایک لمحے کے توقف کے بعد اچانک پوچھا۔ "تم پاگل تو نہیں ہو نا؟"

میں سمجھ نہیں سکی کہ اس نے یہ سوال سنجیدگی سے کیا تھا یا یہ بھی اس کے مخصوص انداز گفتگو کا ایک حصہ تھا۔

"تمہیں یہ پوچھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟" میں نے پوچھا۔

"ویسے ہی.... احتیاطاً پوچھ رہا تھا۔" اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ پھر اپنی گھنی مونچھوں کو بل دیتے ہوئے بولا۔ "دراصل مجھے پاگل عورتوں سے بڑا ڈر لگتا ہے۔"

"میں پاگل نہیں ہوں۔" میں نے کہا "البتہ کچھ عرصہ اور مجھے فرار کا موقع نہ ملتا تو شاید ہو جاتی۔"

"ہم ہندوستانی بہت پسماندہ ہیں۔" اس نے مدھم سی آواز میں گویا اپنے آپ سے کہا۔ "ہمارے ہاں عورت پر بہت ظلم ہوتا ہے۔ تمہاری حالت دیکھ کر مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تم ایسی جگہ سے آئی ہو جہاں سے انسانوں کا بھی گزر تھا۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ فی الحال میں اس مقام اور ان حالات کا تصور ذہن میں نہیں لانا چاہتی تھی جن سے میں گزر کر آ رہی تھی ورنہ میں شاید پھوٹ پھوٹ کر رو پڑتی۔ ہم خاموشی سے چلتے رہے۔

ایک موڑ پر آ کر اس نے پگڈنڈی چھوڑ دی اور دائیں ہاتھ چل دیا۔ اب ہم ایک ریتلے میدان میں چل رہے تھے۔ ہوا ساکت تھی اور غالباً اوس پڑ رہی تھی۔ زخمی پیروں کے نرم نرم، خنک اور نم آلود مٹی کا لمس مجھے اچھا محسوس ہونے لگا۔ کافی دیر میدان میں چلتے رہنے کے بعد جیسے اچانک ہی ہم درختوں کے ایک جھنڈ کے قریب پہنچ گئے۔ اس جھنڈ

کے درمیان ایک نیم پختہ مکان کی چار دیواری نظر آ رہی تھی۔

دروازے پر پہنچ کر شوکت محسن نے دستک دی۔ تیسری دستک کے بعد اندر آہٹ سنائی دی اور غنودگی سے بوجھل مردانہ آواز میں پوچھا گیا۔ "کون ہے؟"

"تیرے والد بزرگوار!" شوکت نے بہ آواز بلند کہا۔ "جلدی سے دروازہ کھول۔"

کنڈی گرنے کی آواز آئی۔ دروازہ کھولنے والا واسکٹ اور دھوتی میں ملبوس گٹھے ہوئے جسم کا ایک ادھیڑ عمر کا سانولا سا آدمی تھا..... کھچڑی سی داڑھی' چندھی چندھی آنکھیں اور موٹے موٹے ہونٹ مگر اس کے چہرے پر معصومیت کا پرتو تھا' وہ ایک ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے میں لاٹھی اٹھائے ہوئے تھا۔

"شیرنی مارلی صاحب؟" دروازہ کھولتے ہی اس نے پوچھا اور اسی لمحے اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ وہ ہڑبڑا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔





"تیری روح کیوں فنا ہو گئی نذرو؟ یہ شیرنی تو نہیں ہے۔" شوکت نے اسے ایک طرف ہٹایا اور میرا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گیا۔ نذرو سر جھکائے پیچھے آ رہا تھا۔

صحن عبور کر کے ہم ایک وسیع کمرے میں داخل ہوئے جہاں طاق میں ایک اونچا سا کیروسین لیمپ روشن تھا۔ دیوار کے ساتھ ایک لمبے چوڑے دیوان پر بستر لگا ہوا تھا۔ وسط میں ایک گول تپائی کے گرد موٹے موٹے تختوں سے بنی ہوئی چند کرسیاں پڑی تھیں۔

"نذرو!" شوکت نے مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "جلدی سے کنویں سے پانی نکال کر بالٹیاں بھر اور اس دکھیاری لڑکی کے نہانے دھونے کا بندوبست کر۔ پہننے کے لیے اسے میرے شب خوابی کے کپڑے دے دے اور پھر اس کے لیے کھانے اور چائے کا بندوبست کر۔" نذرو سعادت مندی سے سر ہلاتا ہوا باہر چلا گیا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد جب میں غسل خانے سے نکلی تو ڈھیلی ڈھالی مگر صاف ستھری بش شرٹ اور پاجامے میں مجھے اپنا وجود روئی کے گالے کی طرح سبک لگ رہا تھا۔ کنویں کا پانی نہایت فرحت بخش تھا اور خوشبودار صابن کے ڈھیروں جھاگ کے ساتھ میرے جسم سے چمٹی ہوئی مدتوں کی غلاظتیں بہہ گئی تھیں۔ نذرو نے مجھے ایک دوسرے کمرے میں پہنچا دیا جس کا فرش کچا مگر صاف ستھرا تھا۔ ایک طرف بڑی سی چارپائی تھی جس پر سلیقے سے بستر لگا ہوا تھا۔

"آپ کنگھی وغیرہ کر لیں بی بی جی! میں اتنی دیر میں کھانا لاتا ہوں۔" نذرو نے ایک دیوار کی طرف اشارہ کیا جس پر ایک لمبا سا آئینہ آویزاں تھا اور قریب ہی ایک طاق میں کنگھا رکھا ہوا تھا۔ مدتوں بعد میں نے آئینے میں اپنی شکل دیکھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ کچھ دیر پہلے تک میں کیسی لگ رہی تھی۔ پھر بھی اپنا آپ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی مصور نے اپنی بھولی بسری "کٹی پھٹی" گرد آلود تصویر کو جھاڑ پونچھ کر نئے رنگوں سے اس کے خدوخال از سر نو ابھارے ہوں۔

کنگھی کر کے میں بالوں کا جوڑا بنا کر پلٹی تو شوکت کو دروازے میں کھڑا پایا۔ وہ کپڑے بدل چکا تھا اور کرتے پاجامے میں پہلے سے مختلف لگ رہا تھا' پختہ اور جہاں دیدہ سا۔ جیسے اس کی عمر میں چند برس کا اضافہ ہو گیا ہو۔ اس کی آنکھوں میں محویت بھی تھی اور بے

یقینی بھی۔

"یہ تم ہی ہو .....کیا نام بتایا تھا تم نے اپنا؟" اس نے تیزی سے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔

"عزیزہ!" میں نے سر جھکا کر آہستگی سے جواب دیا۔

"ہاں....عزیزہ! تمہاری تو جون ہی بدل گئی۔" اس نے چوکھٹ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔
میں خاموش رہی۔ دفعتاً اس کے پیچھے نذرو نمودار ہوا۔

"میں نے بڑے کمرے میں کھانا لگا دیا ہے بی بی جی!" اس نے اطلاع دی۔ شوکت کے پیچھے چلتی ہوئی میں دوبارہ اسی کمرے میں پہنچی جہاں کرسیاں وغیرہ پڑی تھیں۔ تپائی پر ایک قاب میں بھنا ہوا گوشت اور چنگیر میں بڑی بڑی روٹیاں رکھی تھیں۔ میں نے حتی الامکان صبر اور شائستگی سے کھانے کی کوشش کی لیکن اپنے ندیدے پن پر قابو نہ رکھ سکی۔ شوکت باہر جانے سے پہلے کھانا کھا چکا تھا۔ اب صرف چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے مجھے دلچسپی سے کھاتے دیکھ رہا تھا۔

کھانے اور چائے سے فارغ ہوتے ہی مجھ پر ایک عجیب سرور آمیز غنودگی طاری ہونے لگی، جیسے ایک مدت تک صحراؤں میں آبلہ پا سفر کرنے کے بعد کوئی مسافر یک لخت آسودگیوں کے نخلستان میں پہنچ کر اونگھنے لگے۔

شوکت کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ "اب تم اسی چھوٹے کمرے میں جا کر سو جاؤ، باقی باتیں کل ہوں گی۔" وہ کہہ رہا تھا۔

پیروں میں شوکت کی ڈھیلی ڈھالی چپلوں کو گھسیٹتی میں چھوٹے کمرے میں آ گئی اور کنڈی لگا کر بستر پر ڈھیر ہو گئی۔ عام سا بستر اس وقت مجھے پھولوں کی سیج سے زیادہ آرام دہ اور مخمل کے گدوں سے زیادہ دبیز محسوس ہو رہا تھا۔ سب سے زیادہ فرحت مجھے اس بات میں محسوس ہو رہی تھی کہ اس پر میں ٹانگیں پوری طرح پسار کر لیٹ سکتی تھی۔ اس لذت و فرحت کا اندازہ وہی بدنصیب کر سکتا ہے جو دو سال تک سرد پتھریلے فرش پر چار فٹ سے بھی کم جگہ میں سکڑ سمٹ کر سوتا رہا ہو۔ چند لمحے بعد میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئی۔

اگلے روز میں کمرے سے نکلی تو وسیع صحن میں تیز چمکیلی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ چند لمحے تک تو اس دھوپ میں میری آنکھیں ہی نہ کھلیں، پھر جب تک آنکھیں مانوس ہوئیں تو میں نے دیکھا نذرو ایک گوشے میں چھپر تلے بیٹھا چولہے پر دودھ گرم کر رہا تھا۔ یہ گوشہ غالباً مکان کا باورچی خانہ تھا۔ نذرو نے بتایا کہ صاحب چند آدمیوں کے ساتھ جنگل کی طرف گئے ہیں البتہ وہ اسے ایک کام کہہ گئے تھے جو اس نے کر دیا ہے۔

"کیا کام نذرو؟" میں نے پوچھا۔

"صاحب کہہ گئے تھے کہ میں آپ کے لئے ایک جوڑے کپڑوں کا بندوبست کر دوں۔"

اس نے پتیلی چولہے سے اتارتے ہوئے جواب دیا۔ "وہ میں گاؤں سے لے آیا ہوں۔" وہ اٹھ کر بڑے کمرے کی طرف گیا اور چند لمحے بعد کھدر کا تھیلا اٹھائے باہر آیا۔

"اس میں دو زنانہ جوڑے ہیں۔" اس نے تھیلا میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "ہیں تو تھوڑے سے استعمال شدہ لیکن اچھے ہیں اور میرا خیال ہے کہ آپ کو پورے بھی آئیں گے۔"

میں نے کپڑے تھیلے سے نکال کر دیکھے، پھولدار ریشمی شلوار اور قمیض تھی۔ ایک دوپٹہ اور نئی زنانہ چپلیں بھی تھیں۔ نہا دھو کر میں نے ان میں سے ایک جوڑا پہنا۔ اس میں اگر کوئی خامی تھی بھی تو کم از کم اس وقت مجھے محسوس نہیں ہوئی۔ میں نے تو گویا ایک نیا جنم لیا تھا اور ہر چیز ہی میرے لیے نعمت سے کم نہیں تھی۔ ناشتہ کر کے جو دراصل دوپہر کا کھانا تھا، میں ایک بار پھر سو گئی۔ نہ جانے کیوں مجھے بے تحاشہ نیند آئے جا رہی تھی۔

دوبارہ جب میری آنکھ کھلی تو شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ صحن میں مجھے کوئی نظر نہ آیا تو میں بڑے کمرے میں چلی گئی اور دیکھا شوکت محسن بوتل کو سامنے رکھے، جام سنبھال بیٹھا تھا۔ وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی جوشیلے انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"تمہارے قدم بہت مبارک ہیں۔" وہ تقریباً چلا اٹھا۔ "آج میں نے شیرنی مار ہی لی۔ بڑا ہنگامہ رہا بھئی۔ تصویریں کھینچیں، گاؤں میں باقاعدہ میرا جلوس نکالا گیا، ہار پہنائے گئے، یہاں بھی لوگ مبارکباد دینے آ رہے ہیں۔ نمبردار بھی میرے ساتھ ہی آیا تھا، ابھی گیا ہے۔"

"لاش کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"کھال میں نے اتار کر محفوظ کر لی ہے۔ لاش ناظم جنگلات کو بھیج دی گئی۔ وہاں سے باقاعدہ رپورٹ تیار ہو کر کلکٹر صاحب کو جائے گی۔" اس نے بڑے مسرور اور مخمور لہجے میں بتایا۔ پھر چونکتے ہوئے بولا۔ "ارے تم کھڑی کیوں ہو، آؤ بیٹھو نا۔ آج میں بہت خوش ہوں۔"

اس نے گلاس میں بچی ہوئی شراب ایک ہی گھونٹ میں حلق میں انڈیلی اور دوسرا جام تیار کرنے لگا۔ میں بیٹھ گئی تو اس نے سرتاپا میرا جائزہ لیا اور جب اس کا جوش و خروش ذرا کم ہوا تو ذرا ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا۔ "تمہارا کیا پروگرام ہے؟ میں تو شاید پرسوں تک یہاں سے روانہ ہو جاؤں۔"

میرا دل ڈوب سا گیا۔ "کہاں جا رہے ہو؟" میں نے بمشکل پوچھا۔ "یہاں سے تو گھر جاؤں گا۔ چند دن آرام کر کے آئندہ کا پروگرام بناؤں گا۔" اس نے جواب دیا۔ میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ میں اسے کیا بتاتی کہ میرا پروگرام کیا تھا۔ ابھی تو میں آزادی کے احساس سے بھی پوری طرف لطف اندوز نہیں ہو پائی تھی۔

"تمہارا کوئی ایسا عزیز' رشتے دار نہیں جس کے پاس تم جانا چاہو-" چند چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرنے کے بعد اس نے پوچھا-

میں نے خاموشی سے نفی میں سرہلایا-

"عزیزہ!" دفعتاً" اس نے سرگوشی سی کی- "تم.... تم مجھے بہت اچھی لگی ہو...... میرے بس میں ہوتا تو میں تم سے شادی کر لیتا لیکن مسئلہ یہ ہے کہ میں شادی شدہ ہوں- میرے تین بچے ہیں جن میں سے دو سیانے ہو چکے ہیں اور میری بیوی بڑی پھنے خان کی بیٹی ہے- وہ یہ تو برداشت کر سکتی ہے کہ مجھے کوئی آدم خور شیر کھا جائے لیکن یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ میں دوسری شادی کروں-"

"اگر تم شادی شدہ ہو تو حالات خواہ کتنے ہی موافق ہوتے' میں کبھی تم سے شادی نہ کرتی-" میں نے مدھم لہجے میں کہا اور جانے کے لیے اٹھنے لگی تو اس نے بے تابی سے ہاتھ ہلا کر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا-

"ٹھہرو' ٹھہرو- مجھے کچھ سوچنے کا موقع دو شاید میرے ذہن میں کوئی تدبیر آجائے-" اس نے کہا-

میں بیٹھ گئی- وہ جام پر جام خالی کرنے لگا اور ایک ٹک مجھے دیکھتا رہا' اس کی تانبے کی سی رنگت کچھ اور گہری ہو گئی تھی اور آنکھوں میں سرخی بڑھتی جا رہی تھی- میں منتظر نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی- بہت وقت گزر گیا- بوتل آدھی سے زیادہ خالی ہو گئی تھی لیکن اس کا سکوت نہ ٹوٹا-

اس کی آنکھوں میں پھیلتے سمٹتے سائے بتا رہے تھے کہ اس کے اندر نہ جانے کن کن جذبوں کا کار زار گرم ہے- تھک کر میں بے چینی سے پہلو بدلنے لگی تو وہ گلاس رکھ کر اٹھا جیسے اچانک کسی فیصلے پر پہنچ گیا ہو- غیر متوازن سے قدموں سے دروازے تک جا کر اس نے کنڈی چڑھا دی- میری دھڑکنیں یک لخت تیز ہو گئیں اور کنپٹیوں میں دھماکے سے ہونے لگے-

وہ واپس آکر میری کرسی کے عقب میں کھڑا ہو گیا اور اچانک اس نے دونوں ہاتھ مضبوطی سے میرے کندھوں پر رکھ دیئے- "عزیزہ!" اس نے میرے کان کے قریب سرگوشی کی- اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی اور آواز کی تہہ میں کوئی درندہ بول رہا تھا- یک بیک ہی اس میں کوئی تبدیلی آگئی تھی-

"یہ بیٹھے بیٹھے تمہیں کیا ہو گیا ہے-؟" میں نے سخت لہجے میں کہا اور اس کے ہاتھ کندھوں سے ہٹانے کی کوشش کی مگر اس کی گرفت مضبوط تھی-

"تم نے مجھے پاگل کر دیا ہے عزیزہ- اب مجھے نہ ترساؤ-" یک لخت اس نے نہ جانے کس طرح مجھے اٹھایا اور دیوان پر لے جا پٹخا- پھر وہ عقاب کی طرح مجھ پر جھپٹا-

"شوکت....!" میں بلبلا اٹھی- "مجھے معاف کر دو- مجھ میں اب کسی کی ہوس کا نشانہ بننے کی سکت نہیں ہے.....شوکت...." پھر میری آواز گھٹ کر رہ گئی- اس کے منہ سے اٹھتے ہوئے شراب کے بھبکے میرے حواس کو مختل کر رہے تھے- میں نے بہت مزاحمت کی- اس کی دست درازیوں کا سیلاب روکنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ بہت طاقتور تھا- دفعتاً" میرے گھٹنے کسی طرح اس کے پیٹ سے ٹکرائے اور وہ دیوان سے نیچے جا گرا- میں اٹھی تو میری پشت دیوار سے جا ٹکرائی اور کوئی بھاری سی چیز دیوار سے علیحدہ ہو کر میرے کندھے سے ٹکراتی ہوئی پیروں کے قریب آگری- میں نے لپک کر اسے اٹھا لیا- یہ شوکت کی رائفل تھی-

میں نے رائفل سیدھی ہی کی تھی کہ شوکت دیوار پر چڑھ کر دیوانہ وار مجھ پر جھپٹا- ایک جھٹکے سے لبلبی دب گئی- دل دہلانے والے دھماکے کے ساتھ ہی مجھے زبردست دھچکا لگا اور میں دیوار کے ساتھ ٹکرا کر دیوان پر گر گئی- میرا کندھا گویا جسم سے علیحدہ ہو گیا تھا- میں یہی سمجھی کہ گولی مجھے لگ گئی ہے لیکن دوسرے ہی لمحے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھٹا تو میں نے دیکھا شوکت فرش پر چاروں شانے چت پڑا تھا اور اس کی آدھی کھوپڑی' ایک آنکھ اور ناک کا کچھ حصہ غائب تھا- بھل بھل بہتے خون اور بھیانک زخم کے ساتھ اس کا ادھورا چہرہ نہایت خوفناک لگ رہا تھا-

رائفل اب بھی میرے ہاتھ میں تھی اور مجھ میں گویا اٹھنے کی سکت ہی نہیں رہی تھی- پھر جیسے میں کسی ڈراؤنے خواب سے جاگی اور اٹھ کر دروازے کی طرف بھاگی- کنڈی کھول کر میں نے صحن میں قدم رکھا لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے رک جانا پڑا' نذرو میرا راستہ روکے کھڑا تھا- اس کے چہرے کی معصومیت کہیں غائب ہو چکی تھی اور وہ ہونٹ بھینچے اپنی چندھی چندھی آنکھوں سے ایک ٹک مجھے گھور رہا تھا-

ایک لمحے کے لیے تو ہم آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ساکت کھڑے رہے' پھر وہ مجھ پر جھپٹا- دفعتاً" میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا اور نذرو کی اصل شکل گویا میرے سامنے سے غائب ہو گئی- وہ مجھے دوسرا شوکت نظر آیا- اسی لمحے مجھے احساس ہوا کہ رائفل میرے ہاتھ میں ہے-

میرے بازو پوری قوت سے گھومے اور رائفل کا کندا نذرو کی کنپٹی اور رخسار پر پڑا- وہ ایک ہاتھ کنپٹی پر رکھ کر بری طرح لڑکھڑایا- اب مجھ میں اپنے دفاع کی حس اور اعتماد بیدار ہو چکا تھا- اب تک میں نے غیر ارادی سے انداز میں ہاتھ پاؤں چلائے تھے- اب میں نے باقاعدہ ہوش و حواس سے کام لیتے ہوئے رائفل کو نال کی طرف سے پکڑا اور اس کے کندے سے کلہاڑی کی طرح نذرو کے سر پر وار کیا- اس مرتبہ اس کے حلق سے گھٹی گھٹی کراہ سی نکل گئی- سر تھامنے کے لیے اس نے دونوں ہاتھ اٹھائے لیکن یہ ہاتھ سر تک

نہ پہنچ سکے اور وہ لڑکھڑا کر چت ہو گیا۔ خون کی ایک لکیر اس کے بالوں کی جڑوں سے ہوتی ہوئی کان کی لو تک بہہ آئی تھی۔ میں نے رائفل وہیں پھینکی اور اس کا بے حس و حرکت جسم پھلانگ کر دروازہ کھول کر باہر آگئی۔

مکان سے کافی دور نکل آنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ اردگرد تو دور تک سناٹا طاری تھا۔ میں چاہتی تو مکان میں ہی رہ سکتی تھی اور دن نکلنے کے بعد کہیں کا رخ کر سکتی تھی لیکن پھر مجھے شوکت کی لاش کا خیال آیا۔ ادھورے اور بھیانک چہرے والی اس لاش کی موجودگی میں مجھے اس مکان میں رات گزارنے کا تصور بھی ناممکن محسوس ہوا اور پھر نذرو کے بارے میں مجھے صحیح طور پر معلوم نہیں تھا کہ وہ بھی مر گیا ہے یا صرف بے ہوش ہوا ہے۔ رات کو یا صبح ہی صبح اگر کوئی مکان کی طرف آنکلتا تو میرے لیے کوئی راہ فرار نہ رہتی' اس لیے میں نے مکان کی طرف واپس جانے کا خیال ہی دل سے نکال دیا اور سیدھی چلتی رہی۔ کچھ دیر بعد میں سڑک پر پہنچ گئی۔ اتنا مجھے اندازہ تھا کہ شوکت کے ساتھ میں کس سمت سے آئی تھی۔ میں نے اس سے مخالف سمت میں چلنا شروع کر دیا۔

کچھ دیر بعد اپنے عقب میں گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ فوری طور پر میں سہم کر پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر سڑک سے کچے میں اتر کر نشیب میں بھاگنے ہی والی تھی کہ غیر ارادی طور پر مڑ کر دیکھ لیا۔ دھندلی چاندنی میں' میں نے دیکھا کہ ایک گھوڑا ہلکی چال سے آرہا تھا' گویا اس کے کوچوان کو کوئی خاص عجلت نہیں تھی۔ یہ دیکھ کر مجھے ڈھارس سی ہوئی کہ گاڑی پر کوچوان اکیلا ہی تھا۔

میں نے بھاگنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور اپنے آپ کو حتی الامکان پرسکون ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے سڑک کے کنارے کنارے چلنے لگی۔ گھوڑا گاڑی بالکل قریب آپہنچی تو میں رک گئی اور اس کی طرف مڑ کر کھڑی ہو گئی۔ کوچوان ایک دبلا پتلا ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ معمولی تہمد اور کرتے میں ملبوس تھا' سر پر مختصر سی پگڑی تھی۔ اس کی مونچھیں سفیدی مائل اور رنگت گہری سانولی تھی۔ قریب پہنچتے ہی اس نے گھوڑا گاڑی کی رفتار کچھ اور کم کر دی اور تختے پر کھڑے کھڑے شک آلود سی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

"کہاں جا رہے ہو چاچا؟" میں نے جی کڑا کر کے حتی الامکان سرسری لہجے میں کہا۔

"رحیم آباد' کیوں؟" کوچوان نے گھوڑے کی لگامیں کھینچ لی تھیں۔

"وہاں ریلوے سٹیشن ہے؟" میں نے پوچھا اور فوراً ہی مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا کہ یہ سوال مجھے اس علاقے میں قطعی طور پر اجنبی ثابت کر رہا تھا۔ بہرحال اب تو الفاظ منہ سے نکل چکے تھے۔

"ہاں ہے تو سہی۔" گاڑی والے نے الجھن زدہ سے لہجے میں جواب دیا۔ "لیکن میں سٹیشن نہیں' غلہ منڈی جا رہا ہوں۔ دونوں کے درمیان کافی فاصلہ ہے۔"

"اگر تم مجھے سٹیشن چھوڑ دو تو تمہاری بہت مہربانی ہو گی چاچا!" میں نے ملتجیانہ سے لہجے میں کہا۔

اس نے ایک لمحے کے لیے کچھ سوچا' پھر سر کے اشارے سے گاڑی پر چڑھنے کی اجازت دے دی۔ میں گاڑی پر چڑھ کر بوریوں کے قریب سکڑ سمٹ کر بیٹھ گئی۔ گاڑی ایک بار پھر چل پڑی' رات کے سناٹے میں صرف گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز گونج رہی تھی۔

"گھر سے بھاگ کر آئی ہو؟" چند لمحے بعد گاڑی والے نے مڑ کر میری طرف دیکھے بغیر انتہائی سنجیدگی سے پوچھا۔ اس نے کچھ یوں اچانک یہ سوال کیا تھا کہ میں اچھل پڑی۔

"نہیں تو۔" میں نے جلدی سے جواب دیا۔ "میں.....میں دراصل ایک مصیبت زدہ لڑکی ہوں اور بھٹک کر اس علاقے میں آنکلی ہوں۔ میری کہانی بہت لمبی ہے۔"

"اگر تم مصیبت زدہ ہو تو میرے ساتھ چلو۔ مجھ سے جو ہو سکا' میں تمہاری مدد کروں گا۔ میری زنانی بھی دل کی بہت اچھی ہے۔" وہ بظاہر مخنی سا آدمی تھا لیکن اس کی آواز خاصی بارعب تھی۔

"نہیں' نہیں۔" اضطراری طور پر میں تقریباً چلا اٹھی اور جب گاڑی والے نے مڑ کر عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا تو میں نے قدرے خفت سے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔ "میں کسی کے گھر نہیں جا سکتی۔ میں اب بس اپنے گھر جانا چاہتی ہوں۔"

"تمہاری مرضی۔" اس نے لاپروائی سے کہا اور گھوڑے کو ٹھوکا دے کر اس کی رفتار کچھ تیز کر دی۔ دھندلی چاندنی میں ویران رستے پر سفر جاری تھا۔ اسی دوران سڑک سے کافی ہٹ کر کھیتوں میں گھرے ہوئے دو ایک آدمی بھی نظر آئے۔ گاڑی والا اب گویا میرے وجود سے بالکل بے خبر لگامیں ڈھیلی چھوڑے ایک بوری سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے بہ آواز بلند پوربی میں رخصتی کا ایک گیت گانا شروع کر دیا۔ ایک آدھ بول گا کر ہی غالباً اپنی آواز کے بے سرے پن یا شاید گیت کی ناموزونیت کو محسوس کرتے ہوئے وہ چپ ہو گیا۔

سفر تقریباً ایک گھنٹہ جاری رہا ہو گا اور ساتھ آٹھ میل کا فاصلہ طے ہوا ہو گا' جب ہم ایک آبادی میں داخل ہوئے۔ یہ ایک اچھا خاصا شہر تھا۔ مکانات پختہ اور سڑکیں چوڑیں تھیں۔ یہاں بھی چاروں طرف سناٹا تھا۔ رات خاصی بیت چکی تھی۔ میں نے جھجکتے ہوئے گاڑی والے سے پوچھا۔ "غلہ منڈی تو اس وقت بند ہو چکی ہو گی' تم کس کے پاس لے جاؤ گے غلہ؟"

"میرا دراصل کام یہی ہے۔ میں تو ہمیشہ صبح سے ایک گاڑی سے غلہ ڈھو رہا ہوں۔ یہ میرا آخری پھیرا ہے۔ میں یہیں رحیم آباد کا رہنے والا ہوں۔" اس نے بھی میری طرف دیکھے بغیر کہا۔

کچھ دیر بعد اس نے ایک پیلی سی چھجے دار عمارت کے سامنے گاڑی روک دی اور ناک کی سیدھ میں دیکھتے ہوئے بولا۔ "لو سٹیشن آگیا۔"

ایک بار پھر مجھ پر گھبراہٹ سی طاری ہو گئی اور اس گھبراہٹ میں' میں اس کا شکریہ ادا کرنا بھی بھول ہوگئی۔ گاڑی سے اتر کر میں چھجے کے نیچے سے گزر کر گیٹ کی طرف بڑھی۔ تین چار سیڑھیاں چڑھنے کے بعد میں نے مڑ کر دیکھا۔ گاڑی والا گہری نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے مڑتے دیکھ کر اس نے گاڑی آگے بڑھا دی اور اسے گھما کر بے نیازی سے واپس چل دیا۔

گیٹ پر کوئی نہیں تھا۔ گیٹ سے ذرا پہلے بائیں ہاتھ پر ٹکٹوں کی کھڑکی تھی۔ اس کے عقب میں ایک ٹکٹ کلرک کرسی پر نیم دراز سٹول پر پاؤں رکھے کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ آگے بڑھ کر میں نے پلیٹ فارم پر نظر دوڑائی۔ دائیں طرف ٹین کا بہت بڑا شیڈ تھا جس کے نیچے بنچوں پر چند افراد سکڑے سمٹے پڑے سو رہے تھے یا نیم غنودگی میں تھے۔ بائیں طرف پلیٹ فارم کا طویل حصہ ویران پڑا تھا۔ کافی دور ایک ٹھیلا کھڑا نظر آرہا تھا جس پر پٹرومکس لیمپ روشن تھا۔

سامنے ایک ٹرین کھڑی تھی جس کا بیشتر حصہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ چند ایک کھڑکیوں میں دھندلی دھندلی سی روشنی نظر آرہی تھی۔ ان ڈبوں میں مسافر لکڑی کے تختوں والی سیٹوں یا فرش پر بستر بچھائے سو رہے تھے۔ ایک کھڑکی میں ایک عورت اپنے بچے کو کھڑکی سے لٹکائے پیشاب کروانے کی کوشش کر رہی تھی۔ گاڑی کی پرلی طرف دور دور تک اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ ماحول پر اس قدر سکوت طاری تھا کہ بے اختیار جی چاہنے لگا کہ کوئی چیز حرکت کرے' کوئی آواز پیدا ہو۔ ٹرین بھی یوں ساکت اور خاموش کھڑی تھی گویا اس نے برسوں سے اپنی جگہ سے حرکت نہ کی ہو۔

کئی ڈبوں کے قریب سے گزرتے ہوئے میں چھوٹے سے ڈبے کے ایک دروازے پر پہنچی جو کھلا تھا اور اندر دو لمبی گدے دار نہایت ہی آرام دہ نشستیں نظر آرہی تھیں۔ بلا سوچے سمجھے میں نے اس مختصر سے ڈبے میں گھس کر دروازہ بند کر لیا اور اندر سے کنڈی بھی لگا لی۔ کافی دیر تک تو میں نچلی نشست پر اکڑی اکڑی سی بیٹھی رہی کہ ابھی کوئی درمیانی دروازے سے آئے گا اور مجھے کلائی سے پکڑ کر اتار دیا جائے گا یا مجھ سے الٹے سیدھے بے شمار سوالات کرے گا۔ جب میں کوئی تسلی بخش جواب نہ دے پاؤں گی تو مجھے پولیس والوں کے حوالے کر دے گا جو مجھے نجانے کہاں لے جائیں گے۔ شاید ویسے ہی کسی قید خانے میں جہاں سے میں فرار ہوئی تھی لیکن دیر تک نہ تو درمیانی دروازے سے کوئی آیا اور نہ ہی بیرونی دروازے پر کسی نے دستک دی۔

میرے جسم کا تناؤ کچھ کم ہو گیا لیکن الجھن بڑھنے لگی کہ آخر میں یہاں کیوں بیٹھی

ہوں اور یہ ٹرین کبھی چلے گی بھی یا نہیں؟ پھر مجھے یہ احساس ہوا کہ ذہن کے کسی اندھیرے گوشے میں یہ خواہش جاگزیں ہے کہ میں اس علاقے سے بہت دور کہیں نکل جاؤں۔ کسی ایسی جگہ جہاں کوئی یہ نہ جان سکے کہ میں نواب شرافت کے بندی خانے میں قید تھی یا شکاری شوکت اور اس کا ملازم میرے ہاتھوں قتل ہوئے ہیں۔

بیٹھے بیٹھے جب میری قوت برداشت جواب دے گئی اور میں اترنے کا ارادہ ہی کر رہی تھی کہ سیٹی کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں تذبذب کے عالم میں دوبارہ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ سیٹی کے جواب میں انجن نے وسل دی۔ سیٹی ایک بار پھر بجی اور تھوڑے سے وقفے سے انجن کی وسل بھی گونجی اور بالآخر ٹرین نے رینگنا شروع کر دیا۔

ٹرین نے رفتار پکڑی تو مجھے قدرے اطمینان سا محسوس ہونے لگا۔ مجھے اس سے غرض نہیں تھی کہ یہ اطمینان دیرپا ثابت ہوگا یا نہیں۔ اب کھڑکیوں سے تیز ہوا آنے لگی تھی۔ میں نے ان کے تختے گرائے اور نشست پر نیم دراز ہو گئی۔ میں کچھ سوچنا چاہتی تھی لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مجھ میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں۔ کھوپڑی میں دماغ کی جگہ محض ایک خلاء رہ گیا ہے' حواس شل ہو چکے ہیں۔

عین اس وقت جبکہ میرے حواس پر جمی ہوئی برف دھیرے دھیرے کچھ پگھلنے لگی تھی' میرے سامنے باتھ روم کا دروازہ آہستگی سے کھلا اور دوسرے ہی لمحے میری چیخ نکل گئی۔ جب میں نے ایک نوجوان کو اپنے سامنے کھڑا پایا۔

"شش۔" اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مضطرب لہجے میں کہا۔ "چیخ و پکار مچانے کی ضرورت نہیں ورنہ دونوں ہی مارے جائیں گے۔ میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔"

اس کے الفاظ پر غور کرتے ہوئے میں سنبھل کر نشست پر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ وہ کسرتی جسم اور لمبے قد کا ایک وجیہہ نوجوان تھا۔ بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے لمبے گھنگھریالے بال' باریک ترشی ہوئی مونچھیں' گہری بادامی آنکھیں جن کی گہرائی میں اس وقت بھی شریر سی مسکراہٹ مچل رہی تھی۔ اس کی رنگت سرخی مائل تھی' رخساروں پر بڑھے ہوئے شیو کی نیلاہٹ وہ سفید کرتے پاجامے پر واسکٹ نما سیاہ کوٹ پہنے ہوئے تھا جس کے بٹن اس وقت کھلے ہوئے تھے۔ پیروں میں کیشن تھے۔

اس کے لباس پر کئی جگہ مٹی کے دھبے تھے۔ دفعتاً" اس نے بالوں میں ہاتھ پھیرا اور میں نے دیکھا' اس کے ہاتھ کی پشت پر خراشیں تھیں۔ بہرحال اس ایک آدھ مشکوک سی نشانی سے قطع نظر وہ کسی بھی اعتبار سے کوئی چور اچکا یا ڈاکو نظر نہیں آتا تھا۔ میری کچھ ہمت بندھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس وقت مجھے اپنے آپ کو پراعتماد ظاہر کرنے کی ضرورت ہے۔

"دونوں ہی مارے جائیں گے سے تمہاری کیا مراد ہے؟" میں نے قدرے سخت لہجے

میں کہا۔ "مجھے کیوں اپنے ساتھ شامل کر لیا تم نے؟"

"اس لیے کہ تم بھی میری ہی طرح جان بچا کر بھاگتی نظر آ رہی ہو۔" اس نے سرتاپا میرا جائزہ لیا اور آگے بڑھ کر نشست کے ایک کونے پر بیٹھ گیا۔ میں اپنی جگہ کچھ اور سکڑ سمٹ گئی حالانکہ اس کے اور میرے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ "لیکن تم شکل سے انتہائی ہونق نظر آ رہی ہو' بدحواسی تمہارے روئیں روئیں سے ٹپک رہی ہے۔ اس طرح تم جلد ہی پکڑی جاؤ گی اور اگر میرا ساتھ دو گی تو خود بھی بچ جاؤ گی اور مجھے بھی فائدہ پہنچے گا۔"

فوری طور پر میں کوئی جواب نہ دے سکی۔ وہ بڑے اطمینان سے نشست سے ٹیک لگا کر اپنی ناک کی سیدھ میں دیکھ رہا تھا۔ میں نے دزدیدہ نظروں سے اپنا جائزہ لیا۔ میرا ظاہری حلیہ زیادہ برا نہیں تھا اس میں دو بڑے نقائص تھے۔ ایک تو اس وقت میرے پاؤں میں صرف ایک ہی چپل تھی اور پاؤں بری طرح گرد آلود تھے۔ دوسرے میرے سر پر دوپٹہ نہیں تھا حالانکہ باقی لباس کی مناسبت سے میں ایک گھریلو لڑکی نظر آ رہی تھی۔

"تم خوامخواہ اپنے ساتھ مجھے لپیٹے جا رہے ہو۔" میں نے مصنوعی خفگی ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ "میں بھلا کیوں پکڑی جاؤں گی؟ کون پکڑے گا مجھے؟ میں تو ایک کام کے سلسلے میں جا رہی ہوں۔"

"کہاں؟" اس نے فوراً میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا اور میں گڑبڑا گئی۔ یہ تو واقعی مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں کہاں جا رہی تھی یا جانا چاہتی تھی۔

میری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور دوبارہ ناک کی سیدھ میں دیکھتے ہوئے بولا۔ "ضروری نہیں کہ خوبصورت لوگ جھوٹ بھی خوبصورت بول سکیں۔ خیر' مجھے اس سے کیا۔ میں تمہیں سچ بولنے پر مجبور نہیں کروں گا۔ بس تمہیں اتنی تکلیف ضرور دوں گا کہ چند گھنٹوں کے لیے مجھے اپنا ہم سفر سمجھ کر برداشت کر لو۔ مجھ سے تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔ جہاں تمہارا جی چاہے' اتر جانا اور جہاں میں مناسب سمجھوں گا اتر جاؤں گا۔" یک لخت اس کے لہجے میں اتنی سنجیدگی عود آئی کہ مجھے حیرت سی ہونے لگی۔

کئی لمحے تک کونے میں ہم دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش بیٹھے رہے۔ انجن کی چھک چھک اور پٹڑی پر پہیوں کی گڑگڑاہٹ کے باوجود مجھے اپنے اردگرد گہرا سکوت محسوس ہو رہا تھا۔ وہ نوجوان یکلخت یوں لاتعلق ہو کر اپنے خیالوں میں کھو گیا تھا جیسے میری موجودگی سے بالکل بے خبر ہو۔ اس کے اس انداز سے مجھے یقین سا ہونے لگا کہ وہ مجھے نقصان پہنچانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا اور اس کا ساتھ میرے لیے سود مند ہی ہو سکتا تھا۔ صورتحال پر غور کرتے ہوئے مجھے یہ اندازہ بھی ہو چکا تھا کہ اپنے طور پر شاید مجھ میں چند قدم چلنے کی بھی صلاحیت نہیں تھی۔

دنیا میرے لیے ایک شکارگاہ کی طرح تھی جس میں قدم قدم پر پھندے لگے ہوئے تھے۔ مجھے کسی کے مضبوط لیکن مخلص سہارے کی ضرورت تھی۔ کوئی ایسا شخص جو آگے چل کر شوکت ثابت نہ ہو' تاہم اس اجنبی کے سامنے حقیقت کو تسلیم کرنے سے پہلے میں نے اسے کریدنا بہتر سمجھا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ اس وقت میری عقل اور ہوش و حواس میرا ساتھ دے رہے تھے۔

"تم کس سے جان بچا کر بھاگ رہے ہو؟" بالآخر میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"تو تم نے مجھ پر اعتماد کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔" وہ مسکرایا اور میری طرف رخ کر کے بیٹھ گیا۔

"یہ میں نے کب کہا؟ میں نے تو تم سے ایک سوال کیا ہے۔" میں نے کہا۔

"پولیس سے!" اس نے نہایت سادگی سے کہا۔ "یہ تو تھا تمہارے سوال کا جواب اور حقیقت یہ ہے کہ مجھے پولیس سے اتنا خوف نہیں۔ میرا اصل دشمن کوئی اور ہے جو پولیس سے بھی زیادہ طاقتور' بے رحم' خوفناک اور مکروہ انسان ہے۔"

"وہ کون ہے؟" میں اپنے لہجے کی دلچسپی نہ چھپا سکی۔

اس نے ایک بار پھر میرا سرتاپا جائزہ لیا' پھر خودکلامی کے سے انداز میں بڑبڑایا۔ "میرا خیال ہے تمہیں بتانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔" پھر قدرے بلند آواز میں بولا۔ "نواب شرافت علی۔"

مجھے یکلخت دھچکا سا لگا۔ شاید میرے چہرے پر ایسا تغیر آیا تھا کہ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔ پھر وہ سنبھل کر بیٹھ گیا اور بظاہر سپاٹ سے لہجے میں بولا۔ "کیا تم اسے جانتی ہو؟" لیکن اس لہجے کے عقب میں ہزاروں شکوک کے سائے رینگ رہے تھے۔

"ہاں!" میرے حلق سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔ "میری بربادیوں کا ذمہ دار بھی وہی شخص ہے۔" اب میرے لیے مزید مصلحت کوشی سے کام لینا ممکن نہیں رہا تھا۔ الفاظ خودبخود میرے ہونٹوں سے پھسلتے چلے گئے۔ "اس نے میرے باپ کو قتل کرایا' مجھے بے آبرو کیا' گھر سے بے گھر کیا' میرے باغیانہ رویئے کی وجہ سے دو سال تک مجھے اپنے ذاتی بندی خانے میں ڈالے رکھا۔ گزشتہ رات ہی میں وہاں سے فرار ہوئی ہوں۔"

وہ پلکیں جھپکائے بغیر میری طرف دیکھتا رہا۔ اس کا چہرہ یکلخت سپاٹ نظر آنے لگا تھا لیکن آنکھوں میں شعلے سے جل بجھ رہے تھے جیسے کہیں دور افتادہ کھنڈروں میں آگ لگی ہو۔

"ہماری کہانی ایک ہی ہے۔" بالآخر اس کے ہونٹوں نے حرکت کی۔ آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی۔ "شاید منزل بھی ایک ہو۔"

"کیا ہے تمہاری کہانی؟" میں نے اونچی آواز میں پوچھا اور فوراً ہی مجھے احساس ہوا کہ

میری آواز بھرانے لگی تھی۔

"کہانی تو بہت طویل ہے۔" وہ گویا کسی خواب سے جاگتے ہوئے بولا' مختصراً بتاتا ہوں۔ نواب شرافت کی زمینوں سے ملحق ہماری بھی تھوڑی سی زمین تھی جسے میرے والد نے سنبھالا ہوا تھا۔ میں کلکتہ کالج میں پڑھتا تھا۔ آخری سال میں' میں نے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا اور ہم چند لڑکے اپنی ایک تنظیم بنا کر ہندوستان کی آزادی کے لیے کام کرنے والوں کا ساتھ دینے لگے۔ تعلیم ختم کرکے میں گاؤں آیا تو وہاں بھی ہم نے کام جاری رکھا۔ نواب شرافت سے بھی ہم ملے اور اس کا تعاون طلب کیا۔ اس نے ہمیں بڑی صفائی سے ٹال دیا لیکن اس کے بعد سے ہمارے اور اس کے مزارعوں کے درمیان چھوٹے بڑے جھگڑے بڑھنے لگے' پھر دونوں طرف کے چند آدمی بھی مارے گئے۔ مقدمے بازی کے دوران مجھے معلوم ہوا کہ نواب انگریزوں کا کتنا بڑا پٹھو تھا۔ پھر میں نے اپنے نوجوانوں کی تنظیم کو اس نہج پر ڈالا کہ تحریک آزادی سے پہلے دراصل انگریزوں کے پٹھوؤں کی سرکوبی ضروری ہے۔ ہماری تنظیم صحیح معنوں میں کوئی سیاسی تنظیم نہیں تھی۔ بس چند جوشیلے نوجوانوں کا ایک گروہ تھا۔ چالاکی' سازشیں اور ٹھنڈے دماغ سے چالیں چلنا ہمیں نہیں آتا تھا۔ نواب شرافت کی طاقت کا بھی ہمیں اندازہ نہیں تھا۔ اپنی دانست میں بڑے سنسنی خیز اور مہم پسندانہ انداز میں ہم نے نواب سے تصادم بھی مول لے لیا۔ کچھ عرصے بعد میرے دوست بکھر گئے۔ کچھ نے نوکریاں کر لیں' کچھ کی شادیاں ہو گئیں' کچھ اور طرح سے عملی زندگی میں پھنس پھنسا گئے اور رفتہ رفتہ ایک دوسرے سے بے خبر ہو گئے۔ نواب کی آنکھوں میں کھٹکنے کے لیے صرف میں رہ گیا۔ ایک مرتبہ میں کسی کام سے دلی گیا ہوا تھا۔ واپس آیا تو میری دنیا اندھیر ہو چکی تھی۔ مزارعوں کے درمیان جھگڑا ایک مرتبہ پھر ہوا تھا اور اس مرتبہ نواب کے آدمیوں نے میرے والد کا سینہ چھلنی کر دیا تھا حالانکہ وہ جائے تنازع پر موجود نہیں تھے۔ انہیں وہاں سے کافی فاصلہ پر ایک دوسرے کھیت میں جا کر ہلاک کیا گیا تھا۔ مقدمہ چلتا رہا اور اس مقدمے میں ہماری مختصر سی زمین کا نصف سے زیادہ حصہ بک گیا اور نتیجہ کیا رہا؟ میں نواب کو عدالت میں بلوا تک نہیں سکا۔ عدالت کے فیصلے کے مطابق یہ مزارعوں کا باہمی تنازع تھا جس کی لپیٹ میں میرے والد آگئے تھے۔ نواب کے مزارعوں میں سے پچپن' ساٹھ سال کے ایک آدمی نے قتل کا اعتراف کر لیا۔ اسے عمر قید کی سزا ہو گئی اور دوسرے مزارعوں کو چند چند سال کی۔ مجھے معلوم تھا کہ اصل مجرم نواب تھا لیکن میں یہ ثابت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ تو اپنی جگہ بیٹھا صرف مہرے ہلاتا تھا۔ میں دنیا میں بے آسرا رہ گیا تھا۔ باپ کے بعد دنیا میں جیسے میرا کوئی نہ رہا تھا۔ ماں تو پہلے ہی مر چکی تھی' چند ایک عزیز و اقارب تھے۔ انہوں نے جب سنا کہ نواب سے میری دشمنی چل رہی ہے تو انہوں نے ویسے ہی کنارہ کشی اختیار کر لی۔ میں زمین کے معاملات میں اناڑی تھا

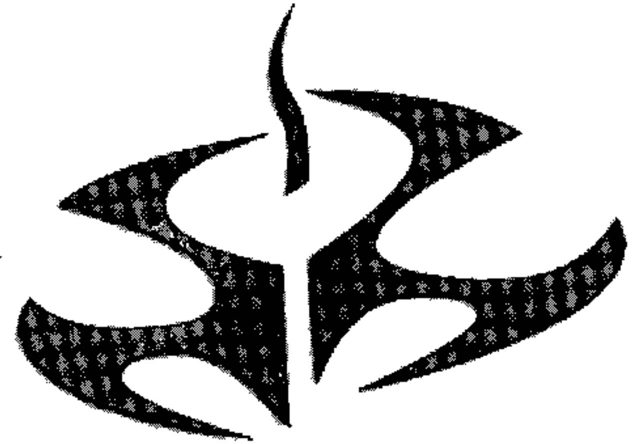
لہٰذا کچھی زمین میں نے مزارعوں ہی کے سپرد کر دی اور ان سے ملنے والے حصے پر گزر اوقات کرنے لگا لیکن رہا آبائی مکان ہی میں۔ دن رات میں بڑا نواب سے انتقام لینے کے افسانوی طریقے سوچتا رہتا لیکن حقیقت یہ تھی کہ دل ہی دل میں اس شخص سے مجھے خوف آنے لگا تھا۔ ابھی میں کسی واضح فیصلے پر نہیں پہنچ پایا تھا کہ نواب کے محل میں ایک اہم واقعہ رونما ہوا۔ ناشتے کی میز پر اس کے ایک بیٹے نے اس پر گولی چلا دی۔ پہلی گولی پیچھے کھڑے ہوئے ایک مصاحب کو لگی' دوسری نواب صاحب۔ ہسپتال پہنچتے پہنچتے مصاحب تو مر گیا' نواب بچ گیا۔ سننے میں آیا ہے کہ لڑکے نے جائیداد کے کسی جھگڑے پر باپ پر گولی چلائی تھی۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ اصل وجہ یہ تھی کہ نواب نے بیٹے کی بیوی پر ہاتھ ڈالا تھا یعنی بہو کو بھی نہیں بخشا تھا۔

جھگڑے کی وجہ بہرحال جو کچھ بھی رہی ہے۔ ہوا یہ کہ پولیس دو دن تک صرف ہسپتال کے چکر لگاتی رہی' اسے محل کی طرف سے اور افسران بالا کی طرف سے رپورٹ درج کرانے کی اجازت ہی نہیں مل سکی۔ ہوش میں آتے ہی نواب نے خاندان کے چند افراد کا اجلاس طلب کیا۔ باپ' بیٹے اور بیگمات کے درمیان صلح صفائی ہو گئی۔ واقعے کے چند چشم دید گواہوں کو بلا کر ہدایات دی گئیں کہ انہیں درحقیقت کیا بیانات دینے ہیں اور سارا ملبہ مجھ پر ڈال دینے کا نہایت پکا بندوبست کر لیا گیا۔

نواب نے ایک لمبا چوڑا بیان قلمبند کرایا جس میں گزشتہ واقعات اور دلائل سے ثابت کیا گیا کہ میں کتنے عرصے سے اس کے خون کا پیاسا چلا آرہا تھا اور وقوعے کے روز میں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ محل میں گھس آیا تھا۔ قاتلانہ حملہ میں نے ہی کیا تھا وغیرہ وغیرہ۔ نواب شرافت کا خاص محل ہمارے گھر سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر ہے۔ محل سے میرے ایک پرانے ہمدرد نے بروقت مجھے اطلاع دے دی کہ کیا ڈرامہ تیار ہوا ہے اور کن تیاریوں کے ساتھ پولیس مجھے گرفتار کرنے کے لیے آنے والی ہے۔ مجھے یقین نہ آیا کہ اس دھرتی پر اتنا اندھیر بھی برپا ہو سکتا ہے' اس لیے میں گھر پر ہی موجود رہا البتہ دل کو ایک کھٹکا سا لگ گیا تھا۔ کچھ نقدی وغیرہ سمیٹ کر گومگو کے عالم میں بیٹھا سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کرنا چاہیے' کھڑکی کے راستے میں نے دیکھا ایک گاڑی گھر کے سامنے آکر رکی ہے۔ گاڑی سے بظاہر کئی شرفاء اترتے نظر آئے لیکن میں سمجھ گیا کہ سادہ لباس میں یہ پولیس والے ہیں۔ وہ اس وقت مکان کو گھیرے میں لے رہے تھے' جب میں چھتوں پر سے پھلانگتا ہوا وہاں سے بھاگ نکلا۔

اس علاقے کو شاید ہی کوئی مجھ سے بہتر جانتا ہو' میں نے سیدھا ریلوے سٹیشن کا رخ کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس وقت ایک پسنجر ٹرین ادھر سے گزرتی ہے۔ خوش قسمتی سے میں عین اس وقت سٹیشن پر پہنچا جب یہ وہاں سے چل پڑی تھی لیکن پھر رحیم آباد آکر یہ ایسی

رکی کہ چلنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ مجھے اندیشہ محسوس ہونے لگا کہ اگر پولیس کا ذہن اس طرف چلا گیا کہ میں نے یہ ٹرین پکڑی ہوگی تو اتنی دیر میں تو وہ رحیم آباد بھی آپہنچیں گے۔ بہرحال میں کھڑکی سے جھانک کر دیکھتا رہا۔ پھر میں نے تمہیں اس ڈبے کی طرف آتا دیکھا تو اٹھ کر باتھ روم میں گھس گیا۔ یہ ہے کل کہانی۔"



وہ بول رہا تھا تو مجھے کوئی اور آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ خاموش ہوا تو ٹرین کی گھڑگھڑاہٹ سنائی دینے لگی۔ اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور بالوں میں انگلیاں پھیر بے مقصد سے انداز میں مسکرایا۔ میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"اب کہاں جاؤ گے؟" میں نے پوچھا۔

"فی الحال تو میں یہاں سے بہت دور نکل جانا چاہتا ہوں' غالباً بمبئی کی طرف' جہاں میں ے آپ کو گم کر لوں۔" وہ آہستگی سے بولا لیکن ایک روز میں واپس آؤں گا۔ پہلے میں ب سے ڈرتا تھا لیکن اب یک لخت ہی میرے دل سے اس کا ڈر نکل گیا ہے مگر ساتھ ہی ے یہ بھی سمجھ میں آگیا ہے کہ اس سے انتقام لینے کے جو افسانوی طریقے میں سوچتا تھا' وہ م نہیں دیں گے۔"

اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی اور وہ میرے چہرے سے نظریں ہٹا کر کسی غیر مرئی چیز کو ورتے ہوئے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ "میں نواب شرافت علی کی موت کا انہ لے کر واپس آؤں گا۔"

ایک لمحے کے لیے گویا موت کا سا سکوت چھا گیا۔ اس کے اٹل لہجے میں کوئی ایسی بات ی جس نے میرے خون کی گردش تیز کر دی۔ ایک لمحے کے وقفے کے بعد اس نے میری رف دیکھا۔ "اور تم کہاں جاؤ گی؟"

"میں بھی بہت دور نکل جانا چاہتی ہوں۔" میں نے پہلو بدل کر کہا۔

"میں نے کہا تھا ناں .....کہ شاید ہماری منزل بھی ایک ہو۔" وہ مسکرایا۔ "میرا ساتھ دو گی؟"

مجھے سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ قطعی اضطراری طور پر میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "ملاؤ ہاتھ۔" مسکرا کر اس نے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ جھجکتے ہوئے میں نے بھی ہاتھ بڑھا دیا اور ایک مدت بعد میرے ہاتھ نے زندگی کا لمس محسوس کیا۔ اس کا مضبوط اور چوڑا سا ہاتھ اپنی گرفت میں ایک وعدہ لیے ہوئے تھا۔

"اگلا اسٹیشن بخیرو عافیت گزر جائے۔" اس نے آہستگی سے میرا ہاتھ چھوڑتے ہوئے

کہا۔ ”اس کے بعد الہ آباد تک لمبی تان کر سوئیں گے۔ الہ آباد اس ٹرین کا ٹرمینل ہے' وہاں سے ہم کوئی میل ٹرین پکڑ لیں گے۔“

”اگلا اسٹیشن تو بخیر و عافیت ہی گزر گیا لیکن وہ ابھی لمبی تان کر سونے کے لیے اوپر کی برتھ پر چڑھا ہی تھا کہ کوپے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے اتر کر دروازہ کھولا۔ سامنے ٹکٹ چیکر کھڑا تھا۔ ”معاف کیجئے میں نے آپ کی نیند میں خلل ڈالا۔“ چیکر نے دزدیدہ نظروں سے کوپے میں جھانکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن میری ڈیوٹی ختم ہو رہی ہے اور اگلے سٹیشن پر اترنے سے پہلے مجھے آخری مرتبہ ٹکٹ چیک کرنے ہیں۔“

”جواباً میں بھی آپ سے معافی ہی چاہوں گا ٹکٹ چیکر صاحب!“ اس نے مسکراتے ہوئے نہایت اطمینان سے کہا۔ ”میں اور بیگم ایسی ہڑبونگ اور بھاگم دوڑ میں ٹرین میں سوار ہوئے ہیں کہ ٹکٹ تو کیا لینا تھا' پاؤں کی جوتیاں اور تن کے کپڑے سنبھالنے کی بھی مہلت نہیں مل سکی۔“ اس نے کوٹ کی اندرونی جیب سے دو نوٹ نکالے۔ ”ٹکٹ بنا دیجئے۔“ اس نے پہلے ایک نوٹ چیکر کو تھمایا۔ ”یہ تو ٹکٹ کے پیسے۔“ پھر دوسرا نوٹ تھماتے ہوئے بولا۔ ”اور یہ آپ کے لیے۔“

”کنڈیکٹر گارڈ تو ٹرین کے ساتھ نہیں ہے۔“ چیکر نے نوٹ لیتے ہوئے نہایت شیریں لہجے میں کہا۔ ”بہرحال میں اگلے سٹیشن پر اتروں گا تو ٹکٹ آپ کو پہنچاتا جاؤں گا۔ کوئی فکر نہ کیجئے' آرام فرمایئے۔“

میں نے آسودگی کی گہری سانس لی۔ اگر قدرت نے اس اجنبی کو نہ بھیجا ہوتا جو اس وقت میرے لیے سب سے بڑا آشنا تھا تو شاید میں اس مرحلے پر کسی بڑی مصیبت میں پھنس چکی ہوتی۔ میری جیب میں تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی اور پھر جوان اور تنہا ہونا میرا سب سے بڑا عیب تھا جس کی شاید قدم قدم پر مجھے سزا ملتی۔

ٹکٹ چیکر کے جانے کے بعد وہ دروازہ بند کر کے مڑا تو میں نے مسکرا کر پوچھا۔ ”کیا بیوی اپنے زبردستی کے شوہر کا نام پوچھ سکتی ہے؟“

”کیا ازراہ کرم اس بیچارے کو زبردستی کے شوہرے کے بجائے مستقبل کا شوہر نہیں کہا جا سکتا؟“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

”فی الحال تو نہیں۔“ میں نے بظاہر سنجیدگی سے کہا۔ ”البتہ غور کیا جا سکتا ہے۔“ اب میں اپنے آپ کو بہت بہتر محسوس کر رہی تھی۔ تفکرات اور خطرات سے بے نیاز۔ وجود جیسے ہلکا پھلکا سا ہو گیا تھا۔

”میرا نام کچھ اکھڑ سا ہے۔ خواتین کو عموماً پسند نہیں آتا۔“ اس نے دوبارہ برتھ پر چڑھتے ہوئے کہا۔

”نام کو پسند یا ناپسند کرنے سے کیا ہوتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میرے خیال میں تو نام اور شخصیت کے درمیان بڑے فاصلے ہوتے ہیں۔ اب اسی نواب شرافت علی کو لے لو۔ نام شرافت علی مگر شرافت شاید سات پشتوں میں بھی اس کے آباؤ اجداد کو چھو کر نہیں گزری۔“

”اس خبیث کا نام نہ لو میرے سامنے۔“ اس کے چہرے پر یکلخت سرخی کی جھلک آئی لیکن دوسرے ہی لمحے گویا وہ خود پر قابو پاتے ہوئے پرسکون لہجے میں بولا۔ ”میرا نام پوچھتے پوچھتے بات کہاں سے کہاں چلی گئی۔ مجھے ارباب مغل کہتے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ آنکھیں بند کر کے برتھ پر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کے خراٹوں کی آواز آنے لگی۔ میں بھی لیٹ گئی اور سونے کی کوشش کرنے لگی لیکن کافی دیر تک دل کو کھٹکا سا لگا رہا۔ بار بار میں آنکھیں ذرا سی کھول کر دیکھتی رہی کہ ارباب برتھ سے اتر تو نہیں رہا لیکن میرا یہ خدشہ محض خدشہ ہی رہا۔

بمبئی پہنچ کر دو دن ہم ایک ہوٹل میں رہے۔ تیسرے دن ارباب کرائے کا ایک مکان تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ مختصر سے اس مکان کے اردگرد آبادی تو تھی پھر بھی اپنی ساخت کی وجہ سے یہ بالکل الگ تھلگ سا لگتا تھا اور اس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس میں تہہ خانہ بھی تھا۔ اگلے روز ارباب ضرورت کا مختصر سا سامان ایک گاڑی میں لاد کر لے آیا۔ اس کے پاس پیسے تیزی سے ختم ہو رہے تھے مگر وہ کچھ خاص فکرمند نہیں تھا۔

مکان میں رہتے ہوئے ہمیں چوتھا دن تھا جب ارباب نے مجھ سے کہا۔ ”آخر میں انسان ہوں۔“ میں نے اس بلاتمہید جملے پر حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”تو میں نے کب تمہارے انسان ہونے پر شک کیا ہے؟“

”شک تو نہیں کیا۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”لیکن ایک انسان کا اس حد تک امتحان لینا بھی کہاں کا انصاف ہے۔ کتنے دن گزر گئے ہیں کہ تم چوبیس گھنٹے میری رسائی میں ہوتی ہو مگر میں تمہاری طرف زیادہ دیر دیکھنے سے بھی اپنے آپ کو باز رکھتا ہوں۔ اندر ہی اندر اپنے آپ سے لڑتا رہتا ہوں اور میں نے اپنے آپ کو توڑ پھوڑ لیا ہے مگر میں زیادہ دیر منافق بن کر رہنا نہیں چاہتا۔“ آخری الفاظ اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہے۔

”تو پھر کیا کرنا چاہیے؟“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

”ہمیں نکاح کر لینا چاہیے اور سکھ چین کی زندگی بسر کرنی چاہیے۔“ اس نے اطمینان سے جواب دیا تاکہ یہ جو ہم چوروں کی طرح ایک دوسرے سے بدکے بدکے پھرتے ہیں' یہ مسئلہ ختم ہو جائے اور ہم ایک طرف سے یکسو ہو کر باقی معاملات کے بارے میں اپنی زندگی کا کوئی لائحہ عمل طے کر سکیں۔“

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن تم سوچ لو۔ ایک تو زندگی کے کسی موڑ پر مجھے دغا نہ دینا' دوسرے کبھی مجھے ماضی کے کسی واقع کا طعنہ نہ دینا۔"

"زیادہ بکواس کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے اٹل لہجے میں کہا۔ "مجھے تم جیسی ہی بیوی کی ضرورت ہے' خصوصاً موجودہ حالات میں۔ ایسی شریک حیات جس کی روح پر تشدد اور ظلم کے چرکے لگ چکے ہوں تاکہ وہ انتقام کے راستے میں ثابت قدمی سے میرا ساتھ دے سکے۔ صعوبتوں سے گھبرا کر منہ نہ موڑ جائے۔ جس کے اندر سلگتی ہوئی زخمی انا کی چنگاری کسی وقت بھی بھڑک کر شعلہ بننے کے لیے تیار ہو۔ ایک عام سی عورت میری آئندہ زندگی میں میرا ساتھ نہ دے سکے گی۔ فی الحال تم ایک عام عورت نظر آتی ہو مگر میں جب بھی تمہیں بغور دیکھتا ہوں' کوئی غیبی قوت میرے کان میں سرگوشیاں کرتی ہے کہ تم ایک عام عورت نہیں ہو۔"

"اچھا' تقریر بند کرو اور کام کی بات کرو۔" میں نے کہا۔ "چلو تم تیار ہو جاؤ' ہم نکاح پڑھوانے چلتے ہیں۔" اس نے اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

"تم تو اتنے آرام سے کہہ رہے ہو جیسے ہم بازار سے دو ٹکے کی مٹھائی خریدنے جا رہے ہوں۔" میں نے کہا۔

"تو اور کیا دھوم دھڑکے سے کہوں تاکہ وہ پڑوسی اکٹھے ہو جائیں جو ہمیں پہلے ہی میاں بیوی سمجھتے ہیں اور وہ مالک مکان بھی آجائے جس نے ہمیں نوبیاہتا جوڑا سمجھ کر مکان کرائے پر دیا تھا اور جو بڑی دلچسپی سے ہمارے ہی گھر کی طرف کان لگائے بیٹھا ہے کہ کب ہمارے ہاں سے کسی چنو منو کی ٹیاں ٹیاں سنائی دیتی ہے۔" ارباب میری طرف دیکھتے ہوئے شرارت سے مسکرایا۔ "اگر ان سب کو معلوم ہو گیا کہ ابھی ہمارا نکاح ہی نہیں ہوا تو ہماری شرافت اور صبر و قناعت پر کوئی یقین نہیں کرے گا اور سب لوگ مار مار کر ہمارا بھرکس نکال دیں گے۔ چنانچہ فی الحال صبر و شکر کے ساتھ چپ چپاتے ہی نکاح ٹھیک ہے۔ چلو اب تیار ہو جاؤ۔"

شام کو اپنے گھر سے آگے دو تین گلیاں چھوڑ کر ہم نے ایک مسجد تلاش کی جس کے ساتھ ہی ایک حجرے پر نکاح رجسٹرار کا چھوٹا سا بورڈ آویزاں تھا۔ حجرے کا دروازہ مسجد کے اندر ہی تھا۔ جوتے اتار کر ہم نے اندر جا کر حجرے کے دروازے پر دستک دی۔ اونچے قد کے ایک بزرگ نے دروازہ کھولا۔ داڑھی کے ساتھ ساتھ ان کی بھنوؤں تک کے بال سفید ہو چکے تھے مگر چہرہ جوانوں سے زیادہ روشن اور آنکھوں میں زندگی کی چمک تھی۔

"ہم نکاح پڑھوانا چاہتے ہیں۔" ارباب نے نہایت سادگی اور بغیر کسی تمہید کے اس طرح یہ جملہ ادا کیا کہ مولوی صاحب ہکا بکا رہ گئے۔

"بڑی خوشی کی بات ہے برخوردار!" بالآخر انہوں نے سنبھال کر کہا۔ "لیکن باراتی کہاں ہیں' گواہ کون ہوں گے اور تمہارے والدین کہاں ہیں؟"

"یہ سب لوگ تو میسر نہیں ہیں مولوی صاحب!" ارباب کے چہرے پر بدستور مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی اور اس کا لہجہ بھی انتہائی بھولپن لیے ہوئے تھا۔ "لیکن اگر لڑکا اور لڑکی بالغ ہوں اور شادی کے لیے آمادہ ہوں تو کیا نکاح نہیں ہو سکتا؟"

"ہو تو سکتا ہے برخوردار!" مولوی صاحب نے قدرے الجھن زدہ سے لہجے میں کہا۔ "لیکن میں احتیاطاً اس قسم کے نکاح نہیں پڑھاتا' کیا معلوم کیا چکر ہو۔ لڑکی ورغلا کر یا بھگا کر لائی گئی ہو' پیچھے مقدمہ یا رپٹ درج ہو۔"

"مولوی صاحب! قصہ مختصر یہ ہے۔" ارباب نے گہری سانس لے کر کہا۔ "ہم دونوں زمیندار گھرانوں کی اولادیں ہیں اور ایک تیسرے زمیندار سے دشمنی میں ہمارے گھر اجڑ چکے ہیں۔ والدین مر چکے ہیں۔ ہم بمشکل جانیں بچا کر بھاگے ہیں ورنہ ہم بھی خواہ مخواہ کی عداوت بازی میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے۔ ہم کئی دن سے ساتھ ہیں۔ ہم چاہتے تو ایک دوسرے کی رضا و رغبت سے گناہ کی زندگی بھی گزار سکتے تھے لیکن ہمارے ضمیر نے یہ گوارا نہیں کیا اور ہم آپ کے پاس آگئے۔ ہم اس اجنبی شہر میں امن و آشتی کے ساتھ ایک نئی زندگی کا آغاز کرنا چاہتے ہیں لیکن آپ اگر عالم ہوتے ہوئے بھی خوف کا شکار ہیں اور ہمارے لیے نئی زندگی کے دروازے کھولنے پر تیار نہیں ہیں تو ہم کوئی اور راستہ ڈھونڈیں گے۔"

مولوی صاحب نے چند لمحے غور کیا۔ باری باری ہم دونوں کا سرتاپا جائزہ لیا۔ میں نے نظریں جھکا لیں البتہ ارباب پرامید نظروں سے مولوی صاحب کی طرف دیکھتا رہا۔

"میں معذرت خواہ ہوں۔" بالآخر مولوی صاحب نے آہستگی سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" ارباب نے پژمردہ سے لہجے میں کہا۔ "ہم چند ایک جگہ اور کوشش کر لیتے ہیں ورنہ پھر جسٹس آف پیس سے اجازت نامہ لے کر آجائیں گے۔"

اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور واپس جانے کے لیے مڑ گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ مولوی صاحب تذبذب کے عالم میں چوکھٹ پر کھڑے تھے۔ ہم ابھی مسجد کے بڑے دروازے تک ہی پہنچے تھے کہ انہوں نے عقب سے آواز دی۔ "سنو صاحبزادے!"

ہم واپس پہنچے تو انہوں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "میرے خیال میں ایک مسلمان جوڑے کو شادی کے لیے انگریز حاکم سے اجازت نامہ لینے کی ضرورت نہیں۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔ "لڑکی! کیا تم حلفیہ اور تحریری بیان دے سکتی ہو کہ تم اپنے والدین یا دیگر سرپرستوں کی مرضی کے خلاف اس نوجوان کے ساتھ فرار ہو کر نہیں آئی ہو؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ ایک طرف ہٹ گئے۔ "ٹھیک ہے' اندر آجاؤ۔"

عشاء کی اذان سے پہلے ہمارا نکاح ہو گیا۔ موذن اور متولی گواہ بنے۔ ارباب نے نکاح خوانی کا ہدیہ اور نمازیوں کے لیے چھوارے منگوا کر بانٹنے کی غرض سے کچھ رقم مولوی صاحب کے سپرد کی اور ہم گھر آگئے۔

یہ ایک عجیب شادی تھی۔ میرے ہاتھوں میں منہدی رچی تھی' نہ ڈھولک پر رخصتی کے گیت گائے گئے تھے۔ میں نے عروسی جوڑا پہنا تھا نہ کسی نے اپنی دعاؤں کے ساتھ مجھے رخصت کیا تھا۔ کسی نے میرا سنگھار کیا تھا نہ میرے در پر شہنائیاں بجی تھیں۔

ڈھائی سال پہلے جب میری نام نہاد منگنی ہونے لگی تھی تو پڑوسیوں نے ڈھولک کی تھاپ پر گیت الاپنے شروع کر دیئے تھے مگر اس وقت ہر بول برچھی کی طرح سینے میں اتر رہا تھا۔ آج میرے کان ڈھولک کی تھاپ اور رسیلے گیت سننا چاہتے تھے مگر سنانے والا کوئی نہ تھا۔

کبھی محل سرا کا پرآسائش اور شاندار رہائشی حصہ میسر تھا تو خلوتوں کا رفیق ایک لٹیرا' ایک مکروہ عفریت تھا۔ آج من کا میت سامنے تھا تو خلوت گاہ کو سجانے کے لیے چار پھول بھی میسر نہ تھے۔ دیر تک ہم دونوں آمنے سامنے چارپائی پر بیٹھے ایک ٹک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے' پھر خودبخود آنکھیں بھر آئیں۔

"الٰہی! میری تقدیر اس طرح کیوں لکھی گئی ہے؟" میں نے بہ زبان خاموش سوال کیا اور آنسو میرے رخساروں پر امڈ آئے۔

ارباب نے مجھے اپنی مضبوط بانہوں کے حلقے میں سمیٹ لیا۔ "مت رو پگلی! میں تیرا درد سمجھ رہا ہوں مگر یہ سب چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں۔" وہ اپنا لہجہ شگفتہ رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "مجھے لگتا ہے کہ ہم دونوں ان سے کہیں زیادہ بڑی باتوں پر دھیان دینے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ باقی اگر تجھے روکھے پھیکے طریقے سے شادی ہونے کا دکھ ہے تو فی الحال اس دکھ کو دل سے نکال دے۔ ہم اس وقت اپنی شادی کا جشن منا لیں گے جب حالات ہمارے حق میں ہوں گے۔ ہم ساری رسمیں ادا کر لیں گے۔ سارے ارمان نکال لیں گے' بس یوں سمجھ لے کہ جشن ادھار رہا.....چل اب ہنس دے۔ منہ بسورتی اچھی نہیں لگتی.....چل ہنس....." اس نے میرے زور سے گدگدی کی۔ میں ہنس پڑی' اس کا دل رکھنے کے لیے نہیں' سچ مچ۔

"اور اگر اس وقت ہمارے منہ میں دانت اور پیٹ میں آنت نہ رہی تو؟" میں نے ہنسی پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"تو پھر کیا۔ جشن تو دانتوں اور آنتوں کے بغیر بھی منایا جا سکتا ہے۔" اس نے سادگی

سے کہا۔ اس کا گفتگو کرنے کا یہ انداز نہایت عجیب تھا۔ کبھی نہایت خطرناک اور کبھی نہایت پرمزاح' کبھی بے حد چبھتی ہوئی اور کبھی نہایت ذومعنی بات۔ وہ اسی سرسری اور سادہ سے لہجے میں انتہائی بھولپن سے بات کر جاتا تھا جیسے اسے اپنے الفاظ کے معنی و مفہوم کا صحیح اندازہ نہ ہو۔ اس کی یہ ادا مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔

ارباب کے پاس پیسے بالکل ہی ختم ہونے لگے تو وہ نوکری کی تلاش میں جانے لگا۔ نوکری اسے بہت جلد مل سکتی تھی کیونکہ اس کے پاس فن تعمیر کی ڈگری تھی لیکن مصیبت یہ تھی کہ وہ یہ ڈگری پیش نہیں کرنا چاہتا تھا اور نہ ہی اپنا اصل نام ظاہر کرنا چاہتا تھا۔ اپنا حلیہ بھی اس نے بہت بدل لیا تھا۔ کلین شیو' چھوٹے چھوٹے بال' جدید ترین انگریزی لباس۔ اب یہ اس کی شخصیت کے نمایاں جزو تھے۔ وہ بظاہر کوئی کھلنڈرا اور مغربیت زدہ سا نوجوان نظر آتا تھا جو کسی وجہ سے رائل آرمی میں کمیشن حاصل کرنے میں ناکام رہ گیا ہو مگر شوق بہرحال ابھی تک اس کے سر پر سوار ہو۔

اس سے پہلے کہ گھر میں فاقہ کشی کی نوبت آتی' ارباب کو ایک تعمیراتی کمپنی میں سائٹ سپروائزر کی نوکری مل گئی۔ تین ماہ اس نے بڑے لگے بندھے معمول کے مطابق گزارے۔ اب میں امید سے تھی اور ارباب نے جب یہ سنا تھا تو خوشی سے پھولا نہیں سمایا تھا لیکن اب چند دن سے میں یہ محسوس کر رہی تھی جیسے وہ کسی ادھیڑبن میں مصروف رہتا ہو۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس کا سیاسی ذہن کسی جوڑ توڑ میں لگا ہوا ہے۔ ایک دو بار میں نے پوچھا بھی تو ٹال گیا۔ "ابھی بتانے والی کوئی بات نہیں۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے اس کے طرزعمل کی وجہ کام کی زیادتی سمجھی کیونکہ اب وہ نجی طور پر کچھ چھوٹے موٹے نقشے بنانے کا کام گھر لانے لگا تھا۔ اس زمانے میں ضابطے اتنے سخت نہیں تھے۔ نجی پراجیکٹس میں کام کا معیار دیکھا جاتا تھا' نام اور ڈگریاں نہیں۔ اس طرح کے نجی کاموں سے ارباب کی آمدنی میں خاصا اضافہ ہوا تھا۔

پھر گاہے بہ گاہے اسے کچھ لوگ ملنے آنے لگے۔ اس نے بتایا کہ یہ اس کے دفتر کے ساتھی ہیں۔ وہ لوگ تھوڑی دیر تک بیٹھک میں گپ شپ کرتے پھر تہہ خانے میں چلے جاتے۔ ارباب نے ڈرائنگ وغیرہ کے کام کا بندوبست بھی تہہ خانے میں کیا ہوا تھا۔ اس کی ڈرائنگ کی مخصوص میز اور ایزل وغیرہ کے علاوہ تہہ خانے کے ہال میں اس نے ایک بہت لمبی سی میز اور چالیس کرسیاں بھی ڈلوا دی تھیں۔

رفتہ رفتہ ہر ہفتے کی شام کو اس سے ملنے کے لیے آنے والوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ ان میں ایک نوجوان سے ارباب کے خصوصی طور پر بہت گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ نرم و نازک اور شرما شرما کر بات کرنے والے اس نفیس طبع سے نوجوان کا نام نصیر بیگ تھا۔ عام

طور پر وہ سفید کرتا اور سفید ہی تنگ پاجامہ پہنے ہوتا تھا اور اس لباس میں کچھ زیادہ ہی دبلا لگتا تھا۔ ملاقاتیوں میں وہ عموماً سب سے پہلے آتا۔ دونوں دیر تک بیٹھک میں بیٹھے چائے پیتے اور کھسر پھسر کرتے رہتے۔ پھر باقی لوگ بھی آنا شروع ہو جاتے۔

ایسا لگتا تھا کہ باقی سب لوگ ارباب کے ساتھ اس نوجوان نصیر بیگ کی بھی غیر معمولی طور پر عزت کرتے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ ایک خاص وقت پر وہ لوگ اٹھ کر تہہ خانے میں چلے جاتے اور ارباب تہہ خانے کی سیڑھیوں کا دروازہ بند کر لیتا تھا۔ میں نے بارہا متجسس ہو کر ارباب سے پوچھا کہ آخر وہ کیا کر رہا ہے مگر اس نے ہمیشہ یہی جواب دیا کہ وقت آنے پر وہ مجھے خود ہی بتا دے گا۔

تہہ خانے کے دو روشن دان برآمدے کی سطح سے ذرا اوپر تھے لیکن ان روشن دانوں پر بھی اندر کی طرف گتہ لگا ہوا تھا۔ ایک روز تہہ خانے کی صفائی کرتے ہوئے میں نے گتہ کونے سے تھوڑا سا پھاڑ دیا۔ اب ضرورت پڑنے پر میں اوپر برآمدے سے اس جھری کے راستے جھانک سکتی تھی۔ میں بارہا تہہ خانے میں کوئی ایسی چیز تلاش کرنے کی کوشش کر چکی تھی جس سے کچھ اشارہ مل سکے کہ وہ آخر تہہ خانے میں اکٹھے ہو کر کیا کرتے ہیں۔

اگر کوئی اجلاس ہوتا ہے تو کس قسم کا؟ مگر مجھے ارباب کے کاموں کی چیزوں کے علاوہ کبھی کاغذ کا کوئی فالتو پرزہ تک نظر نہیں آیا۔

اگلے سنیچر کی رات کو جب ان سب کو تہہ خانے میں گئے ہوئے کچھ دیر ہو گئی تو میں صحن میں تہہ خانے کے روشن دان پر پہنچی اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس جھری پر جھک گئی جو میں نے گزشتہ روز تیار کی تھی۔ تہہ خانے میں بتی جل رہی تھی مگر اس کے باوجود طویل میز کے ایک سرے پر شمعدان میں ایک موم بتی جل رہی تھی۔ میز کے ارد گرد نہایت قرینے سے رکھی ہوئی بیس کرسیاں حاضرین سے بھری ہوئی تھیں۔ باقی خالی کرسیاں دیوار کے ساتھ لگی ہوئی تھیں۔

ان سب لوگوں کے چہروں پر خوفناک حد تک سنجیدگی طاری تھی۔ پہلی نظر میں تو وہ سب مجھے پتھرائے ہوئے انسان محسوس ہوئے۔ پلکیں تک نہیں جھپک رہے تھے۔ دفعتاً ایک شخص نے ہاتھ بڑھایا اور شمعدان ایک پختہ العمر اور گھٹے ہوئے جسم کے ایک آدمی کے آگے رکھ دیا جو چند ہی دن پہلے مجھ کو آتے جاتے دکھائی دینے لگا تھا۔ اس نے ہوا میں کسی غیر مرئی چیز پر نظریں گاڑ کر نہایت آہستگی سے کچھ کہا۔ فاصلہ زیادہ تھا' میں الفاظ سمجھ نہ پائی۔ روشن دان پر میں کچھ اور جھک کر ہمہ تن گوش ہو گئی۔ اب اس شخص کی آواز بھی قدرے بلند ہو چکی تھی۔

اب "وہائٹ اینجلس" میں میری شمولیت ہی میری زندگی کا اثاثہ ہے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "تقریب حلف وفاداری پر میں عہد کرتا ہوں...... یہ کہتے ہوئے اس نے گویا نیند کے عالم میں دھیرے دھیرے شہادت کی انگلی بڑھائی اور موم بتی کی لو پر معلق کر دی۔ "کہ اس منشور کا پابند رہوں گا جو ہمارے سینوں میں نقش ہے۔ آج کے بعد ظلم کو طاقت سے روکنا' اتنی طاقت سے جتنی ہمیں میسر ہوگی' میرا نصب العین ہوگا۔ اگر میں "وہائٹ اینجلس" یا اس کے منشور سے غداری کروں گا تو اپنے آباؤ اجداد کے چہروں پر غلاظت ملنے اور اپنے نسب کو مشکوک بنانے کا مرتکب ہوں گا۔"

اس نے انگلی پیچھے ہٹائی جس سے گہرے سیاہ دھوئیں کی موٹی سی لکیر ہوا میں بلند ہونے لگی تھی۔

اس کے بعد شمعدان ایک اور شخص کے سامنے کھسکا دیا گیا۔ اس کی صورت بھی مجھے کچھ ہی دنوں پہلے نظر آنے لگی تھی۔ وہ بھی یہی الفاظ دہرانے لگا۔ میرے لیے اب روشن دان پر جھکے رہنا دوبھر ہو رہا تھا۔ میں پورے دنوں سے تھی۔ میری سانس اب گویا اٹکنے لگی تھی۔ صورتحال کا مجھے کافی حد تک اندازہ ہو ہی چکا تھا' اس لیے میں اپنے کمرے میں لوٹ آئی۔

رات کو بستر پر میں نے ارباب سے کہا۔ "یہ تم نے کیا ڈرامے بازی شروع کر رکھی ہے؟ تم تو کہتے تھے' تم نے افسانوی منصوبے بنانے بند کر دیئے ہیں۔"

"تو تم نے کچھ باتیں سن لی ہیں۔" اس نے ایک گہری سانس لے کر میری طرف کروٹ بدل لی۔ پھر جواب کا انتظار کیئے بغیر بولا۔ "بہرحال تم تسلی رکھو۔ یہ نہ تو کوئی ڈرامہ ہے اور نہ ہی افسانوی منصوبہ۔ میں سب کچھ بہت سوچ سمجھ کر کر رہا ہوں۔"

"ارباب! میری عمر' تعلیم' تجربہ سب کچھ تم سے بہت کم ہے۔" میں نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "لیکن جب سے میں نے ان ہونق سی شکلوں والے آدمیوں کو موم بتی کے شعلے پر انگلی رکھ کر قسمیں کھاتے دیکھا ہے' مجھے تم ایک نوعمر اور نادان لڑکے لگنے لگے ہو۔ آخر تم کرنا کیا چاہتے ہو؟"

"میں نے جو کچھ سوچا ہے' اس کے سوا میرے لیے کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں اکیلا نواب کو قتل نہیں کر سکتا۔ اس تک میری رسائی ہی نہیں ہو سکتی۔ قانونی اور جائز طریقوں سے میں اسے اس کے گناہوں کی سزا نہیں دلوا سکتا۔ میں بیس جانثار اکھٹے کر چکا ہوں' دس اور تلاش کروں گا۔ تیس جانثاروں کی اس تنظیم کے ساتھ کسی روز میں رات کے اندھیرے میں نواب کے محل پر بجلی بن کر گروں گا اور اس کا اور اس کی اولادوں میں سے جو بھی ہاتھ لگا' سب کا نام و نشان مٹا دوں گا۔" وہ مسکرایا۔ "اس کے بعد اس فہرست پر

کام شروع ہو جائے گا جو میرے جانثاروں نے مرتب کر رکھی ہے۔"

"گویا تم ایک پڑھے لکھے اور ذہین آدمی سے ڈاکو بننے جا رہے ہو۔" میں نے خفگی سے کہا۔ "اول تو کوئی امید نہیں کہ اس طرح تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤ گے اور اگر ہو بھی گئے.....تو بیوی بچوں کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ کر باقی زندگی جیل میں سڑتے گزار دو گے۔"

"میں ڈاکو بننے نہیں جا رہا۔" اس نے قدرے برہمی سے کہا۔ "میں نہایت سائنٹفک بنیادوں پر یہ تنظیم قائم کر رہا ہوں۔ کوئی ہماری گرد کو بھی نہیں پا سکے گا۔ تمہیں کیا معلوم کہ میں نے ان زخم خوردہ لوگوں کے ذہنوں کے کس کس تار کو چھیڑ کر انہیں اپنا ہم خیال جانثار بنایا ہے اور اپنا لائحہ عمل مرتب کرنے سے پہلے گوریلا لڑائیوں کی کتنی طویل تاریخ پڑھی ہے۔"

"میں نے زیادہ کتابیں نہیں پڑھیں۔ زندگی نے مجھے مہلت ہی نہیں دی۔" میں نے نہایت تحمل مزاجی سے کہا۔ "البتہ مجھے اپنے ابا جی کی کہی ہوئی بات نہیں بھولتی کہ سائنسی فارمولے تو عملی طور پر درست ثابت کیے جا سکتے ہیں مگر زندگی کے باقی معاملات میں کتابی علم شاذ و نادر ہی کام دیتا ہے۔ ضروری نہیں کہ جس طریق کار کے تحت ایک آدمی نے کامیابی حاصل کی ہو' دوسرا بھی اسی فارمولے کو اپنا کر کامیاب ہو جائے۔ اگر ایسا ہونے لگے تو دنیا کا ہر فرد ہی کامیاب ہو جائے۔ اس کے علاوہ میری سمجھ میں یہ بھی نہیں آرہا کہ جس طریق کار کے تحت تم قدم اٹھا رہے ہو' اس کے اہم ترین مرحلے کیسے سر ہوں گے؟ وسائل کہاں سے آئیں گے؟ اسلحہ کہاں سے آئے گا؟"

"یہ سب کچھ میں نے سوچ رکھا ہے۔" ارباب کے لہجے میں فتح مندی کی سی جھلک آئی۔ "سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تمہیں اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"نہ جانے کیوں میرا دل نہیں مانتا۔" میں نے کہا۔ "میں بدشگونی کرنا نہیں چاہتی لیکن نہ جانے کیوں مجھے وہم سا ہے کہ یہ طریقہ درست نہیں۔"

"تو پھر تم کیا طریقہ تجویز کرتی ہو؟" ارباب بظاہر پرسکون لہجے میں بولا مگر مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کی تہہ میں وہی جھنجلاہٹ مخفی تھی جو پڑھا لکھا اور جہاندیدہ شوہر اس وقت محسوس کرتا ہے جب اس کی کم پڑھی لکھی اور کم تجربہ کار بیوی اس کے معاملات میں ٹانگ اڑاتی ہے۔

"یہی تو مصیبت ہے۔" میں نے بے بسی سے کہا۔ "کہ میرے ذہن میں کوئی متبادل طریقہ یا تجویز نہیں ہے۔ میری عقل کچھ کام نہیں کرتی لیکن میں ایک موٹی سی بات جانتی ہوں۔ انسان کو اپنی زندگی کے نازک ترین معاملات صرف اپنی ہی ذات کی مدد سے انجام

دینے چاہئیں۔ بات جتنی محدود رہے گی' اتنی ہی اس میں سلامتی ہوتی ہے....."

"میں اب سلامتی اور عدم سلامتی کی فکر سے نکل چکا ہوں۔ ارباب نے چت لیٹ کر کمبل ٹانگوں پر کھینچتے ہوئے کہا۔ "اور جہاں تک تمہارے نقطہ نظر کا تعلق ہے تو میں بھی ایک موٹی سی بات جانتا ہوں کہ اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا....." وہ جماہی لینے لگا۔

"لیکن مجھے تو تمہاری سلامتی کی فکر ہے۔" میں نے ہولے سے کہا۔ "شاید کوکھ میں پلتی ہوئی ان معصوم روحوں کی وجہ سے۔ مجھے دائی نے بتایا ہے کہ میرے ہاں جڑواں بچے ہوں گے۔"

"میں نے تم سے شادی اس لیے کی تھی کہ تمہارے سینے میں بھڑکتا ہوا انتقام کا شعلہ مجھے بھی حرارت پہنچائے گا۔" ارباب نے چھت کو گھورتے ہوئے کہا۔ "لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ تمہارے جذبے اس قدر جلد سرد ہو جائیں گے اور تم بھی مجھے بزدل بنانے کی کوشش کرو گی' میرے پیروں میں بیڑیاں ڈالنی چاہو گی۔"

میں کئی لمحے خاموش رہی۔ وہ میری بات نہیں سمجھ رہا تھا اور مجھے سمجھانا نہیں آرہا تھا۔ "میں نے سنا ہے عورت بہت جذباتی ہوتی ہے۔" میں نے مجروح سے لہجے میں کہا۔ "شاید یہ درست ہو مگر مجھے اس مختصر سی عمر میں تجربہ ہوا ہے کہ اس جذباتیت پر پردہ ڈالے رکھنے میں بھی عورت کا کوئی ثانی نہیں۔ ارباب! میرے سینے میں آتش فشاں مچل رہا ہے مگر اس کی تپش کو تم بھی محسوس نہیں کر سکتے۔ میں نے اس پر صبر و ضبط کی یخ بستگی کے اتنے پردے ڈال رکھے ہیں ......میں.....میں اوچھا وار کرنا نہیں چاہتی۔ چاہے مجھے برسوں انتظار کرنا پڑے....."

"اور خواہ اس دوران دشمن قبر میں سو جائے اور اس کی ہڈیاں تک گل جائیں۔" ارباب نے طنزیہ لہجے میں کہا اور کمبل سینے تک کھینچ لیا۔

"بروں کو جلد موت نہیں آتی۔ عموماً اچھے انسانوں کو خدا جلد اپنے پاس بلا لیتا ہے۔ شاید اس میں بھی خدا کی مصلحت ہو کہ وہ ظالموں کی رسی دراز کرتا ہے حتیٰ کہ وہ خود کو لازوال سمجھنے لگتے ہیں۔ مجھے یقین ہے....." غیر ارادی طور پر میری آواز خودکلامی کی سی سرگوشی میں ڈھل گئی۔ "کہ نواب جلد نہیں مرے گا....کیسے کیسے قاتلانہ حملوں سے تو وہ جانبر ہو گیا ہے۔"

ارباب نے شاید میری سرگوشی نہیں سنی تھی۔ "میں تمہاری باتوں پر غور کرنے کی کوشش کروں گا۔" اس نے رسمی سے لہجے میں کہا اور میری طرف کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ کل اسے یہ بات یاد بھی نہیں رہے گی کیونکہ وہ یاد رکھنا ہی نہیں چاہتا تھا۔

زندگی کی وہ رات میری پہلی ناقابل بیان مسرت کی رات تھی جب میں نے درد کے لامتناہی سمندر سے گزر کر آنکھ کھولی تو اپنے آپ کو ممتا کے ساحل پر پایا۔ میں نے جڑواں بچوں کو جنم دیا تھا۔

ویسے تو مجھے اس وقت بھی اندازہ تھا کہ ہر ماں کو اپنا بچہ سب سے حسین لگتا ہے اور دائی بھی ہر نئی ماں کو "چاند سے بیٹے یا بیٹی" کی نوید سناتی ہے مگر میرے بچوں کو تو جس نے بھی دیکھا' رسمی تبصرے کرنا بھول گیا اور مبہوت ہو کر رہ گیا۔

پاس پڑوس کی اکا دکا عورتوں ہی کا ہمارے ہاں آنا جانا تھا۔ ان میں سے ایک بہت دیر کی خاموشی کے بعد صرف اتنا کہہ سکی۔ "اللہ نظر بد سے بچائے۔ بچوں کے وجود نے گویا پورے گھر میں چاندنی بکھیر دی ہے۔"

ارباب نے دیکھا تو یکبارگی اس کی زبان گنگ ہو کر رہ گئی۔ پھر اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو بھر آئے۔ "تمہیں معلوم ہے....." اس نے میرے قریب بیٹھ کر نوعمر لڑکوں کی طرح شرماتے' جھجکتے اور اٹکتے ہوئے کہا۔ "میں نے....پہلے یہ سوچ رکھا تھا.....کہ ہمارے جڑواں بچوں میں ایک لڑکا اور لڑکی ہوگی تو ان کے نام منصور اور مریم رکھیں گے.....میں نے ایک عربی کتاب میں یہ نام پڑھے تھے اور.....مجھے بہت اچھے لگے تھے۔ تمہیں پسند ہیں؟"

میں نے نہایت آہستگی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میرا ہاتھ ارباب کے ہاتھ میں تھا۔ دونوں بچے میرے پہلو میں تھے اور اس وقت مجھے دنیا کی ہر چیز انتہائی حسین لگ رہی تھی۔ وقتی طور پر میں ماضی کے تمام زخموں کی اذیت اور زندگی کی تمام ناگواریاں بھول گئی۔

ارباب کی خواہش کے مطابق لڑکے کا نام منصور اور لڑکی کا نام مریم رکھ دیا گیا۔ ہاں منصور! یہ دونوں بچے تم اور تمہاری بہن مریم تھے۔

ماں کی کوکھ میں جب بچے کی بنیاد پڑتی ہے تو گویا اس کی زندگی کے ایک عجیب سنسنی خیز دور کا آغاز ہو جاتا ہے۔ ہر مرحلہ پہلے سے زیادہ عجیب اور ناقابل تشریح ہوتا ہے۔ پہلے اپنے اندر اس نئی روح کو لمحہ بہ لمحہ پنپتے محسوس کرنا۔ اپنی دھڑکنوں کے ساتھ اس کی دھڑکنیں سننا۔ پھر پردہ غیب سے اسے ظہور میں آتے دیکھنا۔ اپنے پہلو میں اس ننھی سی جان کا لمس محسوس کرنا۔ اس کے رونے کی آواز یا اس کی قلقاریاں سننا اور پھر ایک نئے سرے سے اس کی پرورش میں منہمک ہو جانا۔ یہ سب ایسے محسوسات ہیں جن کی تفصیل میں اترنا عورت کے بس میں ہو تو نہ جانے کتنی ضخیم کتابیں تصنیف ہو جائیں۔ یہ سارا عمل اور اس کے تمام مرحلے شاید دنیا کے عجیب ترین تجربات ہیں۔

بچہ جب چند ماہ کا ہوتا ہے تو والدین کے لیے امید و بیم اور انتظار کا ایک نیا جنم شروع

ہو جاتا ہے۔ پہلے انہیں انتظار ہوتا ہے کہ بچہ نہ جانے کب گھٹنوں کے بل چلنا شروع کرے گا۔ پھر اسے اپنے پیروں پر چلتے دیکھنے کے لیے ایک ایک دن گن گن کر گزارتے ہیں۔ پھر وہ توتلی زبان میں باتیں شروع کرتا ہے تو اس کا ہر لفظ سن کر والدین یوں خوشی سے نہال ہو جاتے ہیں گویا اس نے کوئی نئی دنیا دریافت کر لی ہے۔

غرض یہ کہ محویت' مصروفیت' انتظار اور جاگتی آنکھوں خواب دیکھنے کا ایک دور شروع ہو جاتا ہے۔ جس میں دنیا و مافیہا کا کوئی ہوش نہیں رہتا۔ ہر بات گھوم پھر کسی نہ کسی طرح بچوں پر ہی آکر ختم ہوتی ہے۔ میں بھی اس عمل میں مگن تھی اور پھر میری توجہ جذب کرنے کے لیے ایک نہیں دو دو ننھی ہستیاں موجود تھیں۔ دیکھتے دیکھتے تم اور مریم ڈیڑھ سال کے ہو گئے۔

تم دونوں اب گڈے گڑیا کی طرح گھر کے مختصر سے صحن میں دوڑتے پھرتے تھے۔ تم دونوں کی شکلیں بھی بہت ملتی تھیں۔ بھورے' چمکیلے بال' سبزی مائل نیلگوں آنکھیں' گلابی رنگت' پتلی اونچی ناک اور ترشے ہوئے ہونٹ' فرق بس یہ تھا کہ مریم کے نقوش میں ایک مبہم سی نزاکت تھی جو کہ ہونی ہی چاہیے تھی۔ آخر کار وہ لڑکی تھی۔

تم دونوں کی عادتیں بھی بہت ملتی تھیں۔ جڑواں بہن بھائیوں میں عموماً پیار بچپن ہی میں ہوتا ہے لیکن تم دونوں تو اس معاملے میں کچھ زیادہ ہی غیر معمولی تھے۔ تم اکٹھے کھیلتے' ایک ہی وقت پر سوتے' ایک ہی وقت پر جاگتے' ایک جیسی چیزیں کھاتے اور ایک دوسرے سے شاذ و نادر ہی لڑتے۔ بعض اوقات تو تم دونوں گھنٹوں گھر کے کسی کونے کھدرے میں یوں خاموشی سے کھیلتے رہتے کہ تمہاری موجودگی کا گمان تک نہ ہوتا۔ ارباب نے سختی سے منع کر رکھا تھا کہ دوسرے بچوں کی طرح تم دونوں کو گلی میں کھیلنے کودنے کے لے نہ نکلنے دیا جائے لیکن تم دونوں نے خود ہی کبھی باہر جانے کی ضد نہیں کی۔ باہر سے کوئی بچہ اگر گھر میں آبھی جاتا تو تم دونوں شاذو نادر ہی اس کے قریب پھٹکتے۔

میں تم دونوں کی ذات میں مگن ضرور تھی لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میرے ماضی کے زخم بھر گئے تھے۔ اذیت کم ضرور ہو گئی تھی' ختم نہیں ہوئی تھی۔ زہر ایک بار سانسوں میں پھیل جائے' خون کا حصہ بن جائے تو پھر اسے الگ کرنا ممکن نہیں رہتا۔ ماضی کی ہر یاد کا زہر بھی میری نس نس میں شامل تھا' جسے میں فراموش کرنا چاہتی بھی تو نہیں کر سکتی تھی۔ کبھی کبھی راتوں کو جب میرے ایک طرف تم اور مریم اور ایک طرف ارباب بے سدھ سو جاتے تو میں گھنٹوں چت لیٹی اپنی بے خواب آنکھوں سے' دھندلی دھندلی روشنی میں چھت کو گھورتی رہتی جس پر مجھے ان گنت پرچھائیاں لرزتی دکھائی دیتیں۔ ان پرچھائیوں کا ہجوم اتنا بڑھتا کہ بالآخر میں چادر میں منہ چھپا لیتی لیکن نیند پھر بھی آنکھ سے کنارہ کش

رہتی۔

بچوں کے بارے میں ارباب کے محسوسات بھی مجھ سے زیادہ مختلف نہیں تھے لیکن اس کا دھیان نہ جانے کتنی سمتوں میں بٹا رہتا۔ اس نے اپنا پیشہ ورانہ اور زیر زمین دونوں ہی کام بہت پھیلا لیے تھے۔ وہ بہت مصروف رہتا تھا۔ اتنا مصروف جیسے کسی.....ملک کو فتح کرنے کی تیاری کر رہا ہو۔

ڈیوٹی وہ اب بھی دیتا تھا۔ اسے ترقی بھی مل گئی تھی اور نجی طور پر بھی معیاری کام ملنے لگا تھا۔ دفاتر میں چھٹی صرف اتوار کو ہوتی تھی لیکن ارباب دو دن چھٹی کرتا اور ان دو دنوں میں گھر سے تقریباً غائب ہی رہتا۔ کبھی کبھار محض دو چار گھنٹے سونے کے لیے آجاتا۔ نہ جانے اب اس کے وہائٹ اینجلس کی تعداد کیا تھی اور وہ کس منزل پر تھی؟ عرصے سے ان لوگوں نے گھر کے تہہ خانے میں اجلاس کرنا ترک کر دیا تھا۔ معلوم نہیں اب ان کا ٹھکانہ کہاں تھا۔ میں نے ارباب سے اس موضوع پر کچھ کہنا سننا چھوڑ دیا تھا۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ اس معاملے میں ہمارے درمیان ہم آہنگی پیدا ہونا تقریباً ناممکن ہی ہے لیکن میں بہرحال اس کی رفیق تھی۔ مستقبل کے پردے میں جو کچھ پنہاں تھا' اس کا سامنا کرنے کے لیے میں نے اسے تنہا نہیں چھوڑا تھا۔ اب جو بھی ہوتا' میں بہرحال اس کے ساتھ تھی۔

کاش مجھے معلوم ہوتا کہ یہ رفاقت مجھے کہاں لے جا رہی تھی..... لیکن غیب کا حال تو کسی کو معلوم نہیں ہوتا ناں.....!



تہہ خانے میں اب اجلاس تو نہیں ہوتے تھے لیکن وہاں لکڑی کی کئی سیاہ' مضبو ن وزنی پیٹیوں کا اضافہ ہو چکا تھا۔ یہ پیٹیاں مقفل تھیں۔ اس پر کسی قسم کا نشا' ضائع نہ ر نہ ہی ارباب نے مجھے ان کے متعلق کچھ بتایا تھا' مگر مجھے معلوم تھا کہ ان :

کبھی کبھی مجھے حیرت بھی ہوئی تھی کہ ارباب یہ سب کچھ کس طرح کر رہا ہے۔ بے اب ہم پر خوش حالی آ چکی تھی۔ ارباب کی آمدنی میں خاصا اضافہ ہو چکا تھا۔ اس نے لی لے لی تھی حالانکہ جس محلے میں ہم رہتے تھے اس میں کار رکھنا تو درکنار ان دنوں کے قریب سے دیکھنے کا اتفاق بھی بہت کم لوگوں کو ہی ہوتا ہو گا' مگر پھر بھی جو کچھ کر رہا تھا وہ اس کی آمدنی میں ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ اس کی آمدنی تو گھربار اور ذاتی رکھاؤ ہی میں ٹھکانے لگ جاتی تھی۔ باقی سرگرمیاں کس طرح جاری تھیں؟

اس کے ساتھیوں میں بھی' مجھے کوئی صاحب ثروت نظر نہیں آتا تھا۔ تنظیم کا تو شاید بنیادی چندہ بھی مقرر نہیں کیا گیا تھا کیونکہ جتنے ارکان کو میں نے دیکھا تھا وہ تو مجھے ئے نام چندہ ادا کرنے کے قابل بھی نظر نہیں آتے تھے۔ ان میں صرف نصیر بیگ ہی کچھ ہ حال معلوم ہوتا تھا۔ باقی سب تو شاید غربت و افلاس کے مارے' جھنجلائے ہوئے اور ارباب کے زخم خوردہ لوگ تھے۔

نصیر بیگ اب بھی گھر آتا جاتا تھا اور اس کے آنے کا کوئی خاص دن یا وقت مقرر تھا۔ وہ اور ارباب ایک ہی کمپنی میں ملازم تھے بلکہ دفتر میں عہدے کے لحاظ سے نصیر ارباب کا افسر تھا لیکن تنظیم میں میرے اندازے کے مطابق اس کی حیثیت ثانوی ۔ غالباً ارباب کے نائب کی حیثیت تھی اس کی۔ وہ جب بھی آتا ارباب ڈرائنگ روم اس کے ساتھ سرجوڑ کر بیٹھ جاتا یا پھر وہ تہہ خانے میں چلے جاتے۔

خوشحالی کے باوجود ارباب نے مکان نہیں بدلا تھا حالانکہ رہن سہن کے اعتبار سے یہ ہمارے شایان شان نہیں تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ تو تہہ خانہ تھا۔ بہت کم مکانوں اتنے عمدہ تہہ خانے ہوتے ہیں۔ دوسرے اس مکان کا محل وقوع کچھ ایسا تھا کہ خواہ کتنے ہی لوگوں کی آمدورفت رہتی اردگرد رہنے والوں کو بمشکل ہی اس کا احساس ہو سکتا

تھا۔ اس علاقہ میں گو کہ غریب متوسط طبقہ ہی آباد تھا' مگر اس طبقے کی روایت کے برعکس لوگوں کو ایک دوسرے کی ٹوہ میں رہنے کی عادت نہیں تھی۔ اس مکان سے متعلقہ یہ خصوصیات بلاشبہ ارباب کیلئے بہت اہم تھیں۔

ایک روز کام پر روانہ ہوتے وقت ارباب نے دروازے پر رکتے ہوئے اچانک کہا۔

"یوم حساب کی ابتدا تو ہونے لگی ہے۔"

"ہم تو اب اپنے دیرینہ دوست کے ٹھکانے کی طرف کوچ کرنے کا پروگرام بنا رہے تھے کہ ہمارے جاسوس نے وہاں سے اطلاع بھیج دی ہے کہ آج کل وہ خود بمبئی پہنچ رہا ہے۔" ارباب مسکرا کر بولا۔

"تمہارا مطلب ہے نواب ----" میری آواز بیٹھ سی گئی۔

"ظاہر ہے اس کے علاوہ میں اس طرح خصوصیت سے کس کا تذکرہ کر سکتا ہوں؟" وہ مسلسل بڑے مسرور انداز میں مسکرائے جا رہا تھا۔ "شاید پہلے تمہیں میں نے نہیں بتایا کہ تقریباً ہر بڑے شہر میں اس مردود کا عشرت کدہ موجود ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ شکار خود ہی پھندے کی طرف آ رہا ہے اور بڑے صحیح وقت پر آ رہا ہے۔ میں اپنی تیاریاں مکمل کر چکا ہوں۔ اب مجھے صرف اس کی آمد کا انتظار تھا۔"

"تم کیا کرنا چاہتے ہو ارباب؟" میں نے اپنی بے اعتدال دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"کیا تمہیں بھی مجھ سے یہ پوچھنے کی ضرورت ہے؟"

اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ "کم از کم تمہیں تو معلوم ہونا چاہئے کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں۔"

میں خاموش ہو گئی اور اسی خاموشی کے ساتھ اسے رخصت کر کے دروازے سے پلٹ آئی۔ میرا دل ڈوب سا گیا تھا۔ نواب شرافت علی کے چیتھڑے اڑتے دیکھنا شاید میری زندگی کی شدید ترین خواہش تھی۔ اس مناسبت سے مجھے ارباب کی بات سن کر خوشی ہونا چاہئے تھی جبکہ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ اب ارباب پہلے کی طرح کمزور اور تن تنہا نہیں تھا' مگر نہ جانے کیوں مجھے یہ سب کچھ ---- بے وقت سا لگ رہا تھا۔ بہرحال میں نے کوشش کی کہ سب کچھ ذہن سے جھٹک دوں۔ میں نے اپنے آپ کو گھر کے کام کاج میں الجھا لیا' لیکن ذہن کے کسی گوشے میں اندیشوں کی گھنٹیاں بجتی رہیں۔

شام کو ارباب کے گھر واپس آنے کا کوئی وقت مخصوص نہیں تھا' مگر اندھیرا گہرا ہونے سے پہلے وہ بہرحال آ جاتا تھا۔ اس روز اندھیرا گہرا ہونے پر اس کی جگہ نصیر بیگ آیا اور اس کا استخوانی سا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ باریک کمانی کی عینک کے عقب سے آنکھیں گویا ابلی پڑ رہی تھیں۔ ایک اور شخص بھی اس کے ہمراہ تھا۔ اس کا نام غالباً عبداللہ

تھا۔ جن دنوں "وہائٹ اینجلس" کے اجلاس تہہ خانے میں ہوتے تھے ان دنوں میں نے اس شخص کو بھی آتے دیکھا تھا۔ اندر آتے ہی نصیر بیگ نے کانپتی انگلیوں سے دروازے کی کنڈی چڑھا دی۔

"بھابی!" کمرے میں پہنچ کر اس نے سرگوشی کی۔ "جلدی سے بچوں کو سنبھالئے اور ہمارے ساتھ اس گھر سے چلئے یہاں چھاپہ پڑنے والا ہے۔"

"مگر کیوں؟" میرا دل دھک سے رہ گیا۔ "ارباب کہاں ہے؟"

"میں راستے میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا۔" وہ تیزی سے بولا۔ "وقت ضائع نہ کیجئے' آپ فوراً میرے ساتھ چلئے۔"

"کہاں؟" میں نے پوچھا۔

"ایک محفوظ جگہ پر۔ پولیس کو ابھی تک ارباب کے بارے میں یہ معلوم نہیں ہے کہ وہ شادی شدہ تھا لیکن اگر چھاپے کے وقت آپ یہاں موجود ہوئیں تو شاید عمر بھر آپ کو چھٹکارا نہ مل سکے۔" اس نے بے چینی سے انگلیاں مروڑتے ہوئے کہا۔

میں نے جلدی جلدی مریم کو کمبل میں لپیٹا اور تمہیں جوتے پہنائے۔ مریم سو رہی تھی اسے عبداللہ نے اٹھا کر کندھے سے لگا لیا۔ تم جاگ رہے تھے' تمہیں نصیر بیگ نے گود میں اٹھایا۔

"مجھے ضرورت کی چند چیزیں تو لینے دو نصیر!" میں نے عجلت میں ادھر ادھر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کو زیادہ سے زیادہ دو منٹ دے سکتا ہوں۔" نصیر نے رکتے ہوئے کہا۔ "آپ کوئی سامان وغیرہ اٹھانے کی کوشش نہ کیجئے۔ جہاں آپ جا رہی ہیں' وہاں آپ کی ضرورت کی ہر چیز مل جائے گی۔"

دو منٹ بعد ہم گھر سے نکلے۔ پہلے نصیر نے دروازے سے باہر سر نکال کر ادھر ادھر دیکھا' پھر قدم باہر رکھا۔ اس کے پیچھے میں تھی اور مجھ سے چند قدم پیچھے عبداللہ' گلیوں میں نیم تاریکی تھی۔ دائیں بائیں گلیوں میں مڑتے ہم تینوں لمبے لمبے ڈگ بھرنے لگے۔

اس وقت ہماری جو حالت تھی شاید ایسی ہی حالت ان بچے کھچے سپاہیوں کی ہوتی ہوگی جن کے لشکر پر زبردست شب خون مارا گیا ہو' مگر وہ اندھیرے کی لڑائی لڑنے کے بجائے کسی طرح جان بچا کر بھاگ آئے ہوں۔ اب عبداللہ آگے چل رہا تھا۔ وہ ایک تگڑا آدمی تھا اور مریم کو اس نے یوں آسانی سے صرف ایک بازو کی مدد سے سینے سے لگا کر رکھا تھا جیسے اس کا کوئی وزن ہی نہ ہو۔ نصیر البتہ تمہیں اٹھائے ہوئے ہانپنے لگا تھا۔ میں نے تمہیں اس کی گود سے لینا بھی چاہا لیکن اس نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ اس طرح میں تیز نہیں چل سکوں گی۔

خاصی دیر تک تاریک گلیوں میں چلتے رہنے کے بعد ہم قدرے کھلی سڑک پر نکلے
تھے کہ سامنے سے دو بڑی بڑی ہیڈ لائٹس اپنی طرف آتی دکھائی دیں۔

"پولیس جیپ!" نصیر نے سرگوشی کی اور مجھے ایک ہاتھ سے الٹے قدموں دھکیلتے ہوئے واپس گلی میں گھس گیا۔ اسی ہاتھ کے دباؤ سے اس نے مجھے دیوار کے ساتھ لگا اور خود بھی دیوار سے چپک گیا۔ عین اس لمحے تم نے ٹھنکنا شروع کر دیا لیکن فوراً تمہاری آواز گھٹ کر رہ گئی۔ شاید نصیر نے سختی سے تمہارے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ عین اسی لمحے مجھے احساس ہوا کہ عبداللہ گلی میں نہیں پلٹ سکا تھا' کیونکہ وہ ہم سے کئی قدم آگے تھا' اور غالباً روشنی کی زد میں بھی آگیا تھا۔

جیپ کی گھرگھراہٹ بالکل قریب آ چکی تھی۔' پھر اس گھرگھراہٹ کے ساتھ ہی میں نے ایک گونجیلی آواز سنی۔ "رک جاؤ۔"

ہمارے سامنے سڑک پر ہیڈ لائٹس کی روشنی ساکت ہو چکی تھی اور اس کے انعکاس کی وجہ سے روشنی نظر آنے لگی تھی اور اس روشنی میں' میں نے عبداللہ کی پرچھائیں دیکھی۔ وہ احمق انسان مریم کو کندھے سے لگائے اندھا دھند بھاگا جا رہا تھا۔

"رک جاؤ' ورنہ گولی مار دی جائے گی---" وہ گونجیلی آواز دوبارہ ابھری' مگر عبداللہ رکا نہیں' پھر میں نے جیپ کو سڑک سے اتر کر عین اس گلی کے دہانے پر پہنچتے دیکھا۔ گلی تنگ تھی اس لئے جیپ وہیں رک گئی۔ البتہ اس میں سے پانچ چھ سپاہی بندوقیں سنبھالے کودے اور سب کے سب اندھا دھند گلی میں گھس گئے۔ جیپ میں صرف ڈرائیور رہ گیا تھا۔ ایک سپاہی نے گلی میں فائر کیا لیکن اس وقت تک عبداللہ کہیں غائب ہو چکا تھا۔

نصیر نے میرا ہاتھ پکڑا اور پیچھے اسی طرح کھسکنے لگا جس طرح سے ہم آئے تھے' لیکن میرے پاؤں تو اپنی جگہ گڑ کر رہ گئے تھے۔ "نصیر---! میری بچی---" میں نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔ میں پوری قوت سے چیخنا چاہتی تھی' مگر نہ جانے کس طرح خود پر ضبط کئے ہوئے تھی۔

"یہ جذبات میں الجھنے کا وقت نہیں ہے بھابی!" اس نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں سرگوشی کی۔ "عبداللہ کو معلوم ہے کہ ہمیں کہاں جانا ہے۔ اگر وہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تو وہ وہیں پہنچ جائے گا۔ آیئے۔"

میں اس کے ساتھ گھسٹنے لگی۔ کئی بار میں نے مڑ کر دیکھا لیکن اب گلی میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا' جدھر عبداللہ گیا تھا۔ کئی گلیوں میں چکرانے کے بعد ہم دوبارہ غالباً اس سڑک پر آ گئے تھے' لیکن اس جگہ سے ہم یقیناً بہت دور نکل آئے تھے جہاں پولیس جیپ سے ہمارا سامنا ہوا تھا۔

کچھ دیر تک ہم مکانوں کی قطاروں کے ساتھ ساتھ چلتے رہے' پھر سڑک کے کنارے

دور دور تک درختوں اور جھاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک جگہ درختوں کے نیچے مجھے ایک بگھی کھڑی نظر آئی۔ کوچوان اپنی نشست پر بڑے اطمینان سے ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھا تھا بیڑی کے کش لے رہا تھا۔ نصیر بگھی کے قریب پہنچا تو اس نے بیڑی ایک طرف پھینک دی۔

بہت دیر لگا دی۔" اس نے سرسری لہجے میں کہا اور باگیں سنبھال لیں۔

"فاصلہ بہت تھا' اور پھر راستے میں تھوڑی سی گڑبڑ ہو گئی۔ مزید چکر کاٹنا پڑا۔" نصیر بیگ نے جواب دیا اور بگھی کا پردہ ہٹا کر مجھے اندر بیٹھنے کا اشارہ کیا' پھر خود بھی میرے برابر بیٹھ کر پردہ گرا دیا۔ بگھی کا یہ حصہ چاروں طرف سے بند تھا۔ صرف دائیں طرف ایک چھوٹی سی جالی دار کھڑکی بنی ہوئی تھی' اور اس کھڑکی میں بن چمنی والا ایک چھوٹا سا کیروسین لیمپ فٹ تھا۔ نصیر نے تمہیں میری گود میں لٹا دیا۔ تم پر اب غنودگی سی طاری ہونے لگی تھی۔

بگھی نے چند ہچکولے سے لئے پھر ہموار سڑک پر آ کر دوڑنے لگی۔ گھوڑے کے ٹاپوں کی تیز آواز سڑک کی ویرانی کا پتہ دے رہی تھی۔ نصیر نے لمبی نشست کے ایک سرے پر کھسک کے گدیلے پشتے سے ٹیک لگائی اور واسکٹ کی جیب سے تھری کیسل کا پیکٹ نکال کر ایک سگریٹ سلگائی اور گہرے گہرے کش لینے لگا۔ اب وہ خاصا پرسکون نظر آ رہا تھا۔ کئی منٹ گزر گئے۔

بالآخر میں نے کہا۔ "تم نے کہا تھا کہ راستے میں سب کچھ بتا دوں گا۔ سب کچھ سے پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ ارباب کہاں ہے؟"

"وہ مر چکا ہے۔" اس نے دھیمے اور سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"نہیں۔" میں سمجھی تھی کہ میرے حلق سے یہ لفظ ایک فلک شگاف چیخ کے ساتھ برآمد ہوا ہے لیکن پھر مجھے احساس ہوا کہ میرے ہونٹ وا ضرور ہوئے تھے لیکن میرے حلق سے کوئی آواز نہیں نکلی تھی۔ یہ لفظ۔ "نہیں" میں نے صرف سوچا تھا اسے آواز نہیں مل سکی تھی۔

شاید مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا تھا' کیونکہ دوبارہ جب میں احساسات کی دنیا میں واپس آئی تو نصیر گھبرائے ہوئے انداز میں میرا کندھا ہلا رہا تھا۔ میں نے آہستگی سے اس کا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹایا۔ تمہیں گود میں سمیٹ کر تم پر یوں چادر تان لی گویا میں تمہارے ننھے سے وجود کے گرد ایک حصار تعمیر کر رہی ہوں تاکہ برے لفظوں کی آہٹ' برے وقت کا سایہ اور بری خبروں کا زہر تم تک نہ پہنچ سکے۔ میرا دل یکلخت یوں سن ہو گیا تھا' گویا شریانوں میں لہو کی بجائے پگھلتی برف کا آبشار اس میں گرنے لگا ہو۔

بگھی اسی رفتار سے بھاگی جا رہی تھی۔ اب آس پاس سے کبھی کبھار کسی گاڑی وغیرہ

کے گزرنے کی آواز سنائی دینے لگی تھی۔ شاید اب بگھی کا رخ کسی آباد علاقے کی طرف تھا۔

"یہ کیسے ہوا؟" بالآخر میں نے اپنے لہو لہو آنسوؤں کو پلکوں ہی پر روک کر پوچھا۔
نصیر نے گہری سانس لی۔ گویا مجھے بولتے دیکھ کر اسے اطمینان ہوا ہو۔ وہ ایک بار پھر پردے کو ہٹا کر بیٹھ گیا اور نئی سگریٹ سلگانے لگا۔

"وہ کریم کے علاقے میں ایک پراجیکٹ کی سائٹ کا معائنہ کر کے واپس آ رہا تھا۔" نصیر نے ایک طویل کش لے کر کیروسین لیمپ کو گھورتے ہوئے کہا۔ "گندے نالے کی پلیا پر ایک ہیبت ناک ٹرک نے بڑے عجیب طریقے سے اس کی کار کو ٹکر مار دی۔ کار بچک کر لڑھکتی ہوئی نشیب میں چھوٹی سڑک پر جا گری اور فوراً ہی اس نے آگ پکڑ لی۔ پروگرام کے مطابق میں کچھ دیر بعد سائٹ سے واپس روانہ ہوا تو میں نے راستے میں ہجوم دیکھا۔ عینی شاہدوں نے مجھے حادثے کی تفصیل بتائی۔ ٹرک حادثے کے فوراً بعد ہی غائب ہو گیا۔ میں جس وقت وہاں پہنچا لوگوں نے آگ بجھا لی تھی' لیکن کار کیا' محض سیاہ لوہے کے ٹکڑوں کا ایک ڈھیر رہ گیا تھا۔ صرف ایک نمبر پلیٹ جو ٹوٹ کر دور جا گری تھی اس سے میں نے کار کو پہچانا۔ اب تم اندازہ کر سکتی ہو کہ لاش کی کیا حالت ہو چکی ہو گی۔ بس یوں سمجھ لو کہ راکھ کا ایک نامکمل پتلا تھا۔"

اس نے خاموش ہو کر مضطربانہ انداز میں سگریٹ کے دو تین کش لئے۔ "نہ جانے کیوں میرا ماتھا ٹھنکا۔ آج شام ہماری ایک مہم طے تھی۔ تنظیم کے کئی ارکان کے پاس ہتھیار تھے۔ میرے نیفے میں بھی خنجر اور پستول موجود تھا۔ میں نے موقع پا کر وہ دونوں چیزیں وہیں گندے نالے میں پھینک دیں اور دفتر واپس جانے کے بجائے ایک اور جگہ چلا گیا۔ وہاں سے میں نے دفتر اپنے ایک خاص آدمی کو فون کیا۔ میرے اندیشوں کی تصدیق ہو گئی۔ تنظیم کے جو رکن کمپنی میں ملازم تھے انہیں تو وہیں گرفتار کر لیا گیا اور باقی کو دوسری جگہوں سے۔ انہیں انگریز سرکار سے غداری اور زیر زمین سرگرمیوں کے جرم میں پکڑا گیا تھا اور جتنی کامیابی سے یہ کارروائی ہوئی تھی اس سے صاف ظاہر تھا کہ تنظیم ہی میں سے کسی نے غداری کی ہے' لیکن مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ غدار نے اگر صرف پولیس کو مطلع کیا تھا تو وہ ارباب کو بھی زندہ ہی گرفتار کرتی۔ اسے اتنے پراسرار انداز میں کیوں مارا گیا۔۔۔؟"

"غدار نے شاید ایک شخص کو مطلع کیا ہو گا' اور باقی ساری کارروائی کیلئے اس شخص نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے ڈوریاں ہلائی ہوں گی۔" میں نے مدھم آواز میں گویا اپنے آپ کو بتایا۔

"آپ کا مطلب ہے نواب۔۔۔؟" اس نے سنبھل کر میری طرف دیکھا۔ میں نے

ہلکی سے اثبات میں سر ہلایا تو ڈبڈبائی آنکھیں چھلک پڑیں۔ پہلا آنسو گویا بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوا۔ ایک بار آنکھیں چھلکیں تو گویا سیلاب ہی امڈ آیا' لیکن میں نے نہایت خاموشی سے چادر کا پلو آنکھوں پر مل کر اس سیلاب کا ریلا جذب کر لیا اور ایک بار پھر کسی نہ کسی طرح اس کی روانی پر بند باندھ دیا۔

آنسوؤں سے نظر ہی نہیں' عقل و حواس بھی دھندلا جاتے ہیں' اور میں نے زندگی کے اب تک کے مصائب سے ایک ہی تجربہ حاصل کیا تھا' کہ سانحوں پر صرف ماتم کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا' چند لمحوں کے لیے سنبھل کر اگر یہ بھی دیکھ لیا جائے' کہ سانحہ اپنے پیچھے کیا کچھ لا رہا ہے تو مزید بہت سی تباہ کاریوں سے بچنے میں مدد مل سکتی ہے۔

"مگر میرے علاوہ کسی کو معلوم ہی نہیں تھا' کہ آج کی مہم کا پس منظر کیا ہے۔" نصیر نے سوچ میں ڈوبتے ہوئے کہا۔ "باقی سب نے تو آنکھیں بند کر کے احکامات کی تعمیل کرنا تھی۔"

03036360959 سیلس فون

"عبداللہ کے بارے میں کیا خیال ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اسے تو میں خود بروقت گھر سے نکال کر لایا ہوں۔ چند منٹ بعد ہی اس کے ہاں بھی چھاپہ پڑا ہے۔" نصیر بیگ نے جواب دیا۔ "اور اس کے علاوہ تیس کے تیس آدمیوں میں سے شاید ہی کوئی بچا ہو۔"

عبداللہ کا خیال آتے ہی میرا منجمد سا دل گویا ریزہ ریزہ ہونے لگا۔ پولیس اس کے تعاقب میں تھی۔ ان کی بندوقوں کی گولیاں لہو چاٹنے کیلئے بے قرار تھیں۔۔۔ اور۔۔۔ عبداللہ کی گود میں میری بچی تھی۔ خدایا! اسے محفوظ رکھنا۔ میں تجھ سے کبھی کچھ اور نہیں مانگوں گی۔۔۔ زندگی نے اب تک مجھ سے جو جو ظلم روا رکھے اس کا شکوہ بھی نہیں کروں گی۔ بس اس کی جان بخشی کر دینا۔

یہ دعا میں نے بے اختیار دل ہی دل میں مانگ لی تھی' مگر اس کی قبولیت کی امید کم ہی تھی' کچھ لوگ شاید پیدائشی تیرہ بخت ہوتے ہیں اور مجھے اب اپنی تیرہ بختی کا یقین ہو چلا تھا۔ میرے لئے اگر کوئی خوشی آئی بھی تھی تو اس کے عقب میں آلام و آفات کا ایک ہجوم ہوتا تھا۔ میرے لئے تو شاید مناسب ہی تھا کہ کبھی بھول کر بھی۔۔۔ کاتب تقدیر سے کسی مسرت کی بھیک نہ مانگوں۔

بگھی شاید کسی بارونق علاقے سے گزر رہی تھی۔ ٹریفک کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور کیروسین لیمپ کے عقب میں چھوٹی سی جالی دار کھڑکی سے روشنیاں پیچھے جاتی دکھائی دے رہی تھیں۔ بگھی کی رفتار کم ہو گئی تھی' لیکن کچھ ہی دیر بعد رفتار پھر بڑھ گئی اور گردوپیش کے سناٹے کا احساس ایک بار پھر ہونے لگا۔ اب پھر سڑک پر صرف گھوڑے کی ٹاپیں ہی گونج رہی تھیں۔

بالآخر بگھی رک گئی۔ قریب ہی ایسی کھرکھراہٹ سنائی دی جیسے لوہے کا کوئی بھاری بھرکم گیٹ کھولا گیا ہو' پھر ایک شخص نے پردہ اٹھا کر بگھی کے اندر جھانکا۔ سپاٹ سی نظروں سے اس نے ہمارا جائزہ لیا اور پردہ گرا دیا۔ بگھی آگے بڑھ گئی اور مزید تھوڑا فاصلہ طے کر کے رک گئی۔

نصیر بیگ بگھی سے اتر کر پردہ سمیٹ کر کھڑا ہو گیا۔ "اتر آیئے۔"

اس نے مجھے سہارا دینے کیلئے ایک ہاتھ بڑھایا۔ تم سو چکے تھے۔ میں تمہیں کندھے سے لگائے بگھی سے اتری اور ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ ہم سرخ پتھر کی بنی ہوئی ایک کوٹھی کے وسیع و عریض احاطے میں کھڑے تھے۔ برآمدے کی سیڑھیاں سامنے ہی تھیں اور برآمدے کی چھت میں فانوس اور چھت سے اوپر کوٹھی کی محرابی پیشانی پر بڑے سے نیلے شیڈ میں ایک طاقتور بلب روشن تھا۔ باقی عمارت باہر سے تاریکی کی قبا اوڑھے کسی دیوپیکر پرچھائیں کی طرح کھڑی نظر آ رہی تھی۔

نصیر بیگ میرا ہاتھ تھامے برآمدے کی طرف بڑھا۔ سیڑھیاں عبور کر کے اس نے دروازے پر دستک دی۔ ایک طویل القامت نوجوان نے دروازہ کھولا اور نصیر کو دیکھ کر خاموشی سے ایک طرف ہٹ گیا۔ ہم ایک آراستہ و پیراستہ نشست گاہ میں داخل ہوئے۔ اس طویل و عریض کمرے کی آرائش اور شان و شوکت دیکھ کر مجھے حیرت ہونے لگی کہ اگر یہ وہائٹ اینجلس کی پناہ گاہ تھی تو پھر وہ واقعی بہت منظم ہو چکے تھے۔

نشست گاہ میں کوئی بھی نہیں تھا۔ نصیر میرا ہاتھ تھامے ایک اور دروازے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ اس دروازے سے ہم ایک طویل راہداری میں نکلے۔ جس میں دونوں طرف کمروں کے دروازے نظر آ رہے تھے۔ مدھم سی روشنی میں یہاں کا فرش سطح آب کی طرح چمک رہا تھا۔ راہداری کے اختتام پر ایک بڑا دروازہ تھا جس کے قریب سٹول پر ایک شخص دیوار سے ٹیک لگائے گردوپیش سے لاتعلق سا بیٹھا تھا۔ اس کی گود میں ایک رائفل رکھی تھی۔ ہمیں دیکھ کر بھی اس نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی' صرف ہونٹ غیر محسوس طور پر ہلائے۔ "تمہارا انتظار ہو رہا ہے۔"

نصیر نے کوئی جواب نہ دیا اور ایک ہاتھ سے دروازہ کھولتے ہی دوسرے ہاتھ سے مجھے نہایت نرمی سے آگے کو دھکیلا۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی اچانک میرے ذہن کے کسی گوشے میں خطرے کی گھنٹی سی بجی' لیکن مجھے تاخیر ہو چکی تھی۔ نصیر میرے عقب میں دروازہ بند کر چکا تھا' اور خود دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا تھا۔

ہال نما اس وسیع کمرے کے وسط میں تین افراد موجود تھے۔ ایک لمبا تڑنگا سیاہ فام جاٹ جو آبنوسی مجسمے کی طرح ایک طرح ایستادہ تھا۔ اس کے سامنے ایک نہایت شاندار مخملیں آرام کرسی بچھی ہوئی تھی جس پر نواب شرافت علی خاں نیم دراز تھا۔ اس کے

قدموں میں ایک گوری ریشمی بال اس کی کمر اور شانوں پر سے ہوتے ہوئے قالین تک پہنچے ہوئے تھے۔ عورت حسین نہیں تھی مگر اس کا جسم نہایت حسین تھا۔ وہ نواب کی بدہیبت پاؤں اپنی گود میں لئے بیٹھی تھی اور ایک خوبصورت قینچی سے نہایت انہماک اور احتیاط کے ساتھ اس کے ناخن کاٹ رہی تھی۔

نواب نے دھاری اور چمکیلے سے کپڑے کا گاؤن پہن رکھا تھا جس کے ساتھ اس کی سیاہ رنگت کا تضاد کچھ زیادہ نمایاں محسوس ہو رہا تھا۔ اسے آخری بار دیکھے ہوئے مجھے کوئی بہت طویل مدت نہیں گزری تھی' مگر اس میں بہت سی تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ بالوں کی سفیدی بڑھ گئی تھی' جبڑوں کا گوشت لٹک گیا تھا' چہرے پر شکنیں نمودار ہو چلی تھیں۔ میں نے ایک ہی نظر میں اس کا سراپا جائزہ لیا اور نصیر بیگ کی طرف مڑی۔

"تو غدار تم ہی تھے نصیر بیگ!" مجھے اپنی آواز زخمی سانپ کی پھنکار سے مشابہ معلوم ہوئی۔ اگر محض لفظوں سے کسی کو قتل کرنا ممکن ہوتا تو شاید میرے ہر لفظ سے نصیر بیگ کئی کئی مرتبہ قتل ہو چکا ہوتا۔

نصیر بیگ کے چہرے کے تاثرات گویا یکلخت ہی بدل گئے تھے وہ اب ایک شرمیلے اور منحنی سے نوجوان کے بجائے ایک شاطر شخص نظر آ رہا تھا۔ اس نے گویا اچانک ہی کینچلی بدلی تھی۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکا اور انتہائی مکارانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "جی ہاں محترمہ پہلے میں نے خریدار سے رابطہ کر کے اپنی قیمت پوچھی تھی۔ غداری کا معاوضہ چونکہ نہایت شاندار مل رہا تھا اس لئے میں نے آمادگی ظاہر کرنا ہی مناسب سمجھا۔ ایسے موقعے زندگی میں بار بار تو نہیں آتے ناں؟" اس کی شکل مجھے نواب سے بھی زیادہ مکروہ لگنے لگی تھی۔ میں نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ نواب آرام کرسی پر سنبھل کر بیٹھ چکا تھا۔ پاؤں اس نے عورت کی گود سے کھینچ لئے تھے اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے بڑی دلچسپی سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"اندھے کو اندھا سو کوس سے ڈھونڈ لیتا ہے۔" نواب نے گاؤن ہٹا کر اپنا گھٹنا کھجاتے ہوئے کہا۔ "ارے بدبخت! تجھے وہ مردود ارباب ہی ملا تھا بیاہ رچانے کو۔۔۔؟"

"خبردار کالے شیطان! اگر تو نے میرے شوہر کے متعلق ایک بھی ایک لفظ منہ سے نکالا تو۔۔۔" میں اس بری طرح چیخی کہ میری آواز پھٹ گئی۔

"تو تم کیا کرو گی جان من؟" نواب نے بدستور مسکراتے ہوئے خلاف توقع بڑے کھلے مگر دھیمے لہجے میں پوچھا۔ میرے سینے میں بے بسی کا غبار سا اٹھا' مگر میں نے آنکھوں سے آنسو نہ چھلکنے دیئے۔ مجھے معلوم تھا کہ شکار جتنا تڑپے' جتنا چلائے' صیاد اتنا ہی لطف اندوز ہوتا ہے۔

"جس طرح تم نے ہمیں مخاطب کیا ہے شاید اس پر ہم تمہاری زبان گدی سے

کھنچوا لیتے۔" نواب نے خلاف توقع اپنا ملائم لہجہ برقرار رکھا۔ "لیکن اب ہماری عادتیں بدل گئی ہیں۔ ہم بڑے ٹھنڈے دل سے سوچنے اور عمل کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ شاید یہ بڑھتی ہوئی عمر کا تقاضا ہے' یا پھر دو مرتبہ موت کو نہایت قریب سے دیکھ لینے کا نتیجہ ہے۔ اب یہی دیکھ لو کہ ارباب اور تمہارا سراغ ملنے کے بعد ہم چاہتے تو خود اپنے ہی آدمیوں سے تم دونوں کو اٹھوا لیتے یا جس طرح بے وقوفوں کی اس تنظیم کی لسٹ پولیس کمشنر کو فراہم کی جا چکی تھی ان کے ساتھ ساتھ ہم تم دونوں میاں بیوی کو گرفتار ہونے دیتے' لیکن اس طرح معاملہ بہت لمبا ہو جاتا۔ مقدمہ چلتا اور ہمارے دشمنوں کو نہ جانے کیا سزا ملتی۔ اس لئے ہم نے نہایت عمدگی سے وہ طریقہ اختیار کیا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ اب ہم خود کوئی خطرہ مول نہیں لیتے اور اپنی کارروائیوں کا کوئی ثبوت نہیں چھوڑتے' کیونکہ آج کل انگریز سرکار کو انصاف پسند کہلانے کا بہت شوق پیدا ہو گیا ہے اور وہ رسمی طور پر ہی سہی لیکن بہرحال شہادتوں اور مقدمے کی کارروائیاں پوری کرنے کے عادی ہو گئی ہے۔ اب ہم لاکھ ٹھنڈے دماغ کے سہی لیکن اپنے دشمنوں کو انجام کو پہنچتے دیکھنے کیلئے اتنا طویل انتظار بھی نہیں کر سکتے تھے خصوصاً جب ہمیں ان کا سراغ بھی مل چکا تھا۔۔۔"

"ویسے جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے۔۔۔" نواب کے ماتھے پر شکنیں گہری ہو گئیں۔ "ہم نے تمہیں قید خانے میں ڈلوایا تھا وہاں سے فرار ہونے میں تم کیسے کامیاب ہوئیں اور ارباب سے کیسے جا ٹکرائیں؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بدستور اسے اپنی جگہ کھڑی گھورتی رہی۔ میرا کچھ بولنے کو جی ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ مایوسی و شکستگی کی آخری منزل ہو یا غم و غصے کی انتہا۔ عموماً دونوں صورتوں میں انسان کی قوت گویائی سلب ہو کر رہ جاتی ہے لیکن میں نہیں کہہ سکتی تھی کہ میں مایوسی و شکستگی کی آخری منزل پر تھی یا غم و غصے کی انتہا پر۔ شاید اس مختصر سے وقت میں پے در پے اتنے صدموں سے میرے حواس کو جو دھچکے پہنچے تھے انہوں نے مجھے سوچنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔

نواب نے چند لمحے تک میری طرف منتظر نگاہوں سے دیکھا' لیکن جب میں نے کوئی جواب نہ دیا تو کندھے اچکا کر بولا۔ "چلو۔۔۔ نہیں بتانا چاہتیں تو نہ سہی۔ ہمیں بھی گزری باتوں سے اب کوئی خاص دلچسپی نہیں رہی۔"

باتوں کی آواز تمہاری نیند میں مخل ہو رہی تھی اور تم نے میرے بازو پر کسمسانا شروع کر دیا تھا۔ تمہیں اٹھائے اٹھائے ویسے بھی میرا بازو شل ہونے لگا تھا۔ دفعتاً" تم نے آنکھیں کھول دیں اور معصوم سی حیرانی کے ساتھ چاروں طرف دیکھا۔ اجنبی ماحول اور اجنبی صورتیں دیکھ کر تم رونے لگے۔ میں نے تمہیں قالین پر کھڑا کر دیا اور گھٹنوں کے بل

تمہارے قریب بیٹھ کر تمہیں چپ کرانے کی کوشش کرنے لگی۔ اس لمحے ایک بار پھر میری نظر نصیر بیگ پر پڑی۔

"عبداللہ بھی تمہارے ساتھ ہی بک گیا تھا کیا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں اس بے چارے کو کچھ بھی نہیں معلوم۔" نصیر بیگ نے مسکرا کر جواب دیا گویا میں نے اس کا مزاج پوچھا۔

"اس کا مطلب ہے کہ اگر وہ بچ بھی گیا تو میری بچی کو لے کر یہاں نہیں پہنچ سکے گا۔" میرے مجروح دل میں ایک اور ٹیس اٹھی۔

"نہیں! اسے اس جگہ کا قطعاً" علم نہیں۔ اسے تو میں نے محض تھوڑی بہت مدد کیلئے ساتھ لے لیا تھا۔ راستے ہی میں اسے میں نے ٹرخا دیا تھا۔" نصیر بیگ نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔

اس کے چہرے پر شرمندگی' خجالت یا تاسف کی ہلکی سی رمق تک نہیں تھی۔ ارباب سے ایک مدت کی دوستی اور اعتمادیوں بے رحمی سے ہوس کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھاتے ہوئے اسے شاید ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوئی تھی۔ ارباب غالباً اس دنیا میں نہیں تھا اور مرے ہوؤں کے بارے میں اچھا ہی سوچنا چاہئے۔ خصوصاً جبکہ وہ آپ کی زندگی کا حاصل رہے ہوں۔ لیکن مجھے ارباب پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ اس شخص نصیر بیگ سے اس کا دن رات کا ساتھ تھا۔ کیا اسے کبھی شبہ تک نہیں ہوا تھا کہ اس شخص میں ضمیر نام کی کوئی چیز موجود نہیں ہے؟ اگر ارباب اتنا ہی مردم ناشناس تھا تو پھر اس کا انجام یہی ہو سکتا تھا۔

"تم نے مجھے یہاں کیوں بلوایا تھا؟" میں نے نواب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ تم نے اب باقاعدہ رونا شروع کر دیا تھا اور میری تمام تر کوشش کے باوجود تم چپ نہیں ہو رہے تھے۔

"بتا دیں گے۔۔۔ بتا دیں گے۔ پہلے اس رونی صورت کو تو چپ کراؤ۔" نواب نے تمہاری طرف اشارہ کیا۔

دفعتاً" لمبا تڑنگا سیاہ فام جاٹ آگے آیا اور تمہاری طرف دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولا۔ "لاؤ اسے میں باہر پہنچا دوں۔"

تم اس کی ڈراؤنی صورت دیکھ کر اور بھی زور زور سے رونے لگے۔ ساتھ ہی تم نے اپنے ننھے سے ہاتھ سے اس کے بڑے بڑے ہاتھ پرے ہٹانے کی کوشش کی اور مجھ سے چمٹ گئے۔ جاٹ نے اپنے بھاری جوتے سے تمہاری ننھی ننھی ٹانگوں پر ہلکی سی ضرب لگائی۔ ضرب تو ہلکی تھی' مگر تم ایک ننھے سے بچے کیلئے تو ناقابل برداشت ہی تھی۔ تم بلبلا اٹھے اور بری طرح مجھ سے چمٹ گئے۔

اب تک مجھ پر جو جسمانی اور روحانی اذیتیں گزر چکی تھیں۔ ان کا حال میں لکھ ہی

چکی ہوں لیکن جتنی تکلیف مجھے تمہاری اس پنڈلی سے ضرب کے پڑنے اور تمہارے بلبلا کر رونے سے پہنچی تھی اتنی اب تک کسی بھی ظلم اور تشدد سے نہیں پہنچی تھی۔

میرے سینے میں مچلتا آتش فشاں گویا پھٹ پڑا۔ میں نے تمہیں ایک طرف ہٹا دیا اور اس سیاہ فام درندے پر جھپٹ پڑی نہ جانے مجھ میں اتنی ہمت کہاں سے آگئی تھی کہ دونوں ہاتھ جوڑ کر جب میں نے اس کے چہرے پر ضرب لگائی تو وہ ڈکرا کر پیچھے کو لڑکھڑایا۔ ساتھ ہی میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر چبا ڈالا۔ اس کے حلق سے غراہٹ نما چیخ سی نکلی۔ دوسرے ہی لمحے اس نے سنبھل کر میرے پیٹ میں گھونسا رسید کیا۔ مجھے یہی محسوس ہوا جیسے لوہے کا بڑا سا ہتھوڑا میرے پیٹ پر پڑا ہو۔ آنتیں یک لخت گویا ایک ہی نقطے پر سمٹ کر رہ گئیں اور میں چکرا کر قالین پر ڈھیر ہو گئی۔ میری آنکھوں کے سامنے پھیلتا اندھیرا تو دوسرے ہی لمحے غائب ہو گیا تھا' لیکن کوشش کے باوجود میں اٹھ کر نہیں بیٹھ سکی۔

"ابے او ناہنجار!" میں نے نواب کی آواز سن کر اس کی طرف دیکھا۔ بظاہر اس نے بڑی سنجیدگی سے ڈانٹنے کے سے انداز میں جاٹ کو مخاطب کیا لیکن اس کے ہونٹوں کے گوشوں سے مسکراہٹ پھوٹی پڑ رہی تھی۔ "ابے ان کو مت مار تجھے معلوم نہیں یہ ننھے میاں ایک بہت بڑی تنظیم وہائٹ اینجلس کے سربراہ کے صاحب زادے ہیں--- اور یہ ان مرحوم سربراہ کی بیوہ ہیں--- کچھ تو ان کا احترام کر---"

اس کے لہجے میں چھپے ہوئے طنز کی کاٹ پر میں تڑپنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ تم روتے ہوئے میرے قریب آ بیٹھے تھے۔ بمشکل تمام میں ایک کہنی کے بل اٹھی اور تمہیں سینے سے چمٹانے کی کوشش کرنے لگی۔

دفعتاً میں نے اس عورت کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا جو اب تک نہایت لاتعلقی سے ایک طرف کو بیٹھی تھی۔ قریب آکر اس نے تمہیں گود میں اٹھایا اور والہانہ انداز میں چومنے اور چمکارنے لگی' پھر اس نے جھک کر میری طرف دیکھا اس کا چہرہ اب بھی تقریباً سپاٹ ہی تھا' لیکن اس کی آنکھوں میں جذبوں کی نرماہٹ اور آنسوؤں کا غبار سا اتر آیا تھا۔

"میں اسے ایک دوسرے کمرے میں لے جا رہی ہوں۔" اس نے نہایت ہی نرم اور مدھم آواز میں کہا جسے شاید میں ہی سن سکی تھی۔ "مطمئن رہنا۔ اسے کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔" اس کے لہجے میں صداقت کی خوشبو تھی۔ میرے دل کو قدرے اطمینان سا محسوس ہوا۔ وہ تمہیں بہلاتی' پچکارتی کمرے سے لے گئی اور چند لمحوں بعد بالآخر تمہارے رونے کی آواز معدوم ہو گئی۔

"ابے او کن کٹے!" نواب نے دوبارہ سیاہ فام جاٹ کو مخاطب کیا اور تب میں نے دھیان سے دیکھا اس دیو زاد کا دایاں کان واقعی آدھے سے زیادہ کٹا ہوا تھا۔ وہ نواب کی

طرف دیکھ کر مسکرایا تو نواب نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ابے! مرحوم و مغفور سربراہ کی بیوی کو کرسی پیش کر--- یہ کوئی میزبانی کا طریقہ تو نہیں۔"

اس عفریت زادے نے دونوں ہاتھ بغلوں میں دے کر مجھے اٹھایا اور ایک کرسی پر تقریباً ٹکا دیا۔ میری نظر نصیر بیگ پر پڑی جو کمرے کے وسط میں آ چکا تھا۔ "نواب صاحب!" اس نے مضطربانہ لہجے میں کہا۔ "اب میرا باقی حساب بھی صاف کر دیجئے مجھے ملک سے باہر جانے کا انتظام بھی کرنا ہے۔"

"کیوں نہیں بھئی۔" نواب نے انتہائی شفقت سے کہا۔ "تم نے اپنا کام نہایت عمدگی سے کیا اور عظیم مرحوم سربراہ کی بیوہ کو شبہ تک نہیں ہونے دیا کہ اسے کہاں لے جایا جا رہا ہے--- ہاں تو تمہارا کتنا روپیہ باقی ہے؟"

"دو لاکھ۔" نصیر نے جھک کر نہایت خاکساری سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"رقم لائی جائے۔" نواب نے کن کٹے سیاہ فام کو اشارہ کیا۔ وہ احتراماً جھکا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ اس کا ہاتھ بجلی کی سی تیزی سے گھوما اور نصیر بیگ کی کنپٹی پر پڑا۔ وہ اچھل کر دور جا گرا۔ اس کی عینک نہ جانے کہاں غائب ہو گئی۔ میرے اندازے کے مطابق اس ضرب سے اس کو کئی دن تک کے لئے بے ہوش ہو جانا چاہئے تھا' مگر اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب وہ اندھے منہ گرتے ہی ناقابل یقین پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا اور جب وہ پلٹا تو اس کے ہاتھ میں دو دھاری چمکیلا خنجر تھا۔ جسے اس نے نوک کی طرف سے انگوٹھے اور انگلی کے درمیان سے پکڑا ہوا تھا۔

"میری طرف مت بڑھنا۔" وہ پیچھے ہٹتے ہوئے اور ایک ٹک کن کٹے کو گھورتے ہوئے سانپ کی طرح پھنکارا۔

دفعتاً نصیر بیگ کے ہاتھوں نے عجیب و غریب انداز میں جھٹکا کھایا اور اس کے ساتھ ہی میں نے خنجر اس رفتار سے اس کے ہاتھ سے نکل کر کن کٹے کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا کہ ایک لمحے کیلئے وہ بس لمبی سی چمکیلی لکیر کی طرح دکھائی دیا۔ کن کٹے نے ایک بار بھی پلک نہیں جھپکائی۔ وہ صرف معمولی سا خم کھا کر خنجر کی لپک سے زیادہ پھرتی کے ساتھ ایک طرف کو ہوا اور خنجر اس کے قریب سے گزر کر پیچھے دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس کی نوک سے پلستر دیوار سے جھڑ گیا۔ نصیر بیگ اب ایک کونے میں پھنس چکا تھا۔ عینک کے بغیر اس کی آنکھیں کچھ بڑی بڑی اور ابھری ہوئی سی لگ رہی تھیں۔

"اسے روکو نواب شرافت علی۔" نصیر بیگ چلایا۔ اس کی نظریں بدستور کن کٹے پر جمی ہوئی تھیں۔ گو کہ مخاطب اس نے نواب کو کیا تھا۔

"ہم ابھی عزیزہ کو بتا رہے تھے ناں!" نواب کی نہایت پرسکون آواز ابھری میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اب بھی اس طرح کرسی پر نیم دراز تھا۔ "کہ اب ہم ہر کام نہایت

ٹھنڈے دل سے سوچ سمجھ کر کرنے کے عادی ہو گئے ہیں اور اب ہم اپنی کارروائیوں کا کوئی ثبوت نہیں چھوڑتے۔ تو جان شرافت! ہم تمہیں یعنی ایک چلتے پھرتے ثبوت کو کس طرح چھوڑ سکتے ہیں۔ خود ہی انصاف کرو اور بتاؤ--- ایں؟ تم نے اپنے اس دوست کو بھی نہیں بخشا جس کے گھر کا تم نے نمک کھایا تھا اور جس نے تم پر اعتماد کرتے ہوئے گویا اپنی شہ رگ تمہارے ہاتھ میں دے رکھی تھی' تو ہم کونسا تمہارے ماں جائے ہیں جو کل کو تم ہمیں بخش دو گے؟"

عین اسی لمحے نصیر بیگ نے ہوا میں قلابازی کھا کر کن کٹے کے سینے پر فلائنگ کک ماری مگر یہ فلائنگ کک گویا ایک سیاہ چٹان پر پڑی تھی۔ جو دھیرے دھیرے آگے کو کھسک رہی تھی۔ نصیر بیگ جب سنبھل کر اٹھا تو اسے سیدھا ہونے کی مہلت نہیں ملی۔ کن کٹے نے اس کی کھوپڑی پر گھونسا رسید کیا تو نصیر کی ٹانگیں مشینی انداز میں مڑ گئیں اور دوسرے ہی لمحے وہ گھٹنوں کے بل کھڑا ادھر ادھر کو جھولنے لگا۔

اس سے پہلے کہ وہ قالین پر ڈھیر ہوتا کن کٹے نے نہایت پھرتی سے اپنے لباس کے کسی حصے سے ریشم کی انتہائی پتلی' مگر انتہائی مضبوط ڈوری کا ایک ٹکڑا نکالا اور نصیر بیگ کی گردن میں پھندا ڈال کر اسے ایک جھٹکے سے دوبارہ اپنے سامنے کھڑا کر لیا۔ چند ہی لمحوں بعد ڈوری کا پھندا اتنا سخت ہو گیا کہ وہ گردن کی کھال اور عضلات میں دھنس کر تقریباً غائب ہو گئی۔

○



نصیر بیگ کی نہ صرف گردن کی رگیں خوف ناک حد تک پھول گئیں بلکہ اس کی پیشانی پر بھی رگیں ابھر آئیں' آنکھیں ابل پڑیں۔ وہ صرف ایک لمحے کیلئے زخمی پرندے کی طرح پھڑکا پھر اس کے بازو ڈھیلے ہو کر اس کے پہلو میں جھول گئے اور سر بھی ایک طرف کو ڈھلک گیا۔

کن کٹے نے نہایت آہستگی سے اسے قالین پر لٹا دیا' اور ڈوری اس کی گردن ہی میں پیوست چھوڑ کر مودبانہ انداز میں نواب کی کرسی کے قریب یوں آ کھڑا ہوا گویا بہت دیر سے یوں ہی کھڑا تھا اور اس نے اپنی جگہ سے جنبش تک نہیں کی تھی۔

"برکت بیگ کو بلاؤ۔" نواب نے اسے حکم دیا۔ وہ دروازے تک گیا' اور ایک پٹ تھوڑا سا کھول کر باہر جھانک کر دھیمی آواز میں کچھ کہا اور واپس آ گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے وہی شخص دروازہ کھول کر اندر آیا جسے میں نے دروازے کے قریب سٹول پر بیٹھے دیکھا تھا۔ رائفل اب اس نے کندھے سے لٹکا رکھی تھی۔

"برکت! یہ مال پارسل کرنا ہے۔" نواب نے نصیر بیگ کی طرف اشارہ کیا۔ "اس کے اپنے ہی گھر کے ایڈریس پر۔ آثار ایسے ہی نظر آنے چاہئیں جیسے تنظیم کے کسی رکن کو علم ہو گیا تھا کہ مخبری اس نے کی ہے اور اسی رکن نے اسے ٹھکانے لگا دیا۔ سمجھ گئے نا؟" برکت بیگ نے اثبات میں سر ہلایا اور لاش کندھے پر اٹھا کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا کمرے سے باہر چلا گیا۔

"کام یوں ہوتے ہیں۔" نواب میری طرف متوجہ ہو کر سمجھانے والے انداز میں بولا۔ "صبر و سکون اور صفائی سے۔ ارباب جیسے جذباتی اور جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنے والوں کا انجام کبھی اچھا نہیں ہوتا۔ خصوصاً جبکہ وہ بڑے بڑے معاملوں میں ہاتھ ڈالنے لگیں۔"

اپنی دانست میں وہ میری روح کو چرکے لگانے کیلئے ایسی باتیں کر رہا تھا' لیکن یہ اس کی آخری بات مجھے بالکل صحیح محسوس ہوئی۔ جو کام ارباب تیس آدمیوں کا گروہ بنا کر نہیں کر سکا تھا اسے وہ اکیلا کر سکتا تھا بشرطیکہ وہ صبر و سکون سے کام لیتا اور جتنی توانائی اس نے تیس آدمیوں کی تربیت دینے میں صرف کی تھی اتنی توانائی صرف اپنے آپ کو تربیت دینے

میں صرف کرتا۔

زندگی کے اہم ترین معاملات میں کامیابی انہی کو ملتی ہے جو ان معاملات میں صرف اپنی ہی ذات کو مشیر اپنا شریک کار اور اپنا محافظ بناتے ہیں۔ اشاروں پر چلنے والے وفادار غلام صرف انہی کو میسر آتے ہیں جو نواب شرافت کی طرح پشت در پشت حکمرانی کرتے آئے ہوں اور زمین کے سینے میں جن کی جڑیں بہت گہری ہوں۔ جن کے پاس ہر طرح کے انسانوں کو خریدنے کیلئے بے اندازہ دولت ہو۔ یہ باتیں صحیح طور پر مجھے گزشتہ ایک آدھ گھنٹے ہی میں سمجھ آئی تھیں۔

"میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ تم مجھ پر اب کون سا نیا ستم ڈھانا چاہتے ہو؟" میں نے زہریلے لہجے میں پوچھا۔

"اوہ---" نواب نے آنکھیں سکیڑ کر مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ "اب تو تمہارا انداز گفتگو اور طور طریقے واقعی بہت بدل گئے ہیں۔ جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے تم ایک نرم و نازک' شرمیلی اور ڈرپوک گڑیا سی ہوا کرتی تھیں۔ تھوڑے ہی عرصے میں تمہارے اندر بہت پختگی اور بے خوفی آگئی ہے۔

"میں نے تمہیں اپنی ذات کی تبدیلیوں پر تبصرہ کرنے کیلئے نہیں کہا تھا۔ بوڑھے ریچھ!" میں نے نفرت سے کہا۔ "میں نے کچھ پوچھا تھا۔"

"ہائے ہائے۔" نواب نے متاسفانہ انداز میں سرہلایا۔ "تجربات و حوادث نے ہم میں کتنی قوت برداشت پیدا کر دی ہے۔ پہلے ہم ایسے انداز تخاطب پر لوگوں کی زبانیں کھنچوا دیا کرتے تھے۔ چہ چہ چہ--- ویسے تم اگر ہمیں صرف ریچھ کہہ لو تو زیادہ مناسب ہو گا۔ بوڑھے ہم ابھی نہیں ہوئے۔ ویسے کے ویسے ہیں۔ جیسا تم دیکھ چکی ہو' باقی جہاں تک تمہارے سوال کا تعلق ہے تو بے فکر رہو' تم پر کوئی ستم وتم نہیں ٹوٹے گا۔ پہلے بھی ہمیں تم سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ جو کچھ ہوا وہ تمہاری سرکشی اور ناشکرے پن کی وجہ سے ہوا اور اب جو کچھ ہوا وہ محض ارباب کی وجہ سے ہوا ہے۔ تم تو صرف اس کی بیوی ہونے کی وجہ سے لپیٹ میں آئی ہو اگر کسی اور حیثیت سے ملی ہوتیں' تو شاید ہم ماضی کی تمام تر ناگواری کے باوجود تمہیں معاف کر دیتے۔ اب بھی ہم تمہارے ساتھ کوئی ظلم نہیں کریں گے۔ بس تمہاری بنیاد پر ہم نے ایک چھوٹا سا سودا کرنے کی کوشش کی ہے۔ دوسرے تاجر نے آج رات آنا تھا' مگر کچھ دیر پہلے اس کا پیغام آیا تھا کہ وہ اب نہیں آ سکے گا' صبح آئے گا۔" وہ بھی ظالم ہمارے ہی پائے کا تاجر ہے۔"

"ٹھیک ہے نواب شرافت علی!" میں نے دل ہی دل میں کہا۔ "یہ تمہارا وقت ہے جو جی چاہے کرو اور جو جی چاہے کہو' اگر آج تم دوبارہ میرے نشیمن پر بجلی بن کر نہ ٹوٹے ہوتے تو شاید میں بھی تمہیں معاف کر دیتی۔ رفتہ رفتہ وہ اذیتیں فراموش کر دیتی جو تم نے

بھی مجھے پہنچائی تھیں۔ میں اپنا اور تمہارا معاملہ خدا پر چھوڑ دیتی ہوں لیکن اب میں تمہیں بھی معاف نہیں کروں گی' کیونکہ اس وقت شاید تم نے مجھے اس طرح برباد نہیں کیا تھا جس طرح اب اجاڑا ہے۔ تمہاری یہ مکروہ مسکراہٹ ایک گھاؤ کی طرح میرے دل پر نقش ہے' اور آج میں عہد کر رہی ہوں کہ اگر زندگی نے مجھے مہلت دی تو تم دیکھو گے اور یہ دنیا بھی کہ عورت اگر انتقام لینے پر اتر آئے تو ایسی مثالیں چھوڑ جاتی ہے جنہیں صدیوں تک دہرایا جاتا ہے۔"

"لہٰذا---" نواب کہہ رہا تھا۔ "فی الحال اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ تم آج رات آرام کرو' صبح جو کچھ ہو گا تمہارے سامنے آجائے گا۔"

"تمہیں اتنی ملائمت سے باتیں کرتے دیکھ کر واقعی یقین نہیں آ رہا ہے کہ تم وہی نواب شرافت علی ہو۔" میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

"بالکل اسی طرح جیسے ہمیں یقین نہیں آ رہا ہے کہ تم وہی عزیزہ ہو۔" اس نے فوراً کہا۔ "دراصل وقت کے ساتھ ساتھ ہر انسان میں تبدیلیاں آتی ہیں۔ کسی میں تیزی سے اور کسی میں آہستگی سے۔ ہم نے گزشتہ تین سال سے دوسرے تجربات کے ساتھ' ایک تجربہ یہ بھی حاصل کیا ہے کہ انسان جس چیز کو دولت کے بل پر حاصل نہ کر سکے' مکاری سے نہ جیت سکے اور طاقت سے بھی حاصل نہ کر سکے اس کا خیال دل سے نکال دینا چاہئے۔ اس سے بالکل لاتعلق ہو جانا چاہئے۔ ورنہ انسان کیلئے بے شمار مشکلات اٹھ کھڑی ہوتی ہیں۔"

یہ تجربہ تمہیں بہت تاخیر سے ہوا ہے کالے لنگور! میں نے دل ہی دل میں سوچا' جبکہ تو نے اپنے لئے ان گنت مصیبتوں کے بیج بو لئے ہیں۔ آج نہ سہی کل نہ سہی پرسوں بہرحال وہ وقت ضرور آئے گا جب تیرے بوئے ہوئے بیجوں سے تیرے لئے مصائب کا ایک جنگل اُگ آئے گا اور تو اسی میں بھٹک بھٹک کر عبرت کی موت مرجائے گا۔

"جاؤ--- اب کھانے کے کمرے میں جا کر کچھ کھا پی لو۔ اس کے بعد خادمہ تمہیں تمہارا کمرہ دکھا دے گی اور خدارا دیکھو! کوئی الٹی سیدھی حرکت کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ میرا یہاں کا عملہ کچھ زیادہ ہی مستعد ہے۔ آدمی کی گردن پہلے توڑتا ہے' اجازت بعد میں طلب کرتا ہے۔" نواب نے بڑے سرسری لہجے میں کہا اور کن کٹے کو اشارہ کیا۔ وہ میری رہنمائی کیلئے آگے بڑھا۔

"میرا بچہ کہاں ہے؟" میں نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"اسے بھی تمہارے پاس پہنچا دیا جائے گا۔" نواب نے جواب دیا۔

"اگر تم اتنی ہی نرم خوئی کا اظہار کرنے پر تلے ہوئے ہو تو میں تمہیں بتا دوں کہ میری بچی راستے میں مجھ سے بچھڑ گئی ہے---" میں نے اسے سارا واقعہ بتایا اور آخر میں

اس سے کہا۔ ”مجھے اپنی بچی واپس چاہیے۔“

”میں ہر ممکن کوشش کروں گا۔“ نواب نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اگر وہ دونوں یا صرف بچی ہی زندہ پولیس کو ہاتھ آ گئی تو تمہیں مل جائے گی‘ اگر وہ بچی سمیت فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تو پھر میں کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ میرا قیام ویسے بھی بمبئی میں زیادہ دن کا نہیں ہے۔ چند دن کیلئے میں ریاست واپس جاؤں گا اور اس کے بعد شاید علاج اور تبدیلی آب و ہوا کی غرض سے کچھ عرصے کیلئے لندن چلا جاؤں بہرحال تم خاطر جمع رکھو۔“

میں کن کٹے کی رہنمائی میں ایک شاندار ڈرائنگ ہال میں پہنچی۔ مجھے ایک کرسی پر بٹھا کر کن کٹا واپس چلا گیا‘ لیکن وہ بڑی لاتعلقی سے ایک کرسی پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا اور اس کے پاس کوئی ہتھیار بھی نظر نہیں آ رہا تھا‘ لیکن مجھے معلوم تھا کہ نہ تو وہ گردوپیش سے ہی لاتعلق ہے اور نہ ہی نہتا۔ چند لمحے بعد ایک سانولی سی لڑکی جھالروں والا پھولا پھولا سا سکرٹ پہنے اونچی ہیل کی جوتی کھٹکھٹاتی ہال میں آئی۔

”کیا کھانا پسند فرمائیں گی آپ؟“ میرے قریب پہنچ کر اس نے مودبانہ انداز میں ایک بار سر جھکانے کے بعد سیدھی کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا۔

”نواب شرافت علی کا کلیجہ بغیر تلے۔“ میں نے جواب دیا۔

”وہ تو اس وقت اشیائے خوردنوش کے ذخیرے میں موجود نہیں ہے۔ آپ کسی اور چیز کا حکم فرمایئے۔“ اس نے اس قدر سنجیدگی سے کہا کہ میں اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

”تو پھر کوئی بھی ایسی چیز لے آؤ جسے ایک ایسا انسان کھا سکے جس کا قطعاً“ کچھ کھانے کو دل نہ چاہ رہا ہو۔“ میں نے کہا۔

لڑکی چند لمحے نظریں جھکائے پرخیال انداز میں تھوڑی کھجاتی رہی‘ پھر چٹکی بجا کر کھٹ کھٹ کرتی باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ ایپرن باندھے ایک چھوٹی سی ٹرے اٹھائے کچن سے نکلی۔ اس نے چٹنیوں اور مصالحوں کی کئی چھوٹی چھوٹی پیالیاں چمچ اور چھری کانٹے میرے سامنے سجا دیئے اور بیچ میں ایک پلیٹ رکھ دی جس میں عجیب سی شکل کے سرخ سرخ کباب سجے ہوئے تھے جن سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ ان کی خوشبو اس قدر اشتہا انگیز تھی کہ میں جو ان حالات میں سوائے زہر کے کھانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی بے ساختہ ہاتھ بڑھانے پر مجبور ہو گئی۔

میں نے پلیٹ خالی کر دی تو لڑکی نے پوچھا کہ میں مزید کھانا تو پسند نہیں کروں گی۔ میں نے نفی میں جواب دیا۔ وہ گرم پانی میں بھیگا ہوا تولیہ لے کر آئی اور میرے ہاتھ اور ہونٹ پونچھنے لگی۔ کیونکہ میں نے کباب ہاتھوں ہی سے کھائے تھے‘ پھر لڑکی نے چائے یا کافی پینے پوچھا۔ میں نے اس سے بھی انکار کر دیا اور وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”آیئے! میں آپ کو آپ کے کمرے میں پہنچا دوں۔“ وہ مجھے راستہ دکھاتے ہوئے بولی۔

میں راہداری میں آئی تو عقب سے ایک سروقد اور باوقار سی عورت ایک خوبصورت سی بچہ گاڑی کو دھکیلتی نظر آئی۔ اس نے بالوں کا اونچا جوڑا بنا رکھا تھا اور نہایت بیش قیمت ساڑھی بنگالی سٹائل سے باندھی ہوئی تھی‘ وہ کسی امیر گھرانے کی معزز خاتون نظر آتی تھی لیکن جب وہ قریب آئی تو میں نے اسے پہچانا۔ یہ وہی تھی جسے میں نے نواب کے پاؤں گود میں رکھے اس کے ناخن تراشتے دیکھا تھا۔ بچہ گاڑی میں تم گدیلوں سے ٹیک لگائے مزے سے پڑے سو رہے تھے۔ تمہارے اوپر نیچے کھلونے بکھرے ہوئے تھے۔ ایک بھالو تو سوتے میں بھی تمہاری بغل میں دبا ہوا تھا۔

قریب آ کر اس عورت نے بچہ گاڑی میرے ہاتھ میں تھما دی‘ میں نے ”گفتگو برائے گفتگو“ کے طور پر پوچھا۔ ”آپ اسی گھر میں رہتی ہیں؟“ اس کے چہرے پر پھیلی گمبھیر سنجیدگی میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ اس نے گویا میری آواز سنی ہی نہیں تھی۔

”شب بخیر۔“ اس نے سرگوشی نما لہجے میں کہا اور واپسی کیلئے مڑ گئی۔ سکرٹ والی لڑکی آگے میرے انتظار میں کھڑی تھی اور مڑ مڑ کر میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں بچہ گاڑی کو دھکیلتی اس کے پیچھے چل دی۔ وہ مجھے جس کمرے میں لے گئی وہاں دو نفیس جڑواں مسہریاں بچھی ہوئی تھیں۔ ایک طرف سیاہ لکڑی کی خوبصورت سنگھار میز رکھی تھی۔ فرنیچر بس یہی تھا لیکن وسیع کمرہ اپنی تمام تر سادگی کے باوجود غالباً گہرے سبز رنگ کے دبیز قالین اور ایسے ہی رنگ کے باریک حریری پردوں کی وجہ سے بہت بھلا اور پرسکون سا لگ رہا تھا۔

”آپ کے سرہانے سوئچ بورڈ پر سفید بٹن لگا ہوا ہے۔“ لڑکی نے دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”کسی چیز کی ضرورت ہو تو اسے دبا دیجئے گا۔“

اس کے جانے کے بعد میں نے دروازہ بند کر کے بولٹ چڑھایا تمہیں بچہ گاڑی سے نکال کر بستر پر لٹایا اور خود بھی تمہارے قریب لیٹ گئی۔ بتی بجھانے کی میری ہمت نہیں پڑ رہی تھی حالانکہ فی الوقت میرے ساتھ معزز مہمانوں ہی کا سا برتاؤ ہو رہا تھا۔ اس برتاؤ کی وجہ بھی میری سمجھ سے باہر تھی۔

بستر پر لیٹ کر مجھے قدرے سکون کا احساس ہوا اور میں نے شام سے لیکر اب تک کے واقعات پر نئے سرے سے غور کرنا شروع کیا۔ مریم سے جدائی اور ارباب کے دردناک موت کے تصور سے میرا کلیجہ شق ہونے لگا۔ دفعتاً“ میرے شعور کے کسی گوشے سے سرگوشی ابھری۔ ارباب کی موت کی خبر ابھی تک تو محض ایک سنی سنائی بات ہے۔ تم نے اس پر اتنی جلدی کیوں یقین کر لیا؟ نصیر بیگ جیسے غدار کا کیا بھروسہ۔ شاید اس نے جھوٹ

لیکن پھر مجھے یاد آیا کہ نواب نے بھی مجھے "بیوہ" کے نام سے مخاطب کیا تھا اور کم از کم آج نواب مجھے جھوٹ کے موڈ میں نہیں دکھائی دے رہا تھا' لیکن یہ بھی تو ممکن تھا کہ اسے بھی غلط ہی اطلاع ملی ہو- اس احساس سے مجھے کچھ ڈھارس سی بندھی دھیرے دھیرے میرے آنسو تھم گئے اور بالآخر مجھے نیند بھی آ گئی-

صبح ناشتے کی میز پر میرا نواب سے سامنا ہوا- اس وقت اس کے برابر والی کرسی پر ایک اور عورت براجمان تھی- پہلی ہی نظر میں وہ نہ جانے کیوں مجھے عجیب سی لگی- وہ عمر کی اس منزل پر تھی جہاں جوانی اسے الوداع کہنے ہی والی تھی مگر یوں لگتا تھا کہ وہ دور تک جوانی کا پیچھا کرنا چاہتی ہے- اس نے نہایت گہرا اور آنکھوں کو چبھنے والا میک اپ کیا ہوا تھا- بالوں کے جوڑے پر قیمتی موتیوں کی لڑی لپیٹ رکھی تھی- شوخ رنگوں کی بنارسی ساڑھی نے اس کے فربہی جسم کو نہایت عمدگی سے سنبھال رکھا تھا- اس کے کانوں میں ہیرے کے آویزے تھے- وہ کرسی کے پشتے سے ٹیک لگائے' ایک لمبے سے سفید ہولڈر میں سگریٹ پھنسائے دھیرے دھیرے کش لے رہی تھی- وہ نیم باز آنکھوں سے یوں ایک سے دوسری چیز کی طرف دیکھ رہی تھی جیسے دنیا اس کی نظروں میں بازیچہ اطفال ہو-

ایک لمحے کیلئے مجھے خیال آیا کہ کہیں وہ نواب کی "یکے از بیگمات" نہ ہو- میں نے نواب کے تاثرات سے ان کے باہمی تعلق کے بارے میں کوئی اندازہ لگانے کی کوشش کی' لیکن نواب کے چہرے پر سرے سے کوئی تاثر نہیں تھا- وہ سر جھکائے دنیا جہاں سے لاتعلق کے ساتھ ناشتہ کرنے میں مصروف تھا- میں نے محسوس کیا کہ میں جب ڈائننگ ہال میں داخل ہوئی تو اس نے سرتاپا میرا جائزہ لیا تھا اور جب میں نے ناشتہ شروع کیا تب بھی وہ بدستور گہری نظروں سے میری ہی طرف دیکھتی رہی- میں نے اس کی طرف نظر اٹھائی تو وہ فوراً کسی اور چیز کو دیکھنے لگی-

میں تمہیں دودھ پلا کر لائی تھی لیکن ناشتے کی میز پر میں نے اپنے گھر کے معمول کے مطابق تمہیں مختلف چیزوں کے چند چھوٹے چھوٹے نوالوں اور پھلوں کی کچھ قاشیں کھلانے کی کوشش کرنے لگی- عورت میرے اس عمل کو بھی بغور دیکھ رہی تھی-

نواب نے ناشتہ یوں ختم کیا گویا دنیا کا سب سے ضروری کام یہی تھا' پھر اس نے ایک طویل ڈکار لے کر بگلے کے پروں جیسے سفید نیپکن سے الٹے توے جیسے سیاہ ہونٹ پونچھتے ہوئے کرسی کے پشتے سے ٹیک لگا کر میری طرف دیکھا' پھر نیپکن ایک طرف رکھ کر خواہ مخواہ دانت نکالتے ہوئے بولا- "تمہیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی نا؟ رات نیند اچھی آئی؟"

واقعی اس دھرتی پر تم جیسے مثالی خبیث بھی کبھی کبھار ہی پیدا ہوتے ہیں شرافت علی! میں نے دل ہی دل میں سوچا' جو ایک عورت کا سہاگ اجاڑ کر اس کی زندگی کو ہر

سے اجیران کر کے پوچھتے ہیں کہ رات کو نیند تو اچھی آئی- میں اسے بتانا نہیں چاہتی تھی کہ میرے شعور کے کسی گوشے میں امید کی کرن باقی ہے کہ ارباب ابھی مرا نہیں اور اسی امید کے سہارے میں گزشتہ رات سو گئی تھی-

میں نے خاموشی سے اس کی طرف دیکھا' اور پھر اس خیال سے کہ کہیں غیر ارادی طور پر میں پلیٹ اٹھا کر اس کے منہ پر نہ کھینچ ماروں' میں نے نظریں جھکا لیں- حالات کو اپنے حق میں بد سے بدتر بنانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا-

"کہیں یہ گونگی تو نہیں؟" اچانک عورت نے نواب سے پوچھا اس کے لہجے میں چھپی ہوئی تشویش پر مجھے بڑی حیرت ہوئی- اس نے یہ سوال اس طرح مضطربانہ انداز میں کیا تھا گویا میرا گونگی ہونا اس کیلئے کسی نقصان کا باعث بن سکتا ہو-

"ارے نہیں گوہر جان!" نواب نے بے ہنگم قہقہہ لگایا اس کے منہ میں تو پوری پون گز کی زبان ہے لیکن شاید یہ لفظوں کی کفایت شعاری کر رہی ہے- حالات ہی کچھ ایسے ہیں- تمہیں تو میں نے سب کچھ ہی بتا دیا ہے-" پھر اس نے ایک لمحے کیلئے خاموش ہو کر عورت کو گھورا- "لیکن تمہیں یہ سوال پوچھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ کیا تمہیں ہماری زبان پر اعتبار نہیں؟"

"اعتبار ہے تبھی تو آئی ہوں ورنہ صرف نامنظوری کا پیغام بھجوا دیتی-" عورت نے کہا اور سگریٹ ایش ٹرے میں مسل کر نواب کی طرف دیکھا- دونوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے کچھ کہا اور اٹھ کھڑے ہوئے- پھر وہ میری طرف دیکھے بغیر یوں کمرے سے رخصت ہو گئے گویا میں اب وہاں موجود ہی نہیں تھی- ہوا میں تحلیل ہو چکی تھی-

وہی لڑکی جس نے مجھے ناشتہ دیا تھا' میرے قریب آئی اور مؤدبانہ انداز میں بولی---
"اگر آپ کو مزید کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دیجئے-"

میں نے نفی میں سرہلایا اور دوستانہ لہجے میں پوچھا- "یہ عورت کون تھی؟"

لڑکی نے خالی نظروں سے مجھے دیکھا اور پھر معذرت خواہانہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا--- "میں کیا بتا سکتی ہوں میڈم! میرا کام مہمانوں کے آرام اور طعام کا خیال رکھنا ہے ان کے بارے میں معلومات رکھنا نہیں-"

"تمہیں اپنے بارے میں بھی معلوم ہے یا نہیں؟" میں نے جل کر پوچھا- "مثلاً یہ کہ تم کون ہو' کس کی اولاد ہو' انسان ہی کی--- یا کسی اور کی؟"

"میں نے آخری بار اپنے باپ کو اس وقت دیکھا تھا جب میری عمر پانچ سال تھی-" لڑکی نے انتہائی سنجیدگی سے قطعی غیر جذباتی لہجے میں کہا--- "وہ شراب کے نشے میں میری ماں کو کپڑے دھونے والی موگری سے پیٹ رہا تھا- اس کا چہرہ مجھے صحیح طور پر یاد نہیں

لیکن میرا خیال ہے کہ وہ بظاہر انسان ہی تھا' کیونکہ اس کی دو ٹانگیں دو ہاتھ اور ایک سر تھا۔ بالکل انسانوں جیسا۔ لہٰذا میں کسی اور مخلوق کی اولاد نہیں ہو سکتی۔"

"کیا اس کے بعد تم اپنے باپ سے بچھڑ گئی تھیں۔" اس بار میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔ اس لڑکی نے غیر جذباتی ہونے کی انتہا کر دی تھی۔ مجال ہے جو اس کی گفتگو میں اس کے لہجے میں کوئی اتار چڑھاؤ آیا ہو۔

"یہی سمجھ لیں۔" اس نے بدستور سپاٹ لہجے میں کہا۔۔۔ "کیونکہ اس رات میری ماں نے اسے سوتے میں قتل کر دیا تھا۔ لکڑیاں چیرنے والی کلہاڑی سے میری ماں نے اس کی کھوپڑی دو حصوں میں تقسیم کر دی تھی۔ بارہ برس تک اس نے اتنی مار کھائی تھی کہ میرے خیال میں اس کے جسم کی تقریباً ہر ہڈی ایک بار ٹوٹ کر جڑ چکی تھی۔ اگر آپ ناشتہ ختم کر چکی ہیں تو اپنے کمرے میں تشریف لے چلئے۔" آخری جملہ بھی اس نے اپنی باقی گفتگو کے ساتھ اسی روانی سے کہا تھا کہ ایک لمحے کیلئے تو مجھے احساس ہی نہیں ہوا کہ اس نے مجھے اٹھنے کیلئے کہا تھا۔ جب دوبارہ اس نے یہی درخواست کی تو میں اٹھی۔

کمرے میں آکر میری سمجھ میں نہ آیا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے' کس طرح وقت گزارنا چاہئے لیکن میری یہ مشکل تم نے حل کر دی۔ تم نے میری انگلی چھوڑی اور دوڑ کر کمرے کے ایک گوشے میں کھڑی بچہ گاڑی سے کھلونے نکالنے لگے۔ تمہارے ساتھ میں بھی کھلونوں سے کھیلنے لگی۔ تمہیں بہلانے لگی۔

تقریباً دو گھنٹے کی اچھل کود اور توتلی زبان میں گنتی کے چند الفاظ دہراتے بالآخر تم تھک کر سو گئے۔ تمہیں مسہری پر لٹا کر میں پلٹی ہی تھی کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور ساتھ ہی اس لڑکی نے اندر جھانکا۔

"تشریف لے چلئے میڈم! گاڑی تیار ہے۔" اس نے کہا۔

"کہاں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"مجھے تو معلوم نہیں میڈم!" اس نے اپنے مخصوص معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ "مجھے صرف اتنا کہا گیا ہے کہ میں آپ کو صدر دروازے تک پہنچا دوں۔"

"میں نواب سے بات کرنا چاہتی ہوں۔" میں نے کہا۔

"وہ تو چند منٹ پہلے ہی کسی کام کے سلسلے میں روانہ ہو چکے ہیں۔" لڑکی نے جواب دیا۔ اس کا مطلب تھا کہ مجھے نواب کے ساتھ نہیں جانا تھا۔ چند لمحے تک میں اپنی جگہ ساکت کھڑی سوچتی رہی پھر میں نے تمہیں اٹھا کر کندھے سے لگایا اور کمرے سے باہر آ گئی۔

لڑکی کی رہنمائی میں چلتے ہوئے میں نے اپنے عقب میں ہلکی سی آہٹ سنی مڑ کر دیکھا تو وہ شخص پیچھے آتا دکھائی دیا جسے میں خواب گاہ کے دروازے پر بیٹھے دیکھ چکی تھی۔

وہ اب بھی بڑی لاتعلقی سے سر جھکائے گویا اپنی راہ چل رہا تھا' لیکن مجھے معلوم تھا کہ کی واسکٹ کی جیب میں ریوالور کا دستہ جھانکنا دکھائی دینے کا مطلب یہی تھا کہ میں حکم کی کوشش نہ کروں۔

برآمدے کی سیڑھیوں کے قریب پورچ میں ایک سیاہ کار کھڑی تھی۔ لڑکی نے بڑے ام سے جھک کر مجھے کار کی طرف جانے کا اشارہ کیا۔ میں سیڑھیاں اتر کر نیچے پہنچی تو ئیور نے کار سے اتر کر میرے لئے پچھلا دروازہ کھولا' اور تب میں نے دیکھا کہ پچھلی لت پر وہی عورت گوہر جان موجود تھی۔ جسے میں ناشتے کی میز پر دیکھ چکی تھی۔

میں کار کے قریب پہنچی تو گوہر جان نے اندر بیٹھے ہی بیٹھے بازو پھیلائے۔ "لاؤ منے میری گود میں دے دو۔" اب میں نے محسوس کیا کہ اس کی آواز غیر معمولی طور پر مترنم ملائم تھی۔

تم اب بھی سو رہے تھے تمہیں گوہر جان کی گود میں لٹا کر میں اس کے برابر بیٹھ گئی ڈرائیور اپنی سیٹ پر آ بیٹھا۔ ڈرائیور کے قریب ہی ایک اور شخص بت کی طرح ساکت تھا۔ اس کی گردن نہایت کوتاہ اور بھینسے کی طرح موٹی تھی۔ میں نے برآمدے کی ل دیکھا وہ لڑکی اور میرے پیچھے آنے والا آدمی دروازے پر کھڑے تھے۔ گاڑی صدر زے کی طرف بڑھی تو لڑکی نے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا اور تیزی سے گھوم کر دروازہ ل کر اندر چلی گئی۔

لوہے کا گیٹ کھلا تھا۔ گاڑی سڑک پر آ کر دائیں طرف گھومی اور چند لمحے بعد اٹے بھرنے لگی۔ یہ سڑک نہایت چوڑی تھی' مگر اس پر ٹریفک برائے نام تھی۔ البتہ اتوں کا سلسلہ گنجان ہوتے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ ہم مضافات سے اندرون شہر کی ف جا رہے تھے۔

"چشم بد دور۔ بہت ہی پیارا بچہ ہے۔" گوہر جان نے تمہی اپنی گود میں ہلکے ہلکے نے ے دیتے ہوئے کہا۔ "بالکل ماں کی طرح خوبصورت ہے۔"

رہی میں

"اس کا باپ بھی کم خوبصورت نہیں ہے۔" میں نے کٹیلے لہجے میں کہا۔ "ئ ملا تو تمہیں اس سے ضرور ملواؤں گی۔"

سا آیا جس

"مرے ہوؤں سے ملنا ممکن ہوتا تو اس دنیا کے دکھ آدھے نہ رہ جائے۔" آسائش اور ڑی سانس لیکر کہا۔

اندر داخل

میں نے اسے گھورا لیکن وہ میری طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ گویا اسے میرے۔ ایک لمحے ب کچھ معلوم تھا' لیکن مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ درحقیقت کون تھی؟ اس ل پوچھتے ہوئے ایک تو مجھے احساس کمتری سا ہو رہا تھا' دوسرے مجھے اندیشہ تھا کہ میں پاؤں لڑکی کی طرح فلسفہ بگھارنا شروع نہ کر دے۔

پر مختلف

چند لمحے خاموشی رہی۔ میں کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے اندازہ لگانے کی کوشش کرتی رہی کہ ہم کس علاقے سے گزر رہے ہیں اور اگر دوبارہ نواب کے عشرت کدے کی طرف آنا پڑے تو کن کن نشانیوں کی مدد سے راستہ طے کیا جائے، لیکن میں کوئی اندازہ نہ لگا سکی۔ ایک تو شہر پوری طرح میرا دیکھا بھالا نہیں تھا اور ویسے بھی بمبئی کی ڈگیں نہ جانے مجھے کیوں ملتی جلتی لگتی تھیں۔

راستوں کی کچھ نشانیاں متعین کرنا بھی محال ہی نظر آ رہا تھا کیونکہ کار خلاف توقع خاصی تیز رفتار سے چل رہی تھی۔ وگرنہ اس کے ظاہری حلیئے سے تو یہی لگتا تھا کہ چلنے کی بجائے رینگتی ہو گی۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ وہ دیگر بہت اچھی اچھی کاروں کے مقابلے میں برائے نام آواز پیدا کر رہی تھی۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں؟" بالآخر میں نے گوہر جان سے پوچھ ہی لیا۔

"میرے گھر۔" اس نے سادگی سے جواب دیا۔

"تمہارا گھر کہیں خلاء میں تو معلق نہیں ہو گا۔" میں نے کاٹ کھانے والے لہجے میں کہا۔ "میں نے جگہ کا نام پوچھا تھا۔"

اس نے ناپسندیدگی کی نظر سے میری طرف دیکھا۔ "تمہارے لئے اتنا کافی نہیں ہے کہ فی الوقت میں تمہیں ایک بھیانک قید خانے سے چھڑا کر لے آئی ہوں۔"

"تمہیں میری اتنی فکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔" میں نے جان بوجھ کر اپنے لہجے کی کاٹ بدستور برقرار رکھی۔ "میں نے اس سے بھی کہیں زیادہ بھیانک قید خانہ دیکھ رکھا ہے۔ میرے لئے تو ساری دنیا ہی ایک بہت بڑا قید خانہ ہے۔"

اس نے برا سا منہ بنایا گویا کوئی کڑوی گولی نگلی ہو۔ "ایک تو ساری زندگی عاشق مزاج مردوں اور ستم رسیدہ عورتوں سے فلسفہ سنتے سنتے میں تنگ آ گئی ہوں۔" وہ ناگواری سے بولی۔ "فی الحال تم خاموشی سے بیٹھو۔ وقت آنے پر تمہیں سب کچھ معلوم ہوتا چلا جائے گا۔"

خاصے طویل سفر کے بعد کار تنگ سی گلیوں کی بھول بھلیوں میں داخل ہوئی۔ چند "مجھے صرف" ادھر ادھر چکرانے کے بعد پیلے پتھروں سے بنے ہوئے بلند و بالا مکان کے سامنے جا کر "مکان کا دروازہ کئی گز کی بلندی پر تھا" اور اس کے دونوں طرف دو چبوتروں پر پتھر "کے" بنے دو شیر نصب تھے۔ کار سے اتر کر اس نے تمہیں میری گود میں دے دیا اور اپنے دیا۔ اس کے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

ساکت کھڑ[illegible] اندر سے یہ مکان [illegible] بہت بڑے کنویں سے مشابہ تھا جسے سطح زمین سے نیچے گئی۔ [illegible]نے کے بجائے زمین سے [illegible] کھڑا کر دیا گیا تھا۔ مکان کی تینوں منزلوں کی بالکونیاں [illegible] کی شکل میں تھیں۔ جن سے نیچے پکے صحن میں جھانکا جا سکتا تھا۔ صحن میں کھڑے دیکھا تو وہ

ہو کر اوپر آسمان کا صرف ایک بڑا سا گول ٹکڑا دکھائی دیتا تھا۔ یہ حقیقت مجھے بہت بعد میں جا کر معلوم ہوئی کہ یہ مکان واقعی ایک اندھا کنواں تھا جس میں گرنے کے بعد کوئی باہر واپس نہیں جا سکا۔

گول صحن میں آمنے سامنے دو جگہوں سے سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں۔ گوہر جان کی رہنمائی میں میں دوسری منزل کی بالکونی میں پہنچی۔ بائیں ہاتھ پر کمروں کی قطار اور دائیں طرف بالکونی کا جنگلا تھا۔

بیشتر کمروں کے دروازے کھلے تھے اور ہر کمرے میں ایک یا دو لڑکیاں موجود تھیں۔ کوئی اپنے آپ کو متاع رائیگاں کی طرح بستر پر بکھیرے پڑی تھی۔ کوئی سنگھار میز کے سامنے بیٹھی اپنے بکھرے وجود کو سمیٹنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کوئی لباس سے بے نیاز پسینے میں شرابور ورزش میں مصروف تھی۔

ہمیں دیکھ کر کئی لڑکیاں لپک کر دروازے میں آ گئیں۔ یہ سب جوان اور حسین تھیں مگر ان کے چہرے پھیکے پھیکے ہونٹ بے رس اور آنکھیں کھنڈر کھنڈر سی تھیں۔ گویا کوئی خون آشام سوتے میں ان کے سارے وجود کی تازگی اور چہرے سے تب و تاب چوس گیا ہو۔ میں نے اپنے عقب میں ان کی آوازیں سنیں۔

"نو گرفتار قفس تیری خدا خیر کرے۔"

"ہائے ہائے چال تو دیکھو، کمرے شاخ گل کی طرح لچک رہی ہے دو قدم میں نرت بھاؤ بتا دے۔"

"بچے والی ہے۔"

"حالانکہ ابھی خود بچی ہے۔"

"مگر بی بی کو اللہ میاں نے بنایا ہے فرصت میں بیٹھ کر۔"

"اس آواز پر بڑے زور کا قہقہہ پڑا۔ گوہر جان چلتے چلتے رک گئی اور اس نے دروازوں میں کھڑی لڑکیوں پر ایک نظر ڈالی۔ منہ سے کچھ بھی نہیں کہا۔ اس کی نظر ہی میں یہ اثر تھا کہ تمام لڑکیاں بھیگی بلیوں کی طرح اپنے کمروں میں گھس گئیں۔

چند قدم آگے چل کر گولائی میں پھیلی ہوئی کمروں کی قطار میں ایک خلا سا آیا جس سے آگے اس منزل کا الگ تھلگ حصہ تھا۔ یہ حصہ دیگر کمروں کی نسبت پر آسائش اور وسیع معلوم ہوتا تھا۔ اس حصے میں ایک کمرے کا خوبصورت پردہ ہٹا کر گوہر جان اندر داخل ہوئیں اور پردہ ایک طرف کو سمیٹ کر مجھے راستہ دیا۔ اندر ملگجی سی روشنی تھی۔ ایک لمحے کے لئے تو مجھے کچھ بھی نظر نہیں آیا۔ گوہر جان نے لائٹ آن کر دی۔

یہ ایک شاہانہ قسم کا کمرہ نشست تھا۔ فرش پر دبیز ایرانی قالین تھا جس میں پاؤں دھنسے جا رہے تھے۔ کمرے کے مختلف حصوں میں شاہی طرز کی اونچی کرسیاں جن پر مختلف

گدے جھلملا رہے تھے۔ انگریزی طرز کے کاؤچ بلورین پایاں اور ایک چھوٹا سا آرام دہ دیوان بچھا ہوا تھا۔ چھت میں دو فانوس لٹک رہے تھے۔ دیواروں پر جہازی سائز کی فریم شدہ رنگین تصویریں آویزاں تھیں۔ یہ تصویریں غالباً انگریز ایکٹریسوں کی تھیں۔

ایک کونے پر میز پر بڑا سا گراموفون رکھا تھا جس کی نقرئی بھونپو پہلی نظر میں چاندی کا ایک بہت بڑا بگل معلوم ہوتا تھا۔ گراموفون کے قریب ہی اوپر نیچے بڑے بڑے ریکارڈوں کا انبار تھا۔ اس کے قریب ہی دیوار میں ایک اونچی سی الماری میں رنگا رنگ بوتلیں، شفاف بلوری گلاس، ایک خانے میں بیش قیمت آرائشی چیزیں اور سب سے نچلے خانے میں کچھ کتابیں بھری ہوئی تھیں۔

اس کے مقابل دیوار میں آتش دان تھا جس کے سامنے قالین پر چیتے کی کھال بچھی ہوئی تھی۔ آتش دان کی کارنس پر مختلف العمر عورتوں کے بڑے بڑے فریم شدہ رنگین پورٹریٹس سجے ہوئے تھے۔ جنہیں غالباً مختلف مگر ماہر فن مصوروں نے بنایا تھا۔ ان میں ایک تصویر گوہر جان کی بھی تھی۔ جو اس کی جوانیکی تھی۔ اس تصویر سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اس کی جوانی نے کیا قیامتیں نہ ڈھائی ہوں گی۔

دفعتاً ایک ملحقہ کمرے کا پردہ ہٹا اور ایک مکروہ صورت سی بڑھیاں اندر آ گئی۔ صورت کے برعکس اس کا لباس اجلا تھا اور جب وہ بولی تو اس کے لہجے کی شائستگی اور آواز کی مٹھاس نے اس کی بدصورتی کا ناگوار تاثر ختم کر دیا۔

"کیا حکم ہے بی بی گوہر!" وہ گویا گوہر جان کے قدموں میں بچھی جا رہی تھی۔

"اس لڑکی کو عظمیٰ والے کمرے میں پہنچا دو۔" گوہر جان نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔ اس کا اور اس کے بچے کی ہر ضرورت کا خیال رکھنا۔"

"آپ بالکل فکر نہ کیجئے بی بی گوہر۔" بڑھیا نے سر خم کر کے کہا اور مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

دوسری شام تک میں خواب گاہ نما ایک کمرے میں رہی بڑھیا تمام وقت برابر والے کمرے میں رہی جس کا ایک مشترک دروازہ درمیان دیوار میں تھا۔ مجھے کسی بھی چیز کی ضرورت ہوتی تو میں اس پر ہولے سے دستک دیتی اور بڑھیاں دوڑی آتی۔ بہرحال میرے کمرے کا آمدورفت والا دروازہ مقفل تھا۔ بڑھیا جب بھی آتی، چابی سے تالا کھول کر آتی اور باہر جاتے وقت بھی دروازہ مقفل کر جاتی۔

کمرہ نہایت کشادہ، روشن اور ہوادار تھا۔ اس لئے اس میں احساس نہیں ہوا کہ میں یہاں قید ہوں۔ البتہ دوپہر کو تم رونے لگے تو بڑھیا تمہیں بہلانے کیلئے باہر لے گئی۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد واپس آئی تو تمہارے لئے کھانے پینے کی بہت سی چیزیں اور کھلونے کے پیکٹ اٹھا لائی تھی۔

مجھے اب تک معلوم نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں اور مجھے یہوں کیوں لایا گیا ہے۔ گوہر جان کو مجھ سے کیا مطلب ہے؟ اور مجھے یہاں قیدیوں کی طرح کیوں رکھا جا رہا ہے؟ گو کہ مجھے یہاں کوئی تکلیف نہیں تھی لیکن مقفل کمرے میں رہنا بجائے خود ایک بہت بڑی تکلیف تھی۔ شام کو گوہر جان آئی تو اس کے ساتھ ایک منحنی سا بوڑھا آدمی بھی تھا۔

"نہیں اپنا اور منے کا ناپ دو۔ دو تین روز میں تمہارے کپڑے وغیرہ تیار ہو کر آ جائیں گے۔" گوہر جان نے ملائمت سے کہا۔

"بوڑھا ناپ لے کر جا چکا تو میں نے گوہر جان کی طرف دیکھا وہ اسی لمبے سے ہولڈر میں سگریٹ لگائے، ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھی تھی اور گہرے کش لے رہی تھی۔ میری موجودگی کا اسے گویا احساس ہی نہیں تھا۔

"یہ کیا سلسلہ ہے؟" بالآخر میں نے کھنکار کر کہا اور تب وہ میری طرف متوجہ ہوئی۔ "کیا اب مجھے یہاں رہنا ہو گا؟"

"ظاہری سی بات ہے۔" اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

"لیکن کیوں؟ اور یہ کونسی جگہ ہے؟" میں نے تند لہجے میں کہا۔

"کیا ابھی تک تمہاری سمجھ میں نہیں آیا؟" اس نے ہلکی سی حیرت سے کہا۔

"نہیں!" میں نے تیزی سے جواب دیا۔

"بہت بھولی ہو، جو عورتیں بھولپن کے عالم میں اس دنیا میں داخل ہوتی ہیں آگے چل کر بڑی قیامت مچاتی ہیں۔" اس نے ہلکا سا کش لیا اور بغور مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا نواب نے تمہیں کچھ نہیں بتایا تھا؟"

"کس سلسلے میں؟" میں تقریباً چلا اٹھی۔

"اوہ! اس مردود نواب سے یہی امید تھی۔ بہرحال میں تمہیں سارا قصہ سناتی ہوں۔" کچھ سوچ کر اس نے گویا وضاحت کی۔ "سب سے پہلے تو میں تمہیں یہ بتاؤں کہ اس وقت تم فارس روڈ کے علاقے میں ہو۔"

"ایک لمحے کیلئے تو میں نے کوئی خاص بات محسوس نہیں کی۔ دفعتاً" میرے ذہن میں چھناکا سا ہوا۔ ایک مرتبہ ارباب نے باتوں باتوں میں سرسری طور پر بتایا تھا کہ بمبئی کا فارس روڈ کا علاقہ ہندوستان کا سب سے بڑا بازار حسن ہے۔

میرے ذہن میں بازار حسن کا تصور نہایت خوفناک تھا۔ یہ تصور ذہن میں ابھرتے ہی میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے اور ساری تندی و تیزی رخصت ہو گئی۔

"لیکن مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟" میں نے سرسراتی آواز میں پوچھا۔ "کیا نواب نے مجھے تمہارے ہاتھ فروخت کر دیا ہے؟"

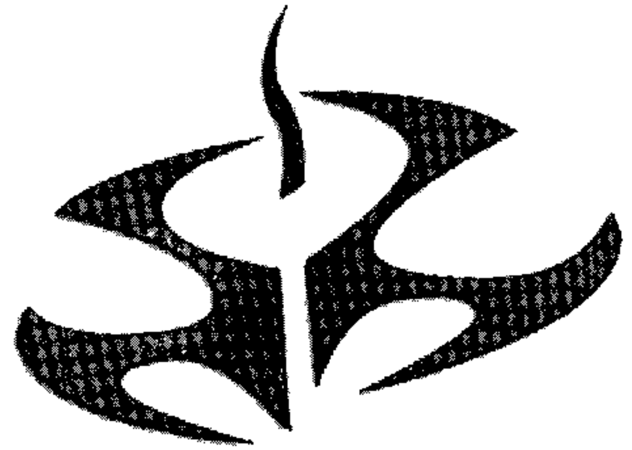
"نہیں۔ ابھی وہ ابلیس اتنا غریب نہیں ہوا کہ بازاری عورتوں کے ہاتھ لڑکیاں

فروخت کرنے لگے۔ اس نے تو پہلے سے ایک لاکھ روپیہ بھی دیا ہے۔"

میں ایک ٹک اسے گھور رہی تھی۔ دھوئیں کے مرغولوں میں اس کا سرخ و سپید چہرہ مجھے دھندلا دھندلا سا لگ رہا تھا۔ نیم وا آنکھوں سے ہوا میں کسی غیرمرئی چیز کو دیکھتے ہوئے وہ دھیرے دھیرے کش لے رہی تھی۔ اس کی محرابی پیشانی پر شکنیں ابھر آئی تھیں گویا وہ الجھن میں ہو کہ بات کہاں سے شروع کرے۔

میں اس کے لب ہلنے کی منتظر تھی۔۔۔





"یہ تقریباً" بیس سال پہلے کی بات ہے" بالآخر گوہر جان نے کہا۔" یعنی اس وقت کی' جب نواب شرافت علی جوان تھا' اور اس کوٹھے پر باقاعدگی سے آتا تھا۔ میں بمبئی میں اس کی شناسا تھی اور اس کی طرف سے اس زمانے میں مجھے پانچ ہزار روپے مہینہ ملتا تھا۔ پانچ ہزار روپیہ تو اس زمانے میں بھی بڑی چیز ہے۔ اس زمانے کی تو بات ہی مت پوچھو۔ ...نے ٹھنڈی سانس لے کر سگریٹ کا ایک کش لیا۔ میں ایک ٹک اس کی صورت دیکھ ...تھی۔

"وہ جب بھی بمبئی آتا اور جتنے دن بھی ٹھہرتا۔ مجھے اس کے ساتھ اس کی کوٹھی میں ...ا پڑتا تھا۔" ایک لمحے کے توقف سے گوہر جان نے بات جاری رکھی۔ اس تعلق کے ... میں تمام تر احتیاطی کوششوں کے باوجود میرے ہاں ایک بچی پیدا ہوگئی۔ بچی خاصی ...ورت تھی یا دوسرے لفظوں میں تم کہہ سکتی ہو کہ بالکل باپ پر گئی تھی۔ "نواب اور ...جے مہاراجے عموماً" ہم جیسی عورتوں کے ہاں اپنی لڑکیاں رہنے نہیں دیتے۔ نواب نے ...ں کئی مرتبہ بچی کو اپنے ساتھ لے جانے کے لئے مجھ سے مانگا مگر میں ٹال مٹول کرتی ...ی۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ اس وقت بچی ...ے لئے میرے دل میں مامتا کروٹیں لے رہی تھی۔ دوسرے یہ کہ میرے ذہن کے کسی ...وشے میں نواب کے خلاف کینہ موجود تھا اور وہ اس لئے کہ اس نے ابتداء میں مجھے ...ادی کا جھانسا دیا تھا اور میں اپنی تمام تر چالاکی کے باوجود اس کے جھانسے میں آگئی تھی۔ ...یگم بننے کے خواب دیکھنے لگی تھی۔ کافی عرصے کے انتظار کے بعد جب میں نے اس کا وعدہ یاد دلایا تو وہ عجیب سے انداز میں ہنس پڑا۔ کہنے لگا دو چار نوابوں نے جوش جذبات میں آکر بازاری عورتوں سے شادیاں کرلی ہیں۔ اب ایسی ہر خوش شکل عورت رانی مہارانی اور بیگم بننے کے خواب دیکھنے لگی ہے۔ لیکن ہم چونکہ بہت دور کی سوچتے ہیں اس لئے کسی بازاری عورت کو محل سرا میں لے جانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے' اس کے بعد نواب نے میرا پانچ ہزار روپیہ مہینہ باندھ دیا۔ میرے دل کو ٹھیس سی لگی۔ مگر بہرحال میں خاندانی قسم کی بازاری عورت تھی، مصلحت کوشی اور عدم جذباتیت ہماری گھٹی میں پڑی ہوتی ہے اس لئے خاموشی سے اس چوٹ کو سہہ گئی۔

"ظاہر ہے کہ بچی کی پیدائش تک میں اس چوٹ کو بھولی نہیں تھی۔ چنانچہ میں بچی نواب کو دینے کے سلسلے میں ٹال مٹول سے کام لیتی رہی۔ حتیٰ کہ کچھ عرصے بعد نواب نہ جانے وکیو چکروں میں اپنی جاگیروں پر ہی الجھ کر رہ گیا اور ایک طویل مدت تک بمبئی نہ آیا۔"

"کئی سال بعد اس کی بمبئی آمدورفت شروع ہوئی تو میرے بجائے اس نے کسی اور نوخیز سی لڑکی سے تعلق استوار کرلیا۔ مجھے بھی اب اس کی کوئی خاص پروا نہیں تھی۔ میں اس عرصے میں نہ جانے کہاں سے کہاں تک پہنچ چکی تھی ..... میں تمہیں مختصراً" یہ قصہ سنائے دے رہی ہوں ..... انہی حالات میں بالاخر میرے بطن سے جنم لینے والی نواب کی بچی جوان ہوگئی۔

"میں نے اس کی پرورش اور تربیت اسی طرح کی تھی جس طرح ایسی ایک بچی کی ہوسکتی ہے۔ اس کے جوان ہوتے ہی میں نے اس سے مجرا کرانا شروع کردیا۔ لڑکی کی شکل و صورت جوانی کے رنگ روپ کے باوجود کوئی خاص نہیں تھی اور کوٹھے پر بڑے پائے کے حسن پرستوں کا آنا جانا تھا۔ اس لئے دوسری لڑکیوں کے مقابلے میں اسے کوئی خاص توجہ نہیں ملتی تھی۔ لیکن جب میں جان بوجھ کر باتوں باتوں میں انہیں بتاتی تھی کہ یہ نواب شرافت علی کی بیٹی ہے تو تماش بینوں کو اس سے کچھ دلچسپی محسوس ہونے لگتی تھی"۔

"تماش بینوں میں نواب کے ہم عصر بھی ہوتے تھے اس کا کوئی شناسا بھی ہوتا' کوئی اس سے حسد رکھنے والا بھی ہوتا تھا۔ یہ بات نواب کے کانوں تک بھی پہنچنے لگی کہ بعض لوگ اس کے تذکرے پر ناک بھوں بڑھا کر کہتے ہیں' اچھا وہی نواب شرافت علی خان جس کی ایک لڑکی فارس روڈ کے ایک کوٹھے پر ناچتی ہے' تم اندازہ کرسکتی ہو کہ نواب کا کیا حال ہوتا ہوگا۔ وہ اولین فرصت میں میرے پاس دوڑا آیا۔"

"لڑکی لینے کے لئے اس نے شرافت' دھونس دھمکی' لالچ سارے ہی ہتھکنڈے آزمائے مگر میں بھی نہ جانے کیوں کچھ زیادہ ہی ضد پر اڑی رہی۔ میں نے لڑکی اس کے حوالے نہیں کی۔ بالاخر اس نے وہی جاگیردارانہ حربہ استعمال کیا یعنی آٹھ دس مسلح آدمی بھیجے اور لڑکی کو اٹھوا لیا۔ انگریزوں سے اس کے بہت ہی گہرے تعلقات ہیں لیکن ان سے تعلقات ہمارے بھی کچھ برے نہیں اور پھر انگریز میں جہاں بہت سی برائیاں ہیں وہاں بہت سی خوبیاں بھی ہیں۔ یہ میرا ذاتی مشاہدہ ہے عام آدمی کا تجربہ شاید مختلف ہو مگر میں نے دیکھا ہے کہ انگریز اس طرح کی کھلم کھلا غنڈہ گردی کو پسند نہیں کرتا' خواہ اس کا مظاہرہ اس کے دوستوں اور ہندوستان کے غداروں کی طرف سے ہی ہو۔ بس تو پھر ہم نے بھی کچھ ڈوریاں ہلائیں۔ چھٹے دن لڑکی نواب کی جاگیر سے برآمد ہوگئی اور دوبارہ یہاں پہنچ گئی۔

"اس کے بعد نواب کافی عرصے کے لئے ٹھنڈا پڑگیا لیکن کل اچانک نواب کا پیغام ملا

کہ وہ لڑکی کے سلسلے میں مجھ سے ایک نہایت عمدہ سودا کرنا چاہتا ہے' اور میں کم سے کم اس سے ملوں ضرور..... اسے یقین ہے کہ میرے منہ میں پانی آجائے گا۔ مجھے تجسس ہوا کہ کم از کم مل کر تو دیکھ ہی لوں۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ اس دوران میں اس لڑکی سے خاصی بیزار ہوچکی تھی۔ کیونکہ ایک تو اس کی وجہ سے مجھے کوئی خاص مالی فائدہ نہیں ہوا' دوسرے وہ خود یہاں اکھڑی اکھڑی سی رہنے لگی تھی۔ جب سے وہ باپ کی جاگیر ہو کر آئی تھی۔ خود کو ہی اس کی واحد مالک سمجھنے لگی تھی۔"

"میں نے اسے سمجھایا کہ نوابوں اور جاگیرداروں کی ہم جیسی عورتوں سے جو اولادیں ہوتی ہیں انہیں وہ محض اپنی ناک رکھنے کے لئے اپنی حویلیوں میں لے جاتے ہیں۔ لیکن حقیقتاً" انہیں اس اولاد سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوتی اور نہ ہی وہ انہیں اپنی دولت و جائیداد میں سے کوئی حصہ دیتے ہیں۔ یہ بچے ان کی محل سراؤں میں یتیموں کی طرح پرورش پاتے ہیں۔ لیکن میرے اس سمجھانے بجھانے کا لڑکی پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ اس طرح ہم دونوں کے درمیان خلیج سی حائل ہوچکی تھی۔ چنانچہ میں نواب سے ملنے چلی گئی۔"

"ناشتے کی میز پر نواب نے مجھے تمہاری صورت دکھائی بعد میں تمہاری کہانی سنائی اور پیشکش کی کہ اگر میں تمہیں اپنے کوٹھے کے لئے اس کی بیٹی کے متبادل کے طور پر قبول کرلوں تو وہ بے حد احسان مند ہوگا اور ساتھ ایک لاکھ روپیہ بھی دے گا۔ شاید یہ میری عمر کا تقاضا تھا یا پھر نواب کی بیٹی سے بیزاری کا نتیجہ تھا کہ میں اس پیشکش کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور ہوگئی۔ اور پھر سچی بات تو یہ ہے کہ تمہارے حسن نے میری آنکھیں خیرہ کرکے رکھ دی تھیں۔ اس گوہر جان کی آنکھیں جس نے خود اپنے زمانے میں نہ جانے کتنی آنکھوں کو پتھر کیا تھا۔ کتنے دلوں کو دھڑکنا بھلا دیا تھا کتنی متکبر پیشانیوں کو اپنی دہلیز پر جھکایا تھا۔ اس گوہر جان کی آنکھیں جو برسوں اس بازار کی بے تاج ملکہ رہی جہاں پورے ہندوستان سے بہترین ترشے ہوئے ہیرے کسی نہ کسی طریقے سے لا کر جمع کئے جاتے ہیں۔ اس گوہر جان کی آنکھیں تمہیں دیکھ کر چند لمحے کے لئے جھپکنا بھول گئی تھیں۔"

"بظاہر میں تم سے بڑی بے نیازی برت رہی تھی لیکن اب میں تمہارے سامنے یہ اعتراف کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتی کہ اس وقت درحقیقت میری دھڑکنیں یک لخت تیز ہوگئی تھی۔ چشم تصور میں میں نے دیکھا کہ یہ ہیرا جب تراش خراش کے بعد میرے بالا خانے کی زینت بنے گا تو کیا کیا قیامتیں بپا ہوں گی۔ نواب نے بڑی دیانت داری سے بتا دیا تھا کہ تم دو بچوں کی ماں ہو لیکن اب بھی تم اس بازار کی تمام لڑکیوں سے بہتر ہو۔ گوہر جان کی پیشگوئی ہے کہ تم اس بازار کی تاریخ کا ایک اہم باب رقم کرو گی۔ امید ہے اب تم سب کچھ سمجھ گئی ہوگی یا کچھ پوچھنے کی ضرورت باقی ہے؟

میں اب تک گویا سماعت کا سمندر بنی بیٹھی تھی' جس میں گوہر جان کی گفتگو کا

لفظ قطرہ قطرہ بن کر ضم ہوتا جا رہا تھا۔ اور جیسے میں یک لخت انسانی قالب میں آگئی۔ اس کے باوجود کئی لمحے تک میں کچھ نہ بول پائی۔ میری مٹھیاں بھنچ گئی تھیں' نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا ہوا تھا اور جسم کا تمام خون گویا کنپٹیوں میں جمع ہوگیا تھا۔

"گوہر جان!" بالآخر میرے حلق سے آواز نکلی اور مجھے اس پر کسی زخمی درندے کی غراہٹ کا گمان ہوا۔ "تم دو انسانوں کے تبادلے کا ذکر یوں کر رہی ہو جیسے غلطی سے تم کوئی خراب جوتی خرید لائی تھیں اور اب وہ تم دکاندار کو واپس کرکے اچھی جوتی لے آئی ہو۔ نواب کی لڑکی بے شک ناجائز تھی لیکن اس نے جنم تو تمہاری کوکھ سے لیا تھا۔ اسے پال پوس کر یوں ایک جنس ناقص کی طرح نواب کے حوالے کرتے وقت تمہارا دل ذرا بھی نہیں دکھا تھا؟"

"اگر ہم جیسی عورتیں اس قسم کے دکھ سینے میں پالنے لگیں تو ہم اور عام عورتوں میں فرق رفتہ رفتہ مٹ جائے گا۔" گوہر جان نے پرسکون لہجے میں کہا اور ہولڈر میں دوسرا سگریٹ لگانے لگی۔ سگریٹ سلگا کر اس نے صوفے پر پہلو بدلا اور ایک گہرا کش لے کر بولی۔ "جذباتیت ہماری سب سے بڑی دشمن ہے۔"

دوسری بات یہ میں نے پہلے سے ہی لہجے میں کہا "کہ تم نے کیسے فرض کرلیا کہ میں وہی کچھ بن جاؤں گی جو تم مجھے بنانا چاہوگی؟"

"تمہیں بننا پڑے گا میری جان" اس نے قدرے اضطراب سے پہلو بدل کرکہا۔ سگریٹ ہولڈر اس نے دو تین مرتبہ ایک سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کیا۔ پھر اپنے مخصوص انداز میں پرسکون ہوکر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "اس لئے کہ تمہارے سامنے کوئی دوسرا راستہ تو کیا' واپس جانے کی بھی کوئی راہ نہیں ہے"؟ اس نے نیم وا آنکھوں سے براہ راست میری آنکھوں میں جھانکا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پلکیں جھپکائے بغیر اسے گھورتی رہی۔

"میں بہت مہربان عورت ہوں" چند لمحے کے توقف کے بعد اس نے دھیمے سے لہجے میں کہا' "ظلم اور زبردستی کی میں قائل نہیں' میں عموماً" انسانوں سے کوئی ایسے کام صرف دلیل کے سہارے کروا لیتی ہوں جن کے لئے بعض لوگ طاقت استعمال کرتے ہیں' جبرو تشدد کرتے ہیں اور پھر ناکام رہتے ہیں۔ بہرحال....."

وہ اچانک اٹھ کھڑی ہوئی۔ "اس موضوع پر بات کرنے کی مجھے کوئی جلدی نہیں' کوئی بے صبری نہیں۔ اور تم بھی ابھی سے اپنے ذہن کو مت تھکاؤ۔ اعصاب پر بوجھ مت ڈالو۔ آرام سے رہو' کھاؤ پیو' اپنی مرضی سے سوؤ' اپنی مرضی سے جاگو' ذہن سے ماضی کی خراشیں مٹنے دو' ہر مسئلے کے بارے میں سوچنے کا ایک وقت ہوتا ہے اور میرے خیال میں اس موضوع پر سرکھپانے کا ابھی وقت نہیں آیا۔ خدا حافظ۔" دوسرے ہی لمحے وہ کمرے سے جاچکی تھی' صرف اس کے بالوں میں رچی ہوئی خوشبو کا ہلکا سا اثر یا پھر اس کے سگریٹ

کے دھویں کے کچھ لہریئے کمرے میں چکراتے رہ گئے۔

میں اپنی جگہ سن بیٹھی رہ گئی۔ تقدیر کی اس مسلسل ستم ظریفی پر میرا ہنسنے کو بھی جی چاہتا تھا کہ گڑھے سے نکلتی تھی۔ تو کھائی میں جاگرتی تھی' اور کھائی سے جوں توں کرکے نکلتی تھی تو دلدل میری منتظر ہوتی تھی۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ آخر میں کس گناہ کی پاداش میں مسلسل قدرت کی نامہرباں گرفت میں تھی۔

مجھے اب جس تازہ صورت حال کا سامنا تھا اس کے بارے میں جتنا زیادہ سوچتی تھی اتنا ہی دل ڈوبتا تھا۔ پھر میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ یہاں کوئی تیری ڈھارس بندھانے تو نہیں آئے گا' تجھے راہ سجھانے نہیں آئے گا' تو خود ہی اپنی مشیر ہے اور تجھے جو کچھ کرنا ہے' صرف اپنے ہی ذہن کی مدد سے کرنا ہے تو پھر اپنے آپ کو بدحواس کرنے اور ہاتھ پاؤں چھوڑنے کا کیا فائدہ؟ تجھے کوئی راہ فرار تلاش کرنا ہوگی۔ میں سوچتی رہی۔ رات گئے تک سوچتی رہی۔

آدھی رات کے قریب جبکہ میرے کمرے پر موت کا سکوت طاری تھا اور یقیناً" باہر کی دنیا بھی اسی طرح سناٹے میں ڈوبی ہوئی تھی' میں پلنگ سے اٹھی اور اس دروازے پر پہنچی جس پر دستک دینے سے بوڑھی خادمہ آن حاضر ہوتی تھی۔ میں نے دروازے پر محض ایک انگلی سے نہایت آہستگی سے ٹک ٹک کی۔ مجھے امید نہیں تھی کہ رات کے اس پہر اتنی مدھم سی دستک وہ بڑھیا سن سکے گی لیکن اس سے زیادہ بلند دستک دینے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔

بڑھیا کے جسم میں شاید کوئی شیطانی روح بستی تھی جو ہروقت بیدار رہتی تھی۔ اتنی خفیف سی دستک کے باوجود مجھے مایوسی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ دوسرے ہی لمحے کمرے میں سلیپروں کی کھسر کھسر کی آواز سنائی دی اور میں سنبھل کر دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہوگئی۔ میرے ہاتھوں میں دوپٹہ تھا جسے میں نے پھندے کی شکل دے رکھی تھی۔

دروازہ کھلا اور بڑھیا اپنی جھونک میں تیزی سے اندر آئی۔ جو کام میں کرنے جا رہی تھی اس قسم کے کام کا مجھے کوئی تجربہ نہیں تھا لیکن اس وقت میرے سینے میں اس پنچھی کی روح پھڑپھڑا رہی تھی جو جال کو اپنے سر پر اٹھا کر اڑ جانا چاہتا ہو۔ اسی روح کا کمال تھا کہ جب میں نے بڑھیا کی طرف پھندا اچھالا تو وہ سیدھا اس کی گردن میں جاپڑا۔ دوسرے ہی لمحے وہ فرش پر چت ہوچکی تھی۔ میں نے اس کے سینے پر گھٹنے رکھ کر سب سے پہلے اسی دوپٹے کا کچھ حصہ اس کے منہ میں ٹھونسا اور اسے گرہ دے کر باقی حصے سے اس کے ہاتھ پشت پر باندھ دیئے۔ بڑھیا بظاہر سوکھی سی تھی لیکن تھی سخت جان۔ بری طرح فرش پر گرنے اور قابو ہونے کے باوجود بری طرح لاتیں چلا رہی تھی۔

مجبوراً" میں نے بستر کی موٹی سی رسی بنا کر بڑھیا کی ٹانگیں بھی باندھ دیں۔ اب میں

نے تمہیں اٹھا کر کندھے سے لگایا اس خوف سے میرا دل لرز رہا تھا کہ تم جاگ نہ اٹھو لیکن یہ دیکھ کر مجھے قدرے اطمینان ہوا کہ تم گہری نیند میں تھے۔

میں دبے پاؤں بڑھیا کے کمرے میں داخل ہوئی بڑھیا کو جب مکان سے باہر جانا ہوتا تھا تب بھی پہلے اپنے کمرے ہی کی طرف جاتی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ ادھر آمدورفت کا کوئی راستہ موجود تھا اسی امید پر میں نے یہ قدم اٹھایا تھا۔

بڑھیا کے کمرے میں روشنی تھی۔ اندر کی طرف سے اس کے دروازے کی کنڈی چڑھی ہوئی تھی۔ نہایت احتیاط سے میں نے کنڈی کھولی اور باہر جھانکا۔ دروازے نے جیسے چند خاص قسم کی مدہم مدہم آوازوں کے دھارے کو باہر ہی روکا ہوا تھا دروازہ کھلتے ہی جیسے مجھ پر ان آوازوں کی ہلکی سی پھوار پڑی۔

یہ آوازیں طبلے کی کھنک' سارنگی کی دکھی سی لے' گھنگھروں کی جھنکار اور ہارمونیم کے زیرو بم کی تھیں۔ مگر شاید کہیں بہت دور سے محض ایک بازگشت کی طرح سنائی دے رہی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ زندگی ابھی اس علاقے میں بیدار تھی۔ اور جیسا کہ مجھے معلوم ہوچکا تھا یہ فارس روڈ کا علاقہ تھا تو اس صورت میں میرے لئے یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ یہ تو میں سن ہی چکی تھی کہ اس جہان نغمہ و جھنکار کی راتیں جاگتی ہیں اور دن سوتے ہیں۔

میرے لئے باعث اطمینان امر تو یہ تھا کہ اس وقت وہ طویل و عریض مکان سکوت اور نیم تاریکی میں لپٹا ہوا تھا۔ کمرے کے دروازے سے نکل کر میں بالکونی میں پہنچ گئی مگر اس لحاظ سے یہ بالکونی عجیب تھی کہ اس کی دیوار انسانی قد سے بھی اونچی تھی۔

اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق میں نے سمت کا تعین کرنے کی کوشش کی اور دیوار کے ساتھ ساتھ بائیں طرف چل دی۔ میرے دائیں ہاتھ پر ایک کشادہ سی راہداری نظر آئی۔ اس کے اختتام پر دیوار میں ایک بڑا سا ہک نما ہولڈر نصب تھا۔ جس میں ایک بڑا سا بلب جھول رہا تھا۔ مگر وہ اتنا میلا تھا کہ اس کی روشنی ایک چراغ کے برابر رہ گئی تھی۔

میں تقریباً" دوڑتی ہوئی اس راہداری کے سرے تک پہنچی اور تب میں نے دیکھا کہ میں بہت بڑے دائرے میں پھیلی ہوئی اس جنگلے دار بالکونی میں کھڑی ہوں جس سے نیچے جھانکنے پر یہ مکان ایک بہت بڑے کنویں سے مشابہ نظر آتا تھا۔ یہاں سے اس کی ساخت میرے لئے کافی حد تک ناقابل فہم تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ اگر میں اس گول بالکونی میں چلنا شروع کر دوں تو بائیں ہاتھ پر پڑنے والے کسی بھی زینے سے نیچے پہنچ سکتی ہوں۔ اور غنیمت یہ تھا کہ اس وقت بائیں ہاتھ پر کمروں کی قطار تاریکی میں ڈوبی نظر آرہی تھی۔

میں نے پنجوں کے بل بالکونی میں لمبے لمبے ڈگ بھرنے شروع کیے۔ پانچ چھ کمروں کے سامنے سے گزرتے ہی بائیں ہاتھ پر مجھے سیڑھیاں نظر آگئیں۔ ٹانگوں کی کپکپاہٹ پر

قابو رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے میں سیڑھیاں اترنے لگی تینوں منزلوں کی سیڑھیاں میں بخیروعافیت اتر آئی۔ سیڑھیوں کے اختتام پر گول صحن کے باہر سامنے ہی مجھے صدر دروازہ نظر آگیا گو کہ وہاں بہت کم روشنی تھی۔

میں لپک کر دروازے تک پہنچی مگر یہ دیکھ کر میرا دل ڈوب گیا کہ لوہے کی بھاری سی زنجیر دار کنڈی میں موٹا سا تالا لٹکا ہوا تھا۔ میں حسرت سے اس تالے کو چھو کر دیکھ رہی تھی کہ کہیں قریب ہی سے سرگوشی سی سنائی دی۔ "باہر جانا ہے"؟

میں اس طرح خوف زدہ ہوکر اچھلی کہ تم کسمسا اٹھے لیکن میں نے اضطراری طور پر تمہیں جلدی سے تھپک کر دوبارہ کندھے سے لگایا۔ سرگوشی سے اندازہ نہیں ہوسکا تھا کہ آواز عورت کی تھی یا مرد کی۔ میں نے ہراساں نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ میرے دائیں ہاتھ پر گہرا اندھیرا تھا۔ اس اندھیرے نے اپنے شکم سے ایک انسانی وجود اگل دیا۔ کھڑے پاجامے ڈھیلے ڈھالے سفید کرتے اور واسکٹ میں ملبوس یہ ایک دراز قد اور قوی الجثہ مرد تھا۔ اس کے سر پر سیاہ مخملی ٹوپی تھی اور قدرے پھیلی ہوئی سی ناک تلے مونچھیں بل کھا کر یوں اٹھی ہوئی تھیں جیسے دو بچھو آمنے سامنے برہم کھڑے ہوں۔

"باہر جانا ہے"؟ اس نے دوبارہ اسی سرگوشی میں پوچھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اسی طرح بیٹھی بیٹھی سی آواز میں بات کرنے کا عادی ہے۔ "گھبراؤ مت میرے پاس چابی ہے۔" اس کے لہجے میں راز داری تھی۔ جیسے کسی نامعلوم وجہ کی بناء پر اسے مجھ سے ہمدردی ہو۔ پھر اس نے میرے جواب کا انتظار کئے بغیر واسکٹ کی جیب سے چابیوں کا ایک گچھا نکالا اور اس میں سے ایک چابی منتخب کرکے تالا کھول دیا۔

میں تب بھی اپنی جگہ سے نہ ہلی تو اس نے خود آگے ہوکر دروازہ چوپٹ کھول دیا اور ایک طرف کو ہٹ کر ہاتھ سے باہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "جانا چاہتی ہو تو جاؤ۔ وقت ضائع مت کرو۔"

میں اب بھی ساکت کھڑی تھی۔ شاید۔ لاشعوری طور پر میں یہ تجزیہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ یہ شخص اپنی نوازش کی کیا قیمت وصول کرنا چاہتا ہے۔ بالاخر میں اسی نتیجے پر پہنچی کہ شاید وہ بنیادی طور پر ایک خدا ترس انسان تھا اور بحیثیت نگران یا چوکیدار اسے جو مواقع میسر تھے۔ وہ مجھے ان سے فائدہ پہنچانے کی کوشش کر رہا تھا۔

میری ہچکچاہٹ دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔ "شاید راستے معلوم نہیں ہیں ؟ آؤ میں تمہیں اس علاقے سے باہر چھوڑ آؤں" وہ مجھ سے پہلے دروازے سے نکل کر آگے آگے ہولیا۔ میں نے یوں ہڑبڑا کر چوکھٹ عبور کی جیسے یک لخت مجھے احساس ہوا ہو کہ میں مزید ایک لحہ یونہی کھڑی رہی تو یہ دروازہ بند ہو جائے گا اور میں یہیں مقید رہ جاؤں گی۔

سیڑھیاں اتر کر وہ شخص کچھ دور تک روشن گلی میں چلتا رہا پھر ایک جگہ رک کر

اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ مہربان انداز میں مسکرایا اور ایک تاریک گلی میں مڑ گیا۔
"جلدی آؤ۔" میں نے تاریکی سے ایک بار پھر اس کی بیٹھی بیٹھی سی آواز سنی۔ "کوئی ہمارے تعاقب میں نہ آ نکلے"۔

ایک لمحے کے لئے میں نے تاریک گلی کے موڑ پر رک کر کچھ سوچنے کی کوشش کی لیکن پھر مجھے احساس ہوا کہ اسی وقت میرے ذہن میں کچھ سوچنے کی سکت نہیں ہے۔ میں چپ چاپ اس کے پیچھے گلی میں داخل ہوگئی۔ اپنے سفید کرتے پاجامے کی وجہ سے وہ اگر صاف نہیں تو کم از کم ایک ہیولے کی طرح مجھے ضرور نظر آرہا تھا۔

کافی دیر تک ہم یونہی تاریک گلیوں میں چکراتے رہے۔ تمہیں اٹھا کر چلتے چلتے میں ہانپنے لگی تھی۔ "شاید تم تھک گئی ہو"؟ اس نے غالباً" میرے ہانپنے کی آواز سن کر پلٹ کر کہا۔ "بہرحال وہ سڑک اب زیادہ دور نہیں جس پر تمہیں چھوڑ کر میں لوٹ آؤں گا۔" وہ اب بھی پہلے ہی کی طرح بیٹھی بیٹھی آواز میں بول رہا تھا۔

بالآخر ہم ایک ایسی گلی میں پہنچے جس کے اختتام پر ایک بلند و بالا دیوار تھی۔ دیوار میں اتنا چھوٹا سا دروازہ تھا اسے چوپٹ کھول کر بھی ایک صحت مند انسان قدرے مشکل ہی سے گزر سکتا تھا اس دروازے میں کہیں تالا نظر نہیں آرہا تھا۔ لیکن اس شخص نے ایک بار پھر اپنا چابیوں کا گچھا نکالا اور ایک چابی دروازے میں موجود ایک ننھے سے سوراخ میں داخل کر دی دوسرے ہی لمحے دروازہ کھل گیا۔ شاید یہ کسی قسم کا چور دروازہ تھا اور نہایت تنگ سی ایک گلی میں کھلتا تھا۔ جو غالباً" قدرے فراخ سڑک پر نکلتی تھی کیونکہ چند گز لمبی اس تنگ و تاریک گلی کے اختتام پر ہلکی سی روشنی نظر آرہی تھی۔

"چلو ناک کی سیدھ میں چلتی جانا"۔ اس نے ایک طرف ہٹ کر مجھے راستہ دیا۔ "بڑی سڑک پر پہنچ جاؤ گی"۔

دھڑکتے دل سے میں نے اس تنگ اور تاریک گلی میں قدم رکھا۔ اندھیرے میں دونوں طرف کی دیواریں تک دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ لیکن چند قدم چل کر جب میں کھلی جگہ میں پہنچی جہاں روشنی تھی تو یہ دیکھ کر میرے پاؤں پتھر ہوگئے کہ میں اسی کنواں نما مکان کے گول صحن میں کھڑی تھی۔ میرے عقب میں کھی کھی کی آواز ابھری۔ مڑ کر دیکھا تو وہ شخص پیٹ پکڑے ہنس ہنس کر دہرا ہو رہا تھا۔ اس کی ہنسی کی آواز بھی بیٹھی بیٹھی سی تھی چند لمحے تک میں ساکت کھڑی پلکیں جھپکائے بغیر اسے گھورتی رہی۔

بے بس سا غصہ میری شریانوں میں دوڑتے لہو کے ساتھ سمٹ کر سینے میں جمع ہوتا رہا۔ پھر یک لخت میں نے اس کے گھٹنے پر پوری طاقت سے ٹھوکر رسید کی۔ میرے پیروں میں گوہر جان کے دیئے ہوئے نہایت مضبوط اور سخت تلے کے سینڈل تھے اور میرا خیال تھا کہ میری ٹھوکر سے وہ خبیث کئی دن کے لئے لنگڑانے پر مجبور ہو جائے گا مگر اس نے اف

تک نہ کی البتہ میرا پاؤں ضرور جھنجھنا کر رہ گیا۔ عام سی جسامت کا مالک ہونے کے باوجود اس کی قوت برداشت غیر معمولی تھی۔

بہرحال اس کی "کھی کھی" ضرور تھم گئی۔ دوسرے ہی لمحے اس نے کرتے کے نیچے ہاتھ لے جاکر نہ جانے کہاں سے انگلی برابر چوڑا اور بالشت بھر سے زیادہ لمبا چم چم کرتا ایک خنجر نکالا۔ اور میری گردن پر رکھ دیا۔ میں ہڑبڑا کر پیچھے ہٹی لیکن خنجر کی نوک بدستور میرے نرخرے پر ٹکی رہی۔ دھیرے دھیرے شہ رگ پر اس کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔

"کمینی ...... حرافہ ......" اس کی بیٹھی بیٹھی سی آواز میرے کان کے قریب گونجی۔ اب یہ آواز کسی زخمی سانپ کی پھنکار سے مشابہ تھی "تو نے بن بادشاہ کے جسم کو ٹھوکر ماری ہے ...... میں تیرے جسم کا ریشہ ریشہ الگ کر دوں گا۔"

"چل اب زیادہ شیخیاں نہ بگھار۔" اچانک اوپر کہیں خاصی بلندی سے آواز آئی۔ اس آواز میں بلا کا ٹھہراؤ وقار اور تحکم تھا۔ اور میں اس آواز کو ہزاروں آوازوں میں بھی پہچان سکتی تھی۔ گو کہ یہ پل پل بدلتی تھی کبھی اس میں غضب کا ترنم ہوتا تھا کبھی کمال کی جھنکار' کبھی تپش' کبھی ٹھنڈ' کبھی ٹھہراؤ' کبھی بہاؤ' میں نے گنتی کی مختصر سی ملاقاتوں میں اس آواز کے ان گنت نشیب و فراز محسوس کئے تھے۔ گوہر جان کی آواز تھی۔ گزشتہ روز ہی خدمت گار بڑھیا نے مجھے بتایا کہ گوہر جان نے برسوں راجوں' مہاراجوں اور نوابوں کے دل و دماغ پر جو راج کیا اس میں اس کی بے پناہ خوبصورتی ہی نہیں' اس کی بے مثال آواز کو بھی دخل تھا۔ اور مجھے بڑھیا کی اس بات پر کوئی شک نہیں تھا۔

"خنجر ہٹا اس کے گلے سے' کیوں اس کا دم خشک کر رہا ہے۔ ایک تو تیری حس مزاح بڑی ظالمانہ ہے اوپر سے خنجر پستول بھی نکال کر کھڑا ہو جاتا ہے" گوہر جان کہہ رہی تھی خنجر فوراً" ہی میری شہ رگ سے ہٹ گیا۔ میں نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ تیسری منزل کی دائرہ صورت بالکونی میں گوہر جان جنگلے پر کہنیاں ٹکائے قدرے جھکی کھڑی تھی۔ بلب گو کہ اس کے عقب میں قدرے بلندی پر دیوار میں فٹ تھا۔ لیکن میں آنکھوں کے سوا اس کے چہرے کا ہر نقش دیکھ سکتی تھی۔ اس کی انگلیوں میں اس کا مخصوص سگریٹ ہولڈر دبا ہوا تھا۔ اور اس میں موجود سلگتی سگریٹ سے دھوئیں کی ایک پتلی سی لکیر ہوا میں بلند ہوکر اوپر تاریکی میں مدغم ہوتی جا رہی تھی۔

"بن بادشاہ؟" گوہر جان نے اس مرتبہ ہلکا سا کش لے کر کہا۔ "عزیزہ خانم کو نہایت احترام سے اوپر لے آؤ۔" یہ کہہ کر وہ بالکونی سے ہٹ کر پیچھے کمرے میں داخل ہوگئی۔

"چلیے۔" بن بادشاہ نے خنجر کرتے کے نیچے کہیں چھپا کر مودبانہ انداز میں جھکتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا۔ اس کا لہجہ یکسر بدل چکا تھا۔

اوپر لاکر اس نے مجھے اسی کمرے کے دروازے پر چھوڑا جس کے راستے پہلی مرتبہ میں گوہر جان کے ساتھ اندر پہنچی تھی۔ دروازہ کھلا تھا اور چوکھٹ کے پیچھے خدمت گار بڑھیا میرے استقبال کے لئے کھڑی تھی جسے میں باندھ کر فرش پر لٹا آئی تھی۔ اس کا چہرہ قطعی پرسکون اور ہر تاثر سے عاری تھا۔ گویا کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ خاموشی سے اس نے مجھے اندر چلنے کا اشارہ کیا۔

میں ایک بار پھر اسی کمرے میں پہنچ گئی جہاں سے چلی تھی۔ بیڈ کے قریب کرسی پر گوہر جان ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھی تھی۔ نیم وا آنکھوں سے اس نے میری طرف دیکھا اور سگریٹ کا ہلکا سا کش لیتے ہوئے بولی۔ "بچے کو بیڈ پر لٹا دو۔ بازو تھک گیا ہوگا تمہارا۔"

اس کا لہجہ قطعی رسمی سا تھا۔ اس میں برہمی۔ خفگی' ہمدردی یا حقارت' غرض یہ کہ کسی بھی جذبے کی کوئی جھلک نہیں تھی۔ اس عورت کے اس رویے سے واقعی مجھے خوف آنے لگا تھا۔ نہ جانے وہ کس قسم کا ذہن رکھتی تھی۔ کیا سوچتی تھی۔ کیا چاہتی تھی۔ اس کے متعلق کچھ بھی کہنا مشکل تھا۔

میں تمہیں بیڈ پر لٹا چکی تو گوہر جان نے مشفقانہ سے انداز میں میرے کندھے پر ہلکی سے تھپکی دی اور ملائمت سے کہا۔ "اب تم بھی سو جاؤ' رات خاصی بیت گئی ہے۔ اپنے دل و دماغ کو پرسکون رکھنے کی کوشش کرو۔" پھر اس نے سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر میری طرف دیکھے بغیر شب بخیر کہا اور کمرے سے رخصت ہوگئی۔ بڑھیا بھی نہایت خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی گئی اور درمیانی دروازہ بے آواز طریقے سے بند ہوگیا۔

کسی نے میرے فرار کی اس ناکام کوشش پر سرزنش نہیں کی تھی لیکن سرزنش کے بعد شاید میری یہ کیفیت نہ ہوتی جو اس وقت تھی۔ احساس بے بسی جھنجلاہٹ' غصے اور نہ جانے کس کس جذبے نے اعصاب کو توڑ کر رکھ دیا۔ میں تمہارے قریب ہی بیڈ پر ڈھیر ہوگئی۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ روتے روتے میں نے دھندلائی ہوئی آنکھوں سے تمہاری طرف دیکھا تم اپنے چہرے پر فرشتوں کی سی معصومیت لئے دنیا و مافیہا سے بے خبر آڑے ترچھے پڑے سو رہے تھے۔ تمہارے ہونٹ نیم وا تھے۔ اور سانسوں کی ہلکی سی خرخراہٹ کے ساتھ نہایت غیر محسوس طور پر ہل رہے تھے۔

اس وقت تمہاری صورت دیکھ کر نہ جانے کیوں مریم مجھے اتنی شدت سے یاد آئی کہ میرا کلیجہ شق ہونے لگا۔ میری بچی نہ جانے کس حال میں تھی' کہاں تھی اور نہ جانے کوئی اس کی نگہداشت بھی کر رہا تھا کہ نہیں۔ مریم سے جدائی کا صدمہ اس لمحے مجھے ان تمام مصائب و الام اور تکالیف پر بھی بھاری محسوس ہوا۔ جو میں اپنی اب تک زندگی میں اٹھا چکی تھی میرا جی چاہا کہ چیخ چیخ کر روؤں۔ دیواروں سے سر ٹکراؤں' شاید اس طرح میری تکلیف میں کچھ کمی ہو مگر اس لمحے میرا ذہن دھیرے دھیرے تاریکی میں ڈوبنے لگا۔ شاید

صدمات' محسوسات اور سوچوں کا بوجھ ذہن کی برداشت سے باہر ہوگیا تھا۔ شاید دماغ کی نسیں تھک گئی تھیں۔ یہ بے خبری اور بے ہوشی اس وقت بہت غنیمت تھی۔ اندھیرے کی آغوش میں پناہ مل جانے سے کم از کم وقتی طور پر زخمی کی اذیت ٹل گئی۔

دوسری صبح دن چڑھے آنکھ کھلی اعصاب پر ایک عجیب سی تھکن طاری تھی گزری ہوئی رات ایک دھندلے خواب کی طرح یاد رہ گئی تھی۔ مریم کا تصور البتہ اب بھی کند چھری کی طرح دل میں پیوست تھا لیکن میں اس کی اذیت کو بھلائے رکھنے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔ دراصل اب میں اپنے شب و روز کا آغاز ایک نئے زاویئے اور نئے حوصلے سے کرنا چاہتی تھی۔ مجھے معلوم ہوگیا تھا کہ اپنی کمزوریوں کا اظہار کرتے رہنے یا اپنے زخموں سے کھیلتے رہنے سے حالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ مجھے اب سب سے پہلی کوشش یہ کرنی تھی کہ میرا جسم و روح کمزور نہ ہونے پائے تاکہ میں صحیح طور پر سوچ بھی سکوں اور اگر کسی فیصلے پر پہنچوں تو اس پر عملدرآمد کے قابل بھی رہوں۔

اس نتیجے پر پہنچ کر میں نے بظاہر اپنے آپ کو بے حد پرسکون بنالیا۔ گوہر جان نے تین چار دن تو میری اس تبدیلی اور پرسکون انداز و اطوار کو شک آلود نظروں سے دیکھا۔ پھر وہ حسب عادت لاپرواہ نظر آنے لگی۔ پھر ایک روز وہ میرے کمرے میں آئی تو اس کے ساتھ ایک عجیب الخلقت سا شخص بھی تھا۔

عمر اس کی پچاس کے قریب ہوگی۔ غیر معمولی طور پر اونچا لیکن ہڈیوں پر محض کھال چڑھی ہوئی گوشت کا نام و نشان نہیں۔ رنگت الٹے توے جیسی مگر باچھوں سے چھلکتی پان کی پیک کی وجہ سے دہانہ خون کی طرح سرخ نظر آرہا تھا۔ سر پر پھولدار ریشمی کپڑے کی چھوٹی سی گول ٹوپی تھی۔ جس کے نیچے سے کھچڑی بالوں کی لمبی لمبی چکنی لٹیں کندھوں پر جھول رہی تھیں۔ یہ شخص چست ریشمی قمیض اور چوڑی دار پاجامہ پہنے ہوئے تھا جو اس کی ہرن جیسی سوکھی سوکھی ٹانگوں پر گویا منڈھا ہوا تھا پاؤں میں سیاہ مخمل کی سلیم شاہی جوتی تھی۔ اس نے اپنی کلائی بڑے اہتمام سے آگے کو بڑھائی ہوئی تھی اور اس پر پان رکھنے کا ایک بڑا سا رنگ برنگا ریشمی بٹوا جھول رہا تھا۔ جس کے لمبے لمبے پھند نے ہر جنبش پر قدم کے ساتھ لہرا رہے تھے۔ اس کی چال میں غضب کی لچک مٹک تھی۔

میں اس وقت بیڈ پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی اور تم اپنے کھلونوں سے کھیل رہے تھے۔ بانس کی طرح لمبا وہ سیاہ فام شخص گوہر جان کو پیچھے چھوڑ کر لچکتا مٹکتا میرے قریب آیا اور یوں جھک گیا گویا سیدھے کھڑے ہوکر اسے میری صورت دیکھنے میں دشواری پیش آرہی ہو۔ اس کے آتے ہی کمرہ چنبیلی کی خوشبو سے بھر گیا تھا۔ اب مجھے اندازہ ہوا کہ اس نے لباس شاید چنبیلی کے عطر میں ڈبو کر پہن رکھا تھا۔

"ماشاء اللہ۔ ماشاء اللہ چشم بدور۔" اس نے نہایت پاٹ دار آواز میں کہا جو اس

کے منحنی جسم سے ہرگز میل نہیں کھاتی تھی۔ ہیرا ہے ہیرا گوہر بائی۔ اس نے سیدھے ہوکر گوہر جان کو مخاطب کیا پھر گہری سانس لے کر کہا۔ "آج تک تم نے اتنی لڑکیوں کو نچایا لیکن تمہارے بھاگ صحیح معنوں میں آج کھلے ہیں۔"

گوہر جان طمانیت اور خاکساری سے مسکرائی گویا اسے بھی عمر بھر کی کسی ریاضت کا صلہ مل گیا ہو۔ لمبا مجہول شخص میرے بیڈ کے قریب سے ہٹ کر طویل و عریض کمرے کے ایک حصے میں بچھے ہوئے اور چاندنی سے ڈھکے ہوئے فرش کی طرف بڑھ گیا۔ چاندنی پر دیوار کے ساتھ کئی گاؤ تکیے بھی لگے ہوئے تھے اس نے بڑی نزاکت سے اپنی سیاہ مخمل کی سلیم شاہی جوتی اتاری اور ایک گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھتے ہوئے اپنا بٹوہ کلائی سے اتارا۔ اس کے پھند نے نہایت نفاست سے یوں موڑے گویا کپڑا تہہ کر رہا ہو۔ پھر بٹوے کو اپنے قریب رکھ کر دوزانو ہوکر بیٹھ گیا۔

میں اپنی حیرت کو چھپائے اس کی حرکات و سکنات دیکھ رہی تھی گوہر جان بھی آج معمول سے کچھ زیادہ ہار سنگھار کئے ہوئے تھی گویا کسی تقریب میں جانے کی تیاری کر کے آئی ہو۔ وہ پلٹ کر دروازے تک آئی اور نہ جانے کس کو کوئی اشارہ کر کے لوٹ آئی۔ اس کے پیچھے پیچھے ہی دو ملازم کمرے میں داخل ہوئے ایک نے بڑا منقش قسم کا ہارمونیم اٹھا رکھا تھا اور دوسرا لڈوؤں سے بھرا ہوا ایک نقرئی تھال اٹھائے ہوئے تھا۔ لڈوؤں کے اردگرد گلاب اور چنبیلی کی پتیوں کا ایک موٹا سا دائرہ تھا۔

ملازموں نے یہ دونوں چیزیں اس مجہول شخص کے سامنے رکھ دیں اور خود خاموشی سے الٹے قدموں لوٹ گئے۔ مجہول شخص نے اپنے انگرکھے کی جیب سے ایک ریشمی رومال نکالا اور اتنی محبت سے ہارمونیم سے کوئی غیر مرئی گرد صاف کرنے لگا جیسے کوئی ماں اپنے بچے کے رخسار پونچھ رہی ہو۔

"بہت کم ایسا ہوتا ہے۔" گوہر جان نے میرے قریب پہنچتے ہوئے یوں مخاطب کیا گویا وہ بہت دیر سے مجھ سے مصروف گفتگو تھی۔ درمیان کسی وجہ سے ذرا دیر کو سلسلہ کلام ٹوٹ گیا تھا اور اب وہ اسے وہیں سے جوڑ رہی ہے۔ "کہ کوئی شخص رقص اور موسیقی دونوں میں بیک وقت کمال حاصل کرے اور استاد کے درجے کو پہنچے۔ حالانکہ دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے مگر رقاص کو صرف سروں کا علم ہوتا ہے وہ خود گا نہیں سکتا اور گانے کے استاد نرت بھاؤ سمجھتے ہیں مگر خود نرت بھاؤ بتا نہیں سکتے۔ لیکن جو اپنے استاد فتح باب خان انبالے والے ہیں۔ انہوں نے دونوں فنون میں کمال حاصل کیا ہے۔"

"تو پھر میں کیا کروں؟" میں نے اکھڑے اکھڑے لہجے میں کہا۔

تم اپنی خوش نصیبی پر فخر کرو کہ تمہیں ان کی شاگردی میں دے رہی ہوں۔" گوہر جان نے نہایت اطمینان سے کہا اور میرا ہاتھ تھام کر اٹھاتے ہوئے بولی "اگر تم چند سال

"لا حول ولا ..... لا حول ولا ....." استاد محترم بڑبڑائے اور رومال سے منہ صاف کرنے لگے تاہم ان کے صبر و سکون میں کوئی فرق نہ آیا۔ منہ صاف کرتے ہی دوبارہ ہارمونیم پر سر ملانے لگتے گویا کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ میرا ارادہ ہارمونیم کو بھی لات مارنے کا تھا۔ لیکن وہ خاصا وزنی نظر آرہا تھا اور اندیشہ تھا کہ میں اپنا پاؤں نہ تڑوا بیٹھوں' اس لئے اپنے آپ پر ضبط کرکے گوہر جان کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر زلزلے کے سے آثار نمودار ہو رہے تھے۔

"گستاخ لڑکی!" اس کے حلق سے جو آواز نکلی اسے سن کر میری عمر کی عورت شاید تھرا اٹھتی بشرطیکہ اس نے مجھ جتنی مصیبتیں نہ جھیلی ہوتیں۔ وہ نہ جانے کس ارادے سے مٹھیاں بھینچ کر میری طرف بڑھی لیکن اس کے مجھ تک پہنچنے سے پہلے وہ مجہول شخص' استاد فتحیاب خان ناقابل یقین پھرتی سے گویا رقص کا کوئی زاویہ بناتے ہوئے اٹھا اور اس نے انگرکھے کی ریشمی آستین میں ملفوف لمبا سا استخوانی بازو ہم دونوں کے درمیان حائل کر دیا۔

"دھیرج گوہر جان .... دھیرج" وہ گنگنانے کے سے انداز میں بولا۔ "اچھی نسل کی گھوڑی اور مستقبل کی اعلیٰ بازاری عورت شروع شروع میں بڑی منہ زور ہوتی ہے۔ تمہیں یاد نہیں مطربہ نے کیسا طوفان مچایا تھا؟ ہارمونیم کے ٹکڑے کر دیئے تھے۔ پردے پھاڑ دیئے تھے اور حتیٰ کہ مسہری بھی نہ جانے کس طرح توڑ دی تھی۔ بعد میں کیسی سانچے میں ڈھلی تھی؟ جیسے بوتل میں پانی ..... اور ثریا کا معاملہ یاد ہے؟ وہ شیر کی بچی تو چار چار کڑیل جوانوں کے قابو میں نہیں آئی تھی اور نعیمہ خاتون اور تہذیب النساء تو کچی عمروں میں آئی تھیں اور اپنی مرضی سے آئی تھیں مگر گھنگھروں باندھتے وقت انہوں نے بھی اڑی کی تھی گو کہ باقی سب کچھ رسان سے سیکھ لیا تھا۔ گوہر جان! ہم تو سمجھے تھے اب تمہاری بردباری کی عمر شروع ہوگئی ہے مگر لگتا ہے ابھی خون ٹھنڈا نہیں پڑا۔

گوہر جان نے اپنی جگہ رک کر ایک طویل سانس لی اور جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اس کے تاثرات یک لخت معمول پر آگئے۔ "خون ٹھنڈا ہی تو پڑ گیا ہے۔ استاد محترم! تبھی تو نواب سے سودا کر لیا تھا۔ اور تبھی تمہیں یہ لڑکی یہاں اس عالم میں نظر آرہی ہے کہ کسی نے اسے اونچی آواز میں پکارا تک نہیں حالانکہ یہ ایک مرتبہ بھاگنے کی کوشش بھی کرچکی

پہلے مجھے مل گئی ہوتیں تو اب تک تمہاری تراش خراش کا عمل مکمل ہوچکا ہوتا اور تم دنیائے فن کا ایک انمول ہیرا بن چکی ہوتیں۔ بہرحال اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ استاد محترم جب کسی پر مہربان ہوتے ہیں تو دیکھتے ہی دیکھتے اس کی کایا پلٹ کر رکھ دیتے ہیں۔"

میں اس کے ساتھ اٹھ کر چاندنی تک پہنچ چکی تھی جہاں استاد محترم خاموشی سے لب ہلاتے ہوئے ایک ہاتھ ہوا میں بلند کرکے شاید کسی سر کی دل ہی دل میں مشق کرتے ہوئے انگلیوں کو بل دے رہے تھے۔

مجھے قریب آتے دیکھ کر وہ آنکھیں پوری طرح کھول کر سنبھل کر بیٹھ گئے اور ہارمونیم کو اپنے کچھ اور قریب کھینچ لیا۔ چاندنی کے قریب پہنچ کر میں رک گئی۔ گوہر جان جو اب خاصی مطمئن نظر آرہی تھی جلدی سے ہاتھ کا اشارہ دیتے ہوئے بچکارنے کے سے انداز میں بولی۔ "ہاں ..... ہاں ..... شاباش چلو دوزانو ہوکر استاد محترم کے سامنے بیٹھو تاکہ شاگردی کی رسم ادا کی جاسکے۔" "بھاڑ میں گئی تمہاری دنیا فن اور چولہے میں گئے تمہارے استاد محترم۔" میں اچانک اس بری طرح چلائی کہ گوہر جان ہڑبڑا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ میں نے لڈوؤں کے تھال کو ایک ٹھوکر رسید کی۔ کچھ لڈو اچھل کر استاد محترم کے منہ پر پڑے اور باقی ان کے عقب میں دیوار سے ٹکرا کر چاندنی پر ڈھیر ہوگئے۔





ہے۔"

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔" استاد نے بازو ہمارے درمیان سے ہٹایا۔ پھر دنیا بھر کی مٹھاس اپنے لہجے میں سمیٹتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔ "کوئی بات نہیں۔ اگر اس وقت تمہارا جی نہیں چاہ رہا تو پھر کسی دن سہی۔" اس نے اپنی ٹوپی درست کی بٹوہ اٹھا کر بازو پر لٹکایا اور اپنی مخصوص لچک مٹک کے ساتھ دروازے کی طرف چل دیا۔ گوہر جان بھی سر جھکائے اس کے ساتھ ہی چلی گئی۔

میں بیڈ کی طرف پلٹ آئی۔ تم بیڈ کا سہارا لئے کھڑے تھے اور حیرانی سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے تمہیں اٹھا کر سینے سے چمٹایا اور کمرے میں ٹہلنے لگی۔ ان حالات میں میرا ذہن تقریباً ماؤف ہوچکا تھا۔ میں جو کچھ بھی کرتی تھی۔ اچانک ہی فیصلہ کرکے کرتی تھی۔ میں اپنے حواس کو حتی الامکان مستعد رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ لیکن پھر بھی کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کوئی راستہ سجھائی نہیں دیتا تھا اور نہ ہی یہ اندازہ ہو پاتا تھا کہ میرا مستقبل کیا ہے۔

میرے لئے امید کی ایک موہوم سی کرن بس تم تھے۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کہ یہ کرن کب تک اور کیونکر میری زندگی میں اجالا کرے گی۔ بس میں لاشعوری طور پر ایک کوشش ضرور کئے جا رہی تھی کہ کسی طرح زیادہ سے زیادہ دن بے مقصد انداز میں گزرتے چلے جائیں گو کہ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ مجھے اس سے کیا فائدہ پہنچ سکتا تھا؟ کب تک یہ سلسلہ چل سکتا تھا؟ اور یہ بے مقصد دن گزارنا بھی کوئی آسان کام نہیں تھا۔ سارا دن بغیر کسی مصروفیت کے کمرے میں پڑے رہنا۔ وقت پر اپنی پسند کا کھانا کھا لینا یا کبھی کبھی بڑھیا کی معیت میں بالکونی کا چکر لگا آنا اور یوں کچھ دیر کے لئے دھوپ یا قدرتی روشنی سے محظوظ ہو لینا۔ تمہیں البتہ بڑھیا دن میں دو تین مرتبہ سیر کرانے اور کھانے پینے یا کھیلنے کی چیزیں دلوانے لے جاتی تھی اس لئے تم بہلے رہتے تھے۔

چند دن اور اسی طرح گزر گئے۔ حالات پر ایک پراسرار سی یکسانیت طاری تھی۔ آخر ایک شام گوہر جان پھر میرے کمرے میں آئی۔ آج اس کا چہرہ بناؤ سنگھار سے بے نیاز تھا۔ بال بھی کھلے تھے اور نہایت خوبصورتی سے کمر پر پھیلے ہوئے تھے۔ اس نے انگریز عورتوں والا ایک لمبا سا ڈھیلا ڈھالا جھالر دار فراک پہن رکھا تھا۔ اس سادگی کے عالم میں وہ معمول سے زیادہ تر و تازہ کم عمر اور حسین لگ رہی تھی۔ اس کی مانگ میں سفید اور سیاہ بال یوں ایک دوسرے میں مدغم تھے جیسے ڈھلتی شب کی سیاہی اور ابھرتی صبح کا اجالا گلے مل رہا ہو۔

"آخر تم بھی اپنا موقف بیان کرو ناں۔" اس نے اپنی پسندیدہ آرام دہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ میں اب اس کی عادت سمجھ گئی تھی۔ وہ اسی طرح بلا تمہید اچانک گفتگو شروع کر

دیتی تھی۔ "میں دلیل دینے اور دلیل سننے کی قائل ہوں۔ تم کچھ ڈھنگ سے بات کرو۔ شاید تم مجھے قائل کر ہی لو۔ آخر تم چاہتی کیا ہو؟"

"میں یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"کہاں جاؤ گی؟" اس نے ملائمت سے پوچھا۔

"کہیں بھی چلی جاؤں گی۔" میں نے جواب دیا۔

"یہ تو کوئی جواب نہ ہوا اور خاص کر ایک جوان اور بلا کی حسین عورت کے ہونٹوں پر تو یہ الفاظ آنے ہی نہیں چاہئیں۔ یہ ارادہ اسے کہیں کا کہیں پہنچا دیتا ہے۔"

"اس نے اپنے فراک کی تہ در تہ جیب سے اپنا سگریٹ ہولڈر اور سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور ایک سگریٹ ہولڈر میں لگا کر سلگائی۔ میں پلکیں جھپکائے بغیر اسے گھور رہی تھی۔ اس نے طویل کش لے کر دھواں میری طرف چھوڑا اور ایک لمحے کے توقف سے بولی۔۔۔

"شاید تمہیں خوش فہمی ہے کہ جب تم یہاں سے نکلو گی تو دنیا بھر کے شریف النفس انسان تمہارے استقبال کے لئے سڑک پر دونوں طرف قطاریں باندھے کھڑے ہوں گے۔ وہ تم پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کریں گے۔ تمہارے سر پر چھتریوں کا سایہ کریں گے۔ تمہیں چم چم کرتی کار میں بٹھائیں گے اور ایک عالی شان حویلی میں لے جاکر تنہا چھوڑ دیں گے اور صبح شام تم سے پوچھنے آیا کریں گے کہ ملکہ عالیہ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔"

وہ پاؤں پٹخ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور یک لخت اس کی آواز کچھ بلند ہوگئی۔ "بولو کیا تمہیں یہ خوش فہمی ہے؟"

"نہیں۔" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ باہر جاتے ہی چاروں طرف سے بھوکے درندے مجھ پر ٹوٹ پڑیں گے اور مجھے ہڑپ کر جائیں گے۔ آخر یہ ایک شہر ہے کوئی جنگل تو نہیں۔"

"یہی تو تمہیں معلوم نہیں بھولی رانی! اس نے بیڈ کے گرد ٹہلتے ہوئے کہا۔ "جنگل تو مفت میں بدنام ہے۔ جنگل کے سارے قانون تو ہم نے اپنا لئے ہیں اور وہ بھی دس قدم آگے بڑھ کر۔ کیا تم ابھی تک قائل نہیں ہوئیں کہ انسانوں کی بستیوں میں طاقت کا قانون چلتا ہے۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ باقی سب ڈھکوسلے ہیں کمزوروں کو تسلی و تشفی دینے اور الو بنانے کی باتیں ہیں اس زمانے میں بقا کے لئے انسان کے پاس کوئی نہ کوئی طاقت ہونا ضروری ہے۔ کمزور انسان تو راہ میں پڑے روڑے کی طرح ہیں۔ کوئی ٹھوکر مارتا ہے۔ ادھر کو لڑھکا دیتا ہے اور کوئی ٹھوکر مارتا ہے۔ تو واپس وہیں پہنچا دیتا ہے۔" بیڈ کے سرہانے پہنچ کر وہ اچانک رکی اور الٹے قدموں واپس میرے سامنے آکر بولی۔

"تمہارے پاس بھی ایک طاقت ہے معلوم ۔ہے کونسی؟"

"میں خاموش بیٹھی اسے گھورتی رہی۔

"تمہارا یہ حسن۔" اس نے میرے چہرے کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ اور دوبارہ چہل قدمی شروع کرتے ہوئے بولی۔

اس کے استعمال کا ہنر سیکھ لو۔ فائدے میں رہوگی۔"

"میں کہہ چکی ہوں۔ میں تم جیسی عورت نہیں بنوں گی ..... نہیں بنوں گی۔" میں نے بہ آواز بلند کہا۔ "تمہاری ان ڈرامائی تقریروں سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ میں جان دے دوں گی .... لیکن تمہاری ناپاک خواہشات کی بھینٹ نہیں چڑھوں گی۔"

"چہ چہ چہ ....." اس نے متاسفانہ انداز میں کہا اور قریب آکر بزرگانہ انداز میں میرا رخسار تھپتھپایا۔ "ڈرامائی تقریر تو تم کر رہی ہو چندا۔ جان ہی دینی تھی تو نواب کے محل میں دے دی ہوتی۔ جہاں تم اس کی کنیز کی حیثیت سے دن گزارتی رہیں۔ نواب نے مجھے بتایا تھا کہ ایک مرتبہ تم نے اسے قتل کرنے کی ناکام کوشش بھی کی تھی۔ وہی چھری تم نے اپنے پہلو میں کیوں نہیں اتار لی تھی۔ میری جان ؟ اس طرح تم بندی خانے میں ڈالے جانے سے بھی بچ جاتیں۔ معلوم نہیں بندی خانے میں تم پر کیا کچھ بیتی ہوگی ؟" اس نے ایک گہرا کش لیا اور دھواں ناک سے نکالتے ہوئے کہا۔

"پس ثابت ہوا کہ جان بہت پیاری ہوتی ہے اور پھر اب تو بات صرف تمہاری ہی جان کی نہیں مسئلہ اس ننھی سی جان کا بھی ہے۔" اس نے تمہاری طرف اشارہ کیا۔

اس کی باتیں میرے دل کو لگ رہی تھیں اور میں ان کے سحر میں گرفتار ہونا نہیں چاہتی تھی۔ اس لئے چلا کر بولی۔ "تم زبردستی کرکے دیکھو۔ میں تمہیں جان دے کر دکھا دوں گی۔ اب مجھ میں اپنے وجود کی تذلیل برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں رہا.... سکت نہیں رہی۔"

"تذلیل؟" اس نے میرے سامنے آرام دہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے حیرت سے دہرایا۔

"تذلیل ہی سے تو میں تمہیں بچانا چاہتی ہوں۔ دیکھو ...... تمہارے ذہن میں اگر یہ خیال ہے کہ کوئی ٹھکانہ' کوئی منزل نہ ہونے کے باوجود تم یہاں سے نکل کر تذلیل سے محفوظ رہوگی تو یہ بھی تمہاری خوش فہمی ہے۔ تم شاید سوچ رہی ہو کہ جاکر کسی خوشحال گھرانے میں نوکری کرلوگی اور بزعم خود' عزت کی زندگی گزاروگی تو یقین کرو کہ اپنے مطلوبہ گھر تک پہنچنے سے پہلے ہی کئی گدھ تمہاری عزت پر ٹوٹ پڑیں گے۔ یہ بمبئی ہے' یہاں کئی ایسے واقعات ہوچکے ہیں کہ کوئی لاوارث اور بے آسرا لڑکی سڑک سے غائب ہوئی اور ایک آدھ دن بعد بے ہوش یا نیم مردہ کسی اندھیرے گوشے میں پڑی پائی گئی۔ تم اگر اس تجربے کا نشانہ بننا چاہتی ہو کہ کسی سیٹھ کا گرگا تمہیں اٹھا کر گاڑی میں ڈالے اور سیٹھ کے عشرت کدے پر پہنچا دے یا بدمعاشوں کی کوئی ٹولی تم پر جھپٹے اور بندر بانٹ میں مصروف ہو جائے تو پھر شوق سے جاؤ۔ تمہارا حسن اور خانماں بربادی تمہارے لئے اتنا بڑا مسئلہ بن جائے گی

کہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔ بالفرض کالوں نے تمہیں بخش بھی دیا تو تمہاری صورت تو گورے صاحبوں کی کھوپڑی بھی بھک سے اڑانے کے لئے کافی ہے۔ اس طرح باہر جاکر تمہیں جو حالات پیش آئیں گے ان سے تذلیل کا صحیح مفہوم تمہاری سمجھ میں آجائے گا۔ فرض کرو تم کسی خوشحال گھرانے تک پہنچ بھی گئیں تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ کسی روز بیگم کی غیر موجودگی میں صاحب کی نیت تم پر خراب نہیں ہوگی؟

چلو ہم مزید فرض کرلیتے ہیں کہ تم جس گھرانے میں پہنچوگی وہاں کے سب افراد نہایت نیک' شریف النفس اور خدا ترس ہوں گے لیکن تمہیں معلوم ہے کہ اس قسم کے گھروں میں چوری چکاری ہو جائے تو کیا ہوتا ہے ؟ انگریز نے ہندوستان کی پولیس کو تفتیش کا ایک سنہرا اصول بتا رکھا ہے جس پر وہ آنکھیں بند کرکے عمل پیرا ہیں اور وہ اصول یہ ہے کہ اگر کسی خوشحال گھرانے میں چوری ہو جائے تو سب سے پہلے اس کے نوکروں کو پکڑ کے الٹا لٹکا دو' ان کی چمڑی ادھیڑ دو۔

اب تم خود ہی سوچو کہ اگر ایسے ہی کسی اتفاق کے تحت تم جیسی نعمت غیر مترقبہ' بھوکے اور ترسے ہوئے' ہندوستانی پولیس والوں کے ہتھے چڑھ گئی تو اس کا کیا حشر ہوگا ؟ ذرا سوچو ..... چشم تصور سے کام لینے کی کوشش کرو تاکہ تذلیل کے صحیح معانی تمہاری سمجھ میں آسکیں۔" اس نے خاموش ہوکر تیزی سے سگریٹ کے دو تین کش لئے اور امید بھری نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "بازاری کہلانا ایک تذلیل سہی لیکن اس کے بعد عورت بے شمار ذلتوں سے بچ جاتی ہے۔"

"تم جتنا مرضی بھونکو گوہر جان !" میں نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مگر یہ میرا آخری فیصلہ ہے کہ میں ہر روز ایک نئے شیطان کی ہوس کا نشانہ بننے کے لئے یہاں نہیں رہوں گی۔"

"اوہ ....." دفعتاً" وہ کش لیتے ہوئے رک گئی۔ "اب میں سمجھی ..... دراصل تمہارے ذہن میں بازار حسن کا اور خصوصاً" میرے بالا خانے کا بڑا غلط تصور ہے۔ گوہر جان کا بالا خانہ کسی سستی قسم کی جسم فروش بھیلنی یا ڈومنی کی اندھیر کٹیا نہیں۔ جہاں ہر ایرا غیرا اور سڑا بسا آدمی جیب میں چند ٹکے ڈال کر چلا آئے اور حیوانوں کی طرح اپنا مطلب نکال کر چلتا بنے۔

یہاں ایک نہیں کئی بالا خانے چلتے ہیں۔ ایک کو تو میری بیٹی ہی چلاتی ہے۔ ان پر صرف مجرا ہی ہوتا ہے۔ بازار حسن کے بھی کچھ قوانین اصول اور اخلاقی ضابطے ہوتے ہیں جن کا تفصیلی علم تمہیں رفتہ رفتہ ہو جائے گا۔ بہرحال جو تم سمجھ رہی ہو وہ ہرگز نہیں ہوتا۔ البتہ ایسا ضرور ہوتا ہے کہ تم جیسے ہیرے پر کسی امیر زادے کا دل آجائے وہ اسے ملازم رکھ لیتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اسے گھر لے جاتا ہے اور اس سے جھاڑو برتن

کرواتا ہے۔ مقصد یہ کہ ایسی عورت اپنے کوٹھے پر ہی رہتی ہے۔ بظاہر مجرا نہ کرنے کا معاہدہ کرتی ہے۔ لیکن درحقیقت مجرا کرتی رہتی ہے۔ البتہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ جب مذکورہ امیر زادہ آتا ہے تو وہ اس کی خدمت میں حاضر رہتی ہے ..... جب تک وہ چاہے۔

چلو میں تمہیں اس پابندی سے بھی آزاد رکھنے کا وعدہ کرتی ہوں۔ یعنی تمہارے لئے کسی کی ملازمہ بننا یا نہ بننا تمہاری اپنی مرضی پر منحصر ہوگا۔ میں تمہیں صرف مجرے کا پابند کروں گی اور اس کے عوض دنیا کی ہر آسائش مہیا کروں گی۔ اب تمہیں مان لینا چاہئے کہ میں نہایت مہربان اور نرم دل عورت ہوں ورنہ تمہارے جیسے حالات میں جو لڑکیاں یہاں پہنچتی ہیں اور تمہارے جتنے اڑیل پن کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ انہیں نائیکہ چٹکی بجاتے میں سیدھا کر دیتی ہے اور ایسے کارگر نسخے میرے پاس ہر نائیکہ سے زیادہ موجود ہو۔ لیکن نہ جانے کیوں میں انہیں استعمال کرنا نہیں چاہتی۔ خصوصاً تم پر ....."

وہ کرسی پر نیم دراز ہوگئی جیسے بولتے بولتے تھک گئی ہو۔ پھر بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے اپنے کھلے بالوں میں کنگھی کرنے لگی۔ اس کی سگریٹ ختم ہو رہی تھی۔ اس نے ہولڈر میں دوسری سگریٹ پھنسا کر سلگائی اور دو تین کش لینے کے بعد جواب طلب نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

میں اب بھی بت بنی بیٹھی تھی۔ اس کی باتوں نے مزید دل کی سنگلاخ زمین نرم کر دی تھی لیکن میں اب بھی نہ صرف ظاہری طور پر بلکہ باطنی طور پر بھی مزاحمت کی پوری کوشش کر رہی تھی۔ اپنے احساس بے بسی کو دبا رہی تھی۔ میں اپنی رضامندی سے کسی بھی تاریک راستے پر قدم رکھنا نہیں چاہتی تھی۔ بے شک میں خانماں برباد تھی۔ میرے دامن میں تاریکیاں بھی تھیں ان تاریکیوں کو سمیٹنے میں میری اپنی رضا تو کبھی بھی شامل نہیں رہی تھی۔

"میرا جواب کبھی ہاں نہیں ہوگا گوہر جان ! تم بلاوجہ وقت ضائع کر رہی ہو۔" میں نے نپے تلے لہجے میں کہا۔ "البتہ ظلم و تشدد کے ہتھکنڈے استعمال کرنا چاہو تو کرکے دیکھ لو۔ شاید کسی مقام پر میری قوت برداشت جواب دے جائے۔"

گوہر جان کا چہرہ ایک لمحے کے لئے سپاٹ ہوکر رہ گیا۔ جیسے طاق پر رکھا چراغ بجھ گیا ہو اور پوری دیوار ہی تاریکی کا حصہ نظر آنے لگی ہو۔ تاہم اس کے طرز عمل میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ وہ اسی صبر و سکون سے بیٹھی سگریٹ کے کش لیتی رہی البتہ اب اس کی نظریں میرے چہرے کے بجائے کمرے کی ایک دیوار پر مرکوز ہوگئیں۔ سگریٹ ختم کرکے اس نے ٹوٹا ہولڈر سے نکال کر سختی سے جوتی تلے مسلا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تمہارا انکار اقرار میں بدل جائے گا میری جان !" وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرائی۔ "اور بہت جلد۔" اس نے جاتے ہوئے ہولے سے میرا گال تھپتھپایا۔ اور

اپنا فراک سنبھالتی رخصت ہوگئی۔

ہر بار وہ ایک نیا شوشا چھوڑ کر میرے اعصاب میں ہلچل سی مچا کر چند دن کے لئے غائب ہو جاتی تھی۔ صورت بھی نہیں دکھاتی تھی۔ اس بار بھی وہ تین دن غائب رہی۔ چوتھے دن وہ آئی تو اس کے ساتھ گٹھے ہوئے جسم کا ایک پستہ قد ملازم بھی تھا۔ جسے میں دو ایک مرتبہ پہلے بھی دیکھ چکی تھی۔ گوہر جان آج خوب بنی ٹھنی تھی اور اس کی حرکات و سکنات سے ایک دبا دبا سا جوش جھلک رہا تھا جیسے آج وہ کسی خاص مہم پر نکلی ہو۔

"آؤ آج تمہیں ایک تماشا دکھاؤں۔" وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اٹھاتے ہوئے بولی۔ میں اس وقت تمہیں سیب کی چند ننھی ننھی قاشیں کھلا کر بیٹھی ہی تھی۔ تم گاؤ تکیے کو گھوڑا بنائے اس پر چڑھے بیٹھے تھے اور خوب اچھل کود کر رہے تھے۔

"کیسا تماشا؟" میں نے مشکوک سی نظروں سے اسے گھورا۔

"آؤ تو سہی چندا! ایسی گھبرانے والی کیا بات ہے۔" اس نے بچوں کی طرح مجھے چمکارا ...... "ہمیں ذرا نیچے تک چل رہے ہیں۔ تمہیں کچھ سیر کرا دوں۔ شاید تمہیں میری راجدھانی پسند آجائے اور تم بھی اس کی ایک شہزادی بنا پسند کرلو۔" اس نے کھینچ کر مجھے اٹھالیا۔

"یہ بھی تو ممکن ہے کہ مجھے تمہاری راجدھانی دیکھ کر تم سے اور بھی زیادہ نفرت ہو جائے۔" میرے ارادے اور بھی زیادہ مضبوط ہوجائیں۔" میں نے جارحانہ لہجے میں کہا۔

میں اس کے عین مقابل کھڑی تھی۔ پہلی مرتبہ میں نے محسوس کیا کہ وہ قد کاٹھ میں میرے ہی برابر تھی بلکہ اس کے کندھے کچھ زیادہ چوڑے تھے اور کسی حد تک مردانہ سی ساخت کے تھے مگر نہایت غور سے دیکھنے پر ہی اس امر کا احساس ہوتا تھا ورنہ جسم سے دھیرے دھیرے پھوٹتی فربہی اور ڈھلتی عمر کے باوجود اس عورت کا جسم سر سے پاؤں تک متناسب اور قیامت خیز تھا۔ ارباب نے ایک مرتبہ مجھے بتایا تھا کہ ہمیشہ ریاض جاری رکھنے والی رقاصاؤں کے جسم سدا بہار ہوتے ہیں۔

"تو تم مجھ سے نفرت کرتی ہو عزیزہ خانم!" وہ ایک انگلی سے میری ٹھوڑی چھوتے ہوئے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرائی۔ اس مسکراہٹ کو میں کوئی معنی نہ دے سکی۔ "ایسا مت کرو عزیزہ خانم! گوہر جان سے آج تک کسی نے بھی نفرت نہیں کی۔" اس نے سرگوشی سی کی اور میرا ہاتھ پکڑ کر دروازے کی طرف بڑھی۔

ملازم نے تمہیں گود میں اٹھانے کی کوشش کی تو تم نے اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اس کے ہاتھ جھٹک دیئے اور پیچھے ہٹ کر کھڑے ہوگئے۔ تمہیں منہ پھلائے غصے سے ملازم کو گھورتے دیکھ کر گوہر جان بے اختیار ہنس دی اور میرا ہاتھ چھوڑ کر تمہاری طرف بڑھی۔

"لو بھئی ...... اپنے شہزادے کو تو ہم خود اٹھائیں گے۔" اس نے بازو پھیلاتے

ہوئے نہایت محبت سے تمہارے پھولے پھولے سرخ و سپید رخسار پر بوسہ دیا اور یوں تمہیں گود میں اٹھا لیا گویا حسین اور نازک پھولوں کے ڈھیر کو سمیٹا ہو۔ اس کی گود میں جاتے تم نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ ذرا سا کسمائے پھر مجھے پیچھے آتے دیکھ کر مطمئن ہوگئے۔

کمروں اور برآمدوں سے گزرتے جب ہم گولائی میں پھیلی ہوئی بالکونی میں پہنچے تو میں نے دیکھا کہ اس منزل کے تقریباً تمام کمروں کے دروازے مقفل تھے۔ گوہر جان کھٹ کھٹ کرتی مجھ سے چند قدم آگے چلی جا رہی تھی۔

دفعتاً مجھے اپنے عقب سے ملازم کی آواز سنائی دی۔ "بی بی جی! آپ کا رومال گر گیا ہے۔" میں نے رک کر پلٹ کر دیکھا۔ ایک نفیس سا گلابی تہہ شدہ رومال فرش پر پڑا تھا مگر یہ میرا نہیں تھا۔ میرے پاس کوئی بھی رومال نہیں تھا۔

"یہ میرا نہیں ہے۔" میں نے ملازم کو بتایا اور چلنے کے لئے پلٹی تو دیکھا کہ گوہر جان کئی قدم آگے جا چکی تھی۔ میں نے تیز چلنے کے ارادے سے قدم بڑھایا ہی تھا کہ اچانک میرے بازو جیسے مشینی انداز میں خودبخود میری پشت کی طرف مڑ گئے اور پھر جیسے وہ کسی فولادی شکنجے میں جکڑے گئے۔ میں لڑکھڑا کر گرنے لگی مگر اسی شکنجے نے گویا مجھے کھڑا رکھا۔ ایک ثانیے کے لئے تو میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا پھر احساس ہوا کہ دراصل اس ملازم نے عقب سے میرے بازو جوڑ کر اس طرح انہیں اپنے سخت بازوؤں کے شکنجے میں جکڑ لیا تھا کہ میں اپنی جگہ بے بس ہو کر رہ گئی تھی۔

"یہ کیا بے ہودگی....." میں چلائی لیکن جملہ میرے ہونٹوں پر ادھورا رہ گیا۔ میری نظر گوہر جان پر پڑی تھی جو چلتے چلتے رک چکی تھی۔ میری طرف رخ کرکے اس نے اچانک تمہیں دونوں بازوؤں سے پکڑا اور جنگلے پر جھک کر تمہیں جھولے دینے لگی۔ تمہارا ننھا سا وجود اب بہت بڑے کنویں سے مشابہ صحن میں لٹکا ہوا تھا۔ تین منزل نیچے رنگ برنگی ٹائیلوں والا صحن کا فرش چمک رہا تھا۔ صحن کے وسط میں مجھے وہی شخص جن بادشاہ بھی کھڑا نظر آیا جو ایک بار میری بے بسی پر دل کھول کر ہنس چکا تھا۔

تمہیں خوف زدہ سے انداز میں ننھی ننھی سی لاتیں ہوا میں چلاتے دیکھ کر اور تمہارے رونے کی آواز سن کر جیسے میرے دل کی دھڑکنیں رکنے لگیں۔ "یہ کیا کر رہی ہو گوہر جان؟" میں دہشت زدہ سی آواز میں چلائی۔

"اسے نیچے پھینک رہی ہوں۔" اس کی بے رحم آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ اس کی آواز میں کسی بھی جذبے کا شعور تک نہیں تھا۔ صرف موت کی سی یخ بستگی تھی۔ تین دن پہلے میں نے تمہیں جو پیشکش کی تھی اگر وہ اب بھی تم نے قبول نہیں کی تو میں منصور کو نیچے پھینک دوں گی۔"

تمہارے رونے کی آواز کچھ اور بلند ہوگئی اور اس میں دہشت کا عنصر کچھ اور بڑھ

کیا۔ میں اپنی جگہ سن ہوکر رہ گئی تھی۔ مجھے خاموش دیکھ کر گوہر جان نے نہایت خطرناک انداز میں تمہاری ایک ٹانگ پر ہاتھ ڈالا اور بازو چھوڑ دیئے۔ اب تمہاری صرف ایک ٹانگ اس کے ہاتھ میں دبی ہوئی تھی اور تمہارا جسم بغیر کسی توازن کے خلاء میں جھول رہا تھا۔ الٹے لٹکنے کے بعد تمہارے حلق سے صرف گھگھیائی ہوئی سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ دہشت کے عالم میں تم نے ننھے ننھے ہاتھ بڑھا کر جنگلا پکڑنے کی بھی کوشش کی تھی۔ لیکن گوہر جان نے تمہیں جنگلے سے دور رکھا تھا۔ کسی بھی لمحے غیر ارادی طور پر بھی اس کی گرفت تمہاری ٹانگ سے ہٹ سکتی تھی۔ تمہارے متحرک وزن سے اس کا ہاتھ تھک کر جواب دے سکتا تھا اور تین منزل نیچے ٹائیلوں کا فرش۔

تم اسے نیچے پھینکو اور میں اسے ہوا ہی میں لوتھڑے کی طرح خنجر میں پرو کر دکھاؤں گا۔ پھر تو ہمیں اپنے فن کا استاد مانو گی؟" نیچے سے ببن بادشاہ کی آواز آئی اور کنویں جیسے صحن میں اس کی بازگشت گونج کر رہ گئی۔

میں نے ایک نظر نیچے دیکھا وہ پر اشتیاق انداز میں سر اٹھائے اوپر ہی کو دیکھ رہا تھا۔ اس مقید درندے کی طرح جس کے پنجرے میں اس کی خوراک پھینکی جانے والی ہو۔ ہاتھ میں پتلا سا خنجر اس نے عموداً پکڑ رکھا تھا۔

"میں صرف تین تک گنوں گی۔" گوہر جان کی آواز آئی "ایک...."

میرے سینے میں دھڑکنیں معدوم ہوچکی تھیں۔ دل کی جگہ جیسے ایک تاریک خلا رہ گیا تھا۔ اپنی جان پر تو میں ہر عذاب سہہ سکتی تھی لیکن اپنے جگر گوشے کو اپنی ہی ہاں یا ناں' کی بدولت موت کی آغوش میں جاتے دیکھنے کا حوصلہ کوئی ماں کہاں سے لائے؟ اور پھر میرے لئے تو صرف مامتا ہی کے پل صراط کو عبور کرنے کا مسئلہ نہیں تھا۔ میرے ذہن میں جو ایک دھندلا سا جال پھیلنے لگا تھا زخموں کی مسیحائی کا جو مبہم سا راستہ ابھرنے لگا تھا اس کے لئے بھی تو امید کی موہوم سی کرن تم ہی تھے۔ ابھی تو مجھے بہت کچھ سوچنا تھا۔ بہت سے فیصلے کرنے تھے۔

"امید کی اس موہوم سی کرن سے محرومی میں کیونکر برداشت کرسکتی تھی۔ اس کرن کے علاوہ زندگی میں اب رہ ہی کیا گیا تھا۔ اگر اس سے محروم ہونا تھا تو پھر خود بھی زندہ رہنے کی کیا ضرورت تھی اور اگر اس کے ساتھ خود کو بھی موت کے سپرد کر دیا تو کتنوں کے ذمے کتنے ہی قرضے واجب الادا رہ جائیں گے۔ یہ قرضے یونہی واجب الادا چھوڑ جاؤں گی عزیزہ خانم؟"

"دو....." گوہر جان کی آواز گویا وادی مرگ سے آئی۔ اس بار اس کی آواز سن کر مجھے اس کی دھمکی میں شبہ نہ رہا کہ تین کہنے کے بعد وہ یقیناً مٹھی کھول دے گی اور میری عمر بھر کی پونجی نیچے جاگرے گی۔ لہو اور گوشت کے ایک ننھے سے بے وقعت ڈھیر میں

تبدیل ہو جائے گی۔

پھر تمہاری آواز میرے پردہ سماعت کے کسی زخمی حصے سے ٹکرائی "ام .... ی امی...." میرے کانوں سے جیسے بھل بھل کرکے لہو بہہ نکلا۔ اس لمحے تمہارا چہرہ میری طرف کو ہوگیا اور تم نے بے بسی سے اپنا ننھا سا ہاتھ میری طرف پھیلایا۔ میں اس وقت خاصے فاصلے کے باوجود تمہارا ایک ایک نقش صاف دیکھ سکتی تھی۔ تمہارے جسم کا سارا خون شاید چہرے پر سمٹ آیا تھا۔ آنکھیں بھنچی بھنچی سی لگ رہی تھیں اور آنسو اب پیشانی کی طرف پھیل رہے تھے۔ ایک لمحے کے لئے تمہارا بازو میری طرف پھیلا رہا۔ تمہاری بھیگی آنکھوں میں ایک مجروح سوال تھا۔ امی! آپ میرا ہاتھ کیوں نہیں پکڑ رہیں؟

"ت .... تین ....."

"نہیں ...... گوہر جان کا لفظ مکمل ہونے سے پہلے میں اس چوپائے کی طرح چلا اٹھی جس کی شہ رگ کند چھری سے کاٹی جا رہی ہو۔ "میرے بچے کو مت پھینکنا ..... میں تمہارا کہا مانوں گی گوہر جان .... ! مانوں گی ..... مانوں گی ....." میری آواز بڑبڑاہٹ میں ڈھل گئی۔ اپنا وجود مجھے دھیرے دھیرے نرم ریت میں دھنستا محسوس ہو رہا تھا۔ آنکھیں نہ جانے کیوں بند ہوئی جا رہی تھیں۔

ادھ کھلی آنکھوں سے میں نے اتنا ضرور دیکھ لیا کہ گوہر جان نے تمہیں جنگلے سے اوپر کھینچ لیا تھا اور فرش پر لاکھڑا کیا تھا۔ پھر میں نے دیکھا کہ تم دونوں بازو اوپر اٹھائے گرتے پڑتے میری طرف آ رہے تھے۔ پھر میرا جسم ڈھیلا پڑگیا اور آنکھوں کے سامنے سے سب کچھ غائب ہوگیا۔ صرف تاریکی رہ گئی۔

میری آنکھ کھلی تو چند لمحے تک کچھ بھی یاد نہ آیا کہ میں کیونکر بے ہوش ہوئی تھی .... اور آیا بے ہوش ہی ہوئی تھی یا مجھے نیند آئی ہوئی تھی؟ سب سے پہلے میری نظر تم پر پڑی۔ تم میرے پہلو میں لیٹے بے خبر سو رہے تھے۔ بیڈ کے قریب ہی آرام دہ کرسی پر گوہر جان بیٹھی تھی اور اس کی صورت دیکھتے ہی مجھے سب کچھ یاد آگیا میں نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ دل ہی دل میں مجھے اس عورت کی مکاری کا اعتراف تھا۔ اس نے خوب سوچ سمجھ کر میری دکھتی رگ پکڑی تھی۔

مجھ پر جسمانی ظلم و تشدد کی انتہا کرکے بھی شاید وہ اپنا مقصد نہ حاصل کر پاتی۔ دوسرے کسی بھی قسم کے ہتھکنڈے استعمال کرکے شاید وہ مجھے اتنا کمزور نہ کر پاتی جتنا میں اس وقت خود کو محسوس کر رہی تھی۔

"ناراض ہو مجھ سے؟" گوہر جان کی آواز آئی لہجے میں حد درجہ ملائمت تھی۔ خیر خواہوں اور مہربانوں کی سی ملائمت۔

"ناراض ہوں یا راضی ..... تمہارے لئے اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" میں نے

اجنبی لہجے میں کہا۔

"تمہیں ابھی مزید آرام کی ضرورت ہے۔" اس نے گہری سانس لے کر کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ "اب میں چلتی ہوں۔ تمہارے سرہانے شیشی میں دوا رکھی ہے۔ ہوسکے تو اس کے چند قطرے پانی میں ملا کر رات کو پی لینا۔"

"بات سنو گوہر جان !" دفعتاً" میں نے اسے پکارا۔ وہ جاتے جاتے رکی اور بڑے اشتیاق سے میری طرف مڑی۔ "جب بقول تمہارے تم کئی بالا خانوں کی مالک ہو اور ہر بالا خانے پر ناچنے والی کئی کئی لڑکیوں کی آمدنی تمہیں ہی آتی ہے تو تم مجھے بھی نچانے پر اتنی مصر کیوں ہو ؟ مجھ اکیلی کے نہ ہونے سے تمہاری دنیا میں کون سی کمی واقع ہو جائے گی ؟"

وہ مربیانہ انداز میں مسکرائی۔ کبھی تم نے کسی جوہری سے پوچھا کہ جب اس کے پاس پہلے ہی سینکڑوں ہیرے موتی موجود ہوتے ہیں تو وہ مزید ہیروں کی خرید و فروخت میں کیوں جان کھپاتا رہتا ہے ؟ کوئی اور اچھا ہیرا دیکھ کر کیوں اس کی راتوں کی نیند حرام ہو جاتی ہے۔ کبھی تم نے کسی کارخانے دار سے پوچھا کہ جب اسے دنیا کی ہر آسائش میسر ہوتی ہے تو وہ کیوں مزید کارخانے لگانے کی بھاگ دوڑ میں ہلکان رہتا ہے؟"

میں کوئی جواب نہ دے سکی۔ شاید میری حسیات صحیح طور پر بیدار نہیں ہوئی تھیں۔ تاہم میں نے گوہر سے ایک اور سوال کر دیا۔ "فرض کرو میں اپنے وعدے سے پھر جاؤں ؟" سوال کرتے ہی مجھے خود بھی اس کے کچے پن کا احساس ہوا مگر اب تو الفاظ منہ سے نکل ہی چکے تھے۔

گوہر جان کی مسکراہٹ کچھ پھیل گئی۔ "تم بھی یہیں ہو۔ تمہارا بچہ بھی یہیں ہے۔ اس مرتبہ تین تک گنتی کی نوبت بھی نہیں آئے گی۔ اس نے نہایت سرسری سے لہجے میں جواب دیا اور ساتھ ہی کہا۔ میں وعدہ خلافوں کی بڑی مخالف ہوں۔ اور ان پر مجھے رحم نہیں آتا۔"

میں اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگی کہ اگر رحم دلی کا دعوی کرتے ہوئے اس عورت کا یہ عالم تھا تو جب بے رحمی پر اترتی ہوگی تو نہ جانے کیا قیامتیں ڈھاتی ہوگی۔ چند لمحے وہ پشت پر ہاتھ رکھے کھڑے میری آنکھوں میں جھانکتی رہی۔ پھر تفہیمی سے انداز میں سرہلا کر باہر کو چل دی۔ آج اس کی چال کچھ بدلی بدلی سی تھی۔ شہزادیوں کی سی تمکنت تھی چال میں .... اور پہلی مرتبہ میں اسے سگریٹ کے بغیر دیکھ رہی تھی ورنہ تو ہمیشہ وہ سگریٹ کے کش لے رہی ہوتی تھی یا کم از کم ہولڈر اس کی انگلیوں میں ضرور دبا ہوتا تھا۔

چند دن بعد میری زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوا۔ مجھے استاد فتح یاب خان کی شاگردی میں دینے کی رسم بڑے اہتمام سے ادا کی گئی۔ پورے مکان میں چراغاں کیا گیا اس مرتبہ چونکہ گوہر جان کو میری طرف سے کسی مزاحمت کا خطرہ نہیں تھا اس لئے نیچے ایک

بہت بڑے ہال کو اس تقریب کے لئے آراستہ کیا گیا تھا اور عمارت میں رہنے والی تقریباً" تمام لڑکیاں بنی سنوری وہاں جمع تھیں۔ جیسے شادی کی رسومات میں شرکت کے لئے آئی ہوں۔ ان میں سے بیشتر لڑکیاں گوہر جان ہی کے بالا خانوں پر ناچتی تھیں اور باقی اس عمارت میں اس کی کرایہ داروں کی حیثیت سے رہتی تھیں۔ ان کی نائیکائیں بھی ان کے ساتھ ہی رہتی تھیں جو عموماً" ان کی مائیں ہی ہوتی تھیں۔ ان میں سے کوئی گھرانہ جب کچھ آسودہ حال ہوتا تھا تو کہیں الگ مکان لے لیتا تھا۔ گویا یہ ایک طرح سے بازاری عورتوں کا ہوسٹل تھا۔

استاد فتح یاب کی پیروی میں جب پہلی مرتبہ میں نے سا ..... رے ..... گا ..... ما ..... کی صدا بلند کی تو میرا جسم گویا پتھرا سا گیا۔ چاروں طرف سے مجھ پر پھولوں کی پتیاں برسنے لگیں۔ ایک گوشے میں بیٹھے سازندوں نے سازینہ شروع کر دیا اور لڑکیوں نے جو دوپٹے کمر میں باندھ کر ٹولیوں کی شکل میں رقص کرنا شروع کیا تو گویا راجہ اندر کے اکھاڑے کا سماں بندھ گیا۔ لڑکیوں نے استاد فتح یاب کو بھی کھینچ کر اٹھالیا اور اس مجہول سے انسان کو رقص کرتے دیکھ کر میں دنگ رہ گئی۔ یوں تو اس کا جسم ہڈیوں ہی کا مجموعہ تھا مگر رقص کرتے دیکھ کر کہنا مشکل تھا کہ اس کے جسم میں ایک بھی ہڈی پائی جاتی ہے۔ اس کے اعضاء پانی کی طرح ہلکورے لیتے تھے۔

میں دم بخود بیٹھی یہ تماشا دیکھ رہی تھی۔ گوہر جان میرے پاس ہی بیٹھی تھی جو خوشی سے گلنار نظر آرہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اس ماں کا سا تفاخر تھا جو اپنے جوان بیٹے کے سر پر سہرا سجا کے اسے بیاہنے چلی ہو۔ لڑکیوں کی ٹولیاں رقص کرتے کرتے ہمارے گرد طواف بھی کرتی جا رہی تھیں۔ اس طرح اس روز درحقیقت صرف رسم ہی ادا کی گئی اور میرا سبق صرف "سا .... رے ..... گا ..... ما" تک ہی محدود رہا۔ رات کو انواع و اقسام کے کھانوں سے بہت بڑا دستر خوان سجا اور نہایت پر تکلف ضیافت رہی۔

رات کو جب مجھے تنہائی میسر آئی اور میں تمہیں لے کر سونے کے لئے لیٹی تو نہ جانے کیوں تمہیں سینے سے چمٹا کر بے تحاشا رو دی۔ آنسو یوں امڈے چلے آرہے تھے جیسے برسوں سے خشک پڑے درد کے سوتے ابل پڑے ہوں۔ مجھے روتے دیکھ کر تم نے بھی منہ بسورنا شروع کر دیا اور تمہاری آنکھوں سے آنسوؤں کو دور رکھنے کے لئے میں نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھ لئے۔

میری اصل تربیت دوسرے دن شروع ہوئی۔ استاد نے بتایا کہ مجھے اس کے لئے روزانہ کم از کم پانچ گھنٹے وقت دینا ہوگا۔ میرے پاس وقت کے سوا تھا ہی کیا ؟ اور فی الحال میری نظر میں اس کی کوئی وقعت نہیں تھی۔

دن گزرتے گئے۔ ایک برس' ایک طویل برس گزر گیا۔ مجھے یہ بتانے میں عار نہیں

کہ رفتہ رفتہ میں نے اس ماحول سے سمجھوتہ کرلیا تھا..... میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ میں نے سردیوں کی طویل اور سونی راتوں میں بارہا اپنے بیڈ پر لیٹے لیٹے چھت پر نظریں جمائے اتنی مرتبہ کئی کئی گھنٹے کے لئے صورت حال کے بارے میں سوچا تھا کہ میری کنپٹیاں دکھنے لگ جاتی تھیں۔ مگر مجھے کوئی متبادل راستہ نہ ملا۔ زمانے کی ٹھوکروں میں رلنے والا پتھر بننے کی اب مجھ میں واقعی سکت نہیں تھی اور پھر میرے ذہن میں جو ایک دھندلا دھندلا سا منصوبہ جڑیں پکڑ رہا تھا اس لئے بھی میں نے بازاری عورت بننا قبول کرلیا تھا۔ مجھے اب کچھ طاقت اور مضبوطی درکار تھی۔ محض دعاؤں اور بدعاؤں پر تکیہ کرکے تو میں نے دیکھ لیا تھا۔

مستقبل کے لئے اب میں ایک نئے زاویے سے اپنے وجود کو مجتمع کرنا چاہتی تھی۔ مجھے یاد تھا کہ کتنی مرتبہ کس کس انداز میں مجھے اجاڑا گیا تھا اور مجھے یہ بھی یاد تھا کہ ارباب کے قتل کے بعد نواب شرافت علی کا سامنا ہونے پر میں نے سوچا تھا۔ "ٹھیک ہے نواب! یہ تمہارا وقت ہے۔ جو جی چاہے کرو اور جو جی چاہے کہو۔ اگر آج تم دوبارہ میرے نشیمن پر بجلی بن کر نہ ٹوٹے ہوتے تو شاید میں تمہیں معاف کر دیتی رفتہ رفتہ وہ اذیتیں فراموش کر دیتی جو تم نے مجھے پہنچائی تھیں۔ میں اپنا اور تمہارا معاملہ خدا پر چھوڑ دیتی۔ لیکن اب میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی کیونکہ پہلے تم نے مجھے اس طرح برباد نہیں کیا تھا جس طرح اب اجاڑا ہے۔ تمہاری یہ مکروہ مسکراہٹ ایک گھاؤ کی طرح میرے دل پر نقش ہے۔ اور آج میں عہد کر رہی ہوں کہ اگر زندگی نے مجھے مہلت دی تو تم بھی دیکھو گے اور یہ دنیا بھی .... کہ عورت اگر ایک بار انتقام لینے پر اتر آئے تو ایسی مثالیں چھوڑ جاتی ہے۔ جنہیں صدیوں تک دہرایا جاتا ہے۔

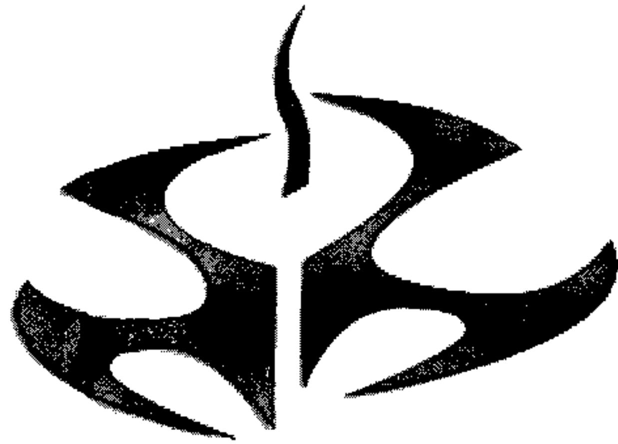
مجھے اپنا یہ عہد یاد تھا۔ کیونکہ میرے ذہن میں اپنے بے گناہ باپ کی بے گور و کفن لاش کی یاد بھی نقش تھی۔ مجھے اپنے کنوارے خوابوں کی دنیا اجڑنے کا سماں بھی یاد تھا۔ مجھے سرداروں کی زہریلے دانتوں کی اذیت بھی نہیں بھولی تھی۔ مجھے نواب کے بندی خانے کا وہ یخ بستہ پتھریلا فرش بھی نہیں بھولا تھا۔ جس پر مجھے اسی طرح وحشی قیدیوں کے سامنے پھینک دیا گیا تھا جس طرح رومن بادشاہ اپنے معتوب کو بھوکے شیروں کے آگے پھنکوا دیتے تھے۔

ارباب کو قتل ہوتے ہوئے میں نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا لیکن جب بھی میں اس کے متعلق سوچتی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے لہو کی ایک چادر سی پھیل جاتی تھی۔ مجھے اپنی بچی کا بچھڑنا بھی یاد تھا۔ مجھے وہ ٹھوکر بھی یاد تھی جو نواب کے باڈی گارڈ اس سیاہ فام جاٹ نے تمہاری نازک سی پنڈلی پر رسید کی تھی۔ مجھے گوہر جان کے ہاتھ میں ایک بے وقعت جانور کی طرح تین منزل کی بلندی پر تمہارا جھولنا اور دہشت زدہ ہو کر رونا بھی

یاد تھا۔ زمانے کے قرضے مجھ پر بہت بڑھ چکے تھے اور مجھے یہ سب چکانے تھے۔ بوجھ اتنا زیادہ ہوگیا تھا کہ اسے ساتھ لئے شاید مجھے خدا کے حضور میں پیش ہوتے ہوئے بھی شرم آتی کیونکہ اس نے مجھے اشرف المخلوقات بنا کر زمین پر بھیجا تھا۔

جو کچھ میں سوچ رہی تھی اس کا سارا دارومدار اب صرف تم پر تھا اس لئے میری آنکھیں تمہاری جانب کچھ زیادہ ہی نگراں تھیں۔





ایک برس میں' میں کچھ سے کچھ بن گئی تھی۔ بلاشبہ مجھ پر بہت محنت کی گئی تھی اور اس سے زیادہ قابل ذکر بات یہ تھی کہ اندر کی مزاحمت نے دم توڑا تو مہینوں کے فاصلے دنوں میں طے ہونے لگے۔ میں نے تربیت کے تقریباً" دسویں مہینے مجرا شروع کیا اور دو ماہ کے اندر اندر امیر زادوں کے طبقے میں کھلبلی مچا دی۔ گوہر جان دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹ رہی تھی اور میری بلائیں لیتے نہ تھکتی تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ اپنے وعدے پر بھی قائم تھی۔ ابھی تک اس نے مجھے جسم فروشی پر مجبور نہیں کیا تھا۔ حالانکہ "ملازمت" کی کئی سنہری پیش کشیں آچکی تھیں۔ مگر شاید وہ لفظوں کی آبرو رکھنا جانتی تھی۔ بے آبرو عورت ہوتے ہوئے بھی!

اب مجھ پر ہر طرح سے اعتبار کیا جانے لگا تھا۔ مجھے کسی خادمہ وغیرہ کو ساتھ لے کر کہیں بھی آنے جانے کی آزادی تھی۔ جو چیز چاہتی منگوا سکتی تھی۔ دل کی افسردگی اگر بہت ہی بڑھتی تو کسی دن رقص کرنے سے انکار بھی کر دیتی تھی اور کوئی مجھے مجبور نہیں کرتا تھا۔ مجھے چھینک بھی آجاتی تو کئی کئی حکیم اور ڈاکٹر بلوائے جاتے تھے۔ زیورات اور روپیہ پیسہ بھی میرے سامنے رہتا تھا۔

میں اکثر سرشام اپنے بالا خانے کی بالکونی میں کھڑے ہوکر تھکی تھکی آنکھوں سے گرمئی بازار کا تماشا دیکھا کرتی اور نہ جانے کیا کیا سوچا کرتی۔ میرے سامنے اب ایک مسئلہ دھیرے دھیرے سر اٹھارہا تھا اور وہ نہایت اہم تھا۔ تم ہوش مند ہوتے جا رہے تھے اور دن بدن وہ عمر قریب آرہی تھی جب گردوپیش اور ماحول کے نقوش ذہن پر ثبت ہونے لگتے ہیں۔ گہرے نہیں تو ہلکے ہی سہی۔ بے شک تم گھر پر ہی رہتے تھے۔ لیکن بالاخر میں نے تمہیں تعلیم و تربیت اور اپنی جاگتی آنکھوں سے دیکھے ہوئے خوابوں کی تکمیل کے لئے باہر تو بھیجنا ہی تھا۔ اور ایک بار تم گھر سے نکلتے تو تمہارے ذہن پر ماحول کے نقوش ثبت ہونے میں زیادہ عرصہ نہیں لگنا تھا۔

اس عمر سے بہت پہلے میں تمہیں یہاں سے کہیں دور بھیج دینا چاہتی تھی لیکن جو کچھ میں سوچتی تھی اس کے لئے فی الحال کوئی واضح طریق کار میرے ذہن میں نہیں آرہا تھا

ہر ان معاملات میں' میں کسی دوسرے فرد سے تبادلہ خیال تو درکنار کسی کو ان ارادوں کی ہوا بھی لگنے دینا نہیں چاہتی تھی۔

اسی سال کے وسط میں ایک عجب حادثہ ہوا۔ آج بھی اس کے بارے میں سوچتی ہوں تو کوئی توجیہہ ذہن میں نہیں آتی۔ وہی کنواں نما مکان جہاں ہم سب رہتے تھے اور جس کا نام گوہر جان نے اپنی ماں کے نام پر "کاشانہ عشرت" رکھا ہوا تھا' اس کی تیسری منزل کی بالکونی میں کھڑی ایک روز گوہر جان سگریٹ پی رہی تھی۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ ہم لوگ کچھ ہی دیر پہلے سو کر اٹھے تھے۔

میں طبیعت کی کسلمندی اور سستی دور کرنے کے لئے اپنے رہائشی پورشن کے سامنے بالکونی ہی میں تمہارے ساتھ کھیل رہی تھی۔ دور کھڑی گوہر جان کو میں صاف طور پر دیکھ رہی تھی۔ میں نے ایک لمحے کے لئے اس کی طرف سے منہ موڑا ہی تھا کہ اچانک ایک دھماکہ ہوا۔ میں نے ہڑبڑا کر پلٹ کے دیکھا عین اس مقام سے بالکونی کا دو ڈھائی گز کا ٹکڑا غائب تھا جہاں گوہر جان کھڑی تھی۔ اس جگہ بالکونی کے فرش میں ایک خلا رہ گیا تھا جہاں اب فرش کے کناروں سے لوہے کی ان سلاخوں کے مڑے ہوئے سرے نظر آرہے تھے جو تعمیر میں استعمال ہوتی ہیں۔

ان سلاخوں کے جوڑ بھی نہ جانے کس طرح علیحدہ ہوگئے تھے۔

انہی کناروں سے اس وقت بھی سیمنٹ اور بجری کا آمیزہ خشک بھربھری مٹی کی طرح نیچے گر رہا تھا۔ پھر میرے دیکھتے دیکھتے یہ آمیزہ گرنا بند ہوگیا اور شکستہ فرش کے ناہموار کنارے میری آنکھوں کے سامنے تازہ زخم کی طرح چمکتے رہ گئے۔

ایک لمحے کے لئے تو میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ ہوا کیا ہے۔ پھر اضطراری طور پر اٹھ کر میں نے جنگلے پر سے نیچے جھانکا۔ بالکونی کے فرش کا منوں وزنی وہ حصہ ٹوٹ کر نچلی منزل کی بالکونی کو بھی معمولی سا نقصان پہنچاتے ہوئے سیدھا صحن میں جاکر گرا تھا اور اس کے ساتھ ہی گوہر جان بھی۔

فرش کے اس ٹکڑے کے مزید کئی ٹکڑے ہوگئے تھے اور اس کی لپیٹ میں آیا ہوا گوہر جان کا آدھے سے زیادہ نچلا دھڑ کچلا جا چکا تھا اور ملغوبے میں تبدیل ہوچکا تھا۔ اوپری دھڑ بھی مسخ شدہ سی حالت میں ترچھا پڑا تھا۔ پہلے مجھے یہی گمان گزرا کہ میں خواب دیکھ رہی ہوں۔

کوئی ہستی جس پر زوال آنا محال لگتا ہو' یوں کسی غیبی طاقت کے ہاتھوں نازک سی کلی کی طرح مسلی جائے تو یہ بات حواس کو کچھ انہونی سی لگتی ہے اور فوری طور پر اس پر یقین نہیں آتا ...... اور یہ تو کوئی انہونی سی انہونی تھی! پوری بالکونی سلامت تھی اور

اسی کے حصے پر میں کھڑی تھی۔ ٹھوس' سیمنٹ اور سریے وغیرہ سے تعمیر شدہ عمارت کی اس بالکونی کو اگر تیشوں اور کدالوں سے توڑنے کی کوشش کی جاتی تو شاید قوی ہیکل مردوں کی ٹولیوں کو دانتوں پسینہ آجاتا۔ وہ خودبخود اس جگہ سے یوں ٹوٹ گئی تھی جیسے کسی نے بڑے سے بسکٹ کے درمیان انگلی مار کر سوراخ کر دیا ہو ..... اور وہ بھی عین اسی جگہ سے جہاں گوہر جان کھڑی تھی ...

لیکن مجھے ان تمام اتفاقات سے زیادہ حیرت ایک اور بات کی تھی۔ جانتے ہو وہ کیا بات تھی منصور ؟ وہ بات یہ تھی کہ بالکونی جہاں سے ٹوٹ کر گری تھی یہی وہ جگہ تھی جہاں سے آج سے ڈیڑھ سال قبل گوہر جان نے تمہیں ایک ٹانگ سے پکڑ کے لٹکایا تھا اور مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے اس کی بات نہ مانی تو وہ تمہیں نیچے پھینک دے گی۔ ہاں ..... یہ عین وہی مقام تھا۔

"کیا یہ تلافی مافات کا عمل تھا ؟ لیکن نہیں۔ تقدیر مجھ پر اتنی مہربان نہیں ہوسکتی تھی ..... اگر ہوتی تو گوہر جان کو اسی وقت سزا دیتی جب وہ میرے جگر گوشے کو ایک حقیر پوٹلی کی طرح جنگلے سے نیچے لٹکائے کھڑی تھی لیکن شاید اس تاخیر میں قدرت کی کوئی مصلحت ہو ..... آن کی آن میں نہ جانے کتنے متضاد خیالات میرے ذہن میں آئے اور نہ جانے میں نے اپنے آپ کو کتنی دلیلوں سے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

گوہر جان کی تجہیز و تکفین اگلے روز عمل میں آئی۔ تیسرے روز "کاشانہ عشرت" ہی میں گوہر جان کا سوم ہوا اور اس کے فوراً" بعد یہاں کی چیدہ چیدہ پختہ عمر کی عورتوں اور نائیکاؤں کی میٹنگ شروع ہوئی جس میں انجمن کی نئی صدر کا انتخاب عمل میں آیا۔ صدر ہمیشہ یہی چیدہ چیدہ عورتیں منتخب کرتی تھیں۔

ان تمام بڑی بوڑھیوں نے گوہر جان کی بیٹی وفا جان کو صدر منتخب کرنے کے حق میں رائے دی کیونکہ ان کے خیال میں اسے اپنی ماں کا اثر رسوخ حاصل تھا' اس کی اپنی مالی حیثیت بڑی مستحکم تھی اور وہ فنڈ کے روپے پیسے کا استعمال بھی سلیقے سے کرسکتی تھی۔ پڑھی لکھی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دھڑلے کی عورت تھی وقت پڑنے پر بڑے سے بڑے پھنے خاں کے سامنے سینہ تان کر کھڑی ہوسکتی تھی ..... اور منصور تمہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ اسے ہندوستان کی چھ علاقائی زبانوں کے علاوہ انگریزی میں بولنے اور لکھنے پر عبور تھا۔ حتی کہ وہ انگریزی میں شاعری بھی کرتی تھی۔

میں نے اس کی ڈائری میں اس کی پچاسوں انگریزی نظمیں دیکھی تھیں مگر مجھے انگریزی واجبی ہی سی آتی تھی اس لئے میں انہیں سمجھ نہیں سکتی تھی۔ وفا جان اپنی ماں کی ہی طرح حسین تھی۔

ابھی اس فیصلے پر رائے زنی جاری ہی تھی کہ وفا جان نے اٹھ کر تقریر کرنے کے انداز میں کہا ..... "لیکن اس مرحلے پر میں یہ واضح کردوں کہ میری محترمہ والدہ نے نہ جانے کیوں کچھ ہی دن قبل مجھے یہ ہدایت کی تھی کہ اگر ان کا ناگہانی طور پر انتقال ہو جائے تو صدارت کے لئے بڑی بوڑھیوں کے سامنے عزیزہ خانم کا نام پیش کیا جائے اور ہوسکے تو اسے ان کی وصیت سمجھ کر اس بات کی کوشش کی جائے کہ عزیزہ خانم ہی صدر بنیں۔ اب یہ آپ کے اختیار میں ہے کہ آپ میری محترمہ والدہ کی خواہش کا احترام کریں یا نہ کریں۔ وفا جان کی آواز بھرا گئی مگر اس نے بات جاری رکھی ..... "میں ان کی خواہش کی تکمیل کو اپنی زندگی کا نصب العین سمجھتی ہوں اور اگر آپ میری رائے سے اتفاق کریں تو میں یہ کہوں گی کہ والدہ محترمہ کی اس تجویز میں یقیناً" کوئی بہت بڑی مصلحت پوشیدہ ہوگی ..... اور پھر عزیزہ خانم کو میں خود بھی اپنی بڑی بہن کی جگہ سمجھتی ہوں۔"

معلوم نہیں یہ بات اس نے معنوی اعتبار سے کہی تھی یا کسر نفسی سے کام لیا تھا ورنہ حقیقت یہ تھی کہ وہ مجھ سے عمر میں کم از کم پانچ چھ سال بڑی تھی۔

بڑی بوڑھیوں کے ٹولے کی متفکرانہ سی نظریں مجھ پر جم کر رہ گئیں۔ مجھے معلوم تھا کہ میری حد سے زیادہ سنجیدگی اور بردباری کی وجہ سے ان کے دلوں میں میرا بے حد احترام ہے لیکن شاید وہ فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہی تھیں کہ میں اس ذمہ دارانہ "منصب" کی اہل ہوسکتی ہوں یا نہیں۔

"میرا خیال ہے ہمیں گوہر جان کی وصیت کا احترام کرنا چاہئے۔" بالآخر ایک نائیکہ نے کہا۔ اس کا نام شمشاد بیگم تھا۔

"ہاں ..... ہاں کیوں نہیں۔" ایک اور بڑھیا نے گلوری کلے میں دباتے ہوئے کہا جو

بس پھر تو چند لمحے کے اندر اندر تائید و تصدیق مکمل ہوگئی۔ صدارت کی نشانی نے ایک زر تار چادر تھی' میرے کندھوں پر ڈال دی گئی۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ مجھے بڑی ان بوڑھی عورتوں کی اس کرم فرمائی سے خوشی ہوئی تھی یا نہیں۔ وقتی طور پر میں رسمی شکریے کے سوا کوئی ردعمل ظاہر نہیں کرسکتی تھی۔ تاہم دل کے کسی گوشے میں نہ جانے کیوں ایک طمانیت کی لہر سی ابھری تھی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ حالات کا دھارا نہایت سست روی' مگر عمدگی سے مجھے میرے مقصد حیات کے قریب لے جا رہا ہے۔

گوہر جان کے چالیسویں کے بعد ایک صبح وفا جان میرے پاس آئی۔ اس کے ساتھ ایک دراز قد اور باریش انگریز نوجوان بھی تھا۔ جس نے باریک کمانی کی نظر کی عینک لگا رکھی تھی۔ وہ خاصا خوش شکل نوجوان تھا تاہم لباس کے معاملے میں نہایت لاپروا معلوم ہوتا تھا۔ گبرڈین کی پتلون پر اس نے شکاریوں جیسی کینوس کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ جیکٹ کی

سامنے والی دونوں بڑی بڑی جیبوں میں دو کتابیں ٹھنسی ہوئی تھیں۔

وفا نے اس سے میرا تعارف کراتے ہوئے صرف اتنا بتایا کہ اس کا نام الیگزینڈر ہے۔ وفا نے اسے میرے کمرہ نشست میں بٹھایا۔ وہ بیٹھتے ہی اپنی بغل سے انگریزی کا اخبار نکال کر اس کے مطالعے میں غرق ہوگیا اور وفا میرے ساتھ اندر بیڈ روم میں آگئی۔

"عزیزہ! میں آپ کو ایک راز کی بات بتانے آئی ہوں۔" اس نے اسی آرام دہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا جس پر عموماً اس کی ماں آکر بیٹھا کرتی تھی۔ جیسا کہ میں بتا چکی ہوں کہ وفا مجھ سے پانچ چھ سال بڑی تھی اور دیکھنے میں بھی بڑی نظر آتی تھی مگر میرا نہایت احترام کرتی تھی اور مجھ پر بھروسہ بھی کرتی تھی۔

"کیسی راز کی بات؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"میں آج رات الیگزینڈر کے ساتھ فرار ہو رہی ہوں۔" اس نے سرگوشی کی۔۔۔ "کل ہم شادی کرلیں گے اور سنیچر کو ایک بحری جہاز یہاں سے انگلستان روانہ ہو رہا ہے۔ اس میں ہماری نشستیں ریزرو ہیں۔ میں ہندوستان کو الوداع کہہ کر جارہی ہوں عزیزہ! میں اور الیگزینڈر اب انگلستان کے ایک چھوٹے سے گاؤں سینٹ پیری میں اس کے آبائی گھر میں ایک نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔ میں یہ اطلاع دینے کے ساتھ آپ کو یہ مشورہ بھی دینا چاہتی تھی کہ میرے بالا خانے کا انتظام سنبھال لیجئے گا۔ وہاں بھروسے کی کسی نائیکہ کو مقرر کردیجئے گا ورنہ وہاں "کام" کرنے والی دونوں لڑکیاں بے مہار ہو جائیں گی۔ میں نقدی اور زیور وغیرہ سب لے جا رہی ہوں۔"

پھر وہ الوداعی انداز میں مجھ سے گلے ملی۔ میں کمرہ نشست تک اس کے ساتھ آئی جہاں الیگزینڈر اخبار کے مطالعے میں غرق تھا۔ وفا کے مخاطب کرنے پر وہ چونکا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ان کے جانے کے بعد میں اپنے کمرے میں آلیٹی اور دیر تک خیالوں کی دنیا میں بھٹکتی رہی۔

دھیرے دھیرے وہ چہرہ اندھیرے میں تحلیل ہوگیا۔ شاید میرے تصور کی کرشمہ آرائی اس لئے جنم لیتی تھی کہ مجھے اب تک کامل یقین نہیں تھا کہ ارباب واقعی مرگیا ہے۔ اس لئے میں اپنے تصور میں اسے ہمیشہ زندہ دیکھتی تھی۔ ارباب کے تصور کے ساتھ ہی مریم کی یاد کا زخم بھی ہرا ہو جاتا تھا۔ پچھلے ایک سال میں ہر ممکن خفیہ ذرائع سے میں نے اس کا سراغ لگانے کی کوشش کی تھی۔ خود سامنے آنے کا خطرہ تو میں مول نہیں لے سکتی تھی کہ کہیں ارباب کی "نامعلوم بیوہ" کی حیثیت سے میری شناخت عمل میں نہ آجائے۔

اس شخص کے ذریعے میں نے اس انسپکٹر تک کا سراغ لگا لیا تھا جو قیامت کی اس رات کو اس پولیس پارٹی کی قیادت کر رہا تھا۔ جس نے عبداللہ پر گولیاں برسائی تھیں اور

اس کا تعاقب کیا تھا۔ مجھے اس پولیس رپورٹ کی نقل تک مل گئی تھی جو انسپکٹر نے کوتوالی آکر اپنے روزنامچے میں درج کی تھی۔ اس رپورٹ کے مطابق عبداللہ آدھے گھنٹے کے تعاقب کے بعد بالآخر گولیوں کی بوچھاڑ کی زد میں آگیا تھا اور ایک برساتی نالے کے قریب ڈھیر ہوگیا تھا لیکن رپورٹ میں اس بات کا کوئی تذکرہ نہیں تھا کہ اس کے ساتھ زندہ یا مردہ حالت میں کوئی بچی بھی پائی گئی تھی۔ میرے ایجنٹ نے اس انسپکٹر سے یہ بھی معلوم کرلیا تھا کہ جو رپورٹ اس نے روزنامچے میں درج کی تھی' واقعاتی اعتبار سے سوفیصد درست تھی۔

تو پھر آخر مریم کہاں گئی تھی؟ اس سوال نے کئی راتوں تک میری نیند اڑائے رکھی تھی۔ بار بار میں نے رپورٹ کو پڑھا اور بالآخر میری نظر ان الفاظ پر اٹک کر رہ گئی تھی جن میں اس جگہ کا نقشہ کھینچا گیا تھا۔ جہاں عبداللہ ڈھیر ہوا تھا۔ برساتی نالہ اس نقشہ میں سب سے اہم تھا۔ عین ممکن تھا کہ مریم اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر نالے میں جاگری ہو۔ میں نے ایک بار پھر پیسہ پانی کی طرح بہایا۔ کئی کارندوں کو ایک اہم مہم پر تعینات کیا۔

برساتی نالے کے دونوں کناروں پر جائے وقوعہ سے لے کر اس کے بہاؤ کے رخ پر آخر تک جتنی بھی آبادی تھی۔ اس کے ایک ایک گھر کو کریدا گیا۔ معلوم یہی ہوا کہ مذکورہ تاریخوں میں یا اس کے بعد بھی یہاں اتنی کم عمر بچی کی لاش کبھی نہیں پائی گئی تھی۔

غرضیکہ میں نے اپنی کوششوں میں کوئی کمی نہ چھوڑی تھی اور جب سے پیسہ میرے ہاتھ میں آنا شروع ہوا تھا۔ میں نے اس کا بیشتر حصہ اسی کام پر صرف کیا تھا مگر مجھے کوئی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ مریم کا کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا۔ ارباب کے متعلق بھی کچھ پتا نہیں چل سکا تھا۔ البتہ اس کے متعلق یہ بات یقینی طور پر معلوم ہوگئی تھی کہ پولیس کو جو لاش ملی تھی وہ بری طرح جھلسی ہوئی تھی۔ اس کی کوئی شناخت باقی نہیں تھی۔ پولیس نے صرف سونے کے ایک لاکٹ کی موجودگی کی وجہ سے اسے ارباب کی لاش قرار دیا تھا۔ ان کی تفتیش کے مطابق یہ لاکٹ وہائٹ اینجلس تنظیم کے سربراہ کی واحد شناخت تھا۔

لیکن محض اس ایک لاکٹ کی وجہ سے میرا یہ تسلیم کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا کہ وہ لاش ارباب ہی کی تھی۔ میری یہ بے یقینی اس وفا پرست بیوی کی آخری آس بھی ہوسکتی تھی جسے وہ آخری سانس تک سینے سے لگائے رہتی ہے۔ یہ ایک حقیقت بھی ہوسکتی تھی اور محض ایک خوش فہمی بھی۔

اس رات نہ جانے کیوں میرا شدت سے جی چاہ رہا تھا کہ جلد از جلد چاروں طرف سکوت طاری ہو جائے۔ کائنات پر موت کا سناٹا چھا جائے۔ معمول کے مطابق دھیرے دھیرے سکوت پھیلنا شروع ہوا۔ چار بجے کے قریب بالآخر سناٹا چھا گیا۔ کبھی کبھی

دور کہیں گشت پر نکلے ہوئے کسی سپاہی کی وسل سنائی دے جاتی تھی اور بس۔ نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ تم اب دوسرے کمرے میں خادمہ کے ساتھ سونے لگے تھے۔ میں تنہا اپنے بستر پر ساکت لیٹی یوں چھت کو گھور رہی تھی جیسے میرے ہلتے ہی کوئی دھماکہ ہو جائے گا۔

اور پھر میرے ہلے بغیر ہی دھماکہ ہوگیا۔

ایک نہیں ..... دو ..... تین ..... چار .... اور پھر وہی لامتناہی سکوت ہر دھماکے پر میرے جسم میں جیسے کوئی نس پھٹتی رہی۔ لہو اندر ہی اندر پھیلتا رہا۔ زندگی اندر ہی اندر سمٹتی رہی۔

پھر دفعتہ" میری خواب گاہ کے دروازے پر کسی نے انگلی سے نہایت ہلکی سی دستک دی۔ "بی بی جی! آپ جاگ رہی ہیں؟" یہ میری خادمہ خاص تھی۔

بمشکل تمام میں نے اپنے آپ کو بستر سے اٹھایا۔ ایک بار جسم حرکت میں آیا تو جیسے پیروں کو پر لگ گئے۔ میں نے جھٹکے سے وہ دروازہ کھولا۔

"بی بی جی! آپ نے آواز سنی؟ کہیں گولی چلی ہے ....." خادمہ نے کہا۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور اسے دھکیل کر سیڑھیوں کی طرف دوڑی نیچے مردان خانے کے تمام کمرے خالی تھے۔ ببن بادشاہ بھی اپنے کمرے میں نہیں تھا۔

میں نے دروازہ کھولا اور ایک طرف کو دوڑ پڑی۔ میں نے عقبی گلی کی طرف سے وفا کی رہائش کا رخ کیا۔ میرا اندیشہ درست ہی نکلا۔ عقبی صحن کا دروازہ کھلا تھا۔ الیگزینڈر کی لاش چوکھٹ سے باہر کی طرف پڑی تھی ..... اور وفا کی لاش چوکھٹ سے اندر۔ دونوں کے ہاتھ عالم نزاع میں غالباً" ایک دوسرے کی طرف بڑھے تھے مگر چوکھٹ تک پہنچتے پہنچتے ساکت ہوگئے تھے۔ گھر سے نکلتے وقت یقیناً الیگزینڈر آگے آگے تھا۔ اور وفا پیچھے۔ گولیاں کھا کر الیگزینڈر یقیناً کافی آگے جاکر گرا تھا اور اس نے پلٹ کر وفا تک ہاتھ پہنچانے کی کوشش کی تھی کیونکہ گلی کی گرد آلود اور ناہموار تنگ سڑک پر اس کے گھسٹنے کا خون آلودہ نشان تھا۔ وفا گولی کھا کر اوندھی گری تھی اور وہ الیگزینڈر کی طرف ہاتھ بھی پوری طرح بڑھا نہیں پائی تھی اس کی انگلیاں چوکھٹ کی لکڑی پر شکنجے کی طرح جم چکی تھیں۔

دونوں کو دو دو گولیاں ماری گئی تھیں اور ایک ہی جگہوں پر۔ الیگزینڈر کی بھی پسلیوں اور سینے میں سوراخ تھا اور وفا کے بھی۔ کچھ مرد آچکے تھے اور شاید تذبذب کے عالم میں کھڑے تھے کہ کیا کیا جائے؟ تین لڑکیاں اوپر گیلری میں دہشت کے مارے ساکت کھڑی تھیں۔ صرف ایک بڑھیا سینے پر دو ہتڑ مار کر بین کر رہی تھی۔ اگر وہ خاموش ہو جاتی تو ماحول پر شاید ایک ساکت تصور کا گمان ہوتا۔

میرے آنے پر باتوں کی بھنبھناہٹ شروع ہوئی اور شاید کسی نے مجھے مخاطب بھی کیا لیکن میں نے کسی کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔ میں ان چار مسٹنڈوں کی طرف بڑھی جو لاتعلق سے انداز میں کھلے دروازے سے ذرا ہٹ کر کھڑے تھے۔ ان میں سے دو کے کمرے تو بالکل صحن کے رخ پر تھے۔ یعنی اگر ان کے کمرے کے دروازے ذرا سے بھی کھلے ہوتے تو یہ اوپر سے آنے جانے والے ہر انسان پر نظر رکھ سکتے تھے۔ میں ان کے نام نہیں جانتی تھی۔ مگر صورتوں سے انہیں پہچانتی تھی۔ میں نے ان میں سے ایک کو گریبان سے پکڑلیا۔

"کس نے قتل کیا ہے ان دونوں کو؟" میرے لفظوں میں میری روح کا سارا غیظ و غضب شامل تھا مگر پھر بھی میری آواز ایک سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں ہو سکی تھی۔ سوال کے ساتھ ہی میں نے باری باری چاروں کی شکل غور سے دیکھی۔

"ہم کو کیا معلوم، ہم تو سوتا پڑا تھا۔" اس نے جواب دیا جس کا میں نے گریبان جکڑ رکھا تھا۔

تو تمہیں یہاں اس لئے رکھا جاتا ہے کہ پڑے سوتے رہو؟ خواہ کوئی یہاں لاشوں کے انبار لگا جائے۔" میں نے اس کے منہ پر الٹے ہاتھ کا تھپڑ رسید کیا۔ اس نے سر کو یوں جھٹکا دیا جیسے ایک لمحے کے لئے اس کی نظر دھندلا گئی ہو پھر وہ رخسار پر ہاتھ جما کر کینہ توز نظروں سے مجھے گھورنے لگا۔ اس کے ہونٹوں کے گوشے سے خون کی ایک پتلی سی لکیر ٹھوڑی پر پھیلنے لگی تھی۔

قاتل ان میں سے کوئی بھی ہوسکتا تھا اور یہ بھی عین ممکن تھا کہ وہ ان کا کوئی ساتھی رہا ہو جو اب تک نجانے کہاں سے کہاں پہنچ چکا ہو۔ سانپ نکل چکا تھا اور لکیر پیٹنے کا کام میں پولیس کے لئے چھوڑ دینا چاہتی تھی۔ میں نے ایک بار پھر اپنی مدتوں کی مشق کو کام میں لانے کی کوشش کی اور ذہن میں بھڑکتی آگ کو بمشکل تمام سرد کر دیا۔

اس کا گریبان چھوڑ کر میں وفا کی لاش کی طرف پلٹی۔ اس کا ایک رخسار صحن کے فرش پر ٹکا ہوا تھا۔ ملائم ریشمی بال دوسرے رخسار پر سے ہوتے ہوئے خون آلود فرش سے چپک کر رہ گئے تھے لیکن خون میں لتھڑنے کے باوجود ان کا سنہرا پن اب بھی علیحدہ ہی نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اب بھی کھلی تھیں اور ان میں آس کا وہ رنگ اب بھی منجمد تھا جو وہ میرے گھر سے رخصت ہوتے وقت لے کر چلی تھی۔

موت کی اذیت اور تشنج کے باوجود اس کے بھنچے ہوئے ہونٹوں پر اس معصوم سی مسرت بھری مسکراہٹ کے مٹے مٹے سے آثار باقی تھے۔ وہ مسکراہٹ جو صرف اس انسان کے ہونٹوں پر ہوتی ہے جو ایک طویل قید سے رہائی پا کر ایک نئی زندگی کی امید پر ایک نئی

راہ پر پہلا قدم رکھتا ہے ...... اور مجھے یاد آیا کہ اس نے کتنے مسرور انداز میں میرے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا تھا ...... عزیزہ ! میں ایک نئی زندگی شروع کرنے جا رہی ہوں ...... یہ گزشتہ شام ہی کی تو بات تھی۔ ابھی تو ان الفاظ کی بازگشت بھی میرے ذہن میں مدھم نہیں پڑی تھی۔

نئی زندگی کی نوید مجھے سنانے والی وہ پارہ صفت لڑکی خاک و خون میں لتھڑی ایک مسلی ہوئی کلی کی طرح میرے قدموں میں پڑی تھی۔ جسے اس نے بڑے چاؤ اور امید سے اپنا ہم سفر چنا تھا کہ وہ اس کی حفاظت کرے گا۔ اسے اپنی مضبوط بانہوں کے حلقے میں سمیٹ کر دور بہت دور خوشیوں کے ان دیکھے اور انجانے دیس میں لے جائے گا۔ وہ اس کی تو کیا خود اپنی بھی حفاظت نہیں کرسکا اور ایک بار پھر مجھے نہ جانے کیوں وہی احساس ہوا جو ارباب کی موت پر ہوا تھا۔ ان دونوں نے بھی کچا ہی قدم اٹھایا تھا' افسانوی راستہ اختیار کیا تھا۔

ایک بار پھر اس نظریے پر میرا یقین پختہ ہوگیا۔ "کسی چیز کی طلب ہے تو پہلے اپنے اندر سے اسے چھیننے کی طاقت پیدا کرو۔ چوروں کی طرح چھپ چھپا کر روانہ ہونے والوں کو منزلیں نہیں ملا کرتیں۔

پھر میں نے الیگزینڈر کی لاش پر نظر ڈالی۔ اس کی عینک صحیح سالم لیکن اس سے کافی دور پڑی تھی۔ اس کے جسم پر وہی لباس تھا جو میں شام کو دیکھ چکی تھی۔ جیکٹ کی بڑی بڑی جیبوں میں دو کتابیں بھی اسی طرح ٹھنسی ہوئی تھیں۔ اچانک وفا کی آواز ایک بار پھر میرے ذہن میں گونج اٹھی۔ "میں کینوس کے ایک چھوٹے سے تھیلے میں صرف زیور اور نقدی رکھ کر تیار رہوں گی......"

لاشوں کے آس پاس کہیں بھی اس قسم کا کوئی تھیلا نظر نہیں آرہا تھا۔ میرے دل میں افسردگی کی ایک اور لہر سی اٹھی۔ وفا اور الیگزینڈر کی روحوں کی طرح تھیلا بھی یقیناً یہاں سے کہیں دور جاچکا تھا۔ میری مجبوری یہ تھی کہ مجھے اپنے آپ کو حالات سے بالکل لاعلم ظاہر کرنا تھا۔ اس لئے میں تھیلے کے متعلق بھی کچھ نہیں پوچھ سکتی تھی۔

"سنو......" بالآخر میں نے اپنی تمام تر تھکن کے باوجود بہ آواز بلند سب کو مخاطب کیا۔ "میں گھر جا رہی ہوں۔ پولیس آئے تو جس کو جو کچھ بھی معلوم ہو' بالکم و کاست بتا دے۔" تھکے تھکے قدموں سے میں گھر لوٹ آئی۔

جیسا کہ مجھے توقع تھی کہ ایک انگریز کے قتل سے خاصی کھلبلی مچے گی...... تو ایسا ہی ہوا۔ اگلی صبح میں ناشتہ زہر مار کرکے فارغ ہی ہوئی تھی کہ خادمہ نے بڑے متوحش انداز میں اطلاع دی کہ ریزیڈنٹ صاحب بہادر تشریف لائے ہیں اور مجھ سے بات کرنا چاہتے

ہیں۔

"انہیں بٹھاؤ اور ان کا پسندیدہ مشروب وغیرہ پیش کرو۔ میں ابھی آتی ہوں۔" میرے اندر یک بیک بلا کا اعتماد اور سکون آگیا تھا۔

ریزیڈنٹ صاحب بہادر چاہتے تو مجھے اپنے دفتر میں بھی طلب کرسکتے تھے لیکن اگر وہ شخص خود چل کر آیا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ میں چار پانچ ہزار افراد کی نمائندگی کرتی ہوں۔ خواہ یہ افراد بازاری عورتیں' دلال اور نائیکائیں ہی تھیں۔ معاشرے کے دھتکارے ہوئے۔ ناپسندیدہ بے عزت و بے حمیت بے ناموس لوگ۔

اس کا نام گلبرٹ تھا۔ وہ ادھیڑ عمر کا ایک فربہ اندام' میانہ قد اور نرم خوسا آدمی تھا اور خاصی اچھی اردو بول لیتا تھا۔ جہاں اٹکتا تھا وہاں انگریزی کا لفظ ٹانک لیتا تھا۔ دونوں ہاتھوں میں چھڑی گھماتے ہوئے بات کرتا تھا اور کہیں کہیں افسرانہ رعونت بہرحال جھلک آتی تھی۔

"...... باقی سب باتیں تو معلوم ہو ہی جائیں گی۔ عزیزہ خانم !" باقی گفتگو کی طرح اس نے یہ الفاظ بھی بگڑے ہوئے تلفظ کے ساتھ ہی کہے تھے تاہم میں درست لفظ کے ساتھ لکھ رہی ہوں .... "اور قاتل بھی پکڑا جائے گا۔ فی الحال مجھے صرف یہ جاننے سے دلچسپی ہے کہ ایک انگریز نوجوان رات کے اس پہر وفا جان کے مکان کے پچھلے حصے میں کیا کر رہا تھا۔ کیا آپ کو کوئی ایسی بات معلوم ہے جو اس گتھی کو سلجھانے میں پولیس کی مدد کرسکے ؟ میں نے سوچا کہ ایس پی صاحب سے پہلے آپ سے میں خود ملوں۔"

"مسٹر ریزیڈنٹ!" میں نے حتی الامکان پر وقار لہجے میں کہا۔ "کہ آپ وقوعے کا تذکرہ اس طرح کر رہے ہیں گویا قتل صرف اس انگریز نوجوان کا ہوا ہے۔ مت بھولئے کہ ایک نوجوان لڑکی وفا جان بھی قتل ہوئی ہے۔ باقی رہے آپ کے سوالات تو ان کے جوابات مجھے خود بھی درکار ہیں اور میں آپ کی انتظامیہ سے ان کے جوابات کی توقع کر رہی ہوں۔ میں اس بازار اور ان سے متعلقہ افراد کی انجمن کی صدر ضرور ہوں لیکن یہاں کا ہر فرد اپنا ہر راز مجھے بتا کر ہر قدم نہیں اٹھاتا۔ اس کی اپنی ایک نجی زندگی بھی ہوتی ہے۔"

"بہت خوب !" اس نے بردباری سے سرہلایا گویا میں نے اس کا مطلوبہ جواب دیا ہو حالانکہ ظاہر ہے ایسا ہرگز نہیں تھا۔ پھر اس نے اپنا ہیٹ اتار کر برابر ہی تپائی پر رکھ دیا۔ جس پر شیمپین کی بوتل اور گلاس رکھے ہوئے تھے۔ گلاس بالکل خشک اور شفاف نظر آرہے تھے۔

"آپ نے شوق نہیں فرمایا ؟" میں نے تپائی کی طرف اشارہ کیا۔

"اگر آپ کچھ دیر نہ آتیں تو شاید میں ایک آدھ پیگ پی لیتا لیکن اب میں جلد

از جلد بات ختم کرکے جانا چاہوں گا۔"

اس نے چھڑی اپنی گود میں رکھ لی اور سر پر نمودار ہوتے ہوئے مختصر سے گنج پر ہاتھ پھیرا۔ جس پر پسینے کی اکا دکا بوند چمک رہی تھی۔ "میں آپ سے ضرور ایک رائے لینا چاہوں گا۔ آپ کے خیال میں پولیس کو اپنی تفتیش کا آغاز کہاں سے کرنا چاہیے ؟"

"ان چار مردوں کی گرفتاری سے جو مکان کے پچھلے کمروں میں رہتے ہیں۔ ان میں سے دو کے کمروں کا رخ عین صحن کی سمت ہے۔ انہیں یقیناً کچھ نہ کچھ معلوم ہونا چاہیے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی۔" ریذیڈنٹ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "کہ ہم نے ان چاروں کو گرفتار کرلیا ہے اور ان میں سے ایک دفا اور الیگزینڈر کے قتل کا اعتراف بھی کرچکا ہے۔ اس کی نشاندہی پر آلہ قتل بھی تلاش کرلیا گیا ہے۔ یہ ریوالور اس نے چار گولیاں چلانے کے بعد صحن میں موجود اس کنویں میں پھینک دیا تھا جس میں سے ہینڈ پمپ کے ذریعے پورے مکان کو پانی سپلائی ہوتا ہے۔ اس کنویں پر فرش کے رنگ سے ملتا جلتا ایسا آہنی ڈھکن موجود ہے جو پہلی نظر میں دکھائی بھی نہیں دیتا۔"

"قاتل ان چاروں میں کون ہے ؟" میں نے سرسراتی ہوئی سی آواز میں پوچھا اور تنویمی سی کیفیت میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ ریذیڈنٹ نے بلاشبہ مجھے حیرت زدہ کر دیا تھا۔

"احمد کمال نام ہے اس کا ...... وہی جو ان میں سب سے کم عمر ہے۔" ریذیڈنٹ نے چھڑی گھماتے ہوئے جواب دیا۔

قتل کی کوئی وجہ بتائی اس نے؟" میں نے پوچھا۔ اپنے لہجے پر میں اب قابو پاچکی تھی۔

"ہاں ...... وہ کہتا ہے دفا اس کی محبوبہ تھی اور الیگزینڈر اسے لے کر بھاگنے والا تھا۔" ریذیڈنٹ دروازے کی طرف مڑگیا...." اور یہ بات اس لئے صحیح معلوم ہوتی ہے کہ الیگزینڈر کی جیب سے .... انگلینڈ روانہ ہونے والے ایک بحری جہاز کی ڈیلکس روم کی ٹکٹ ملی ہے۔ جس پر مسٹر اور مسز الیگزینڈر کے ناموں کا اندراج ہے۔ اب صرف ایک چھوٹی سی الجھن باقی ہے کہ دفا کی تمام پونجی اور زیورات غائب ہیں جن کی مالیت ایک خادمہ کے اندازے کے مطابق کم از کم تین لاکھ ہے۔ تین لاکھ بہت بڑی رقم ہوتی ہے۔" ریذیڈنٹ میری طرف دیکھ کر یوں مسکرایا گویا میری رائے طلب کر رہا ہو۔

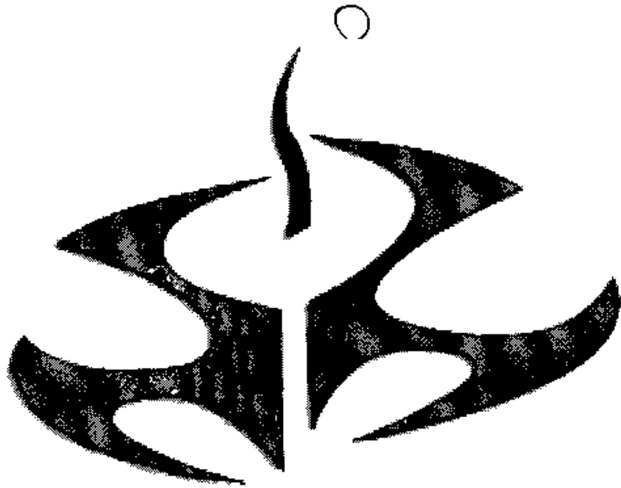
"ہاں ! کم از کم اتنی بڑی ضرور ہے کہ اس کے لئے کوئی دو افراد کو قتل کر سکتا ہے یا پھر قتل کا الزام اپنے سر لے سکتا ہے۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

ریذیڈنٹ مسکرا گیا۔ "ہاں ..... ہم اس پہلو پر بھی سوچ رہے ہیں۔" اس نے پرخیال نظروں سے میری طرف دیکھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس کے کچھ عرصے بعد ایک اور اہم واقعہ پیش آیا۔ میں اپنے بالا خانے کی بالکونی میں کھڑی تھی۔ میں بالکونی میں کبھی کبھار ہی کھڑی ہوتی تھی اور وہ بھی اس وقت جب کبھی دل اداس ہوتا تھا تو دھیان بٹانے کے لئے کسی ستون وغیرہ کی اوٹ میں آتے جاتے چہروں پر لکھی مختلف تحریریں پڑھنے کی کوشش کرتی تھی۔

میرے بالا خانے کے سامنے والے چند بالا خانے چھوڑ کر دائیں طرف دودھ ' دہی' مشروبات' کھیر اور نہ جانے کن کن چیزوں کی بہت بڑی دکان تھی۔ اسے پانچ بھائی چلاتے تھے۔ پانچوں پہلوان تھے۔ لیکن سب اکھاڑے کو الوداع کہہ چکے تھے حالانکہ بوڑھا ان پانچوں میں سے کوئی نہیں تھا مگر عمر کے اس دور میں سارے ہی بھائی پہنچ چکے تھے۔ جب کشتی لڑنا بس کی بات نہیں رہتی۔ بازار میں اب بھی ان کا بڑا رعب تھا۔

اسی دکان کی طرف سے تکرار کی اونچی اونچی آوازیں سن کر میں بری طرح چونک اٹھی۔



بازار حسن میں عزیزہ خانم کے بالا خانے کے بعد پہلوانوں کی دکان ہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں کبھی کسی کو اونچی آواز میں بولنے کی جرات نہیں ہوتی تھی۔ نشے میں دھت شرابی بھی وہاں پہنچ کر اپنے پراگندہ حواس کو مجتمع کر لیتے تھے ورنہ کسی قسم کی ہاؤ ہو شروع کرنے سے پہلے ہی اٹھا کر دکان سے خاصی دور پھینک دیئے جاتے تھے.... اور اس کارروائی میں یہ امتیاز نہیں رکھا جاتا تھا کہ مذکورہ شخص کون ہے؟ کس حیثیت کا مالک ہے؟ بدمعاش ہے یا شریف البتہ پھینکنے سے پہلے دکان کے نوکر چاکر اس شخص کی جیب سے اس چیز کے پیسے ضرور نکال لیتے تھے جو اس نے کھائی ہوتی تھی لیکن قیمت سے زیادہ ایک دھیلا بھی نہیں نکالا جاتا تھا۔

اور جو کچھ میں اس وقت اس دکان پر دیکھ رہی تھی اور جو آوازیں سن رہی تھی وہ مجھے حیران کر دینے کے لئے کافی تھیں۔ دکان میں باہر کی طرف ایک بڑا سا سفید چبوترا تھا۔ اس کی سفید ٹائلیں دور ہی سے چمکتی نظر آتی تھیں۔ اس پر سب سے بڑے پہلوان صاحب ایک موٹے سے گدیلے پر آلتی پالتی مارے بیٹھے ہوتے تھے۔ ان کے دائیں ہاتھ پر شفاف شوکیس ہوتا تھا جس میں چند ایک خاص خاص مٹھائیوں کے تھال نہایت خوبصورتی سے سجے ہوتے تھے۔ دائیں ہاتھ پر برف کی سل ہوتی تھی جس پر کھیر کی ٹھوٹھیاں رکھی ہوتی تھیں۔ سامنے ربڑی کا تھال ہوتا تھا اور ان کے قریب بڑا سا آہنی کیش بکس ہوتا تھا جسے گلا کہا جاتا ہے۔

بڑے پہلوان صاحب اپنے حبشے اپنی بہت بڑی پگڑی اور نہایت موٹی موٹی خمدار اور غالباً" موم سے اکڑائی گئی مونچھوں کی وجہ سے ان تمام چیزوں کے درمیان نہایت نمایاں نظر آتے تھے۔

اس وقت ایک شخص بوٹ سمیت اس سفید چبوترے پر پاؤں رکھے کھڑا تھا جسے بڑے پہلوان صاحب کسی ایسے شخص کی انگلی لگتے دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے جو اچھی طرح صاف ستھرا نظر نہ آرہا ہو۔ "اب کہہ تو دیا .... اب ہزار بار کہوں کیا کہ چندن بابا نے آج تک کسی دکان پر کھانے پینے کے بعد پیسے نہیں دیئے۔ ابھی تو صرف دو سیر دودھ پیا ہے .... چندن بابا ادھر روزانہ پانچ سیر دودھ پینے آئے گا اور کوئی پیسہ نہیں دے گا۔ سمجھے پیارے۔

چربی کے ڈرم ....." وہ کہہ رہا تھا۔

اس نے باقاعدہ اپنا بیلچہ نما ہاتھ بڑھا کر ایک انگلی سے تمسخرانہ انداز میں بڑے پہلوان صاحب کا پھولا پھولا گال چھوا۔ اس کی پاٹ دار آواز میں یورپی لہجے کی جھلک تھی وہ اپنے آپ کو بابا کہہ رہا تھا مگر اس کی عمر یقیناً" تیس بتیس سے زیادہ نہیں رہی ہو گی۔ اس کا چہرہ گو کہ مجھے نظر نہیں آرہا تھا کیونکہ اس کی پشت میری طرف تھی تاہم اس کی بکھرے بکھرے بالوں میں مجھے کہیں سفیدی غالب نظر نہیں آئی۔

وہ لٹھے کا کھڑا پاجامہ اور لمبا سا کرتہ پہنے ہوئے تھا جس کی آستین چڑھی ہوئی تھیں اور اچھے خاصے فاصلے سے بھی اس کے بازو کی ہر مچھلی پھڑکتی نظر آرہی تھی۔ اس کے کندھے بے تحاشا چوڑے اور گردن سانڈ کی طرح گتھی ہوئی تھی۔ قد اتنا اونچا تھا کہ اگر وہ بازو بلند کرتا تو اپنے سر پر گھومتے چھت میں لٹکے ہوئے اس پنکھے کو چھو سکتا تھا جس کا درمیانی حصہ کسی گیند سے مشابہ تھا۔

پکی رنگت کا یہ نامعلوم شخص دیو زاد ہی تھا مگر اس کا جثہ محض بیکار گوشت کا انبار معلوم نہیں ہوتا تھا محسوس ہوتا تھا کہ یہ شخص بیک وقت پتھر کی طرح ٹھوس بھی ہے اور ربڑ کی طرح لچکیلا بھی۔ اس کے جسم نے یقیناً" مدتوں بے پناہ مشقوں یا پھر ورزشوں کی سختی برداشت کی تھی۔

اس نے انگلی سے بڑے پہلوان صاحب کا گال چھوا تو ان کی مونچھیں بری طرح پھڑکنے لگیں نتھنے پھولنے پچکنے لگے لیکن وہ اس شخص چندن بابا کے چہرے کی طرف نہیں' شعلہ بار نظروں سے اس کے بوٹ کی طرف دیکھ رہے تھے جو سفید چبوترے پر ٹکا ہوا تھا۔ اسی کیفیت میں پہلوان صاحب کے حلق سے اچانک یوں آواز برآمد ہوئی جیسے شیر کو کسی نے سوتے میں خنجر چبھو دیا ہو۔

"ابے گرالو سالے کو... دیکھ کیا رہے ہو۔" وہ دھاڑے۔ "میں اس کے گلے میں زنجیر ڈال کر اسے کتے کی جگہ باندھوں گا۔"

دائیں بائیں سے دکان کے کئی تگڑے تگڑے سے ملازم اس شخص پر ٹوٹ پڑے جس نے اپنے آپ کو چندن بابا کہا تھا ان میں سے ایک کے ہاتھ میں میں نے لوہے کا وہ لمبا سا خطرناک کھرچنا بھی دیکھا جس کی ایک ضرب چندن بابا کے تربوز نما سر کے دو ٹکڑے بھی کر سکتی تھی۔ اس نے اپنے پہلوؤں اور پیٹھ پر برستے گھونسوں اور لاتوں کی قطعاً" پروا نہیں کی سب سے پہلے ہاتھ سے اس طرح کھرچنے کا وار روکا کہ دوسرے ہی لمحے کھرچنا اس کے ہاتھ میں تھا۔

صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ شخص گھر سے ہی لڑائی کا تہیہ کر کے آیا تھا اور اس معرکے سے بڑا محظوظ ہو رہا تھا۔ اس کی گویا پشت پر بھی آنکھیں تھیں۔ اس نے کھرچنا یوں پکڑ لیا

کہ کسی کو ضرب لگائے تو پھل کی طرف سے نہ لگے۔ صرف سلاخ کی طرف سے لگے۔ یہ سلاخ اس نے ایک ہی وار میں یوں گھمائی کہ کسرتی جسموں والے تین ملازم تو ایک ساتھ ہی دہرے ہو کر فرش پر ڈھیر ہو گئے اور یوں تڑپنے لگے گویا ان کی کمریں ٹوٹ گئی ہوں حالانکہ چندن بابا نے اس وار میں شاید آدھی طاقت بھی استعمال نہیں کی تھی۔ اس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے دیہات کے کسی اسکول ٹیچر نے لڑکوں کو سرزنش کرنے کے لئے بید گھمایا ہو۔ اگر وہ پوری طاقت استعمال کرتا تو شاید سلاخ ان کے جسموں سے کسی دھار دار چیز کی طرح گزر جاتی۔

دوسرے وار میں باقی دو جوان بھی اوندھے ہو گئے اور چند لمحے بعد ان سب نے اپنی اپنی جگہ ساکت ہو جانے کا عقلمندانہ فیصلہ کیا۔ چندن بابا نے کھرچنا نہایت اطمینان سے چبوترے سے ٹکا کر کھڑا کر دیا۔

"ان بالکوں کو کیوں اس نوجوانی میں ہڈی سینے کا کوئی روگ لگواؤ گے میرے میٹھے گلگلے۔" چندن نے ایک بار پھر پہلے ہی کی طرح انگلی سے بڑے پہلوان کے گال کو چھیڑا۔ بڑے پہلوان اب براہ راست اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پھنکار رہے تھے۔ بلاشبہ ابھی ان کی آنکھوں میں مرعوبیت کا کوئی نشان نہیں تھا تامل کی وجہ شاید یہ تھی کہ وہ پوری طرح اپنے آپ کو اشتعال میں لانے کی کوشش کر رہے تھے ابھی شاید کچھ کسر باقی تھی۔

لیکن میرا یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ دراصل ان سے پہلے ان کے چاروں چھوٹے بھائیوں کی باری تھی اور شاید یہ ان کے اکھاڑے کا اصول تھا جسے وہ یہاں بھی توڑنا نہیں چاہتے تھے۔ یہ چاروں بھائی بھی بڑی بڑی پگڑیاں باندھتے تھے مگر اس وقت جب میں نے انہیں دکان کے اندرونی حصوں سے نکلتے دیکھا تو ان کے سروں پر پگڑیاں نہیں تھیں اور آستین چڑھی ہوئی تھیں۔ وہ پیچھے سے آئے تھے اور ایک طرح سے انہوں نے چندن بابا کو دھوکے سے پکڑا تھا۔

ان میں سے دو نے چندن کی گردن پر ہاتھ ڈالا اور دو نے جھک کر اس کی ٹانگیں پکڑنے کی کوشش کی تھی انداز یہی تھا کہ وہ ایک بھاری برتن کی طرح چندن بابا کو اٹھائیں گے اور فرش پر مار کر چور کر دیں گے۔ مگر ایسا نہیں ہو سکا۔ چندن تڑپ کر ان کی گرفت سے نکلا دو کے سر آپس میں ٹکرائے اور ایک کو اٹھا کر باقی تینوں پر یوں دے مارا کہ چاروں بھائی بوریوں کی طرح اوپر نیچے ڈھیر ہو گئے تاہم وہ جلد ہی اٹھے اور پہلے سے زیادہ جوش و خروش اور خونخواری سے چندن بابا پر پلٹے۔

لڑتے لڑتے وہ سڑک پر آ گئے تھے اور لوگ جمع ہونے لگے۔ تاہم میں بلندی پر ہونے کی وجہ سے پورا منظر صاف طور پر دیکھ رہی تھی اور میری رگوں میں خون کی گردش اتنی تیز ہو چکی تھی کہ مجھے سانس لینے میں بھی دشواری پیش آ رہی تھی۔ مجھے چند ایک کشتیاں

دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا کیونکہ ان دنوں کشتی عملی طور پر ہندوستانی تہذیب کا ایک حصہ تھی مگر بڑے بڑے نامی پہلوانوں میں میں نے ایسی پھرتی طاقت اور داؤ کا بیک وقت ایسا عجیب مظاہرہ نہیں دیکھا تھا جو یہ شخص چندن بابا پکی سڑک پر ایک محدود سی جگہ میں چار کیم شحیم پہلوانوں سے لڑتے ہوئے پیش کر رہا تھا۔ بے شک یہ پہلوان سابق ہی سہی مگر انہیں اکھاڑا چھوڑے ہوئے زیادہ مدت تو نہیں ہوئی تھی اور طاقت اور داؤ پیچ میں بہرحال وہ بہت سے طاقت ور انسانوں سے کہیں برتر تھے۔

مگر یہ کم بخت چندن بابا شاید لوہے سے بنا ہوا تھا جس میں بجلی دوڑ رہی تھی وہ ان چاروں کو یوں اٹھا اٹھا کر پٹخ رہا تھا جیسے وہ روئی کے بورے ہوں بالآخر ان میں سے دو تو پختہ سڑک سے ٹکرا ٹکرا کر ساکت ہو گئے تھے اور ان کے سروں سے اور شاید چہروں کے بعض حصوں سے بھی خون بہہ رہا تھا۔ باقی دو اب بھی چندن بابا کو قابو کرنے کے لئے اپنی سی کوشش کر رہے تھے۔ دفعتہ" چندن بابا نے ہاتھ ترچھا کر کے کلہاڑی کی طرح یکے بعد دیگرے دونوں بھائیوں کی کنپٹیوں پر رسید کیا اور دونوں طوفان سے اکھڑے ہوئے درخت کی طرح جھکولا کھا کر اپنے بے ہوش بھائیوں کے قریب ہی ڈھیر ہو گئے۔

چندن بابا نے پلٹ کر بڑے پہلوان کی طرف دیکھا جو اب بھی چبوترے پر ساکت بیٹھا تھا۔ اس کا سپید چہرہ تپے ہوئے تانبے کی طرح سرخ ہو چکا تھا۔ یہ ایک حیرت انگیز بات تھی کہ وہ اب بھی سراسیمہ نہیں ہوا تھا پھر اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز طور پر میں نے اسے یوں اٹھ کر ہوا میں چھلانگ لگا کر چندن بابا کی طرف آتے دیکھا جیسے کسی بہت بڑے اور طاقت ور اسپرنگ نے اسے اس کی جگہ سے اچھال دیا ہو۔ اس کے بے تحاشا پھیلے ہوئے تن و توش اور بھاری بھرکم توند [illegible] رکھتے ہوئے اس کا یوں عقاب کی سی اڑان کے ساتھ جھپٹنا بلاشبہ ایک طلسمی سا کارنامہ تھا۔

چند منٹ کی اس معرکہ آرائی میں پہلی مرتبہ میں نے چندن بابا کو گرتے دیکھا۔ بڑا پہلوان اس پر سوار تھا مگر دوسرے ہی لمحے وہ بہت بڑے گولے کی طرح ہوا میں کئی فٹ اچھلا اور دھپ سے سڑک پر آ گرا کیونکہ چندن اس کے نیچے سے نکل چکا تھا اب چندن کو شاید غصہ آ گیا تھا کیونکہ میں نے اس کے انداز میں وحشت انگیزی محسوس کی۔

اس نے بڑے پہلوان کو سنبھلنے نہیں دیا۔ اس کی پگڑی ایک طرف کو لڑھک چکی تھی۔ چندن نے دونوں ہاتھ جوڑ کر اس کے ضرب لگائی جس نے بڑے پہلوان کو اٹھ کر کھڑا ہونے سے باز رکھا۔ چندن نے اب داؤ پیچ کی بجائے گھونسوں گھٹنے کی ضربوں اور کہنی کے واروں سے بڑے پہلوان کو نیم بے ہوش سا کر کے رکھ دیا۔ وہ گھٹنوں کے بل کھڑا یوں جھول رہا تھا جیسے اس کی بینائی جواب دے چکی ہو بار بار تکلیف آمیز انداز میں سر کو جھٹکے دے رہا تھا۔

اس کے چہرے سے بھی خون پھوٹ پڑا تھا اور مونچھیں ڈھلک گئی تھیں چندن بابا نے اسے مارنا بند کر دیا تھا اور کھڑا اپنے کپڑے جھاڑ رہا تھا۔ دفعتہ" بھیڑ کو چیرتے ہوئے دو سپاہی آگے آئے۔ پہلے انہوں نے حیرت سے بے ہوش اور نیم بے ہوش پہلوانوں کی طرف دیکھا پھر جھجکتے ہوئے یوں چندن بابا کی طرف دیکھا جیسے بونے قطب مینار کو دیکھ رہے ہوں۔ ایک نے تو باقاعدہ عورتوں کی طرح دانتوں میں انگلی دے لی۔

"تم نے ان کو مارا ہے؟" ایک نے اپنی چھڑی سے پہلوانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چندن سے پوچھا۔

"ان کو ہوش میں لا کر انہی سے پوچھ لو۔" چندن بابا نے اپنی آستین درست کرتے ہوئے لاپروائی سے جواب دیا۔

"بلوہ کرتے ہو' بدمعاشی دکھاتے ہو؟" ایک سپاہی نے اپنی آواز میں کڑک پیدا کرنے کی کوشش کی مگر انداز ایسا ہی تھا جیسے کوئی بچہ نقاب لگا کر باپ کو ڈرانے کی کوشش کر رہا ہو۔ دونوں سپاہیوں نے چندن بابا کا ایک ایک بازو پکڑ لیا ان کے سر چندن بابا کے کندھوں سے بھی نیچے تھے۔

"چلو تھانے!" دوسرے نے بھی ہمت کر کے کہا۔

اس اثناء میں بڑا پہلوان سنبھل کر اٹھ کھڑا ہوا تھا سب سے پہلے اس نے پگڑی تلاش کر کے سر پر رکھی۔ پگڑی کا ایک سرا اس کے سینے پر ڈھلک آیا جس سے اس نے اپنا چہرہ پونچھا اور چندن کے سامنے آکر بغور اس کا چہرہ دیکھنے لگا وہ دیکھ رہا تھا چندن کو مگر مخاطب سپاہیوں کو کیا۔ "اسے چھوڑ دیجئے سنتری جی غلطی ہماری ہی تھی..... ہماری..... " اس کی پاٹ دار آواز بھرا گئی۔

"آپ کی؟" سپاہی بھونچکا رہ گئے۔ "آپ کی کیا غلطی تھی.... پہلوان جی؟" ایک نے پوچھا۔

"بس کہہ جو دیا کہ غلطی ہماری تھی۔" بڑے پہلوان کی آواز کچھ اور بلند ہوئی مگر پہلے سے زیادہ بھرا گئی وہ سر جھکا کر پگڑی کے پلو سے آنکھیں پونچھنے لگا۔

"آخر کچھ ہمیں بھی تو پتہ چلے کہ غلطی کیا تھی؟" ایک سپاہی نے کہا اس کے تلفظ سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ہندو ہے۔ "آخر ہمیں پرچہ کاٹنا ہے۔"

"کوئی پرچہ ورچہ نہیں کٹے گا سنتری جی!" بڑا پہلوان یکلخت ہی بدلی سی آواز میں غرایا مگر فوراً" ہی پگڑی کے پلو سے دوبارہ آنکھیں پونچھنے لگا اور پہلے جیسے ہی بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "غلطی ہماری تھی کہ ہم پہلوانی چھوڑ کر تجارت میں پڑ گئے۔" یہ جملے اس نے خود کلامی کے سے لہجے میں ادا کیے تھے۔ پھر وہ قدرے بلند آواز میں بولا۔ "اس جوان نے کہا تھا کہ دودھ اچھا نہیں ہے ہم نے اس کی بات پر دھیان دینے کی بجائے اس سے جھگڑا

شروع کر دیا۔ اسے جانے دو سنتری بادشاہ یہ شیر آدمی ہے اسے چھوڑ دو چھوڑ دو اسے۔" وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر دکان کی طرف دوڑ گیا اور دروازہ بند کرنے لگا۔ سامان جوں کا توں پڑا تھا۔

"تو گویا تم اس شخص کے خلاف کوئی شکایت درج کرانا نہیں چاہتے؟" ایک سپاہی نے گویا تصدیق کی خاطر اس کے قریب جا کر پوچھا۔

"نہیں.... نہیں۔" بڑا پہلوان بدستور مجنونانہ لہجے میں بولا۔ "شکایت درج کرنی ہے تو ہمارے خلاف کر لو۔"

"اب تمہارے خلاف کیا شکایت لکھیں پہلوان جی تم شریف لوگ ہو۔" دوسرے سپاہی نے کہا اور چندن بابا کا بازو چھوڑ دیا۔

پہلوان نے دکان بند کر کے بڑا سا تالا ڈال دیا اور اپنے بھائیوں کو جھنجھوڑ کر جگانے لگا۔

"دکان کیوں بند کر دی؟ کہیں جا رہے ہو؟ ایک سپاہی نے جھک کر کہا۔

"بس جی! جہاں ایک دفعہ عزت خراب ہو جائے وہاں کیا رہنا کیا کاروبار کرنا۔" پہلوان جی نے اپنے ہونٹوں پر زبردستی ایک مسکراہٹ پیدا کی جو مسکراہٹ کم اور کسی اندرونی ٹیس کا کھچاؤ زیادہ معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے بھائی ایک ایک کر کے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

چندن بابا ایک طرف کھڑا نہایت سکون سے مونچھوں کو بل دے رہا تھا۔ بڑا پہلوان اور اس کے بھائی دیکھتے ہی دیکھتے نہ جانے کس طرف کو غائب ہو گئے۔ یکایک مجھے اپنے دل میں بڑے پہلوان کے لئے بے پناہ احترام محسوس ہوا۔

دفعتہ" چندن بابا نے ہجوم کو مخاطب کیا۔ "بھائیو! دکان دو تین دن بعد پھر کھلے گی صرف مالک بدل جائے گا۔ چیزیں آپ کو ویسی ہی ملیں گی بالکل فکر نہ کریں۔" یہ کہہ کر وہ اطمینان سے ایک طرف کو چل دیا گویا کوئی سیاسی لیڈر قوم سے نیا وعدہ کر کے تقریر ختم کر کے اسٹیج سے اتر کر اپنی نشست کی طرف جا رہا ہو۔

میں جو اب تک گویا تنویمی سی کیفیت میں کھڑی تھی چونک کر پلٹی۔ ایک بوڑھی خادمہ اور بالاخانے کی دوسری لڑکیاں میرے آس پاس ہی کھڑی تھیں۔ میں خادمہ کو بازو سے پکڑ کر ایک طرف لے گئی اور سرگوشی میں اس سے کہا۔ "یہ جو شخص جا رہا ہے اسے بلا کر لاؤ۔ بغلی دروازے سے لانا۔ اسے کہنا میری مالکن تم سے ایک بہت ضروری بات کرنا چاہتی ہیں..... اور بات تمہارے فائدے کی ہے۔"

کچھ دیر بعد میں نے بڑھیا کی رہنمائی میں چندن بابا کو بالاخانے کی سیڑھیاں چڑھتے دیکھا۔ وہ چیتے کی طرح چوکنا نظر آ رہا تھا اور یوں اوپر کو دیکھتے ہوئے سیڑھیاں چڑھ رہا تھا

جیسے اسے اندیشہ ہو کہ اوپر سے اس پر کوئی بم نہ پھینک دے۔ سیڑھیوں کے اختتام پر میں نے اس کا استقبال کیا۔

"کیا بات ہے بائی جی؟" اس نے اڑیل بھینسے کی طرح رک کر اکھڑے اکھڑے لہجے میں پوچھا۔ اس کی آنکھوں میں تجسس بھی تھا اور شکوک و شبہات کی پرچھائیاں بھی۔ اشتیاق کی چمک بھی تھی اور احتیاط کی جھلک بھی۔

اس کا لہجہ مجھے پسند نہیں آیا تاہم میں نے اپنی ناگواری کو مکمل طور پر چھپاتے ہوئے مسکرا کر شائستگی سے کہا۔ "تشریف تو لائیے جناب! ہم عورت ذات ہیں۔ آپ کو کھا تو نہیں جائیں گے۔"

"ہمیں کوئی کیا کھائے گا۔" اس کا زعم لوٹ آیا۔ "اور اگر کوئی مائی کا لال کھا بھی گیا تو ہضم کیسے کرے گا۔ ہم تو مگرمچھ کے پیٹ میں بھی تہلکہ مچا دیں گے۔" بازاری مخلوق تو میں بھی تھی لیکن بازاری پن اس کے لہجے میں تھا بہرحال وہ میرے پیچھے پیچھے آنے لگا۔ میں اسے کمرہ خاص میں لے آئی جہاں ہم لوگ خاص الخاص افراد سے اہم یا ہنگامی گفت و شنید کرنے کے لئے نشست رکھا کرتے تھے۔

چندن بابا نے دیہاتیوں کی سی حیرانی سے کمرے کی آرائش کا جائزہ لیا لیکن ساتھ ہی وہ چالاک شہریوں کی طرح مرعوب نہ نظر آنے کی حتی الامکان کوشش کر رہا تھا۔ "کیا پسند فرمائیں گے؟" میں نے پوچھا۔

"مطلب کی بات کرو بائی جی!" اس کا لہجہ بدستور اکھڑا اکھڑا سا تھا۔ "مجھے معلوم ہے اس بازار کی عورتیں اور خصوصاً" تمہارے جیسے ٹھاٹ باٹ والی عورتیں بلاوجہ کسی سے اتنی مہربانی سے پیش نہیں آتیں۔"

"تو میں نے کب کہا کہ میں بلاوجہ تم پر مہربان ہو رہی ہوں۔" میں نے پہلے ہی کی طرح نرمی سے کہا۔ "مجھے تم سے کام ہے۔"

"ذرا ٹھہر" اس نے واسکٹ کی کسی اندرونی جیب سے نوٹوں کی چند گڈیاں نکال کر تپائی پر رکھ دیں۔ "تمہاری نظر کسی طرح اس رقم پر تو نہیں پڑ گئی بائی جی؟" اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "اگر ایسی ہی کوئی بات ہے تو میں تمہیں پہلے ہی بتا دوں کہ یہ میری رقم نہیں ہے اس لئے میں اسے کوٹھے پر لٹانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا.... ارادہ کر بھی لوں تو اس پر عمل کرنا میرے بس کی بات نہیں۔"

میں نے اب بھی اس کے انداز گفتگو پر کوئی ناگواری ظاہر نہ کی۔ اس میں اس کا کوئی قصور نہ تھا صورتحال ہی کچھ ایسی تھی کہ اس کا شک زدہ ہونا بے جا نہ تھا اور پھر وہ نہ جانے کس ماحول کی پیداوار تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ اس سے شائستگی اور معاملہ فہمی کی توقع رکھی جاتی۔

اس کی جیب سے برآمد ہونے والی رقم گوکہ میرے اندازے کے مطابق پندرہ ہزار سے زیادہ نہیں تھی لیکن اس جیسے حلئے کے انسان کی مناسبت سے یہ بہت بڑی رقم تھی۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ابھی ہم اس مقام کو نہیں پہنچے کہ اتنی معمولی سی رقم ہتھیانے کے لئے لوگوں کو یوں دعوت دے کر بلاتے پھریں۔ ابھی تو بڑے بڑے دل والے ہمارے دروازے پر آتے ہیں اور اپنی مرضی سے اس سے بھی کہیں بڑی بڑی رقمیں لٹانے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ ویسے برسبیل تذکرہ یہ رقم ہے کس کی؟"

چند لمحے کے لئے وہ سوچ میں پڑ گیا پھر گویا کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑایا۔ "میرا خیال ہے تمہیں بتا دینے میں کوئی حرج نہیں تم بگاڑ ہی کیا سکتی ہو۔" پھر قدرے بلند آواز میں بولا۔ "یہ رقم میں سیٹھ ارجن لال سے وصول کر کے لایا ہوں اور باس کو پہنچانے جا رہا ہوں۔"

"باس کون ہے؟" میں نے قدرے چونک کر پوچھا۔

"باس ...." وہ کچھ گڑبڑا سا گیا۔ "باس بس باس ہے ..... مجھے نہیں معلوم وہ کون ہے' میں نے تو اس کی شکل تک نہیں دیکھی اور نہ ہی کبھی اس سے ملا ہوں۔"

"تو پھر رقم کیسے پہنچاؤ گے؟" میں نے کہا۔

"بس میں رات کو جا کر آرام سے اپنے کمرے میں سو جاؤں گا صبح مجھے دروازے کے نیچے چٹ پڑی مل جائے گی کہ پارسل فلاں جگہ کوڑے دان میں پھینک دو یا فلاں باغیچے کی کسی بنچ تلے رکھ دو اور فوراً کھسک جاؤ میں اس ہدایت پر عمل کروں گا مال خود ہی باس تک پہنچ جائے گا۔" اس نے قدرے اطمینان سے ٹانگیں پھیلا کر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔ اب اس کے چہرے پر اس داستان گو کی سی طمانیت نمودار ہوئی جسے مدت بعد کوئی سامع میسر آیا ہو۔

"واہ یہ تو بڑی جاسوسی قسم کی کہانی سنا رہے ہو تم.... جیسی انگریزی فلموں میں ہوتی ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ویسے یہ بتاؤ کہ کیا تم پڑھے ہوئے بھی ہو؟"

"کیوں نہیں۔" اس نے قدرے فخریہ لہجے میں کہا۔ "پانچویں جماعت پاس ہوں اچھی بھلی انگریزی بھی پڑھ لیتا ہوں لیکن بس ذرا ظاہری حلئے سے کچھ جاہل سا ہی لگتا ہوں.... ہے ناں....؟" اس نے تصدیق طلب نظروں سے میری طرف دیکھا اور خاموش مسکراہٹ کے سوا کوئی جواب نہ پا کر بڑی معصومیت سے اپنے سراپا پر نظر دوڑائی۔ میں بغور اس کی طرف دیکھ رہی تھی اور اس کی اب تک کی گفتگو کو تولنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی ذات کی ڈور کا سرا یقیناً" کسی پراسرار مقام تک پہنچا ہوا تھا اور شاید الجھا ہوا بھی تھا۔

اس سے کوئی بات کرنے سے پہلے اس کے متعلق زیادہ سے زیادہ جان لینا ضروری تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہ اپنی ذات کے بارے میں گفتگو کرنے میں زیادہ حیل و حجت سے کام

نہیں لے گا خصوصاً" میرے سامنے۔

"چندن بابا...!" میں نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ اس نے میری بات کاٹ کر پوچھا۔" تمہیں میرا نام کیسے معلوم ہوا؟"

"باہر پہلوانوں کی دکان پر دھینگا مشتی کرنے سے پہلے تم نے خود ہی سینہ ٹھونک کر اپنا نام لیا تھا۔" میں نے کہا۔ "میں نہ صرف سب کچھ دیکھ رہی تھی بلکہ سن بھی رہی تھی۔"

"اوہ۔" اس نے اطمینان کی سانس لی۔ "ہاں تو تم کیا کہہ رہی تھیں"

"میں یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ اپنے متعلق کچھ تفصیل سے بتاؤ تم کون ہو کہاں سے آئے ہو یہ باس وغیرہ کا کیا چکر ہے میں تمہارے متعلق سب کچھ جاننا چاہتی ہوں۔" میرے لہجے میں جو اشتیاق جھلک رہا تھا وہ مصنوعی نہیں تھا۔

"لیکن تم سب کچھ کیوں جاننا چاہتی ہو؟" اس کے لہجے میں ایک بار پھر شک در آیا۔

"اس لئے کہ شاید ہم ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "میں تم سے ایک اہم معاہدہ کرنا چاہتی ہوں...... تمہیں ایک پیش کش کرنا چاہتی ہوں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ مجھے تمہارے متعلق سب کچھ معلوم ہو کیونکہ معاملہ بڑا نازک ہے بہرحال اگر تمہارے متعلق سب کچھ جان لینے کے بعد میں محسوس کروں گی کہ تم میرے مطلب کے آدمی نہیں ہو تو ہم نہایت دیانتداری سے سب کچھ بھول جائیں گے.... یہ بھی بھول جائیں گے کہ اس کمرے میں ہماری کوئی ملاقات بھی ہوئی تھی ٹھیک؟"

"وہ تو ٹھیک ہے۔" اس نے بھی نہایت سنجیدگی سے کچھ سوچتے ہوئے میری آنکھوں میں جھانکا۔ "تم کہہ رہی ہو کہ معاملہ نازک ہے اور میں سوچ رہا ہوں کہ میری کہانی میں تو کئی معاملے نازک ہیں کئی راز کی باتیں ہیں۔ میں اپنا ٹینٹوا تمہارے ہاتھ میں کیسے دے دوں؟"

"رازوں کے تبادلے ہی کے لئے تو میں نے تمہیں بلایا ہے۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اور پھر میں کہہ تو چکی ہوں کہ اگر بات نہ بنی تو ہم اس ملاقات کو بھول جائیں گے تم غالباً" بدمعاش ہو اور میں بازاری عورت۔ اگر ہم ہی عہد کی پاسداری نہیں کریں گے تو کون کرے گا؟ شرفاء نے تو یہ کام کب کا چھوڑ دیا ہے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔" اس نے ایک گونج دار سا قہقہہ لگا کر کہا چند لمحے کے لئے وہ سوچ میں ڈوب گیا پیشانی پر شکنیں ابھر آئی تھیں گویا فیصلہ نہ کر پا رہا ہو کہ بات کہاں سے شروع کرے۔ پھر اچانک ہی بولا۔ "میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے کہ تفصیل سے سب کچھ بتاؤں۔ ویسے بھی میں موٹے دماغ کا آدمی ہوں پرانی باتوں کی تفصیل مجھے یاد نہیں رہتی۔" اس نے ایک گہری سی سانس لے کر صوفے پر پہلو بدلا اور ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔

"میرا اصل نام غوث بخش ہے۔" ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے یک لخت کہا۔

"اور میں امرتسر کے قریب ایک گاؤں حضور پور کا رہنے والا ہوں یہ گاؤں مسلمانوں کا ہے اور زمینداری بھی وہاں مسلمانوں ہی کی قائم ہے۔ زمین تقریباً" ساری کی ساری چوہدری عاقل نامی ایک شخصیت کی ملکیت ہے۔ میرا مطلب ہے کہ سات سال پہلے جب میں وہاں سے بھاگا تھا تب تک تو اسی کی ملکیت تھی آج کل کا پتا نہیں۔" اس نے ایک لمحے کے لئے خاموش ہو کر گہری سانس لی اور عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔

"کچھ لوگ امیر زادے ہوتے ہیں کچھ نوابزادے کہلاتے ہیں کسی کو لوگ مروتاً" شریف زادہ اور کسی کو احتراماً" صاحبزادہ کہہ کر بلا لیتے ہیں لیکن میں اپنے گاؤں میں چمار زادہ مشہور تھا۔ وجہ یہ تھی کہ قحط کی زمانے میں میرے باپ نے کچھ عرصے کاشتکاری چھوڑ کر جوتے گانٹھنے کا کام کیا تھا۔ لیکن یہ میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے کی بات تھی۔

"جب میں نے ہوش سنبھالا تو میرا باپ پہلے ہی کی طرح چوہدری عاقل کا مزارع تھا لیکن اس کے نام کے ساتھ لفظ چمار مستقل طور پر نتھی ہو چکا تھا۔ وہ بے چارہ شریف آدمی تھا ایک دو مرتبہ اس نے دبی دبی زبان سے احتجاج کیا تو پھر وہ بھی چھوڑ دیا۔

"میرے جوان ہونے تک میرا باپ سانپ کے کاٹے سے مر چکا تھا مگر ورثے میں مجھے چمار زادے کا خطاب دے گیا تھا جوان ہونے سے پہلے ہی میں چوہدری کے مزارعوں کی صف میں شامل ہو چکا تھا۔ باپ کی موت کے بعد بھی انہی زمینوں پر خون پسینہ ایک کرتا رہا۔ ماں میری پہلے ہی مر چکی تھی۔ اس لئے بس ایک عجیب خالی خالی اور بیکار سی زندگی تھی جو میں گزار رہا تھا۔

"ہاں یہ تو میں تمہیں بتانا ہی بھول گیا کہ میرا قد کاٹھ بچپن ہی سے غیر معمولی تھا گھر میں روپیہ کپڑا لتا نہیں تھا مگر کھانے پینے کی چیزوں کی کمی نہیں تھی۔ بھینس بھی تھی میں ڈٹ کر کھاتا تھا اور ڈٹ کر کام کرتا تھا۔ دن بھر کھیتوں میں کام کرنے اور جان توڑنے کے باوجود جسم میں کوئی بجلی سی لہریں لیتی رہتی' بے چین کئے رکھتی چنانچہ میں اکھاڑے چلا جاتا اور اپنی عمر سے بڑے بڑے اور پختہ کار گبھروؤں سے گھنٹوں زور آزمائی کرتا۔

"اپنی غیر معمولی طاقت کا احساس مجھے اس دن ہوا جس دن ایک آوارہ بیل نہ جانے کس ترنگ میں آکر پھنکاریں مارتا اور فصلوں کو روندتا پگڈنڈی پر میرے سامنے آگیا بلکہ میرے سامنے نہیں یوں کہئے کہ اس کم عمر اور نوخیز کامنی سی لڑکی کے سامنے آگیا جو میرے آگے آگے جا رہی تھی اور میں اس کی لچکیلی کمر پر نظر گاڑے حکم کے غلام کی طرح اس کے پیچھے چلا جا رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس کی لچکیلی کمر کے نظارے سے دل بھرے تو تیز تیز قدموں سے آگے نکل کر اس کا چہرہ دیکھوں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ کون تھی اس کا لباس بہرحال امیرانہ تھا اور اس قسم کے رکھ رکھاؤ کی لڑکی کو میں نے پہلی ہی مرتبہ اس پگڈنڈی پر دیکھا تھا۔

"ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ بیل اچانک ہی منہ سے جھاگ اڑاتا اس کے سامنے آگیا وہ دہشت زدہ ہو کر چیخی اور الٹے قدموں بھاگنے کی کوشش میں چت گر پڑی۔ قریب تھا کہ بیل اسے کچل دیتا کہ میں نے گویا کسی خواب سے بیدار ہو کر لمبی چھلانگ لگائی اور بیل جو صرف ایک ثانیے کے لئے ہی ٹھٹکا تھا کو دونوں سینگوں سے پکڑ لیا۔

"اب اگر یہ کہوں گا کہ میں نے اس توانا اور بپھرے ہوئے بیل کے پاؤں زمین سے اکھاڑ دیئے تھے تو تم شاید گپ سمجھو گی۔ اس لئے اس بات کو میں یہیں چھوڑتا ہوں اور مختصراً تمہیں لڑکی کے بارے میں بتاتا ہوں۔

"مصیبت ٹلنے کے بعد وہ کپڑے جھاڑ کر کھڑی ہوئی تو میں نے دیکھا وہ سرو کے بوٹے کی طرح سیدھی اور لمبی لڑکی تھی مگر سرو کی طرح سپاٹ بہرحال نہیں تھی اس کی آنکھیں بن کاجل کے کالی اور نشیلی تھیں جیسی تصویروں میں ہوتی ہیں بلکہ وہ پوری کی پوری سر سے پاؤں تک تصویر ہی تھی جس میں اللہ نے جان ڈال دی تھی۔"

"سیاہ ریشمی لنگی' سفید بوسکی کا کرتہ اور اس کی پشت پر پھیلے ہوئے کولھوں سے نیچے تک پہنچے ہوئے سیاہ ریشمی بالوں کی گھٹائیں اور کانوں میں سونے کے بڑے بڑے جھمکے پیروں میں زری کی جوتیاں' اس کی طرف ایک بار دیکھ کر نظریں ہٹا لینا بہت ہی مشکل تھا۔

اس کے وجود پر جو تھوڑی بہت گرد باقی لگی رہ گئی تھی اسے بھی نہایت نفاست سے صاف کرنے کے بعد اس نے اپنے وجود کو چادر میں لپیٹا نظریں بھر کر میری طرف دیکھا اور میرے پیروں تلے سے گویا زمین کھینچ لی۔ میں ہوا میں تیرنے لگا اس نے صرف ایک لفظ شکریہ کہا اور آگے بڑھ گئی اس کے بعد ایک عرصے تک میں نے اسے دوبارہ نہیں دیکھا۔

میں تمہیں یہ بھی بتاتا چلوں کہ زور آزمائی اور نت نئے جسمانی کرتب سیکھنے کے ساتھ ساتھ مجھے دو شوق اور تھے ایک بنسری بجانا دوسرے ہیر گانا۔ چاندنی راتوں میں یہ شوق کچھ زیادہ ہی عود کر آتے اور میں ندی کے کنارے درخت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کئے بنسری بجاتا رہتا یا پھر اونچے سروں میں ہیر گاتا۔

میری عمر ان دنوں چوبیس برس تھی۔ میں پہاڑ ہو چکا تھا اور پہاڑ بھی ایسا جسے خواہشوں نے آتش فشاں بنا رکھا تھا..... آنکھیں بند کر کے ہیر گاتے وقت میں اپنے آپ کو رانجھا محسوس کرتا۔ جو اپنی ہیر کا انتظار کر رہا تھا مگر میری ہیر نہیں آتی تھی۔ ہوتی تو آتی۔ ہیر کا تصور کرتے وقت میری بند آنکھوں میں ایک دھندلی دھندلی سی تصویر اتر آتی' سرو قد آنکھیں بن کاجل کے کالی اور بن پیئے نشیلی' سیاہ ریشمی لنگی' سفید بوسکی کا کرتہ' سیاہ ریشمی بالوں کی گھٹائیں اور..... اور وہ مترنم آواز میں ایک لفظ شکریہ...

"پھر ایک روز بنسری بجاتے وقت میں نے ایک خواب دیکھا کہ وہی سرو قد لڑکی چاندنی میں نہائی' زلفوں کی گھٹائیں اپنے کندھوں پر بکھیرے میرے سامنے کھڑی ہے۔ اس کی ناک میں ہیرے کا لونگ لش لش چمک رہا ہے۔

پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر میرے ہاتھوں سے بنسری لے لی اور میں نے بالکل اس طرح چھوڑ دی جیسے میرے ہاتھوں میں جان ہی نہیں رہ گئی تھی۔ تب ایک لمحے کے لئے مجھے سوچنا پڑا کہ شاید یہ خواب نہیں ہے۔ میں نے اپنی انگلی دانتوں میں دبائی اور کچھ زیادہ ہی زور سے دبا لی کہ خون ٹپکنے لگا۔ اپنے آپ کو مزید یقین دلانے کے لئے میں نے اس سے کہا۔ "میری بنسری واپس کر دو۔"

اس نے بنسری میری طرف بڑھائی لیکن ساتھ ہی کہا۔ "اب اور مت بجاؤ اتنی درد ناک دھن سن کر میرا کلیجہ شق ہونے لگتا ہے۔"

اب مجھے اس میں کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ یہ خواب نہیں تھا فریب نظر نہیں تھا حقیقت تھی... وہی کھنک دار آواز جیسے چاندی کے برتن آپس میں ٹکرا گئے ہوں' وہی نشیلی آنکھیں جو قدموں تلے زمین شق کر دیتی تھیں۔

وہ میرے قریب ہی اس پتھر پر بیٹھ گئی جس پر دن میں عورتیں کپڑے دھوتی تھیں۔

"میں نے سنا تھا بنسری کی آواز میں جادو ہوتا ہے۔" اس نے سرگوشی کی مگر اس سرگوشی میں بھی ترنم تھا۔ "لیکن یقین تمہاری بنسری سن کر آیا ہے میں نے سینکڑوں مرتبہ یہ دھن سنی ہے اور ہر بار بے چین ہو کر بستر پر کروٹیں بدلنے لگی ہوں لیکن ساتھ ہی میرا یہ بھی دل چاہتا ہے کہ بنسری خاموش نہ ہو' بجتی رہے۔"

"میں اب پوری طرح ہوش و حواس میں آچکا تھا۔ وہ میرے اتنے قریب بیٹھی تھی کہ مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے وجود سے مقناطیسیت کی لہریں یا پھر شاید کسی غیر مرئی سورج کی کرنیں پھوٹ رہی ہیں اور میرے جسم میں جذب ہو رہی ہیں۔ کافی دیر تک ہم خاموش بیٹھے رہے اس نے کہنیاں گود میں نکالی تھیں اور ہتھیلیوں کے حلقے میں چہرے کو محصور کئے نہر کے پانی کو تک رہی تھی جو چاندنی میں سیال چاندی کی طرح جھلملا رہا تھا۔

"تمہیں معلوم ہے میں کون ہوں" دفعتہ" اس کی سرگوشی ایک بار پھر ابھری۔ میں نے خشک گلے سے تھوک نگلا اور نفی میں سرہلایا تب اس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر گویا اپنے آپ سے کہا۔ "اس کا مطلب ہے میرے عشق کی تپش تم تک نہیں پہنچی۔ میں تو تمہارے بارے میں سب کچھ جانتی ہوں۔ تم کہاں رہتے ہو کیا کرتے ہو' تمہیں کتنی مزدوری ملتی ہے' فصل کٹنے پر کتنا غلہ ملتا ہے' تم نے کشتی میں کن کن کو ہرایا۔ مجھے تمہارے متعلق سب کچھ معلوم ہے۔ اس دن سے جب تم نے مجھے بیل کے نیچے کچلے جانے سے بچا لیا تھا۔ اس دن کے بعد سے مجھے تمہارے بارے میں ہر بات معلوم ہے مگر تم مجھے بھول گئے ہو گے۔

میں نے جلدی سے تردید کی۔ "نہیں ...... نہیں .... میں ہرگز نہیں بھولا مگر میں نے تمہارے بارے میں جاننے کی کوشش نہیں کی کہ میں کس سے پوچھوں۔"

اس نے اپنی زری کی جوتی کی نوک سے نہر کے کنارے کی نم آلود مٹی پر لکیریں کھینچتے

ہوئے کہا۔ "اچھا ہی کیا تم نے جو کسی سے نہیں پوچھا' پوچھنے کا بھی ایک ڈھنگ ہوتا ہے۔"

"تم کون ہو.... کہاں رہتی ہو؟" میں نے اشتیاق سے پوچھا۔
"میں جاگیردار عاقل کی پوتی ہوں اور حویلی میں رہتی ہوں۔"
اس نے تمکنت سے جواب دیا۔

"یک لخت میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے عشق کا آتش فشاں برف ہو گیا۔ طلب کی تپش غائب ہو گئی' جذبے خواہشیں سب اڑنچھو ہو گئیں۔

ویسے تو میں بیلوں کو قلابازیاں کھلاتا تھا' شیر کو للکار سکتا تھا مگر جاگیرداروں کے گھر کا بارہ سال کا مجہول سا لڑکا بھی مجھے چمار زادہ کہہ کر بلا سکتا تھا اور دو جوتے مار کر اپنے پیروں میں بٹھا سکتا تھا مجھ سے جوتے چٹوا سکتا تھا۔

میں نے فوراً" اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے اور گڑگڑا کر کہا... "تم اپنے گھر واپس چلی جاؤ..... کسی نے ہمیں یہاں دیکھ لیا تو قیامت آجائے گی۔"

"وہ تلملا کر اٹھ کھڑی ہوئی جیسے کسی نے اس کی منہ پر طمانچہ رسید کر دیا ہو اور زہر میں بجھے لہجے میں بولی۔ آخر کی نا وہی چماروں والی بات۔ اتنا بڑا ہاتھی جیسا ڈیل ڈول لئے پھرتا ہے اور سینے میں دل چڑیا سے بھی چھوٹا ہے۔"

"زندگی میں پہلی بار مجھے محسوس ہوا کہ ذلت' توہین یا بے عزتی کیا ہوتی ہے۔ اس سے پہلے جاگیرداروں نے کھیتوں میں کام کے دوران بات بے بات مجھے ٹھوکریں بھی ماری تھیں اور ہنٹر اور لاتیں بھی برسائی تھیں مگر مجھے کبھی بے عزتی کا احساس نہیں ہوا تھا۔

"یک لخت میرے اندر جیسے کسی زخمی شیر کی روح جاگ اٹھی میں نے آگے بڑھ کر لڑکی کے رخسار پر اتنے زور کا تھپڑ رسید کیا کہ وہ دور جا گری لیکن فوراً" ہی وہ اٹھی اور مجھ سے آلپٹی۔ خوشی سے مغلوب لہجے میں بولی۔ "میں تجھے ایسا ہی مرد دیکھنا چاہتی ہوں جو صرف اکھاڑے ہی میں اپنی دہشت نہ پھیلائے بلکہ عام زندگی میں بھی اپنی بے عزتی کرنے والوں کو چھٹی کا دودھ یاد دلا دے۔"

"میں نے اس کی یہ فرمائش گرہ سے باندھ لی اور ایک نیا ہی انسان بن گیا لیکن یہ نئی زندگی مجھے کچھ زیادہ راس نہ آئی۔ عائشہ جس نے مجھے نیا انسان بنایا تھا مجھ سے ملنے آتی رہی۔ ایک روز وہ ملنے آئی تو پیچھے پیچھے اس کا تقریباً" سارا خاندان بھی چلا آیا۔ اس کا باپ' بھائی' کئی چچا' کئی ماموں دادا اور نہ جانے کون کون تھا اور سب کے ہاتھوں میں گنڈاسے' بندوقیں یا خنجر تھے۔

○

عائشہ اس وقت میری گود میں سر رکھے لیٹی تھی اور ہمارے قدموں میں کشادہ نہر اپنی مخصوص سبک روی سے بہہ رہی تھی۔ ان سب نے جب ہمارے گرد گھیرا ڈالا تو ایک لمحے کے لئے جیسے نہر کا پانی' ہماری سانسیں اور کائنات کی حرکت سب کچھ رک گیا۔ ایک لمحے کے لئے ان میں سے بھی کوئی کچھ نہ بولا پھر عائشہ کے دادا نے آنکھوں ہی آنکھوں میں عائشہ کے باپ کو اشارہ کیا۔ اس کے بعد کا منظر آج بھی میری آنکھوں میں تازہ ہے جیسے چند لمحے پہلے کی بات ہو۔

عائشہ کے باپ نے عائشہ کو بالوں سے پکڑ کر زمین پر گرایا' اس کے سینے پر گھٹنا رکھا اور اس سے پہلے کہ میں سمجھ سکتا کہ کیا ہو رہا ہے اس نے یوں عائشہ کے گلے پر چھری پھیر دی جیسے کسی بھیڑ بکری کو ذبح کیا ہو۔ پھر اس نے اٹھ کر بالوں ہی سے پکڑ کر تڑپتی پھڑکتی لاش کو گھسیٹا اور نہر میں پھینک دیا۔ عائشہ کی آدھی سے زیادہ گردن کٹی ہوئی تھی اور اس سے بھل بھل خون بہہ رہا تھا۔ مجھے یاد ہے جب اس کے باپ نے اسے زمین پر گرایا تو اس کے حلق سے ایک نہایت مختصر' گھٹی گھٹی سی چیخ نکلی تھی جیسے اس نے مدد کے لئے مجھے بلایا ہو مگر میں بے بس دم بخود کھڑا رہ گیا۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے عائشہ کی لاش نے پانی میں دو تین غوطے کھائے۔ پانی میں کچھ دور تک سرخی پھیلی۔ پھر جوں جوں پانی کے بہاؤ کے ساتھ لاش دور ہوتی چلی گئی' سرخی بھی غائب ہو گئی۔ تب میں نے اس خالی چبوترے کی طرف دیکھا جہاں چند لمحے پہلے عائشہ میرے زانو پر سر رکھے لیٹی تھی۔ اسی لمحے میرے اندر جیسے پنجرہ سا کھل گیا اور بیسیوں درندے باہر آگئے۔ جھپٹ کر میں نے عائشہ کے باپ کی گردن دبوچی اور اس سے پہلے کہ وہ چھری میرے پہلو میں گھونپتا' اس کی گردن چٹ سے ٹوٹ چکی تھی۔ اس کے گرنے سے پہلے میں نے چھری اس کے ہاتھ سے نکالی اور جو بھی قریب نظر آیا اس کے پیٹ میں گھونپ دی اور ان کا گھیرا توڑ کر نکل آیا۔

ان میں سے کوئی فائر نہیں کر رہا تھا۔ دو تین آدمی مجھ پر گنڈاسوں سے وار کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ شاید وہ اس کارروائی کی کسی کو خبر نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ ان میں نے ایک کا گنڈاسا میرے ہاتھ آگیا۔ پھر نہ جانے کتنی لاشیں گریں۔ میں الٹے قدموں

پیچھے بھی ہٹتا جا رہا تھا اور گنڈاسا بھی گھمائے جا رہا تھا۔ دفعتہ" میں نے بندوق کا رخ اپنی طرف ہوتے دیکھا اور گنڈاسا چھوڑ کر نہر میں چھلانگ لگا دی۔ اپنے آس پاس مجھے پانی میں کئی گولیوں کی شپاشپ' سنائی دی تاہم میں پانی کے نیچے ہی تیرتا دوسرے کنارے کی طرف بڑھتا گیا۔ نہر کا پاٹ کافی چوڑا تھا۔ اندازاً بیچ میں پہنچ کر میں نے سر نکال کر پیچھے دیکھا۔ چار پانچ آدمی میرے پیچھے تیرتے آ رہے تھے۔ کچھ پانی کی سطح سے نیچے بھی ہوں گے۔ بہرحال جو مجھے نظر آ رہے تھے ان میں سے تین کے ہاتھ میں بندوقیں اور گولیوں کی پیٹیاں تھیں اور بندوق والے ہاتھ انہوں نے پانی کی سطح سے بلند رکھے تھے تاکہ بندوقیں اور گولیاں بھیگنے سے محفوظ رہیں۔

دوسرے کنارے پر پہنچ کر میں جنگل میں گھس گیا۔ گولیاں اب بھی میرے تعاقب میں تھیں اور فائروں کے دھماکوں سے چرند پرند بدحواس ہو کر اپنے ٹھکانوں سے نکل کر ادھر ادھر دوڑنے یا اڑنے لگے تھے۔ پھر میں اونچی اونچی گھاس کے ایک ایسے سلسلے میں گھس گیا جہاں انہیں میرے تعاقب کے سلسلے میں سمت کا اندازہ نہ رہا۔

پھر فائرنگ کے درمیانی وقفہ میں میں نے عائشہ کے بھائی کی للکار سنی۔ "غوثو! چمار کے بچے..... ! اب چاہے زندگی بھر بھاگتے رہنا میں پاتال تک تیرا پیچھا کروں گا۔"

بس تو پھر قصہ مختصر یہ کہ میں بھاگتا رہا۔ تین سال بھاگتا رہا۔ ایک شہر سے دوسرے شہر دوسرے سے تیسرے۔ کبھی کسی سمت میں کبھی کسی سمت میں اور بالاخر بمبئی پہنچ گیا۔ اتنی دور آکر بھی کافی دن تک مجھے خوف رہا کہ کوئی میرا تعاقب نہ کر رہا ہو' پیچھے سے مجھے گولی نہ مار دے۔ اس سے بھی زیادہ خوف مجھے پولیس سے آتا تھا۔ پولیس کے منحنی سے سپاہی کو دیکھ کر بھی میرے پسینے چھوٹنے لگتے تھے اور میں ادھر ادھر گلیوں میں گھس جاتا تھا۔ مگر جب کافی عرصے تک کچھ نہ ہوا تو مجھے اطمینان ہو گیا۔

ایک روز میں فٹ پاتھ پر سویا ہوا تھا کہ صبح ہی صبح چار تگڑے تگڑے اچکے سے آگئے۔ ایک نے ٹھوکر مار کر مجھے اٹھایا اور بولا۔ "کرایہ نکالو۔"

میں نے ہکا بکا ہو کر پوچھا۔ "کس چیز کا کرایہ؟"

بولا۔ "فٹ پاتھ پر رہنے کا۔ ادھر رہنا ہے تو ایک مہینے کا پیشگی کرایہ نکالو۔ پندرہ روپیہ۔"

میں نے مزید حیران ہو کر پوچھا۔ "فٹ پاتھ پر رہنے کا بھی کرایہ لگتا ہے؟"

اس نے میرے حیرت کی پروا کئے بغیر مجھے ایک اور ٹھوکر رسید کی اور بگڑ کر بولا۔ "ٹائم کھوٹی کیوں کرتا ہے۔ تم کو معلوم نہیں یہ جو مچھر دانیوں کی طرح کے کپڑے کی چار دیواریاں لگا لگا کر ادھر فٹ پاتھوں پر ہزاروں خاندان آباد ہیں یہ سب کرایہ دیتے ہیں۔"

میں نے ادب سے کہا۔ "مگر بھائی! میں تو چھڑا ہوں۔ آج یہاں ہوں' کل کہیں اور

ہوں گا۔ میں نے اگر ادھر رہنا ہوتا تو کرایہ دے دیتا۔"

اب اس شخص کے صبر کا پیمانہ گویا لبریز ہو گیا۔ چلا کر بولا ابے تین دن سے تو ہم تجھے یہاں دیکھ رہے ہیں۔ اب کرایہ ادا کرنا تجھ پر لازم ہو گیا ہے۔ ہماری طرف سے تو بھی گھر بسا' شادی کر' بچے پیدا کر' جو مرضی کر' مگر ہمیں کرایہ ضرور ادا کر۔"

میں نے گویا ایک اہم نکتے کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہا۔ "مگر بھائی صاحب! سڑکیں اور فٹ پاتھ تو سرکار کے ہوتے ہیں۔ کیا تم سرکار کی طرف سے کرایہ لینے آئے ہو؟"

اس نے غصے میں پہلے سے زیادہ زور سے مجھے ایک ٹھوکر رسید کی اور پہلے سے زیادہ بلند آواز میں بولا۔ "سرکار کی ایسی تیسی ادھر ہم خود سرکار ہیں۔"

اب بہت ہو چکی تھی' میں ٹھوکریں بھی کھا چکا تھا اور مجھے یہ تسلی بھی ہو چکی تھی کہ وہ سرکاری آدمی نہیں ہیں۔ چنانچہ میں نے اٹھ کر انہیں کرایہ ادا کرنا شروع کر دیا۔ گھونسوں تھپڑوں اور لاتوں کی شکل میں۔

وہ زیادہ دیر نہیں ٹکے۔ ابھی میں نے سختی بھی شروع نہیں کی تھی کہ بھاگ گئے۔ ان میں سے ایک نے چاقو بھی نکالا تھا مگر وہ وہیں پڑا رہ گیا۔ میں بھی وہاں سے کھسک لیا۔ اسی شام میں ایک فٹ پاتھیہ ہوٹل کے چھپر تلے بیٹھا تھا کہ ایک خوش پوش آدمی سر پر ہیٹ اور آنکھوں پر رنگین شیشوں کی عینک لگائے میرے قریب ہی بنچ پر آبیٹھا اور سرگوشی میں مجھ سے بولا۔ "نوکری چاہیے؟ لمبے ہی پیسے ملیں گے۔"

میں نے اثبات میں سرہلایا اور غور سے اس کی طرف دیکھا۔ بظاہر وہ شریف آدمی ہی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے بدستور سرگوشی میں کہا۔ "میرے ساتھ آؤ..... کسی شریفانہ جگہ پر چل کر بات کرتے ہیں۔"

میں اٹھ کر اس کے ساتھ ہو لیا۔ کار میں بیٹھ کر وہ مجھے کسی شریفانہ' جگہ پر لے گیا۔ وہ اس کا اپنا فلیٹ تھا جہاں دو سانولی سی لڑکیاں انتہائی شریفانہ لباس میں موسیقی کے ایک ریکارڈ کی دھن پر تھرک رہی تھیں۔

یہ شخص "باس" کا خاص آدمی تھا۔ اس کے توسط سے میں باس کے گروہ میں شامل ہوا۔ اسی نے مجھے ضروری تربیت دی' شہری زندگی گزارنا سکھائی۔ تاہم باس کے متعلق اسے بھی کچھ معلوم نہیں تھا۔ میری تربیت مکمل ہو گئی اور اپنا کام میں نے غیر معمولی کامیابی سے انجام دینا شروع کر دیا تو باس کا یہ خاص آدمی اپنا فلیٹ میرے حوالے کر کے غائب ہو گیا۔ ساری چیزیں جوں کی توں چھوڑ گیا' سوائے ان دو لڑکیوں کے انہیں وہ ساتھ ہی لے گیا چھوڑ بھی جاتا تو میرے کس کام کی تھیں؟ میری طرف تو عورت مسکرا کر بھی دیکھ لے تو میری آنکھوں میں فوراً" ایک گردن کٹی لاش ابھر آتی ہے جس کے نرخرے سے بھل بھل خون ابل رہا ہوتا ہے اور اس کی دہشت سے پھٹی پھٹی ساکت آنکھیں میری

طرف ایک سوال لئے دیکھ رہی ہوتی ہیں..... مجھے بچا نہیں سکے اور خود زندہ پھر رہے ہو بے غیرت۔

اس کے ساتھ ہی میرا جسم ٹھنڈا پڑ جاتا ہے اور میرے اندر کا آدمی مر جاتا ہے۔

چندن بابا نے خاموش ہو کر گہری سانس لی اور گویا کسی خواب سے چونکتے ہوئے بولا۔

"پہلی مرتبہ اپنی کہانی کسی کو سنائی ہے کیونکہ پہلی مرتبہ ہی کسی نے اتنی اپنائیت سے فرمائش کی ہے۔ اب تم بتاؤ تم کیا چاہتی ہو؟"

"تم نے یہ وضاحت تو کی ہی نہیں کہ گروہ میں تمہارا کام کیا ہے؟" میں نے ملامت سے پوچھا۔

"اس سے پہلے میں ایک وضاحت اور کر دوں کہ یہ میرا اپنا ہی خیال ہے کہ "باس" کا کوئی گروہ موجود ہے۔ ورنہ میں نے آج تک دو تین افراد کے سوا کسی کو نہیں دیکھا۔ ایک تو لڑکا سا ہی ہے جو عموماً" میرے لئے پیغام لے کر آتا ہے۔ زیادہ تر پیغامات مجھے ٹیلی فون پر ہی ملتے ہیں۔ دوسرا وہی باس کا خاص آدمی تھا جو بعد میں غائب ہو گیا۔ تیسرا ایک اور خاصی حد تک میری ہی طرح تگڑا آدمی ہے جس نے مجھے خنجر پستول کے نت نئے داؤ پیچ اور کار' لانچ وغیرہ چلانا سکھائی تھی۔ وہ بھی مجھے شاذ و نادر ہی نظر آتا ہے۔ باقی رہی میرے کام کی بات تو یہ بڑا لمبا چکر ہے۔ میرے کئی طرح کے کام ہیں۔ لیکن بنیادی طور پر میں وصولی کرنے والا آدمی ہوں مجھے حکم ملتا ہے کہ فلاں سیٹھ کے پاس چلے جاؤ یا فلاں بڑے آدمی کے پاس پہنچ جاؤ۔ وہ اتنی رقم لئے بیٹھا ہو گا اس سے لے کر فلاں جگہ پہنچا دو۔ بعض مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ میں رقم لینے پہنچا تو خنجر پستولوں سے مسلح کئی آدمی مجھے اپنے منتظر ملے وہاں مجھے اپنی مہارت اور طاقت دکھانی پڑی۔

"کبھی ایسا نہیں ہوا کہ تم رقم لینے پہنچے تو متعلقہ آدمی کے بجائے تمہیں وہاں پولیس والے بیٹھے ملے ہوں؟" میں نے پوچھا

"تمہیں رقم کی وصولی کے دوران کبھی ایسا نہیں ہوا۔ البتہ ویسے پولیس سے اکثر سامنا ہوتا رہتا ہے بلکہ جہانگیر نام کا ایک ایس پی ہے' وہ تو اکثر میری ٹوہ میں رہتا ہے۔ اسے باس' اس کے نامعلوم گروہ اور میری سرگرمیوں کی کچھ سن گن ملی ہوئی ہے۔ اس نے ایک بار مجھے بلوے کے الزام میں پکڑ بھی لیا تھا لیکن اگلے ہی روز دانت پیستے ہوئے نہ جانے کیوں رہا کر دیا۔ تاہم اس نے منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے یہ ضرور کہا تھا۔ "چندن! کچھ دن اور عیش کر لو۔ میں کوشش میں لگا ہوا ہوں جلد ہی تمہیں اور تمہارے پالن ہاروں کو ایسی جگہ دفن کروں گا جہاں سے تم کبھی سر نہیں نکال سکو گے۔" اس شخص سے حقیقتاً" مجھے خوف آتا ہے جب بھی میں اس کے شکنجے میں آگیا اور ساتھ ہی اگر میرے ماضی میں کئے ہوئے قتل بھی سامنے آگئے تو میں سیدھا پھانسی کے تختے پر پہنچ جاؤں گا۔ لیکن باس سے

میں نے جب بھی فون پر اس سلسلے میں بات کی تو اس نے اپنی دمے کے مریضوں جیسی ہنسی کے درمیان اڑا دی ہے اور لاپروائی سے کہتا ہے کہ ایس پی جہانگیر جیسے نہ جانے کتنے اس کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں اور اسے پانے کے بجائے خود نجانے کہاں پہنچ جاتے ہیں۔"

"وصولی کے علاوہ تمہارا کوئی کام نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے کہا ناں کہ لمبا چکر ہے۔ کبھی کبھی میں کسی لانچ پر مال کے ساتھ بطور محافظ بھی جاتا ہوں اور کیش وصول کر کے لانا میری ذمہ داری ہوتا ہے۔ کبھی مجھے کسی کارخانے یا سیاسی جلسہ میں تصادم شروع کرانے کا کام بھی انجام دینا پڑتا ہے اور وہ بھی اس طرح کے تصادم شروع ہوتے ہی میں خود کھسک جاؤں اور کوئی یہ نہ جان سکے کہ فساد کی اصل وجہ کون تھا۔ کبھی مجھے حکم ملتا ہے کہ باس فلاں جگہ پر واقع فلاں دکان کو بند دیکھنا چاہتا ہے یا فلاں جگہ کوئی دکان یا مارکیٹ بند پڑی ہے اور فلاں پارٹی اس کے کھلنے کے سلسلے میں مزاحمت کر رہی ہے اسے کھلواتا ہے اور فلاں پارٹی کے حوالے کرنا ہے وغیرہ وغیرہ۔"

"اور اس کے عوض تمہیں ملتا کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"سب کچھ ملتا ہے۔" اس نے گڑ بڑا کر کہا۔ "میرا مطلب ہے میری ہر ضرورت پوری ہوتی ہے۔ راج نگر میں فلیٹ ہے جس میں ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔ گاڑی ہے نوکر ہے' دکاندار کے ہاں سے سودا سلف آتا ہے جس کا بل مجھے نہیں معلوم کون ادا کرتا ہے اور اس کے علاوہ پانچ سو روپے نقد ہر مہینے خرچے پانی کے لئے مل جاتے ہیں۔ وہ بھی میرے لئے زیادہ ہی رہتے ہیں کیونکہ شراب یا سگریٹ میں نہیں پیتا کسی کے کوٹھے پر میں نہیں جاتا' عورت کے قریب پھٹکنے کی مجھ میں جرات نہیں رہی۔"

"اپنی جان کو سولی پر لٹکائے رکھنے کا تمہیں بس اتنا معاوضہ ملتا ہے کہ گزر بسر اچھی ہوتی رہے... تم دراصل بہت سیدھے ہو چندن بابا! اور بے وقوف بن رہے ہو۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ "تمہارے اس نام نہاد "باس" کا درحقیقت کوئی گروہ وغیرہ نہیں۔ گروہ تم خود ہی ہو..... وہ صرف کوئی اعلیٰ درجے کا بلیک میلر یا مڈل مین ہے جو پارٹیوں سے بڑے بڑے کاموں کے معاہدے کرتا ہے..... خود لمبی رقمیں کھینچتا ہے اور تم سے محض تنخواہ داری میں سارا کام لیتا ہے اور خود پس منظر میں ہی رہتا ہے کہ کل کو برا وقت آئے تو خود غائب ہو جائے اور تم پھنس جاؤ گے۔"

"یہ بات نہیں ہے۔" چندن نے اپنے نادیدہ باس کی وکالت کرتے ہوئے کہا۔ "میں کئی بار پھنسا ہوں ہمیشہ کسی غائبانہ ہاتھ نے ہی مجھے بچایا ہے۔ جو ظاہر ہے باس ہی کا تھا۔"

"یہ تو چھوٹے موٹے معاملوں میں پھنسنے کی بات ہے ناں۔ کبھی کسی لمبے چکر میں پھنسو گے تب دیکھنا۔" میں نے کہا۔

"لیکن جہاں تک روپے پیسے کا معاملہ ہے تو اب بھی ایک طرح سے میں باس کا ایک

لاکھ روپے کا مقروض ہوں۔ میں ایک بار ایک پارٹی سے ایک لاکھ روپیہ لے کر آرہا تھا کہ رات کے وقت کچھ لوگوں نے دھوکے سے مجھے روک کر میرے سر پر کوئی چیز مار کر مجھے بے ہوش کر دیا اور روپیہ لے اڑے۔ باس کو میں نے یہ بات بتائی تو اس نے صرف ایک لمحے کے لئے فون پر خاموشی اختیار کی پھر کہنے لگا روپے کی کوئی بات نہیں ..... غنیمت یہ ہے کہ تمہاری جان بچ گئی۔ پھر اس نے ہنستے ہوئے جتایا.... ویسے اب تم میرے ایک لاکھ کے مقروض ہو گئے ہو کیونکہ یہ رقم تمہاری بے وقوفی اور بے احتیاطی سے ضائع ہوئی ہے.... بہرحال اب تم میرا ساتھ چھوڑنے کا خیال بھی دل میں نہ لانا ورنہ میں نے تمہارے بعض کارناموں کے جو تصویری ثبوت محفوظ رکھے ہوئے ہیں ان کی بدولت تم باقی زندگی جیل میں ہی گزار دو گے... بات غالباً" باس نے اس لئے جتائی تھی کہ کچھ عرصہ پہلے میں کسی بات پر روٹھ کر کہہ چکا تھا کہ یہ دھندے میرے بس کی بات نہیں اور میں اب انہیں ترک کر کے کوئی شریفانہ کام کروں گا۔"

"میں اب بھی یہی کہوں گی چندن بابا کہ تم بے حد سیدھے انسان ہو.... اور باس جیسے شاطر آدمی کو تمہاری رفاقت میسر آجانا بلاشبہ اس کی خوش قسمتی کی دلیل ہے" میں نے کہا۔ "تمہیں غالباً" شبہ تک نہیں گزرا ہو گا کہ تمہارے قبضہ سے روپیہ چھینا جانا دراصل باس ہی کی چال بھی ہو سکتی ہے۔ تمہیں اپنا ممنون احسان کر کے ہمیشہ کے لئے زیر دام رکھنے کی غرض سے۔"

اس کی چوڑی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ وہ کم از کم ذہن پر زور دینے کے لئے تو تیار ہو گیا تھا۔ "ہو سکتا ہے۔" چند لمحے بعد بالآخر اس نے محتاط لہجے میں کہا۔ "مگر تم یہ ساری باتیں کیوں کر رہی ہو؟"

"میں تمہیں اس سے بہتر زندگی کی پیشکش کرنا چاہتی ہوں جس میں تمہارا بھی فائدہ ہے اور میرا بھی۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "آخر تم کب تک اس غیر یقینی اور خطرناک انداز سے زندگی گزارتے رہو گے؟ کب تک خوف و ہراس اور ہنگاموں سے الجھتے رہو گے؟ کبھی تمہیں کوئی حادثہ بھی پیش آسکتا ہے..... کسی تصادم میں تمہیں بھی کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ انسان تمام عمر جیتا ہی نہیں رہتا۔ بالفرض تم اپنے کسی عضو سے محروم ہو جاؤ اور لڑنا بھڑنا تو درکنار روزمرہ کے معمولات میں ہی دوسروں کے محتاج ہو جاؤ' تو کیا تمہیں یقین ہے کہ تب بھی تمہاری گزر بسر اسی طرح ہوتی رہے گی؟ تمہیں اسی طرح آنکھوں پر بٹھایا جاتا رہے گا اور تمہارے ہاتھوں زک اٹھانے والوں میں سے کوئی تم سے حساب برابر کرنے نہیں آئے گا؟"

"یہ سارے خطرات تو بجا ہیں لیکن بہرحال انسان کو کسی نہ کسی طرح زندگی گزارنا ہی ہوتی ہے اور خطرات سے تو کوئی بھی محفوظ نہیں۔ اچھا بھلا شریف اور امن پسند انسان راہ

چلتی کسی گاڑی تلے آکر مر جاتا ہے۔ عمارتیں گرنے یا آتشزدگی کے حادثوں میں کتنے انسان مر جاتے ہیں۔ موت تو ایک دن آنی ہی ہے۔" چندن نے فلسفہ پیش کیا۔

"احمقانہ سی بات ہے۔" میں نے بلا تامل کہا۔ "اگر سب تمہاری طرح سوچنے لگیں تو سب چور ڈاکو اور قاتل بن جائیں کہ موت تو ایک دن آنی ہی ہے کیوں نہ جی بھر کے تباہیاں مچالیں لیکن یہ جو دنیا کے ننانوے فیصد افراد پر سکون اور بے خطر زندگی کے لئے کوشاں رہتے ہیں کیا یہ سب پاگل ہیں؟ حادثوں میں مرجانا اور بات ہے لیکن حادثے کی صورت میں بھی انسان کی موت اور کتے کی موت میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے۔ آپ بے شک حادثاتی طور پر مرجائیں لیکن کوئی تو آپ کو اچھے لفظوں میں یاد کرنے والا دنیا میں باقی ہو' کوئی تو ہو جو آپ کا ذکر احترام سے کرے' کوئی تو ہو جسے آپ کی موت کا دکھ ہو۔ یہ بھی ایک بہت بڑی انسانی ضرورت ہے لیکن عموماً" ہمیں اس کا احساس تاخیر سے ہوتا ہے۔ کوئی وقت ایسا ضرور آئے گا جب تمہیں میری باتیں یاد آئیں گی لیکن اس وقت شاید تاخیر ہو چکی ہو اور تمہیں میرے جیسی پیشکش کرنے والا کوئی نہ ملے"

"تم بتاؤ تو سہی آخر چاہتی کیا ہو؟ انکار یا اقرار تو بعد کی بات ہے سوچ کر بھی جواب دیا جا سکتا ہے۔" چندن بابا نے کہا۔

"میرا ایک بیٹا ہے ابھی چھوٹا ہے نا سمجھ ہے۔" میں نے سر جھکا کر دھیمے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "میں نہیں چاہتی کہ وہ یہاں اس ماحول میں ہوش سنبھالے بلکہ میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ اسے معلوم ہو سکے کہ وہ ایک بازاری عورت کا بیٹا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ میں اسے ہر اعتبار سے ایک طاقتور انسان بنانا چاہتی ہوں۔ میرے ذہن میں تجویز یہ ہے کہ میں اسے بمبئی سے دور کسی اور شہر میں منتقل کر دوں۔ اس کے کام کاج اور نگہداشت کے لئے ایک گورنس موجود ہو گی۔ اس کے علاوہ مجھے اس کی تربیت اور حفاظت کے لئے تم جیسے ایک شہ زور کی ضرورت ہو گی جو بچپن سے ہی اسے ایک خاص نہج پر تربیت دے اور خلوص دل سے اپنی نگرانی میں اس کی پرورش کرے۔ اپنی اولاد کی طرح لگن اور محبت سے اپنا شہ زوری کا سارا اثاثہ اس میں منتقل کر دے۔ میری بات سمجھ رہے ہو ناں؟ اس مقصد کے لئے تمہیں میری پیشکش یہی ہے کہ میں تم لوگوں کو یعنی اپنے بیٹے' گورنس اور تمہارے لئے کسی اور شہر مثلاً" پونا میں کسی خوبصورت اور پرسکون علاقے میں بنگلہ لے دوں گی۔ تمام اخراجات میرے ذمے ہوں گے۔ جیب خرچ کے لئے تمہیں اب پانچ سو ماہانہ ملتا ہے مجھ سے چھ سو لے لینا اور اصل اہمیت ان چیزوں کی نہیں ہے بڑی بات تو یہ ہے کہ وہ ایک پرسکون اور شریفانہ زندگی ہو گی۔ تمہیں روز روز لوگوں سے لڑنے جھگڑنے اور خطرناک کاموں میں ہاتھ ڈالنے کے لئے نہیں جانا پڑے گا۔ کوئی پولیس والا تمہاری ٹوہ میں نہیں رہے گا۔ اپنی نیند سوؤ گے اور اپنی مرضی سے جاگو گے۔ کوئی تم پر حکم چلانے والا نہیں ہو

گا۔ البتہ تمہارے ہر آڑے وقت میں کام آنے کے لئے میں موجود ہوں گی۔ اس تجویز کی مزید تفصیلات بھی ہم طے کر لیں گے۔ بہرحال تم صرف یہ بتاؤ کہ بات تمہارے دل کو لگتی ہے یا نہیں... ؟"

"دل کو تو لگتی ہے۔" اس نے کچھ سوچ کر کہا۔ "لیکن میں ابھی کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ مجھے اس پر کچھ غور کرنے کی مہلت دو حالانکہ میں غور و فکر کرنے والا آدمی نہیں ہوں لیکن یوں اچانک تم سے ملاقات ہونے اور اس طرح بے ساختہ یہ ساری باتیں ہونے کے بعد میری عقل کچھ الجھ کر رہ گئی ہے۔ دوسرے جس طرح کی زندگی گزار رہا ہوں شاید یہ مجھے راس آگئی ہے میں اس میں رچ بس گیا ہوں۔ اس سے نکلنے کا سوچتے ہوئے مجھے بڑا عجیب سا لگتا ہے اس میں مجھے بڑا مزا آتا ہے۔"

"میرے بتائے ہوئے ڈھنگ سے زندگی گزارو گے تو کچھ دن بعد تمہیں وہ ایسی راس آئے گی کہ بعد میں آج کل کے زمانے کی باتیں سوچو گے تو کراہت آئے گی جب تم ایک ننھے اور معصوم بچے کی صحبت میں رہو گے اور ابتداء سے اس کی پرورش اور تربیت کرو گے تو تمہیں محسوس ہو گا کہ تمہاری زندگی کا کچھ مقصد ہے' تم کچھ تخلیق کر رہے ہو۔ تمہیں پہلے سے زیادہ لطف آئے گا۔

"تمہاری باتیں مجھے بڑی درست اور اچھی لگ رہی ہیں خاتون۔ لیکن بہرحال مجھے کچھ مہلت دو۔ اتنے اہم معاملات دو اجنبیوں کے درمیان اتنی جلدی تو طے نہیں پاتے۔ گو کہ تم مجھے اتنی اجنبی نہیں لگ رہیں۔ تمہاری شخصیت میں کوئی سحر ہے تبھی میں نے یوں بلاحیل و حجت تمہیں اپنی ساری زندگی کی کہانی سنا ڈالی۔ بہرحال بمبئی کی شہری زندگی میں میں نے جہاں اور بہت کچھ سیکھا ہے وہاں یہ بھی سیکھا ہے کہ جب کسی معاملے میں انسان الجھن میں پڑ جائے تو اسے فوری طور پر فیصلہ کرنے کے بجائے بات کسی اور وقت پر ٹال دینی چاہیے۔ چنانچہ میں کسی اور وقت آکر جواب دوں گا۔ اب میں چلتا ہوں۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا میں نے مزید کچھ نہ کہا اور اس کے ساتھ سیڑھیوں تک آئی۔ پہلی سیڑھی پر قدم رکھنے سے پہلے وہ مڑا اور گہری سنجیدگی سے بولا۔ "تم سے مل کر حقیقتاً بہت خوشی ہوئی ہے مدت بعد ایک شریف عورت سے ملاقات ہوئی بھی تو کہاں بازار حسن میں۔" پھر وہ بڑی ملائمت سے مسکرایا اب وہ ایک قطعی بدلا بدلا سا آدمی لگ رہا تھا۔ مہذب شائستہ اور نرم خو۔

"اتنی گہری گفتگو ہونے کے باوجود مجھے تمہارا نام اب تک معلوم نہیں ہو سکا خاتون!" اس نے ایک سیڑھی اتر کر کہا۔ اب بھی اس کا قد مجھ سے اونچا لگ رہا تھا جب کہ میں خود بھی عام قد و قامت کی عورت نہیں تھی۔

"مجھے عزیزہ خانم کہتے ہیں۔" میں نے اسے بتایا۔

"میری اس بازار میں کچھ زیادہ آمدورفت تو نہیں اس لئے مجھے یہاں کے معاملات میں کچھ زیادہ تجربہ نہیں۔" اس نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ "لیکن میں یقین سے اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ تم اس بازار کی مخلوق نہیں لگتیں۔ عزیزہ خانم! تمہاری ذات کے پیچھے بھی یقیناً کوئی طویل اور انوکھی داستان ہو گی۔ میں جب دوبارہ آؤں گا تو تم سے اس کہانی کے سنانے کی فرمائش کروں گا.... خدا حافظ۔" وہ رخصت ہو گیا۔

مجھے توقع تھی کہ وہ جلد دوبارہ آئے گا۔ اقرار کرنے کے لئے نہ سہی' انکار ہی کرنے۔ اس نے وعدہ بھی کیا تھا۔ مگر وہ نہ آیا.... ڈھائی ماہ گزر گئے۔

میں اس کی طرف سے مایوس ہو گئی اور اس کی آمد کی آس چھوڑ بیٹھی اور اس نا امیدی میں میری تشویش' اضطراب اور بے چینی انتہا کو پہنچنے لگی۔ مائیں اپنے لڑکوں کو ہوش سنبھالتے اور بڑھتے دیکھ کر خوشی سے پھولی نہیں سماتیں لیکن میں تمہیں اکثر اسی طرح دزدیدہ نظروں سے دیکھا کرتی تھی جیسے تم میری وہ بیٹی ہو جس کی جوانی ڈھلتی جا رہی ہے اور کوئی رشتہ نہیں آرہا۔ میرا دل بیٹھ سا جاتا تھا۔

پھر ایک روز جبکہ بازار کی رونق دم توڑ چکی تھی۔ لڑکیاں اپنی اقامت گاہوں میں جا چکی تھیں اور سب سے آخر میں رات کے پچھلے پہر میں بالاخانے کی سیڑھیاں اتر رہی تھی کہ ملگجی روشنی میں ایک چوڑا چکلا ہیولا سا اوپر آتا دکھائی دیا۔ وہ کمبل میں لپٹا ہوا بھاری بھرکم آدمی تھا جس نے اپنے چہرے کا بیشتر حصہ بھی بظاہر لاپروائی سے مگر درحقیقت نہایت سوچے سمجھے طریقے سے چھپا رکھا تھا کہ کوئی اسے پہچان نہ پائے۔ مگر میں نے اسے دور سے ہی پہچان لیا تھا اس لئے مجھے کوئی خوف محسوس نہ ہوا۔ بوڑھی خادمہ میرے ساتھ تھی میں نے اس سے کہہ دیا کہ وہ گھر چلی جائے۔ میں اس شخص سے بات کر کے آؤں گی۔

میرے قریب پہنچ کر چندن بابا نے چہرے سے کمبل ہٹا لیا۔ "تم نے مجھے پہچان لیا ناں؟" اس نے مسکرا کر پوچھا۔

"دور سے ہی پہچان لیا تھا۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "سر پر مصیبت پڑی ہے تبھی آئے ہو ناں.... اپنے وعدے پر تو نہیں آئے۔"

"میں تم سے شرمندہ ہوں.... میں بہت الجھا ہوا تھا۔" وہ ایک بار پھر گویا کسی الجھن کو ذہن سے جھٹکتے ہوئے مسکرایا۔ "ویسے تم نے کیسے جانا کہ میرے سر پر مصیبت پڑی ہے؟"

"میں تو پھر بھی ایک جہاندیدہ عورت ہوں چندن بابا میں نے کہا۔ اس وقت تمہیں دیکھ کر کوئی عقل کا اندھا بھی کہہ سکتا ہے کہ تم کسی پریشانی میں مبتلا ہو۔"

"بہت بڑی پریشانی میں۔ اس نے تسلیم کیا۔ "کیا ہم یہاں سیڑھیوں ہی میں کھڑے باتیں کرتے رہیں گے؟"

میں نے ایک لمحے کے لئے سوچا کہ اسے گھر لے جاؤں پھر بہتر یہی سمجھا کہ پہلے یہیں

بالاخانے پر بات کر لوں۔ میں نے اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور مڑ کر سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

اوپر کمرہ نشست میں آکر چندن بابا نے پہلے پانی کے دو گلاس پیئے پھر چند گہری گہری سانسیں لے کر کہا۔ "ایس پی جہانگیر میرے خون کا پیاسا ہو رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اسے قانونی تقاضوں کی تکمیل کے لئے مجھے گرفتار کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ کوئی ذاتی پرخاش ہے کوئی پرانا حساب ہے جسے وہ برابر کرنا چاہتا ہے۔ آج میں باس کے حکم پر ایک سیاسی لیڈر کے ہاں سے کچھ رقم لینے پہنچا۔ اس نے مجھے رقم تو ادا کر دی لیکن کچھ بدحواس سا لگ رہا تھا اس کی حالت دیکھ کر میں چوکنا سا رہا رقم لے کر چلنے لگا تو برابر کے کمرے سے ایس پی جہانگیر نکل آیا۔ وہ سادہ لباس میں تھا اور اس کے ہاتھ میں سرکاری ریوالور کے بجائے سائلنسر والا ایک نیا پستول تھا۔ اس نے مجھے للکارا لیکن بہرحال میں بچ بچا کر وہاں سے نکل آیا جہانگیر اگر سرکاری طور پر مجھے قابو میں کرنے آیا ہوتا تو مکان کے گرد پولیس کا محاصرہ بھی ہوتا.... لیکن ایسا نہیں تھا۔ میں بڑی آسانی سے مکان سے نکل کر گاڑی میں بیٹھ کر چل دیا۔ کسی نے مجھے نہیں روکا۔ راستے میں رقم میں نے ایک پبلک لیوٹری میں رکھی جیسا کہ مجھے حکم ملا تھا اور گھر جا پہنچا۔ گھر میں گھستے ہی جیسے بھیڑیوں کا غول کا غول مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ نہ جانے کتنے آدمی پہلے ہی سے اندر گھات لگائے بیٹھے تھے۔ یہاں تو میں پھنستے پھنستے بلکہ یوں کہو کہ مرتے مرتے ہی بچا۔ ایک خنجر تو یوں سمجھو کہ میری شہ رگ کو چھو کر ہی پلٹا۔ خیر جوں توں جان بچا کر وہاں سے بھاگا۔ نیچے آیا تو گاڑی کے چاروں پہیوں کی ہوا نکلی ہوئی تھی۔ پیدل ہی دوڑ لگانا پڑی۔ اس دوران بہت دور تک تعاقب ہوا لیکن گولی بہرحال نہیں چلائی گئی۔

تب سے بچتا بچاتا پھر رہا ہوں۔ کئی مقامات سے بیسیوں مرتبہ اس نمبر پر باس کو فون کرتا رہا ہوں جو ہمارے رابطہ کا واحد ذریعہ ہے لیکن وہاں سے کوئی جواب نہیں مل رہا تھا پھر میں نے مجبوراً" آپریٹر سے پوچھا کہ یہ فون خراب تو نہیں حالانکہ باس نے سختی سے حکم دے رکھا تھا کہ یہ نمبر میرے علاوہ کسی کے علم میں نہ آنے پائے۔ آپریٹر نے کئی منٹ بعد بالآخر بڑی حیرت سے مجھے بتایا کہ یہ نمبر تو ایک پبلک کال آفس کا تھا جو عرصہ پہلے بند کر دیا گیا تھا۔

تب یکایک ہی میں تھک سا گیا۔ اس سارے چکر سے یک لخت ہی بیزار سا ہو گیا۔ میں جو سمجھتا تھا کہ میں اس زندگی میں رچ بس گیا ہوں۔ اچانک ہی مجھے اپنا یہ خیال قطعی غلط محسوس ہونے لگا۔ باطنی طور پر غالباً" اب بھی میں ایک سیدھا سادا دیہاتی ہوں' مگر راستہ بھول کر کسی اور سمت میں جا نکلا تھا اور سراب کو نخلستان سمجھ کر بھٹکنے لگا تھا۔ یوں اچانک یہ سب کچھ میرے دل سے اتر گیا کہ میں خود بھی حیران رہ گیا۔

میں نے سوچا چلو زندگی نئے سرے سے شروع کرتے ہیں۔ بس میں بیٹھ کر محنت مزدوری کرنے کے ارادے سے بندرگاہ کی طرف چل دیا کہ وہاں حلال کی روزی کمایا کریں گے اور مچھیروں کی بستی میں رہا کریں گے۔ راستے میں ذہن نے اچانک پلٹا کھایا اور تمہارا خیال آ گیا۔ تم نے جو پیشکش کی تھی وہ بہت بھلی لگی۔ دوسری باتیں تو اپنی جگہ سب سے اچھا پہلو مجھے یہ لگا کہ جہاں تم مجھے رکھو گی وہاں ایک بچہ میرے ساتھ ہو گا اور بچہ تمہارا ہو گا تو ظاہر ہے پیارا بھی ہو گا۔ کسی پیارے سے بچے کے ساتھ رہنا کتنا بھلا لگتا ہے۔ کم از کم زندگی کچھ بامقصد تو محسوس ہونے لگے گی۔ اسے پروان چڑھانا اور اپنا تجربہ یا ہنر اس میں منتقل کرنا یقیناً" ایک دلچسپ عمل ہو گا۔ "یہ سوچ کر میں راستے میں بس سے اتر گیا۔ رات کافی بیت چکی تھی واپسی میں مجھے کوئی بس نہیں ملی میرے پاس زیادہ پیسے بھی نہیں تھے' لڑائی جھگڑے میں گر چکے تھے۔ محض چند سکے باقی تھے۔ اس لئے پیدل واپس آنا پڑا اور وہ بھی تنگ و تاریک گلی کوچوں کے راستے اپنے سائے تک سے بچتے بچاتے۔" اس نے بے مقصد سے انداز میں اپنے الجھے ہوئے بالوں میں انگلیاں پھیریں اور طویل سانس لے کر پوچھا۔ "اب تم کیا چاہتی ہو۔" سسپنس فون 03036360959

"میں کیا کہوں گی۔" میں نے آہستگی سے کہا۔ "میری پیشکش اب بھی برقرار ہے۔ کہنا صرف یہ ہے کہ میں اپنی کل متاع حیات تمہارے حوالے کروں گی۔ اپنی جان سے بڑھ کر اس کی حفاظت کرنا۔ اپنے بچے سے زیادہ اس دنیا میں مجھے کچھ عزیز نہیں...."

"یہ سب کچھ مجھے سمجھانے کی ضرورت نہیں۔" اس نے قدرے بیزاری سے کہا۔ "اگر آج تم مجھ پر اتنا بھروسہ کر رہی ہو' مجھ گرتے ہوئے کو تھام رہی ہو تو میں بھی آخری سانس تک اس معاہدے کو نبھاؤں گا۔

اس کے بعد مجھے انتظامات وغیرہ کرنے میں چند دن لگ گئے۔ اس دوران چندن بابا بازار حسن ہی میں چھپا رہا۔ انتظامات مکمل ہوتے ہی میں نے تمہیں ایک گورنس اور چندن بابا کے ساتھ پونا منتقل کر دیا۔ حالانکہ تم پہلے بھی چوبیس گھنٹے میرے ساتھ نہیں رہتے تھے لیکن یوں علیحدہ مکان میں دو اجنبی انسانوں کے ساتھ منتقل ہونے پر شروع شروع میں تم نے بہت واویلا کیا اور کئی راتوں تک میری بھی یہی کیفیت رہی کہ خادمہ کے کمرے میں تمہارا خالی بستر دیکھتی تھی تو کلیجہ شق ہونے لگتا تھا۔ پھر میں اپنے آپ کو سمجھانے لگتی تھی کہ زندگی میں بے مقصد اور بے وجہ بھی تو اتنی اذیتیں برداشت کی ہیں اپنے مقصد حیات کی خاطر ایک اذیت اور سہی .... ہاں...

میرا مقصد حیات اب یہی تو رہ گیا تھا کہ اپنی بربادی اور تذلیل کے ذمے داروں کا وہ حشر کروں کہ آئندہ معاشرہ محض اس لئے کسی کو کچلنے سے تائب ہو جائے کہ وہ کمزور ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات نہ رہے۔

اپنے اس مقصد حیات کی تکمیل کے لئے میں نے جو کچھ سوچ رکھا تھا اس پر عملدر آمد کا آغاز ہو چکا تھا۔ چند دن بعد تمہارا معصوم سا ذہن بھی نئے ماحول سے مانوس ہو گیا اور میری بے قراری کو بھی قرار آگیا۔ چندن بابا بھروسے کا آدمی ثابت ہوا تمہاری پرورش بالکل اسی انداز میں ہو رہی تھی جس طرح میں چاہتی تھی۔

ہوش سنبھالنے کے بعد کی باتیں تو تمہیں بھی یاد ہوں گی منصور! جن دنوں میں یہ واقعات قلمبند کر رہی ہوں' تم دس سال کے ہو چلے ہو۔ تمہاری اٹھان دیکھ کر میرا رواں رواں مسرت سے نہال ہو جاتا ہے لیکن گزرے ہوئے ان آٹھ' دس برسوں نے اندر ہی اندر نہ جانے کیا ستم ڈھایا ہے کہ اپنا وجود مجھے کھوکھلا' کھوکھلا سا محسوس ہونے لگا ہے۔ سینے میں درد کی شکایت رہنے لگی ہے رقص بھی میں نے ترک کر دیا ہے ویسے بھی اس بازار میں عورت کا شباب پانچ سات سال سے زیادہ نہیں رہتا۔

اب نہ جانے کیوں کچھ دھڑکا سا لگا رہتا ہے کہ خبر نہیں زندگی کس موڑ پر دغا دے جائے' کوئی حادثہ پیش آجائے۔

اسی لئے میں نے حفظ ماتقدم کے طور پر اپنی یہ داستان لکھنی شروع کر دی تھی ورنہ یہ سب کچھ ایک خاص وقت میں میں نے بہ زبان خود تمہیں سنانا تھا لیکن جیسا کہ میں پہلے بھی خیال ظاہر کر چکی ہوں کہ ایک لحاظ سے اسے لکھنا ہی زیادہ بہتر تھا زبانی شاید میں یہ سب کچھ اس طرح من و عن بیان نہ کر پاتی اور اس کے کئی پہلوؤں کی سنگینی کو تم صحیح طور پر محسوس نہ کر پاتے اور یوں تمہاری شدت انتقام میں کچھ کمی آجاتی۔

میرے ذہن میں تمہارے مستقبل کا نقشہ یہ ہے کہ تم ہر اعتبار سے ایک غیر معمولی انسان بنو اور تمہاری طبیعت مجموعہ اضداد ہو۔ تم میں شیر کی سی طاقت اور غضبناکی بھی ہو اور لومڑی کی سی عیاری اور مکاری بھی۔ تمہارا اشتعال اور غیظ و غضب پہاڑوں کا سینہ چاک کر کے رکھ دے اور جہاں مصلحت کا تقاضا ہو وہاں تمہاری سرد مزاجی ہمالیہ کی برف پوش چوٹیوں کی یخ بستگی کو بھی مات کر دے۔ تم انتہائی حکمت و ذہانت سے بھی مالا مال ہو اور مثالی بے خوفی و شجاعت سے بھی۔ تمہارے اندر پتھروں کی سی سختی اور کھردرا پن بھی ہو ربڑ کی سی لچک بھی تاکہ ہر طرح کے حالات میں ڈھل جاؤ ڈٹ جاؤ ہر آزمائش سے گزر جاؤ۔

اس طرح کی چند متضاد خصوصیات اگر ایک انسان میں جمع ہو جائیں تو اس کے سامنے بڑے بڑے لشکر بھی ہیچ ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنی ذات میں خود ایک بہت بڑا لشکر ہوتا ہے۔ اس طرح کا انسان قدرت ہی چاہے تو پیدا کر سکتی ہے۔ لیکن اگر قدرت کے کچھ اصولوں کو مدنظر رکھا جائے تو خود انسان کی کوشش بھی بڑے بڑے کرشمے دکھا سکتی ہے۔ میں تمہیں ایسا ہی بے مثال انسان بنانا چاہتی ہوں منصور! اور اگر میں زندہ رہی تو اس ناممکن کو ممکن

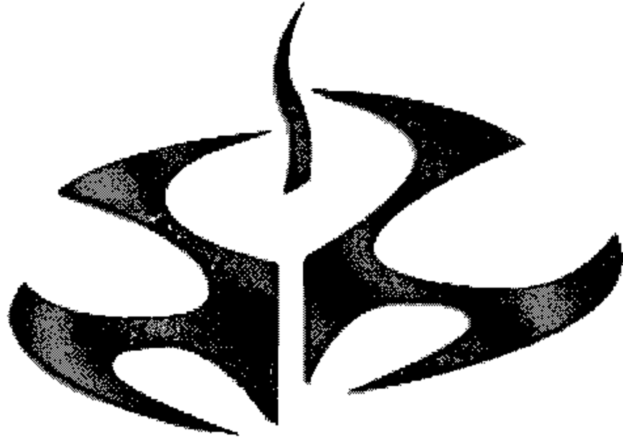
کر دکھاؤں گی۔

میں تمہیں کسی بھی اعتبار سے کمزور نہیں رہنے دوں گی جب تم تربیت کی اس منزل پر پہنچو گے جو میری نظر میں ہے تو میں ایک اور طاقت بھی تمہیں مہیا کروں گی۔ جس کے بغیر دنیا میں طاقتور کہلانے کا تصور مکمل نہیں ہوتا اور وہ طاقت ہے دولت! میں تمہیں بے اندازہ تو نہیں لیکن اتنی دولت ضرور مہیا کروں گی کہ ضرورت پڑنے پر تم بہت سے انسانوں کے ضمیر بھی خرید سکو گے اور اس کے بعد بھی تمہارا ہاتھ تنگ نہیں ہو گا۔ اپنی رہائش میں میں نے تمہارے لئے ایک چھوٹا سا خزانہ محفوظ کر دیا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس خزانے میں اضافہ ہی ہوتا جائے گا۔ اس لئے میں نے اب تک بازاری بنے رہنا قبول کر لیا ہے لیکن یہ سب کچھ تو میری اپنی منصوبہ بندی ہے ناممکن ممکن ہے کہ میرے بے عنوان سے اندیشے درست ثابت ہو جائیں۔ کوئی حادثہ پیش آجائے تمہیں قبل از وقت میری حقیقت کا علم ہو جائے اور تمہارا ردعمل نہ جانے کیا ہو ممکن ہے جس وقت تم اپنی آنکھوں میں سینکڑوں سوال لئے میرے سامنے آکھڑے ہو اس وقت باتیں کرنے کی مہلت ہی نہ ملے۔ حالات یا زندگی اتنا موقع ہی نہ دے تب کم از کم میں اپنے سینے کا یہ بوجھ تحریر کی شکل میں تمہیں سونپ تو سکوں گی۔

بیٹے! عین ممکن ہے کہ میں تمہیں وہ نہ بنا سکوں جو میں چاہتی ہوں میرا مشن ادھورا رہ جائے۔ تمہاری ذات کی تکمیل نہ ہو سکے۔ ہیرا تراشانہ جاسکے۔ سونا کندن نہ بن سکے لیکن اس صورت میں بھی اسے میری التجا سمجھو' میرا حکم سمجھو یا اپنا فریضہ کہ تم میری بربادیوں کا انتقام ضرور لو گے۔ میں تمہاری ماں ہوں اور میرے ساتھ جو کچھ ہوا وہ میں نے بلا کم و کاست تمہیں بتا دیا۔ اب یہ فیصلہ میں تم پر چھوڑتی ہوں کہ یہ سب کچھ جاننے کے بعد تمہارے انتقام کی حدیں کہاں تک پھیلنی چاہئیں۔ اس کا آغاز کہاں سے ہونا چاہیے اور انجام کی صورت کیا بنی چاہیے۔

میں اتنا ضرور کہوں گی کہ جوش سے زیادہ ہوش سے کام لینا۔ باپ کی طرح پہلی پرواز میں ہی پنکھ نہ گنوا لینا اور تمہارے انتقام کی صورت خواہ کچھ بھی ہو لیکن اس کہانی کو دنیا میں ایک مثال بنا جانا کہ آئندہ کوئی بھی طاقتور کسی کمزور کو پاؤں تلے کچلتے وقت ایک بار ضرور یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے کہ شاید کل اسے اسی دنیا میں اپنی خباثت کا حساب دینا پڑ جائے۔ اس کے سامنے تمہارے انتقام کی کہانی کی ایسی مثال ضرور موجود ہو کہ اس کی روح کانپ اٹھے۔

اس کے علاوہ مجھے تم سے کچھ نہیں کہنا' کچھ نہیں مانگنا' میں نے اپنی زندگی میں تمام تکلیفیں اپنی جان پر سہی ہیں اور تم پر کبھی کوئی آنچ نہیں آنے دی لیکن اب جو کام تمہارے ذمے لگا رہی ہوں اس میں شاید تمہیں بے شمار صعوبتیں اٹھانی پڑیں۔ اب یہ



تمہاری مرضی ہے کہ صعوبتوں کی یہ راہ اختیار کر کے دوسری دنیا میں ماں کے سامنے سرخرو پہنچو یا آرام و آسائش کی زندگی گزارو اور بے غیرت کہلاؤ۔

آخر میں دو اہم باتیں اور بتاتی چلوں۔ میں نے اپنی جس جمع پونجی کا ذکر کیا ہے وہ پونا میں تمہارے مکان ہی میں موجود ہے۔ باغ میں فوارے کے لئے جو چھوٹا سا تالاب بنایا گیا ہے اسے جان بوجھ کر ادھورا چھوڑ دیا گیا ہے اور اس میں پانی پہنچانے کا بندوبست بھی نہیں کیا گیا۔ اس میں لگے ہوئے فوارے کو گھما کر نکالو گے تو نیچے ایک خانہ نظر آئے گا۔ اس میں وہ سوئچ موجود ہے جسے دبانے سے نیچے موجود فولادی چادر سرک جائے گی اور واٹر پروف تجوری نظر آنے لگے گی۔



اس کے بعد



"تلاش"

کے دوسرے

حصے کا مطالعہ کریں



تلاش

حصّہ دوم



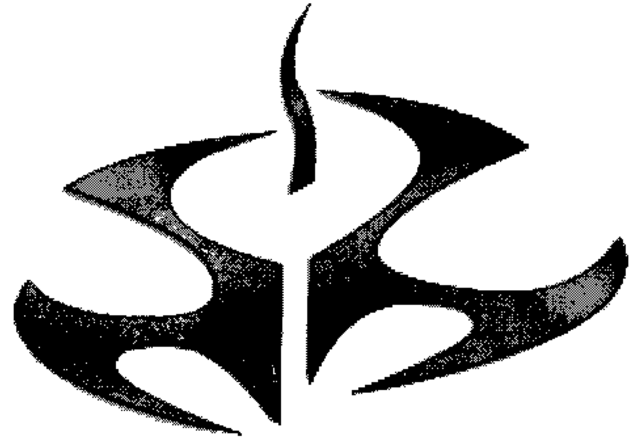


احمد مودی

تلاش

2

محمود احمد مودی



مکتبہ القریش ۔ سرکلر روڈ، اردو بازار، لاہور

پلٹنے کا موقع دیئے بغیر ہڑپ کر سکتا ہے۔ ان مگرمچھوں پر غالب آنا ہے تو بال برابر فاصلہ طے کرتے وقت بھی آنکھیں کھلی رکھو اور جذباتیت کا خانہ اپنے دل سے نکال دو۔

جب میں نے اس فارمولے پر عمل کرتے ہوئے سوچا تو مجھے روپا سے اپنی کچھ دیر پہلے کی گفتگو بڑی بے جواز سی محسوس ہوئی۔ آخر میں یوں منہ اٹھا کر کہاں جانا چاہتا تھا اور کیا کرنا چاہتا تھا؟ میں نے سوچا مجھے کوئی لائحہ عمل بنا کر چلنا چاہئے اور اس کے لئے وقت درکار تھا... اس دوران روپا سے وابستہ رہنے میں کوئی حرج نہیں تھا... اور اسی دوران کسی تدبیر سے اگر جلد از جلد روپا کے دشمنوں پر بھی ہاتھ ڈالا جا سکتا تو اور بھی بہتر تھا۔

ان سے نمٹنے کے بعد بہرحال میں روپا کی طرف سے بے فکر ہو کر کہیں بھی جا سکتا تھا اور اس کے لئے بہرحال میرے دل میں نرم گوشہ موجود تھا' خواہ میں کتنا ہی غیر جذباتی ہو کر سوچتا.... اسے میں کم از کم ناگہانی اور دوسروں کی مسلط کردہ موت میں گرفتار چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا تھا۔

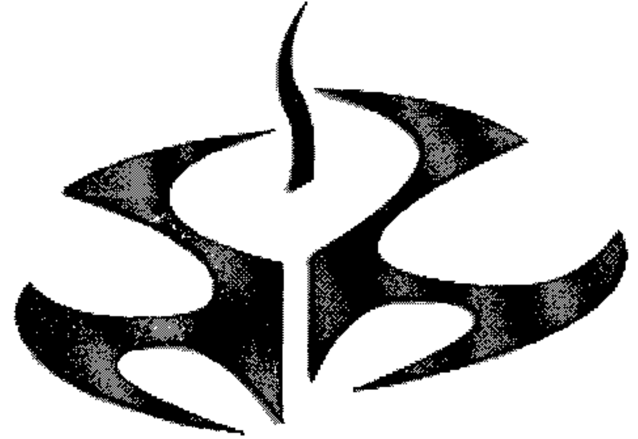
اس فیصلے پر پہنچنے کے بعد میں نے اپنے آپ کو بے حد پر سکون اور پر اعتماد محسوس کیا۔ حتیٰ کہ اسٹوڈیو میں پہنچنے کے بعد دوپہر کو کھانے کے وقفے میں جب روپا سے میری دوبارہ ملاقات ہوئی اور ہم پروڈکشن کے دوسرے آدمیوں کی ساتھ ذرا ستانے کے لئے بیٹھے تو میرا موڈ اس حد تک خوشگوار ہو چکا تھا کہ میں نے انہیں کئی لطیفے بھی سنائے۔

کسی کو نہیں معلوم تھا کہ میں نے کتنے بھیانک شعلوں کو ہنسی کے آبشار تلے دفن کر دیا ہے۔ ایسا لگتا تھا کہ میرا ایک نیا جنم شروع ہو گیا ہے۔ ایک اصلاح شدہ جنم' جس میں' میں اپنی بہت سی خامیوں اور فطری خصائل پر غالب آچکا تھا یا پھر میری شخصیت پر ایک اور ہی شخصیت کا خول چڑھ چکا تھا۔ پرانا منصور اس میں مقید ہو چکا تھا اور اس کی سلگتی روح کا دھواں اندر ہی اندر بل کھا رہا تھا' شعلے طاقت پکڑ رہے تھے اور آگ کا ایک سمندر تخلیق کر رہے تھے جو ایک حقیر سے کوزۂ جاں میں بند تھا۔

روپا میری شگفتگی پر سب سے زیادہ خوش تھی۔ بات بات پر ہنسی سے اس کی آنکھوں میں پانی آئے جا رہا تھا۔ میری صبح کی گفتگو کو غالباً" اس نے میری نوجوانی کے کسی ناپختہ جذباتی تغیر کا مظاہرہ سمجھ کر بھلا دیا تھا اور پہلے سے تعلق خاطر کی فضا میں گہری گہری سانسیں لینے کی کوشش کر رہی تھی۔

اسٹوڈیو سے واپسی پر ہمیں کافی تاخیر ہو گئی.... کشمیر میں پکچرائز کئے گئے چند مناظر میں روپا کا ڈبنگ کا کام باقی تھا وہ کچھ طول کھینچ گیا.... اور ہم نائٹ شفٹ کے اختتام سے ذرا پہلے ساڑھے بار بجے کے قریب اسٹوڈیو.... کے ریکارڈنگ روم سے نکلے۔

کار میں بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کرنے سے پہلے میں نے لیور دبا کر کنورٹیبل شیورلیٹ کی کینوس کی چھت کھول دی۔ حالانکہ موسم میں ابھی خنکی تھی۔



" اسے کیوں کھول دیا تم؟" روپا نے غیر ارادی سے انداز میں اپنے جھالر دار لمبے سے
لبادے کو زیادہ احتیاط سے جسم کے گرد لپیٹتے ہوئے کہا۔ " مجھے سردی لگے گی۔"
" کوئی بات نہیں" میں نے اگنیشن میں چابی گھماتے ہوئے مسکرا کر اس کی طرف
یکھا۔ " تمہاری گاڑی کے تو گلو و کمپارٹمنٹ میں بھی وہسکی اور برانڈی کے پوے موجود
ہتے ہیں۔ ایسی صورت سے نمٹنے کے لئے... ویسے آپس کی بات ہے... سردی کچھ ایسی
یادہ بھی نہیں۔ یہ بمبئی ہے شملہ' مسوری یا کشمیر تو نہیں۔
گاڑی گیٹ سے نکل کر پرائیویٹ روڈ عبور کر کے بڑی سڑک پر آئی تو روپا نے بچوں
ں طرح بغلوں میں ہاتھ دے لئے۔ "ویسے تمہارا کوئی نہ کوئی مقصد ہے ضرور' چھت کھول
ر چلنے کا۔ تم مجھے بتاؤ یا نہ بتاؤ۔" چند لمحے بعد اس نے مضافاتی سڑک پر ادھر ادھر نظر
ڑاتے ہوئے کہا۔

" ہاں! " میں نے سنجیدگی سے کہا۔ " میں چاہتا ہوں کہ جنہیں تمہاری جان کی
ورت ہے انہیں راہ چلتے بھی تمہاری شناخت میں دشواری پیش نہ آئے۔" میری خواہش
، کہ یہ قصہ جلد از جلد ختم ہو۔ چوہے بلی کا یہ کھیل آخر کب تک جاری رہے گا؟"
"گویا اب تمہاری کوشش یہ ہے کہ وہ لوگ مجھے دیکھیں اور جلد از جلد یہ قصہ پاک
یں تاکہ تمہاری جان چھوٹے؟" اس نے مجروح سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں
زہ نہیں کر سکا کہ اس کا یہ انداز اداکاری کا کمال تھا یا حقیقت کا مظہر۔
" نہیں۔" میں نے قدرے ترمیم سے کہا۔ " میری کوشش ہے کہ وہ لوگ جلد از جلد
ں کہیں دیکھ کر سامنے آئیں تاکہ میں جلد از جلد ان کا قصہ پاک کروں۔" آخری الفاظ
رتے وقت نہ جانے کیوں میرے دانت بھنچ کر رہ گئے۔
" اوہ منصور! تم یکایک کتنے بدلے بدلے لگے ہو اور اپنی عمر سے کچھ بڑے بھی۔" میں
روپا کی حیرت بھری آواز سن کر اس کی طرف دیکھا وہ قدرے پھیلی پھیلی آنکھوں سے
طرف دیکھ رہی تھی۔ اس عالم میں وہ بہت معصوم دکھائی دینے لگی تھی۔ میں نے
نے کی کوشش کی تاکہ میرے جبڑوں کے تنے ہوئے عضلات معمول پر آجائیں۔ میری
ش غالباً" کامیاب رہی۔ کیونکہ میں نے روپا کو اطمینان کی ایک گہری سانس لیتے سنا۔
چہرہ اس وقت تک تاریکی کی زد میں آچکا تھا... کیونکہ ہم ایک الیکٹرک پول کی روشنی
سائی سے نکل چکے تھے..... اور دوسرے کی روشنی کی حدود میں داخل ہونے والے

یک لمحے کی تاریکی گزر جانے کے بعد میں نے دوبارہ روپا کی طرف دیکھا۔ وہ اب
سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی اور اس کے کھلے سیاہ بال دور تک ہوا میں لہرا رہے تھے۔
مسلسل پھڑپھڑاہٹ سے تنگ آکر اس نے انہیں سمیٹ کر جوڑا بنا لیا۔ میں کن

انکھیوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور میرے خیال میں وہ ہرگز میری طرف نہیں دیکھ رہی تھی مگر نہ جانے کیونکر اس نے میری دزدیدہ نگاہی کو محسوس کر لیا اور دھیرے سے بولی۔ " آگے چوراہا آرہا ہے اور وہاں سے اس وقت دودھ کے ٹرک گزرتے ہیں..... اگر مارنا ہی ہے تو کسی اچھی سی چیز سے ٹکرا کر مارنا..... دودھ کے ٹرک سے ٹکرا کر مرنا تو نہایت غیر رومانی سی حرکت ہو گی۔"

میں محتاط ہو کر ڈرائیو کرنے لگا۔

اس رات بلکہ اس کے کئی دنوں بعد تک کوئی واقعہ پیش نہ آیا۔ اب مجھے اکتاہٹ سی ہونے لگی۔ اس سے پہلے مجھے روپا کے ساتھ رہتے ہوئے شب و روز کی یکسانیت کا اس بری طرح احساس نہیں ہوا تھا اس دوران کوئی آوٹ ڈور شوٹنگ بھی نہیں آئی تھی کہ کچھ تبدیلی کا احساس ہوتا۔

ایک روز ہم اسٹوڈیو سے واپس آئے تو ہال میں ٹیلی فون کے پاس رکھی ہوئی پیغامات کی کتاب میں ملازمہ کا نوٹ کیا ہوا ایک پیغام نظر آیا جو ضروری پیغامات کے خانے میں تھا۔

" چار بج کر تیس منٹ پر کنور میسوری آف نیپال کا فون آیا تھا وہ ایمبسڈر ہوٹل ڈی لکس سویٹ نمبر چار سو دس میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ جیسے ہی آپ آئیں انہیں فون کر لیں۔"

یہ پیغام دن کی ملازمہ کا نوٹ کیا ہوا تھا اور وہ جا چکی تھی۔ روپا نے باقی پیغامات پر بھی سرسری سی نظر ڈالی اور کہا۔ " میں کپڑے بدل لوں پھر دیکھتے ہیں یہ کنور میسوری آف نیپال کون ذات شریف ہیں۔"

یہ ہمارا معمول تھا کہ اسٹوڈیو سے واپسی پر ایزی ہونے کے بعد پہلے ہال میں بیٹھ کر چائے پیتے تھے۔ اس دوران روپا ضروری ٹیلی فون کرتی تھی۔ میں تازہ دم ہو کر نیچے آیا تو روپا مجھ سے پہلے ہال میں پہنچ چکی تھی۔ وہ فون کے قریب ایزی چیئر پر بیٹھی تھی اور اس کے سامنے تپائی پر چائے رکھی تھی۔ وہ گود میں کچھ کاغذات رکھے انہیں الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔ " ایک تو اس شیلا کی بچی نے ابھی تک مجھے نئے معاہدوں کی فائل ہی بنا کر نہیں دی۔" وہ ایک نظر میری طرف دیکھ کر بڑبڑائی۔ " مجھے تو سیکریٹری رکھنے کا کوئی فائدہ ہی نہیں ہے۔

" تمہیں اس نام نہاد مینجر کو رکھنے کا اب تک کیا فائدہ ہوا ہے۔" میں نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتے ہوئے کہا اور اس کے ساتھ دوسری ایزی چیئر پر بیٹھ گیا۔ اس نے کاغذات سمیٹ کر تپائی پر رکھے اور ایک نظر میری طرف دیکھ کر چائے کی ٹرے اپنی طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔ " یہ تو کوئی میرے دل سے پوچھے۔"

چائے پینے کے بعد میں نے کپ تپائی پر رکھا تو روپا بولی۔

" ذرا فون کر کے دیکھو تو سہی یہ کنور میسوری کون ہے اور کیا چاہتا ہے میں نے تو اس سے پہلے کبھی یہ نام نہیں سنا۔"

میں نے ڈائریکٹری میں امبیسڈر کا نمبر دیکھا اور سوئٹ نمبر چار سو دس سے رابطہ قائم کیا۔ ایک کھردری سی مردانہ آواز نے ہیلو کہتے ہی پوچھا۔ " آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟"

"کنور میسوری سے۔" میں نے پروقار لہجے میں کہا۔

" آپ کا اسم گرامی؟" دوسری طرف بولنے والا کچھ سنبھل کر بیٹھ گیا۔

" میں میڈم روپا کا منیجر ہوں.... میرے خیال میں آپ کے لئے اتنا ہی جان لینا کافی ہے.... آپ کی تعریف؟" میں نے پوچھا۔

" میں کنور میسوری کا سیکریٹری ہوں... میں ابھی ان سے آپ کی بات کراتا ہوں۔ ایک منٹ ہولڈ کیجئے۔" میں نے اس کے لہجے میں دبا دبا سا جوش محسوس کیا۔ سکوت چھا گیا۔ پھر خاصے فاصلے پر جیسے کوئی دروازہ کھلا اور بند ہوا۔ چند لمحے بعد ایک بھاری بھرکم آواز ابھری۔

" ہیلو.... مسٹر منیجر!" کنور میسوری نے بغیر کسی تعارف اور تمہید کے کہا۔

"کیا یہ ممکن نہیں کہ میڈم روپا سے میری براہ راست بات ہو سکے؟"

" نہیں کنور میسوری! میں نے رکھائی سے کہا۔ " آپ کا مقصد معلوم ہوئے بغیر یہ ن نہیں ہے۔"

" ایک بہت بڑی فلم کا سلسلہ ہے جسے ہم جی ایم فلمز والوں کے اشتراک سے پلان کر ہ ہیں .... اس میں میڈم روپا کو کاسٹ کرنے کی بات کرنی ہے .... یہ تو خیر ابتدائی معاملہ ۔ ہماری اصل دلچسپی ایک دوسرے پروجیکٹ میں ہے جو بین الاقوامی نوعیت کا ہے۔ ہم میں بعض مصلحتوں کی بناء پر میڈم روپا کو پارٹنر شپ آفر کرنا چاہتے ہیں۔" کنور ری نے بتایا۔

" چند سیکنڈ ہولڈ کیجئے میں میڈم سے بات کرتا ہوں۔" میں نے ریسیور پر ہاتھ رکھتے ، روپا کو آنکھ ماری اور دھیمی آواز میں اسے بتایا کہ کنور میسوری کیا کہہ رہا ہے۔

" میں بات کر کے دیکھ لیتی ہوں۔" روپا نے سرگوشی میں کہا۔ " ویسے تم بھی سنتے

"اس نے ٹیلی فون کے ایکسٹنشن کی طرف اشارہ کیا۔ اس نمبر کی ایک ایکسٹنشن روپا بگاہ میں تھی اور دوسری اسی سیٹ کے قریب روپا نے حال ہی میں رکھوائی تھی کیونکہ فراد سے گفتگو کرتے وقت وہ کبھی "شرارتاً" اور کبھی "مصلحتاً" مجھے سنواتی تھی۔ میں ن کا ریسیور اٹھا چکا تو روپا نے ہیلو کیا۔

"گڈ ایوننگ میڈم!" کنور کا لہجہ پہلے سے زیادہ شائستہ ہو گیا۔

" مجھے کنور میسوری آف نیپال کہتے ہیں .... شاید آپ نے کبھی میرا نام سنا ہو۔"

" جی نہیں۔" قدرے توقف کے بعد روپا نے صاف گوئی سے کہا۔ میں نے کبھی نہیں سنا۔"

" بڑا افسوس ناک اتفاق ہے.... خادم کا تعلق نیپال کی بڑی امیر ترین فیملی سے ہے.... بہرحال اسے چھوڑیئے..." اسے گویا انکساری ظاہر کرنے کا خیال آگیا۔ " اصل بات یہ ہے کہ فیملی کا واحد وارث ہونے کی بناء پر میں نے محض خاندانی دولت پر تکیہ کر کے بیٹھ جانے کی بجائے ہاتھ پاؤں ہلانے کی کوشش کی ہے۔ پچھلے ایک سال سے میں نے ایک کثیر الامقاصد قسم کا تجارتی ادارہ بنا رکھا ہے۔ کونٹی ننٹ کارپوریشن' کے نام سے کینیڈا' انگلینڈ ہانگ کانگ وغیرہ میں اس کے دفاتر ہیں۔ حال ہی میں فلمسازی کو بھی میں نے اپنے تجارتی منصوبوں میں شامل کیا ہے اور جی ایم فلمز کے ساتھ اشتراک کا معاہدہ کیا ہے۔ انہوں نے ہمیں پہلے تو صرف ہندوستان کی مارکیٹ کے لئے ایک بڑی کاسٹ کی فلم کا منصوبہ دیا ہے۔ اس کے بعد بین الاقوامی مارکیٹ کے لئے بیک وقت چار فلموں کا پلان تیار کیا ہے۔" وہ سانس لینے کے لئے ایک لمحے کو خاموش ہوا۔

" ہمارا ادارہ آپ کو اپنی مستقل اسٹار رکھنا چاہتا ہے۔ ہندوستانی فلم کے لئے تو ہم آپ کو وہی معاوضہ دیں گے جو آپ طلب کریں گی۔" اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ " البتہ بین الاقوامی فلموں میں ہم آپ سے پارٹنر شپ کرنا چاہیں گے۔ آپ چاہیں تو نفع نقصان میں شریک ہوں یا کچھ سرکٹ لے لیں..... ویسے ہمارے منصوبوں کے بارے میں آپ غالباً کچھ نہ کچھ تو اخباروں میں پڑھ ہی چکی ہوں گی۔"

ڈپلو میسی تو روپا کو آتی ہی نہیں تھی۔ ایسے موقعوں پر اس کا جواب فلمی عورت کی روایات کے خلاف ہوا کرتا تھا۔ " جی نہیں۔" اس نے بلا تامل کہا۔ " میں اخبار وغیرہ پڑھتی ہی بہت کم ہوں۔ ہم جیسے لوگوں کے بارے میں ان میں جانے کیا کچھ لکھا ہوتا ہے۔ خواہ مخواہ پڑھ کر دل دکھتا ہے۔ ویسے جتنا میں پڑھتی ہوں اس میں کبھی اس قسم کی کوئی خبر نظر سے نہیں گزری۔"

" اوہ خیر.... " کنور میسوری نے ایک گہری سانس لی۔ " مجھے افسوس ہے کہ آپ ہمارے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتیں۔ بہرحال اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بمبئی کے میرے موجودہ دورے کا سب سے اہم مقصد آپ سے معاملات طے کرنا ہی ہے میں جلد از جلد آپ سے شرف ملاقات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

روپا نے ایک لمحے توقف کیا پھر نہایت متانت سے بولی۔ " میں اپنی سیکریٹری سے اپنی مصروفیات کا شیڈول معلوم کرنے کے بعد ہی آپ کو کوئی وقت دے سکتی ہوں اور سیکریٹری اس وقت موجود نہیں ہے۔

"لیکن پلیز مجھے کوئی یقینی جواب ضرور دیجئے.... میرا یہاں قیام صرف کل شام تک کا ہے۔" کنور میسوری کے لہجے میں ایک وقار آمیز التجا تھی۔ "کل شام مجھے ہر حال میں لندن کی پرواز پکڑنی ہے میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔"

"اچھا ٹھہریئے.... میں اپنی ڈائری دیکھ کر کچھ بتاتی ہوں۔" روپا نے متذبذب لہجے میں کہا اور ریسیور پر ہاتھ رکھ کر سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا.... میں نے اشارہ دیا کہ وہ ملاقات کا وقت دیدے۔

اس نے مزید چند لمحے توقف کیا پھر ماؤتھ پیس سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔ "کل تو میں اسٹوڈیو جانے سے پہلے ہی وقت نکال سکتی ہوں۔ آپ صبح نو بجے آجائیں۔ ہم ایک گھنٹہ گفتگو کر سکتے ہیں یا پھر آپ ڈھائی بجے اسٹوڈیو آجائیں' دو شوٹنگوں کے درمیان میرے پاس ڈھائی گھنٹے کا بریک ہے۔ بشرطیکہ شوٹنگیں وقت پر ہوئیں۔ جو کہ عموماً" وقت پر نہیں ہوتیں۔"

"گھر پر ہی گفتگو ٹھیک رہے گی۔ لیکن کیا آپ واقعی صبح اتنی جلدی تیار ہو جاتی ہیں؟"

"جی ہاں! کیونکہ میں شوٹنگ کے لئے کبھی رات کا وقت نہیں دیتی۔" روپا نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔

"فلمی دنیا کے ہاتھ میں نے صرف اپنے دن فروخت کئے ہیں۔ راتیں اپنے ہی تصرف میں رکھی ہیں۔"

"بہت خوب بہت خوب میڈم!" کنور میسوری کا لہجہ کچھ خوشامدانہ سا ہو گیا۔ "مجھے کسی نے بتایا تھا اور ٹھیک ہی بتایا تھا کہ آپ روایتی فلمی عورتوں سے بہت مختلف ہیں۔ آپ سے ملاقات یقیناً" میرے لئے ایک خوشگوار تجربہ ہو گی۔"

"شاید۔" روپا نے خشک لہجے میں کہا۔ "خدا حافظ" اس نے ریسیور رکھ دیا لیکن دوسری طرف سے میں نے کئی سیکنڈ بعد سلسلہ منقطع ہونے کی آواز سنی.... تب میں نے بھی ریسیور رکھ دیا۔ روپا اپنی آرام دہ کرسی پر جا بیٹھی تھی اور ٹانگ پر ٹانگ رکھے دھیرے دھیرے ایک پاؤں ہلا رہی تھی۔

"کیا بات ہے ملاقات کے لئے وقت دینے میں تم بہت ہچکچا رہی تھیں؟" میں نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"الجھن میں پڑ گئی تھی منصور!" اس نے ہاتھوں کی مرمریں اور مخروطی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنساتے ہوئے کہا۔ "میں نے آج تک کوئی ایسا نیپالی نہیں دیکھا جو میسوری کی طرح اتنی صاف اردو بولتا ہو۔"

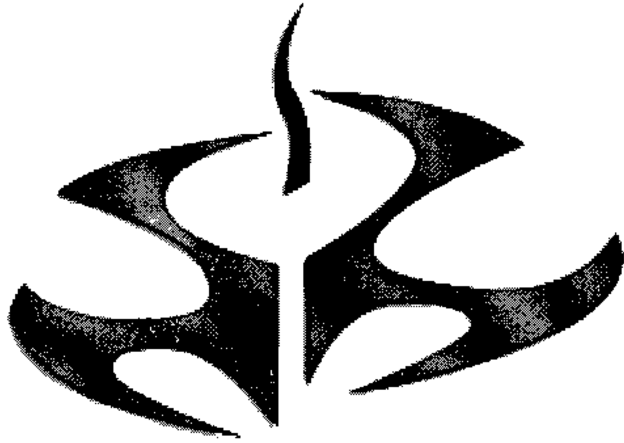
"ہو سکتا ہے اس نے ہندوستان ہی میں پرورش پائی ہو۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔ "

ویسے بھی امراء میں شمار ہونے والے لوگ عموماً" کئی کئی زبانوں پر عبـ

"بہرحال ہمیں بہت محتاط رہنا پڑتا ہے۔" روپا نے کہا.... "دے گی' کھڑکیوں کے
مراسم بڑھانے کے لئے عجیب عجیب روپ دھار لیتے ہیں.... کوئی نواب ہے گا جس کی پراسرار
کسی راجے مہاراجے کا وارث بن بیٹھتا ہے اور کوئی کسی ایسے بزنس مَن وہ مختلف فلموں
کر..... آجاتا ہے جس کی شاخیں پوری دنیا میں پھیلی ہوتی ہیں۔ بعد میں پتہ چلتا ہے کہ
موصوف کسی دہقان کے صاحبزادے ہیں جو حال ہی میں دس بیس ایکڑ زمین چھوڑ کر مرا ہے
اور یہ اس زمین کو بیچ کر دس بیس دن بڑے ٹھاٹ کی زندگی بسر کر کے دل کی حسرتیں نکال
رہے ہیں۔ گلزار بانو سے تم واقف ہوتا؟"

میں نے ذہن پر زور دیا کہ یہ گلزار بانو کون تھی؟ نام تو کچھ مانوس لگ رہا تھا۔





"لیکن پلیز مجھے کو [illegible]
ہے۔" کنور میسوری کے [illegible]
لندن کی پرواز پکڑنی ہے بس پر [illegible]
"اچھا ٹھہریے [illegible]
کہا [illegible] [illegible] یا تھا مگی

دوسرے ہی لمحے مجھے یاد آگیا کہ گلزار بانو کون تھی۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا گلزار بانو کسی زمانے میں صف اول کی ہیروئن تھی۔ آج کل اس کے عروج کا ستارہ کچھ ماند پڑ چکا تھا۔

"گلزار بانو تو اس قسم کے ایک نوجوان کے چکر میں کچھ زیادہ ہی پھنس گئی تھی۔" روپا نے بتایا۔ "اور تقریباً" دو سال پہلے اس سے شادی بھی کر بیٹھی تھی۔ اس کا زوال تو درحقیقت اسی وقت سے شروع ہوا ہے بالآخر بے شمار پیسہ وقت اور ساکھ برباد کر کے طلاق لے کر ہی جان چھوٹی تھی۔"

"تمہیں کوئی اس طرح کا چکر نہیں دے سکتا۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "تمہارے پاس تو کالے جادو سے زیادہ خطرناک علم موجود ہے.... انسان کو پڑھ لینے کا علم!"

"وہی علم تو مجھے اب تک بچائے ہوئے ہے۔ وہ بھی مسکرائی۔ "ورنہ تمہیں کیا معلوم ہماری لائن میں کیسے کیسے جادوگر پڑے ہیں۔ اسکرین پر تمہیں جو نظر آتے ہیں اس سے کہیں زیادہ فنکار' تو پس پردہ پڑے ہوئے ہیں۔ انسان کو پل بھر میں کوہ قاف لے جانے والے۔"

"میں نے اسی لئے تو تمہیں کنور میسوری سے ملاقات کر لینے کا مشورہ دیا تھا کہ دل میں جو خلش ہو وہ نکل جائے۔" میں نے کہا۔ "یہ کھٹک نہ رہے کہ شاید وہ کام ہی کا آدمی تھا جس سے ہم نے ملاقات نہیں کی۔"

"مجھے اب اس امر سے کوئی دلچسپی نہیں رہی کہ وہ کون ہے کیا چاہتا ہے اور نہ ہی اس بات کی کوئی پروا ہے کہ اس سے مل کر مجھے فائدہ ہو گا یا نقصان۔ بس تم قریب موجود رہو تو میں جنوں کے سردار سے بھی ملاقات کے لئے تیار ہوں۔" اس نے مسکرا کر خوابناک سے لہجے میں کہا اور ایک طویل انگڑائی لے کر یک لخت جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔ پھر یک جھٹکے سے اٹھتے ہوئے بولی۔ "اپنا تو موسیقی سننے کو جی چاہ رہا ہے تمہارا موڈ بنے تو تم بھی میرے کمرے میں آجانا۔"

"شکریہ!" میں نے آداب بجا لانے والے لہجے میں کہا۔ "بندہ بغیر موسیقی کے ہی ٹھیک ہے۔" پھر میں نے سنجیدہ ہو کر ایک لمحے کے توقف سے کہا۔ "دراصل میں آج کل

کچھ لکھنے پڑھنے کا کام کر رہا ہوں۔"

مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنی خوابگاہ میں جا کر تمام روشنیاں بجھا دے گی' کھڑکیوں کے پردے کھینچ دے گی۔ ایک گوشے میں صرف ایک ننھا سا بلب روشن رہے گا جس کی پراسرار سی برائے نام روشنی میں ہر چیز پھیلے ہوئے سائے کی طرح نظر آئے گی۔ پھر وہ مختلف فلموں کے' جن میں اس کی اپنی فلمیں بھی شامل ہوں گی' الیہ نغموں کے ریکارڈ گراموفون پر لگاتی رہے گی اور دنیا مافیہا سے بے خبر ہو کر چھت پر نظر گاڑ کر سنتی رہے گی۔ پھر کسی نغمے پر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے گی اور دنیا کی کوئی طاقت اسے چپ نہیں کرا سکے گی۔ حتیٰ کہ وہ یونہی روتے روتے تکیے میں منہ چھپائے سو جائے گی اور ریکارڈ ختم ہو جانے کے بعد بھی صبح تک اسی طرح سوئی تلے سرسراتا رہے گا۔

جن دنوں میں نیا نیا آیا تھا' اسے موسیقی سننے کے یہ دورے اکثر پڑتے تھے اب ان میں بہت کمی آچکی تھی۔ پینے پلانے کی رفتار بھی بہت کم ہو چکی تھی۔ بقول اس کے اپنے' وہ سینے میں بکھری ہوئی کرچیوں کو جمع کرنے میں کامیاب ہوتی جا رہی تھی۔

میں نے اس سے پڑھنے لکھنے کے کام کا درحقیقت بہانہ ہی کیا تھا روپا سے جدا ہونے کے بعد آج کل ایک ہی مشغلہ ہوتا تھا جسے میں فریضے کی طرح انجام دیتا تھا اور یہ کام تھا سوچنا..... صرف سوچنا۔

میں گھنٹوں اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑا رہتا اور ملگجی تاریکی میں نظریں گاڑے سوچتا رہتا۔ پلنگ پر لیٹتا تب بھی یہ سوچیں میرے ذہن کی نس نس میں سنگریزوں کی طرح چبھتی رہتیں۔ حتیٰ کہ خواب بھی مجھے کچھ ملتے جلتے سے ہی نظر آتے میری سوچوں کا عنوان بھی ایک ہی تھا ذہن خواہ کیسے بھی بیکراں جزیروں میں بھٹکتا رہتا' مگر سوچ کی نہج ایک ہی رہتی۔ ذہن جیسے قطب نما کی سوئی بن گیا تھا۔

سوچ بچار کی یہ ریاضت بے سود نہیں تھی۔ میں اپنے آپ کو یاسیت کے سمندر میں نہیں ڈبو رہا تھا۔ میرے ذہن میں تو بہت بڑی بساط بچھی ہوئی تھی اور میں دھیرے دھیرے اس پر مہرے سجا رہا تھا۔ میں اپنی ذات کے لئے خود ہی استاد بنا ہوا تھا اپنی تربیت کر رہا تھا۔ بڑی عمدگی سے اپنی ذہنی تراش خراش کا کام انجام دے رہا تھا۔ ممی کی ڈائری کو میں نے جلا دیا تھا۔ مجھے اب اس کی ضرورت نہیں تھی اس کا ایک ایک لفظ میرے ذہن پر نقش تھا۔

دوسرے روز ہم ناشتے سے "تقریباً" فارغ ہو کر کافی پی رہے تھے جب پٹھان چوکیدار اسحاق خان نے ایک سنہری وزیٹنگ کارڈ طشتری میں روپا کو پیش کیا۔ میں نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ سنہری کارڈ پر نہایت نفیس اور باریک حروف میں صرف کنور میسوری آف نیپال چھپا ہوا تھا۔ کوئی ایڈریس یا فون نمبر وغیرہ نہیں تھا جیسا کہ "عموماً" نہایت اہم اور بڑی

شخصیتوں کے کارڈ پر ہوتا ہے کہ صرف ان کا نام کافی سمجھا جاتا ہے۔

"انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ میں آرہی ہوں۔" روپا نے وزیٹنگ کارڈ پر نظر ڈال کر کافی کا گھونٹ بھر کر کہا۔

میں کھڑکی میں جا کھڑا ہوا جس میں نیلے رنگ کا ٹینٹڈ گلاس لگا ہوا تھا۔ اس سے باہر کا منظر نظر آتا تھا' اندر کا نہیں۔ اس کھڑکی سے گیٹ دکھائی دیتا تھا..... میں نے اسحاق خان کو گیٹ کی طرف جاتے دیکھا۔ اندر آتے وقت وہ گیٹ کو تالا لگا کر آیا تھا.... تالا کھولنے کے بعد اس نے چوڑے چکلے گیٹ کے دونوں پٹ کھولے ساتھ ہی چمکیلے سیاہ رنگ کی ایک کیڈلک بے آواز عفریت کی طرح اندر پھسل آئی۔ اس کے شیشے بھی گہرے رنگ کے تھے.... اور کار کی جو سائیڈ مجھے نظر آرہی تھی اس طرف کی کھڑکیوں میں مکمل طور پر شیشے چڑھے ہوئے تھے...... کار برآمدے کے قریب آکر رکی ہوگی..... اور برآمدہ چونکہ مجھے نظر نہیں آرہا تھا اس لئے میں کار سے اترنے والوں کو بھی نہیں دیکھ سکا۔

میں نے پلٹ کر روپا کی طرف دیکھا وہ کافی ختم کر چکی تھی مگر بدستور اپنی جگہ بیٹھی تھی مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر گھڑی دیکھتے ہوئے بولی۔ "نو بج کر دو منٹ ..... یہ کنور میسوری وقت کا تو بڑا پابند معلوم ہوتا ہے۔ یہ صحیح معنوں میں بزنس مین ہونے کی نشانی ہوتی ہے۔

"چلو پھر اس سے مل ہی لیں.... دیکھیں اس کا بزنس کیا ہے ٹھاٹ باٹ تو بڑے نظر آرہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"اسے چند منٹ انتظار کرنے دو..... ابھی تو وہ ڈرائنگ روم میں اپنے لئے نشست کا انتخاب بھی نہیں کرپایا ہو گا۔" روپا نے ایک چھوٹے سے میک اپ مرر میں اپنے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"انتظار کرانا بھی حسینوں کی ایک ادائے دلبری ہوتی ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"حسینوں کی ادائے دلبری نہیں۔" اس نے دلکشی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ "یہ اپنی ہیبت بڑھانے کا ایک حربہ ہوتا ہے۔"

میں ایک کرسی پر آبیٹھا تو وہ اٹھ کر ٹہلنے لگی.... ساتھ ہی بڑی لاپروائی سے وہ کچھ گنگنا بھی رہی تھی۔ ایک مرتبہ اس نے میری طرف مڑ کر بچوں کی سی معصومیت سے پوچھا۔ "میرے کپڑے تو اچھے ہیں نا؟"

میں اسے بتا نہ پایا کہ اس وقت بڑے بڑے کاسنی پھولوں والی بنگالی اسٹائل کی ساڑھی اور اسی طرز کے بڑے بڑے چاندی کے زیورات میں وہ کس قدر خوبصورت لگ رہی تھی.... کہنے کو یہ زیور چاندی کے تھے مگر ان میں کئی ہیرے جڑے ہوئے تھے.... روپا معمولی

پڑھی لکھی تھی' مگر زندگی نے جہاں اسے اور بہت کچھ سکھایا تھا لباس کا سلیقہ بھی غضب کا دیا تھا۔ وہ ہمیشہ دوسری عورتوں سے الگ نظر آتی تھی' اور پارٹیوں میں میں نے دیکھا تھا کہ وہ سماجی یا مالی اعتبار سے اپنے سے کہیں بڑی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور کلچرڈ عورتوں پر بھی چھائی رہتی تھی۔

میرے تاثرات سے اسے اپنے سوال کا جواب مل گیا اور مطمئن ہو کر دوبارہ ٹہلنے لگی۔ پانچ منٹ بعد اس نے مجھے چلنے کا اشارہ کیا اور ہم ڈرائنگ روم کی طرف چل دیئے۔

روپا نے ڈرائنگ روم میں داخل ہونے کے لئے پردہ ایک طرف کو ہٹایا تو میری نظر آراستہ و پیراستہ اور طویل و عریض ڈرائنگ روم میں سامنے ہی صوفے پر بڑے با رعب انداز میں بیٹھے ہوئے ایک شخص پر پڑی۔ پہلی نظر میں وہ مجھے کوئی منگول شہزادہ دکھائی دیا اس کے لمبے لمبے بھورے بالوں کی لٹیں اس کے کندھوں کو چھو رہی تھیں.... چپٹی ناک تلے پتلی پتلی چنگیزی طرز کی مونچھیں ڈھیلے ڈھالے انداز میں لٹکی ہوئی تھیں..... آنکھوں پر طلائی فریم کی تاریک شیشوں والی عینک تھی' چہرہ خاصا چوڑا اور رنگت تپے ہوئے تانبے سے مشابہ تھی۔ رخساروں پر جیسے گوشت میں گرہیں سی پڑی ہوئی تھیں۔

وہ سفید چمکیلے ساٹن نما کسی کپڑے کا چینی طرز کا بند گلے کا کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ کوٹ کے ساتھ اس نے چوڑی دار پاجامہ پہن رکھا تھا پیروں میں مخملیں جوتے تھے جن پر سفید موتی ٹکے ہوئے تھے۔ اس کے گلے میں موٹے موٹے سبز پتھروں کی مالا تھی ان پتھروں میں بڑی مدھم قسم کی چمک تھی۔

مجموعی طور پر وہ بھاری تن و توش کا آدمی تھا اور کچھ اس انداز سے بیٹھا ہوا تھا جیسے زمانہ قدیم کا کوئی بادشاہ اپنے درباریوں سے خطاب کرنے لگا ہو.... روپا کو دیکھتے ہی وہ اٹھا اور کورنش بجا لانے کے سے انداز میں جھک کر اس نے گویا اسے خوش آمدید کہا۔ اس کی ... آنکھوں پر گو کہ تاریک شیشوں کی عینک تھی مگر میں نے محسوس کیا کہ سیدھا کھڑا ہوتے وقت اس نے گہری نظروں سے روپا کا سر تا پا جائزہ لیا تھا اور اسی وقت میری نظر ایک اور شخص پر پڑی جو غالباً" حد ادب کے طور پر کنور میسوری سے کافی فاصلے پر ایک اور کرسی پر بیٹھا تھا۔

روپا کو دیکھ کر وہ بھی پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور احتراماً" جھکا تھا۔ اس کے پیروں کے قریب چمڑے کا ایک نفیس بریف کیس رکھا تھا یہ شخص نہایت دبلا پتلا تھا مگر اس کے بازو' ٹانگیں اور ہاتھوں کی انگلیاں غیر معمولی طور پر لمبی تھیں۔ اس کے چہرے کے عضلات کھنچے کھنچے سے تھے اور آنکھیں مینڈک کی طرح ابھری ہوئی تھیں۔ تاہم اس کے بال اچھے تھے' اور سلیقے سے بنے ہوئے تھے۔ وہ سوٹ میں ملبوس تھا اور سوٹ کی عمدہ تراش خراش کی وجہ سے اس کی شخصیت کچھ غنیمت نظر آرہی تھی۔ یقیناً" وہ کنور میسوری کا سیکریٹری

تھا۔

تعارف کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی کیونکہ ہم چاروں ہی ایک دوسرے کو جان چکے تھے..... روپا نے سر کی خفیف سی جنبش سے ان کے سلاموں کا جواب دیا' اور انہیں بیٹھنے کے لئے کہہ کر مجھے بھی بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود بھی بیٹھ گئی۔

"آپ کیا پینا پسند کریں گے کنور؟" اس نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

"تکلفات کی ضرورت نہیں میڈم!" یہ جملہ اس نے نہایت شستہ انگریزی میں ادا کیا تھا اور گویا میرے اس خیال کی تصدیق کر دی تھی کہ غیر معمولی طور پر اونچے خاندانوں کے لوگ عموماً کئی کئی زبانوں پر عبور رکھتے ہیں۔ اس کی آواز خاصی گونج دار تھی۔

"میں چاہتا ہوں کہ آپ کا کم سے کم وقت لوں۔"

اس نے مسکراتے ہوئے کہا..... اس مسکراہٹ کے دوران اس کی لٹکی ہوئی چنگیزی مونچھوں کے درمیان فاصلہ بڑھ گیا۔

"آپ اطمینان سے بات کریں.... میرے پاس ایک گھنٹہ فاضل ہے۔" روپا نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے اس سے بھی زیادہ شستہ انگریزی میں کہا۔ اسے انگریزی بولتے سن کر بھی کوئی اس کی اصلی تعلیمی استعداد کا اندازہ نہیں کر سکتا تھا۔

"سب سے پہلے تو آپ یہ بتائیں کہ کیا آپ ہماری اس فلم میں کام کرنے کے لئے تیار ہیں۔ جو ہم بی ایم والوں کے اشتراک سے ہندوستانی مارکیٹ کے لئے بنا رہے ہیں؟" کنور میسوری نے اب اردو میں بات شروع کر دی۔

روپا کی پیشانی پر ہلکی سی شکن نمودار ہوئی۔ "کیا بی ایم والوں نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ میں پہلے اسکرپٹ پڑھتی ہوں اس میں اپنا رول دیکھتی ہوں' باقی کاسٹ دیکھتی ہوں پھر معاوضے کی بات کرتی ہوں اور جب یہ سب چیزیں طے پا جائیں تب حامی بھرتی ہوں۔"

"بتایا تھا..... میں اسکرپٹ ساتھ لے آیا ہوں۔ ملک کے مایہ ناز مصنف رہبر بلالی نے اسے لکھا ہے۔ قصہ انگریزی ناول سے ہے۔"

پھر کنور نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ "وہ میں ابھی آپ کی خدمت میں پیش کروں گا میں آپ سے صرف یہ یقین دہانی چاہتا تھا کہ اگر اسکرپٹ' آپ کے رول' کاسٹ اور معاوضے وغیرہ کی طرف سے آپ کا اطمینان ہو گیا تو آپ ڈیٹ دے سکیں گی یا نہیں؟ آپ کا شیڈول بہت زیادہ ٹائٹ تو نہیں ہے؟"

اب اگر روپا کی جگہ کوئی اور ہیروئن ہوتی تو خواہ اس کی صرف ایک فلم سیٹ پر ہوتی' مگر کاروباری مصلحت کے تحت اس کا جواب کچھ اس قسم کا ہوتا۔ "وہ جی شیڈول میں تو بالکل گنجائش نہیں ہے لیکن اب آپ آہی گئے ہیں' اور پھر آپ کا بی ایم والوں سے بھی معاملہ ہے ..... ان کا لحاظ تو کرنا ہی پڑے گا میں کسی نہ کسی طرح گنجائش نکال لوں گی۔"

اس کی بجائے روپا نے نہایت دیانتداری سے کہا۔ "میں سچ کہتی ہوں... سائن کرتی ہوں۔ اس لئے میں مشین کی طرح دن رات مصروف کچھ اور ہے۔" بھی نہیں۔ اس پورے سال میں میرے پاس بہت کم ڈیٹس ہیں۔" ... لیا! اس تھی لیکن بہت معمولی حد تک۔

"خیر..... یہ باتیں تو طے ہو ہی جائیں گی۔" کنور میسوری نے کہا۔ "پہلے آپ کو فلم اسکرپٹ اور آئندہ منصوبوں کی رپورٹ پیش کرتا ہوں..... آپ نظر ڈال کر ہی شاید کسی فیصلے پر پہنچ سکیں۔ اس نے اپنے سیکریٹری کو اشارہ کیا..... سیکریٹری نے بریف کیس اٹھا کر نہایت ادب سے اس کے سامنے جاکر پیش کیا۔

"گاڑی سے بڑی فائل بھی نکال لاؤ۔" کنور میسوری نے اسے حکم دیا..... وہ مودبانہ مستعدی سے گھوما اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا' میرے قریب سے گزر کر دروازے کی طرف چلا گیا..... ڈرائنگ روم میں تو نہایت دبیز ایرانی قالین بچھا ہوا تھا' لیکن میرا اندازہ تھا کہ ننگے فرش پر چلتے وقت بھی اس شخص کے قدموں کی آہٹ پیدا نہیں ہوتی تھی..... ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چلتے وقت اس کے جوتے فرش کو چھوتے ہی نہیں تھے۔

کنور میسوری نے بریف کیس گھٹنوں پر رکھا اور کوئی بٹن دبا کر کھٹکے سے اس کا تالا کھولا' اور اس پر جھک گیا..... چند لمحے بعد اس نے بریف کیس میں ہاتھ ڈال کر جو چیز نکالی وہ خوف ناک سی ساخت کا ایک دو نالی ریوالور تھا جس پر **سائیلنسر** بھی لگا ہوا تھا اور جس کا رخ ہماری ہی طرف تھا۔

مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا کیونکہ اس سانپ نے اس وقت پھن نکالا تھا جب ہمیں اس پر سانپ ہونے کا شبہ تک نہیں رہا تھا۔ تاہم میں نے اپنی حیرت ظاہر نہیں ہونے دی تھی۔ البتہ ایک نظر روپا کی طرف ضرور دیکھ لیا۔ اس کا چہرہ یک لخت سپید پڑ گیا تھا۔ مگر پھر شاید میری موجودگی کے احساس سے وہ کچھ سنبھل گئی۔

"یہ ایک ایسا اسکرپٹ ہے میڈم روپا۔" کنور میسوری نے ریوالور کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔ "جسے کوئی سی بھی زبان بولنے والے با آسانی سمجھ سکتے ہیں غالباً آپ بھی سمجھ گئی ہوں گی کہ میں آپ کو لینے آیا ہوں۔"

میرا ہاتھ جو گود میں ٹکا ہوا تھا..... غیر محسوس طور پر میری جیکٹ کی جیب ہی طرف بڑھ رہا تھا جس میں میرا مشین پسٹل موجود تھا۔ کنور ہم سے اتنے فاصلے پر بیٹھا تھا کہ اگر میں انتہائی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بھی چھلانگ لگاتا تب بھی زیادہ امکان یہی تھا کہ اس کے ریوالور سے نکلنے والی گولیاں مجھے بیچ راستے ہی میں ڈھیر کر دیتیں اور یہ شخص کنور میسوری یا جو بھی اس کا **اصل** نام تھا..... ریوالور کو کھلونے ہی کی طرح استعمال کرنے کا عادی معلوم ہوتا تھا۔

تھا۔

تعارف کی ضرورت مج حطرناک اور سخت جان شخص تھا مجھے معلوم تھا کہ عینک کے
تھے..... روپا نے سرپے چھپی ہوئی اس کی آنکھیں روپا کو کم اور مجھے زیادہ دیکھ رہی ہیں۔
کے لئے میں بہت ہی آہستگی سے جیب کی طرف ہاتھ بڑھا رہا تھا کنور میسوری بھی عجلت میں
کوئی قدم اٹھانے کا عادی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس کا انداز کسی بھاری بھرکم اور ست
الوجود اژدھے سے مشابہ تھا جو بڑی کاہلی سے رینگتا ہے مگر جب کسی جاندار کے جسم کے
گرد لپٹ جاتا ہی تو چند سیکنڈ میں اس کی ہڈیاں چور کر کے رکھ دیتا ہے..... اس کا انداز
کوبرا جیسا نہیں تھا جو بجلی کی سی تیزی سے ڈستا ہے۔

"نہیں..... نہیں برخودار....." دفعتاً" اس کی غراہٹ سن کر میرا دل کچھ زیادہ تیزی سے دھڑک اٹھا۔ "ہاتھ اپنی جگہ ساکت رکھو ورنہ یہ جسم سے الگ بھی ہو سکتا ہے اس ریوالور کی گولی بڑی ظالم ہے اور ذرا ایک نظر پیچھے بھی دیکھ لو۔"

میں نے گردن ترچھی کر کے دیکھا کنور کا سیکریٹری جو گاڑی سے بڑی فائل نکالنے گیا تھا اور اس کے ہاتھ میں بھی ویسا ہی ریوالور تھا جس کا رخ میری گدی کی طرف تھا۔ مینڈک کی آنکھوں سے مشابہ اس کی آنکھیں بالکل ساکت تھیں اور ان میں بے رحم موت اپنے خوفناک پر پھیلائے بیٹھی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ محض ایک ریوالور کے اضافے سے وہ مجہول سا شخص کس قدر سفاک نظر آنے لگا تھا۔

"رشی!" کنور نے اپنے نام نہاد سیکریٹری کو مخاطب کیا۔ "برخودار کو غیر ضروری وزن سے نجات دلا دو۔" میں نے پیچھے دیکھے بغیر محسوس کر لیا کہ وہ عقب میں میرے قریب آپہنچا ہے۔ پھر اس کا استخوانی ہاتھ مجھے اپنی جیکٹ کی جیب کی طرف بڑھتا نظر آیا اور دوسرے ہی لمحے میرا مشین پسٹل اس کی غیر معمولی طور پر لمبی انگلیوں کی گرفت میں تھا۔

"بڑی عمدہ چیز ہے۔" ساتھ ہی اس کا تبصرہ سنائی دیا۔ اس کی آواز کچھ ایسی ہی تھی جیسے مینڈک کا گلا بیٹھ گیا ہو۔ مجھے حیرت تھی کہ اس کی شخصیت میں مینڈک سے اتنی مشابہت کیوں تھی۔

مشین پسٹل اس نے غالباً" اپنی جیب میں رکھ لیا اور اسی ہاتھ سے میری دوسری جیبوں و تھپتھپایا۔ بغلیں ٹٹول کر دیکھیں کہ کہیں ہولسٹر تو موجود نہیں' پھر وہ پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے غالباً" کنور میسوری کو کوئی اشارہ کیا کیونکہ وہ ایک ہاتھ میں بریف کیس اور دوسرے میں ریوالور سنبھالے اٹھ کھڑا ہوا۔

"چلئے میڈم! کنور نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ اس مرتبہ میڈم اس نے طنزائیہ لہجے میں کہا تھا۔

"کہاں لے جانا چاہتے ہو تم مجھے؟" روپا نے سرسراتی آواز میں پوچھا۔

"میرا بس چلے تو میں آپ کو چاند پر لے چلوں۔" کنور نے مکارانہ انداز میں مسکراتے

ہوئے کہا پھر ایک ٹھنڈی سانس لی۔ "لیکن افسوس کہ میرا معاہدہ کچھ اور ہے۔"

"کس سے ہے تمہارا معاہدہ؟" یہ سوال میں نے کیا۔

"اوہ...... چہ.....چہ..." اس نے گویا کسی دودھ پیتے بچے کو پچکارا۔ "لڑکے بالے! اس قسم کا سوال نہیں کیا کرتے۔" پھر وہ روپا سے مخاطب ہوا۔ "مجھے اطلاع ملی ہے کہ مینجر آڑ میں تم نے کثیر المقاصد قسم کا یہ لونڈا رکھا ہوا ہے۔ یہ کافی خطرناک ہے محض اس کی شہرت سن کر ہی میں آپ کے ساتھ اسے بھی لپیٹے لئے چل رہا ہوں ورنہ اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔"

اس کے اس تضحیکی انداز پر بھی میں نے معمولی سا بھی رد عمل ظاہر نہیں کیا اور نہایت پر سکون لہجے میں کہا۔ "یہ آپ کی نوازش ہے سور جی! ویسے آپ یہ زحمت نہ کرتے تب بھی میں آپ کے ساتھ چلنے کی درخواست ضرور کرتا آپ جیسے بزرگوں کی صحبت روز روز تو نصیب نہیں ہوتی۔"

ضرور..... ضرور چلو برخوردار!" اس نے سفاک مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "تمہیں بھی پتا تو چلے کہ کنور میسوری درحقیقت ہے کس چڑیا کا نام۔" پھر یک لخت اس کے لہجے میں کرختگی آگئی۔ "اب اٹھ بھی چکو۔" ساتھ ہی اس نے ریوالور کو حرکت دی۔

اس وقت میرا ارادہ تھا کہ کوئی ہاتھ دکھاؤں لیکن ایک تو روپا کی وجہ سے باز رہا میں تو اپنا بچاؤ کر سکتا تھا لیکن اسے نقصان پہنچنے کا احتمال تھا۔ دوسرے میں نے یہ سوچ کر ارادہ تبدیل کر دیا تھا کہ اب ڈور ہاتھ آئی ہے تو سرا بھی تلاش کر ہی لیا جائے۔

میرے چہرے پر سرد مہری دیکھ کر روپا نے نظر پھیرلی۔ اور گویا صرف اپنے آپ پر ہی تکیہ کرتے ہوئے قدرے سختی سے کنور کو مخاطب کیا۔ "ویسے تم ہو کون؟"

"میں بس آپ جیسے کچھ بڑے بڑے لوگوں کا خادم ہوں.... آڑے وقت میں ان کے کام آتاہوں۔ ان کے چھوٹے موٹے کام جن کے سلسلے میں وہ خواہ مخواہ ادھر ادھر جھک مارتے رہتے ہیں مختصر سے وقت میں انجام دیتا ہوں اور اپنی راہ لیتا ہوں۔ مسافر ہوں' آج یہاں کل وہاں۔" کنور نے خوشگوار لہجے میں جواب دیا۔

"کرائے کے قاتل ہو۔" روپا نے اپنے لہجے میں حقارت ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

"نہیں .... میں اس سے کافی اونچے درجے کا فنکار ہوں۔" اس کا لہجہ کھردرا سا ہو گیا۔ "اب تم دونوں دروازے کی طرف گھوم جاؤ اور شانہ بشانہ پورچ کی طرف چلو۔" میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا ایک لمحے کی ہچکچاہٹ کے بعد روپا بھی میرے ساتھ قدم اٹھانے لگی۔ رشی دروازے سے ہٹ کر ایک طرف کو کھڑا ہو گیا۔ ریوالور کا رخ ہماری طرف تھا۔ ہم اس کے قریب پہنچے تو وہ ریوالور کوٹ کی جیب میں اس طرح رکھ کر کہ اس کی نال کا ابھار نظر آتا رہے۔ میرے ساتھ چلنے لگا۔ کنور میسوری ہمارے پیچھے تھا۔

چوکیدار گیٹ سے باہر بیٹھا تھا اس لئے وہ ہمیں کار میں سوار ہوتے نہیں دیکھ سکا۔ اسٹیئرنگ پر ڈرائیور موجود تھا کنور نے پہلے روپا کو پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کا حکم دیا۔ اس کے ساتھ ہی رشی اس کے پہلو سے ریوالور لگائے بیٹھ گیا۔

کنور نے مجھے دوسرے دروازے کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔ میں پچھلی ہی سیٹ پر روپا کے برابر بیٹھ گیا تو کنور میری پسلیوں پر ریوالور رکھے میرے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ گاڑی کی پچھلی سیٹ اتنی کشادہ تھی کہ ہم چاروں بغیر کسی تکلیف کے بیٹھے تھے ۔ حالانکہ ہم میں سے دو افراد عام تن و توش کے مالک نہیں تھے یعنی میں اور کنور میسوری۔

کنور کا لمس محسوس کر کے مجھے ایک اور حقیقت کا احساس ہوا بظاہر وہ تھل تھل کرتے پلپلے جسم کا مالک محسوس ہوتا تھا..... لیکن درحقیقت وہ اتنا ہی ٹھوس اور مضبوط تھا جتنی اس کے ریوالور کی نال جو میری پسلیوں میں چبھ رہی تھی۔

ڈرائیور صورت حال سے مکمل طور پر لاتعلق نظر آرہا تھا۔ اس نے نہ تو پیچھے مڑ کر دیکھا اور نہ ہی کچھ پوچھا' خاموشی سے گاڑی اسٹارٹ کی اور گھما کر گیٹ پر لے آیا۔ ہارن سن کر چوکیدار نے گیٹ کھول دیا اور تقریباً" بے آواز انجن والی گاڑی اس کے قریب سے گزرتی چلی گئی اس نے نہ صرف ہمارے لئے گیٹ کھولا تھا بلکہ جھک کر الوداعی انداز میں ہمیں سلام بھی کیا تھا۔ وہ دیکھ ہی نہیں سکا کہ میری اور روپا کی پسلیوں پر ریوالور ٹکے ہوئے تھے۔

گاڑی پر سکون رہائشی علاقے سے نکل آئی اور شہر کی بھری پری سڑکوں پر فراٹے بھرنے لگی۔

کئی میل کا فاصلہ یونہی خاموشی سے طے ہوا۔ دفعتاً" میرے دائیں ہاتھ پر روپا گویا بدک کر اچھلی۔ رشی جو اس کے کندھے سے کندھا جوڑے بیٹھا تھا' نے یقیناً" کوئی حرکت کی تھی۔ "ذلیل.... لنگور کے بچے...!" وہ گھٹی گھٹی روہانسی آواز میں چیخی۔

میری کنپٹیوں میں ایک بار پھر شرارے سے پھوٹے لیکن میں نے انہیں پھیلنے نہ دیا اور ٹھہرے لہجے میں کنور سے کہا۔ "اس کمینے سے کہو کہ اپنے غلط پنجوں کو قابو میں رکھے ورنہ میں بھول جاؤں گا کہ تم دونوں کے پاس ریوالور موجود ہیں۔ مرنے سے پہلے میں کم از کم اس کا بھیجا ضرور نکال جاؤں گا۔

"کمینگی نہیں کرو رشی۔" کنور نے مربیانہ لہجے میں اپنے ساتھی سے کہا۔ اس نے قدرے آگے جھک کر مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ اس کی مینڈک جیسی آنکھوں میں مسکراہٹ کی رمق تک نہیں تھی' صرف پتلے پتلے ہونٹ عجیب سے انداز میں کھنچ کر رہ گئے تھے۔ وہ کوئی جواب دیئے بغیر سنبھل کر بیٹھ گیا۔

کار میں اتنی خاموشی چھا گئی تھی کہ جیسے سب سو گئے ہوں۔ انجن کی مدھم سی

سرسراہٹ کے علاوہ کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

بیس پچیس منٹ کے مزید سفر کے بعد جب کار ایک تنگ اور نیم پختہ گلی میں رکی تو وہ علاقہ مجھے اجنبی ہی دکھائی دیا۔ تاہم کار سے اتر کر یہ اندازہ ضرور ہوگیا کہ ہم شہر کے کسی اچھے علاقے میں تھے۔ ہمارے دونوں طرف متوسط درجے کی کوٹھیوں کی قطاریں تھیں لیکن یہ در حقیقت ان کوٹھیوں کی عقبی گلی تھی کہیں کہیں لوگوں نے کوڑا کرکٹ بھی پھینک رکھا تھا۔

کنور نے جیب سے چابیوں کا ایک بڑا سا گچھا نکال کر ڈرائیور کی طرف اچھالا اور اس نے آگے بڑھ کر ایک کوٹھی کا پچھلا گیٹ کھول دیا۔ یہ ایک خاص کشادہ دو منزلہ کوٹھی تھی جس کے عقبی حصے میں بھی لان تھا۔ تالا گیٹ میں لٹکانے کے بعد کنور نے چابیوں کا گچھا جیب میں ڈالا اور ہمیں اندر چلنے کا اشارہ کیا۔ اب رشی ہمارے پیچھے تھا اور کنور میرے پہلو بہ پہلو چل رہا تھا۔ ڈرائیور نہ جانے کہاں غائب ہوگیا تھا گھاس کے درمیان ایک پختہ روش پر چلتے ہوئے ہم قدرے اونچائی پر بنی ہوئی اصل عمارت تک پہنچے مگر کنور کئی دروازوں کے قریب سے گزرتا چلا گیا۔ عمارت کے ایک کونے پر پہنچ کر سیمنٹ ہی کی کشادہ سیڑھیاں نیچی جاتی دکھائی دیں۔

ہم سیڑھیاں اترنے لگے چاروں طرف گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا کوٹھی میں یقیناً" کوئی ذی روح موجود نہیں تھا۔ سیڑھیوں کے اختتام پر لکڑی کا دروازہ تھا کنور نے ایک بار پھر چابیوں کا گچھا نکال کر ایک چابی منتخب کی اور دروازہ کھول کر اندر قدم رکھتے ہی بایاں ہاتھ بڑھا کر ریوالور سے کوئی سوئچ دبایا اور تاریک تہ خانہ یکایک جگمگا اٹھا۔

یہ نہایت طویل و عریض' غالباً" بالائی عمارت ہی جتنا تہ خانہ تھا۔ دائیں طرف دیوار کے ساتھ نئے اور صاف ستھرے گتے کے کارٹن بہت بڑی تعداد میں دیوار کے ساتھ چنے ہوئے تھے۔ ان پر مختلف صابنوں اور ٹائلٹ کے دیگر سامان کے بڑے بڑے لیبل نظر آرہے تھے۔

ایک گوشے میں ایک صاف ستھری آفس ٹیبل لگی ہوئی تھی جس پر ٹیبل لیمپ' کئی فائلیں اور دیگر دفتری سامان بھی موجود تھا میز کے گرد چند کرسیاں بھی موجود تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس تہ خانے کو گودام اور دفتر کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا چھت میں تین پنکھے بھی موجود تھے اور لوہے کے ایک فالتو کنڈے میں ایک لمبا سا نوکیلا' بہت بڑا ایک ہک لٹکا ہوا تھا جیسا عموماً" قصاب گوشت کے نہایت وزنی پارچے لٹکانے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ پھر اس ہک کی موجودگی کی وجہ بھی میری سمجھ میں آگئی۔ گتے کے بڑے بڑے کارٹنوں کی قطار کے ساتھ ہی ایک بہت بڑی لوہے کی ترازو اور مختلف اوزان کے باٹ پڑے تھے۔ غالباً" یہاں ایسا مال بھی آتا تھا جسے تولنے کی ضرورت پڑتی تھی اور اس مقصد

کے لئے ترازو اس بڑے سے ہک میں لٹکا دیا جاتا ہو گا۔

رشی ہمارے عقب میں موجود رہا اور کنور میز پر جا بیٹھا۔ ریوالور اب اس نے میز پر لٹکا لیا تھا تاہم نال اب بھی ہماری طرف اٹھی ہوئی تھی۔ میں اور روپا میز سے کچھ دور کنور کے سامنے یوں کھڑے تھے گویا کسی جوڑے کو کسی جھوٹے الزام میں گرفتار کر کے تھانے دار کے سامنے پیش کیا گیا ہو۔ رشی اس سپاہی کی طرح ہمارے عقب میں تنا کھڑا تھا جس نے یہ کارنامہ انجام دیا ہو۔

میں نے کارٹنوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تو تم دکھاوے کے لئے کوئی کاروبار بھی کرتے ہو؟"

"ارے نہیں۔" اس نے گویا کسی اور خیال سے چونک کر قدرے آرام سے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "یہ تو کسی شریف اور معزز قسم کے بلیکئے تاجر کا گھر اور خفیہ گودام ہے جو اپنی نیک کمائی سے اپنے بیوی بچوں کو سوئٹزرلینڈ کی سیر کرانے گیا ہے۔ ہم اس طرح کی دو تین ماہ کے لئے خالی رہنے والی محفوظ قسم کی کوٹھیوں کی تاک میں رہتے ہیں اور ان میں اپنا کیمپ لگا لیتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مکینوں نے کب آنا ہے۔ اس سے دو ایک دن پہلے ہی ہم اپنا مختصر سا سامان سمیٹ کر کوچ کر جاتے ہیں اگر کبھی کبھار ہمارے کسی معرکے کے سلسلے میں سراغ لگاتی ہوئی پولیس اس کوٹھی تک آ بھی پہنچتی ہے تو گردن بے چارے مالک کی پھنستی ہے.... جسے کچھ پتا نہیں ہوتا..... کیسا ہے؟" وہ داد طلب لہجے میں بولا اور جواب کا انتظار کئے بغیر بے آواز سے طریقے سے ہنسنے لگا۔ اسی ہنسی میں کئی بار بھیڑیئے کی غراہٹ سی در آئی۔ اس کے علاوہ کوئی آواز سنائی نہ دی۔

"ویسے مجھے اپنے اب تک کے کیمپوں میں یہ کیمپ سب سے زیادہ پسند آیا ہے۔ معلوم ہے کیوں؟" اس نے اپنی چندھی چندھی لیکن خون آشام آنکھوں کو ایک بار بھی جھپکایا نہیں تھا۔ "محض اس ایک ہک کی وجہ سے۔" اس نے چھت میں لٹکے ہوئے بڑے سے نوکیلے آہنی ہک کی طرف اشارہ کیا اور اس کے ہونٹوں پر اس کی مخصوص حیوانی سی مسکراہٹ ایک بار پھر رینگ آئی۔

"اس ہک کی وجہ سے مجھے ایک نیا تجربہ کرنے کا موقع ملا۔" اس نے گویا چٹخارے لیتے ہوئے کہا۔ "واہ کیا منظر تھا..... اپنے سابقہ شکار کو جو تمہاری ہی طرح بڑی اکڑ فوں والا آدمی تھا میں نے لباس کے تکلف سے نجات دلائی۔ ہاتھ پاؤں باندھے اور اس کا حلقوم اس ہک پر ٹکا کر لٹکا دیا۔ پھر ایک سوئی لے کر میں اس کے جسم کے نازک حصوں پر چبھونے لگا.... ہر مرتبہ سوئی چبھونے پر وہ تڑپتا تھا اور ہک اس کی حلق میں اور گہرا اتر جاتا تھا۔ بڑی دیر میں جا کر ہک میں لٹکا ہوا اس کا جسم ساکت ہوا۔"

چند لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی اور ہمارے پیچھے کھڑے رشی

سے مخاطب ہوا۔ "ابھی تو صرف پونے بارہ ہوئے ہیں..... وکرم کے آنے میں پورا سوا گھنٹہ باقی ہے تب تک کیا ہمارے یہ حسین مہمان یونہی کھڑے رہیں گے؟"

رشی نے کوئی جواب نہ دیا.... وہ گویا صرف احکامات پر عملدرآمد کرنے کی مشین تھا۔

کنور میسوری چند لمحے پر خیال نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا پھر اس نے سر پر ہاتھ پھیرا اور دوسرے ہی لمحے وہ مجھے گنجا نظر آیا.... بڑے سے بلب کی تیز روشنی میں اس کی چندیا چمک رہی تھی۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ اب تک وہ وگ پہنے ہوئے تھا۔ وگ اب اس کے ہاتھ میں تھی جسے اس نے بڑی احتیاط سے میز پر رکھ دیا۔ سر گنجا نظر آنے سے اس کی شخصیت کا تاثر بہت بدل چکا تھا۔ وہ کچھ اور زیادہ خوفناک نظر آنے لگا تھا۔ گردن بھی گویا بھینسے کی طرح گٹھی ہوئی اور مضبوط دکھائی دینے لگی تھی۔

بڑے آسودہ سے انداز میں کئی مرتبہ چندیا پر ہاتھ پھیرنے کے بعد وہ ایک بار پھر رشی سے مخاطب ہوا۔ "ایسا کرو کہ الماری سے لوہے کی تار کا وہ لچھا نکال لاؤ' اور اس لونڈے کے تو ہاتھ پاؤں باندھ کر ایک طرف ڈال دو اور اس سپر اسٹار حسینہ کو ذرا میرے پاس بھیجو۔ میں اس کے آٹو گراف لیتا ہوں۔ آخری الفاظ ادا کرتے وقت اس کے ہونٹوں پر اس کی مخصوص شیطانی مسکراہٹ رینگ آئی جس میں ایک خوفناک قسم کی بھوک بھی شامل ہو چکی تھی۔ غیر محسوس طور پر اس نے چٹخارہ سا لے کر بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "وکرم نے تو اس مال کو ایکسپورٹ کر ہی دینا ہے ہم ذرا نمونہ ہی دیکھ لیں۔"

میں نے اپنے عقب میں رشی کی آہٹ نہیں سنی لیکن کن انکھیوں سے دیکھ لیا۔ وہ ایک دیوار گیر الماری سے لوہے کے باریک اور نرم تار کا لچھا لے کر میری پشت پر پہنچ چکا تھا۔ فیصلہ کن لمحہ آپہنچا تھا مجھے معلوم تھا کہ لوہے کی یہ نرم اور باریک تار ایک مرتبہ میری کلائیوں اور ٹانگوں کے گرد کس دی گئی تو پھر میں اپنی نسیں اور گوشت تو کٹوا سکوں گا لیکن اس بندش سے ہاتھ پاؤں آزاد نہیں کرا سکوں گا۔

"ہاتھ پشت پر لے جاؤ۔" کنور نے ریوالور کو حرکت دیتے ہوئے مجھے حکم دیا۔

میں نے ہاتھ پیچھے کئے اور جیسے ہی.... رشی نے میرے ہاتھوں کو چھوا میں اس کی استخوانی کلائیوں کو گرفت میں لیتے ہوئے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ دوسرے ہی لمحے رشی پرندے کی طرح میرے سر پر سے گزرتا ہوا کنور کی طرف جا رہا تھا۔ اسے ہوا میں اچھالتے ہی میں نے روپا کی ٹانگ پکڑ کر اسے ایک طرف کو گھسیٹ کر فرش پر گرا دیا تھا اور اس کی طرف دیکھے بغیر چلا کر اسے ہدایت دی تھی کہ وہ فرش سے ہرگز نہ اٹھے۔

یہ عمل گو کہ دو یا تین سیکنڈ کے وقفے پر محیط تھا مگر کنور اس دوران ساکت بیٹھا تماشا نہیں دیکھتا رہا تھا اور نہ ہی اس نے بوکھلاہٹ میں اندھا دھند فائرنگ شروع کی تھی۔ وہ یقیناً" ایک بے مثال بندوق باز تھا۔ میرے حرکت میں آتے ہی اس نے گولی چلا دی تھی

لیکن اس وقت وہ یہ نہیں جان سکا تھا کہ میری حرکت کس سمت میں ہو گی۔ اس نے یقیناً" میری پیشانی کا نشانہ لیا تھا لیکن میرے بجلی کی سی تیزی سے گھٹنوں کے بل بیٹھنے کی وجہ سے دو نالی ریوالور کی گولیاں میرے بالوں کو چھوتی ہوئی گزریں اور غالباً" رشی کے جسم سے پار ہو گئیں۔ کیونکہ اس کی کربناک چیخ گونجی تھی، مگر دوسرے ہی لمحے چونکہ وہ اڑتے پرندے کی طرح میز پر پھسلتا ہوا کنور سے جا ٹکرایا تھا۔ اس لئے وہ چیخ ادھوری ہی رہ گئی۔

فائر کی آواز محض ایک ہلکی سی "ٹھک" تک محدود رہی تھی جیسے کسی ایئر ٹائٹ بوتل کا کارک کھولا گیا ہو..... کنور نے ایک ہی فائر پر اکتفا نہیں کیا تھا اس نے مزید کئی فائر کئے تھے۔ مگر اس دوران چونکہ وہ کرسی سمیت الٹ چکا تھا اس لئے گولیاں چھت سے ٹکرائیں اور بہت سا پلستر ادھڑ کر نیچے آگرا۔

میں نے کنور کی طرف جھپٹنے میں دیر نہیں کی تھی مگر وہ میرے اندازے سے کہیں زیادہ پھرتی سے رشی کو ایک طرف اچھال کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے جیسے ہی میز کے عقب سے اس کا سر ابھرتے دیکھا، میز اس پر الٹ دی مجھے اس تک پہنچنے میں تاخیر ہو چکی تھی لیکن میز الٹنے سے میرا مقصد حل ہو گیا۔ مجھے چند لمحے کی مہلت مل گئی میز بہت وزنی تھی۔ میرا خیال تھا کہ کنور اس کے تلے دب کر کچھ دیر کے لئے ضرور بے بس ہو جائے گا مگر ایسا نہیں ہوا تاہم اس کا ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر ضرور کچھ دور جا گرا میز کو اس نے کھلونے کے طرح ہوا میں اچھال دیا۔ وہ ایک دھماکے سے کچھ دور جا گری، اور اس کے ساتھ ہی جیسے میرے اور کنور کے درمیان سے کوئی فصیل ہٹ گئی۔

اب ہم ایک دوسرے کے سامنے تھے کنور فرش پر چت تھا اور میں گھٹنوں کے بل کھڑا تھا میں نے اس کے سینے پر کراٹے کے وار کے لئے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ ناقابل یقین پھرتی سے اس نے میرے سینے میں لات رسید کر دی۔ میں الٹ کر پیچھے جا گرا..... ضرب اتنی شدید تھی کہ عام آدمی کی شاید پسلیاں دہری ہو جاتیں۔ ایک لمحے کے لئے تو میں بھی چکرا گیا... دل جیسے اچھل کر حلق میں آگیا تھا لیکن مجھے فوراً" سنبھلنا پڑا۔ کنور چیتے کی سی پھرتی سے ریوالور پر جھپٹا تھا۔ اس بار میں نے اس کے جبڑے پر ٹھوکر رسید کی۔ وہ الٹتے الٹتے سنبھل گیا۔ اس دوران میں نے دوسری ٹھوکر سے ریوالور کو کافی دور پہنچا دیا۔

کنور نے ریوالور کا خیال چھوڑ دیا، اور اٹھ کر بھوکے درندے کی طرح مجھ پر جھپٹا۔ گوشت کے ابھاروں میں گھری ہوئی اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ اس ی پیشانی اور باچھوں سے خون بہنے لگا تھا، مگر اس کے ہونٹ مسکراہٹ کے سے انداز میں ھنچے ہوئے تھے اور اس عالم میں اسے دیکھ کر.... اندازہ ہوتا تھا کہ اس شخص کی فطرت میں ون کی پیاس رچی ہوئی ہے۔

وہ بپھرے ہوئے سانڈ کی طرح مجھ سے ٹکرایا اور دھکیلتا ہوا مجھے دور تک لے گیا۔

دیوار کے ساتھ چپکا کر اس نے پوری قوت سے میری پسلیوں کے نیچے گھونسہ رسید کرنا چاہا مگر میں اس کی گرفت سے پھسل گیا اور اس کا گھونسہ ہتھوڑے کی طرح دیوار سے ٹکرایا۔ یہ چوٹ اچھے بھلے مضبوط آدمی کا ہاتھ بیکار کر دینے کے لئے کافی تھی..... مگر اس نے ایک ہلکی سی غراہٹ کے بعد پہلے سے زیادہ مشتعل ہو کر اسی ہاتھ سے میرے منہ پر گھونسہ رسید کرنے کی کوشش کی۔ اس مرتبہ بھی میں جھکائی دے گیا۔ یہ سب کچھ وہ اتنی پھرتی سے کر رہا تھا کہ مجھے اپنی تمامتر صلاحیتوں کے باوجود اس پر حملہ کرنے کی مہلت نہیں مل رہی تھی۔

اچانک اس نے مجھے فلائنگ کک رسید کی جو میرے لئے بالکل ہی غیر متوقع چیز تھی۔ میں گرا اور گرتے گرتے دیوار سے جا ٹکرایا۔ ایک لمحے کے لئے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ پختہ فرش پر لڑتے ہوئے فلائنگ کک برداشت کرنا اور لگانا دونوں ہی آسان کام نہیں ہیں۔ مگر میں نے دیکھا کہ میری آنکھوں کے سامنے ایک لمحے کے لئے چھانے والا اندھیرا دور ہونے تک کنور ایک بار پھر مجھ پر ٹوٹ پڑا تھا۔ اس نے مجھے بالوں سے پکڑ کر اٹھایا اور غالباً" سر سے اونچا اٹھا کر فرش پر پٹخنا چاہتا تھا جب میں نے یا.....ادو... کی زور دار چیخ کے ساتھ اس کی ہنسلی کی ہڈی پر کراٹے کا ایک ہاتھ رسید کیا۔ اس مرتبہ اس کے حلق سے اذیت بھری کراہ خارج ہوئی جو اس بات کی نشانی تھی کہ ہنسلی کی ہڈی ٹوٹ چکی ہے اس سے کم تکلیف پر تو کنور جیسا آدمی نہیں کراہ سکتا تھا۔

وہ ایک لمحے کے لئے لڑکھڑایا اور سنبھل گیا اور ایک بار پھر اس نے فلائنگ کک لگانے کی کوشش کی۔ اس کا انداز بتاتا تھا کہ وہ جوڈو کی شد بد رکھتا ہے کیونکہ اس کی فلائنگ دراصل "چاپ سوئی" کی ایک کوشش تھی۔ میرا غم و غصہ اور اشتعال اب میرے قابو سے باہر ہو چکا تھا۔ ہر بات کی مصلحت میرے ذہن سے نکل چکی تھی۔ صرف اس شخص کو سبق سکھانے اور سزا دینے کا تصور رہ گیا تھا۔

فلائنگ کک کے لئے جو وہ ہوا میں بلند ہوا تو میں نے اس کے نشانے سے ہٹ کر اس کی پنڈلی پر کراٹے کا ایک ہاتھ مارا اس وار نے یقیناً" اس کی پنڈلی کا گوشت دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا ہو گا۔ وہ فرش پر گرا تو فوری طور پر اٹھ نہیں سکا۔ اسی دوران میں نے اس کی کنپٹی پر ٹھوکر رسید کی۔ وہ بلبلاتا ہوا اٹھا مگر اس کی ٹانگ میں لنگڑاہٹ تھی۔ اس کے حلق سے اب جو آوازیں نکل رہی تھیں وہ کئی درندوں کی غراہٹ سے مشابہہ تھیں۔

اس کا چہرہ خون سے لتھڑ چکا تھا۔ میں نے اس کی چندیا کے عین وسط میں چاپ لگائی۔ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا ایک لمحے کے لئے اس کا سر ادھر ادھر کو ڈولا مگر دوسرے ہی لمحے وہ اچھل کر مجھ پر جھپٹا۔ میں نے اس کے چہرے پر اتنی طاقت سے گھونسہ رسید کیا کہ اس کی چھوٹی سی ناک بالکل ہی چپٹی ہو گئی اور اس کے چہرے پر خون کی تہہ گہری ہو گئی۔

اس بار وہ میری طرف آیا تو میری انگلیوں کے ایک ہلکے سے وار نے اس کی ایک

آنکھ کو ملغوبے میں تبدیل کر کے رکھ دیا۔ ایک لمحے پہلے جہاں آنکھ نظر آرہی تھی وہاں اب محض خون اور شفاف جیلی نما مادے کا ملغوبہ نظر آرہا تھا۔

میں نے اس کے سنبھلنے سے پہلے اسے اٹھایا' اور پختہ فرش پر پٹخ دیا اور ساتھ ہی نرخرے پر پاؤں رکھ دیا۔ اس مرتبہ وہ ساکت پڑا رہ گیا اور اپنی اکلوتی رہ جانے والی آنکھ کو تیزی سی جھپکاتے ہوئے یوں خاموشی سے چھت کو دیکھنے لگا جیسے اس آنکھ کی بینائی بھی تیزی سے غائب ہو رہی ہو..... اس کی نظر میں شکست خوردگی جھلک آئی تھی۔

"اٹھو۔" میں نے اس کے کولہے پر ٹھوکر رسید کی۔ "ابھی تو تمہیں مجھ لونڈے کو لکڑی کی طرح بیچ میں سے توڑنا ہے۔ اٹھو میرے شیر جوان میرے رستم زماں!" میں نے اسے ایک اور ٹھوکر رسید کی وہ نحیف سے انداز میں بلبلایا اور اس نے رحم طلب سے انداز میں ہاتھ اٹھایا۔ پھر اس کا بازو دوبارہ ڈھیلے ڈھالے انداز میں فرش پر جا ٹکا۔ میں نے اسے ایک بار پھر گریبان سے پکڑ کر کھڑا کرنے کی کوشش کی اس سے صحیح طور پر کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔

"جس شخص کو تم نے اس ہک پر لٹکا کر اس کے جسم کے نازک حصوں پر سوئیاں چبھو چبھو کر اسے اذیت کی موت مار' تھا اس کا جرم کیا تھا؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "مجھے تو اس کو ٹھکانے لگانے کے ایک لاکھ روپے ملے تھے اور ساتھ ہی ہدایت کی گئی تھی کہ اسے جلدی مگر حتی الامکان تکلیف دہ طریقے سے مارا جائے۔"

"اب میں تمہیں اسی ہک پر لٹکانے لگا ہوں۔" میں نے اسے ہک کی طرف گھسیٹتے ہوئے کہا۔ "اور میں تمہارے ہاتھ بھی نہیں باندھوں گا کیونکہ تمہارا وزن اتنا ہے کہ ہک پر لٹکتے ہی تمہاری یہ موٹی گردن اتنی گہرائی تک ہک میں پھنس چکی ہو گی کہ تم میں ہلنے کی سکت ہی نہ رہے گی.... اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ میں یہ خدمت بلا معاوضہ انجام دوں گا۔

تمہاری طرح کسی سے ایک لاکھ تو کیا ایک روپیہ بھی نہیں لوں گا۔"

چند قدم تو وہ گھسٹتا چلا گیا مگر ہک کے قریب پہنچ کر اڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ تب میں نے پوچھا۔ "مرنا نہیں چاہتے..... خصوصاً" ہک پر لٹک کر؟" اس نے نفی میں سر ہلایا اور ہنسلی کی ہڈی ٹوٹی ہونے کی وجہ سے بری طرح کراہ اٹھا۔

"تو پھر جو کچھ میں پوچھوں وہ بتانا پڑے گا۔ بتاؤ گے؟" میں نے اسے دوبارہ اپنے قریب گھسیٹتے ہوئے کہا۔

"بتاؤں گا۔" اس نے خرخراتی سی آواز میں جواب دیا۔

○

میں نے مناسب سمجھا کہ کنور میسوری سے پوچھ گچھ شروع کرنے سے پہلے روپا کو گھر بھیج دوں۔ یہاں کسی وقت بھی کوئی نیا خطرہ نازل ہو سکتا تھا۔ میں نے اسے اس کیڈلک کی چابیاں دے دیں جس میں وہ لوگ ہمیں یہاں لائے تھے۔

"تم فورا" اس گاڑی میں بیٹھ کر گھر روانہ ہو جاؤ۔ چاہو تو راستے میں کہیں یہ گاڑی چھوڑ دینا اور ٹیکسی لے لینا۔" میں نے ہدایت کی۔

روپا مجھے وہاں چھوڑ کر جاتے ہوئے ہچکچائی لیکن میرے سمجھانے پر رخصت ہو گئی۔ تب میں دوبارہ کنور میسوری کی طرف متوجہ ہوا۔ مجھے وہیں الماری سے ایک چھوٹی سی کلہاڑی بھی مل گئی تھی جو اب میرے ہاتھ میں تھی۔ کنور میسوری بالکل نڈھال اور بے دم تھا۔

"سب سے پہلے تو یہ بتاؤ کنور میسوری کہ تم کون ہو؟ تمہارا اصل نام کیا ہے؟" میں نے اس کا بازو کھینچ کر اس کے ہاتھ کی انگلیاں فرش پر پھیلاتے ہوئے پوچھا۔ "یاد رکھو کہ اگر تم نے میرے سوالوں کا جواب دینے میں حیل و حجت کی تو میں پہلے ایک ایک کر کے گاجر مولی کی طرح تمہاری انگلیاں کاٹنی شروع کروں گا۔ پھر ہاتھ..... پھر پاؤں......"

"میرا اصل نام نشچل ہے۔" وہ تیزی سے بول اٹھا۔ "قومیت کے اعتبار سے نیپالی ہوں۔ لیکن پلا بڑھا یہیں بمبئی میں ہوں......" چند لمحے تک ہانپنے کے بعد اس نے سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ "نوجوانی کے زمانے سے ہی مجھے اونچے درجے کے بدمعاشوں کی صحبت میسر آگئی تھی اور زیر زمین سرگرمیوں میں میں نے بڑی تیزی سے ترقی کی لیکن میری اپنی ایک الگ سی لائن بن گئی اور وہ یہ کہ میں صرف ایسے معروف اور ممتاز افراد کے قتل یا اغواء کے لئے مخصوص ہو کر رہ گیا جن پر عام بدمعاش یا تو ہاتھ ڈالتے ہوئے ڈرتے تھے یا وہاں تک ان کی رسائی ہی نہیں تھی۔"

وہ ایک بار پھر ہانپنے لگا اور چند لمحے تک کچھ نہ بولا تو میں نے پوچھا۔ "روپا کو تم کس کے لئے اغوا کر رہے تھے؟"

"وکرم کے لئے۔" وہ سانس کو اعتدال پر لانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "لیکن حقیقت یہ ہے کہ وکرم بھی یہ کام کسی اور کے لئے کر رہا تھا۔ چکر یہ ہے کہ ہماری زیر زمین

دنیا میں مشہور آدمیوں کے قتل یا اغوا کے بھی ٹھیکے چلتے ہیں۔ روپا کے قتل کا ٹھیکہ وکرم کو کافی عرصہ سے ملا ہوا ہے۔ کام کرانے والی پارٹی کون ہے یہ مجھے بھی معلوم نہیں۔ وکرم نے اپنے کئی گرگے آزما لئے لیکن روپا کی یا تو قسمت اچھی تھی یا حملے غلط وقت اور غلط جگہوں پر ہوتے رہے کہ ہر مرتبہ وہ بچ گئی۔ پھر سننے میں آیا کہ اس نے ایک کام کا آدمی رکھ لیا ہے۔ وہ آدمی تم تھے۔ ٹھیکہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ حالانکہ وکرم ایڈوانس کے طور پر ایک بڑی رقم لے کر خرچ بھی کر چکا تھا۔ اس دوران حالات میں ایک تبدیلی یہ آئی کہ وکرم کو پتہ چلا کہ ایک افریقی ریاست کا شہزادہ لندن میں کہیں روپا کی ایک فلم دیکھ بیٹھا ہے اور اس پر پاگل پن کی حد تک عاشق ہو گیا ہے۔ اس نے چند ایک نہایت اونچے درجے کے ایجنٹوں سے بات کی کہ اگر روپا کو اس کے شبستان کی زینت بنوا دیا جائے تو وہ روپا کو پانچ لاکھ پاؤنڈ اور ایجنٹوں کو معقول کمیشن ادا کر سکتا ہے۔ ایجنٹوں نے ٹوہ لگائی اور حتمی طور پر اس نتیجے پر پہنچے کہ روپا ان فلمی اداکاراؤں میں سے نہیں ہے جو غیر ملکی والیان ریاست یا شہزادوں وغیرہ کی اس قسم کی پیشکش قبول کر لیتی ہیں۔ تم چاہو تو روپا سے تصدیق بھی کر سکتے ہو۔ کہ .... ایک مرتبہ افریقی شہزادے شومبی کی طرف سے اسے اپروچ کرنے کی کوشش کی گئی تھی یا نہیں۔ مختصراً" یہ کہ وکرم کو جب یہ معلوم ہوا کہ اس قسم کا کوئی موقع موجود ہے اور کوئی اس سے فائدہ نہیں اٹھا پا رہا ہے تو اس نے ایک تیر سے دو شکار کرنے کی ٹھانی کہ روپا کو مارنے کی بجائے اغوا کر کے مالتی مندر پہنچا دے جہاں سے افریقی شہزادہ شومبی اسے خود ہی اپنی ریاست نکاراگوچی لے جائے گا۔"

میں نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ مالتی مندر ایک چھوٹا سا جزیرہ تھا۔ ماہم کریک کی طرف سے سمندر میں مالتی مندر تک کا سفر تقریباً" آٹھ میل کا تھا۔ میں کبھی اس طرف گیا نہیں تھا لیکن میں نے سنا تھا کہ جزیرے کا کچھ حصہ کسی افریقی شہزادے کی ملکیت ہے۔ جس نے وہاں تقریباً" پچاس ایکڑ پر ایک خوبصورت محل بنوا رکھا ہے اور ہندوستان میں قیام کے دوران وہیں ٹھہرتا ہے لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کونسی افریقی ریاست کا شہزادہ ہے اور اس کا نام کیا ہے۔

"اچھا تو وکرم نے روپا کو فروخت کرنے کا پروگرام بنا رکھا ہے؟" میں نے پوچھا۔

نشچل نے اثبات میں اشارتاً" جواب دینے کی کوشش کی اور ایک بار پھر کراہ کر رہ یا۔ "وہ دونوں پارٹیوں سے پیسے کھرے کرنا چاہتا تھا۔ جس پارٹی نے روپا کو مروانے کا ٹھیکہ یا تھا اس سے وکرم نے پچاس ہزار ایڈوانس لے رکھا ہے اور کام مکمل ہونے پر دو لاکھ کا رہ ہے۔ اگر اس نے شومبی سے بھی پیسے کھرے کر لئے ہوتے تو اس کی کئی نسلوں کے ر دور ہو جاتے بشرطیکہ اس کی نسلیں اس دنیا میں آنے میں کامیاب ہو جاتیں۔ آج کل نکہ وہ سختی سے پولیس اور سی آئی ڈی کی نظر میں ہے۔ اس لئے خود کسی کام میں ہاتھ

نہیں ڈال رہا۔ ٹھیکہ در ٹھیکہ والے سسٹم سے کام چلا رہا ہے اور اس میں بھی لمبے نوٹ کما رہا ہے۔ دنیا کے ہر ملک کی کرنسی اس کی بریف کیس میں موجود ہوتی ہے۔ شملہ کے ایک شراب خانے میں میری جب اس سے ملاقات ہوئی اور اس نے مجھے اس ٹھیکے کی پیشکش کی تو کم از کم ایک لاکھ روپے کی تو اس نے دونوں ہاتھوں میں ہیروں کی انگوٹھیاں پہن رکھی تھیں پچیس ہزار کا گلے میں لاکٹ ہو گا۔ فرانس کا سلا ہوا سوٹ تھا اور ....."

"بس کرو۔" میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "اس کے سارے زیورات وغیرہ کی تفصیلی رپورٹ بتانے کی ضرورت نہیں۔ وہ مرد ہے یا کوئی نوبیاہتا دلہن۔"

"یہ تو تمہیں تب معلوم ہو گا جب اس سے سامنا ہو گا۔" نشچل نے قدرے مرعوبیت زدہ لہجے میں کہا۔ اس کی آنکھ بند ہوئی جا رہی تھی اور وہ بصد کوشش اسے کھلی رکھ رہا تھا۔ دفعتاً" وہ نہایت نحیف لہجے میں بولا۔ "مجھ پر بے ہوشی طاری ہو رہی ہے۔ تمہیں تمہارے خدا کا واسطہ مجھے جلد ایسی جگہ پہنچا دو جہاں طبی امداد مل سکے۔

"طبی امداد لینے کا اتنا ہی شوق تھا تو لڑنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا پھر قدرے تشفی آمیز لہجے میں کہا۔ "بے فکر رہو میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔ یہ رشی کون تھا؟"

اس نے گردن ترچھی کر کے ایک نظر اوندھے پڑے رشی کو دیکھنے کی کوشش کی جس کے منہ سے لہو ایک پتلی سی لکیر کی شکل میں بہہ کر اب خشک ہو چلا تھا۔

"تھا تو یہ میرا ہی آدمی لیکن بہت دن سے اس کے دل میں آزادانہ کام کرنے کی خواہش مچل رہی تھی۔" اس کے کچلے ہوئے ہونٹوں میں حرکت سی ہوئی۔ میں نے ایک نظر گھڑی پر ڈالی۔ "وکرم ایک بجے آئے گا ناں؟"

"ہوں۔" اس کا جواب اثبات میں تھا۔ مگر نقاہت کے مارے صرف ہنکارا سا بھر کر رہ گیا تھا۔ اس کی آنکھ اب بند ہوتی جا رہی تھی اور اسے کھلی رکھنے کی اب اس میں سکت نہیں رہی تھی۔

"وہ تنہا ہی ہو گا؟ میں نے اس کا کندھا ہلاتے ہوئے پوچھا اس کا جسم اب بالکل ڈھیلا پڑ چکا تھا۔ بھیگی ہوئی روئی کی طرح۔

"ہوں۔" اس نے پہلے سے مدھم ہنکارا ابھرا۔

"میں آگیا ہوں دوست" دفعتاً" میرے عقب سے ایسی مردانہ آواز سنائی دی جس میں حد سے زیادہ مٹھاس تھی۔ میرے اعصاب ایک لمحے کے لئے جھنجھنا کر رہ گئے مگر میں نے اپنے آپ کو کوئی رد عمل ظاہر کرنے سے باز رکھا اور فوراً" ہی اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ کسی خوش فہمی میں مبتلا ہوئے بغیر میں نے اپنے آپ کو یقین دلایا کہ یہ وکرم آپہنچا ہے۔ نشچل نے کم از کم دو باتیں تو غلط ہی بتائی تھیں۔ ایک تو وکرم کی آمد کے وقت کے بارے میں

کیونکہ ابھی ساڑھے بارہ بجے تھے۔ دوسرے اس کے تنہا آنے والی بات بھی غلط تھی کیونکہ میں نے غیر محسوس انداز میں گردن ترچھی کرتے ہوئے کن انکھیوں سے اپنے پیچھے کم از کم تین آدمیوں کی جھلک تو دیکھی تھی' عین ممکن تھا کہ وہ اس سے بھی زیادہ ہوں۔

"تمہیں میرا ہی انتظار تھا ناں!" وہی شیریں آواز ایک لمحے کے توقف کے بعد سنائی دی۔ "اب بالکل اسی طرح ہاتھوں کو ساکت رکھتے ہوئے سیدھے کھڑے ہو جاؤ۔ کوئی ہتھیار وغیرہ نکالنے کی کوشش نہ کرنا' زندگی اور مختصر ہو جائے گی۔" پھر اس کے ایک طویل سانس لینے کی آواز سنائی دی۔ شاید اس کی نظر اب نشچل پر پڑی تھی کیونکہ اس نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔ "نشچل زندہ ...... ہے یا مرگیا؟"

میں کوئی جواب دیئے بغیر آہستگی سے سیدھا کھڑا ہو گیا تب اس نے خود نشچل کو پکارا مگر اس کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔

"نشچل کا یہ حشر تم نے ہی کیا ہے؟" مجھ سے پوچھا گیا۔ لہجے میں تحیر یا بے چینی کی جھلک نہیں تھی۔ یہ محض ایک سیدھا سادا سا سوال تھا۔

میں نے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا تو اس کے لہجے کی شیرینی قدرے کم ہو گئی۔ "کیا بند گوبھی کی طرح منہ پھلائے کھڑے ہو۔ ذرا ادھر گھوم جاؤ۔ میں بھی تو تمہارے درشن کروں۔ باتیں ہی باتیں سنی ہیں۔"

میں ابھی تک دل ہی دل میں اپنے آپ کو اس بات پر کوس رہا تھا کہ نشچل سے پوچھ گچھ کرنے میں اتنا منہمک ہو گیا تھا کہ تین افراد کی آمد کا مجھے احساس تک نہ ہو سکا۔ اگر اپنے حواس سے کام لینے میں میری مستعدی کا یہی عالم تھا تو پھر میرا اللہ ہی حافظ تھا۔

آہستہ آہستہ میں ان لوگوں کی طرف گھوما۔ تعداد میں وہ تین ہی تھے وکرم ایک گہرے رنگ کے سوٹ میں ملبوس تھا۔ ٹائی ہیٹ حتیٰ کہ کوٹ کی سامنے والی جیب سے جھانکتے ہوئے رومال تک کے لوازمات مکمل تھے۔ اپنے صاف ستھری' ظاہری حلئے کی بدولت وہ پڑھے لکھے خوشحال تاجر نظر آتے تھے۔ خامی بس یہی تھی کہ ان میں سے دو کے ہاتھوں میں بدصورت قسم کے ریوالور تھے۔ ایک کی نال میرے پیٹ کی سیدھ میں تھی اور دوسرے کی میرے سینے کی سیدھ میں۔

درمیان والے کے ہاتھ میں ریوالور کے بجائے نہایت نفیس قسم کا بریف کیس تھا۔ یہ شخص یقیناً وکرم تھا۔ اسے میں نے اس کے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں چمکتی ہوئی چار ہیرے جڑی انگوٹھیوں کی مدد سے پہچانا۔ وہ قد میں اپنے دائیں بائیں کھڑے ریوالور بدست دونوں ساتھیوں سے اونچا تھا۔ کلین شیو' کتابی چہرہ باریک بھنویں' نیلی آنکھیں اور گوری رنگت۔ حلئے اور قد کاٹھ کے اعتبار سے وہ ایک دھائی پہلے کی فلموں کا ہیرو نظر آتا تھا۔ صرف اس کی کشادہ پیشانی پر زخم کے ایک بڑے سے نشان نے اس کی شخصیت کو گرہن لگا

دیا تھا۔

"ماشاء اللہ چندے آفتاب چندے ماہتاب۔" وکرم نے گویا کسی نومولود کی بلائیں لیتے ہوئے کہا۔ "تو آخر تم نے یہاں بھی بازی پلٹ ہی دی۔ روپا کہاں ہے؟"

میں نے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے چہرے پر قدرے جھنجلاہٹ کے آثار دکھائی دیئے۔ مگر دوسرے ہی لمحے وہ پہلے کی طرح نارمل نظر آنے لگا۔ بڑے مطمئن انداز میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا وہ میری طرف بڑھا۔ میرا ارادہ یہی تھا کہ جیسے ہی وہ تلاشی کے لئے مجھے چھوئے گا عین اسی لمحے اپنی کارروائی شروع کر دوں گا۔ بعد میں بات بگڑ بھی سکتی تھی۔ وکرم اور اس کے دونوں ساتھی مجھے عام بدمعاش نظر آرہے تھے۔ وہ ہاتھا پائی کے عادی معلوم نہیں ہوتے تھے۔ ان کا انحصار اسلحے پر محسوس ہوتا تھا۔

میں منتظر ہی رہ گیا کہ وکرم قریب آکر میری تلاشی لے گا لیکن وہ مجھ سے دو قدم کے فاصلے پر ہی رک گیا اور پھر اس کی لات اتنی تیزی سے چلی کہ میں محض اس کی ایک جھلک ہی دیکھ سکا.... میری آنتیں گویا یک لخت ایک گولے کی سی شکل میں سمٹ کر میرے حلق میں آپھنسیں اور میں مزاحمت کی تمام تر کوشش کے باوجود شہتیر کی طرح دیوار سے جا ٹکرایا۔ غنیمت تھا کہ میرا سر دیوار سے نہیں ٹکرایا ورنہ شاید میں چکرا کر گر پڑتا' اس تکلیف کے عالم میں بھی میں اس بات پر حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکا کہ تقریباً عام سی جسامت کے اس انسان میں اتنی طاقت کیونکر تھی کہ اس کی ٹانگ کی ضرب نے میری آنتیں الٹ کر رکھ دی تھیں بلکہ مجھے اتنی قوت سے کئی گز پیچھے دیوار سے اس طرح ٹکرا دیا تھا کہ میری کمر مفلوج سی ہو کر رہ گئی تھی۔

وکرم نے اسی پر بس نہیں کی۔ میں پیٹ پکڑے دیوار سے ٹکا ابھی سیدھا بھی نہیں ہو پایا تھا کہ اس نے میرے سر کے پیچھے گھونسا رسید کیا۔ پہلے مجھے یہ شبہ گزرا کہ شاید اس کے ہاتھ میں کوئی ہتھوڑا تھا۔ جس سے اس نے ضرب لگائی ہے مگر جب میں سنبھل کر سیدھا ہوا تو اس کے ہاتھ مجھے خالی نظر آئے۔

میری حالت دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر متکبرانہ مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔ اور وہ شیخی میں آکر شاید مجھے سنبھلنے کا موقع دے رہا تھا۔ میں نے سر جھٹک کر کئی مرتبہ آنکھیں جھپکائیں تو اس کی متکبرانہ مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی۔

اس نے کسی باکسر کی سی تیزی اور مشاقی سے میری ناک پر گھونسا رسید کرنے کی کوشش کی جو میری پیشانی پر پڑا۔ اس شخص کے ہاتھ پیروں میں واقعی فولاد کی سی سختی تھی۔

اب بہت ہو چکی تھی۔ اتنی مار میں نے پہلی مرتبہ کھائی تھی لیکن ایک حیرت انگیز بات یہ تھی کہ ان چند ضربوں نے جہاں مجھے تکلیف پہنچائی تھی وہاں جیسے میری جان کی نامعلوم گہرائیوں میں سوئی ہوئی کچھ عجیب سی قوتوں کو بھی بیدار کر دیا تھا۔ اندر ہی اندر جیسے

کسی آتش فشاں کا دہانہ کھل گیا تھا۔

وکرم میری آنکھوں میں طوفان کی آمد کے آثار نہیں دیکھ سکا، کیونکہ اس کی آنکھوں پر اس وقت تکبر کی پٹی چڑھی ہوئی تھی۔ میرے بازو کی حرکت بھی وہ نہیں دیکھ سکا ہو گا۔ میں نے زندگی میں پہلی بار شاید اتنی قوت سے کراٹے کا وار کیا تھا۔ میرا ہاتھ بیلچے کی طرح اس کی پیشانی کے وسط میں پڑا اور یہ دیکھ کر مجھے افسوس ہوا کہ اس ایک وار نے ہی کم از کم وکرم کی حد تک معرکہ آرائی کا فیصلہ کر دیا۔ کچھ لوگ صرف مارنے کی حد تک طاقتور ہوتے ہیں برداشت کی طاقت ان میں کم ہی ہوتی ہے۔ وکرم شاید اسی قبیل کے شہ زوروں میں سے تھا۔

پھر پیشانی پر ہاتھ پڑتے ہی وہ بے بنیاد دیوار کی طرح آگے کو جھک آیا اور قریب تھا کہ .... میرے اوپر آگرتا۔ میں نے اسے تھما کر گردن کے گرد بازو کستے ہوئے اس طرح روک لیا کہ اس کا چہرہ اس کے ساتھیوں کی طرف ہو گیا اس کی پیشانی کی کھال پھٹ چکی تھی اور اس کا جسم جس ڈھیلے ڈھالے انداز میں میری گرفت میں تقریباً" جھول رہا تھا اس سے مجھے اندیشہ محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی کھوپڑی کی ہڈی زیادہ نہ چٹخ گئی ہو۔

اس کے ساتھیوں کو شاید صحیح معنوں میں اندازہ ہی نہ ہو پایا تھا کہ ان کے باس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ وہ غالباً" اسی خیال سے قدرے مطمئن کھڑے تھے کہ باس کے ہاتھوں مار کھاتے کھاتے وہ مجھے چند لمحوں پر فرش پر ڈھیر ہوتے دیکھیں گے لیکن جب انہوں نے باس کو بے بسی کے عالم میں میری گرفت میں دیکھا اور اس کا خون آلود چہرہ ان کے سامنے آیا تو وہ جیسے کسی خواب سے ہڑبڑا کر بیدار ہوئے۔

ان میں سے ایک نے نہایت پھرتی سے اپنے ریوالور والے ہاتھ پر ہاتھ رکھا اور دائیں ٹانگ کو ذرا خم دے کر وہ فائر کرنے ہی لگا تھا کہ اس کے ساتھی نے اس کے ریوالور کی نال پر ہاتھ رکھ کر اسے جھکا دیا اور تب اسے احساس ہوا کہ اگر وہ فائر کر دیتا تو گولی پہلے اس کے باس کے جسم میں پیوست ہوتی۔ میں نے مکمل طور پر اسے اپنی ڈھال بنا رکھا تھا۔ ان ریوالور برداروں کی غلطی یہ تھی کہ وہ دونوں قریب ہی کھڑے تھے۔ اگر وہ ایک دوسرے سے کچھ ہٹ کر کھڑے ہوتے تو ان میں سے کوئی ایک تو مجھ پر کسی پہلو سے فائر کر سکتا تھا۔

"ریوالور پھینک دو۔" میں نے اپنی سانس کے ہلکے سے ارتعاش پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "ورنہ چڑی کے اس غلام کی گردن ٹوٹ جائے گی۔ غیر ارادی طور پر میرے لہجے میں ایک لوفرانہ سی شوخی آگئی تھی۔

میں نے دونوں ریوالور برداروں کے چہروں پر الجھن کے آثار دیکھے تو وکرم کی گردن کو ایک خاص انداز میں ہلکا سا جھٹکا دیا۔ ہڈی کی کڑکڑاہٹ انہوں نے بھی سن لی۔

"اس کی گردن ٹوٹنے لگی ہے۔" میں نے قدرے بلند آواز میں کہا۔ "اور شاید تمہیں



علم نہ ہو اس لئے بتادوں کہ گردن ٹوٹنے کے بعد آدمی مرجاتا ہے۔

انہوں نے مشورہ طلب نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تو میں نے وکرم کی گردن کو اسی مخصوص انداز میں ایک ہلکا سا جھٹکا اور دے دیا۔ اس مرتبہ ہڈیاں کڑکڑانے کی آواز کے ساتھ مجھے وکرم کے جسم میں ہلکا سا تناؤ بھی محسوس ہوا اور مجھے قدرے اطمینان ہوا کہ اس کے دماغ کو اتنی چوٹ نہیں پہنچی تھی کہ وہ مرجاتا۔ ابھی وہ زندہ تھا مگر نہ جانے کتنی دیر کے لئے دنیا مافیہا سے بے خبر ہو چکا تھا۔

ان دونوں کے ہاتھوں میں ریوالوروں کا رخ فرش کی طرف ہو گیا۔ "ذرا آگے کو پھینکنا میرے قریب۔" میں نے فوراً" ہدایت دی۔ ان کے چہروں کو دیکھتے ہوئے میں شبہ بھی نہیں کر سکتا ہے۔ مگر یہ میری خام خیالی تھی کہ موت کے منہ میں پھنسا ہوا انسان بھی اپنی سی کوشش تو کرتا ہے۔ ان میں سے ایک نے بظاہر نہایت مایوسی کے عالم میں ریوالور میری طرف پھینکتے پھینکتے اچانک فائر کر دیا جبکہ دوسرے کا ریوالور میرے قدموں میں آن گرا تھا۔

شاید میری قسمت ہی اچھی تھی کہ میں نے بروقت اس کی انگلی ٹریگر پر پہنچتے دیکھ لی تھی اور میں گھٹنے کے بل ایک طرف کو گر گیا تھا۔ اس نے اندھا دھند اسی سمت میں دو فائر اور کر دیئے تھے۔ میں بغیر کسی اندازے کے ہی ایک طرف کو گرا تھا۔ بہرحال اس کوشش نے مجھے بچا لیا ورنہ شاید میرے آدھے جسم کے پرخچے اڑ گئے ہوتے۔ فائر کرنے والا کچھ نروس سا ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ ریوالور کا رخ درست کر سکتا میں نے اس پر دوسرے ریوالور سے فائر کر دیا۔ وہ ہوا میں تقریباً" ایک فٹ اچھلا اور کوئی آواز نکالے بغیر الٹ کر کافی پیچھے جا پڑا۔

میں نے اس کے ساتھی کا جائزہ لیا۔ وہ مجسمے کی طرح ساکت کھڑا تھا اور لاش کی بجائے ہوا میں کسی غیر مرئی چیز کو ایک ٹک دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ زندگی سے محروم نظر آرہا تھا۔ یک لخت ہی جیسے کسی نے اس کا سارا خون چوس لیا تھا۔

میں نے ایک ریوالور جیب میں رکھ کر وکرم کا بریف کیس اٹھایا اور ریوالور سے وکرم کے ساتھی کو اس طرف چلنے کا اشارہ کیا جدھر چند کرسیاں بے ترتیبی سے پڑی تھیں۔ اس نے خاموشی سے میرے اشارے کے مطابق عمل کیا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے کوئی لاش کسی طاغوتی طاقت کے اشارے پر اٹھ کھڑی ہوئی ہو اور اس کے احکامات کی پابندی کر رہی ہو

وہ ایک کرسی پا جا بیٹھا۔ اب اس کے اور میرے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ میں نے مطمئن ہو کر بریف کیس کا جائزہ لیا۔ وہ مقفل تھا۔ میں نے وکرم کی جیبوں کی تلاشی لی تو کوٹ کی ایک چھوٹی سی جیب میں مجھے ایک ننھی سی چابی مل گئی۔

میں نے بریف کیس کھولا اس میں صرف دو ہی چیزیں تھیں۔ ایک اسٹین گن جس کے مختلف حصے علیحدہ کر کے رکھے گئے تھے۔ بریف کیس میں ہر حصے کے لئے باقاعدہ ایک خانہ

بنا ہوا تھا۔ دوسری چیز نقدی تھی۔ سو سو کے نوٹوں کی چند گڈیاں اس کے علاوہ اس میں کچھ بھی نہیں تھا۔

بریف کیس بند کر کے میں نے ایک طرف رکھ دیا۔ اسے میں نے استعمال کے لئے منتخب کر لیا تھا۔ سیدھے کھڑے ہو کر میں نے تہہ خانے کا جائزہ لیا۔ طویل و عریض تہہ خانہ اس وقت میدان کار زار کا منظر پیش کر رہا تھا۔ ایک طرف میز الٹی پڑی تھی۔ ایک کرسی کی دو ٹانگیں ٹوٹی ہوئی تھیں دیوار کے ساتھ چنے ہوئے کئی کارٹن گر چکے تھے۔ دیواروں اور چھت میں سے متعدد جگہوں سے پلستر اکھڑ کر فرش پر بکھرا ہوا تھا اور ان جگہوں پر گولیوں کے گہرے گہرے نشانات نہایت بدنما لگ رہے تھے۔

ایک طرف نشچل چاروں خانے چت پڑا تھا۔ لہو میں لتھڑے ہوئے چہرے کے ساتھ وہ کوئی مردہ درندہ نظر آرہا تھا۔ اس کا سینہ نہایت آہستگی سے پھول اور پچک رہا تھا۔ لگتا تھا کہ سانسوں کی آمدورفت بہت سست پڑ چکی ہے۔ اس سے کچھ دور رشی اوندھا پڑا تھا۔

ایک طرف وکرم پڑا تھا۔ پیشانی کی کھال پھٹنے کے باعث اس کا چہرہ بھی خون میں تر تھا۔ اس کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ سانس اٹک اٹک کر آرہی تھی۔ جب اس شخص نے لگا تار تین چار وار کر کے میرے حواس مختل کر دیئے تو مجھے گمان بھی نہیں تھا کہ وہ کراٹے کا ایک ہاتھ کھا کر قریب المرگ ہو جائے گا۔

دروازے سے کچھ ادھر وکرم کا ساتھی تھا۔ وہ بھی اس طرح چت پڑا تھا کہ ایک ٹانگ مڑ کر اس کے اپنے ہی جسم تلے دبی ہوئی تھی۔ اس کی اردگرد خون کا تالاب سا پھیلتا جا رہا تھا۔ ان مردہ یا نیم مردہ انسان نما حیوانوں کے لئے میرے دل میں تاسف رحم یا پشیمانی کی کوئی رمق نہیں تھی۔

ریوالور کو ایک انگلی پر گھماتے ہوئے میں اس شخص کے قریب پہنچا جو اب تک کی کشمکش میں نہ صرف زندہ تھا بلکہ اس کے سوٹ پر شکن تک نہیں آئی تھی۔ وہ دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھے کرسی پر بیٹھا ایک دیوار کو گھور رہا تھا۔ اس کی پلکیں شاید مستقل طور پر جھپکنا بھول گئی تھیں۔ اس کی حالت میں یہ تبدیلی مجھے کچھ حیرت انگیز سی لگ رہی تھی۔

میں اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ تب بھی اس نے آنکھ نہ جھپکی۔

"تمہارا نام؟" میں نے پوچھا۔

"درشن رام" اس کے ہونٹ مشینی انداز میں ہلے۔ میری طرف اس نے اب بھی یکھا تھا۔

"درشن رام۔" میں نے جوتے کی نوک اس کی کرسی پر ٹکاتے ہوئے کہا۔ "مجھے نہ تو زیادہ کچھ جاننے سے دلچسپی ہے اور نہ ہی میرے پاس بہت سے سوالات کرنے کے لئے وقت ہے۔ مجھے صرف یہ جاننے سے دلچسپی ہے کہ روپا کو ہلاک کرنے کے لئے وکرم کی

خدمات کس نے حاصل کر رکھی تھیں؟"

"وہ ایک امیر کبیر اور فیشن ایبل بڑھیا ہے۔ اس کا نام..... پورا نام تو معلوم نہیں کیا ہے سب لوگ اسے منورما کہہ کر بلاتے ہیں۔ اس کے ہونٹ کل پرزوں کی طرح یکساں رفتار سے ہل رہے تھے اور بہت ہی مدھم سی آواز برآمد ہو رہی تھی۔ مجھے کان لگا کر سننا پڑ رہا تھا۔ جس بے ساختگی سے وہ بول رہا تھا اس سے مجھے یقین ہو رہا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا۔

"میں نے وکرم کے ساتھ صرف ایک ہی مرتبہ اسے اس کے گھر پر قریب سے دیکھا ہے۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "جب ہم ایڈوانس کی رقم لینے گئے تھے۔"

"گھر کا پتا کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تھرٹین کشمیر بلیورڈ۔" اس نے رٹے رٹائے سبق کو دہرایا۔

ایڈریس بہت مختصر اور آسانی سے یاد رہنے والا تھا کشمیر بلیورڈ اور اس سے ملحقہ علاقہ اس لحاظ سے منفرد تھا کہ یہاں صرف ایسی کوٹھیاں تھیں جن کا رقبہ فٹوں یا گزوں میں نہیں ایکڑوں میں تھا۔ اونچے اونچے درختوں میں گھری ہوئی ان کوٹھیوں کی اصل عمارات یوں چھپی رہتی تھیں کہ سڑک سے گزرنے والوں کو یہ علاقہ محض ایک خوبصورت جنگل معلوم ہوتا تھا جس میں بہت سی طویل و عریض چار دیواریاں کھینچ دی گئی تھیں۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اب تمہارا کیا کروں؟" میں درشن رام کی طرف دیکھتے ہوئے خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑایا۔

"تم مجھے بھی مار ہی ڈالو۔ اس نے اب اچٹتی سی نظر مجھ پر ڈال کر اپنے مردہ ساتھی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کرشن رام کے بغیر جینے کا کیا فائدہ۔

"بڑا پیار تھا تمہیں اپنے ساتھی سے؟" میں نے اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی ویرانی کو قدرے حیرت سے دیکھا۔

"وہ میرا ساتھی نہیں سگا بھائی تھا۔ دفعتاً" جیسے وہ پھٹ پڑا.... "بچپن سے اب تک ہم ہمیشہ اکٹھے رہے تھے۔ ہر اچھا برا کام ہم نے مل کر ہی انجام دیا تھا اور ہمارا عہد تھا کہ ساتھ جئیں گے ساتھ مریں گے۔" وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔

"اوہ...." میرے ہونٹوں سے سیٹی کی سی آواز نکل گئی۔ میں اس کی ہچکیوں کے ساتھ لرزتے ہوئے جسم کو دیکھ رہا تھا۔ مگر میرے دل میں اس کے لئے کوئی نرم گوشہ پیدا نہیں ہوا تھا۔

"پھر تو مجھے بھی بڑا افسوس ہے کہ میں نے ایسی عدیم المثال جوڑی توڑ دی۔ میں نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ "تم دونوں کا شمار تو شاید عنقریب دنیا کے آٹھویں عجوبے کے طور پر

ہونے لگتا۔ کم از کم میں نے تو آج تک دو بھائیوں میں اتنی یگانگت نہیں دیکھی۔" پھر میں نے جیسے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "بہرحال اگر تمہیں اتنا ہی دکھ ہے تو میں تمہاری ایک مدد کر سکتا ہوں۔ یہ لو ریوالور اور خود کشی کر لو۔ بقول تمہارے اب جینے کا کیا فائدہ۔"

میں نے جیب سے ریوالور جو غالباً اس کا اپنا ہی تھا نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ ریوالور ملتے ہی وہ بھی اپنے بھائی کی طرح زندگی اور موت کی کشمکش میں ایک آخری اور فیصلہ کن کوشش ضرور کرے گا۔ یعنی مجھ پر گولی ضرور چلائے گا اور میں اس کے لئے بھی تیار تھا۔ اسے ریوالور دیتے وقت میں اپنے بچاؤ کے لئے پوری طرح تیار تھا اور اس کی انگلی ٹریگر تک پہنچنے سے پہلے میں اس کے سینے میں گولی اتار دینے کی پوزیشن میں بھی تھا۔

مگر میں اس کے بچاؤ کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس لئے وہ اپنا کام کر گزرا۔ اس نے واقعی ریوالور کی نال کنپٹی پر رکھ کر بلا تامل ٹریگر دبا دیا۔ اس مرتبہ فائر کا دھماکا پہلے سے بھی کم تھا اور جو تھا اس سے بھی زیادہ آواز اس کی کھوپڑی کی ہڈی کے پاش پاش ہونے کی تھی۔

دوسرے ہی لمحے وہ کرسی سے نیچے میرے سامنے اس عالم میں ساکت پڑا تھا کہ اس کی کھوپڑی کا آدھا بالائی حصہ غائب تھا اور باقی شکستہ حصے سے یوں بھل بھل خون ابل رہا تھا جیسے لاکھوں شریانوں کے منہ کھل گئے ہوں۔

اپنا حلیہ کافی حد تک درست کرنے کے بعد میں نے تہہ خانے پر ایک الوداعی نظر ڈالی اور وہاں سے نکل آیا۔

وکرم کی جیبوں سے مجھے بریف کیس کی ننھی سی چابی کے علاوہ کار کی چابیوں کا ایک گچھا بھی ملا تھا۔ میری توقع کے مطابق کار گلی میں کھڑی تھی۔ یہ ایک سلور گرے جیگوئر تھی۔ نہایت شاندار اور باوقار گاڑی تھی۔ اس کی ہیڈ لائٹس بڑی سرچ لائٹس سے مشابہ تھیں۔

گاڑی میں بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کر کے میں سڑک پر لایا۔ یہ علاقہ میرے لئے اجنبی تھا۔ میں نے اندازاً گاڑی بائیں طرف موڑ لی کہ کسی بڑی سڑک پر پہنچ سکوں۔ کچھ دیر ادھر اُدھر بھٹکنے کے بعد بالاخر میں شیوا جی روڈ پر نکل آیا۔ شہر کے گنجان آباد علاقوں سے گزرتے وقت میں نے دیکھا عروس شب دھیرے دھیرے انگڑائیاں لیتی بیدار ہو رہی تھی۔ کلبوں' ہوٹلوں اور بڑی بڑی دکانوں کے نیون سائن جھلملانے لگے تھے۔

میرے کشمیر بلیورڈ پہنچنے تک رات اپنا رنگ جما چکی تھی۔ یہ سڑک تقریباً تین میل لمبی تھی اور اس کے دونوں طرف پھیلی ہوئی بعض کوٹھیوں کی حدود تو اب سڑک سے ہی شروع ہو جاتی تھیں اور اپنی کوٹھیوں کے درمیان کہیں کہیں سے چھوٹی چھوٹی نجی سڑکیں

ان کوٹھیوں تک جا رہی تھیں جو پچھلی طرف واقع تھیں۔

بالاخر وہ کوٹھیوں کی چار دیواری کے درمیان مڑتی ہوئی ایک تنگ سی سڑک پر مجھے ٹریفک کے نشانات کی طرح لوہے کا ایک چھوٹا سا سائن بورڈ نظر آیا۔ جس پر سرخ رنگ سے لکھا تیرہ کا ہندسہ اور تیر کا نشان نظر آ رہا تھا۔ میں نے گاڑی اس سڑک پر موڑ دی۔

انگریز عموماً تیرہ کے ہندسے کو منحوس خیال کرتے ہیں لیکن ابھی میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ ہندسہ کس کے لئے منحوس ثابت ہونے والا تھا۔ میرے لئے یا اس کوٹھی کے مکینوں کے لئے؟

کھلے آسمان تلے مزید کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد مجھے اپنے سامنے ایک کھلا گیٹ نظر آیا جس کی سلاخوں میں تار کی مدد سے ٹین کی ایک چھوٹی سی پلیٹ جھول رہی تھی جس پر تیرہ کا ہندسہ چمک رہا تھا۔ اس کوٹھی کی چار دیواری نسبتاً کافی اونچی تھی اور اسی مناسبت سے گیٹ بھی اونچا اور کشادہ تھا مگر اس کی سلاخوں پر زنگ کی موٹی موٹی تہیں جمی ہوئی تھیں اور ظاہر یہی ہوتا تھا کہ ایک مدت سی یہ یونہی کھلا ہے۔ اس کو بند کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ چار دیواری پر بھی نہ جانے کس زمانے میں زرد چونا پھیرا گیا تھا جس کی تہہ جگہ جگہ سے اکھڑ چکی تھی اور وہاں سیاہ کائی کی سی تہیں جم چکی تھیں۔ طویل و عریض ڈرائیو وے میں درختوں سے جھڑے ہوئے ان گنت زرد زرد پتے بکھرے پڑے تھے۔

عمارت بدروحوں کا مسکن معلوم ہوتی تھی۔ ماحول پر وہی پراسراریت اور ہیبت ناک سا سکوت طاری تھا جس کی منظر کشی میں نے انگریزی کی خوفناک کہانیوں میں بار بار پڑھی تھی۔ دفعتاً مجھے احساس ہوا کہ درختوں تلے تاریکی میں دونوں طرف آگے پیچھے مختلف رنگوں اور مختلف ماڈلوں کی گاڑیاں بھی کھڑی ہیں ان کی طرف میں نے دھیان ہی نہیں دیا تھا۔

میں گاڑی سے اترا اور تین سیڑھیاں چڑھ کر برآمدے میں پہنچا۔ سامنے بلند و بالا چوبی دروازہ نظر آ رہا تھا۔ ابھی میں اس تک نہیں پہنچ پایا تھا کہ دائیں طرف سے ایک شخص اندھیرے کی آغوش سے نکل کر اچانک ہی سامنے آ گیا۔ وہ چھریرے جسم کا ایک طویل القامت اور بظاہر بہت مہذب انسان تھا۔ اس کے چہرے پر ملائمت اور نہایت خلیق مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی مگر اس کی آنکھوں کا گویا اس کے چہرے سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔ وہ محض بلور کی دو گولیاں معلوم ہوتی تھیں۔ ٹھوس سرد اور ہر تاثر سے عاری۔ وہ سوٹ میں ملبوس تھا۔

"کہاں سے تشریف لائے ہیں اور کس سے ملنا ہے؟" اس نے انتہائی شائستہ لہجے میں پوچھا۔ آواز سرگوشی سے کچھ ہی بلند تھی۔

"مجھے وکرم نے بھیجا ہے۔" میں نے آواز کو قدرے بھاری بنانے کی کوشش کرتے

ہوئے دھیمے لہجے میں کہا اور یہ بتانے کی کوشش نہیں کی کہ مجھے کس سے ملنا ہے۔

"اوہ......" اس نے ایک گہری اور آسودہ سی سانس لے کر ایک نظر اس گاڑی کی طرف دیکھا جس میں میں آیا تھا۔ "میں بھی سوچ رہا تھا کہ ....." وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر مسکرایا اور راستے سے ہٹ کر گردن کو قدرے خم دیتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھا اور پھر جیب سے ایک چابی نکال کر اس نے چوبی دروازے کے ایک ایسے سوراخ میں داخل کی جسے شاید میں اس تختے پر کندہ کئے گئے بیل بوٹوں میں کبھی تلاش نہ کر پاتا۔

"میڈم دوسری منزل پر اپنے پارلر میں ہیں۔" اس نے چابی گھماتے ہوئے کہا۔ چابی کو اس نے کئی چکر دیئے جیسے وہ چابی نہیں اسکریو ڈرائیور ہو۔ پھر اس نے ایک ہاتھ سے دروازے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا اور خود ایک طرف کو ہٹ گیا۔ الوداعی انداز میں گردن ہلا کر وہ وہیں کھڑا رہا۔ میں نے اندر قدم رکھا اور دروازہ نہایت ہی ہلکی سی کلک کے ساتھ میرے عقب میں بند ہو گیا۔

میں اب ٹیلیفون بوتھ نما لیکن اس سے خاصی بڑی کوٹھری میں کھڑا تھا۔ میرے سامنے دھندلے شیشے کا دروازہ تھا جس کے پار کچھ نظر نہیں آرہا تھا لیکن اتنا ضرور معلوم ہو رہا تھا کہ ادھر تیز روشنی ہے

تب مجھے احساس ہوا کہ دہرے دروازوں کا یہ سسٹم دراصل ساؤنڈ پروفنگ اور ایئرکنڈیشننگ کے لئے تھا۔

میں نے جیسے ہی شیشے کا دروازہ کھولا میرے ارد گرد جیسے ..... خوشبوؤں آوازوں اور روشنیوں کا ایک سیلاب امڈ پڑا۔ دو دروازے پار کرتے ہی جیسے میں کسی اور دنیا میں آگیا تھا۔ باہر موت کا سا سکوت تاریکی اور سونا پن تھا اور اندر کی تمام تر رنگینی' روشنی و رعنائی کے ساتھ ہنگامہ حیات شباب پر تھا۔ شیشے کے دروازے سے نکل کر چند لمحے کے لئے تو میں اپنی جگہ ساکت کھڑا رہ گیا۔

یہ ایک طویل و عریض ہال تھا جس میں فرش پر بھڑکیلے سرخ رنگ کا دبیز قالین بچھا ہوا تھا جس میں پاؤں دھنسے جا رہے تھے۔ چھت کے وسط میں ایک بہت بڑا اور اس کے ارد گرد کئی چھوٹے چھوٹے فانوس آویزاں تھے جن کی روشنی آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی.... چھت اور فرش کے درمیان قوس قزح کی رنگینیاں بکھری ہوئی تھیں۔

ہال کے وسط میں قدیم رومن طرز کی ایک بہت بڑی ڈائننگ ٹیبل تھی جس کے ارد گرد کرسیاں نہیں تھیں۔ اس پر انواع و اقسام کے کھانے سجے ہوئے تھے۔ دھات کی ڈشوں کے نیچے اسپرٹ لیمپ روشن تھے کہ کھانے ٹھنڈے نہ ہوں۔ ایک خاص اور ادھوری سی یونیفارم میں ملبوس تراشیدہ سے جسم کی مالک دو لڑکیاں اس میز سے خالی پلیٹیں اٹھانے اور مزید ڈشیں رکھنے میں مصروف تھیں۔

میز کے گرد چند جوڑے کھڑے تھے۔ مردوں کے لباس اعلیٰ اور بیش قیمت چہروں پر خوشحالی آسودگی کی چمک مگر آنکھوں میں خمار کی دھندلاہٹ تھی۔ بات بات پر ادھر ادھر کو جھولتے تھے جیسے توازن برقرار رکھنا مشکل ہو رہا ہو۔ ان کی ساتھی لڑکیاں خود بھی خمار کے خلاؤں میں ہلکورے لے رہی تھیں مگر انہیں سہارا دینے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ان میں سے کئی کے ہاتھوں میں اب بھی جام تھے.... نہایت شوخ بھڑکیلے اور بیش قیمت مگر ناکافی لباس والی کوئی لڑکی سر پیچھے کو جھٹک کر **پھیپھڑوں** کا پورا زور لگا کر کوئی بات کرتی تو اس کی گردن کی مرمریں جلد پر نیلی نیلی رگیں ابھر آتیں۔ آواز تو ماحول کے شور میں مدغم ہو کر معلوم نہیں اپنے مخاطب تک پہنچ پاتی تھی۔ کبھی کبھی ان میں سے کوئی اپنا گلاس بلند کر کے چلا کر کچھ کہتا تو سامعین قہقہے لگاتے لگاتے دہرے ہو جاتے ایک دوسرے پر گر جاتے۔ لڑکیاں اپنے اپنے ساتھیوں کو سنبھالنے کی کوششیں تیز کر دیتیں۔

ہال کے اختتام پر فرش کا کچھ حصہ اونچا تھا جس پر قالین نہیں تھا۔ یہ حصہ اتنا صاف چمکیلا اور چکنا تھا کہ اس کی جھلملاہٹ دور ہی سے واضح تھی۔ اس حصے پر چند جوڑے نیم مجنونانہ سے انداز میں محو رقص تھے۔ پس منظر میں تیز موسیقی گونج رہی تھی۔

یہ گویا ایک ہی طرز کا نائٹ کلب تھا جس میں ڈائس ڈرنکس اور ڈنر سب ایک ہی فلو پر یکجا کر دیا گیا تھا۔ ایک اور عجیب بات میں نے یہ محسوس کی کہ ہال بار اور ڈانسنگ فلور پر موجود تقریباً" تمام ہی جوڑوں میں بیشتر مرد ہندوستانی اور پختہ العمر بلکہ بہت سے تو ادھیڑ عمر تھے۔ البتہ لڑکیاں مختلف النسل اور سب کی سب نوجوان تھیں۔ ان کے طرز عمل سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ ان مردوں کی بیویاں نہیں تھیں۔

ماحول کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد میں آگے بڑھا۔ کسی نے میری طرف کوئی توجہ نہ دی۔ میں نہایت اطمینان سے سیڑھیوں کی تلاش میں نظر دوڑاتے ہوئے ہال کو عبور کرنے لگا۔ ہال کے اختتام پر پہنچ کر ڈانسنگ فلور پر بائیں جانب مجھے سیڑھیاں نظر آئیں۔

آخری سیڑھی پر قدم رکھتے ہی مجھے لاؤنج کے پار ایک بڑے دروازے پر پیتل کے حروف میں لفظ "پرائیویٹ" چمکتا نظر آیا۔ اس کے نیچے قدرے چھوٹے حروف میں "میڈم منورما" کی نیم پلیٹ نظر آرہی تھی۔ یقیناً" یہی میڈم منورما کا پارلر تھا۔

دروازے پر پہنچ کر میں نے ایک انگلی سے دستک دی۔

"دروازہ کھلا ہے؟" ایک ہلکی سی آواز میرے کانوں تک پہنچی۔

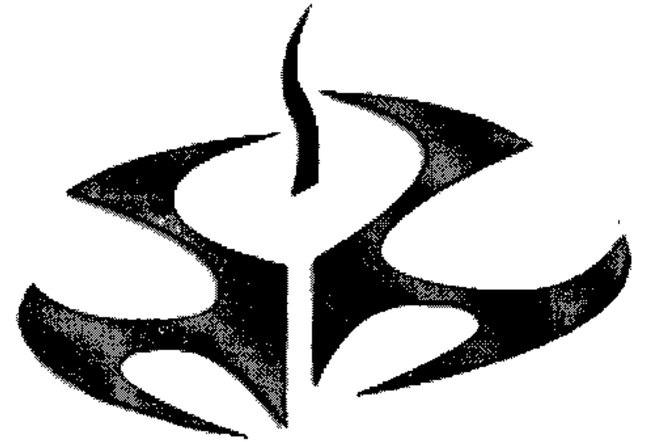
میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا اور ایک لمحے کے لئے وہیں رک گیا۔ یہاں روشنی زیادہ نہیں تھی منظر بہرحال آسانی سے دیکھا جا سکتا تھا مگر ترتیب و آرائش کے اعتبار سے یہ ایک عجیب جگہ تھی۔ فرش پر یہاں بھی دبیز قالین تھا مگر اس کا رنگ گہرا نیلا تھا۔ کھڑکیوں پر اسی رنگ کے نہایت خوبصورت پردے لٹک رہے تھے ایک طرف دیوار کے

ساتھ نہایت شاندار بیضوی ڈبل بیڈ لگا ہوا تھا۔ جس پر حسین نائیلون کا پنجرہ سا تنا ہوا تھا۔ اس کی ڈوریاں چھت سے منسلک تھیں۔

جہاں میں کھڑا تھا اس سے کچھ ہی دور دائیں ہاتھ پر ایک گوشے میں خاصی بڑی اور بیش قیمت آفس ٹیبل اور سیاہ اسٹیل کی فائلنگ کیبنٹ فٹ تھی۔ میز کے ساتھ صرف ایک مگر بے حد خوبصورت چمڑے کے گدیلوں والی ریوالونگ چیئر بھی موجود تھی۔ میز پر کئی فائلیں کتابیں اور کچھ کھلے کاغذات قدرے بے ترتیبی سے پڑے تھے۔ کھلی فائل پر کسی کے موٹے موٹے عدسوں والی نظر کی عینک بھی پڑی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کوئی لکھنے پڑھنے کا کام کرتے کرتے ابھی ابھی اٹھ کر گیا ہے۔ گویا یہ طویل و عریض کمرہ بیک وقت خوابگاہ ڈرائنگ روم اور آفس کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔

چاروں طرف کا جائزہ لیتے ہوئے میری نظر کمرے کے وسط میں ٹکی جہاں ایک عورت آرام کرسی پر نیم دراز تھی۔ اس کے مرمریں پاؤں پانی سے بھرے ایک بلوریں برتن میں ٹکے ہوئے تھے۔ اس کے پیروں اور ڈھیلے ڈھالے گاؤن سے ہوتی ہوئی میری نظر اس کے چہرے پر پہنچی۔۔۔

○



اس کی عمر غالباً پچپن سے اوپر ہی تھی مگر رکھ رکھاؤ غضب کا تھا۔ اس کی رنگت حد سے زیادہ سپید تھی اور زندگی سے خالی نظر آتی تھی۔ چہرے پر گہری گہری شکنیں اور ہونٹ مرجھائے ہوئے تھے مگر بڑھاپے کی ان نشانیوں کو نہایت ماہرانہ میک اپ نے بڑی حد تک دبا رکھا تھا۔ چہرے کی مناسبت سے اس کے بال بھی تقریباً سارے سفید ہونے چاہیے تھے مگر وہ گہرے سیاہ اور نہایت چمکیلے تھے۔ یہ کسی بہت ہی نفیس اور بیش قیمت ڈائی کا کمال تھا۔

"اجنبی نظر آتے ہو؟" دفعتاً بڑھیا کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ اس کی آواز میں بڑھاپے کی لرزش کی بجائے اب بھی ایک عجیب سی کھنک اور لوچ تھا۔ "مگر اجنبی یوں بلا اطلاع مجھ تک تو نہیں پہنچ پاتے۔" اس نے ایک نظر اپنے دائیں طرف ایک تپائی پر رکھے ہوئے ٹیلی فون کی طرف دیکھا اور پھر سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

میں نے کمرے کی خنک فضا میں ایک گہری سانس لی اور رسمی سے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ "مجھے وکرم نے بھیجا ہے۔"

میرا خیال تھا کہ یہ سن کر وہ خوشی سے کھل اٹھے گی اور نہایت ہی شیریں لہجے میں بیٹھنے کی دعوت دے گی۔ پھر پوچھے گی کہ میں کیا کھانا اور کیا پینا پسند کروں گا اور میں اس سلسلے میں قطعاً کسی تکلف سے کام نہیں لوں گا اور کیونکہ مجھے بھوک بھی شدت سے لگ رہی تھی اور پیاس بھی۔

مگر میری توقعات کے برعکس اس کی سیاہ آنکھوں میں ایک لخت برہمی اور سردمہری در آئی۔ پتلے پتلے ہونٹ ایک لمحے کے لیے بے رحمانہ انداز میں بھنچ کر رہ گئے۔ پھر ان میں جنبش ہوئی۔ "اگر وہ خود آیا ہوتا تو اس بار شاید میں تپائی اٹھا کر اس کے سر پر دے مارتی۔" پھر اس نے ہونٹ چباتے ہوئے گویا خود پر ضبط کرنے کی کوشش کی۔ میں نے اس دوران کوئی تبصرہ یا صفائی پیش کرنا ضروری نہ سمجھا۔

"میں تو اس خبیث کو ایڈوانس دے کر پھنس گئی۔" بڑھیا ۔۔۔۔۔نے اب قدرے نرم لہجے میں کہا۔ "اونچے درجے کا بدمعاش بنا پھرتا ہے' چوہے سے بھی ڈر جانے والی وہ احمق عورت تو اس سے اب تک مری نہیں۔ وکرم نے اس معاملے کو جتنا لمبا کھینچ دیا ہے' اس

سے لگتا ہے کہ اس کی کامیابی کا انتظار کرتے کرتے میں شمشان پہنچ جاؤں گی اور روپا
بوڑھی ہو جائے گی اور تب اسے خود ہی زندہ رہنے کی آرزو نہیں رہے گی۔ اس بار اس
نے کوئی نئی کہانی گھڑی ہوگی اور خود آکر وہ کہانی سنانے کی اس میں ہمت نہ ہوگی۔ اس لیے
تمہیں بھیجا ہوگا.....“

”روپا مرچکی ہے میڈم!“ میں نے آہستگی سے کہا۔
”کیا؟“ وہ تقریباً اچھل پڑی۔ پھر اپنے ردعمل کے اس بے ساختہ اظہار پر شرمندہ سی
ہو گئی گویا اس کے نزدیک اپنے محسوسات پر قابو نہ رکھنا باعث شرم عادت ہو۔ وہ یک لخت
ہی نہایت پرجوش نظر آنے لگی تھی مگر اپنے آپ کو پرسکون رکھنے کی پوری کوشش کر رہی
تھی۔ اس نے چٹکی بجا کر اس لڑکے کو جانے کا اشارہ کیا جو اس کے بال بنا رہا تھا۔ وہ
خاموشی سے سر جھکائے باہر چلا گیا۔
”ادھر آؤ.....بیٹھ جاؤ ناں۔“ منورما نے اپنے دائیں ہاتھ پر پڑی ایک اور آرام دہ کرسی
کی طرف اشارہ کیا۔ مسرت اس کے روئیں روئیں سے پھوٹی پڑ رہی تھی مگر اس کی
آنکھوں میں بے یقینی تھی۔
میں آرام دہ کرسی کے ایک سرے پر ٹک چکا تو اس نے بے تابی سے آگے کو جھکتے
ہوئے کہا۔ ”کیا کہہ رہے تھے تم؟ کیا واقعی روپا مرچکی ہے؟“
میں نے اثبات میں سرہلایا۔ ”ہاں۔“
”خیر.....بالآخر میرے من کی یہ پھانس نکل ہی گئی۔“ اس نے جسم ڈھیلا چھوڑ کر آرام
دہ کرسی کے پشتے کو ایک لیور کی مدد سے قدرے سیدھا کرکے اس سے ٹیک لگا لی۔ اس کی
نظر بدستور مجھ پر مرکوز تھی۔
”اب مت کس لیے آئے ہو؟ باقی رقم لینے؟“ اس نے پوچھا۔
”نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”رقم آپ اطمینان ہونے کے بعد دکرم ہی کو ادا کیجیے
گا۔ میں تو صرف آپ کو اطلاع دینے آیا تھا۔“
پھر میں نے ایک لمحے کے توقف سے کہا۔ ”ویسے کرائے کے قاتل سوالات تو نہیں کیا
کرتے لیکن اگر آپ برا نہ مانیں تو میں پوچھوں کہ روپا سے آپ کی اس حد تک نفرت کی
وجہ کیا تھی کہ آپ نے اسے مروانے کے لیے اتنا تردد کیا؟“
”بظاہر تو کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔“ اس نے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔
”اس عورت نے مجھے شکست کا احساس دلایا تھا۔ اس لیے اس کا وجود پھانس کی طرح
میرے دل میں پیوست تھا۔ میں نے اسے اس وقت سہارا دیا جب وہ ایک وقت کی روٹی کی
محتاج تھی۔ میں نے اسے تراش کر پتھر سے ہیرا بنایا اور جب وہ کسی قابل ہوئی تو مجھے ٹھوکر
مار کر چلی گئی.....اور وہ بھی عین اس وقت جب میں اسے ایک سیٹھ کی ساتھی بنانے کے

لیے کچھ رقم بھی لے چکی تھی اور اسے خرچ بھی کر چکی تھی۔ اس وقت ہماری مالی حالت
کچھ اتنی زیادہ اچھی نہیں تھی۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ مجھے کتنی ذلت اٹھانی پڑی تھی۔
میری کتنی بے عزتی ہوئی تھی.....“ وہ خاموش ہو کر چھت کو گھورنے لگی جیسے اس کی نگاہیں
ماضی کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہی ہوں۔
”گویا آپ کو صرف اس بات کا اتنا غصہ تھا کہ روپا اپنی زندگی کو اپنی مرضی سے بسر کرنا
چاہتی تھی؟“ میں نے سرسری لہجے میں کہا۔
”اس دنیا میں بہت کم لوگ اپنی زندگی کو اپنی مرضی سے بسر کرتے ہیں۔“ بڑھیا نے
ٹھوس لہجے میں کہا۔ ”خصوصاً روپا جیسی کمزور عورت کو تو یہ حق ہرگز نہیں مانگنا چاہیے تھا
جبکہ اسے طاقتور بنانے کی ابتداء بھی میں نے ہی کی تھی۔ اسے زندگی بھر میرے سامنے سر
نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔“ دفعتاً اس کی چمکیلی آنکھوں میں شک و شبے کی ہلکی سی پرچھائیں
رینگ کر آئی۔ اس نے قدرے چونک کر آنکھیں سکیڑ کر میری طرف دیکھا۔
”لڑکے! مجھے تمہارے لہجے سے روپا کے قرب کی خوشبو آرہی ہے۔ تم نے اس کو مار
دیا ہے یا کہیں چھپا لیا ہے؟“ دفعتاً اس نے سخت لہجے میں کہا۔
میں نے ایک مصنوعی قہقہہ لگایا اور قدرے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔
”یہ تو آپ کو کل کے اخبارات سے معلوم ہوگا میڈم! ویسے آپ کے قیافے کی میں
داد دیتا ہوں۔ سچی بات یہ ہے کہ روپا میری زندگی کی وہ پہلی عورت تھی جسے ہلاک کرتے
وقت میرا دل پسیجا اور اس کے لیے مجھے کچھ ہمدردی سی محسوس ہوئی۔ میرا اس سے مراسم
استوار کرنے کو جی چاہا مگر پھر پیشہ ورانہ تربیت غالب آگئی اور ساتھ وہ بے ہودہ سا محاورہ
بھی یاد آگیا کہ گھوڑا گھاس سے محبت کرے گا تو کھائے گا کیا؟ قصائی مویشیوں پر رحم کھانا
شروع کر دے گا تو کھائے گا کہاں سے؟ بس یہی سوچتے سوچتے اس کی کھوپڑی اڑا دی۔ یہ
آپ کا کمال ہے کہ ان سوچوں کا پرتو بھی آپ نے محسوس کر لیا۔“
وہ انتہائی جہاندیدہ اور مکار ہونے کے باوجود اس مدح سرائی کے اثرات سے نہ بچ
سکی۔ بڑے فخریہ انداز میں مسکرائی اور بولی۔ ”اگر تمہارا ایک رات کے لیے دنیا جہاں کے
تفکرات کو بھول جانے کا ارادہ ہو تو میں تمہیں اعزازی وزیٹر کے طور پر یہاں ایک رات
قیام کی دعوت دیتی ہوں۔“ وہ مسکرائی۔ ”تم میرے لیے اتنی اچھی خبر لائے ہو کہ میرا سچ مچ
تمہاری خاطر مدارت کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔“
میں نے نفی میں سرہلایا اور مسکراتے ہوئے کہا۔ ”شکریہ! فی الحال میرا دنیا جہاں کے
تفکرات کو بھول جانے کا کوئی ارادہ نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے تمام مسائل اس وقت
تک میرے سر پر سوار رہیں جب تک میں ان سے نمٹ نہ لوں.....اور پھر ابھی میں نے
دوسری خبر تو تمہیں سنائی ہی نہیں جسے سن کر بلاشبہ تم اچھل پڑو گی.....“

میں آپ سے تم پر اتر آیا تھا۔
"وہ کیا؟" اس نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔ "وہ یہ کہ روپا درحقیقت زندہ ہے۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اور میری خدمات ایک غیبی طاقت نے دراصل تمہیں ٹھکانے لگانے کے لیے حاصل کی ہیں۔"
وہ خوفزدہ ہونے کی بجائے کچھ چڑ سی گئی۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اسے میری بات کا یقین نہیں آیا تھا۔ میں اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ وہ آنکھیں سکیڑے مجھے گھور رہی تھی۔
"میرے خیال میں ابھی ہمارے درمیان اتنی بے تکلفی پیدا نہیں ہوئی کہ تم اس قسم کا مذاق کرنے لگو۔" وہ ناگواری سے بولی۔
"میں مذاق نہیں کر رہا ناہنجار بڑھیا۔" میں نے دانت پیس کر کہا۔ "یہ بتاؤ کہ اپنے لیے موت کا کونسا طریقہ پسند کرو گی؟ گولی کھا کر مرنا چاہتی ہو یا ٹینٹوا دبوا کر؟ کھڑکی سے گر کر مرنے کو ترجیح دو گی یا گردن تڑوا کر مرنے کو؟ یہ چاروں طریقے نہایت کم تکلیف دہ ہیں۔ تمہارے جرائم کی فہرست چونکہ زیادہ طویل نہیں' اس لیے میں تمہیں کم سے کم تکلیف دہ موت کا طریقہ منتخب کرنے کی اجازت دے رہا ہوں۔ جلدی بولو۔"
"بکواس مت کرو۔" اس بار وہ ناگن کی طرح پھنکاری۔ وہ براہ راست میری آنکھوں میں جھانک رہی تھی اور غالباً اسے میری بات کا یقین آگیا تھا کیونکہ اس کا ہاتھ دھیرے دھیرے اپنی کرسی کے پائے میں لگے ہوئے ایک سرخ بٹن کی طرف بڑھ رہا تھا مگر وہ ظاہر یہی کر رہی تھی کہ وہ میرے الفاظ کو محض بکواس سمجھ رہی ہے۔
میں نے اس کے ہاتھ کو سرخ بٹن کے عین قریب پہنچنے کا موقع دیا اور عین اس وقت جبکہ اس کی انگلی بٹن کو چھونے والی تھی' میں نے اس کے بازو پر کراٹے کا وار کیا اور ساتھ ہی اس کے منہ پر سختی سے ہاتھ بھی رکھ دیا۔ گوکہ کمرہ مجھے ساؤنڈ پروف معلوم ہو رہا تھا' تاہم میں کوئی خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔
اس کی کلائی گویا دو حصوں میں تقسیم ہو گئی اور بازو بے جان انداز میں پہلو میں جھول گیا۔ وہ میرے ہاتھ کے دباؤ تلے بری طرح مچل رہی تھی۔ میں نے دوسرا ہاتھ پھیلا کر اس کی پیشانی گرفت میں لے لی اور ایک مخصوص جھٹکا دیا۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی اور چہرے کے عضلات تنے رہ گئے۔ چٹ کی صرف ایک ہلکی سی آواز کے ساتھ اس کی گردن ٹوٹ چکی تھی۔ میں نے دونوں ہاتھ ہٹا لیے تو وہ آرام دہ کرسی کے ایک بازو پر لڑھک گئی۔
کمرے میں سناٹا در آیا تھا۔ یہ موت کا سناٹا تھا۔ میڈم منورما کی پھٹی پھٹی آنکھیں گویا اب بھی مجھے دیکھ رہی تھیں اور میں اس کے سامنے کھڑا سوچ رہا تھا کہ بس اتنی سی بات تھی۔ کہاں وہ مسلح آدمیوں کے حملے' اسٹین گنوں سے فائرنگ' کنور میسوری کی ڈرامہ بازی'

وکرم کی دہشت گردی اور ان سب چیزوں کی وجہ سے روپا کا جیتے جی سولی پر ٹنگے رہنا۔ ان سب کے پیچھے محض اسی ناتواں سی بڑھیا کا ہاتھ کام کر رہا تھا۔ معاملہ کتنا خوفناک اور گھمبیر نظر آتا تھا کیونکہ فساد کی اصل جڑ کا پتا نہیں چل رہا تھا ورنہ بات تو کچھ بھی نہیں تھی۔
بہرحال اسی ناتواں سی بڑھیا تک پہنچنے کے لیے مجھے جن تجربوں سے گزرنا پڑا تھا' انہوں نے میرے حوصلے میں اضافہ کیا تھا۔ جن حالات کا مجھے سامنا ہونے کی توقع تھی' یہ شاید ان کی ریہرسل تھی۔
میں نے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ ادھر ادھر کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ میں جس خاموشی سے اوپر آیا تھا' اسی طرح واپس پہنچ گیا۔ یہ دیکھ کر مجھے قدرے حیرانی ہوئی کہ اب وہاں ایک جوڑا بھی نظر نہیں آرہا تھا حتیٰ کہ سرو کرنے والی لڑکیاں بھی غائب ہو چکی تھیں۔ تمام جوڑے دراصل کمروں میں جا چکے تھے اور کمرے ساؤنڈ پروف تھے۔
باہر آکر میں نے محتاط نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ وہ نوجوان مجھے کہیں نظر نہیں آیا جس نے میرے لیے دروازہ کھولا تھا۔ چاروں طرف وہی سناٹا اور سکوت طاری تھا جس سے گزر کر میں یہاں پہنچا تھا۔ درختوں تلے ملگجے اندھیرے میں رنگ برنگی کاریں اسی طرح کھڑی تھیں۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ سکوت اور دھندلاہٹ میں لپٹی ہوئی اس عمارت کی دیواروں کے پیچھے کیسی دنیا آباد تھی؟ کیا ہنگامہ بپا تھا اور اس کے ہر کمرے میں عیش و طرب اور بے راہ روی کی کیسی کیسی داستانیں رقم کی جا رہی تھیں؟
کار میں بیٹھ کر میں روپا کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ مجھے یقین تھا کہ میری اتنی دیر کی غیر حاضری سے وہ بے حد پریشان ہو گی۔ اندیشہ یہ بھی تھا کہ اس گھبراہٹ میں وہ کوئی غیر ضروری قدم نہ اٹھا بیٹھے' اسی لیے میں نے فیصلہ کیا تھا کہ پہلے جا کر اسے تسلی دے دوں۔ اس کے بعد اس تہ خانے کا ایک چکر لگا کر آؤں گا جہاں میں نشچل اور وکرم کو نیم مردہ چھوڑ آیا تھا۔
پون گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد جب میں نے گاڑی اس بلاک کی طرف موڑی جہاں بیضوی پلے گراؤنڈ کے قریب روپا کا گھر تھا تو مجھے سڑک پر ہلچل اور غیر معمولی آمد و رفت نظر آئی ورنہ عام حالات میں اس پوش رہائشی علاقے کی سڑکوں پر کم ہی آمد و رفت نظر آتی تھی۔
پلے گراؤنڈ کی طرف گاڑی موڑتے ہی میں نے سامنے کا منظر دیکھ کر غیر ارادی طور پر یک لخت گاڑی روک لی۔ سامنے لوگوں کا بے پناہ ہجوم تھا۔ بیسیوں گاڑیاں ادھر ادھر کھڑی نظر آرہی تھیں جن میں پولیس اور فائر بریگیڈ کی بھی گاڑیاں شامل تھیں۔ بڑی بڑی سرچ لائٹیں روشن تھیں لیکن ان کے درمیان کیمروں کی فلش لائٹوں کے جھماکے الگ ہی نظر آرہے تھے۔
جو مقام ان سب کی توجہ کا مرکز تھا وہاں روپا کی کوٹھی ہونی چاہیے تھی جو اب وہاں



نہیں تھی- اس کی جگہ اب محض ملبے کا ایک انبار تھا جس سے کہیں کہیں سے دھوئیں کی لکیریں بلند ہو رہی تھیں- مخصوص لباس اور ہیلمٹ وغیرہ پہنے ہوئے فائر بریگیڈ کا عملہ کئی جگہوں سے مستعدی سے ملبہ ہٹانے میں مصروف تھا- کئی باوردی اور بے وردی افراد بار بار ہجوم کو ہٹاتے ادھر ادھر آتے جاتے نظر آرہے تھے-

میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا- روپا کی کوٹھی ملبے کا ڈھیر کیونکر بن گئی تھی اور کیا روپا بھی اس کے ساتھ ہی.....؟ ان سوالات نے گویا مجھے چکرا کر رکھ دیا- میرے ہاتھ پیروں سے گویا جان نکل گئی- اب تک کی ساری مار دھاڑ' بھاگ دوڑ اور جدوجہد نے مجھے اتنا نہیں تھکایا تھا جتنا صرف ایک منظر نے مجھے بے دم کر دیا تھا- قریب تھا کہ میں گاڑی سے اتر کر دیوانوں کی طرح دوڑتا ہجوم کے قریب جا پہنچتا اور کسی وردی والے کو جھنجھوڑ کر پوچھتا کہ معاملہ کیا ہے؟ روپا زندہ ہے یا.....؟ اسے مردہ تصور کرنے پر دل آمادہ ہی نہیں ہوتا تھا-

صحیح صورتحال جانے بوجھے بغیر ہی میرا دل دھاڑیں مار مار کر رونے کو چاہ رہا تھا- بہرحال اپنے اعصاب کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے میں نے ہجوم سے اتنی دور ہی رہتے ہوئے گاڑی کا انجن بند کیا- چابی اگنیشن میں چھوڑی اور گاڑی سے اتر گیا-

گاڑی اس وقت ایک کوٹھی کی کمپاؤنڈ وال کے قریب تھی اور اس کا بیشتر حصہ اندھیرے ہی میں تھا البتہ اس سے اترتے وقت میں روشنی میں ہی تھا- دفعتاً" میں نے سامنے سے زنانہ سائیکل پر ایک لڑکی کو تیزی سے اپنی طرف آتے دیکھا- اس کے تراشیدہ بال اور اسکرٹ ہوا میں اڑ رہا تھا- اسٹریٹ لائٹ چونکہ اس سے پیچھے تھی' اس لیے اس کا چہرہ مجھے صاف نظر نہیں آرہا تھا- میں چوکنا ہو گیا-

میرے قریب آکر لڑکی نے سائیکل کی بریک لگائی اور اتر پڑی- تب میں نے دیکھا کہ وہ روپا کی سیکرٹری اوشا تھی- اس کی سانس پھول رہی تھی اور ستواں ناک پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں چمک رہی تھیں- وہ سیاہ اسٹاکنگ اور کینوس کے جوتے پہنے ہوئے تھی اور اس وقت کالج کی کوئی ایتھلیٹ لگ رہی تھی- اسے دیکھ کر مجھے ایک گونہ طمانیت کا احساس ہوا- میرے کچھ پوچھنے سے پیشتر ہی وہ بول اٹھی-

"مسٹر منصور!" اس نے انگریزی میں کہا- "آپ فوراً میرے ساتھ چلئے- میں کب سے آپ کی تلاش میں یہیں چکرا رہی تھیں-"

"آؤ جلدی سے گاڑی میں بیٹھو-" میں نے دوسری طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا-

"میری سائیکل....." وہ ہچکچاتے ہوئے بولی- "پلیز اسے ڈکی میں رکھ دیں-" پچیس چھبیس سال کی اس تندرست و توانا اور خاصی حد تک جہاندیدہ لڑکی کے انداز میں سکول کی بچیوں جیسی معصومیت تھی- شاید میں اس وقت اس کی سائیکل وہیں پھینک دیتا اور کہتا-



"میں بعد میں تمہیں دس سائیکلیں لے دوں گا-" لیکن شاید اس کے لہجے کا اثر تھا کہ مجھے یہی محسوس ہوا جیسے اس کی عمر بھر کی پونجی یہیں رہی جا رہی ہے- میں نے اگنیشن سے چابیاں نکال کر ڈکی کھولی اور اس کی سائیکل کو اس میں ٹھونسا اور اسٹیئرنگ سنبھالتے ہوئے پوچھا- "کدھر چلنا ہے؟"

وہ میرے برابر بیٹھ چکی تھی- "گاڑی واپس موڑ لیجئے-" اس نے کہا-

اوشا کی ہدایت کے مطابق میں گاڑی دائیں بائیں گلیوں میں موڑنے لگا- خاموش رہنا میرے بس سے باہر ہو گیا تو میں نے پوچھا- "یہاں کیا ہوا تھا؟"

"میرا گھر تھوڑی ہی دور رہ گیا ہے- ابھی آپ کو سب معلوم ہو جائے گا-" اوشا نے مبہم سا جواب دیا-

"روپا تو زندہ ہے ناں؟" میں نے قدرے بلند آواز میں بے چینی سے پوچھا-

"جی ہاں!" اس نے جواب دیا-

اس لمحے میرا وجود طمانیت کی ٹھنڈی جھیل میں اتر گیا- وائلن کے تاروں کی طرح تنے ہوئے میرے اعصاب کو قرار آگیا- اس وقت میرے لیے سب سے اہم اور سنگین سوال یہی تھا جس کا مجھے جواب مل گیا تھا' باقی باتیں میرے نزدیک بہت کم اہم تھیں-

ہم ابھی اسی علاقے میں تھے' تاہم ایسے حصے میں پہنچ چکے تھے جہاں بنگلوں اور کوٹھیوں کی بجائے چھوٹے بڑے فلیٹوں پر مشتمل کئی منزلہ عمارتیں سر اٹھائے کھڑی تھیں' انہیں سے ایک نسبتاً پرانی عمارت کے سامنے اس نے گاڑی رکوائی اور اترتے ہوئے مجھے ساتھ آنے کا اشارہ کیا-

زرد روشنی میں ڈوبی ہوئی سیڑھیاں طے کرکے میں اس کی رہنمائی میں دوسری منزل پر ایک فلیٹ تک پہنچا جس کے سلیٹی دروازے پر ایک دائرے میں سیاہ پینٹ سے آٹھ کا موٹا سا ہندسہ لکھا نظر آرہا تھا- اوشا کی دستک کے جواب میں ایک تپلی دبلی سی بڑھیا نے دروازہ کھولا اور مجھے دیکھ کر نمستے کیا- بڑھیا' اوشا کے مستقبل کی پرچھائیں معلوم ہوتی تھی- یقیناً وہ اوشا کی ماں تھی- اب مجھے یہ پوچھنے کی ضرورت نہ رہی کہ یہ کس کا گھر ہے- ظاہر سی بات تھی کہ اوشا کا گھر تھا-

پہلا کمرہ خاصا کشادہ تھا اور اس کی آرائش اوسط درجے کی تھی- قالین کا رنگ اڑا اڑا سا تھا اور صوفہ بھی پرانا تھا مگر اس کے گدیلوں پر صاف ستھرے غلاف چڑھے ہوئے تھے اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ اسی کمرے کے ایک گوشے میں قالین پر روپا آرام سے بیٹھی دو نوعمر لڑکیوں کے ساتھ لوڈو کھیل رہی تھی- نوعمر لڑکیاں اوشا کی چھوٹی بہنیں معلوم ہوتی تھیں-

"خدا کا شکر ہے منصور!" روپا مجھے دیکھ کر لوڈو چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی- میرے آنے

سے پہلے وہ غالباً تفکرات کو بھلانے کی کوشش میں خاصی کامیاب ہو چکی تھی اور لڑکیوں کے ساتھ قہقہے لگا رہی تھی مگر مجھے دیکھتے ہی جیسے سارے فراموش کردہ اندیشے اس کی آنکھوں میں اتر آئے۔ "تمہارا انتظار کرتے کرتے میں تو پاگل ہو چلی تھی۔"

میں خاموش کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ وہ میرے قریب آگئی۔

"ہوا کیا تھا؟" بالآخر میں نے پوچھا۔

"صحیح طور پر تو مجھے بھی نہیں معلوم۔" اس نے سادگی سے کہا۔ "میں تمہاری ہدایت کے مطابق کنور میسوری کی کیڈلک ایک سڑک پر چھوڑ کر کچھ دیر ٹیکسی تلاش کرتی رہی لیکن ٹیکسی نہیں ملی۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ سیاہ چشمے اور عام سے لباس کے باوجود کچھ لوگ مجھے پہچان نہ لیں اور ہجوم اکٹھا نہ ہو جائے' اس لیے میں گلیوں گلیوں سے ہوتی پیدل ہی چل دی۔ گھر کا فاصلہ کچھ زیادہ نہیں رہا تھا۔ اس وقت میں پلے گراؤنڈ کے قریب پہنچ چکی تھی۔ جب میں نے زبردست دھماکے کے ساتھ کوٹھی کا مرکزی حصہ منہدم ہوتے دیکھا۔ پلستر اور اینٹوں وغیرہ کے کچھ ٹکڑے تو میں نے خس و خاشاک کی طرح ہوا میں بھی اڑتے دیکھے' پھر باقی دیواروں وغیرہ میں بھی دراڑیں پڑیں اور وہ بھی زمین بوس ہو گئیں۔"

روپا نے سسکی سی لی اور قابل رحم سے انداز میں میری طرف دیکھا۔

"میں نے بڑے چاؤ سے خود بنوایا تھا منصور!" اس نے جیسے شکوہ سا کیا۔ جیسے اس کی تباہی میں میرا بھی ہاتھ رہا ہو۔ "اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ یوں نیست و نابود ہو گیا جیسے بندروں نے کسی پرندے کا آشیانہ اجاڑ دیا ہو۔"

"یہ شکر کرو کہ وہ پرندہ زندہ بچ گیا ہے۔" میں نہ جانے کیوں مسکرا دیا۔ "آشیاں تو پھر بھی بنتے رہیں گے۔" میں نے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ "کوٹھی میں غالباً بے حد طاقتور بم چھپایا گیا تھا۔ مجھے تو یہ سوچ کر جھرجھری آرہی ہے کہ اگر تمہیں ٹیکسی مل جاتی تو یقیناً تم چند منٹ پہلے گھر پہنچ چکی ہوتیں۔ تب کیا ہوتا؟"

روپا کو واقعتاً جھرجھری سی آگئی۔ اس دوران جیسے ہم نے کمرے میں موجود دیگر افراد کو قطعی نظرانداز کر دیا تھا۔ بڑھیا تو چند لمحے پہلے ہی دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔ اوشا نے مجھے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تشریف رکھیے' میں آپ کے لیے کافی لاتی ہوں۔"

"کافی نہیں۔" میں نے فوراً کہا۔ "میرے لیے کچھ کھانے کے لیے لاؤ' ہو جائے گا کوئی بندوبست؟" میں نے احتیاطاً پوچھا۔

"کیوں نہیں۔" وہ مسکرائی۔ "چند منٹ انتظار کی زحمت اٹھانا پڑے گی۔" وہ غالباً کچن کی طرف چل دی۔ باہر جاتے وقت اس نے شاید اپنی چھوٹی بہنوں کو بھی اشارہ کر دیا تھا کیونکہ اس کے ساتھ ہی کمرے سے وہ بھی رخصت ہو گئیں۔ میں صوفے پر بیٹھ گیا اور

روپا کو بھی اپنے قریب بیٹھنے کا اشارہ کیا مگر وہ دیوار سے ٹیک لگا کر میرے پیروں کے قریب ہی قالین پر بیٹھ گئی۔ گھر میں بھی وہ اسی طرح ایزی ہو کر بیٹھنا پسند کرتی تھی۔ اس وقت وہ عام سی ساڑھی میں' بکھرے بکھرے بالوں اور بے نیاز چہرے کے ساتھ بہت مختلف لگ رہی تھی۔ بغور دیکھنے پر اسے کوئی عام آدمی شاید ہی تسلیم کر پاتا کہ یہ وہی روپا ہے جسے وہ فلموں میں ایک سے ایک انوکھی صورت میں دیکھتا رہا ہے۔

"....جب مجھے اپنی آنکھوں پر یقین آگیا۔" روپا کہہ رہی تھی۔ "کہ کوٹھی واقعی زمین بوس ہو چکی تھی اور لوگ ادھر ادھر سے دوڑے آنے لگے تھے تو میں خاموشی سے وہاں سے کھسک لی۔ صحیح طور پر مجھے خود بھی نہیں معلوم کہ اس کی وجہ کیا تھی۔ شاید میں یہ سوچ کر گھبرا گئی تھی کہ پولیس والے اور اخباری رپورٹر وغیرہ بھی پہنچ جائیں گے اور مجھ سے طرح طرح کے سوالات کریں گے۔ میں کیا جواب دوں گی؟ مجھے اس تصور سے ہی وحشت ہونے لگی تھی۔ دوسرے شاید میرے تحت الشعور میں یہ خیال بھی آیا ہو کہ میرے جن دشمنوں نے کوٹھی میں بم رکھا ہوگا' وہ کچھ عرصے کے لیے یہی سمجھ لیں کہ میں واقعی مر چکی ہوں' جو کچھ بھی ہو.....بہرحال سب سے بڑی گھبراہٹ تنہائی کی تھی۔ ویسے تو میرا خیال ہے کہ میں خاصے مضبوط اعصاب کی عورت ہوں لیکن اس قسم کی صورتحال میں میرے حواس مختل اور عقل خبط ہو کر رہ جاتی ہے۔ میں خوفزدہ بہرحال نہیں ہوئی تھی۔ بس یہ فیصلہ کرنے سے معذور ہو گئی تھی کہ فوری طور پر مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میرے ذہن میں بس اوشا کا نام آیا اور میں اس کے گھر کی طرف دوڑ پڑی۔ اس کا گھر قریب بھی تھا اور چونکہ میں کئی مرتبہ اسے یہاں ڈراپ کرکے گئی ہوں' اس لیے مجھے یاد بھی تھا۔ تبھی سے میں نے اس کو وہاں دوڑا دیا تھا کہ ہجوم کے آس پاس ہی چکر لگاتی رہے اور تم آتے نظر آؤ تو تمہیں بالا بالا ہی یہاں لے آئے۔ اب تم جو کہو گے' میں وہی کروں گی۔" میری طرف دیکھتے ہوئے وہ اتنی دیر میں پہلی مرتبہ مسکرائی۔ پھر فوراً ہی سنجیدہ ہو گئی۔

"تم میری ہی سنے جا رہے ہو۔" وہ بولی۔ "اپنی تو کچھ سناؤ تم پر کیا بیتی؟ اتنی دیر کہاں لگا کر آرہے ہو؟"

میں نے مختصراً اسے تمام واقعات سنا دیئے۔ پرنس' وممی کا میں نے کوئی تذکرہ نہیں کیا البتہ اتنا ضرور کہہ دیا...."تمہارا اصل دشمن تو ختم ہو چکا ہے البتہ ایک شخص باقی ہے جس کی طرف سے شاید کبھی تمہیں کسی قسم کا خطرہ لاحق ہو جائے۔ آج کل میں ہی میں اس کا بھی بندوبست کر دوں گا۔ اس کے بعد تم ہمیشہ کے لیے بے فکر ہو جاؤ گی بشرطیکہ تمہارا کوئی نیا دشمن پیدا نہ ہو جائے...." میں کہنا چاہتا تھا کہ اس وقت بہرحال میں اس کی حفاظت کے لیے موجود نہیں ہوں گا۔ میں اسے الوداع کہہ کر جا چکا ہوں گا ......لیکن میری اسے یہ بتانے کی ہمت نہ پڑی۔

"فی الحال ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" اس نے پوچھا۔

"فی الحال تو سب سے پہلے اوشا جو کچھ پکا کر لائے گی' اسے ہم دونوں چٹ کریں گے۔" میں نے کہا۔ "اس کے بعد کچھ سوچیں گے کیونکہ میں نے سنا ہے' سوچ بچار میں معدہ بھی کافی اہم کردار ادا کرتا ہے۔"

اسی لمحے اوشا واپس آگئی اور مسکراتے ہوئے بولی۔ "میں نے ٹینا اور پنکی کو سینڈو چز تیار کرنے پر لگا دیا ہے۔ میں نے سوچا کہ اتنی دیر میں ہم خبریں ہی سن لیتے ہیں۔ مقامی خبروں کا وقت ہو رہا ہے۔"

اس نے دروازے کے قریب دیوار کے ساتھ لگی تپائی پر رکھا بجلی کا ایک ریڈیو آن کر دیا۔ سٹیشن ٹیون کرنے کے بعد وہ روپا کے قریب ہی قالین پر آبیٹھی۔ نیوز ریڈر غالباً سرخیاں پڑھ چکی تھی اور اب لگے بندھے اور گھسے پٹے لفظوں میں انتظامیہ کے کسی افسر اعلیٰ کا ایک روایتی سا وعدہ پڑھ کر سنا رہی تھی کہ آنے والے اتنے برسوں میں فلاں جامع منصوبے کے تحت فلاں مسئلہ جڑ سے ختم کر دیا جائے گا۔

چند منٹ ہم خاموشی سے بیٹھے اسی قسم کی بکواس اور کھوکھلی خبریں سنتے رہے جو مجھے زہر لگتی تھیں۔ پھر اس نے نئی خبر شروع کی۔

آج سہ پہر پالی ہل کے علاقے میں معروف و مقبول فلمی اداکارہ میڈم روپا کی کوٹھی ایک زبردست دھماکے سے زمین بوس ہو گئی۔ دھماکہ اس قدر شدید تھا کہ آس پاس کی دو کوٹھیوں کی چار دیواری کو بھی نقصان پہنچا۔ باور کیا جاتا ہے کہ کوٹھی میں موجود افراد میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچ سکا۔ ایک ملازم اور ایک ملازمہ کی لاش ملبے سے نکالی جا چکی ہے۔ مصدقہ اطلاعات کے مطابق میڈم روپا آج شوٹنگ کے لیے کسی بھی سٹوڈیو نہیں پہنچی تھیں جس کی بنا پر اندیشہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ شاید گھر میں موجود رہنے کی وجہ سے وہ بھی حادثے کا شکار ہو چکی ہوں۔

ماہرین نے دھماکے کی وجہ طاقتور بم کا پھٹنا بیان کی ہے۔ ملبہ ہٹانے اور تحقیقات وغیرہ کا کام جاری ہے۔ مزید تفصیلات شاید ہم آپ کو صبح کے بلٹن میں سنا سکیں۔ مقامی خبریں ختم ہوئیں۔

میں نے چٹکی بجاتے ہوئے روپا سے کہا۔ "لو......یہ مسئلہ تو حل ہو گیا کہ تمہیں کیا کرنا چاہیے۔ میرے ساتھ اب تم اپنے گھر......بلکہ یوں کہو کہ اپنے کھنڈر کی طرف چلو گی اور اپنی تمام تر اداکارانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے یوں ظاہر کرو گی جیسے تم پر حیرت در صدمے کا شدید حملہ ہوا ہے۔"

جب ہم جائے وقوعہ پر پہنچے تو ہجوم کافی کم ہو چکا تھا۔ فائر بریگیڈ اور پولیس والوں کے علاوہ کچھ ہی لوگ نظر آرہے تھے۔ میں نے ملبہ کے ڈھیر کے قریب گاڑی لے جانے کی

کوشش کی تو پولیس والے نے وسل دے کر مجھے روک دیا اور مستعدی سے ہماری طرف بڑھا۔ اسی لمحے روپا گاڑی سے اتر گئی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے ملبے کے ڈھیر کو دیکھنے لگی۔ پولیس کانسٹیبل اسے پہچان کو دوڑا دوڑا گیا اور نجانے کہاں سے ایس پی کو بلا لیا۔ اس دوران وہاں موجود تماشا دیکھنے والوں میں بڑی تیزی سے خبر پھیل چکی تھی کہ میڈم روپا زندہ ہے اور ابھی ابھی کہیں سے آئی ہے۔ لوگ ہمارے گرد جمع ہونے لگے تھے۔ ایس پی نے آکر سب کو ڈانٹا اور کانسٹیبلوں وغیرہ کو ہدایت کی کہ انہیں پیچھے ہٹائیں۔ اس دوران وہیں سڑک کے کنارے پلے گراؤنڈ کے قریب چند کرسیاں بھی پولیس والوں نے لا کر بچھا دی تھیں۔

"تشریف رکھیں میڈم!" ایس پی نے روپا کو ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا لیکن وہ بڑی کامیابی سے سکتے کی سی کیفیت کا اظہار کر رہی تھی اور بت بنی کھڑی تھی۔ ایس پی کے تیسری مرتبہ مخاطب کرنے پر وہ چونکی' وہ کہہ رہا تھا "بھگوان کی بڑی کرپا ہے کہ آپ زندہ ہیں.....ہمیں ملبے میں لاش کے کچھ حصے ملے ہیں۔ ان کی بنا پر ہم تو تصدیق کرنے والے تھے کہ آپ بھی....." اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور ایک لمحے کے توقف سے پوچھا۔ "ویسے آپ تھیں کہاں؟ ہم نے تمام سٹوڈیوز سے پتا کروایا تھا۔"

"میں ایک عزیز کی بیمار پرسی کے لیے پونا گئی ہوئی تھی۔" روپا نے جھرجھری سی لے کر بڑبڑانے کے انداز میں کہا۔ "لیکن یہ ہوا کیا ہے؟ کیسے ہوا ہے؟" صدمے سے گویا اس کی آواز بیٹھی جا رہی تھی۔ "میں نے تو ریڈیو پر خبر سنی اور دوڑی چلی آئی....میرے ملازموں کا کیا ہوا؟"

"آپ کا چوکیدار تو بچ گیا ہے' بہرحال اسے کافی زخم آئے ہیں۔ وہ اسپتال میں ہے۔ اس کے علاوہ ہمیں ایک عورت اور ایک ادھیڑ عمر مرد کی لاش ملی ہے اور تیسری لاش کے چند حصے ملے ہیں۔ شاید وہ عورت اس جگہ کے بہت قریب تھی جہاں بم رکھا گیا تھا۔"

"چوکیدار کے علاوہ دو ملازمائیں اور ایک مالی گھر پر تھا۔ گویا ان میں سے کوئی زندہ نہیں بچا۔" روپا بڑبڑائی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اب وہ اداکاری نہیں کر رہی تھی۔ دکھ واقعی اس پر غلبہ پانے لگا تھا۔ یوں بھی وہ عجیب ہی سی عورت تھی۔ اس کے مزاج کا کوئی پتہ نہیں تھا کہ کب' کس سمت سے صدمے کی کوئی لہر آئے اور اس کی تمام سوچوں کو بہا کر لے جائے۔

"آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ یہ حرکت کس کی ہو سکتی ہے؟" ایس پی نے گویا اس کا دھیان ہٹانے کے لئے پوچھا۔

"یہ تو آپ کو معلوم کرنا ہے ایس پی صاحب!" روپا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے نہایت باوقار لہجے میں کہا۔ "میری تو کسی سے دشمنی نہیں لیکن نہ جانے کون میرے خون کا

پیاسا بنا ہوا ہے اور کیوں؟ آپ کے علم میں تو ہوگا کہ مجھ پر بارہا قاتلانہ حملے ہو چکے ہیں۔ مجھے خود حیرت ہے کہ میں کیونکر بچتی رہی ہوں۔ یہ اس سلسلے کی سب سے بڑی کوشش تھی۔ اب تو بس یہی کسر رہ گئی ہے کہ یہ نامعلوم لوگ ٹینکوں سے مجھ پر چڑھائی کر دیں۔" روپا کے لہجے میں طنز جھلک آیا۔

"آپ بالکل چنتا نہ کریں۔" ایس پی نے اس کے طنز کو سمجھتے ہوئے کہا۔ "اس بار میں ان نامعلوم بدمعاشوں کو پاتال سے بھی کھود نکالوں گا۔"

"یہی وعدہ کافی عرصہ پہلے ڈی آئی جی صاحب بھی مجھ سے کر چکے ہیں۔" روپا نے نہایت سادگی سے کہا۔

"اب فی الحال آپ کا قیام کہاں ہوگا؟" ایس پی نے قدرے کھسیا کر موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

"کچھ دن کے لیے کسی ہوٹل ہی میں قیام کروں گی۔" روپا نے اٹھتے ہوئے کہا۔

مجھے مطلع کر دیجئے گا کہ آپ کس ہوٹل میں ہیں۔" ایس پی نے کہا۔ پھر ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "اخباری نمائندے بھی کچھ ہی دیر پہلے اپنے اپنے دفتروں کو روانہ ہوئے ہیں۔ ابھی میں دفتر جاؤں گا تو ان کے فون آنے شروع ہو جائیں گے۔" "انہیں صرف یہ بتا دیں کہ میں زندہ ہوں۔" روپا نے سردمہری سے کہا۔ "لیکن میں نہ تو کوئی بیان دوں گی اور نہ ہی میں کسی سے ملوں گی۔"

"کہاں چلنا چاہیے؟" چند لمحے بعد میں نے اندھیرے میں پارک کی ہوئی گاڑی کو سڑک پر لاتے ہوئے پوچھا۔ روپا میرے برابر بیٹھی کھوئی کھوئی نظروں سے سامنے دیکھ رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ اس پر مخصوص اداسی کا دورہ پڑا ہے۔

"تاج چلو۔" اس نے آہستگی سے کہا۔

تاج محل ہوٹل کی ان دنوں بڑی شہرت تھی۔ راستے میں روپا نے چونکتے ہوئے کہا۔ "منصور! مجھے پیسوں کی ضرورت ہوگی۔ صبح بینک کی بھی چھٹی ہے۔ میں وہاں سے نئی چیک بک وغیرہ بھی نہیں لے سکوں گی۔"

"پیسوں کی فکر نہ کرو۔" میں نے اس کی سیٹ کے نیچے پڑے ہوئے بریف کیس کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ نوٹوں سے بھرا ہوا ہے۔ اور ابھی میں خاصی بڑی رقم چھوڑ آیا ہوں جو ہمارے خون کی پیاسی بڑھیا ادا کر رہی تھی۔"

"تو کیا تم لڑائی بھڑائی کے علاوہ لوٹ مار بھی کرتے ہو؟" وہ مسکرائی۔ اس کے ذہن سے جلد ہی اداسی کے بادل چھٹنے لگے تھے۔ اس کا مزاج پہاڑی علاقوں کے موسم کی طرح ہے۔ پل میں کچھ پل میں کچھ۔

تاج محل میں اسے ایک وی آئی پی سوئٹ میں پہنچا کر نوٹوں کی ایک گڈی اس کے

حوالے کرتے ہوئے میں نے کہا۔ "میں اب چلتا ہوں۔ کچھ کام ادھورا رہ گیا تھا' اسے مکمل کرنا ہے۔ میری واپسی میں اگر تاخیر ہو جائے تو کوئی فکر نہ کرنا۔"

بریف کیس اٹھائے میں لفٹ کے ذریعے نیچے آیا اور کار میں بیٹھ کر اس تہہ خانے کی طرف روانہ ہو گیا جہاں میں نے **نشچل** اور وکرم کو ان کے ساتھیوں کی لاشوں کے درمیان نیم مردہ چھوڑا تھا۔ وکرم ہی کی گاڑی ابھی تک میرے استعمال میں تھی۔

تہہ خانے تک واپس پہنچنے میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی اور جب کنڈی کھول کر اندر پہنچا تو منظر تقریباً ویسا ہی نظر آیا جیسا میں چھوڑ کر گیا تھا۔ صرف ایک فرق پڑا تھا اور وہ یہ کہ **نشچل** دم توڑ چکا تھا۔ وہ گھسٹتے گھسٹتے دروازے کے قریب پہنچ گیا تھا اور موت نے اسے راستے میں ہی آلیا تھا۔ مرنے سے پہلے اسے خون کی قے بھی آئی تھی۔ وہ احمق اگر دروازے تک پہنچ بھی جاتا تو اسے کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ دروازہ تو باہر سے بند تھا۔

وکرم وہیں پڑا اکھڑی اکھڑی سانسیں لے رہا تھا۔ جہاں میں اسے باندھ کر ڈال گیا تھا۔ میں نے بالوں سے پکڑ کر اسے سیدھا کیا تو اس نے سوجی سوجی سی آنکھیں بمشکل نیم وا کرکے میری طرف دیکھا۔ اس کی پیشانی سے خون بہہ کر اس کے چہرے پر جم چکا تھا اور اس کے درمیان اس کی آنکھیں پیوند کی طرح چمک رہی تھیں۔ میں نے اسکے منہ سے کاغذ کا گولا نکالا۔

"تمہیں تمہارے....خدا کا واسطہ....مجھے چھوڑ دو.....میں بڑی تکلیف میں ہوں۔" وہ بڑبڑایا۔ "میں تم سے معافی مانگتا ہوں .....میں تمہیں بہت سا پیسہ دینے کو تیار ہوں.....تم اگر کہو گے تو میں ہمیشہ کے لیے ملک سے باہر چلا جاؤں گا۔" اس کا لہجہ اس شرابی سے مشابہ تھا جس کا نشہ نہ جانے کب سے ٹوٹ رہا ہو اور اب اذیت اس کی برداشت سے باہر ہو گئی ہو۔

"تم مجھے صرف میرے سوالوں کے جواب دو۔" میں نے کہا۔ "میں تمہیں چھوڑنے پر غور کر سکتا ہوں' وعدہ نہیں کر رہا۔" یہ بتاؤ کہ روپا کی کوٹھی میں بم کس نے رکھا تھا؟"

"رشی نے۔" اس نے بلا تامل جواب دیا۔

"لیکن رشی اور **نشچل** تو روپا کو اغوا کرکے لا رہے تھے' پھر اس میں بم رکھنے کی کیا ضرورت تھی؟" میں نے اس کے بالوں کو ایک جھٹکا دیا۔

"یہ بھی **نشچل** ہی کی تجویز تھی۔" وکرم کراہا۔ "اس نے کہا تھا کہ زیادہ عرصے تک روپا کی گمشدگی سے ملک میں گرما گرمی کی فضا برقرار رہے گی جو ہمارے حق میں خطرناک ثابت ہو سکتی ہے' اس لیے روپا کو اغوا کرنے کے بعد اگر ٹائم بم کے ذریعے اس کی کوٹھی کو تباہ کر دیا جائے تو یہی سمجھا جائے گا کہ اس دھماکے میں خود روپا کے بھی پرخچے اڑ گئے ہیں اور اگر اس کی تردید کرنے والا کوئی گواہ باقی رہا تو اسے ہم خود ٹھکانے لگا دیں گے۔ ایک بار

جب یہ خبر پھیل جائے گی کہ روپا مر چکی ہے تو پھر رفتہ رفتہ لوگ اسے بھول جائیں گے۔ اس کے مداحوں اور فلم سازوں کو آہستہ آہستہ صبر آجائے گا اور پولیس کی فائلیں بھی بند ہو کر داخل دفتر ہو جائیں گی لیکن اگر معاملہ اس کی گمشدگی کا رہا تو پریس بھی شور مچاتا رہے گا اور عوامی حلقے بھی شور مچائیں گے۔"

"ہوں۔" میں ہنکارا بھر کر رہ گیا۔ میرے ذہن میں سوچوں کے گھوڑے سرپٹ دوڑ رہے تھے اور میری رگوں میں لہو کی گردش کچھ تیز ہو چکی تھی۔ ایک لمحے کے توقف سے میں نے پوچھا۔ "روپا کے بارے میں تمہارا کیا پروگرام تھا؟" "میرا کام صرف اتنا تھا کہ آج رات دو بجے روپا کو مالتی مندر جزیرے پر پہنچا دوں اور پرنس شومبی سے دو لاکھ پاؤنڈ نقد وصول کرکے واپس آجاؤں۔" وکرم نے بتایا۔

میں نے گھڑی دیکھی' اس وقت پونے بارہ ہو رہے تھے۔

"اور پرنس کا پروگرام کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ روپا کو اپنے ذاتی جہاز میں ڈال کر جزیرے سے پرواز کرکے بمبئی کے ہوائی اڈے پر آتا۔ وہاں اپنا فلائٹ پلان دے کر وہ نکاراگوچی کی طرف پرواز کر جاتا۔"





میں نے قدرے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا اور ایک لمحے کی خاموشی کے بعد پوچھا۔ "یعنی تمہیں روپا کو جزیرے پر جہاز تک پہنچانا تھا؟"

اس نے اثبات میں سرہلایا تو میں نے پوچھا۔ "کیا جزیرے پر رن وے موجود ہے؟"

"میں نے صرف سنا ہے کہ جزیرے پر پرنس نے میل ڈیڑھ میل کے دائرے میں کنکریٹ کی پٹی کھنچوا رکھی ہے جو جہاز کے لیے رن وے کا کام دیتی ہے لیکن میں نے وہ جگہ دیکھی نہیں۔" وکرم بولا۔ "طے یہ پایا تھا کہ میں بوٹ میں روپا کو لے کر ڈیڑھ بجے جزیرے پر پہنچ جاؤں گا اور بوٹ ہاؤس میں داخل ہو کر ٹارچ سے تین مرتبہ کنارے کی طرف سگنل دوں گا....کنارے پر ایک کار میں فیزوشیا نامی ایک افریقی میرا انتظار کر رہا ہوگا' وہ بوٹ ہاؤس میں آئے گا اور مجھے رن وے تک ساتھ لے جائے گا۔"

"اور بوٹ کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میری اپنی بوٹ تو آج کل کوسٹ گارڈز کے قبضے میں ہے۔" وکرم نے پہلے سے زیادہ کمزور لہجے میں کہا۔ "آج میں نے اپنے ایک سمگلر دوست سے بوٹ مستعار لینے کا بندوبست کرنا تھا۔" اس نے رحم طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "میں نے تمہارے ہر سوال کا جواب سچائی اور تفصیل سے دے دیا ہے' کوئی بات نہیں چھپائی۔ اب تو مجھے کھول دو۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا ہے اور پیشانی پھوڑے کی طرح دکھ رہی ہے۔"

"تمہاری آنکھوں کے آگے تو مدتوں سے اندھیرا چھایا ہوا تھا پیارے! اور اس اندھیرے میں تمہیں برے بھلے میں کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا اور جہاں تک تمہاری پیشانی پھوڑے کی طرح دکھنے کا سوال ہے تو حقیقت یہ ہے کہ تم خود معاشرے کی پیشانی پر ایک پھوڑا ہو جس سے مستقل غلاظت بہہ رہی ہے۔" میں نے بے رحمی سے کہا۔ "مجھے تم بدمعاشوں کی فطرت کے اسی پہلو سے سب سے زیادہ نفرت ہے کہ اپنے سے کمزور پر ظلم ڈھاتے وقت تم اس کی چیخ و پکار اور فریاد سن کر خوشی کے مارے زمین سے دو فٹ اونچے اچھلتے ہو اور جب تمہیں کوئی گردن ناپنے والا ملتا ہے تو فوراً ہاتھ جوڑ دیتے ہو' زندگی کی بھیک مانگنے لگتے ہو' بدمعاشی کرتے ہو تو کم از کم اتنا حوصلہ تو رکھو کہ اپنی جان پر بھی سختی سہہ سکو۔"

میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کا سر مضبوطی سے پکڑ کے ایک جھٹکا دیا۔ اس کی گردن گو کہ سانڈ کی طرح مضبوط تھی مگر اس داؤ کی خاص بات یہی تھی کہ اس کے مقابلے میں گردن کی مضبوطی کچھ خاص کام نہیں آتی تھی۔ وکرم کو تو کچھ سمجھنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی لیکن اس عالم میں بھی وہ گویا ایک ٹک میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کے پپوٹے بند کیے اور بریف کیس اٹھا کر تہہ خانے سے باہر آگیا۔ دروازہ میں نے ایک بار پھر بولٹ کر دیا اور گاڑی میں جا بیٹھا۔ اس وقت بارہ بج رہے تھے۔ اگر میں بروقت کوئی بوٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو مالتی مندر پہنچ کر پرنس شومیرو سے میری ملاقات ہو سکتی تھی جس کا نام میں نے اپنے نادیدہ دشمنوں کی تازہ ترین فہرست میں درج کر لیا تھا۔

وکرم کے سمگلر دوست کا نہ تو میں نے نام پتا پوچھا تھا اور نہ ہی میں اس سے بوٹ مستعار لینے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میرے ذہن میں **فشنگ** ہاربر کا خیال آیا تھا جہاں مچھیروں کے سینکڑوں ہٹ بھی تھے۔ ان میں سے کئی مچھیروں کے پاس ذاتی لانچیں بھی تھیں جو ماہی گیری میں استعمال ہوتی تھیں۔ میں نے چند لمحے سوچا' پھر گاڑی سٹارٹ کر کے **فشنگ** ہاربر کی طرف روانہ ہو گیا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد میں ساحلی علاقے میں پہنچا.... **فشنگ** ہاربر کی حدود سے بہت پہلے ہی زرد پتھروں کی ایک نیچی مگر بہت چوڑی دیوار بہت دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے گاڑی سڑک سے اتار کر ریتیلے حصے میں دیوار کے قریب کھڑی کی اور دیوار پھلانگ کر پیدل **فشنگ** ہاربر کی طرف روانہ ہو گیا۔ بریف کیس میرے ہاتھ میں تھا۔ میری جیکٹ کی ایک جیب میں مشین پسٹل اور دوسری میں **سائلنسر** والا پستول موجود تھا۔

کمزور سی چاندنی میں دور سے مچھیروں کے ہٹس یوں نظر آرہے تھے کیسے کسی نے بڑے بڑے سیاہ اور بے ہنگم صندوق بے ترتیبی سے ادھر ادھر پھیلا دیئے ہوں۔ ان سے کافی فاصلے پر بائیں طرف ایک طویل و عریض اور اونچا پلیٹ فارم پھیلا ہوا تھا جس پر ٹرالیاں' ٹوکریاں اور بوریوں کے ڈھیر اور نہ جانے کیا کیا کاٹھ کباڑ پھیلا نظر آرہا تھا۔ اسی پلیٹ فارم سے متصل بہت بڑا ماہی خانہ تھا جس کے سامنے بیسیوں ٹرک کھڑے نظر آرہے تھے۔

یہاں سمندر کی بو ایک مخصوص نم آلود سی بو پر مچھلیوں کی بو غالب تھی۔ پختہ پلیٹ فارم پر میں نے ایک شخص کا ہیولا دیکھا جس کے کندھے پر بندوق بھی نظر آرہی تھی۔ اس نے کئی بار ٹہلتے ٹہلتے ٹارچ چمکا کر ادھر ادھر دیکھا' شاید وہ چوکیدار تھا۔

مچھیروں کے ہٹس درحقیقت ہٹس کیا' اچھے بھلے مکانات تھے۔ ایک مرتبہ ہمیں شوٹنگ کے سلسلے میں یہاں آنے کا اتفاق ہوا تھا تو میں نے دیکھا تھا کہ ان میں سے بیشتر کے اندر جدید مکانوں والی سہولتیں موجود تھیں۔ مچھیروں میں سے چند ایک سمگلروں کے آلہ کار بھی

تھے۔ کبھی کبھار جیل میں چلے جاتے تھے اور ٹھاٹ سے رہتے تھے۔

میں ابھی ہٹس کے درمیان پھیلی ہوئی ٹیڑھی میڑھی گلیوں میں سے ایک میں داخل ہی ہونے والا تھا کہ عقب سے آتا ہوا ایک شخص میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ وہ غالباً پختہ پلیٹ فارم کی طرف سے آرہا تھا میں نے اسے دیکھا نہیں تھا۔ وہ درمیانے قد کا ایک پختہ عمر کا سیاہ فام شخص تھا۔ اس کا جسم خوب گٹھا ہوا تھا۔ سردی گو کہ خاصی تھی مگر اس کے جسم پر صرف بغیر آستینوں کی ایک میلی سی واسکٹ اور ٹخنوں سے اونچی دھوتی تھی۔ پیروں میں ربڑ کے بوٹ تھے جنکی وجہ سے ریت پر اس کے چلنے سے مدھم سی آواز بھی پیدا نہیں ہو رہی تھی۔

مجھے یقین ہو گیا کہ وہ مچھیرا ہے۔ میں اس سے سلسلہ کلام شروع کرنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ اس نے خود ہی پوچھ لیا۔ "کس سے ملنا ہے بابو جی؟"

خلاف توقع اس کے لہجے میں نہایت شائستگی اور ملائمت تھی۔

"کسی خاص آدمی سے تو نہیں۔" میں نے قدرے ہچکچاہٹ سے کہا اور غیر ارادی طور پر میں کچھ اور آہستہ چلنے لگا۔ میرے ساتھ اس کے قدم بھی سست پڑ گئے۔ قدرے توقف سے میں نے کہا۔ "مجھے دراصل چند گھنٹوں کے لیے ایک بوٹ چاہیے۔"

"یہاں بوٹس کرائے پر تو نہیں ملتیں۔" اس کے لہجے میں اب واضح طور پر دلچسپی کی جھلک آئی تھی۔

"پیشکش معقول ہو تو نہ ہونے والے کام بھی ہو جاتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "مزید گفتگو کرنے سے پہلے یہ بتاؤ کہ تمہارے پاس بوٹ ہے؟"

"کیوں نہیں۔" وہ مسکرایا۔ "پینتالیس ہارس پاور کی نئے ماڈل کی بوٹ ہے۔ کیا اب میں پوچھ سکتا ہوں کہ وہ معقول پیشکش کیا ہے جس کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے؟" اس کے لہجے کی شائستگی پر اب مجھے بجا طور پر حیرت ہونے لگی تھی۔ میرے خیال میں تو مچھیروں میں سے کسی کو اس حد تک اردو بولنی نہیں آتی تھی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے شک ہوا کہ خفیہ پولیس کا آدمی تو نہیں لیکن اسی لمحے وہ ایک ہٹ کے سامنے رک گیا۔

"وہ پیشکش پانچ سو روپے فی گھنٹہ ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ میرا گھر ہے۔" اس نے ہٹ کی طرف اشارہ کیا' باقی باتیں اندر چل کر کرتے ہیں' تشریف لائیے۔" وہ ہٹ کی طرف مڑا' اسی دوران ایک عورت نے دروازہ کھول دیا۔ ململ کی ساڑھی میں سڈول جسم کی وہ عورت پکی رنگت کے باوجود بے حد پرکشش نظر آرہی تھی۔ ڈھائی تین سال کا ایک بے ہنگم سا بچہ اس کی ساڑھی پکڑے ساتھ چلا آرہا تھا۔

"بس ٹھیک ہے ..... تم اندر جاؤ سندری!" مچھیرے نے اپنی بیوی کو حکم دیا۔ "میں ذرا بیٹھک میں بیٹھ کر بابو صاحب سے بات کروں گا۔"

مچھیرا مجھے ساتھ لیے بیٹھک میں داخل ہوا' یہ ایک اچھا بھلا پختہ دیواروں اور فرش والا کمرہ تھا جس میں معقول قسم کی کئی کرسیاں اور ایک تپائی بڑے سلیقے سے رکھی تھی۔

"میرا نام چھنا ہے۔" اس نے مجھے ایک کرسی پیش کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کا نام میں نہیں پوچھوں گا' جب آپ مناسب سمجھیں گے تو خود ہی بتا دیجئے گا۔" پھر جب ہم بیٹھ چکے تو وہ بولا۔ "البتہ میں یہ ضرور پوچھوں گا کہ آپ کو بوٹ کس مقصد کے لیے چاہیے؟ میری بوٹ ابھی نئی ہے اور ایک مرتبہ بھی ادھر کا مال ادھر کرنے میں استعمال نہیں ہوئی۔"

"کیا میں شکل و صورت سے تمہیں سمگلر نظر آتا ہوں؟" میں نے پوچھا۔

"شکل و صورت سے تو کوئی بھی سمگلر' سمگلر نظر نہیں آیا۔" چھنا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "کون کہہ سکتا ہے کہ یہ جو شریف شہری امپورٹ ایکسپورٹ کے بڑے بڑے عالیشان دفتر کھولے بیٹھے ہیں' ان کے مال کے ساتھ کیا کچھ جاتا اور کیا کچھ آتا ہے اور تو اور مختلف نوعیت کے وردیوں والوں میں نہ جانے کتنے یہ دھندہ کرنے والوں کے مائی باپ ہیں۔ اس لیے شکل و صورت کی بات تو چھوڑیں۔"

"بہرحال میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں اور نہ ہی مجھے اس قسم کا کوئی تجربہ ہے۔" میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور تم یہ بھی دیکھ رہے ہو کہ میرے پاس اس وقت اس بریف کیس کے سوا کچھ نہیں ہے۔"

"اس بریف کیس میں بھی ستر' اسی لاکھ کی ہیروئن سما سکتی ہے بابو صاحب!" چھنا مسکرا دیا۔ "لیکن خیر' ان باتوں کو چھوڑیئے' میں تسلیم کر لیتا ہوں کہ آپ کو اس مقصد کے لیے بوٹ نہیں چاہیے۔ آپ کو جانا کہاں ہے؟"

"مالتی مندر۔" میں نے اسے بتا دینے میں کوئی حرج محسوس نہیں کیا۔

"جواب تو درحقیقت میرا ہاں ہی ہے۔" وہ سر کھجاتے ہوئے بولا۔ "یہ ساری بحث و تمحیص اس لیے تھی کہ آپ مجھے بھی اپنے ساتھ کیوں نہیں لے جاتے؟ اگر آپ مجھ پر بھروسہ کریں تو میں اچھا ساتھی ثابت ہو سکتا ہوں۔ میری بڑے عرصے سے خواہش ہے کہ میں کبھی کسی حوصلہ مند آدمی کے ساتھ کسی مہم پر جاؤں۔ معلوم نہیں کیوں یہ شوق اکثر مجھے بے چین رکھتا ہے اور جب سے میں نے نئی بوٹ خریدی ہے تب سے تو یہ بے چینی بہت ہی بڑھ گئی ہے۔ خالی مچھلیوں کی بار برداری کرنے میں مزا نہیں آتا۔ آپ سے گفتگو کر کے نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہوا کہ درحقیقت مجھے آپ ہی جیسے کسی شخص کا انتظار تھا۔"

میں ہنس دیا۔ "اس قسم کے مکالمے تو رومانی افسانوں میں ہوتے ہیں۔"

میرے تبصرے پر کوئی دھیان دیئے بغیر اس نے بات جاری رکھی۔ "مجھے لگتا ہے کہ میرے اندر کوئی خاص صلاحیت' کوئی خاص طاقت موجود ہے جسے استعمال کرنے کا موقع

نہیں مل رہا۔" اس کے لہجے میں دبا دبا سا جوش جھلک آیا تھا۔ "پیسے کی مجھے اتنی پروا نہیں' ایک بار آپ مجھے اپنے ساتھ کسی بھی کام میں شریک کر کے دیکھیں شاید میں ہمیشہ کے لیے آپ کا اچھا دوست ثابت ہو سکوں۔"

اس کے لہجے میں اخلاص کی جو خوشبو تھی' اس نے مجھے سنجیدہ ہونے پر مجبور کر دیا۔

"میرے ساتھ چلتے ہوئے اگر تمہیں کوئی نقصان پہنچا تو اس کے ذمہ دار تم خود ہی ہو گے۔" میں نے کہا۔

"ارے صاحب اس کی فکر نہ کریں۔" اس نے ایک نئے جوش سے کہا۔ "جان بھی چلی جائے تو پروا نہیں اور آپ سے امید تو نہیں.....پھر بھی احتیاطاً واضح کر دوں کہ مجھے دھوکہ مت دیجئے گا ورنہ میں اتنا بے ضرر بھی نہیں جتنا نظر آتا ہوں۔"

"میں دھوکہ دینا اور دھوکہ کھانا دونوں ہی پسند نہیں کرتا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اور میں بھی اتنی سی درخواست ضرور کروں گا کہ مجھے محض لونڈے لپاڑوں میں شمار مت کرنا۔"

"مجھے معلوم ہے صاحب! آپ بڑے گہرے پانی میں ہیں۔ میری آنکھوں نے دنیا دیکھی ہے۔" اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"تم کیا توقع کر رہے ہو' میں کسی مہم پر جا رہا ہوں؟" میں نے پوچھا۔

"اب مجھے یہ سوچنے کی ضرورت ہی نہیں صاحب!" اس نے لاپروائی سے کہا۔ "آپ بے شک ادھر کا مال ادھر کرنے میں ساتھ لے چلیں' کوئی پروا نہیں۔ بس کچھ ہنگامہ' کچھ بھاگ دوڑ اور کچھ مار دھاڑ ہونی چاہیے.....مچھلیاں ڈھوتے ڈھوتے ان کی مخصوص بدبو سے میرا تو دماغ شل ہو کر رہ گیا ہے اور ہاتھ پیروں کو زنگ لگنے لگا ہے۔"

"میں بہت معمولی سے کام پر جا رہا ہوں چھنا!" میں نے اس کی دلچسپی اور جوش و خروش کچھ کم کرنے کی کوشش کی۔

"کوئی بات نہیں..... آج آپ کے ساتھ چھوٹے اور معمولی کام پر چلوں گا' کل کو کسی بڑے کام میں بھی دوستی نبھانے کا موقع ملے گا.....اسی بات پر ملائیں ہاتھ۔" اس نے ہاتھ میری طرف بڑھایا' میں نے گرم جوشی سے اس سے مصافحہ کیا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ اس کا ہاتھ اس قدر سخت ہو گا' لوہے کا پنجہ معلوم ہوتا تھا.....ایک عرصے بعد مجھے کسی سے مصافحے کا لطف آیا تھا۔

میں نے ایک بار پھر گھڑی دیکھی اور جیب سے کچھ نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "لو' یہ گھر میں دے دو اور بیوی بچوں سے جو بات کرنی ہے' وہ کر کے باہر آجاؤ' میں باہر کھڑا ہوتا ہے۔"

اس نے ایک نظر نوٹوں کی طرف دیکھا۔ "اتنی رقم کی کیا ضرورت ہے' ایک نوٹ کافی

رہے گا۔" اس نے کہا۔

"اب اتنے بھی رضاکار مت بنو۔" میں نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔ "جس طرح میں کہہ رہا ہوں' اسی طرح کرتے رہو..... تبھی میرے ساتھی بن سکو گے۔"

اس نے نوٹ لے لیے اور اندر چلا گیا۔ میں ہٹ سے باہر آگیا' چند منٹ بعد ہی وہ بھی آگیا۔ اس کے حلیے میں صرف یہ فرق پڑا تھا کہ سر پر ایک اونی ٹوپی کا اضافہ ہو گیا تھا۔

"تمہیں سردی نہیں لگے گی سمندر میں؟" میں نے پوچھا۔

"آج تک تو کبھی لگی نہیں۔" اس نے میرے ساتھ چلتے ہوئے کہا "اور اگر لگی بھی تو بوٹ میں اس کا بندوبست ہے۔"

چند منٹ بعد ہم پختہ پلیٹ فارم پر آپہنچے جو کسی بھی بڑے سے بڑے ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارم سے کہیں زیادہ لمبا چوڑا تھا۔ دور سے ہمارے ہیولے دیکھتے ہی وہاں ٹہلتا ہوا چوکیدار ہمارے قریب آپہنچا۔ اس نے ٹارچ کی روشنی ہم دونوں کے چہروں پر ڈالی اور چھنا کو دیکھ کر خوش دلی سے ہاتھ ہلایا اور ایک ایسی زبان میں کچھ کہا جو میری سمجھ سے بالاتر تھی' غالباً مچھیروں کی زبان تھی۔ چھنا نے بھی اسی زبان میں جواب دیا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ محض ایک دوسرے کی خیروعافیت دریافت کر رہے تھے۔

ہم اس کے قریب سے گزرتے چلے گئے تو میں نے چھنا سے پوچھا۔ "رات کے اس پہر ہمیں بوٹ میں جاتے دیکھ کر اسے کسی قسم کا شک تو نہیں ہوگا؟ یہ کچھ پوچھے گا تو نہیں؟"

چھنا نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "یہ غریب کیا پوچھے گا' اس کی ڈیوٹی صرف اتنی ہے کہ کوئی یہاں سے کچھ اٹھا کر نہ لے جانے پائے۔ کوئی کب آرہا ہے' کیا لا رہا ہے' کیا لے جا رہا ہے' ان باتوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی ان معاملات میں اسے لب کشائی کی اجازت ہے۔ بعض مچھیرے تو ایسے ہیں جن سے کوسٹ گارڈ والے بھی یہ سوال نہیں کرتے کیونکہ اس قسم کے سوالات کرنے والوں کے بھتے بند ہو جاتے ہیں۔"

ہم پلیٹ فارم کے کنارے تک آپہنچے تھے۔ میں نے دیکھا نیچے پچاسوں موٹر بوٹس قطار در قطار پانی میں دھیرے دھیرے ہچکولے کھا رہی تھیں۔ پلیٹ فارم کا وہ حصہ جس سے سمندر کا پانی ٹکرا رہا تھا' اس پر قطار میں سینکڑوں ہک نصب تھے۔ بوٹس کے رسے یا زنجیروں کے سرے انہی کنڈوں میں بندھے ہوئے تھے۔ چھنا مجھے سیڑھیوں کی طرف لے گیا اور سیڑھیاں اترتے ہوئے بولا۔ "آپ یہیں کھڑے ہوں' میں بوٹ یہیں لاتا ہوں۔" ایک بوٹ کا رسا وہ ہک سے علیحدہ کر چکا تھا' دوسری بوٹس پر چڑھ کر انہیں پھلانگتا ہوا وہ اپنی بوٹ تک پہنچا اور اس کے ڈیک ہاؤس میں داخل ہو گیا۔

یہ تقریباً چالیس فٹ لمبی کریم کلر کی ایک خوبصورت موٹر بوٹ تھی جس کے سامنے والے حصے پر ونڈ سکرین کے نیچے سرخ کا ہندسہ اور موٹے موٹے حروف میں اسکا نام "وہائٹ

شارک" لکھا نظر آرہا تھا حالانکہ بوٹ کا رنگ کہیں سے بھی وہائٹ نہیں تھا۔ چند لمحے بعد میں نے اس کا انجن بیدار ہونے کی آواز سنی۔ آواز کسی درندے کی خرخراہٹ سے زیادہ بلند نہیں تھی اور محض آواز ہی سے اس کے انجن کی عمدگی کا اندازہ ہوتا تھا۔

بوٹ بڑی صفائی سے دوسری بوٹس کے درمیان سے نکلی اور سیڑھیوں کی طرف آگئی۔ چھنا نے ڈیک ہاؤس کی سب سے اگلی کھڑکی سے سر نکال کر مجھے ڈیک پر کودنے کا اشارہ کیا اور میں سیڑھیوں کے قریب سے گزرتی بوٹ کے ڈیک پر کود گیا۔ جب تک میں ڈیک ہاؤس میں چھنا کے پاس پہنچا' بوٹ رفتار پکڑ چکی تھی اور دائرے میں گھوم کر سمندر کا سینہ چیرتی گہرے پانیوں کی طرف چل دی۔ میں چھنا کے قریب جا کھڑا ہوا۔ چاند اب کسی آوارہ بادل کے ٹکڑے کے پیچھے جا چھپا تھا اور جہاں تک بوٹ کی طاقتور ہیڈ لائٹ کی رسائی تھی' صرف وہیں تک سمندر کی لہریں چمکتی نظر آرہی تھیں۔

"آپ جوتے اتار کر اطمینان سے دیوار گیر بستر پر بیٹھ جائیں۔" چھنا نے مجھے مشورہ دیا۔ "مالتی مندر پہنچنے میں ہمیں بیس پچیس منٹ لگیں گے۔"

میں نے اس کے مشورے پر عمل کیا۔ میں واقعی چند منٹ ستانے کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ چند لمحے بعد چھنا بھی وہیل کو لاک کرکے میرے قریب ہی اس زاویئے پر آبیٹھا کہ ونڈ سکرین سے اسے سطح سمندر کا منظر دور تک نظر آتا رہے۔

"کوئی بات کریں..... آپ تو بالکل چپ چپ ہیں۔" چھنا نے دوستانہ سے انداز میں کہا۔

میں اس وقت سوچ بچار میں الجھا ہوا تھا۔ چند لمحے خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے کے بعد میں نے کہا۔ "چھنا! اگر کوئی بے انتہاء دولت مند غیر ملکی شخص جو سرکاری طور پر بھی اہمیت کا مالک ہو' تمہارے ملک کو محض جسم فروشی کا اڈہ سمجھ کر استعمال کرے' صرف دولت کے بل پر ہی جسم نہ خریدے بلکہ طاقت کے بل پر بھی اپنی من پسند لڑکیوں اور عورتوں کو اٹھوا لے اور اپنے ساتھیوں سمیت انہیں بربریت اور درندگی کا نشانہ بنانے کے بعد ان کی لاشیں سڑکوں یا پارکوں میں پھکوا دے اور اس کے باوجود نیک نام رہے' اس کے لیے تم کیا سزا تجویز کرتے ہو؟"

اس نے ایک لمحے کے لیے میری آنکھوں میں جھانکا اور کچھ سوچ کر مسکراتے ہوئے بولا۔ "میں اس کے لیے قتل کی سزا تجویز کروں گا۔"

بڑی گرم جوشی سے مسکراتے ہوئے اس نے دھوتی کی ڈب میں ہاتھ ڈالا اور چھوٹا سا ایک اسپرنگ دار چاقو نکالا۔ اس پر موجود ایک چھوٹا سا بٹن دباتے ہی سانپ کی زبان کی طرح جھٹکے سے اس کا چار' پانچ انچ لمبا دو دھاری پھل دستے سے باہر آگیا۔ چھنا نے ڈیک ہاؤس کی زرد روشنی میں نقرئی پھل کی جھلملاہٹ کا جائزہ لیتے ہوئے خودکلامی کے سے انداز

میں کہا۔ "ایک منٹ بھی نہیں لگے گا...." دفعتاً" اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ "مالتی مندر پر ایک افریقی شہزادے کا محل ہے' جہاں وہ کبھی کبھی آکر قیام کرتا ہے۔ آپ کا اشارہ اس کی طرف تو نہیں؟" اس نے پوچھا' اس کی تنگ سی پیشانی پر شکنیں ابھر آئی تھیں۔

"بالفرض میرا اشارہ اسی کی طرف ہو تو کیا تم میرے ساتھ چلنے کا ارادہ ترک کر دو گے؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" وہ فوراً بولا۔ "ایک بار دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا' سو بڑھا دیا۔ اب ہاتھ کھینچنے کا کیا سوال۔ اب تو مقابل شہزادہ ہو یا شہنشاہ' جو ہوگا' سو دیکھا جائے گا۔"

اس لمحے وہ مجھے بڑا کھرا اور جی دار آدمی معلوم ہوا۔ اس کے لیے میرے دل میں پسندیدگی کی لہر قوی ہو گئی۔ اسی اثناء میں دور کہیں تاریک سمندر کے سینے پر کچھ روشنیاں جھلملاتی دکھائی دینے لگی تھیں۔

"یہ روشنیاں کیسی ہیں؟" میں نے چھنا سے پوچھا۔

"یہ اسی شہزادے کے محل وغیرہ کی روشنیاں ہیں۔" چھنا نے جواب دیا۔ "میں کبھی جزیرے پر گیا تو نہیں لیکن سنا ہے کہ وہاں کئی طاقتور جنریٹر پر مشتمل ایک چھوٹا سا پاور ہاؤس بھی موجود ہے جس سے شہزادے نے اپنی ضرورت کی جگہوں پر روشنی کا انتظام کر رکھا ہے۔ درختوں وغیرہ کی اوٹ کی وجہ سے بعض اوقات یہ روشنیاں زیادہ دور سے نظر نہیں آتیں۔"

روشنیاں لحہ بہ لحہ واضح تر ہوتی گئیں بالآخر ہم جزیرے تک پہنچے۔ بوٹ ہاؤس کی تلاش میں ہم نے جزیرے کے گرد چکر لگانا شروع ہی کیا تھا کہ ہمیں چند فرلانگ کا فاصلہ طے کرتے ہی وہ نظر آگیا۔ یہ دراصل سمندر میں کچھ فاصلے تک بڑھی ہوئی کنکریٹ اور پتھروں کی ایک کشادہ سرنگ سی تھی جس میں اس وقت روشنی تھی۔ چھنا نے بڑی مہارت سے بوٹ اس میں داخل کرکے انجن بند کر دیا اور چند لمحے بعد بوٹ ہلکے سے دھچکے سے رک گئی۔ بوٹ ہاؤس میں اس جیسی دو تین بوٹس برابر برابر کھڑی کرنے کی گنجائش تھی اور کنارے پر ان کی رسیاں یا زنجیریں باندھنے کے پول بھی نصب تھے اور ان سے آگے ایک چوبی دروازہ تھا جس سے گزر کر جزیرے پر پہنچا جا سکتا تھا۔ یہ دروازہ اس وقت کھلا ہوا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ بوٹ ہاؤس میں اس وقت کوئی اور بوٹ موجود نہیں تھی۔

میں نے چھنا سے ٹارچ لی جو ڈیک ہاؤس ہی میں موجود تھی۔ وکرم نے مجھے بتایا تھا کہ ٹارچ سے تین مرتبہ سگنل دینے پر فیروشیا نامی ایک شخص آئے گا جو بوٹ میں آنے والوں کو پرنس شومبی کے جہاز تک لے جائے گا۔ میں نے چھنا کو آنکھ مار کر اسے تیار رہنے کا اشارہ کیا اور ٹارچ کا رخ کنارے کی طرف کرکے اسے تین مرتبہ جلایا بجھایا۔

تیسری مرتبہ میں نے ٹارچ بجھائی ہی تھی کہ ساحل کی تاریکی سے ایک ہیولا بوٹ پر کود آیا۔ بوٹ کنارے سے کافی فاصلے پر تھی اور ہیولے کی جسامت دیکھتے ہوئے مجھے اس کا بوٹ پر کود آنا کسی حد تک ناقابل یقین لگا کیونکہ وہ پورا ہاتھی کا ہاتھی تھا۔ چالیس فٹ لمبی بوٹ بھی اس کے وزن سے ڈول کر رہ گئی تھی۔

وہ ہیولا دھپ دھپ کرتا سیدھا ڈیک ہاؤس میں آگیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اسے دیکھ کر چھنا کا ردعمل کیا ہوا۔ البتہ میں ضرور کئی لمحے کے لیے دم بخود رہ گیا' وہ دراصل مرد نہیں عورت تھی اور اتنی بھیم شحیم عورت میں نے زندگی میں پہلی بار دیکھی تھی۔ اس کا قد کم از کم چھ فٹ' رنگ الٹے توے کی طرح سیاہ' آنکھیں انگارے کی طرح سرخ اور صورت انتہائی بھیانک تھی۔ افریقی معیار حسن سے شاید اس کے نین نقش سرمایہ نگاہ عاشقاں رہے ہوں لیکن کم از کم میں نے خواب میں بھی اتنی بھیانک شکل نہیں دیکھی تھی۔

پہلی نظر میں وہ عورت نہیں کسی الف لیلوی جن کی مادہ معلوم ہوتی تھی۔ موٹے موٹے ہونٹ بھینس کی طرح لبوترا منہ اور بھینس ہی کے دانتوں جیسے باہر کو جھانکتے ہوئے چوڑے چوڑے دانت' اس کی بھنویں کسی گبھرو پٹھان کی پلی ہوئی مونچھوں سے بھی زیادہ موٹی تھیں اور پلکیں جیسے تھی ہی نہیں۔ پلکوں سے محروم سرخ انگارہ سی آنکھیں مینڈک کی آنکھوں کی طرح باہر کو ابھری ہوئی تھیں۔ پیشانی سے کافی اوپر تک بال نہیں تھے۔ سر کے وسط سے بال شروع ہوتے تھے اور وہ بھی محض بھیڑ کی اون کی طرح کھوپڑی سے چپکے ہوئے تھے۔

اس کے بازو شہتیر اور ہاتھ بیلچے سے مشابہ تھے۔ اس نے اسکرٹ نما جو ایک ڈھیلا ڈھالا لبادہ پہن رکھا تھا' وہ محاورتاً نہیں حقیقتاً بڑے سائز کے ایک خیمے کے برابر تھا۔ اس کے پیروں میں چمڑے کے بوٹ تھے جو یقیناً کسی کاریگر نے خاص طور پر اس کے لیے تیار کیے ہوں گے۔ کم از کم ہندوستان کی کسی دکان پر اس کے سائز کے جوتے دستیاب نہیں ہوں گے۔

اس کا سراپا جائزہ لے کر میں نے چھنا کی طرف دیکھا' وہ دیوار گیر بستر پر بیٹھا ایک ٹک اسی عفریت زادی کی طرف دیکھ رہا تھا مگر مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس کی آنکھوں میں خوف کی جھلک کی بجائے دلچسپی کی چمک تھی۔

میں ایک بار پھر عورت کی طرف متوجہ ہوگیا جو اس دوران متلاشی نظروں سے ڈیک ہاؤس کے گوشے گوشے کا جائزہ لے رہی تھی' پھر اس کی نظر مجھ پر مرتکز ہو گئی' میں اس سے چند فٹ کے فاصلے پر ہی کھڑا تھا۔

"لڑکی کہاں ہے؟" دفعتاً" ڈیک ہاؤس میں جیسے نقرئی گھنٹیاں گونج اٹھیں۔ سوال انگریز میں کیا گیا تھا اور آواز ایسی ترنم ریز تھی کہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ اس عفریت

زادی کے حلق سے برآمد ہوئی ہوگی۔ لہجہ اتنا شستہ اور لفظ اتنا بے عیب تھا کہ مجھے کالج کے زمانے کی اپنی پروفیسر موہنی شانتا رام یاد آگئیں جنہوں نے آکسفورڈ میں تعلیم پائی تھی اور اب تک وہاں ٹاپ کرنے والی تین ہندوستانی طالب علموں میں سے ایک تھیں۔

"لڑکی؟" میں نے بے مقصد سے لہجے میں دہرایا۔ میں سوچ رہا تھا کہ شاید وکرم نے کسی غلط فہمی کی بنا پر یا پھر ہوش و حواس ٹھکانے نہ ہونے کی وجہ سے مجھے بتا دیا تھا کہ فیروشیا کوئی مرد ہے ورنہ درحقیقت وہ یہی عورت ہوگی۔

"تم فیروشیا ہو؟" میں نے سنبھل کر پوچھا۔

"فیروشیا کو تو میں باندھ کر اس کے کمرے میں ڈال آئی ہوں۔" اس نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔ "اس سے یہ معلوم کرنے کے لیے مجھے اس کے دو دانت توڑنے پڑے کہ آج رات پرنس کے لیے کچھ لوگ بوٹ میں ایک نئی لڑکی لے کر آرہے ہیں جس کے لیے پرنس دیوانہ ہوا پھر رہا ہے۔ مجھے شام ہی سے پرنس اور فیروشیا کی پراسرار سی حرکات و سکنات دیکھ کر شک پڑ رہا تھا کہ ایک بار پھر دال میں کچھ کالا ہے۔ اس لیے میں نے پرنس کے گھر سے نکلتے ہی فیروشیا کو دبوچ لیا تھا۔"

"مگر خاتون تم ہو کون؟" میں نے قدرے بلند آواز میں پوچھا۔ میرے حواس اب صحیح طور پر کام کرنے لگے تھے۔

"ہرہائی نس لیڈی سنتالا آف نکاراگوچی۔" اس نے بڑے وقار سے کہا۔ "پرنس شومبی کی بیوی.....مجھے بہت عرصے سے خبریں مل رہی تھیں کہ نکاراگوچی کی لڑکیوں سے دل بھر جانے کے بعد پرنس نے ہندوستان کو اپنی عیاشیوں کا مرکز بنا لیا ہے۔ اس لیے اس مرتبہ وہ نکاراگوچی سے آنے لگا تو میں بھی اس کے ساتھ چلی آئی۔ میں اب مزید برداشت نہیں کر سکتی کہ وہ مہینوں میری طرف پلٹ کر بھی نہ دیکھے اور دنیا بھر کی نت نئی لڑکیوں کے ساتھ وقت گزارتا پھرے۔ مجھے معلوم ہے کہ شہزادوں وغیرہ کی بیویوں کے لیے ان کے شوہروں کی عیاشی کی خبریں کسی خاص اشتعال کا باعث نہیں بنتیں کیونکہ وہ خود بھی اس قسم کی سرگرمیاں شروع کرکے اپنے اشتعال کا گلا گھونٹ لیتی ہیں لیکن مصیبت یہ ہے کہ میں اس قسم کی جوابی کارروائی بھی نہیں کر سکتی۔ اچھے بھلے مرد مجھے دیکھ کر چیخیں مارتے ہوئے بھاگ جاتے ہیں۔ شروع شروع میں تو خود پرنس کا یہی حال ہوتا تھا....."

"پھر اس نے آپ سے شادی کیسے کرلی؟" بے ساختہ میری زبان پر یہ سوال آگیا۔

"کیونکہ میرے خاندان کی بدولت ہی اس کے خاندان کی بادشاہت قائم ہے۔" لیڈی سنتالا یعنی مسز شومبی نے نخوت سے جواب دیا۔ "اور انہیں شاہی خاندان کا رتبہ بھی میرے ہی آباؤ اجداد نے دلایا ہے ورنہ یہ لوگ تو معمولی لوہار تھے۔ میرے دادا برٹش آرمی میں کمانڈر جنرل تھے۔ انہوں نے بغاوت کی' اپنے خاندان اور وفادار ساتھیوں میں سے سینکڑوں

کی جانوں کی قربانی دی اور انگریزوں کا تختہ الٹ کر راتوں رات پرنس شومبی کے دادا کو تخت پر بٹھا دیا اور مشہور کر دیا کہ وہ شہزادے ہیں اور نکاراگوچی کے تخت کے اصل وارث ہیں۔"

"تو اسی لیے پرنس شومبی تمہاری شوہریت کے بوجھ تلے کراہ رہا ہوگا۔" میں بڑبڑایا۔ "اور شاید اسی بے رحمانہ شادی کے ردعمل میں وہ اتنا بے راہ رو اور انسانی خواہشات کے معاملے میں مطلق العنان ہوگیا ہوگا۔" لیکن فوراً ہی میں نے سوچا کہ اس کے حالات میں ان لڑکیوں کا تو کوئی قصور نہیں تھا جو اس طرح کسی کے ہاتھ بکی بھی نہیں تھیں مگر انہیں بھی نہ صرف اس کی اور اس کے ساتھیوں کی بربریت و حیوانیت کا نشانہ بننا پڑا تھا بلکہ زندگی سے بھی ہاتھ دھونے پڑے تھے۔

میری بڑبڑاہٹ عفریت زادی کی سمجھ میں نہ آئی تو وہ کچھ اور آگے کو آگئی۔ "کیا کہا تم نے؟" اس نے ایک بار پھر مسکرانے کی کوشش میں اپنی شکل کو اور زیادہ بھیانک بنا لیا۔

"کچھ نہیں....." میں نے نفی میں سر ہلایا۔

"میں نے اتنی باتیں کر ڈالیں' اپنے اور پرنس کے متعلق' سب کچھ بلاکم و کاست بتا دیا۔ اب تم بھی بتا دو کہ لڑکی کو تم نے کہاں چھپا رکھا ہے؟" اپنی دانست میں وہ بڑی لگاوٹ سے مسکرائی۔ "میں صرف اس کا چہرہ تھوڑا سا بگاڑ کر اسے سمجھانا چاہتی ہوں کہ دولت کے عوض اپنا آپ نہیں بیچا کرتے۔"

"اور فرض کرو کہ وہ اپنی مرضی سے نہ آئی ہو' اسے اغوا کرکے لایا گیا ہو تو پھر تم کس کا چہرہ بگاڑو گی؟" میں نے تلخی سے پوچھا۔

"اغوا کرنے والوں کا۔" اس نے بلاتامل جواب دیا۔ "اب تم کہو گے کہ اصل ذمہ دار تو پرنس ہوتا ہے تو تمہاری اطلاع کے لیے بتا دوں کہ اس کا چہرہ تو میں اکثر بگاڑتی ہی رہتی ہوں۔ آج بھی وہ باہر کہیں اپنے کسی ٹھکانے پر لڑکی کا انتظار کرتے کرتے مایوس ہو کر جب گھر واپس آئے گا تو میں خوابگاہ میں گھونسوں اور لاتوں سے اس کا استقبال کروں گی۔"

"خیر.....یہ تمہارا گھریلو معاملہ ہے کہ تم اس کا استقبال کس طرح کرتی ہو۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "بہرحال تمہاری گفتگو سے مجھے یہ سبق ملا ہے کہ شہزادہ بن کر بھی انسان کو بیوی کے مظالم سے نجات نہیں۔" پھر میں یک لخت بہت زیادہ سنجیدہ ہوگیا۔ "تاہم تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اس بوٹ پر کوئی لڑکی نہیں ہے [illegible] ہی ہم کسی پرنس شومبی وغیرہ سے ملنے آئے ہیں۔ ہمارا دھندہ تو ادھر کا مال ا[illegible] ہم اپنے ایک ساتھی کی تلاش میں ہیں جو لانچ لے کر کہیں غائب ہوگیا ہے۔"

"زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں۔" عفریت زادی کی آواز سے یک لخت ترنم غائب ہوگیا اور تیوری چڑھ گئی۔ "اگر تم وہی آدمی نہ ہوتے جس کا پرنس کو انتظار ہے تو تم

کبھی بوٹ ہاؤس میں آکر نہ رکتے' ٹارچ سے تین مرتبہ سگنل نہ دیتے اور فیروشیا کا نام نہ لیتے۔ خیر.... تم مت بتاؤ' میں خود دیکھ لیتی ہوں۔"

ہرہائی نس لیڈی سنتالا آف نکاراگوچی یک لخت بپھری ہوئی ہتھنی بن گئی۔ اس نے وہ دیوار گیر بستر الٹ دیا جس پر چھنا بیٹھا تھا۔ چھنا کچھ دور جا گرا اور ایک کہنی کے بل وہیں لیٹ گیا۔ اس کے تاثرات میں کوئی خاص فرق نہ آیا۔ وہ اب بھی اسی طرح عفریت زادی کی حرکات و سکنات دیکھ رہا تھا جیسے اس کے سامنے کوئی دلچسپ فلم چل رہی ہو۔

غصے سے پھنکارتے ہوئے وہ ہر چیز کو اٹھا کر ادھر سے ادھر پھینکنے لگی۔ چند ہی لمحوں میں اس نے کیبن کی ہر چیز کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ عجیب الٹے دماغ کی عورت تھی۔ بوٹ میں لڑکی کا کوئی نام و نشان نہ پا کر اس کا غصہ ٹھنڈا ہونے کے بجائے بھڑکتا جا رہا تھا۔

"ہرہائی نس!" بالآخر میں نے عقب سے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "لڑکی بہرحال لڑکی ہوتی ہے' لکڑی کا کوئی ٹکرا نہیں جسے کونے کھدرے میں پھینک کر اوپر سے اس پر کاٹھ کباڑ ڈال دیا جائے اور نہ ہی اسے جیب میں چھپایا جا سکتا ہے۔ اب آپ یہ ہڑبونگ ختم کریں اور گھر جا کر آرام سے سوئیں۔"

"بکواس مت کرو۔" وہ غرائی اور نہایت غیر متوقع طور پر اس نے گھومتے ہوئے مجھے الٹے ہاتھ کا تھپڑ رسید کر دیا۔ کچھ دیر پہلے اس کے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے میرے ذہن میں ان کے لیے بیلچوں کی تشبیہ غلط نہیں آئی تھی۔ مجھے یہی محسوس ہوا کہ میرے رخسار اور کنپٹی پر کسی نے بیلچہ پوری قوت سے گھما کر مار دیا ہے۔ میں چوبی دیوار سے جا ٹکرایا اور آنکھوں کے سامنے پھیلتی تاریکی سے مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ اب میں چکرا کر گر جاؤں گا لیکن میں نے فوراً ہی سانس روک کر سر جھٹکا' پھر یوگا کے ایک خاص انداز کے تحت کئی گہری گہری سانسیں لیں۔

وہ گھونسہ بلند کیے میری طرف آ رہی تھی۔ "سچ سچ بتاؤ کہ لڑکی کو تم نے کہاں چھپا رکھا ہے؟" اس کی آواز اب نہایت کریہہ محسوس ہو رہی تھی۔ "اس بوٹ میں ضرور کہیں کوئی خفیہ خانہ ہے' جلد بتاؤ وہ کہاں ہے۔ دلال کے بچے!" اس نے آ کر بائیں ہاتھ سے میرا گریبان پکڑ لیا اور دایاں ہاتھ گھونسے کی شکل میں میرے چہرے کے سامنے لہرانے لگی۔ مجھے یقین تھا کہ اس کا ایک ہی گھونسا آدمی کی شکل بگاڑ سکتا تھا۔

اب میرے اندر غصے کا ابال اٹھ رہا تھا جو میری کنپٹیوں میں مرتکز ہو رہا تھا۔ میری پیشانی گھڑی کی طرح ٹک ٹک کرنے لگی تھی۔ شاید اس کے وسط میں کوئی رگ پھڑک رہی تھی۔ اس عفریت زادی نے مجھے خاموش پا کر گھونسہ بلند کیا اور جیسے ہی اس کا بازو نیچے آنے لگا' میں نے اسے ہاتھ پر روک لیا۔ اس کی کلائی پوری طرح تو میری گرفت میں نہ آئی لیکن جتنی آئی تھی' اتنی ہی کافی تھی۔ میں نے اسے بس طاقت سے گرفت میں لیا تھا'

اس سے ایک بار تو اس عفریت زادی کو بھی گمان گزرا ہو گا کہ اس کی کلائی شاید کسی آہنی شکنجے میں پھنس گئی ہے کیونکہ میں نے اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار دیکھے تھے۔

دائیں ہاتھ سے میں نے اس کے پیٹ سے ذرا اوپر ایسے حصے پر پوری طاقت سے گھونسہ رسید کیا جہاں عام آدمی کو اگر اس طرح گھونسہ پڑ جاتا تو وہ خون تھوکتے ہوئے وہیں پھڑک کر رہ جاتا وہ ہتھنی کی بچی بھی اپنی جگہ سے اچھل پڑی اور اس کے جوتوں کی دھمک کیبن میں گونج کر رہ گئی۔ اس نے ابکائی سی لی اور پہلے سے زیادہ غضبناک ہو کر اپنی کلائی چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔

دوسرا گھونسہ میں نے اس کی کنپٹی پر رسید کیا۔ وہ لڑکھڑائی مگر فوراً ہی سر جھٹک کر اس طرح سنبھل گئی جیسے میں نے سنبھالا لیا تھا۔ اس عورت کی کلائی قابو میں رکھتے ہوئے مجھے دانتوں پسینہ آنے لگا تھا۔ اس کا بایاں بازو آزاد تھا۔ میرا گریبان اس کے ہاتھ سے چھوٹ چکا تھا۔ یہی بازو گھما کر اس نے میرے منہ پر تھپڑ رسید کرنا چاہا لیکن میں بروقت جھک گیا۔ اس کا ہاتھ چوبی دیوار پر پڑا اور وہ بلبلا کر رہ گئی۔

وہ پیچھے کو لڑکھڑائی۔ اگر میں نے اس لمحے اس کی کلائی نہ چھوڑ دی ہوتی تو میں بھی اس کے اوپر جا گرتا۔ وہ کاٹھ کباڑ پر ڈھیر ہونے کے بعد بھی اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی اور اپنا بڑا سا سر بار بار جھٹک رہی تھی مگر پھر وہ بے بسی سے ساکت ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی جیسے کائنات بھی ساکت ہو گئی۔ اس کی اچھل کود اور زور آزمائی سے جیسے بوٹ پر بھونچال آیا ہوا تھا۔

گوشت کے اس پہاڑ کو غصے میں ایک ٹھوکر رسید کر کے میں مڑا تو درمیانی دروازے میں چھنا کھڑا نظر آیا۔ وہ تحسین آمیز نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔

"واہ صاحب واہ!" وہ مسحور سے لہجے میں بولا۔ "تھی تو عورت مگر اسے زیر کرنا آپ جیسے شہ زوروں ہی کا کام تھا۔ وہ تو قریب آنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ ایک بار سوچا کہ پسلیوں میں چاقو گھونپ کر اس کا کام تمام کر دوں۔ پھر یہ سوچ کر رک گیا کہ شاید آپ اس کا مارا جانا پسند نہ کریں۔ اگر اسے ہلاک ہی کرنا ہوتا تو غالباً آپ خود ہی کوئی ہتھیار استعمال کر لیتے۔" اس نے یقیناً میری جیکٹ کی جیبوں کے ابھاروں سے ریوالوروں کی موجودگی کا اندازہ لگا لیا تھا۔

"مل کر اسے کسی نہ کسی طرح ڈیک کے کنارے تک لے چلتے ہیں۔" چھنا نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔ "ڈیک کے کنارے سے ساحل تک میں تختہ لگا دوں گا اور اسے تختے پر لڑھکا دیں گے۔ قسمت اچھی ہوئی تو کنارے پر پہنچ جائے گی ورنہ پانی میں ڈبکیاں کھا کر خود ہی ہوش میں آ جائے گی اور نکل جائے گی۔"

ہم نے یہی طریقہ استعمال کیا' بمشکل تمام اسے گھسیٹتے ہوئے ڈیک کے کنارے تک

لائے' پھر تختہ رکھ کر اس پر لڑھکا دیا۔

میں نے اپنا بریف کیس اور چھنا نے ٹارچ سنبھالی اور ہم بھی تختہ ہی کے ذریعے کنارے پر اتر آئے۔ چھنا نے بوٹ کو رسی کی مدد سے پل سے باندھ دیا تھا۔ جزیرے پر پہنچ کر چند منٹ کی تلاش کے بعد ہی ہمیں وہ گاڑی مل گئی جس میں مسز شومبی یہاں آئی تھی۔ یہ سفید رنگ کی ایک کنور ٹیبل آلٹر تھی۔ مسز شومبی ایسی ہی گاڑی میں سفر کر رہی تھی۔ بند چھت والی گاڑی میں داخل ہونا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔

مسز شومبی کو ہم نے وہیں پڑا رہنے دیا اور خود گاڑی لے کر اندازاً" اس پختہ پٹی کی تلاش میں چل پڑے جو رن وے کا کام دیتی تھی۔ میں نے وقت دیکھا پونے دو بج رہے تھے۔ وکرم نے بتایا تھا کہ اسے روپا کو لے کر دو بجے جزیرے پر پہنچنا تھا' گویا ہم وقت سے کچھ پہلے ہی پہنچ گئے تھے جس کا مطلب تھا کہ ہم اطمینان سے رن وے تلاش کر سکتے تھے۔

رن وے تلاش کرنے میں ہمیں زیادہ دیر نہیں لگی۔ ہم کنکریٹ کی ایک پختہ پٹی پر آپہنچے تھے جو ہمارے دائیں بائیں دور تک پھیلی نظر آرہی تھی۔ میں نے گاڑی روک کر دونوں طرف نظر دوڑائی' طیارے کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ البتہ سڑک دونوں طرف سے دائرے میں گھوم رہی تھی اور اس دائرے کے درمیان بھی چونکہ جھاڑیوں اور اونچے اونچے درختوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا' اس لیے یہ دیکھنا مشکل تھا کہ سڑک کے گھماؤ سے آگے کیا ہے۔ میں نے بغیر کسی اندازے کے گاڑی دائیں طرف موڑ دی۔ رن وے کا نیم دائرہ طے کرتے ہی مجھے طیارہ نظر آگیا۔ تاروں کی مدھم روشنی میں اس کے وہ حصے چمک رہے تھے جن پر پینٹ نہیں تھا اور اس کے دونوں طرف سرخ بتیاں جل بجھ رہی تھیں۔ میں نے غیر ارادی طور پر فوراً" بریک لگا دی کیونکہ طیارے کا رخ ہماری طرف تھا اور ہیڈ لائٹس کی روشنی اس کے پہیوں پر پڑ چکی تھی اور طیارے میں موجود افراد یقینی طور پر ہماری گاڑی کو دیکھ چکے تھے۔



میرا ایک ہاتھ اسٹیئرنگ پر اور دوسرا جیب میں موجود مشین پسٹل پر تھا۔ چند لمحے یونہی گزر گئے۔ پھر میں نے گاڑی رن وے سے ہٹا کر جھاڑیوں کے قریب جا روکی۔ اس دوران طیارہ بدستور سکوت میں ڈوبا رہا۔ طیارے کے ساتھ الومنیم کی ہلکی سیڑھی لگی ہوئی تھی اور میری نظر اسی پر تھی۔ میں نے گاڑی کی لائٹیں بجھا دیں البتہ انجن اسٹارٹ رہنے دیا۔

چند لمحے بعد میں نے طیارے کی سیڑھی پر ایک ہیولا نمودار ہوتے دیکھا۔ یہ چھریرے جسم کا کوئی دراز قد شخص تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سوٹ کیس بھی نظر آرہا تھا۔ سیڑھی سے اتر کر وہ بڑے مطمئن اور پروقار انداز میں گاڑی کی طرف آنے لگا۔ وہ قریب آپہنچا تو میں نے دیکھا' وہ تھری پیس سوٹ میں ملبوس ایک دبلا پتلا اور لمبا افریقی نوجوان تھا۔ اس کے رخساروں کی ہڈیاں بدنمائی کی حد تک ابھری ہوئی تھیں' تاہم موٹی موٹی آنکھیں خاصی دلکش تھیں۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس کے ایک ہاتھ میں چھوٹی سی ٹارچ بھی موجود تھی' اس لیے جب اس نے قریب آکر اچانک میرے چہرے پر روشنی ڈالی تو میں گڑبڑا سا گیا لیکن ساتھ ہی میں نے محسوس کیا کہ مجھ سے زیادہ وہ خود گڑبڑا گیا ہے۔

"وکرم کہاں ہے؟" اس نے اضطراری طور پر پوچھا۔ اس کی انگریزی میں فرانسیسی لب و لہجے کی جھلک تھی۔

"مجھے وکرم نے ہی بھیجا ہے۔" میں نے سنبھل کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"فیروشیا کے بغیر تم یہاں کیسے آپہنچے؟" اس نے چھنا کی طرف ایک نظر دیکھ کر گاڑی کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "اور یہ میری بیوی کی گاڑی تمہارے پاس کیسے نظر آرہی ہے؟"

اب تعارف کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ میرا اندازہ درست ہی نکلا کہ وہ پرنس شومبی ہے۔ یہ تصور کرکے مجھے عجیب سا احساس ہوا کہ بیوی کے ساتھ اس کی جوڑی کیسی لگتی ہوگی۔ ڈھول اور چھڑی ہی کی مناسبت تھی ان میں۔ آہ بیچارہ شومبی! ایک لمحے کے لیے مجھے اس سے ہمدردی محسوس ہوئی لیکن اس کے کرتوت یاد کرتے ہی اس ہمدردی کی جگہ غصے نے لے لی۔

"تھوڑی سی گڑبڑ ہو گئی تھی۔" میں نے اب نہایت پرسکون لہجے میں کہا۔ "آپ کی

بیوی نے فیروشیا کو قابو کرکے اس سے معلوم کر لیا تھا کہ آج آپ کے لیے کوئی تحفہ پہنچنے والا ہے' اس لیے ساحل پر فیروشیا کے بجائے وہ خود ہی ہمارے استقبال کے لیے موجود تھی۔"

"اوہ.....یہ تو بہت برا ہوا۔" شومبی کی آواز سے میں نے محسوس کیا کہ اس کے جسم میں ایک لمحے کے لیے کپکپی سی آگئی تھی۔ اگر اس کی رنگت اتنی سیاہ نہ ہوتی اور وہاں روشنی کچھ زیادہ ہوتی تو شاید اس کی رنگت کا تغیر بھی نظر آجاتا۔

"مجبوراً ہمیں ان کے ساتھ تھوڑی سی بدتمیزی کرنی پڑی۔" میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

"کیا تم نے اسے گولی مار دی؟" اس نے خوفزدہ لہجے میں پوچھا لیکن اس لہجے کی تہہ میں ایک ہلکی سی امید بھی پنہاں تھی۔

"نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "ہم نے انہیں صرف بے ہوش کیا ہے' اسی لیے ان کی گاڑی ہمارے پاس نظر آرہی ہے۔"

اس نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔ "تم اسے بے ہوش نہیں کر سکتے' تم نے یقیناً کوئی ہتھوڑا استعمال کیا ہوگا۔" اس نے خیال ظاہر کیا۔

"اس بحث کو چھوڑیے کہ ہم نے کیا استعمال کیا اور کیا نہیں۔" میں نے قدرے بیزاری سے کہا۔ "اور کام کی بات کیجیے۔ کیا آپ اب بھی لڑکی کو لے کر افریقہ کی طرف پرواز کرنے کے لیے تیار ہیں؟"

"اب تو یہ اور بھی ضروری ہو گیا ہے۔" اس نے خودکلامی کے سے لہجے میں کہا۔ "جب تک سنتالا کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہو جاتا' میں اس کا سامنا نہیں کر سکتا۔ لڑکی کہاں ہے؟"

"بوٹ ہی میں ہے۔" میں نے کہا۔ "آپ رقم لے کر آئے ہیں؟"

"ہاں۔" اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا سوٹ کیس قدرے بلند کرکے مجھے دکھایا۔ "لیکن تم لڑکی کو بوٹ میں کیوں چھوڑ آئے ہو؟ وہیں آس پاس سنتالا بھی ہوگی۔"

"ہم نے احتیاطاً ایسا کیا ہے۔" میں نے کہا۔ "اپنی بیوی کی آپ فکر نہ کریں' وہ ساحل سے کافی فاصلے پر ہیں اور کم از کم ایک گھنٹے تک ہوش میں نہیں آئیں گی۔ لڑکی بھی بے ہوش ہے۔ آپ اسے اسی گاڑی میں ڈال کر لے آیئے گا۔ ہم وہیں سے رخصت ہو جائیں گے۔ تشریف رکھیے۔" میں نے ہاتھ بڑھا کر پچھلا دروازہ کھولا۔

اس نے ایک لمحے کے لیے کچھ سوچا' پلٹ کر طیارے کی طرف دیکھا۔ پھر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ سوٹ کیس اس نے اپنے پیروں کے قریب رکھ لیا۔ میں گاڑی کو رن وے پر لے آیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہاں آنے کا صحیح راستہ کونسا تھا' میں نے گاڑی کو یو ٹرن دے

کر رفتار بڑھا دی۔ پرنس نے راستہ بتانے کی کوشش نہیں کی۔ میں یا تو صحیح راستے کی طرف جا رہا تھا یا پھر پرنس اپنے ہی خیالات میں کھویا ہوا تھا۔

طیارہ عقب میں ہماری نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ ایک جگہ مجھے جھاڑیوں اور درختوں کے درمیان پگڈنڈی نظر آئی۔ میں نے گاڑی رن وے سے اتار کر اسی طرف موڑ دی۔ پرنس اب بھی کچھ نہ بولا۔ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں چھنا کو اشارہ کیا اور چند لمحے بعد ایک مناسب سی جگہ دیکھ کر ایکسیلیٹر کو خاص انداز میں استعمال کرتے ہوئے گاڑی کو پے در پے کئی جھٹکے دیئے اور پھر انجن بند کر دیا۔

پرنس اب چونک کر میری طرف متوجہ ہو چکا تھا۔

"شاید انجن میں کچھ خرابی ہو گئی ہے۔" میں نے ناگواری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا اور دروازہ کھول کر اترتے ہوئے پوچھا۔ "کیا ڈکی میں کچھ ٹولز وغیرہ موجود ہیں؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" اس نے جواب دیا۔ میں نے مزید وقت ضائع نہیں کیا اور گاڑی سے اترتے ہی اس کے منہ پر گھونسا رسید کیا۔ وہ پچھلی سیٹ پر ڈھیر ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی آواز نکالتا' میں نے جھک کر اسے گریبان سے پکڑ کر کھلی چھت کی گاڑی سے باہر کھینچ لیا۔ اس کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئی تھیں اور نچلا ہونٹ پھٹ چکا تھا۔ اس کے حلق سے **گھگھیانی** ہوئی سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ مجھے حیرت ہوئی کہ عورتوں کے معاملے میں اتنا درندہ صفت نوجوان اس قدر چھوٹے دل کا مالک تھا۔

اس کے ہاتھ تھر تھر کانپ رہے تھے اور وہ ان کے پیچھے چہرہ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید وہ چیخنا بھی چاہتا تھا مگر آواز ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے میرا جی چاہا کہ اس کی پتلی سی گردن ایک جھٹکے سے توڑ دوں لیکن اپنے آپ پر ضبط کرتے ہوئے میں نے اس کی کنپٹی پر ہاتھ رسید کیا۔ وہ بے ہوش ہو کر میری گرفت میں جھول گیا۔

چھنا بھی گاڑی سے اتر آیا تھا۔ اس نے پرنس کو دونوں بازوؤں پر سنبھالتے ہوئے کہا۔ "بس صاحب جی! آپ کا کام ختم' میرا کام شروع۔"

میرے کہنے سے پہلے ہی وہ پرنس کو دونوں بازوؤں پر اٹھائے جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔ کچھ دیر بعد میں نے اسے جھاڑیوں سے برآمد ہوتے دیکھا۔ وہ اپنے بٹن والے چاقو کو دھوتی پر صاف کرکے بند کر رہا تھا۔ چاقو دھوتی کی ڈب میں رکھ کر اس نے میری طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے گاڑی میں آبیٹھا۔ میں اس وقت اسٹیئرنگ پر بیٹھا تھا۔

فشنگ ہاربر واپس آکر میں نے چھنا کو اس کے گھر چھوڑا اور اسے مزید کچھ رقم دینے کی کوشش کی مگر اس نے لینے سے انکار کر دیا اور کہا۔ "آپ پہلے جو کچھ دے چکے ہیں' وہی میری توقعات سے بہت زیادہ ہے۔ اتنے پیسے تو اسمگلر بھی نہیں دیتے' آپ تو پھر بھی ایک نیک کام کرکے واپس آرہے ہیں۔"

”نیک کام کے الفاظ پر میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔“ رخصت ہوتے وقت میں نے کہا۔ ”چھنا! عنقریب مجھے تمہاری ضرورت پڑے گی۔ میں ایک بڑا منصوبہ بنا رہا ہوں‘ اس میں تم بھی میرے ساتھیوں میں شامل ہو گے‘ جلد ہی میں تمہیں لینے آؤں گا۔“

”آپ مجھے ہر وقت تیار پائیں گے۔“ اس نے خلوص دل سے کہا۔ ”میں خود بھی اس دنیا سے نکلنا چاہتا ہوں بشرطیکہ کسی آپ جیسے بہادر اور مخلص دوست کا ساتھ میسر ہو۔“

”تم پروا ہی مت کرو۔“ میں نے اس کا کندھا تھپکا۔ ”میں نے تمہارے اندر چھپا ہوا ہیرا دیکھ لیا ہے۔ جلد ہی مجھے تم جیسے کئی انسانوں کی ضرورت پڑے گی۔“

اسے خدا حافظ کہہ کر میں بریف کیس اور سوٹ کیس اٹھائے اپنی گاڑی تک آیا۔ میں سیدھا تاج محل ہوٹل پہنچا۔ اس وقت صبح کے چار بجنے کو تھے۔ میں روپا کے سوئٹ میں نہیں گیا۔ اس کے بجائے استقبالیہ پر رک کر میں نے اپنے لیے ایک سنگل کمرہ حاصل کیا۔ یہ کمرہ تیسری منزل پر تھا جبکہ روپا کا سوئٹ چوتھی منزل پر تھا۔ پورٹر میرا سوٹ کیس اور بریف کیس چھوڑ کر جا چکا تو میں نے تیزی سے جوتے‘ کپڑے اتار کر پھینکے اور سیدھا باتھ روم میں گھس گیا۔

نہا دھو کر تازہ دم ہو کر میں نے ہوم سروس کو فون کرکے بے وقت ناشتہ منگوایا۔ ناشتہ کرتے ہی مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی لیکن سونے سے پہلے ایک کام کرنا ضروری تھا۔ میں نے فون پر روپا کے سوئٹ کا نمبر ڈائل کیا۔

دوسری طرف سے ریسیور پہلی ہی گھنٹی پر اٹھا لیا گیا لیکن جب روپا کی آواز آئی تو اس میں غنودگی کا بوجھل پن تھا۔ ”ہیلو....“ اس نے پراشتیاق لہجے میں کہا۔

”منصور!“ میں نے نہایت مدھم آواز میں کہا۔

”میں تمہارے انتظار میں سو نہیں سکی‘ کہاں ہو تم؟“ اس نے بے تابی سے پوچھا۔

”تم سے بہت دور۔“ میں نے بدستور مدھم آواز میں کہا۔ ”جو کچھ میں کہوں‘ اسے غور سے سنو اور اس پر عمل بھی کرنا تبھی باقی زندگی سکون سے گزرے گی ورنہ خوامخواہ پریشان رہو گی‘ اپنے زخموں کے ذخیرے میں اضافہ کرتی رہو گی....“ میں نے ایک طویل سانس لی۔ اس دوران روپا نے بولنے کی کوشش کی لیکن میں نے تیزی سے کہا۔ ”صرف میں بولوں گا اور تم سنو گی.... تمہارے لیے ایک اچھی خبر یہ ہے کہ فی الحال تمہارا کوئی دشمن باقی نہیں رہا جو تمہیں کوئی نقصان پہنچا سکے اور بری خبر یہ ہے کہ میں اب واپس نہیں آؤں گا۔ دو چار دن تم اسی ہوٹل میں ٹھہر کر کسی پراپرٹی ڈیلر کے توسط سے کوئی کوٹھی یا فلیٹ خرید لینا اور اس میں منتقل ہو کر بالکل اسی طرح معمول کے مطابق زندگی گزارنا شروع کر دینا جس طرح میری آمد سے پہلے تمہارے شب و روز گزرتے تھے۔ اب ایک اچھا پہلو یہ ہوگا کہ تمہارے ذہن پر کسی جانی دشمن کا خوف نہیں ہوگا۔ تم آرام سے کام پر جا سکو گی‘

آرام سے سو سکو گی اور بے خوفی سے زندگی کے معاملات انجام دے سکو گی۔“

”کیا واقعی تمہارے بغیر میں یہ سب کچھ کر سکوں گی؟“ اس نے میری تمام تر تیز گوئی کے باوجود یہ کہنے کا موقع ڈھونڈ لیا۔ کہنے کو یہ محض ایک سادہ سا سوال تھا مگر لہجہ و آواز کچھ ایسی تھی کہ میں نے اپنے دل پر غیر جذباتیت کا جو خول چڑھایا تھا‘ چٹخنے لگا اور اس سے لہو رسنے لگا مگر میں اندر ہی اندر اس لہو کو پی گیا۔ اگر میں جذبوں اور ناطوں کو پیروں کی زنجیر بنائے رکھتا تو میں وہ بھاری قرض نہیں چکا سکتا تھا جو زندگی نے میرے ذمے لگا دیا تھا۔

”ہاں.... تم میرے بغیر سب کچھ کر سکو گی۔“ میں نے اپنے لہجے میں ارتعاش پیدا نہیں ہونے دیا۔ ”اور بہت عمدگی سے کر سکو گی۔ کوشش کرو گی تو بہت جلد بھول جاؤ گی کہ تمہاری زندگی میں منصور نامی کوئی شخص آیا تھا....“

”کیا میری زندگی میں پیار کرنے والی ہستیاں صرف اس لیے ہی آتی رہیں گی کہ میرے لہو میں زہر گھول کر‘ میرے دل کو پارہ پارہ کرکے جاتی رہیں اور میں انہیں بھول جانے کی کوشش کرتی رہوں؟“ وہ جیسے پھٹ پڑی۔ اس کا لہجہ ہسٹرائی ہو گیا اور آواز آنسوؤں میں بھیگ گئی۔ ”پہلے میں نے اپنی ماں کو بھلایا‘ باپ کو بھلایا‘ آنکھوں سے محروم ہو جانے والے شوہر کو بھلا دیا‘ **نمونیے** میں بغیر دوا کے مرجانے والے بچے کو بھلایا....دل پر لگنے والے ہر زخم کو بھلایا....اور اب تم کہتے ہو کہ میں تمہیں بھی بھول جاؤں....مجھے نفرت ہے اس لفظ ”بھول“ سے....“ اس کی آواز ہچکیوں میں ڈھل گئی۔ میں خاموش بیٹھا تھا۔

وہ میرے کمرے سے ایک منزل اوپر اور شاید کمرے کے عین اوپر ہی بلک رہی تھی‘ آنکھوں سے لہو بہا رہی تھی۔ مجھ سے ایسے سوال کر رہی تھی جن کے جواب مجھے آتے ہی نہیں تھے۔ میں اپنے اور اس کے درمیان حائل ایک چھت کے فاصلے کو آسمان اور زمین کے درمیان دوری میں تبدیل کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ میری کوشش کو ناکام بنانے کے درپے تھی مگر میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ مجھے اس آزمائش سے سرخرو نکلنا ہے کیونکہ یہ میری اس تربیت کا پہلا مرحلہ تھا جو مجھے آئندہ کے لیے درکار تھی۔ اگر میں پہلے مرحلے پر ہی کمزور پڑ جاتا تو آئندہ اپنے آپ سے کوئی اچھی توقع نہیں رکھ سکتا تھا۔

”مجبوری ہے روپا!“ میں نے اب بھی حتی الامکان ہموار لہجے میں کہا۔ ”ہزاروں عفریت میرے تعاقب میں ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تم بھی کسی مصیبت میں پڑو۔“

”اتنی پرتکلف گفتگو کرنے سے بہتر ہے کہ تم اپنا منہ بند ہی رکھو۔“ یہ کہہ کر اس نے کھٹ سے فون بند کر دیا۔ یہ شاید زندگی کے ایک اور پرخلش باب کا اختتام تھا۔ معلوم نہیں زندگی اب کبھی اس باب کے اعادے کی مہلت دیتی یا نہیں۔“

میں چند لمحے خاموشی سے ریسیور ہاتھ میں تھامے خالی الذہنی کے سے عالم میں اسے

گھورتا رہا۔ پھر آہستگی سے اسے کریڈل پر رکھ کر اسی آہستگی سے بستر پر لیٹ گیا۔

صبح اٹھ کر میں عقبی دروازے سے ہوٹل سے نکلا اور گاڑی میں جا بیٹھا۔ اسٹارٹ کرنے کے بعد میں نے گاڑی سیدھی ہی کی تھی کہ ایک گھٹیا قسم کے چائے خانے سے ایک شخص گویا گرتا پڑتا نکلا اور گاڑی کے سامنے سے گزرتے ہوئے گلی عبور کرنے لگا۔ اس کے لمبے اور مجہول جسم پر ایک اچھا بھلا سوٹ ٹنگا ہوا تھا اور اپنے استعمال پر غالباً کافی شرمندہ نظر آرہا تھا۔ سوٹ ایک تو اس شخص کے جسم پر ڈھیلا بہت تھا' دوسرے اس پر لاتعداد شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ شخص کافی دنوں سے سلیپنگ سوٹ کا کام بھی اسی سے لے رہا تھا۔

لیکن اصل بات سوٹ' ٹائی یا جوتوں کی نہیں' اس شخص کی تھی جس کے جسم پر یہ سب چیزیں موجود تھیں۔ یہ شخص عاشق علی عرف طبلہ تھا۔ وہ چائے خانے کے مالک کو کچھ ریزگاری دے کر نکلا تھا مگر یوں حواس باختہ نظر آرہا تھا جیسے عدم ادائیگی کی وجہ سے چائے خانے والے نے اسے دھکے دے کر دکان سے نکالا ہو۔

میں نے گاڑی روکی اور اتر کر اس کے قریب پہنچا۔ "کیا حال ہے طبلہ؟" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ اچھل پڑا۔

"اوہ..... تم ہو۔" اس نے اطمینان کی ایک طویل سانس لی۔

"کیا بات ہے' ایک عرصے سے کہیں نظر نہیں آئے۔" میں نے کہا۔ "اسٹوڈیو میں بھی صورت دکھائی نہیں دی۔"

"یہ سالا بمبئی شہر ہی ایسا ہے پیارے۔" اس نے پہلے سے بھی زیادہ طویل سانس لی۔ "ایک مرتبہ جس کا ہاتھ چھوٹ گیا' سو چھوٹ گیا۔ پھر وہ دوبارہ مشکل سے ہی نظر آتا ہے۔ خاص کر یہ اپنی فلمی دنیا میں تو اتنی چکاچوند ہے کہ سامنے کھڑے ہوئے آدمی کی شکل بھی پہچانی نہیں جاتی۔"

"طنز کر رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔ "کیا کبھی ایسا اتفاق ہوا ہے کہ اسٹوڈیو میں' میں نے تمہیں دیکھا اور پہچانا نہیں؟"

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔" اس نے اپنائیت سے بازو میری کمر میں حائل کر دیا۔ "میں تو ایسے ہی ذرا فلسفہ بول رہا تھا..... آج کل فلسفہ پر ہی زیادہ گزارہ ہے۔"

"ہو کیا رہا ہے؟ کیا سرگرمیاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔ "تمہارے جسم پر سوٹ دیکھ کر تو شبہ گزرتا ہے کہ آج کل تمہیں کچھ زیادہ کام مل رہا ہے۔"

"کام تو اچھا خاصا مل رہا ہے یار! اس نے ایک اور آہ بھری۔ "اور ہم آدمی بھی کام کے تھے لیکن اپنی خرمستیوں سے اپنا بیڑہ غرق کر لیا۔ پچھلے دنوں ایک پٹھان سیٹھ کو چکر دے بیٹھا تھا کہ آؤ پارٹنر شپ میں فلم بناتے ہیں۔ میرے انڈسٹری میں ایسے تعلقات ہیں کہ

فلاں ہیرو کو کاسٹ کروں گا تو وہ پیسے ہی نہیں لے گا' فلاں ہیروئن کو سائن کرنے جاؤں گا تو وہ میرے گھٹنے چھوئے گی اور ساری ڈیٹس کینسل کر کے مجھے دے دے گی وغیرہ وغیرہ۔ میں نے شاید اس روز تاڑی پی رکھی تھی' اس لیے خوب واہی تباہی بک رہا تھا مگر وہ سیٹھ چکر میں آگیا....."

میں طبلہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے گاڑی کے پاس لے آیا اور ہم دونوں اس سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔ "پھر کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"ہونا کیا تھا اس بدبخت نے فوراً دو لاکھ روپے میرے قدموں میں رکھ دیئے۔" طبلہ نے یوں ناگواری سے کہا گویا سیٹھ نے روپے اسے نہیں دیئے تھے بلکہ اس سے چھین لیے تھے۔ "اور کہنے لگا کام شروع کرو' میں باقی کا بھی بندوست کرتا ہوں۔" طبلہ خاموش ہو گیا۔

"پھر کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"بس پھر میں نے کام شروع کر دیا۔" اس نے سادگی سے کہا۔ فلسازی کے علاوہ ہر کام ایک سال کا ایڈوانس کرایہ دے کر راج بھون میں دفتر لے لیا۔ قالین اور فرنیچر ڈلوایا جس میں اپنی میز سب سے بڑی بنوائی......" اس نے بات ادھوری چھوڑ کر اچانک پوچھا۔ "یار تمہیں معلوم ہے ہم غریب لوگ غریب ہی کیوں رہتے ہیں؟"

"تمہارا اس سلسلے میں کیا خیال ہے؟" میں نے جواب دینے کے بجائے اسی سے پوچھا۔

"اس لیے کہ ہمارے پاس پیسہ آبھی جائے تو ہمیں ہضم نہیں ہوتا۔" اس نے بلاتامل جواب دیا۔ "دو لاکھ دیکھ کر مجھے یہی گمان گزرا کہ یہ رقم جیسے کبھی ختم ہی نہیں ہوگی۔ بیشتر غریبوں اور ترسے ہوئے انسانوں کی طرح میں نے بھی چار پیسوں پر اختیار حاصل ہوتے ہی سب سے پہلے اپنی وہ حسرتیں پوری کرنی شروع کیں جو مدتوں سے دل میں پل رہی تھیں۔ دفتر میں روزانہ اسکاچ کی بوتل آنے لگی۔ ٹیکسیوں میں سفر شروع ہو گیا۔ کسی ڈھنگ کے ایکٹر یا ایکٹریس کے گھر جانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اس سے پہلے ہی تمام جاننے والی ایکسٹرا لڑکیوں کو بھنک پڑ گئی کہ طبلہ نے کوئی فائنسر پھانسا ہے۔ شہد کی مکھیوں کی طرح وہ سب دفتر میں آن جمع ہونے لگیں۔ اتفاق سے ان میں کئی خوش شکل بھی تھیں۔" طبلہ نے ان میں سے نہ جانے کس کی یاد میں ایک مرتبہ پھر ٹھنڈی سانس لی۔ "اب سب ایکسٹرا گرلز کے ساتھ تقدیر کا ظلم و ستم یک لخت ہی کچھ زیادہ بڑھ گیا۔" طبلہ نے ایک لمحے کے توقف سے کہا۔ "کسی کا باپ اچانک ہی بستر مرگ پر پہنچ گیا' کسی کا بھائی جھوٹے مقدمے میں پھنس کر کسی نامعلوم جیل میں چلا گیا' کسی کی ماں کو یکایک کینسر کے درجے کی کوئی بیماری لاحق ہو گئی' کسی کے مکان کی چھت گر پڑی اور کوئی خود میرے اوپر گر پڑی۔ میرا خیال ہے ان دنوں میں نچلے درجے کا راجہ اندر کہلانے کا مستحق ہو چکا تھا اور جس فیاضی

سے میں قرضے بانٹ رہا تھا' اس سے میں محمد شاہ رنگیلے کا وزیر مالیات معلوم ہوتا تھا۔ ایک روز بالآخر فلم کا نام طے پا گیا۔ "نشانی" نام طے پا جانے کے بعد قدرے فرصت میسر آئی تو سوچا کہ ہیروئن کے طور پر روپا کو سائن کر لیا جائے لیکن عین اسی روز انکشاف ہوا کہ بینک میں صرف پچانوے روپے باقی ہیں یعنی اتنی رقم بھی باقی نہیں بچی تھی کہ سائننگ اماؤنٹ کے طور پر کسی ہیروئن کو دی جا سکتی۔ سیٹھ صاحب حالانکہ تمام خرمستیوں میں میرے ساتھ برابر کے شریک رہے تھے لیکن بینک میں پچانوے روپے باقی رہ جانے کا سن کر آپے سے باہر ہو گئے۔

میں نے انہیں سمجھایا کہ اگر وہ پچاس ہزار کا بندوبست اور کر دیں تو فلم سیٹ پر چلی جائے گی اور اگر کسی ڈسٹری بیوٹر سے بات طے ہو گئی تو قسطیں بھی ملنی شروع ہو جائیں گی مگر سیٹھ صاحب نہیں مانے اور غصے میں ایک ایکسٹرا لڑکی کو بغل میں دبا کر مسوری چلے گئے۔ آج کل وہ یہیں ہیں اور پستول لیے میری تلاش میں گھومتے رہتے ہیں۔ فلم "نشانی" کی آخری نشانی میرے جسم پر موجود یہ سوٹ ہی ہے۔"

"کیا فلم کی کہانی لکھی جا چکی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔" اس نے قدرے شرمیلے لہجے میں کہا۔ "میں نے خود لکھی تھی..... بلکہ کئی سال سے لکھ کر رکھی ہوئی ہے۔ پہلے میں نے اس کا نام "بمبئی بائی نائٹ" رکھا ہوا تھا' پھر میں نے دیکھا کہ ہر چھوٹے موٹے شہر سے تعلق رکھنے والے جن للو پنجو اور نوآموز افسانہ نگاروں کے افسانے اخباروں اور رسالوں میں چھپتے ہیں' ان میں سے ہر ایک ہی اس عنوان سے طبع آزمائی ضرور کر چکا ہے۔ چنانچہ میں نے اپنی کہانی کا نام بدل کر "نشانی" رکھ دیا۔"

"اچھا یہ بتاؤ کہ رہ کہاں رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"اسی کھولی میں۔" اس نے قدرے فخر سے جواب دیا۔ "دراصل وہ کھولی ہی میرا ایک ایسا ٹھکانہ ہے....." اس نے وضاحت کی۔ "جس کا اس پٹھان سیٹھ کو علم نہیں۔"

"اچھا میں چند دنوں تک وہیں تم سے آ کر ملوں گا۔" میں نے کہا۔ "اس سیٹھ کا معاملہ میں خود ہی نمٹا دوں گا اور..... دیکھو..... فلم ضرور بنے گی بلکہ ایک نہیں بہت سی فلمیں بنیں گی۔ ایک بہت بڑی فلم کمپنی قائم ہو گی جس کے ڈائریکٹر تم ہو گے..... سمجھے؟"

"تم تم نے بھی تاڑی پی رکھی ہے؟" طبلہ نے مشکوک نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "جو اسی طرح کی باتیں کر رہے ہو جیسے میں نے اس پٹھان سیٹھ سے کی تھیں؟"

"تمہیں معلوم ہے میں پیتا نہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اور تاڑی پینے کا میں ساری زندگی تصور بھی نہیں کر سکتا۔"

"وہ تو مجھے معلوم ہے۔" اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "میں تو مذاق کر رہا تھا۔"

میں نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ اب میں چلتا ہوں' فی الحال میں تاج محل

میں مقیم ہوں اگر اچانک کوئی ضرورت پڑے تو آ سکتے ہو۔ ویسے میں بہت جلد خود تم سے رابطہ قائم کروں گا..... اور دیکھو اسٹوڈیو وغیرہ میں کہیں روپا سے سامنا ہو تو میرا ذکر نہ آنے پائے۔"

"بہت بہتر۔" اس نے کہا اور کار سے ہٹ کر ایک طرف کو چل دیا۔

ہوٹل پہنچ کر میں نے ہوم سروس کو فون کر کے کھانا منگوایا۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں نے اپنا مشین پسٹل اور سائلنسر والا ریوالور اپنے لباس میں جیبوں میں چھپایا۔ خنجر میری کلائی پر بندھے ہوئے ایک ایسے نیام میں رہتا تھا جسے مخصوص انداز میں جھٹکا دیتے ہی وہ میرے ہاتھ میں آ جاتا تھا۔ ہتھیاروں کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں نے چمڑے کی ٹوپی اور رنگین شیشوں کی عینک اٹھائی' بریف کیس ایک ہاتھ میں لٹکایا اور کمرے سے نکل آیا۔

میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ہوٹل کی پارکنگ لاٹ سے نکل کر سڑک پر آ گیا۔ کچھ دیر بعد گاڑی اس سڑک پر فراٹے بھر رہی تھی جو پونا کو جاتی تھی۔ کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ میں اسی سڑک کے راستے بمبئی آیا تھا۔ اس وقت میں معصوم اور ہونہار طالب علم تھا۔ مختصر سے عرصے میں' میں نہ جانے کیا بن گیا تھا۔ ماضی کے وہ پرسکون شب و روز اور مستقبل کے معصومانہ خواب جانے کہاں کھو گئے تھے۔

میں جب پونا کی حدود میں داخل ہوا' اس وقت رات کے بارہ بجنے کو تھے۔ پہلے پہل مجھے محسوس ہوا کہ یہ شہر میرے لیے اجنبی اور گلی کوچے نامانوس سے ہیں مگر جوں جوں میں اس مکان کی طرف بڑھتا گیا جہاں میں رہا کرتا تھا' توں توں سڑکوں اور گلی کوچوں سے شناسائی اور مانوسیت کی خوشبو پھوٹتی محسوس ہونے لگی۔

وہ گلی جو کبھی اپنی محسوس ہوتی تھی' اس میں داخل ہوتے وقت میری دھڑکنیں کچھ تیز ہوئیں مگر میں نے فوراً ہی سردمہری کا ہتھیار استعمال کر کے انہیں اعتدال پر لانے کی کوشش کی اور اپنے مکان کے سامنے گاڑی روکنے کے بجائے سست رفتاری سے گزرتا چلا گیا۔ مکان کے گیٹ پر تالا پڑا تھا اور باغیچے کی گھاس وغیرہ اتنی اونچی ہو چکی تھی کہ چار دیواری سے باہر جھانکنے لگی تھی۔

مکان میرا اپنا تھا' ممی کا خریدا ہوا تھا مگر میں عقبی دیوار پھلانگ کر چوروں کی طرح اس میں داخل ہوا۔ یہاں ہر طرف وحشت اور ویرانی میری منتظر تھی۔ اس مکان کا فرش کبھی شیشے کی طرح چمکتا تھا۔ اس پر مٹی کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ میں برآمدے ہی میں رک گیا اور ٹارچ بجھا دی۔ کمروں میں سے کسی کا دروازہ کھلا تھا اور کسی کا بند مگر ان میں جانے کی ہمت ہی نہیں پڑی۔ اس گھر کے در و دیوار نے بچپن سے جوانی تک میری زندگی کا تماشا دیکھا تھا اور خاموش رفیق کی طرح میری ہر آہ' میرے ہر آنسو اور میرے ہر قہقہے میں شریک رہے

تھے۔

وہ باغیچہ جس کے ایک حصے میں اکھاڑا تھا اور جہاں چندن بابا نے میری اولین جسمانی تربیت گاہ قائم کی تھی' جھاڑ جھنکار کا مجموعہ بن چکا تھا اور وہاں بکھرے ہوئے خشک پتوں نے اداس چاندنی کا کفن اوڑھ رکھا تھا۔ گلاب اور رات کی رانی کے پودے پانی نہ ملنے سے سوکھ کر کاٹھ کباڑ اور جھاڑ جھنکار ہی میں مدغم ہو چکے تھے۔

میں نے سوچا کہ احتیاط کو بالائے طاق رکھتے ہوئے برآمدے کی بتی جلا لوں کہ شاید وحشت کا احساس کچھ کم ہو سکے لیکن سوئچ کے کھٹکے کا کوئی ردعمل ظاہر نہ ہوا' میں نے دوسرا سوئچ دبایا' پھر تیسرے کو آزمایا مگر کوئی بلب روشن نہ ہوا شاید بتی کٹ چکی تھی۔

خشک پتے اور شکستہ ٹہنیاں میرے قدموں تلے چرچرا رہی تھیں۔ ان پتوں اور ٹہنیوں تلے زمین مجھے بے حد نرم محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے پاؤں سے ایک جگہ سے کباڑ ہٹا کر دیکھا تو اندازہ ہوا کہ یہاں سے زمین حال ہی میں کھودی گئی ہے۔ پھر اسے برابر کرکے دوبارہ خشک پتے وغیرہ اوپر ڈال دیئے گئے ہیں۔ میں نے کئی جگہ سے کوڑا کرکٹ ہٹا کر دیکھا اور خاصی حد تک حیران ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ طویل و عریض باغیچہ سارے کا سارا ہی کھود ڈالا گیا تھا۔

ایسا کون کر سکتا ہے اور کس کو اس کی ضرورت پیش آسکتی تھی؟ یہ سوچتے ہوئے میں فوارے تک پہنچا تو اس کی چار دیواری مسمار شدہ نظر آئی۔ پختہ فرش کھدا پڑا تھا۔ ایک لمحے کے لیے تو میں ششدر رہ گیا۔ اب مجھے امید نہیں رہی تھی کہ ممی کا چھپایا ہوا موٹا خزانہ یہاں باقی رہ گیا تھا لیکن سوال یہ تھا کہ اس پر ہاتھ کس نے صاف کیا؟ ممی نے اپنی ڈائری میں جس انداز میں اس کا تذکرہ کیا تھا' اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ انہوں نے کسی کو اس بات کی بھنک نہیں پڑنے دی کہ انہوں نے اپنی عمر بھر کی جمع پونجی سونے اور جواہرات کی شکل میں منتقل کرکے کہاں چھپائی ہے۔ اس راز میں انہوں نے اپنی قریب ترین اور قابل اعتماد ہستیوں میں سے بھی کسی کو شریک نہیں کیا تھا۔ پھر کوئی یہاں تک کیسے آپہنچا تھا؟

ویسے تو کچھ رقم مجھے وکرم کے بریف کیس سے مل چکی تھی۔ دو لاکھ پاؤنڈ مجھے پرنس شومبی کی بدولت میسر آگئے تھے۔ اس دور کے لحاظ سے یہ بہت بڑی رقم تھی اور زر مبادلہ کی صورت میں ہونے کی وجہ سے تو اس کی اہمیت اور بھی زیادہ تھی لیکن ممی کا خزانہ شاید اس ساری رقم پر بھاری ہوتا۔

فوارے کی چار دیواری اور شکستہ فرش کے ملبے کے قریب کھڑے کھڑے دفعتاً" مجھے خیال آیا کہ مجھے ایک کوشش تو کرکے دیکھ لینی چاہیے۔ اصل فوارہ تو محفوظ ہی تھا۔ کھدائی کرنے والے' والوں نے شاید ممکن ہی نہ سمجھا ہو کہ فوارے کے نیچے بھی کچھ ہو سکتا ہے

یا میکنزم کا علم نہ ہونے کی وجہ سے خزانے تک ان کی رسائی نہ ہو سکی ہو جس انداز میں سارے باغیچے کو جگہ جگہ سے کھودا گیا تھا' اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ کھودنے والوں کو درحقیقت مطلوبہ جگہ کا علم نہیں تھا۔

میں ملبے پر پاؤں رکھتا آگے پہنچا۔ فوارے کے گرد بھی خاصا ملبہ جمع تھا۔ میں جھک کر اسے ہٹانے لگا۔ ملبہ ہٹ جانے کے بعد میں نے دیکھا کہ فوارہ نیچے تک صحیح سالم تھا۔ اس کا سیمنٹ کا مینار نما حصہ لوہے کے ایک گول پلیٹ فارم پر ایستادہ تھا جو دھات ہی کے ایک گنبد نما حصے کے ساتھ بولٹوں کی مدد سے جڑا ہوا تھا۔ گنبد نما حصہ زمین میں پیوست معلوم ہوتا تھا۔ میں نے ڈائری میں پڑھی ہوئی ہدایت کے مطابق فوارے کے ڈسک نما گول پلیٹ فارم کو گھمانے کی کوشش کی۔ بظاہر فوارے کے کسی بھی حصے کو گھمانے کی کوشش احمقانہ ہی معلوم ہوتی تھی لیکن جب میں نے غیر معمولی طاقت صرف کی تو پلیٹ فارم کے ساتھ گنبد نما حصہ بھی گھوم گیا اور مزید ایک چکر دینے پر وہ کئی انچ اوپر آگیا۔ اب اس کے نیچے ایک خانہ نمودار ہو چکا تھا جس میں اب پورا فوارہ لوہے یا کسی اور دھات کی راڈ پر کھڑا تھا۔

میں نے جھجکتے ہوئے اس خانے میں ہاتھ ڈالا۔ خانہ زیادہ گہرا نہیں تھا۔ اس میں مجھے ایک کنڈا سا ابھرا محسوس ہوا۔ میں نے اسے کھینچا تو نیچے جیسے کوئی چھوٹا سا دروازہ کھل گیا اور فوارہ مزید اوپر چلا گیا۔ وہ راڈ جس پر فوارہ اب کھڑا تھا' جیسے ایک جھٹکے کے ساتھ زمین سے نکل آئی تھی۔ اب میں خانے میں جھک کر دیکھ سکتا تھا۔ جھانک کر دیکھنے پر مجھے کچھ نظر نہ آیا تو میں نے ٹارچ کی روشنی ڈالی اور میری دھڑکن ایک لمحے کے لیے بے قابو ہو کر رہ گئی۔

خانے کی تہہ میں واقعی ایک چھوٹا سا دروازہ کھل چکا تھا اور اس دروازے کے نیچے ایک اور کافی کشادہ' پختہ اور صاف ستھرا خانہ نظر آرہا تھا۔ اس خانے میں سیاہ رنگ کا ایک نہایت عمدہ اسٹرانگ بکس رکھا تھا۔ اسٹرانگ بکس کو اٹھانے کے لیے مجھے گھٹنوں کے بل جھکنا پڑا۔

اس عمل میں شاید میں اتنا منہمک ہو گیا تھا کہ مجھے کوئی آہٹ وغیرہ سنائی نہیں دی تھی لیکن جیسے میں اسٹرانگ بکس اٹھا کر سیدھا ہوا' ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"اس صندوقچے کو زمین پر ہی رکھ دو اور سیدھے کھڑے ہو جاؤ دوست!" آواز میں ملائمت بھی تھی' تحکم اور ایک دبی دبی مسرت بھی۔ "تمہارا بہت بہت شکریہ۔ تم نے میری مشکل آسان کر دی۔ اس خزانے کی تلاش میں' میں کئی ہفتے سے اس مکان میں چھپا ہوا تھا اور ایڑی چوٹی کا زور لگا چکا تھا لیکن کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم یوں میری مدد کو آپہنچو گے.....اور ہاں .....دیکھو زیادہ پھرتی دکھانے کی کوشش نہ

کرنا- میرے ہاتھ میں ریوالور ہے اور اب خزانہ دریافت ہو جانے کے بعد میں اس بات کی پروا نہیں کروں گا کہ فائر کی آواز کوئی سن لے گا-"

میں نے اسٹرانگ بکس زمین پر رکھ دیا- اس آواز نے بلاشبہ مجھے حیران کر دیا تھا- میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کوئی شخص اس خزانے کی تاک میں بیٹھا ہوگا-

"اب میری طرف گھوم جاؤ لیکن اپنی جگہ سے قدم نہ بڑھانا- میں تمہاری شکل دیکھنا چاہتا ہوں-" نادیدہ شخص نے کہا-

میں آہستگی سے اس کی طرف گھوم گیا- دھندلی چاندنی میں' میں نے دیکھا کہ وہ ایک میانہ قامت مگر مضبوط اور پختہ العمر شخص تھا- اس کی آنکھوں میں مکارانہ چمک تھی اور ہونٹوں پر شاطرانہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی- وہ بھی گہری نظروں سے میرا جائزہ لے رہا تھا-

"اندر چلو-" چند لمحے بعد اس نے ریوالور سے کمروں کی طرف اشارہ کیا اور خود ایک طرف کو ہٹ گیا تاکہ میں اس کے سامنے سے گزر کر مکان کی طرف جا سکوں- میں نے سردست اس کی ہدایت پر عمل کرنے ہی میں مصلحت سمجھی-

میں برآمدے کی طرف چل دیا- وہ مناسب فاصلہ رکھ کر ایک ہاتھ میں اسٹرانگ بکس اٹھائے اور دوسرے میں ریوالور سنبھالے میرے پیچھے آرہا تھا-اس طرف سے برآمد کی سیڑھیاں چڑھ کر سب سے پہلے اس کمرے کا بغلی دروازہ سامنے پڑتا تھا جو کبھی میرا بیڈ روم ہوا کرتا تھا- میں اس کی طرف بڑھا تو ریوالور بردار نے مجھے منع کرتے ہوئے اس کمرے کے دروازے کی طرف بڑھنے کی ہدایت کی جو کسی زمانے میں میری گورنس کے استعمال میں ہوا کرتا تھا- اس کمرے سے کچن ملحق تھا-

دروازہ بند تھا لیکن مقفل نہیں تھا- اسے کھول کر میں نے اندر قدم رکھتے ہوئے دیکھا کہ کمرے کے ایک گوشے میں کیروسین لیمپ روشن تھا جس پر ایسا شیڈ لگایا گیا تھا کہ اس کی روشنی ایک دائرے میں محدود رہے' تاہم ملگجی روشنی میں کمرے کے باقی حصے کا بھی جائزہ لینا زیادہ مشکل نہیں تھا- بیڈ پر کافی حد تک صاف ستھرا بستر لگا ہوا تھا اور کمرے کی حالت بھی بتا رہی تھی کہ یہاں کوئی کافی عرصے سے مقیم ہے-

"روشنی کے دائرے میں پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ جاؤ-" مجھے حکم ملا- میں نے اس حکم کی تعمیل کی- ریوالور بردار کا ہیولا ملگجے اندھیرے میں مجھے بیڈ کی پٹی پر بیٹھتا دکھائی دیا- اسٹرانگ بکس اس نے بیڈ کے نیچے کھسکا دیا تھا-

"اب میں تمہارا نام جاننا چاہوں گا-" اس نے اب نہایت پرسکون لہجے میں کہا-

"تمہارے خیال میں' میں کون ہو سکتا ہوں؟" میں نے اس سے سوال کر دیا-

"مجھے شبہ پڑتا ہے کہ ......" وہ جیسے ذہن پر زور دیتے ہوئے بولا "کہ تم عزیزہ خانم

کے لڑکے ہو گو کہ یہ بات صحیح طور پر کسی کو بھی معلوم نہیں کہ اس کی کوئی اولاد تھی یا نہیں-"

"اور تمہیں یہ علم کیونکر ہوا کہ اس مکان میں کوئی خزانہ بھی موجود ہے؟" میں نے نہایت ملائمت سے پوچھا-

"آپس کی بات ہے......" اس نے قدرے شرمیلے لہجے میں کہا- "کہ اگر تم عزیزہ کے لڑکے ہو تو کچھ زیادہ باعزت آدمی میں بھی نہیں- میرا تعلق بھی بازار سے ہے-" وہ خاموش ہو گیا-

"میں نے پوچھا تھا کہ تمہیں اس مکان میں خزانے کی موجودگی کا علم کیونکر ہوا؟" میں نے اپنا سوال دہرایا-

"ایک روز میں بے دھیانی میں بلا اجازت عزیزہ خانم کے رہائشی کمرے میں داخل ہو گیا-" اس نے گویا کسی بچے کے اصرار پر کوئی کہانی شروع کرتے ہوئے کہا- "وہ کمرے میں نہیں تھیں-" میں نے محسوس کیا کہ وہ شخص ممی کا ذکر بڑے احترام سے کر رہا تھا- "ان کے بیڈ کے قریب ہی تپائی پر چمڑے کی سیاہ جلد والی ڈائری کھلی لیکن الٹی رکھی تھی- قریب ہی قلم پڑا تھا- وہ غالباً لکھتے لکھتے اٹھ کر باتھ روم میں چلی گئی تھیں- باتھ روم سے پانی گرنے کی آواز آرہی تھی- میں نے یونہی بے مقصد سے انداز میں ڈائری اٹھا لی اور جو صفحہ میرے سامنے آیا' اس پر پونا کے کسی مکان اور خزانے کا تذکرہ تھا- عزیزہ خانم کسی کو مخاطب کرتے ہوئے کچھ لکھ رہی تھیں- اب مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ وہ شاید تم ہی تھے-" اس نے ایک لمحے کے لیے خاموش ہو کر گہری سانس لی-

بہرحال میں نے جب ڈائری اٹھا لی تھی تو مجھے اس قسم کی کوئی تحریر نظر آنے کی توقع نہیں تھی-" اس نے سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا "اس لیے میں محض اچٹتی نظر سے صفحہ کو دیکھ رہا تھا- دفعتاً" باتھ روم کے دروازے کی ناب گھومنے کی آواز آئی اور میں نے ہڑبڑا کر ڈائری وہیں رکھ دی' تاہم پونا.....خزانہ فوارہ.....باغیچہ......" یہ الفاظ میرے ذہن پر نقش ہو کر رہ گئے- اس دن کے بعد کبھی مجھے اس ڈائری کو دوبارہ دیکھنے کا موقع کوشش کے باوجود نہیں مل سکا لیکن میں بہرحال تگ و دو میں لگا رہا-

"مجھے پتا چلا کہ عزیزہ خانم ہفتے میں ایک مرتبہ چند گھنٹے کے لیے کہیں جاتی ہیں- ڈرائیور ان کا وفادار تھا- اسے کریدنے کے باوجود مجھے کچھ معلوم نہ ہو سکا- بالآخر ایک روز میں ان کا تعاقب کرنے میں کامیاب ہو گیا- میں نے انہیں یہاں آتے دیکھ اور میرے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ رہا کہ خزانے کے سلسلے میں ڈائری میں پونا کے جس مکان کا ذکر تھا' وہ یہی ہے-

میں نے بعد میں اس مکان کے کئی چکر لگائے لیکن مجھے خزانہ تلاش کرنے کا موقع

نہیں ملا۔ اپنے انہی چکروں کے درمیان میں نے یہاں تمہیں بھی دیکھا تھا۔ اس وقت تمہارے داڑھی نہیں تھی۔ پھر پراسرار سے انداز میں عزیزہ خانم کی موت واقع ہو گئی اور میں نے سنا کہ ان کی موت سے قبل ایک نوجوان ان کے بارے میں پوچھتا ہوا آیا تھا اور عزیزہ خانم کے کمرے میں دو آدمیوں کو بھی قتل کر دیا گیا تھا۔ مجھے فوراً خیال آیا کہ وہ نوجوان غالباً تم ہی تھے اور تم شاید عزیز خانم کے بیٹے ہو لیکن میں نے زبان بند رکھی۔ میں کسی بھی الجھن میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے صرف خزانے کی فکر تھی۔

کچھ عرصے بعد میں نے اس مکان کا چکر لگایا تو یہاں تالا لگا ہوا دیکھا۔ اپنے اطمینان کی خاطر میں نے مزید کچھ انتظار کیا' پھر ایک رات پچھلی دیوار سے اس مکان میں کود گیا۔ یہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا کہ باغیچے اور فوارے کے تالاب میں کہیں کھدائی نہیں کی گئی تھی یعنی ابھی کسی نے خزانے کو نکالنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں کچھ ضروری سامان اور خشک خوراک وغیرہ لے کر یہیں آچھپا اور محفوظ اوقات کے دوران خزانے کی تلاش کا کام کرنے لگا۔ مجھے صحیح طور پر معلوم نہیں تھا کہ خزانہ کس جگہ دفن ہے۔ بس اتنا ہی پتا تھا کہ وہ باغیچے میں اور غالباً فوارے ہی کے آس پاس کہیں مدفون ہے۔ میں نے اندازاً ایک سرے سے کھدائی شروع کی اور اس وقت سے لے کر اب تک کھدائی کرتے کرتے میرا تیل نکل چکا تھا مگر خزانہ تو کیا کہیں سے ایک کھوٹا سکہ بھی برآمد نہیں ہوا تھا.....''

وہ ایک گہری سانس لے کر مسکرایا اور گویا بات ختم کرتے ہوئے بولا۔ ''اور پھر تم فرشتہ رحمت بن کر آگئے۔''

''میں تمہارے لیے فرشتہ اجل بھی تو ثابت ہو سکتا ہوں۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔

○



میرے لہجے میں موت کی دھمکی تو پوشیدہ تھی لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں کیسے صورتحال کو پلٹ سکتا تھا۔

''میں اس پہلو پر غور کر رہا ہوں۔'' اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ یک لخت غائب ہو گئی اور چہرے پر تناؤ چھا گیا۔'' اس لیے مناسب یہی ہے کہ.....'' اس نے ریوالور زیادہ صحیح طور پر سنبھال لیا۔ ''میں تمہیں گولی مار کر یہیں باغیچے میں دفن کر جاؤں۔''

''اتنی سی بات کے لیے اتنی لمبی تمہید باندھ رہے تھے۔'' میں نے ناگواری سے کہا۔ ''گولی مارنی ہے تو مار بھی چکو بلکہ میری لاش اگر باغیچے ہی میں دفن کرنی تھی تو وہیں گولی مار دیتے۔ یہاں تک لانے کی زحمت کیوں کی؟ لاش کو گھسیٹتے ہوئے پھر باغیچے تک لے جاؤ گے؟'' میرا انداز ایسا ہی تھا جیسے میں اپنی نہیں کسی اور کی لاش کی بات کر رہا ہوں۔ وہ کچھ گڑبڑا سا گیا مگر پھر سنبھل کر بولا۔ ''انسان جسے جان سے مارنے لگا ہو' اس سے دو دو باتیں تو کر لینی چاہئیں اور کچھ نہیں تو کم از کم اس کا نام تو پوچھ لینا چاہیے۔''

''میرا نام بلبل کشمیر ہے۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''خوبصورت نام ہے ناں؟''

''ہیرو بننے کی کوشش کر رہے ہو؟'' اس کی آواز میں سختی در آئی۔

''دراصل مجھے مرنے کی بہت جلدی ہے اور تم دیر کیے جا رہے ہو۔'' میں نے گویا شکوہ کیا۔

''یہ لو...'' اس نے ٹریگر دبا دیا۔

میرا اب تک کا ذاتی تجربہ یہ تھا کہ گولی صرف وہ خطرناک ہوتی ہے جو لاعلمی میں کسی سمت سے آئے۔ اس گولی کے لیے میں بہت دیر سے تیار تھا۔ میں کرسی سے پھسلا اور ساتھ ہی میری لات اس تپائی پر پڑی جس پر کیروسین لیمپ رکھا تھا۔ لیمپ کہیں دور جا گرا اور بجھ گیا ورنہ مجھے اندیشہ تھا کہ وہ بجھنے کے بجائے کہیں مٹی کا تیل بکھر جانے کی وجہ سے زیادہ آگ نہ پکڑ لے۔

اس شخص نے دوسرا فائر کرنے میں تاخیر نہیں کی مگر اس وقت تک اندھیرا چھا چکا تھا۔ گولی غالباً اس کرسی میں لگی تھی جس پر ایک سیکنڈ پہلے میں بیٹھا تھا کیونکہ لکڑی کے پرخچے اڑنے کی آواز آئی تھی۔

مجھے احساس ہو رہا تھا جو میری خوش فہمی بھی ثابت ہو سکتا تھا کہ وہ شخص اندھیرے میں مجھ سے بہتر نہیں دیکھ پا رہا تھا حالانکہ وہ کافی دنوں سے کم روشنی میں رہنے کا عادی ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ وہ خوفزدہ بھی ہو چکا تھا۔ میں نے تاریکی میں اس کی شبیہ کو بیڈ کے نیچے گھستے دیکھا۔ پھر میں نے اسے اسٹرانگ بکس سینے سے لگائے ایک کہنی اور پیٹ کے بل کھسکتے ہوئے بیڈ کے دوسری طرف سے نکل کر دروازے کی طرف بڑھتے دیکھا۔

اپنی دانست میں خوفزدہ کرنے کے لیے اس نے اندھیرے میں ایک فائر اور جھونک دیا۔ میں دیوار کے ساتھ لگ کر فرش سے چپکا ہوا تھا اور سائیلنسر والا ریوالور میرے ہاتھ میں آچکا تھا۔ اس نے دروازے کے قریب رک کر غالباً ایک لمحے کے لیے سوچا کہ دروازہ کھولنے پر اس کا ہیولا مجھے نظر آجائے گا۔ اس نے حتی الامکان پھرتی سے کام لیتے ہوئے پہلے دو فائر کیے' پھر تیزی سے دروازہ کھول کر اسٹرانگ بکس اٹھا کر باہر چھلانگ لگا دی۔

اس کا خیال رہا ہوگا کہ وہ برآمدے کو پھلانگتا ہوا سیدھا باغیچے کی کچی زمین پر جا گرے گا اور وہاں سے اٹھ کر بھاگ لے گا۔ وہ باغیچے کی کچی زمین پر گرا ضرور لیکن مردہ حالت میں کیونکہ چھلانگ لگاتے وقت میرے ریوالور کی دو گولیاں اس کے جسم میں دھنس گئی تھیں۔

میں نے باہر آکر دیکھا' وہ خزاں رسیدہ پتوں کے بستر پر پڑا تھا اور زندگی سے محروم ہو چکا تھا۔ اس کے جسم سے بہتا ہوا خون زرد پتوں کو سرخ بنا رہا تھا۔ میں نے دوبارہ کمرے میں جا کر بیڈ کے نیچے سے اسٹرانگ بکس اٹھایا اور مزید وقت ضائع کیے بغیر مکان سے نکل آیا۔ مجھے اندیشہ محسوس ہو رہا تھا کہ اس شخص کے ریوالور سے فائرنگ کی آواز یقیناً دور تک سنی گئی ہوگی۔ رات کے سکوت میں تو ویسے بھی معمولی آواز بھی بلند محسوس ہوتی ہے۔ میں اپنے مکان میں لاش چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا تھا لیکن اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

میں نے براہ راست ہائی وے کا رخ نہیں کیا بلکہ مختلف رہائشی علاقوں سے گزرتے ہوئے ادھر جانے کا فیصلہ کیا۔ ایک گلی میں دھیرے دھیرے کار ڈرائیو کرتے وقت نہ جانے کیوں ذہن میں یک لخت ہی ٹک ٹک سی ہونے لگی۔ شاید یہ گردش ایام کی گھڑی تھی جو الٹی چلتی تھی۔ اس گلی سے کوئی مانوس سی خوشبو آرہی تھی جس نے لاشعور کی گرہیں سی کھول دی تھیں۔ یادوں کے اجڑے ہوئے صنم خانوں میں گھنٹیاں سی بج اٹھی تھیں۔ اس گلی میں ایسی کیا بات تھی؟ یہاں کی ہوا کیوں دامن گیر ہوئی جا رہی تھی؟ راستہ کیوں زنجیر بنا جا رہا تھا؟ در و دیوار کیوں سرگوشیاں کر رہے تھے؟ یہ کیا ماجرا تھا؟

میں اپنے آپ سے پوچھتا رہا اور ایکسیلیٹر سے میرا پاؤں بالکل ہی ہٹ گیا۔ پھر خودبخود ہی بریک پر جم گیا۔ تب یک لخت جیسے لاشعور کے اندھیروں میں سینکڑوں آفتاب

طلوع ہو گئے۔ دیر سے سہی' سب کچھ یاد تو آگیا۔

جی ہاں.....یہی وہ گلی تھی جہاں ماہتاب رہتی تھی۔

حالات خواہ کچھ بھی تھے' میرے محسوسات میں خواہ کتنی ہی تبدیلیاں آچکی تھیں اور میں نے اپنی ذات کے کھنڈر پر بلاشبہ ایک نئی عمارت تعمیر کر لی تھی لیکن آج جب تقدیر نے ایک بار پھر کوچہ جاناں میں پہنچا دیا تو جیسے سارے زخموں کے منہ کھل گئے۔ ساری مدفون تمنائیں انگڑائیاں لے کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ تمام بھولے بسرے خواب ایک بار پھر آنکھوں میں جھلملا اٹھے۔ بے اختیار اس حاصل حیات سے ملنے کو دل مچل اٹھا۔

میں گاڑی سے اترا اور اس مکان کی طرف بڑھا جو کبھی تمام آرزوؤں اور امنگوں کا مسکن ہوا کرتا تھا اور کبھی جس کے دروازے پر پہنچ کر دھڑکنیں اتنی تیز ہو جایا کرتی تھیں کہ دھمک کنپٹیوں میں سنائی دینے لگتی تھی۔ آج نجانے کیوں اس کے در پر پہنچ کر جسم سرد سا پڑ گیا۔ پھر یہ دیکھ کر تو جیسے دل دھڑکنا ہی بھول گیا کہ لوہے کے گیٹ پر بڑا سا تالا جھول رہا تھا۔

مجھ پر یک لخت تھکن سی طاری ہو گئی۔ پہلے تو جی چاہا کہ فوراً اپنے راستے پر چل پڑوں اور ایک بار پھر ذہن سے یہ خیال جھٹک دوں کہ اس دنیا میں کوئی ماہتاب بھی ہوتی تھی مگر یار کے گھر کے سامنے کھڑے ہو کر اس طرح سوچنا اپنے بس میں نہ رہا۔ میں نے پاگلوں کی طرح ادھر ادھر دیکھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ پھر اس کے سوا کوئی طریقہ نہ سوجھا کہ کسی پڑوسی سے معلوم کرنے کی کوشش کروں۔

میں نے برابر والی کوٹھی کی کال بیل بجائی۔ تین چار مرتبہ طویل طویل وقفوں تک بیل دینے کے باوجود کوئی جواب نہ آیا۔ میں مایوس ہو کر ماہتاب کی کوٹھی سے متصل دوسری کوٹھی کی طرف بڑھنے لگا تھا کہ اندر پختہ روش پر آہٹ سنائی دی۔ کوئی سلیپر گھسیٹتا آرہا تھا' پھر آہنی گیٹ میں بنی ہوئی چھوٹی سی کھڑکی ذرا کھلی اور ایک پھولے پھولے سے مردانہ چہرے کا کچھ حصہ نظر آیا۔

"معاف کیجئے گا.....میں نے آپ کو بڑی زحمت دی۔" میں نے نہایت معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ "کیا براہ کرم آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ آپ کے یہ پڑوسی کہاں گئے ہوئے ہیں؟" میں نے ماہتاب کی کوٹھی کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے اس شخص کی غنودگی بھری آنکھوں میں کسی بے عنوان سے جذبے کی پرچھائیاں اترتے دیکھیں۔ شاید یہ خوف تھا لیکن میں اس وقت کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔

"تم کون ہو؟" اس نے کھڑکی مزید وا کیے بغیر کھردرے لہجے میں پوچھا۔

میں کہنے لگا تھا کہ کیا یہ جاننا ضروری ہے؟ مگر میں نے حتی الامکان تحمل سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "میں ان کا ایک فیملی فرینڈ ہوں۔ کافی عرصے بعد لندن سے واپس آیا ہوں۔"

اس شخص کی آنکھوں سے میں صاف پڑھ سکتا تھا کہ اسے میری بات پر قطعاً یقین نہیں آیا' تاہم اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "وہ لوگ کوٹھی بیچ گئے ہیں اور نیا مالک ابھی اس میں شفٹ نہیں ہوا۔ وہ کہیں گیا ہوا ہے۔"

"یہ کب کی بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کافی عرصہ گزر گیا۔" اس نے مبہم سا جواب دیا۔

"آپ کو ان کے نئے ایڈریس کا کچھ علم ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جی نہیں...ان کے نئے ایڈریس کا یہاں کسی کو بھی کچھ علم نہیں۔" اس نے ایک بار پھر کھردرے لہجے میں کہا اور کھڑاک سے کھڑکی بند کر لی۔ وہ مزید کسی سوال کا جواب نہیں دینا چاہتا تھا۔ میرا جی چاہا کہ گیٹ پھلانگ کر اس شخص کی گردن مروڑ ڈالوں۔ لوگ نہ جانے کیوں اتنے بے حس' بے مروت اور روکھے ہوتے جا رہے تھے۔ کسی کی بات کا تسلی بخش جواب بھی نہیں دے سکتے تھے۔ جو کچھ انہیں معلوم ہوتا تھا' وہ بھی کسی پریشان حال کو نہیں بتا سکتے تھے۔ بغیر کسی وجہ کے ماہتاب کے والدین کا یوں کوٹھی بیچ کر کہیں چلے جانا میری سمجھ سے بالاتر تھا لیکن فی الحال خاموشی سے لوٹ جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

پیراماؤنٹ ٹریڈرز وہ کثیر المقاصد کاروباری ادارہ تھا جس نے چھ ماہ کے قلیل عرصے میں صرف بمبئی میں نہیں ہندوستان کے ایک بہت بڑے حصے میں پھیلے ہوئے کاروباری حلقوں میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ بمبئی کے سب سے مہنگے کاروباری مرکز "بدلا چیمبرز" کے تین فلورز پر اس کے دفاتر پھیل چکے تھے اور نہ صرف بمبئی کے دیگر علاقوں میں بھی ذیلی دفاتر موجود تھے بلکہ کلکتہ' مدراس اور دہلی تک اس کی شاخیں پہنچ چکی تھیں۔ اس ادارے کے کنسٹرکشن کمپنیوں میں بھی شیئرز تھے۔ بنارس ٹیکسٹائلز کے نام سے ایک مل بھی اس ادارے نے خریدی تھی جو دیوالیہ ہو کر بند ہونے کو تھی مگر اب نئی انتظامیہ کے تحت اس کے شیئرز کی قیمت میں زبردست اضافہ ہو گیا تھا۔

پیراماؤنٹ ٹریڈرز ہی کے زیرانتظام ایک فلم کمپنی بھی قائم کی گئی تھی جس کے شیڈول پر چار فلمیں تھیں اور دو کا آغاز ہو چکا تھا۔ فلموں کی ڈسٹری بیوشن کا ایک ادارہ بھی قائم کیا گیا تھا۔ پیراماؤنٹ ٹریڈرز ہی کے الحاق سے ایک ادارہ سرمایہ کاری کا بھی قائم کیا گیا تھا۔ اس میں بمبئی کے چار بڑے سیٹھوں نے خاطرخواہ سرمایہ فراہم کیا تھا جو بہترین منافع کی شرح پر دوسرے پراجیکٹس میں لگنا شروع ہو چکا تھا۔ صرف یہی نہیں اس ادارے نے فشنگ کے کام میں بھی ہاتھ ڈالا تھا اور پیراماؤنٹ فشریز کے نام سے ایک ذیلی کمپنی قائم کی تھی جس نے حکومت کے ساتھ فشنگ کے کام میں شراکت کر لی تھی۔

کاروباری ادارے تو انڈیا میں اس سے بھی کہیں بڑے بڑے موجود تھے لیکن پیراماؤنٹ ٹریڈرز کی سب سے اہم اور قابل ذکر خصوصیت یہ تھی کہ اس کا منیجنگ ڈائریکٹر میں تھا۔

اس کے اٹھتر فیصد شیئرز کا میں تنہا مالک تھا اور باقی تین فیصد بمبئی کے چار سیٹھوں میں تقسیم تھے جن کا میں نے پہلے بھی ذکر کیا ہے۔

میں نے جب کاروبار کی دنیا میں قدم رکھنے اور یک لخت اتنے پاؤں پھیلانے کا فیصلہ کیا تو مجھے پوری طرح یقین نہیں تھا کہ مجھے اتنی جلدی کامیابی نصیب ہو گی۔ بہرحال یہ احساس لاشعوری طور پر ضرور تھا کہ یا تو پتنگ ایک دم ہی آسمانوں پر جا چڑھے گی یا پھر ڈور ہاتھ پر سے کٹے گی لیکن داؤ سیدھا ہی پڑا۔ بعدازاں میں اس نتیجے پر پہنچا کہ کاروبار میں عقل کا کردار ضمنی ہوتا ہے۔ زیادہ اہم کردار آپ کی قسمت اور پیسے کا ہوتا ہے۔

میں نے جب کاروبار کی منصوبہ بندی کی تو کاغذوں پر مجھے یہ سب کچھ شیخ چلی کا خواب محسوس ہوا تھا۔ یوں تو اس وقت میرے پاس دو کروڑ کے قریب رقم موجود تھی لیکن جس پیمانے پر میں سوچ رہا تھا' اس مناسبت سے اس رقم کی مثال اونٹ کے منہ میں زیرہ والی تھی اور پھر میں یہ رقم بھی لے کر ایک دم کاروبار کے میدان میں نہیں کود سکتا تھا۔ ٹیکس ڈیپارٹمنٹ والے پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ جاتے کہ اتنی بڑی رقم میرے پاس آئی کہاں سے؟

گو کہ انڈیا میں اس وقت بھی بلیک منی کاروبار کرنے میں لگانے پر تیار ہو جانے والوں سے حکومت نرمی برتتی تھی لیکن میں کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھا۔ ایک چھوٹے سے سیٹھ کی معرفت سب سے پہلے تو میں نے ایک ایجنٹ کو پکڑا جس نے رقم تو خاصی خرچ کرا دی لیکن نہایت مکمل اور بے عیب ایسی دستاویزات انتہائی صفائی سے تیار کرا دیں جن کی رو سے میں نے لندن میں حال ہی میں فوت ہونے والے اپنے ماموں کی خاصی بڑی جائیداد فروخت کی تھی اور پیسہ ہندوستان میں کاروبار کرنے میں لگانے لایا تھا۔

میں نے دفاتر بہت شاندار قائم کیے۔ منصوبے قطعی بے عیب تیار کیے اور ان کے سلسلے میں ایک انگریز بزنس ایڈوائزر سے بھی مدد حاصل کی۔ یوں ایک مرتبہ تو میں نے کم پونجی کے باوجود بمبئی کے اونچے کاروباری حلقے میں کھلبلی مچا دی۔ میں نے بینک آف انڈیا کو چار کروڑ روپے قرض کی درخواست پیش کی۔ لون کمیشن نے ڈیڑھ کروڑ روپے قرض منظور کیا۔

میں نے ایک تجربہ یہ بھی حاصل کیا کہ کاروباری دنیا میں ایک چیز اور بھی اثرانداز ہوتی ہے۔ اسے آپ ایک طرح کی "دہشت" کہہ سکتے ہیں۔ ایک بار آپ کی دہشت پھیل جائے تو راستے خود بخود آپ کے لیے کھلتے چلے جاتے ہیں۔ سیٹھ لوگ چیک بکس اور نوٹوں سے بھرے بریف کیس لے کر آپ کے دفتر کے چکر لگانے لگتے ہیں۔ اس کے بعد ساکھ کا مرحلہ آتا ہے۔ ایک بار آپ کی ساکھ بن جائے' پھر چاہے کسی کام میں ہاتھ ڈال دیجئے' صرف ذہن حاضر رکھیے۔ بمبئی آپ کو اوپر سے اوپر لے جائے گا۔

آپ کو شاید یہ جان کر بھی حیرت ہو کہ میری فلم کمپنی کا ڈائریکٹر طبلہ تھا گو کہ اب اس کے دفتر پر اے اے لاکھانی (عاشق علی لاکھانی) کی نیم پلیٹ آویزاں تھی۔ وہ معمولی تعلیم یافتہ شخص جو زیادہ سے زیادہ سو روپے روز پر ایکسٹرا کے طور پر فلموں میں کام کرتا تھا اور بعض اوقات ڈپلیکٹ کے طور پر کام کرتے ہوئے جان کو خطرے میں ڈالتا تھا اور جس کے سلام کا کوئی سیدھے منہ جواب نہیں دیتا تھا' فلم کمپنی کو بڑے عمدہ طریقے سے چلا رہا تھا۔ میں نے کام اسے سونپتے وقت ایک لیکچر دیا تھا۔ اب اس کا سابقہ تجربات کو دہرانے یا اپنی ادھوری حسرتوں کو پورا کرنے کا کوئی ارادہ معلوم نہیں ہوتا تھا۔

اس کے دفتر میں اب بھی لڑکیوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ یہ لائن ہی ایسی تھی مگر اب وہ انہیں پچھلے کمرے میں نہیں بلاتا تھا۔ وہ صاف ستھرا سوٹ پہنے اپنی چھوٹی سی گاڑی میں دفتر آتا تھا اور بڑے وقار اور سنجیدگی سے دفتری اور کاروباری معاملات چلاتا تھا۔ چودہ آدمیوں کا مستقل اسٹاف اس کا ماتحت تھا۔

میری فشنگ کمپنی کا سربراہ چھنا تھا۔ وہ گو کہ واجبی سا ہی پڑھا لکھا تھا اور اب بھی دھوتی کرتے میں دفتر آتا تھا لیکن اپنا کام نہایت عمدگی سے چلا رہا تھا۔ سہ ماہی آڈٹ سے پتا چلا تھا کہ اس کے شعبے نے سب سے کم مدت میں منافع کی شرح سب سے زیادہ دی تھی۔ وہ بڑا سنجیدہ انسان تھا۔ اس کا ماتحت اسٹاف اس سے بڑا مرعوب رہتا تھا۔

میں نے پیراماؤنٹ ٹریڈرز کے اسی طرح کے کئی شعبے بنا کر ان کا ایک ایک سربراہ مقرر کر دیا تھا اور انہیں تقریباً آزادانہ طور پر کام کرنے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ اس طرح مجھ پر کام کا وزن زیادہ نہیں تھا اور میں منصوبہ سازی اور بھاگ دوڑ میں زیادہ وقت صرف کر سکتا تھا۔

تاہم کاروبار کو میں نے اپنے حواس پر سوار نہیں ہونے دیا تھا۔ یہ تو میرا زاد راہ تھا' منزل کچھ اور تھی۔ کاروبار کو میں نے ایک انجن کی طرح سیٹ کر دیا تھا جو ایک بار اسٹارٹ ہونے کے بعد خود بخود چل رہا تھا۔ میرا کام صرف انجن کی آواز پر دھیان رکھنا تھا کہ کہیں کوئی پرزہ کھڑکھڑاہٹ تو پیدا نہیں کر رہا۔ کہیں کوئی نٹ بولٹ ڈھیلے تو نہیں پڑ رہے؟ کوئی پرزہ تبدیل ہونے والا تو نہیں؟

ایک روز میں دفتر پہنچا تو میری سیکرٹری نے بڑے مسرت بھرے لہجے میں بتایا۔ "سر! میڈم روپا..... آپ سے ملنے آئی ہیں۔ میں نے انہیں اندر آپ کے دفتر میں بٹھا دیا ہے۔"

اپنے ساؤنڈ پروف ایئرکنڈیشنڈ دفتر کا دروازہ کھول کر میں بیرونی حصہ عبور کر کے اندر پہنچا۔ روپا ٹانگ پر ٹانگ رکھے صوفے پر پشتے سے ٹیک لگائے بیٹھی خوابناک سی آنکھوں سے دروازے ہی کی طرف دیکھ رہی تھی' جیسے میری راہ دیکھتی رہی ہو۔ اس نے اپنی جگہ سے جنبش نہیں کی' وہ یوں میری طرف دیکھ رہی تھی جیسے میں ایک خواب ہوں اور اس

نے ذرا پلک جھپکی تو بکھر جاؤں گا۔

وہ موتیا رنگ کے ایک عجیب و غریب کپڑے کی ساڑھی میں ملبوس تھی جو چمکیلی دھند کی طرح گویا اس کے جسم پر جما ہوا تھا۔ ایسے ہی کپڑے کے کہنیوں تک کے دستانے پہن رکھے تھے' بالوں کا جوڑا بہت ہی خوبصورت تھا۔ اس کے وجود کی مسحور کن خوشبو وسیع کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ وہ سدا بہار عورت تھی' ہمیشہ کی طرح آج بھی بے پناہ حسین' ترو تازہ اور شگفتہ نظر آرہی تھی۔ بس آنکھوں کی گہرائیوں میں خوابیدہ اداسی کے رنگ کچھ اور گہرے ہو چکے تھے۔

میں نے بریف کیس ریک پر رکھا اور مسکراتے ہوئے اس کی طرف مڑا۔

"معاف کیجئے گا سیٹھ صاحب! میں آپ کا قیمتی وقت ضائع کرنے آگئی ہوں۔" اس کے رسیلے ہونٹوں نے حرکت کی' لہجہ سپاٹ تھا مگر الفاظ سپاٹ نہیں تھے۔

"دیکھو.....اب طنز و نز کرنے کی کوشش نہ کرو۔" میں اس کے قریب جا بیٹھا اور اس کے ہاتھ تھام لیے۔ "اچھے دوست جب ایک طویل عرصے کی جدائی کے بعد ملتے ہیں تو ایک دوسرے پر زہریلے لفظوں کے تیر نہیں برساتے۔"

"خصوصاً جبکہ ایک ہی شہر میں رہ کر جدا رہنے کی سرتوڑ کوشش کی گئی ہو۔" اس کا لہجہ پہلے جیسا ہی رہا۔ "جس انداز میں آپ نے الوداع کہا تھا' اس سے آپ کی مراد غالباً یہی تھی کہ میں آئندہ آپ سے ملنے کی کوشش نہ کروں سیٹھ صاحب! مگر افسوس کہ میں نہ جانے کس جذبے سے شکست کھا کر چلی آئی حالانکہ میں بڑی خوددار عورت تھی سیٹھ صاحب!" "اوہ.....خدا کے لیے سیٹھ صاحب' سیٹھ صاحب کی گردان بند کرو روپا۔" میں نے اپنائیت بھرے غصے سے اس کے بازو کو ہلکا سا جھٹکا دیا اور فوراً ہی انتہائی ملائمت اور انکساری سے کہا۔ "میں آج بھی تمہارا ایک حقیر غلام ہوں' دوست ہوں' رازدار ہوں' خیرخواہ ہوں' پیار کرنے والا ہوں لیکن میں روایتی عاشق نہیں۔ میں محبت کا ثبوت اسے ہی نہیں سمجھتا کہ تمہارے در پر پڑا رہوں یا بلاناغہ تم سے ملتا رہوں۔ میری محبت کو میرے ہی انداز کا اسیر رہنے دو' میں خواہ کہیں بھی رہوں۔ کتنا ہی عرصہ تم سے نہ ملوں لیکن تم مجھے ہمیشہ یاد رہو گی' محترم رہو گی' محبوب رہو گی.....اس سے زیادہ مجھ سے کچھ نہ مانگو۔"

"میں تو تم سے کچھ بھی نہیں مانگتی۔" وہ یک لخت ٹوٹ گئی' اس کی آنکھیں چھلک آئیں.....گویا سمندر رونے کو تھا۔ "لیکن تم ہی کہو کہ یہ کوئی انداز ہے تعلق داری کا؟ مجھے یوں خدا حافظ کہہ کر اچانک روپوش ہو گئے جیسے پاتال میں اترنے لگے ہو.....اسی شہر میں بزنس کرتے رہے.....اتنی ٹانگیں پھیلا لیں' فلم کمپنی بھی قائم کر لی لیکن تمہیں کبھی بھول کر بھی میرا خیال تک نہ آیا؟ کبھی ایک فون ہی کر لیا ہوتا۔ تمہاری کمپنی کا کوئی نمائندہ مجھے سائن کرنے آیا اور باتوں باتوں میں تمہارا ذکر نکل آیا۔ میرے کرید کرید کر پوچھنے پر وہ

تمہارے متعلق بتاتا رہا اور مجھے یقین ہوگیا کہ یہ تم ہی ہو۔ تمہارا خیال تھا کہ اسی شہر میں رہ کر اتنا کاروبار پھیلا کر اور خصوصاً فلم کے دھندے میں بھی ٹانگ اڑانے کے باوجود تم میری نظروں سے اوجھل رہو گے؟ میں نے کنٹریکٹ تو سائن کر دیا لیکن ایک حسرت سی محسوس ہوئی کہ کاش یہ کنٹریکٹ سائن کروانے تم آئے ہوتے....." اس نے موتیا رنگ کے ہی ایک چھوٹے سے نفیس رومال سے آنکھیں میچ کر پونچھیں اور جھرجھری سی لے کر یوں سنبھل گئی گویا اپنی اس کیفیت پر شرمندہ ہو۔ اسے ندامت ہو کہ وہ اپنے آپ پر قابو کیوں نہیں رکھ پا رہی۔

"یہ تو ایک غیر اہم چھوٹا سا کاروباری معاملہ تھا جس کے متعلق مجھے علم بھی نہیں کہ کوئی نمائندہ تمہارے پاس گیا تھا۔" میں نے اس کے گداز ہاتھ تھپکتے ہوئے کہا۔ "تمہیں حسرت محسوس ہوئی کہ کنٹریکٹ سائن کروانے میں تمہارے پاس آیا ہوتا۔ بالکل بیکار کی بات کی تم نے' خدا نہ کرے جو میں کسی کاروباری اور وہ بھی اتنے معمولی کام کے لیے تمہارے پاس آیا ہوتا۔ تم سے میرا تعلق کاروبار کا نہیں' جذبوں کا ہے۔ تم سے میرا معاملہ لین دین کا نہیں' دل کا ہے۔ میں تمہارے پاس اگر آتا تو کسی جذبہ دل کی تجدید کے لیے آتا....."

"اور وہ دن شاید کبھی نہ آتا۔" اس نے میری بات کاٹ دی۔

"چلو میں نہیں آسکا' تم آگئیں۔ تم نے مجھے عزت بخشی' میرا مان بڑھایا۔" میں نے خلوص سے کہا۔ "میں پہلے بھی تمہارا زیر بار تھا' اب تمہاری اچھائیوں کے بوجھ تلے کچھ اور دب گیا ہوں۔ اب ان گلے شکووں کو چھوڑو.....یہ بتاؤ کیا پیو گی؟ جو کچھ تم پیتی ہو' وہ بھی یہاں دستیاب ہے۔"

"تمہیں پتہ ہے گھر سے نکلنے کے بعد میں نہیں پیتی۔" وہ مسکرائی۔ "میں صرف کافی پیوں گی لیکن پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ آخر اس ڈرامائی قطع تعلق میں کیا مصلحت تھی؟ اس کی تہہ میں کوئی بھید ہے جو میں کھولنا چاہتی ہوں۔"

"کوئی بھید نہیں۔" میں نے تیزی سے ہاتھ ہلایا۔ "میں محسوس کر رہا تھا کہ تمہارا میرا تعلق عشق بنتا جا رہا ہے۔ بہت سے کاموں میں عشق مہمیز ثابت ہوتا ہے۔ آپ کو تحریک دیتا ہے' تیزی سے آگے بڑھاتا ہے۔ اس کی بدولت انسان سے معجزے سرزد ہونے لگتے ہیں لیکن بعض کاموں کے راستے میں عشق دیوار بن جاتا ہے۔ افیون کی تاثیر دکھانے لگتا ہے' آدمی کو سست کر دیتا ہے۔ میں زندگی میں جو کچھ کرنا چاہتا ہوں' اس کے سلسلے میں بھی مجھے اندیشہ تھا کہ عشق میرے لیے مہمیز ثابت نہیں ہوگا' افیون بن جائے گا۔ عشق کے سوا میں کچھ نہیں کر سکوں گا .....اور تعلق داری کی ڈور چونکہ بہت الجھی ہوئی تھی اور اسے آہستہ آہستہ سلجھانے میں مجھے کامیابی نہیں ہو رہی تھی اس لیے میں نے جھٹکے سے اسے

توڑ ڈالا لیکن یہ مت سمجھو کہ اس کے ساتھ تعلق خاطر بھی ٹوٹ گیا....میں نے کہا ناں کہ یہ میرا اپنا انداز ہے.....اور میری محبت کو میرے ہی انداز کا اسیر رہنے دو۔"

"تم تو اپنا فلسفہ گھڑ کر سکون سے اپنی دنیا میں مگن ہو گئے۔" اس کے لہجے میں شکست خوردہ سا شکوہ تھا۔ "دوسرے کی زندگی تہہ و بالا ہو گئی' تمہیں اس سے کیا غرض۔"

میز کے قریب جا کر میں نے انٹرکام پر کرسٹینا کو کافی بھجوانے کے لیے کہا اور دوبارہ روپا کے قریب آبیٹھا۔ "اور سناؤ' نیا گھر بنوا لیا تم نے؟" میں موضوع بدلنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"بنوایا نہیں.....بنا بنایا لیا تھا' باندرہ میں ہے۔ انشورنس کمپنی نے خاصی حیل حجت کے بعد بہرحال کلیم ادا کر دیا تھا۔ میرا کوئی خاص نقصان نہیں ہوا۔ سوائے اس کے کہ ذہنی دھچکے سے سنبھلنے میں خاصی دیر لگی اور بہت سے ضروری کاغذات اور ماضی کی کچھ نشانیاں ضائع ہو گئیں....." وہ دھیرے دھیرے بتا رہی تھی....موضوع بدلنے سے اس کا لہجہ بھی معمول پر آگیا تھا اور میں یہی چاہتا تھا....ذاتیات بڑا تکلیف دہ موضوع بھی ہے اور بڑا حیرت انگیز بھی۔

"بہرحال .....نیا گھر بنوانے کو جی نہیں چاہا۔" وہ بتا رہی تھی۔ "لیکن جو خریدا ہے یہ بھی خاصا خوبصورت ہے۔"

میں نے کوئی تبصرہ نہ کیا تو وہ میری طرف دیکھتے ہوئے ہچکچاہٹ آمیز اور قدرے شرمیلے سے انداز میں مسکرائی...."تم کب آرہے ہو' اسے اپنے وجود کی روشنی سے جگمگانے؟"

"روپا! ایک تو تم میری اتنی عزت افزائی کرتی ہو کہ میرا دماغ ساتویں آسمان پر جا پہنچتا ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ویسے مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ مجھے جلد ہی تمہارے گھر آنا پڑے گا۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "میں تمہیں بھی کسی ایسے دھندے سے لگانے کے بارے میں سوچ رہا تھا جس میں الجھ کر زندگی کے بارے میں تمہاری بے دلی اور لاتعلقی ختم ہو جائے گی۔"

"تمہارا خیال ہے کہ میری فلمی مصروفیات کم ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"مجھے معلوم ہے کہ تم تین مصروف ترین ہیروئنوں میں سے ایک ہو۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیکن فلمی مصروفیتیں تھکا دینے والی ہوتی ہیں' میں تمہارے لیے کوئی ایسی مصروفیات پیدا کرنا چاہتا ہوں جو تمہیں تھکانے کے بجائے تمہارا دل جوش و خروش سے بھر دیں اور اس وقت بھی برقرار رہیں جب فلمی دنیا میں تمہاری مصروفیات گھٹ جائیں گی اور جھنجلاہٹ بڑھ جائے گی.....میں دراصل بہت دور کی سوچنے لگا ہوں۔"

"گویا تم شادی کے لیے آئیڈیل مرد بنتے جا رہے ہو۔" وہ ایک بار پھر شرارت سے

مسکرائی...." کاش تم مجھے اس وقت ملے ہوتے جب میں شادی کی حماقت کو دہرانے کے سلسلے میں پوری طرح سنجیدہ ہو رہی تھی مگر قدرت نے بال بال بچا لیا۔"

اور کاش تم اس وقت بھی میرے قریب موجود ہو جب میرے دل میں شادی کی خواہش پیدا ہو جائے۔" میں نے بھی شرارتاً کہا۔

"وہ دن آنے تک اپنے تو نہ منہ میں دانت ہوگا' نہ پیٹ میں آنت۔" اس نے مصنوعی آہ بھر کر کہا۔

"مجھے تم اس وقت بھی "جہاں ہے اور جیسی ہے" کی بنیاد پر قبول ہوگی۔" میں نے کہا "ویسے حال اپنا بھی تم سے کچھ مختلف نہیں ہوگا۔"

دفعتاً" دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی' غالباً کافی آگئی تھی۔

آفس بوائے کافی کی ٹرالی لیے اندر آیا اور دو مگ تیار کرکے ہمیں دے کر خاموشی سے واپس چلا گیا۔ کافی پینے کے بعد روپا بھی بادل نخواستہ سے انداز میں رخصت ہو گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں دیر تک اپنی جگہ ساکت بیٹھا گہری گہری سانسیں لیتا رہا۔ میرے اعصاب میں کچھ ارتعاش سا پیدا ہو چکا تھا جو میرے نزدیک کوئی اچھی علامت نہیں تھی۔ میں جذباتی ہلچل وغیرہ سے اپنے آپ کو حتی الامکان محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ میں نے کام شروع کر دیا' پھر چند منٹ بعد کرسٹینا کو بلایا۔

"انگریزی کے دو تین بڑے اخباروں میں صبح کے لیے ایک اشتہار دے دو کرسٹینا!" مجھے ایک اسٹینو ٹائپسٹ کی ضرورت ہے جو بطور اسٹینو ٹائپسٹ خواہ اچھی نہ ہو لیکن نہایت خوبصورت' بے عیب اور گرامر کی غلطیوں سے پاک انگریزی لکھ سکتی ہو۔ اسے ہر بات وضاحت سے نہ سمجھانی پڑے' میرا مطلب سمجھ رہی ہو ناں؟"

"جی سر! مجھے بھی تو اسی صلاحیت کی بنا پر آپ نے ترجیح دی تھی۔" اس نے محتاط انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"وہ کسی اچھے ادارے کی تعلیم یافتہ ہو۔" میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ جتنی لڑکیاں بھی انٹرویو کے لیے آئیں' ان میں سے دو یا تین لڑکیاں منتخب کرکے انہیں ان کی فائلیں دے کر میرے پاس بھیج دینا۔ ان میں سے ایک کو میں خود منتخب کروں گا۔ یہ کام پیر کو رکھ لو۔ آج سے ٹھیک پانچ دن بعد۔"

"او کے سر!" اس نے مستعدی سے کہا اور سمجھ گئی کہ اب مجھے مزید کچھ نہیں کہنا ہے' اس لیے تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

پیر کو میں دہلی میں ایک میٹنگ میں شرکت کرکے گیارہ بجے کی فلائٹ سے بمبئی واپس پہنچا اور ایئرپورٹ سے سیدھا دفتر چلا گیا۔ ابھی میں بریف کیس رکھ کر بیٹھا ہی تھا کہ انٹرکام پر سگنل ملا۔ میں نے ریسیور اٹھایا.....دوسری طرف کرسٹینا تھی۔

"سر! شیڈول کے مطابق آج آپ کو اپنے لیے اسٹینو ٹائپسٹ کا انتخاب کرنا تھا۔" کرسٹینا بولی۔ "میں صبح سے کانفرنس روم میں ان لڑکیوں کے ساتھ مغز کھپا رہی تھی' پولیس چوبیس لڑکیاں آئی تھیں۔"

"تم نے ان میں سے کتنی منتخب کی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"صرف دو۔" کرسٹینا نے جواب دیا۔ "بلکہ سچ پوچھئے تو میرا ووٹ صرف ایک ہی کے حق میں تھا لیکن میں نے اپنے طور پر اس اکیلی پر انحصار نہیں کیا کہ آپ شاید اس کی صلاحیتوں کے باوجود اسے منتخب کرنے کا فیصلہ نہ کریں' اس لیے میں نے ایک اور بہترین لڑکی کو ساتھ رکھا ہے اور دو لڑکیوں کو ویٹنگ لسٹ پر بھی رکھا ہے۔"

"اس لڑکی کے بارے میں تم نے یہ کیوں سوچا کہ میں شاید اس کی صلاحیتوں کے باوجود اسے منتخب نہ کروں؟" میں نے پوچھا۔

"سر!" کرسٹینا نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ اس بری طرح برقعے میں لپٹی ہوئی ہے کہ صرف آنکھیں نظر آتی ہیں' دوسرے یہ کہ مجھے اس کی وجہ بھی اتفاقاً معلوم ہو گئی اس کی شکل اتنی خوفناک ہے کہ شاید آپ اسے سامنے بیٹھے دیکھ کر ڈرتے رہا کریں۔ ویسے اس کا اصرار ہے کہ وہ دفتر میں بھی اسی طرح برقع لپیٹے رکھا کرے گی لیکن یہ بھی عجیب لگے گا۔"

"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے' ہوش سنبھالنے کے بعد سے اب تک میں کسی دنیاوی چیز سے نہیں ڈرا۔" میں نے کہا۔ "بہرحال تم پہلے اس لڑکی کو اندر بھیج دو جو بدصورت نہیں ہے۔" میں نے ریسیور رکھ دیا اور بٹن دبا کر دروازے پر سبز بلب روشن کر دیا۔

چند سیکنڈ بعد جو لڑکی اندر آئی' وہ مجھے پہلی ہی نظر میں بھلی لگی وہ سرخ و سپید اور دراز قد تھی۔ عمدہ تراش خراش کے لباس میں تھی۔ اس نے بہت ہی ہلکا میک اپ کیا ہوا تھا۔ اسے خوبصورت لڑکیوں میں شمار کیا جا سکتا تھا۔ وہ روانی سے انگریزی بول سکتی تھی اور اس کی حرکات و سکنات سے سلیقہ جھلکتا تھا۔ اس میں سستے پن کی کوئی علامت نہیں تھی۔ وہ کسی اچھے گھرانے کی فرد معلوم ہوتی تھی۔ تعلیم بھی اس نے اچھے اور معروف تعلیمی اداروں میں پائی تھی۔

میں نے چند نکات بتا کر اسے ایک لیٹر ٹائپ کرنے کے لیے کہا' وہ میرے دفتر ہی کے ایک گوشے میں پڑے بی ایم الیکٹرک ٹائپ رائٹر پر ٹائپ کرنے لگی اور میں کچھ فائلیں دیکھنے لگا۔

چند ہی منٹ میں جو خط ٹائپ کرکے لائی' اسے پڑھ کر میں دل ہی دل میں عش عش کر اٹھا۔ میں اس کے تقرر کا فیصلہ تقریباً کر ہی چکا تھا۔ جب مجھے یاد آیا کہ کرسٹینا نے ایک اور لڑکی کا تذکرہ کیا تھا جو حد سے زیادہ بدصورت مگر اس کے خیال میں بہت زیادہ اہلیت کی

مالک تھی۔

میں نے اس لڑکی کو جس کا تحریر کا نمونہ میں دیکھ چکا تھا' یہ کہہ کر رخصت کر دیا کہ کل تک ٹیلی فون پر اسے حتمی فیصلے سے مطلع کر دیا جائے گا' پھر میں نے کرسٹینا کو ہدایت کہ وہ نقاب پوش بدصورت لڑکی کو اندر بھیج دے۔

سر سے پاؤں تک سیاہ برقعے میں لپٹی ہوئی وہ سرو قد لڑکی اندر آئی۔ اس کی ناک اور پیشانی تک نقاب میں چھپی ہوئی تھی۔ صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ ساحر آنکھیں' جھیل آنکھیں' غزالی آنکھیں' یہ سب تشبیہات ان آنکھوں کے لیے ہیچ تھیں۔ وہ شاید دنیا کی حسین ترین آنکھیں تھیں' کم از کم میں نے اپنی زندگی میں ان سے زیادہ حسین آنکھیں نہیں دیکھی تھیں۔

مگر تمام تر حسن و کشش سے قطع نظر یہ آنکھیں اس قدر سونی تھیں کہ ان میں جھانکتے ہوئے مجھے اندر ہی اندر جھرجھری سی آ گئی۔ اس نے اپنے کوائف کی فائل نہایت آہستگی سے میز پر رکھ دی اور سیدھی کھڑی پلکیں جھپکائے بغیر میری طرف دیکھتی رہی.... پلکیں جھپکانے میں مجھے بھی کامیابی نہیں ہو رہی تھی.... میرا رواں رواں جیسے پتھرا گیا تھا۔

وہ بھی اپنی آنکھوں میں تڑپتے پھڑکتے کسی جذبے کو مدفون رکھنے کی کوشش کر رہی تھی اور مجھے یقین تھا کہ اس کوشش میں دل اس کا بھی خون ہو رہا ہو گا مگر بڑا حوصلہ تھا اس کا۔

مجھے معلوم تھا کہ وہ شروع ہی سے ایک غیر معمولی لڑکی تھی' اس لیے ابھی تک اپنے پیروں پر کھڑی تھی۔ اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا تھا۔ میرے سکوت کو دیکھتے ہوئے شاید وہ سمجھ رہی تھی کہ میں اسے پہچانا نہیں' شاید اس سے اس کی انا بھی مجروح ہوئی تھی اور تبھی شاید وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ وہ خود بھی کچھ نہیں کہے گی۔ نوکری کی تلاش میں آئی ہوئی امیدوار ہی بنی رہے گی۔

شاید اس کا خیال تھا کہ جن آنکھوں سے ٹکر ٹکر میری طرف دیکھ رہی تھی' محض ان کی مدد سے میں اسے نہیں پہچان سکتا۔ کتنی بھولی تھی وہ۔ ان ساحر آنکھوں کو بھلا میں کیسے بھول سکتا تھا؟

یہ میری ماہتاب کی آنکھیں تھیں۔

"میرے سامنے بیٹھ جاؤ ماہتاب! اور چہرے سے نقاب ہٹا دو۔" میرے سینے کی قبر سے یہ آواز اس مردے کی کراہ کی طرح برآمد ہوئی جسے کسی معجزے کے تحت دھیرے دھیرے زندگی مل رہی ہو۔

اس کی آنکھوں میں زلزلہ سا آیا' آنسوؤں کا ایک سیلاب تھا جسے اس نے روکنے کی کوشش کی تھی۔ "ڈر تو نہیں جاؤ گے؟" اس نے کسی روح کی طرح سرگوشی کی۔

"یہ پوچھو کہ خوشی سے مر تو نہیں جاؤ گے۔" میں نے اب قدرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ "گویا میرا مسخ شدہ چہرہ دیکھ کر تمہیں خوشی ہو گی۔" اس کی سرگوشی میں اس مرتبہ کند خنجر کی سی چبھن تھی۔

"نہیں.... خوشی تو تمہارے مل جانے کی ہو گی' کسی بھی عالم میں سہی' مل تو گئیں۔" میری آواز اب پرسکون ہو چکی تھی۔ "مسخ شدہ چہرے پر غور کرنے کا مرحلہ بعد میں آئے گا۔ پہلے ملن کی لذت سے تو لطف اندوز ہو لینے دو۔" میں نرم نرم چمڑے کی پوشش والی گدے دار کرسی میں یا تو دھنسا جا رہا تھا یا پھر کرسی سمیت فضا میں بلند ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے اس موقع پر بھی اپنے محسوسات کو اعتدال پر رکھنے کی کوشش کی۔

میں اٹھ کر اس کی طرف دوڑا نہیں.... میں نے اس کے بکھرے بکھرے وجود کو بازوؤں کے حلقے میں سمیٹنے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے اس کا چہرہ ہاتھوں میں تھام کر یہ نہیں کہا کہ جو آنسو انگارے بن کر اسے اندر ہی اندر جھلسا رہے ہیں' انہیں وہ میرے دامن میں ڈال دے' میں موتیوں کی طرح انہیں سنبھال کر رکھوں گا۔ یہ سب کچھ کرنے اور کہنے کو میرا دل چاہا رہا تھا مگر میں اپنی جگہ ساکت بیٹھا رہا۔

ماہتاب میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی.... پھر دھیرے دھیرے اس نے نقاب چہرے سے ہٹا دیا۔ مجھے نہ تو حیرت کا جھٹکا لگا اور نہ ہی خوف آیا۔ میں نے ایک فوٹوگرافر کی سی باریک بینی سے اس کھنڈر چہرے کا جائزہ لیا۔ آنکھوں کے سوا اس چہرے پر کچھ بھی سلامت نہیں تھا۔

جلد جگہ جگہ سے پھٹ چکی تھی۔ کہیں سے سیاہی جھانک رہی تھی اور کہیں سے ہڈیوں کی سفیدی۔ وہ رخسار جو کبھی گلاب کو شرماتے تھے' جیسے انگاروں پر جھلس چکے تھے۔ وہ ہونٹ جن سے یاقوت کی سی سرخی چھلکتی تھی' چتکبرے ہو چکے تھے اور نچلا ہونٹ تو آدھا غائب ہی تھا۔ اس جگہ ننگے ننگے دانت حسین ہونے کے باوجود ڈراؤنے لگ رہے تھے.... ستواں ناک کے آس پاس گوشت کھنچ چکا تھا جس کی وجہ سے ناک قدرے ٹیڑھی لگ رہی تھی۔ ناک کی پھننگ بھی غائب تھی اور باقی حصے پر بھی سیاہ داغ تھے۔

یہ وہی ماہتاب تھی جس کے حسن نے کالج میں تہلکہ مچا دیا تھا جسے دیکھ کر نوجوانوں کے دل دھڑکنا بھول جاتے تھے اور بڑے بڑے سنجیدہ اور معمر پروفیسروں کے چہرے پر بھی رونق آ جاتی تھی۔

یہ وہی ماہتاب تھی جس کی محبت میری زندگی کا حاصل تھی' جسے میں نے پوجنے کی حد تک چاہا تھا۔

چند لمحے کے لیے ہم دونوں خاموش رہے اور یہ چند لمحے گویا صدیوں پر محیط تھے' پھر میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ "اب مجھے سب کچھ بتاؤ کہ یہ کیسے ہوا.... کوئی پہلو

تشنہ نہ رہنے پائے۔"

"کیا کرو گے سن کر؟" اس کے لہجے میں اب بھی زہر تھا۔ "سانپ نکل جائے تو لکیر پیٹنے کا فائدہ؟" میں نے جب تمہیں آوازیں دے کر روکنا چاہا تھا کہ تم مجھے کن خطرات میں گھری ہوئی چھوڑ کر جا رہے ہو؟ اس وقت حد سے زیادہ جذباتی بنے ہوئے تھے' اب حد سے زیادہ سرد مزاج بنے ہوئے ہو۔"

"تم مجھ پر زہر میں بجھے ہوئے جتنے بھی تیر برساؤ.....بلکہ زندگی بھر برساتی رہو گی تب بھی اس زیاں کا حساب پورا نہیں ہوگا جو میری وجہ سے تمہیں پہنچا ہے لیکن جو کچھ میں پوچھ رہا ہوں' خدا کے لیے اس کا جواب ضرور دو.....یہ بہت ضروری ہو گیا ہے۔" میں نے یہ سب کچھ اتنے دھیمے پن سے کہا تھا کہ ایک ایک لفظ اس کے ذہن میں اتر جائے۔

چند لمحے وہ میرے پیچھے کسی چیز پر نظر جمائے بیٹھی رہی۔ پھر میری طرف دیکھے بغیر دھیرے سے بولی۔ "سب کچھ ایک ڈراونا خواب لگتا ہے۔ کتنی جلدی سب کچھ ہو گیا۔ آشیاں بنانے میں بڑا وقت لگتا ہے.....تنکا تنکا چنتے چنتے عمر بیت جاتی ہے لیکن اجاڑنے میں کچھ دیر نہیں لگتی۔"

○



وہ چند لمحے خاموش رہی گویا اس کی سمجھ میں نہ آرہا ہو کہ بات کہاں سے شروع کرے.....آخر اس نے دھیمے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "تمہارے غائب ہونے کے چند روز بعد ہی ابو کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا۔ وہ دکان کے سامنے اپنی گاڑی پارک کر کے سڑک پار کر رہے تھے کہ ایک تیز رفتار ٹرک اچانک نمودار ہوا اور انہیں کچلتا ہوا گزر گیا۔ ہم نے اسے محض ایک حادثہ ہی سمجھ کر جس طرح بن پڑا' برداشت کیا لیکن بعد میں کہیں زیادہ اذیت اس وقت ہوئی تھی جب پتا چلا کہ یہ حادثہ نہیں تھا.....یہ بتانے کی تو کوئی ضرورت نہیں کہ اس ٹرک کا کوئی سراغ نہیں لگ سکا تھا۔ ابھی میں اور امی چالیسویں کے بعد ایک دوسرے کے آنسو پونچھنے ہی میں مصروف تھے کہ صرافہ بازار میں رات کو گشتی پولیس کے کئی سپاہیوں اور صرافہ بازار کے اپنے چوکیداروں کی موجودگی میں ہماری دکان پر ڈاکہ پڑا اور ڈاکو گویا دکان میں جھاڑو پھیر گئے۔ لاکھوں کے قیمتی زیورات اور ہیرے موتیوں میں سے ایک ذرہ بھی نہیں چھوڑا بلکہ ایک سیف ان سے نہیں ٹوٹا تو سیف ہی دیوار سے اکھاڑ کر لے گئے۔ ہم نے اب بھی یہی سمجھا کہ تقدیر ہمارے خلاف سازش کر رہی ہے اور ہم نے محض اس مقولے سے اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ مصیبت تنہا نہیں آتی۔ جواہرات اور زیورات کی دکان میں ابو کی ایک ہندو سیٹھ ارجن داس سے پارٹنر شپ تھی' وہ بہت ہی اچھا اور ہمدرد قسم کا آدمی تھا۔ ابو اپنی زندگی میں اس پر بہت اعتماد کرتے تھے' اس لیے ظاہر ہے امی کی نظر میں بھی اس کا مقام محترم تھا۔ ڈاکے کے چند روز بعد وہ آدمی امی کے پاس آیا' نہایت افسردہ و ملول تھا لیکن اس نے مجھے اور امی کو بہت ڈھارس دی۔ اس کی شیریں بیانی کا کوئی جواب ہی نہیں تھا۔

سیٹھ ارجن داس نے امی کو بتایا کہ دکان کے بیمے کی رقم اور ابو کا بینک بیلنس وغیرہ حاصل کرنے میں انہیں بہت وقت لگے گا اور بہت سے قانونی نقائص کی وجہ سے شاید انہیں کسی ایک یا دونوں چیزوں سے محروم ہونا پڑ جائے اور چونکہ انہیں قانونی معاملات کا ادراک نہیں ہے اور وہ محض وکیل پر انحصار کر کے سارے معاملات سے نہیں نمٹ سکتیں' اس لیے بہتر یہی ہے کہ امی اس کے نام پاور آف اٹارنی لکھ دیں' وہ خود ہی سارے کام سیدھے کر لے گا۔

امی کاروباری معاملات میں بالکل اناڑی تھیں' سیٹھ ارجن داس کی شیریں بیانی کے جال سے نہ بچ سکیں۔ انہوں نے نہ صرف پاور آف اٹارنی لکھ دی بلکہ وصیت نامہ بھی اسکے حوالے کر دیا کیونکہ اس کا کہنا تھا کہ پاور آف اٹارنی کے کاغذات کے ساتھ وصیت کی ایک مصدقہ نقل بھی منسلک ہوگی۔ مصدقہ نقل تیار کرنے کے بعد وہ اصل وصیت نامہ واپس کر دے گا۔

اس کے بعد سیٹھ ارجن داس کا کوئی پتا نہیں چلا۔ امی کے اکاؤنٹ میں کچھ رقم تھی لیکن وہ کب تک ساتھ دے سکتی تھی؟ ہاتھ تنگ ہونے پر امی نے انشورنس کمپنی اور بینک وغیرہ سے رابطہ قائم کیا تو معلوم ہوا کہ سیٹھ ارجن داس انشورنس کا کلیم اور بینک بیلنس وغیرہ سب وصول کر چکا ہے' امی نے اس کے گھر فون کیا' وہ رنڈوا تھا۔ اس کے دو بیٹے اپنی بیویوں کے ساتھ ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ان کا باپ تو انگلینڈ چلا گیا ہے اور وہاں کوئی کاروبار سیٹ کرنے کے چکر میں ہے' اس لیے دو سال تک واپس نہیں آئے گا۔

امی نے حواس باختگی کے عالم میں اپنے اور اس کے مشترکہ وکیل سے رابطہ قائم کیا' وہ نہایت رکھائی سے پیش آیا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھی ارجن داس سے مل چکا ہے۔ اس نے بتایا کہ ارجن داس کے خلاف مقدمہ قائم کرنے کے لیے کوئی ٹھوس بنیاد موجود نہیں ہے اور اگر مقدمہ کیا بھی گیا تو سالوں چلے گا اور امی کو کچھ ملنے کے بجائے الٹا مقدمہ کے اخراجات ادا کرنے پڑ جائیں گے۔

ادھر سے مایوس ہو کر ہم ابھی کوئی دوسرا راستہ تلاش بھی نہ کر پائے تھے کہ ایک روز مدن موہن دو بدمعاشوں کے ساتھ ہمارے ہاں آیا۔ پہلے اس نے بڑے مہذبانہ انداز میں ہمارے حالات پر اظہار ہمدردی کیا۔ پھر امی سے کہنے لگا کہ اگر وہ اپنی بیٹی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھما دیں تو سارے مسئلے حل ہو سکتے ہیں۔

مجھے شبہ تو پہلے ہی تھا' اب یقین ہو گیا کہ کم از کم ٹرک والے حادثے اور دکان کی ڈکیتی کے پیچھے اسی کا ہاتھ تھا۔ امی ظاہر ہے' اس کی بات سن کر آگ بگولہ ہو گئیں۔ تب اس کا انداز تخاطب یکسر بدل گیا۔ اپنے مخصوص لوفرانہ لہجے میں بولا۔ "بڑھیا! رسی جل گئی مگر بل نہیں گیا۔ میں چاہوں تو ابھی تمہاری بیٹی کو اٹھا کر لے جاؤں لیکن میں تم دونوں کو اپنے قدموں پر جھکانا چاہتا ہوں۔ وہ دن دور نہیں جب تم خود اپنی بیٹی کا ہاتھ پکڑ کر اسے میری جھولی میں ڈالنے آؤ گی اور یہ خود بھی میری نظر کرم کے لیے سو سو جتن کرے گی۔ میری نوازشات کے لیے ترسے گی۔

امی نے اس کے منہ پر طمانچہ رسید کر دیا۔ تب وہ غصے سے لال پیلا ہو گیا' اس نے اپنے ایک ساتھی کو اشارہ کیا اور اس نے پنڈلی پر بندھا ہوا خنجر نکال کر امی کے سینے میں

اتار دیا.....

ماہتاب کی آواز ضبط کی تمام تر کوششوں کے باوجود بھرا گئی اور آنکھوں کا سونا پن بڑھ گیا۔ چند لمحے تک وہ کٹے پھٹے ہونٹوں کو بھینچے بیٹھی رہی۔ پھر جھرجھری سی لے کر ایک طویل سانس لیتے ہوئے بولی۔ "تم اس وقت کا تصور نہیں کر سکتے' ایک جوان لڑکی کے گھر میں رات گئے تین درندہ صفت بدمعاش گھسے ہوئے ہوں' سامنے خون میں لت پت ماں کی لاش پڑی ہو اور پاس پڑوس میں ایسا کوئی بھی نہ ہو جو آپ کی آواز سن کر دیکھنے کے لیے آجائے کہ معاملہ کیا ہے۔ اس لڑکی کا اس وقت کیا عالم ہوگا' یہ تم نہیں جان سکتے۔

مدن موہن نے قہقہہ لگاتے ہوئے خباثت بھری نظروں سے میری طرف دیکھ کر کہا۔ "میں چاہوں تو ابھی تمہیں اٹھا کر لے جاؤں لیکن اب بات اس سے بڑھ گئی ہے' تم میری ضد بن گئی ہو۔ اب میں اس وقت کے لیے تھوڑا سا انتظار کر لوں گا جب تم گھٹنوں کے بل رینگتی ہوئی آؤ گی اور پالتو بلی کی طرح میرے قدموں میں لوٹا کرو گی.....میں جب چاہوں گا تمہیں تھپکی دوں گا اور جب چاہوں گا ٹھوکریں ماروں گا۔"

مدن اور اس کے ساتھی بڑے اطمینان سے رخصت ہو گئے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ میں دیر تک امی کا سرد ہاتھ تھامے ان کے سرہانے گم صم بیٹھی رہی۔ اس امید پر کہ شاید یہ کوئی ڈراؤنا خواب ہے' جلد ہی ٹوٹ جائے گا...... لیکن پھر مجھے یقین کرنا ہی پڑا.....مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ہمارے علاقے کا تھانہ کس طرف ہے۔ آدھی رات کے قریب میں پوچھتی پاچھتی گرتی پڑتی تھانے پہنچی۔ وہاں پر موجود ہر پولیس والا اپنے اپنے عہدے کے مطابق میرے جسم کے مختلف حصوں تک رسائی کی کوشش کرنے لگا۔ بالآخر میں نے جب انگریزی میں انہیں گالیاں دیں تو وہ کچھ کچھ پیچھے ہٹے......پھر ایس ایچ او نے آکر ڈانٹ ڈپٹ کر سب کو ان کے کاموں پر لگایا......بڑی توجہ اور ہمدردی سے میری کہانی سنی۔

میرے حواس مختل اور اعصاب منتشر تھے لیکن جیسے بھی مجھ سے بن پڑا' میں نے مدن موہن کے متعلق سب کچھ تفصیل سے بتانے کی کوشش کی' اس نے مجھے بڑی تسلیاں دیں۔ مجھے انصاف بہم پہنچانے کا وعدہ کیا۔ اس قسم کے کئی **ڈائیلاگ** بھی بولے جو ہندوستانی فلموں میں عموماً بولے جاتے ہیں۔ قانون کی بالادستی' مظلوم کی دادرسی اور اس قسم کی دوسری باتیں۔ محض بکواس.....

پولیس آکر میری امی کی لاش لے گئی.....دوسرے روز پوسٹمارٹم کے بعد لاش ملی اور تقریباً لاوارثوں کے سے انداز میں دفن کر دی گئی۔ کالج سے میں فارغ ہو چکی تھی۔ کلاس فیلوز سب ادھر ادھر بکھر چکے تھے۔

میں تمہیں مختصراً سب کچھ بتا رہی ہوں......تھانے کچہری کے ذریعے مدن موہن کا کچھ نہیں بگڑا.....میں اپنے آپ کو بے حد غیر معمولی لڑکی سمجھتی تھی لیکن ان حالات میں سارا

غیر معمولی پن دھرا رہ گیا تھا۔ بالآخر میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے اس شہر سے کہیں چلے جانا چاہیے' چپ چاپ نکل لینا چاہیے۔ یہاں زندگی میرے لیے حرام کر دی گئی تھی۔ یہ بات طے تھی کہ میرے لیے حالات اس سے برے ہی ہو سکتے تھے' اچھے نہیں.....چنانچہ میں نے بمبئی آنے کا فیصلہ کر لیا۔ دل میں ایک موہوم سی امید یہ بھی تھی کہ شاید یہاں کہیں زندگی کے موڑ پر تم سے بھی سامنا ہو جائے۔

اس نے اداس سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں کی یاسیت کچھ اور بڑھ گئی۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ "راجہ نامی ایک پراپرٹی ڈیلر نے مجھے تنہا و لاوارث دیکھ کر مکان بھی چند ہزار میں مجھ سے ہتھیا لیا۔ اس نے مجھے ایسے چکر دیئے کہ میں چند ہزار کی رقم ہی قبول کرنے پر تیار ہو گئی۔ میں نے کوٹھی کی چابی راجہ صاحب کے حوالے کی اور ٹیکسی کرکے سٹیشن پہنچ گئی.....میں ابھی پلیٹ فارم پر قلی کی تلاش میں نظر ہی دوڑا رہی تھی کہ ایک شخص جانے کس سمت سے مجھ سے آٹکرایا۔ میں نے صرف اس کا ہاتھ حرکت میں آتے دیکھا جس میں شیشے کا کوئی برتن سا تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ شخص ہجوم میں غائب ہو گیا۔ مجھے یہی محسوس ہوا تھا جیسے کسی نے میرے چہرے پر انگارے پھینک دیئے ہیں جو وہیں چپک کر رہ گئے ہیں۔

میرے حلق سے شاید اذیت بھری چیخیں نکل رہی تھیں اور میں پلیٹ فارم پر گر کر ایڑیاں رگڑنے لگی تھی۔ میری آنکھیں بند تھیں' مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ درحقیقت ہوا کیا ہے۔ بس اذیت کا ایک احساس تھا' میں نے اپنے اردگرد لوگوں کے دوڑنے بھاگنے کی آوازیں سنیں لیکن جلد ہی میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا۔ ماہتاب نے ایک بار پھر خاموش ہو کر خلا میں گھورا گویا اس وقت کے تصور سے اس کی قوت گویائی سلب ہو گئی ہو۔

"مجھے ہوش آیا تو......" اس نے میری منتظر نگاہوں کو محسوس کرتے ہوئے ایک بار پھر بولنا شروع کیا۔ "میرے چہرے پر برستی ہوئی آگ ٹھنڈی پڑ چکی تھی اور گردن تک چہرہ پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا' صرف آنکھوں پر پٹیوں کے درمیان ایک موٹی لکیر جتنا خلا تھا جس سے میں اپنے گرد و پیش کا منظر دیکھ سکتی تھی۔ سب سے پہلے تو اس احساس سے میری روح کو طمانیت ہوئی کہ میں دیکھ سکتی تھی' میری بینائی محفوظ تھی ورنہ جب میں ریلوے پلیٹ فارم پر گری تھی تو مجھے یہی محسوس ہوا تھا کہ میری بینائی بھی جاتی رہی ہے۔

اردگرد دیکھنے پر احساس ہوا کہ میں کسی ہسپتال میں تھی۔ جلد ہی ایک لیڈی ڈاکٹر مجھے دیکھنے آئی۔ اس نے میرے اشاراتی استفسار پر بتایا کہ کسی نے میرے چہرے پر تیزاب پھینک دیا تھا۔ میری آنکھیں معجزانہ طور پر محفوظ رہی تھیں' لوگوں نے مجھے ریلوے کے بعض کارکنوں کی مدد سے ریلوے ہسپتال پہنچا دیا تھا کیونکہ اس وقت قریب وہی تھا۔

میں نے اشاروں ہی اشاروں میں اپنے سامان کے متعلق پوچھا تو پتا چلا کہ میرے قریب

صرف ایک سوٹ کیس پایا گیا تھا جو اس وقت پولیس کی تحویل میں ہے۔ بیگ کا کسی کو کچھ پتا نہیں تھا۔ مجھے اپنی آخری پونجی لٹ جانے کا کوئی خاص دکھ نہیں ہوا' شاید بربادی اور مسلسل تباہی کے راستے پر ایک مقام ایسا بھی آتا ہے جب ہر صعوبت ہیچ ہو کر رہ جاتی ہے یا پھر شاید انسان کا احساس ہی مر جاتا ہے۔

شام کو ایک اے ایس آئی میرا بیان لینے آیا تاکہ ایف آئی آر درج کی جا سکے لیکن لیڈی ڈاکٹر نے اسے بتایا کہ فی الحال میں بولنے سے قاصر ہوں اور ابھی میرے منہ پر پٹی ڈھیلی نہیں کی جا سکتی۔ میں نے اشارے سے اے ایس آئی سے کاغذ اور قلم مانگا اور اسے ایک رقعہ لکھ کر دیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ مجھے کچھ اندازہ نہیں کہ کس نے میرے چہرے پر تیزاب پھینکا اور کیوں پھینکا۔ میں تو ایک کام کے سلسلے میں چند دن کے لیے بمبئی جا رہی تھی۔

میں نے اس سے رقم اور قیمتی اشیاء سے بھرے ہوئے بیگ کے متعلق بھی کچھ نہیں پوچھا بلکہ میں نے تو اس سوٹ کیس کے سلسلے میں بھی کوئی سوال نہیں کیا جو اس کی تحویل میں تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میرے چہرے پر تیزاب پھینکنے والا شخص مدن موہن کے گرگے کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ جھنجلاہٹ میں اس نے آخری قدم اٹھایا تھا اور مجھے موت سے زیادہ بھیانک سزا دی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ جس وقت میں پونا کو الوداع کہنے کی تیاریاں کرتی پھر رہی تھی' اس کا کوئی نہ کوئی گرگا مجھ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔

اب ان سب باتوں کو دہرانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا' خصوصاً پولیس کے سامنے۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ دولت اور طاقت کے قانون کے سامنے پولیس اور عدالتیں کسی کو کتنا انصاف فراہم کر سکتی ہیں۔

میں ہسپتال میں سولہ دن زیرعلاج رہی۔ آخری پٹی کھلنے کے بعد ڈاکٹروں نے مجھے ہمت و استقامت کے موضوع پر ایک اور اجتماعی لیکچر دیا۔ اس کے بعد مجھے آئینہ دکھایا گیا۔ ان کا خیال تھا کہ میں چیخیں مارنے لگوں گی۔ زار و قطار روؤں گی لیکن ایسا نہیں ہوا شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میں ذہنی طور پر اس سے بھی کہیں بدتر صدموں کے لیے تیار ہو چکی تھی یا پھر شاید زندگی سے میری دلچسپی ہی ختم ہو گئی تھی۔ صدموں اور نقصانات کا احساس تو انہیں ہوتا ہے جنہیں زندگی کو زندگی کی طرح بسر کرنا ہو۔ مجھے تو اب صرف اتنی سانسیں پوری کرنی تھیں جتنی میرے مقدر میں لکھ دی گئی تھیں۔

آئینے میں اپنا چہرہ.....یا یوں کہو کہ اپنی تقدیر کا چہرہ دیکھ کر میں نے اف تک نہ کی۔ برقعے کا انتظام میں نے پہلے ہی کر لیا تھا۔ اس میں لپٹ کر ہسپتال سے رخصت ہو گئی۔ میرا ارادہ اب بھی بمبئی ہی جانے کا تھا' تاہم اس بار میں بس کے ذریعے روانہ ہوئی اور خیریت سے پونا کی حدود سے نکلنے میں کامیاب ہو گئی۔ شاید اب مجھے ایک ایسا شکار سمجھ کر چھوڑ دیا

گیا تھا جس میں شکاری کے لیے کوئی کشش باقی نہیں رہی تھی۔

یہاں بمبئی میں میری ایک شادی شدہ دوست رہتی تھی جو پونا کے کالج میں میرے ساتھ پڑھتی تھی لیکن تعلیم ادھوری چھوڑ کر کم عمری میں بیاہ دی گئی تھی اور تب سے بمبئی ہی میں تھی۔ کبھی کبھار اس سے میرا خطوں کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔ اس کا ایڈریس مجھے یاد تھا' بس سے اتر کر میں سیدھی اس کے پاس پہنچی۔

ظاہر ہے اس نے مجھے نہیں پہچانا اور میرے اصرار کے باوجود وہ مجھے ماہتاب تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہوئی اور جب میں نے اسے اپنی چند ایک نشانیاں دکھائیں اور چند ایک ایسی باتیں بتائیں جن کا علم صرف مجھے ہی ہو سکتا تھا' تب اس نے مجھے ماہتاب تسلیم تو کر لیا لیکن اس کی رنگت زرد پڑ گئی اور جب میں نے اس سے کہا کہ مجھے چند دن کے لیے پناہ درکار ہے' اس کے بعد میں اپنا کوئی انتظام کر لوں گی تو اس کی رنگت کچھ اور زیادہ زرد پڑ گئی۔ وہ بالکل گم صم سی ہو گئی۔

اسی دوران اس کا شوہر بھی آ گیا۔ میری دوست نے علیحدگی میں جا کر اس سے کچھ مشورہ کیا اور پھر میرے پاس آ کر بولی۔ تم دیکھ رہی ہو' ہمارا فلیٹ کچھ زیادہ بڑا نہیں' بچے بھی سارا دن انہی کمروں میں کھیلتے ہیں۔ اب تم چوبیں گھنٹے تو چہرہ لپیٹ کر نہیں رکھ سکتیں.....ظاہر ہے بچوں کی نظر تو پڑے گی.....اور اس طرح ان کے ذہن پر برے اثرات مرتب ہوں گے.....تم میرا مطلب سمجھ رہی ہو ناں؟ برا مت ماننا.....آج کی رات تو تم یہاں ٹھہرو' صبح میرے میاں لڑکیوں کے ایک بورڈنگ ہاؤس میں تمہارا بندوبست کر دیں گے.....وہاں رہائش ذرا مہنگی ہے لیکن اتنی جلدی کوئی معقول بندوبست نہیں ہو سکتا۔ بہرحال تم گھبرانا نہیں.....اگر روپے پیسے کی کوئی کمی پڑی تو ہم کسی نہ کسی طرح کوئی بندوبست کرنے کی کوشش کریں گے۔

میں نے اسے بتایا کہ سردست پیسے کا مسئلہ نہیں۔ مجھے صرف رہنمائی کی ضرورت ہے۔ بمبئی میرے لیے نیا شہر ہے' مجھے اپنی دوست کے رویئے سے کوئی دکھ نہیں ہوا۔ میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ مجھ میں اب دکھ محسوس کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رہی تھی۔ میں اس سے زیادہ ہمدردی کی توقع ہی لے کر نہیں آئی تھی۔

دوسرے دن میں بورڈنگ ہاؤس میں منتقل ہو گئی جہاں رفتہ رفتہ میری مختصر سی پونجی ختم ہونے لگی۔ میں نے اخباروں میں خالی آسامیوں کے اشتہار دیکھ کر دفتروں کے چکر لگانا شروع کر دیئے۔ میں نے ایک ایک دن میں چھ چھ انٹرویو دیئے لیکن ہر جگہ سے کچھ اس قسم کا جواب ملتا تھا "آپ کی اہلیت اور قابلیت میں تو کوئی شک نہیں مگر....." اس "مگر" سے آگے کچھ نہیں کہا جاتا تھا لیکن میں جانتی تھی کہ کون سے الفاظ ان کے حلق میں گھٹ کر رہ جاتے ہیں۔

کام کی اہمیت بے شک ان کی نظروں میں مسلم تھی لیکن کام کرنے والی ان کے خیال میں کم از کم ایسی تو ہونی چاہیے تھی کہ اگر دفتر کی دلکشی میں اضافہ نہ بھی ہو تو کم از کم کارکن اور آنے والے دیکھ کر خوف تو نہ کھائیں یا پھر دفتر کی میز پر بھی ناک منہ تک برقعے میں لپٹی ہوئی لڑکی کو دیکھ کر تجسس کے مارے اعصابی تناؤ کا شکار نہ ہوں۔

آج میری جیب میں آخری پانچ کا نوٹ رہ گیا تھا۔ بورڈنگ ہاؤس کا ایک ماہ کا کرایہ اور میس کا بل واجب الادا ہے اور میں مصمم ارادہ کر کے آئی تھی کہ اگر آج بھی ملازمت نہ ملی تو میں بس میں بیٹھ کر سیدھی سمندر پر جاؤں گی۔ سیر کے لئے لانچ میں بیٹھوں گی اور گہرے سمندر میں پہنچ کر چھلانگ لگا دوں گی اور وہ بھی اتنی خاموشی سے کہ لانچ چلانے والے کو پتا ہی نہ چل سکے۔ وہ جب چکر لگا کر واپس آئے اور کیبن میں مجھے موجود نہ پائے تو گھبراہٹ اور خوف کے مارے میں زبان بند ہی رکھنے میں عافیت سمجھے۔

تم سے ملاقات کا تو میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اب تو میں نے یہ امید بھی دل سے نکال دی تھی کہ بمبئی میں شاید کبھی راہ چلتے تمہاری صورت نظر آ جائے۔ خصوصاً ان حالات میں تم سے سامنا ہونے کا تو میں خواب میں نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس نے آفس کے در و دیوار پر نظر ڈالتے ہوئے کہا لیکن تم اگر اس وقت مجھے پہچاننے سے قاصر رہتے تو مجھے کوئی دکھ نہ ہوتا اور نہ ہی میں تمہیں اپنے متعلق کچھ بتانے کی کوشش کرتی لیکن یہاں بھی ملازمت نہ ملنے کا مجھے ضرور دکھ ہوتا۔

اس کے دونوں ہاتھ میز پر ٹکے ہوئے تھے اور انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسی ہوئی تھیں۔ میرے ہاتھ غیر ارادی طور پر آگے بڑھے اور میں نے ان شناسا ہاتھوں کو اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا۔ ان کے گداز میں آج بھی کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ چند لمحے تک وہ ایک ٹک میری طرف دیکھتی رہی' میں محسوس کر رہا تھا کہ اس کی سانسیں بتدریج تیز ہو رہی ہیں اور جس میں ارتعاش بڑھ رہا ہے۔

پھر جیسے مدت سے باندھا ہوا ضبط کا بند ٹوٹ گیا۔ ایک گھٹی گھٹی سی چیخ کے ساتھ وہ بلک بلک کر رو دی۔ میں نے اسے چپ کرانے کی کوشش نہیں کی۔ مجھے معلوم تھا کہ تیزاب نے صرف اس کے چہرے کو جلایا ہے لیکن یہ آنسو اگر اس کے سینے ہی میں رکے رہے تو اس کی روح تک کو خاکستر کر دیں گے۔ بالآخر اس نے میز پر سر ٹیک دیا' ہر سسکی کے ساتھ اس کا جسم بری طرح لرز رہا تھا۔

پھر جیسے جذبوں کے آتش فشاں کو دھیرے دھیرے قرار آنے لگا۔ اس کی سسکیاں مدھم پڑنے لگیں اور ان کے درمیان اس نے نیم روٹھے ہوئے بچوں کی طرح اٹک اٹک کر کہا۔ "اس بار ہاتھوں کو تھاما ہے تو پہلے کی طرح چھوڑ کر.....زمانے کی بھیڑ میں نہ کھو جانا.....میں تمہاری خاطر لٹ گئی ہوں.....برباد ہو گئی ہوں.....میرے پاس کچھ باقی نہیں بچا.....مجھ سا تہی

دامن خدا کسی کو نہ کرے.....“

میں اٹھا اور میز کے گرد چکر کاٹ کر اس کے قریب پہنچا۔ ایک ہاتھ اس کے کندھے پر رکھا اور دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے میں دیر تک اس کے بالوں میں کنگھی سی کرتا رہا۔ جب وہ بالکل پرسکون ہو چکی تو میں نے اس کا چہرہ اوپر کیا اور اپنے دل میں موجزن محبت کے سمندر کی تمام تر شدتوں کو سینے ہی میں مخفی رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے صرف اتنا کہا۔ ”اب سب کچھ بھول جاؤ‘ سارے غم سارے تفکرات‘ میرے لیے چھوڑ دو.....سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

اس کی آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں اور آنسوؤں سے پورا چہرہ بھیگا ہوا تھا لیکن اب وہ مسکرانے پر قادر ہو چکی تھی۔ کیا یہ مسخ شدہ چہرہ بھی ٹھیک ہو جائے گا؟“ اس نے انگلی سے اپنے چہرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اور نیم طنزیہ سے انداز میں مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں.....یہ مسخ شدہ چہرہ بھی ٹھیک ہو جائے گا۔“ میں نے وثوق سے کہا۔

”غالباً تم پلاسٹک سرجری کی بات کرو گے؟“ اس نے گویا میری کوئی غلط فہمی دور کرتے ہوئے ..... ”لیکن جن ڈاکٹروں نے میرا علاج کیا تھا‘ انہوں نے باتوں باتوں میں مجھے بتا دیا تھا کہ اتنے بگڑے ہوئے چہرے کی درستی پلاسٹک سرجری کے ذریعے بھی ممکن نہیں۔“

”شاید انہوں نے تمہاری مفلسی کو دیکھتے ہوئے تمہیں مزید معلومات بہم پہنچانا غیر ضروری سمجھا ہو۔“ میں نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ اس کے پیکر سے آج بھی وہی پراسرار سی خوشبو پھوٹ رہی تھی جو کبھی مجھے دور ہی سے اس کی آمد کا پتا دیا کرتی تھی۔

”پلاسٹک سرجری کی ترقی یافتہ شکل کاسمیٹک سرجری ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اس میں وقت اور پیسہ تو بہت لگتا ہے لیکن یوں سمجھو کہ ناممکنات کو ممکن بنا دیا جاتا ہے۔ بری طرح کٹے پھٹے چہرے درست ہو جاتے ہیں‘ گنجوں کے سر پر بال اگ آتے ہیں اور بوڑھوں کی جھریاں دور ہو جاتی ہیں۔“

”ہندوستان میں تو میں نے اس قسم کی سرجری کا کہیں تذکرہ نہیں سنا۔“ ماہتاب نے کہا۔

”میں ہندوستان کی نہیں‘ انگلینڈ اور امریکہ کی بات کر رہا ہوں۔ انتظامات مکمل ہوتے ہی تمہیں لندن یا نیو یارک کی طرف پرواز کرنی ہوگی۔“ میں نے کہا

”تم ساتھ نہیں چلو گے کیا؟“ اس نے پوچھا۔ اس کی آنکھوں میں زندگی سے دلچسپی لوٹ آئی تھی۔

”نہیں.....میرا اندازہ ہے کہ تمہارے علاج میں شاید چھ ماہ یا اس سے بھی زیادہ عرصہ

لگ جائے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن میں تمہیں بھجوانے‘ وہاں تمہارے قیام اور واپس آنے کے نہایت تسلی بخش انتظامات کر دوں گا تمہیں بس آنکھیں بند کرکے ہدایات پر عمل کرنا ہوگا اور کچھ نہیں۔“

پھر میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”آؤ اب گھر چلیں۔“ نیچے آکر میں نے پارکنگ لاٹ سے گاڑی نکال لی اور ماہتاب کو ساتھ بٹھا کر روانہ ہو گیا۔

میں نے گھر میں نوکروں کی بھیڑ بھاڑ نہیں رکھی تھی۔ محض اس مصلحت کے تحت کہ میں اپنی نجی زندگی کو کم سے کم افراد تک محدود رکھنا چاہتا تھا۔ گھر میں صرف دو نوکر تھے۔ میاں بیوی‘ دونوں اس قدر محنتی اور مستعد تھے کہ آج تک مجھے کسی تیسرے ملازم کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ ان میں عام نوکروں والے خصائل نہیں پائے جاتے تھے اور میں انہیں تنخواہ بھی عام گھریلو ملازموں کے مقابلے میں چار گنا دیتا تھا۔ میاں کا نام کرمو تھا اور بیوی کا بشیراں۔ کرمو چھ فٹ سے بھی نکلتا ہوا ایک کڑیل نوجوان تھا اور بشیراں بھی خوبصورتی کے اعتبار سے کچھ کم نہ تھی۔

میں اور ماہتاب ہال میں پہنچے تو بشیراں کچن سے اور کرمو ڈرائنگ روم سے آتا دکھائی دیا۔

”میں بہت جلدی میں ہوں۔“ میں نے دونوں میاں بیوی کو مخاطب کیا۔ ”تم اپنا اپنا کام کرتے رہو۔ مجھے تمہیں صرف یہ بتانا تھا کہ آج سے یہ بی بی اس گھر میں رہیں گی اور تم نے بالکل اسی طرح ان کے آرام کا خیال رکھنا ہے اور حکم ماننا ہے جس طرح میرا.....“

انہوں نے اثبات میں سر ہلایا اور واپس چلے گئے۔ میں نے نچلی منزل کے تمام کمرے ماہتاب کو دکھا دیئے جن میں دو خوابگاہیں تھیں۔ ”جہاں تمہارا دل چاہے ڈیرہ ڈال دو۔ جب جی چاہے سو جایا کرو۔ جب جی چاہے اٹھ جایا کرو۔ کسی بھی سلسلے میں وفاشعار بیویوں کی طرح میرا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں.....کیونکہ ابھی تم صرف وفاشعار ہو‘ بیوی نہیں۔“ میں شرارتاً مسکرایا.....”اور میں بھی چونکہ صرف وفاشناس ہوں‘ شوہر نہیں‘ اس لیے میرا کوئی معمول نہیں.....اکثر میں راتوں کو بہت دیر سے گھر آتا ہوں اور کبھی کبھی تو کئی کئی رات آتا ہی نہیں۔“

”کہاں رہتے ہو؟“ اس نے فوراً بے ساختہ پوچھا۔

”دیکھا.....بیویوں کی طرح سوال شروع کر دیئے ناں..... ادھر آپ نے کسی لڑکی کو گھر سونپا اور ادھر اس نے سوال شروع کیے۔“ میں نے اسے چھیڑا۔

”بہت بدمعاش ہو گئے ہو۔“ وہ کچھ جھینپ سی گئی۔ ”کیا دولت آنے سے بدمعاشی بھی آجاتی ہے؟“ اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا‘ اسے یک بیک جیسے کوئی خیال اداس کر گیا۔ نقاب میں چھپے ہوئے اپنے چہرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ”اس صورت

کے ساتھ کیا میں تمہاری بیوی ہونے کا تصور کر سکتی ہوں؟"

"کیوں' کیا ہوا تمہارے چہرے کو؟" میں نے سادگی سے کہا۔ "مجھے تو تمہارا صرف وہی چہرہ نظر آتا ہے جو شروع سے میرے ذہن پر نقش ہے۔ اس چہرے پر اگر تم نے کوئی اور چہرہ سجا لیا ہے تو وہ یقینی عارضی ہوگا۔"

"دل رکھنے میں تمہارا کوئی جواب نہیں۔" وہ مغموم سے انداز میں مسکرائی۔

"میرا کسی بھی معاملے میں کوئی جواب نہیں۔" میں نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔ "تم دیکھتی جاؤ۔"

دوسرے روز میں دفتر میں اخبار دیکھ رہا تھا کہ ایک اشتہار دیکھ کر یک لخت نہ جانے کیوں چوکنا ہو کر بیٹھ گیا۔ یہ اشتہار مالتی مندر پر پرنس شومبی کے پیلس کی فروخت سے متعلق تھا۔ پرنس کے اسٹیٹ مینجر نے لکھا تھا کہ محل کو خریدنے کی خواہشمند پارٹیاں چاہیں تو پانچ تاریخ تک اس سلسلے میں پرنس شومبی سے ملاقات کر سکتی ہیں۔ مذکورہ تاریخ تک وہ تاج محل ہوٹل کے وی آئی پی سوئٹ میں مقیم ہوں گے۔

اس کا مطلب تھا' پرنس شومبی زندہ تھا۔ چھنا کے ہاتھوں مرا نہیں تھا لیکن اس کے زخمی ہونے یا کہیں زیرعلاج رہنے کی کہانی کسی اخبار میں نہیں آئی تھی۔ اس نے یقیناً اپنی رسوائی کے ڈر سے سارے قصے کو دبا دیا تھا۔

میرے ذہن میں جیسے کچھ چرخیاں سی تیزی سے گھومنے لگی تھیں۔ میں نے انٹرکام کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن پھر رک گیا۔ کچھ دیر مزید سوچنے کے بعد میں نے ڈائریکٹ لائن والے ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھایا اور تاج محل کا ڈائریکٹ نمبر ڈائل کیا۔ میں نے پرنس شومبی کے سوئٹ سے رابطہ قائم کرنے کے لیے کہا تو آپریٹر نے مودبانہ لہجے میں پوچھا۔

"آپ کی تعریف؟"

"ان سے بس اتنا کہہ دو کہ پیلس کی خریداری کے سلسلے میں ایک پارٹی بات کرنا چاہتی ہے۔" میں نے اپنی آواز بالکل بدلی ہوئی تھی۔

"بہت بہتر....." آپریٹر نے کہا اور فوراً ہی سلسلہ ملا دیا۔ شاید اس معاملے میں اسے خصوصی ہدایات تھیں۔

فون پرنس شومبی نے خود ریسیو کیا اور پہلے میرا تعارف چاہا۔

"آپ کا یہ خادم بہت گمنام سا آدمی ہے۔" میں نے بدستور بدلی ہوئی آواز اور مدھم سے لہجے میں کہا۔ "حالانکہ بہت سے ناموروں کے نام بنانے یا بگاڑنے کی طاقت رکھتا ہے مگر خود آپ کے اس خادم کو اس کے پاس پڑوس میں بھی کوئی اچھی طرح نہیں جانتا۔"

"سیدھے سادے الفاظ میں اپنا تعارف کراؤ اور اختصار سے اپنا مقصد بیان کرو۔" دوسری طرف سے پرنس شومبی نے قدرے بیزاری اور نخوت سے کہا۔

"سیدھے سادے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ آپ کے اس خادم کا تعلق انڈیا کی ایک بہت بڑی نیوز ایجنسی سے ہے جس کا الحاق فرانس پریس اور ویسٹرن ورلڈ نیوز سے بھی ہے۔ مزید سیدھے سادے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کا یہ خادم جب کوئی خاص اور چٹ پٹی خبر اپنی ایجنسی کو فراہم کرتا ہے تو ہندوستان کے علاوہ دیگر کئی ممالک کے بڑے بڑے اخبارات بھی اسے نمایاں انداز میں شائع کرتے ہیں۔"

"گویا تم انٹرویو لینا چاہتے ہو؟" پرنس شومبی نے اب قدرے خلیق لہجے میں کہا۔ "لیکن آپریٹر نے تو بتایا تھا کہ تم پیلس کی خریداری کے سلسلے میں....."

"آپریٹر نے ٹھیک ہی بتایا تھا یور ہائی نس!" میں نے قدرے استہزائیہ لہجے میں کہا..... "لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس سے پہلے آپ سے میرا مفصل تعارف ہو جائے..... آپ کو شاید معلوم ہوگا کہ رپورٹر بڑی عجیب ہی مخلوق ہوتے ہیں۔ ہوائیں ان کے کانوں میں سرگوشیاں کرتی ہیں اور دور دراز کی خبریں لا سناتی ہیں۔ کسی ضرورت کے تحت بعض اوقات بڑے بڑے بدمعاش بعض قیمتی راز ان کے کانوں میں ڈال جاتے ہیں اور بعض اوقات یہ خود بھی بڑی عجیب عجیب اور ناقابل یقین باتوں کا کھوج نکال لیتے ہیں۔"

"میں اب بھی نہیں سمجھا کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔" پرنس نے الجھن زدہ سے لہجے میں کہا۔

"آپ کیسے سمجھ سکتے ہیں جبکہ میں ابھی اصل موضوع پر آیا ہی نہیں۔" میں نے بیٹھی بیٹھی آواز میں بڑے تحمل سے کہا۔ "میں آپ کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ کافی عرصہ پہلے دو بدمعاشوں نے مجھے ایک بڑی دلچسپ کہانی سنائی تھی۔ کہانی کا مرکزی کردار ایک عیاش شہزادہ تھا جو ایک پرائے ملک میں جا کر دولت یا طاقت کے بل پر اپنی من پسند عورتوں اور لڑکیوں کو اپنی ہوس کی تسکین کے لیے حاصل کیا کرتا تھا۔ اس شہزادے کا ایک دلال اتفاق سے ان بدمعاشوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ بدمعاشوں نے اس کے ساتھ جو سلوک کیا سو کیا لیکن انہیں جانے کیا سوجھی کہ انہوں نے اپنی سوچ کے مطابق ایک نیک کام کی بھی ٹھان لی۔" میں ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔ دوسری طرف یوں سکوت طاری تھا جیسے پرنس نے سانس بھی روک رکھی ہو۔

"وہ دونوں بدمعاش رات کے اندھیرے میں مالتی مندر پہنچے....." میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا..... شہزادہ جو اپنے دلال کے انتظار میں تھا' ان بدمعاشوں کو اپنے دلال ہی کے نمائندے سمجھ کر ان کے ساتھ کار میں بیٹھ کر چل دیا اور ان بدمعاشوں نے ایک جگہ جھاڑیوں میں لے جا کر شہزادے کے پہلو میں چاقو گھونپ دیا۔ اپنی دانست میں انہوں نے شہزادے کو سزا دی تھی۔ اب یہ شہزادے کی خوش قسمتی تھی کہ وہ زندہ بچ گیا۔ سنا ہے اس کے بعد سے شہزادے کے خاص خاص آدمی جن کو وہ اکثر دعوت شیراز دیا کرتا تھا' بڑے

پریشان ہیں کہ اب شہزادہ نہ تو دلالوں کے ذریعے کسی حسینہ کو بلواتا ہے اور نہ ہی خونخوار قسم کے کرائے کے بدمعاشوں کے ذریعے کسی شریف زادی کو اٹھواتا ہے۔ وہ حیران ہیں کہ شہزادے کو ہوا کیا ہے۔ کیا خیال ہے..... کیوں نہ اخبارات میں یہ دلچسپ قصہ چھاپ کر ان کی الجھن دور کر دی جائے؟ صرف انہی کا نہیں' اس کے پڑھنے سے اور بھی بہتوں کا بھلا ہوگا۔ بہت سوں کے لیے اس میں عبرت کا سامان ہوگا اور بہت سوں کے لیے تفنن طبع کا..... کچھ لوگوں کو یہ جان کر بھی بڑی حیرت ہوگی کہ شہزادے کی دیوزادی بیوی جس کی وجہ سے شہزادے کی شہزادگی قائم ہے' اب شہزادے کو گھونسوں اور لاتوں سے پیٹتی ہے جبکہ پہلے وہ صرف تھپڑوں پر اکتفا کرتی تھی۔"

دوسری طرف چند لمحے کے لیے خاموشی رہی..... پھر شہزادے کی سانسوں کی آواز سنائی دی اور خودکلامی کے لہجے میں بڑبڑایا..... "بلیک میلنگ....." پھر قدرے بلند آواز میں بولا۔ "کیا چاہتے ہو..... روپیہ؟"

"نہیں..... روپے پیسے کی ضرورت ہوتی تو بہت پہلے تم سے رابطہ قائم کیا ہوتا۔" میں نے قدرے حقارت سے کہا۔ "مجھے خود تم سے کچھ نہیں چاہیے۔ میرا ایک محسن ہے جسے شاید اب میرا نام بھی یاد نہ ہو' اب جبکہ تم نے پیلس فروخت کرنے کا ارادہ کر ہی لیا ہے تو میں چاہتا ہوں کہ اسے میرے محسن کے ہاتھ بیچو۔" میں نے کہا لیکن اپنی مطلوبہ قیمت پر نہیں بلکہ جتنی بھی رقم وہ تمہیں فوری طور پر آسانی کے ساتھ ادا کر سکے گا' تم اسے ہی کافی سمجھ کر رکھ لو گے' خواہ دوسری پارٹیوں کی طرف سے تمہیں کتنی ہی رقم کی پیشکش ہو چکی ہو..... سمجھ گئے؟"

وہ چند لمحے خاموش رہا..... پھر بدستور ہموار لہجے میں بولا۔ "سمجھ گیا..... کون ہے تمہارا وہ محسن؟ اور اس سلسلے میں تمہارا اس سے کتنا کمیشن طے ہوا ہے؟"

"غیر ضروری باتوں سے اجتناب برتو تو بہتر ہے۔" میں نے اپنی بدلی ہوئی آواز میں غراہٹ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "ورنہ ہو سکتا ہے کہ میں اپنے محسن کا احسان اتارنے کا ارادہ فی الحال ملتوی کر دوں اور اس کہانی کو ٹائپ کرنے بیٹھ جاؤں جس کے اہم نکات پر مشتمل چند کاغذ کب سے میری میز کی دراز میں دبے پڑے ہیں۔"

"اوکے ..... اوکے....." پرنس نے قدرے بیزاری اور عجلت سے کہا۔ "تم اپنے ان محسن صاحب کو میرے پاس بھیج دو....."

"وہ اتنا گرا پڑا آدمی نہیں ہے کہ تم اس لہجے میں اس کا ذکر کرو۔" میں نے گویا برا مناتے ہوئے کہا..... "اور نہ ہی وہ تم سے ملنے آئے گا' تم خود اس کے پاس جاؤ گے..... فون نمبر میں دے رہا ہوں..... پہلے تم اس سے ملاقات کا وقت طے کرو گے۔" میں نے اسے اپنا ہی فون نمبر دیا' نام بتایا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں اطمینان سے فائلیں وغیرہ دیکھنے لگا۔ چند منٹ بعد ہی میرے عام ٹیلی فون سیٹ کی گھنٹی بجی جس کا نمبر بورڈ کے توسط سے ملتا تھا۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ میرا اندازہ درست ہی نکلا' کرسٹینا کہہ رہی تھی ..... "سر!..... پرنس شومبی آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

پرنس کے لہجے میں میری توقع کے عین مطابق نخوت و احساس کی برتری کی جھلک نہیں تھی بلکہ وہ حتی الامکان دوستانہ انداز میں بات کرنے کی کوشش کر رہا تھا حتیٰ کہ اس نے اپنا تعارف بھی کرانے کی کوشش کی۔

میں نے خالص تاجروں والی خوش خلقی سے کہا۔ "ہندوستان میں آپ اتنے بھی گمنام نہیں پرنس! فرمایئے اس خادم گمنام سے آپ نے کیونکر رابطہ قائم کیا؟ کیا ضرورت آن پڑی؟"

"یہ تو ملنے پر ہی بتا سکتا ہوں۔" اس نے کہا۔ "بہرحال آپ چونکہ کاروباری آدمی ہیں' اس لیے اطمینان کی خاطر یہ بتا دوں کہ میں آپ کو کچھ دینے ہی آؤں گا' لینے نہیں۔"

اب ایسا بھی نہیں تھا کہ کاروباری ذہنیت پر اس کے طنز کو میں سمجھ نہ پاتا۔ میں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "کچھ لینا دراصل ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی مسٹر پرنس!" میں نے کہا۔

"درست کہا آپ نے۔" اس نے فوراً تسلیم کر لیا۔ "تو میں کب آپ کی خدمت میں حاضر ہو سکتا ہوں۔"

"کھانے کے وقت تک اب میں فارغ ہی ہوں۔" میں نے کہا۔ "آپ چاہیں تو کھانا میرے ساتھ ہی کھائیں۔"

"کھانا پھر کبھی سہی۔" پرنس نے کہا۔ "فی الحال صرف کاروباری بات ہوگی۔ میں آدھے گھنٹے بعد حاضر ہو جاؤں؟"

"بصد شوق۔" میں نے کہا۔ پرنس نے خدا حافظ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس کے بعد میں محض دستخط وغیرہ کرنے اور نئی اسٹینو کے ٹائپ کردہ خطوط پڑھنے کا کام کرتا رہا۔ تقریباً پینتیس منٹ بعد کرسٹینا اندر آئی۔ پرنس شومبی کو اندر بھیجنے کی میں نے اسے پہلے ہی ہدایت دے رکھی تھی۔

"سر! پرنس شومبی کو تو میں اندر بھیجنے لگی تھی لیکن وہ کہنے لگے کہ ان کے دونوں باڈی گارڈ بھی اندر آئیں گے۔" کرسٹینا نے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔ "اس سلسلے میں کیا حکم ہے؟"

"پرنس سے کہو کہ باڈی گارڈز کو باہر ہی چھوڑ دیں۔ ہمارے دفتر میں ان کی جان کو کوئی خطرہ نہیں۔" میں نے کہا۔ "دوسرے میں نجی گفتگو کے دوران باڈی گارڈز وغیرہ کی موجودگی کو پسند نہیں کرتا۔"

چند لمحے بعد پرنس شوبی اندر آیا۔ کافی عرصہ پیشتر میں نے مالتی مندر پر اس رات اسے زیادہ غور سے نہیں دیکھا تھا لیکن اس کے باوجود اب دیکھ کر احساس ہوا جیسے اس کی عمر میں کئی برسوں کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اس کے رخساروں کی ہڈیاں کچھ اور ابھر آئی تھیں اور آنکھوں کے گوشوں پر شکنیں سی نمودار ہو چکی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں گلابی ڈورے صاف نظر آ رہے تھے۔ خودکار دروازہ اس کے عقب میں بند ہو گیا۔ وہ وہیں کھڑا ایک ٹک مجھے دیکھ رہا تھا لیکن میں مطمئن رہا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اس وقت مجھے قطعاً نہیں پہچان سکتا تھا۔

میں نے اٹھ کر اسے خوش آمدید کہا اور مصافحہ کرنے کے بعد اسے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس کی موٹی موٹی آنکھوں سے اضمحلال نمایاں تھا اور لمبی لمبی انگلیوں میں ہلکا سا ارتعاش تھا۔ اس نے ایک لبوترے سے منقش اور چمکیلے سگار بکس سے ایک موٹا سا سگار نکال کر بے رحمانہ سے انداز میں چوڑے چوڑے دانتوں سے اس کا ایک سرا توڑ کر ردی کی ٹوکری میں تھوکا۔ میں نے ٹیبل لائٹر اٹھا کر لمبی چوڑی میز پر کچھ آگے جھک کر اس کے سگار کو شعلہ دکھایا۔

شکریہ ادا کر کے اس نے طویل کش لیا اور دھویں کے مرغولوں کے عقب سے پرخیال نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا۔ میں نے بھی بدستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اپنی اصل آواز میں کہا۔ ”میرے لیے آپ کی آمد نہایت غیر متوقع ہے۔ کیا اب آپ میرا تجسس دور کرنا پسند فرمائیں گے؟“

وہ اب بھی خاموش رہا جیسے گفتگو کے لیے موزوں الفاظ منتخب کر رہا ہو۔ پھر غالباً اپنی دانست میں اس نے نہایت موثر کن انداز میں گفتگو شروع کرتے ہوئے کہا۔ ”آج کا دور احسان فراموشی کا ہے لیکن آپ بڑے خوش قسمت ہیں کہ آپ کے احسان کو کسی نے یاد رکھا ہے۔“ پھر اس نے ایک لمحہ توقف کر کے ڈرامائی انداز میں پوچھا۔ ”کسی نیوز ایجنسی میں آپ کا کوئی دوست رپورٹر ہے؟“

”مجھے تو یاد نہیں پڑتا کہ میرا کوئی دوست اس قسم کے پیشے سے بھی تعلق رکھتا ہے۔“ میں نے بظاہر ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا حالانکہ اس وقت مجھے ہنسی آ رہی تھی۔

”دوست نہیں ملاقاتی ہی ہو گا جس پر آپ نے کبھی کوئی احسان کیا ہو گا۔“ اس نے کہا۔

”ملاقاتیوں کے نام تو مجھے یاد بھی نہیں رہتے اور نہ ہی میں کسی پر احسان کر کے یاد رکھتا ہوں۔“ میں نے بے نیازی سے کہا۔

”اس کا مطلب ہے کہ مجھے اپنا اثر و رسوخ استعمال کرنا پڑے گا۔“ اچانک اس کے لہجے میں سختی در آئی۔

”اس رپورٹر کا پتا چلانے کے سلسلے میں۔ جس کے ساتھ ملی بھگت کے ذریعے تم مجھے بلیک میل کر کے میرا پیلس سستے داموں مجھ سے ہتھیانے کی کوشش کر رہے ہو۔“ وہ سانپ کی طرح پھنکار اٹھا۔

”آپ تشریف لے جا سکتے ہیں مسٹر پرنس!“ میں نے سکون سے کہا۔ ”پہلے آپ شوق سے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر آئیں‘ اس کے بعد آ کر مجھے بتا دیجئے گا کہ بات کیا ہے؟ مجھے ابھی تک یہی معلوم نہیں کہ آپ کس رپورٹر‘ کس پیلس اور کس ملی بھگت کی بات کر رہے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں اس طرح توہین آمیز انداز میں گفتگو کرنے والوں کو اٹھوا کر دفتر سے باہر پھنکوا دیا کرتا ہوں اور یہ تحقیق بعد میں کرتا ہوں کہ وہ پرنس ہیں یا شہنشاہ.....اور جہاں تک اثر و رسوخ کا تعلق ہے تو اس ملک میں چھوٹے موٹے شہزادوں کی صرف عزت ہوتی ہے‘ اثر و رسوخ نہیں۔ اثر و رسوخ یہاں صرف تاجر کا ہے جو سب سے زیادہ ٹیکس ادا کرتا ہے اور میں صرف تاجر ہی نہیں ایوان صنعت و تجارت کا جنرل سیکرٹری بھی ہوں جس کے ارکان کی تعداد ڈیڑھ ہزار سے زیادہ ہے جو صرف بمبئی ہی کی نہیں ہندوستان کے اور بھی کئی علاقوں کی معیشت کو چلا رہے ہیں جو میرے ایک اشارے پر اپنی اپنی صنعتوں کا پہیہ جام کر کے تم جیسے شہزادوں کا منہ کالا کر کے.....جو اتفاق سے پہلے ہی کالا ہے‘ ملک بدر کروانے کا مطالبہ کر سکتے ہیں...... سمجھے؟ اس لیے بہتر ہے کہ جو بات کرنی ہے سیاق و سباق کے ساتھ کرو۔ دھمکیاں دینا تمہارے حق میں نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔“

[illegible]

[illegible]

پرنس چند لمحے تک مخملیں پوشش والی کرسی کے ہتھوں پر سختی سے ہاتھ جمائے گھورتا رہا۔ اس کے نتھنے تیزی سے پھول پچک رہے تھے۔ میں بھی پلکیں جھپکائے بغیر اس کی طرف دیکھتا رہا۔ دفعتاً اس نے سگار ایش ٹرے میں مسل دیا۔

"پرنس شومبی نے بلیک میل ہونا نہیں سیکھا۔" اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اور اتفاق سے میری عادت بھی یہی ہے کہ میں طاقت پہلے استعمال کرتا ہوں، نتائج پر غور بعد میں۔" کرنے کو میں یہ بھی کر سکتا ہوں کہ اپنے باڈی گارڈز کو اندر بلاؤں اور انہیں محض ایک اشارہ کر دوں۔ وہ اسی کرسی پر تمہارا جسم چھلنی کرکے رکھ دیں گے۔ کہانی ہم یہاں سے جانے کے بعد اطمینان سے گھڑ لیں گے۔ زیادہ سے زیادہ اگر ہوا تو یہی ہوگا کہ میرے باڈی گارڈز کو چند ماہ کی سزا ہو جائے گی کیونکہ میرے لیے یہ ثابت کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہوگا کہ کاروباری گفتگو کے دوران مشتعل ہو کر تم نے لفافے کھولنے والی چھری سے مجھ پر حملہ کر دیا تھا۔ چھری کا ذکر مجھے اس لیے کرنا پڑے گا کہ ریوالور تم جیسے سیٹھ اپنے پاس رکھتے نہیں کیونکہ چلانے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔

"اللہ رے خوش فہمی۔" میں نے زیرلب اردو میں کہا۔ پھر قدرے بلند آواز میں کہا۔ "یہ بھی تو ممکن ہے کہ اس کمرے میں کہیں ایسے آلات چھپے ہوں جن سے تمہاری گفتگو کسی اور کمرے میں ریکارڈ ہو رہی ہو۔"

ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں سراسیمگی کی سی جھلک آئی لیکن فوراً ہی وہ سنبھل گیا۔ "بلیک میلروں کے یہی تو انداز ہوتے ہیں۔ میں تم سے یہی پوچھنے آیا ہوں کہ مجھے اس رپورٹر کا نام و پتہ بتاؤ جس نے مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش کی ہے...... بلکہ مجھے تو یقین ہے کہ تمہارے ہی توسط سے میں ان دو بدمعاشوں تک بھی پہنچ سکتا ہوں جنہوں نے مالتی مندر میں میرے طیارے کے قریب مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا تھا اور میرے دو لاکھ پاؤنڈ چھین کر بھاگ گئے تھے۔ مجھے اب احساس ہو رہا ہے کہ تم، وہ بلیک میلر رپورٹر اور وہ دونوں بدمعاش، تم سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہو...... یہ بزنس ...... یہ آفس، سب اصل میں آڑ ہیں جس کے پیچھے تم لوگ مل جل کر بڑی بڑی وارداتیں کرتے ہو۔ بڑے بڑے ہاتھ مارتے ہو۔"

"مالتی مندر میں آپ پر یہ قاتلانہ حملہ اور دو لاکھ پاؤنڈ چھینے جانے کا واقعہ کب پیش آیا تھا پرنس؟" دفعتاً میں نے نرمی سے پوچھا۔

"سال ہو چلا ہے۔" اس نے بے ساختہ جواب دیا۔

"آپ نے اس کی رپورٹ تو درج کرائی ہوگی۔ پولیس نے کارروائی نہیں کی؟" میں نے نہایت سادگی سے پوچھا۔

"رپورٹ؟" وہ ایک بار پھر گڑبڑا گیا لیکن نہایت شاطر انسان تھا، اس لیے اس مرتبہ بھی سنبھل گیا۔ اس قسم کی چھوٹی موٹی باتوں کو منظرعام پر لا کر میں سکینڈل بنوانا پسند نہیں کرتا۔ مجھے امید تھی کہ ایک نہ ایک روز میں اپنے ان حقیر دشمنوں کو خود ہی ڈھونڈ نکالوں گا۔ میرا اندازہ درست ہی تھا۔ بالآخر مجھے ان کا سراغ مل ہی گیا یعنی تم! اب تم مجھے بتاؤ گے مسٹر منصور کہ وہ کون تھے؟ اگر تم نے میری بات کا جواب نہ دیا تو تمہیں سزا دینے کے لیے میں اب اپنے باڈی گارڈز کو بھی زحمت نہیں دوں گا کیونکہ وہ ویسے ہی ضرورت پڑنے پر ہر الزام سر لینے کو تیار رہتے ہیں۔ اب تم زبان کھول دو۔" اس نے کوٹ کی اندرونی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا جہاں میں بغلی ہولسٹر کی موجودگی کے آثار پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔

میرے خیال میں خالص کاروباری آدمی ہی بنے رہنا اب کوئی زیادہ ضروری نہیں تھا کیونکہ اب وہ شہزادگی کو بالائے طاق رکھ کر تیسرے درجے کا بدمعاش نظر آنے لگا تھا۔

"مسٹر پرنس! میں نے یک لخت اپنا لہجہ بدلتے ہوئے انتہائی سرد اور سفاک آواز میں کہا۔" ہولسٹر تک ہاتھ لے جانے سے پہلے ایک نظر میز کے نیچے دیکھ لیجیے۔ اس مشورے پر عمل نہ کرنے سے آپ کی زندگی ضائع بھی ہو سکتی ہے۔"

آخری لفظوں میں ایسا اثر تھا کہ نہ صرف ہولسٹر کی طرف بڑھتا ہوا اس کا ہاتھ مشینی انداز میں رک گیا بلکہ اضطراری طور پر اس نے کرسی بھی کچھ پیچھے کھسکائی تاکہ آسانی سے جھک کر میز کے نیچے دیکھ سکے۔ نیچے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں اور وہ یک لخت سیدھا ہو کر کرسی پر یوں ساکت بیٹھ گیا جیسے تصویر کھنچوا رہا ہو۔ حالانکہ میز کے نیچے کوئی ایسی زیادہ ڈراؤنی چیز بھی نہیں تھی کہ اس کے اوسان یوں خطا ہو جاتے۔

میز کے تختے کے نچلی طرف صرف ایک ہلکی سب مشین گن فٹ تھی جو نیم دائرے میں اس طرح خاموشی، تسلسل اور قدرے تیز رفتاری سے حرکت کر رہی تھی جیسے کسی بہت بڑے ڈائل پر بہت بڑی سیکنڈ کی سوئی حرکت کر رہی ہو۔ میرے سامنے آفس کا جتنا بھی حصہ تھا، وہ پورا کا پورا اس سب مشین گن کی زد پر آتا تھا۔ میرے مقابل چاروں کرسیوں پر بیٹھے ہوئے افراد تو گن کی نالی سے محض چند انچ کے فاصلے پر ہی ہوتے تھے۔

"اس سے فائرنگ شروع کرنے کے لیے صرف ایک بٹن دبانے کی ضرورت ہوتی ہے۔" میں نے سرسری سے لہجے میں کہا۔ "جس پر اس وقت میرا ہاتھ ہے لیکن اب ہم

اسلحے، دھمکیوں اور بلیک میلنگ سے ہٹ کر کاروبار کی بات کریں گے، صرف کاروبار کی۔"

کمرے میں چند لمحے سکوت رہا۔ پرنس کی ساری تیزی و طراری ہوا ہو گئی تھی۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ محض ایک سیٹھ کے سامنے نہیں بیٹھا تھا۔

"ہاں......وہ رپورٹر میرا دوست ہے جس طرح میرے اور بہت سے لوگ دوست ہیں۔" میں نے گویا اب اصل گفتگو شروع کی۔ "اور اس کا اصرار ہے کہ میں وہ پیلس آپ سے خرید لوں حالانکہ مجھے اس کو خریدنے کی کوئی ایسی خاص خواہش نہیں لیکن میرے اس دوست کا کہنا ہے کہ وہ مجھے آپ سے وہ پیلس برائے نام قیمت پر دلوا دے گا کیونکہ آپ اس کی بات بہت مانتے ہیں۔"

"ہاں......"اس نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر قدرے سنبھل کر تلخی سے کہا۔ ٹھیک ہی تو کہتا ہے وہ۔ میں اس کی بات بہت مانتا ہوں۔ یہ دوسری بات ہے کہ میں اس کا نام نہیں جانتا، اس کی صورت سے ناآشنا ہوں حتیٰ کہ اس کی آواز بھی میں نے آج پہلی مرتبہ فون پر سنی ہے۔"

"خیر......یہ آپ کا اور اس کا معاملہ ہے۔" میں نے خشک لہجے میں کہا۔

"کیا تمہیں واقعی اس وجہ کا علم نہیں جس کی بناء پر وہ اتنے وثوق سے یہ بات کہہ رہا ہے؟" پرنس نے متجسس لہجے میں پوچھا۔

"نہیں۔" میں نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ "وہ میرا دوست ضرور ہے لیکن اپنے کاروباری راز مجھے نہیں بتاتا۔ وہ بلیک میلر شاید ہو لیکن اسے کچھ عجیب ہی قسم کا بلیک میلر کہا جا سکتا ہے۔ اب یہی دیکھ لیں کہ وہ میرے ایک چھوٹے سے احسان کے بدلے میں آپ کے توسط سے مجھے بہت بڑا فائدہ پہنچانا چاہتا ہے۔ بلیک میلر ایسے کہاں ہوتے ہیں؟"

میں نے اس رپورٹر کا کردار اتنی کامیابی سے تخلیق کیا تھا کہ اب تو خود مجھے بھی محسوس ہونے لگا تھا جیسے واقعی اس کا وجود ہے۔

"اب میں آپ کو سیدھے، صاف اور دو ٹوک انداز میں بتا دوں کہ میں آپ کو اس پیلس کی قیمت زیادہ سے زیادہ دو لاکھ روپے دے سکتا ہوں۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"دو لاکھ؟" پرنس کے پہلو میں جیسے کسی نے چھری گھونپ دی۔ "دو لاکھ روپے تو اس میں بجلی اور ایئرکنڈیشنگ کا بندوبست کرنے میں خرچ ہو گیا تھا۔ آج سے چار سال پہلے اس کی تعمیر اور جزیرے کی آدھی زمین کی قیمت کے ضمن میں میرا ایک کروڑ سے اوپر خرچ ہوا تھا۔ اس وقت دو لاکھ سے زیادہ کے تو اس کے صرف گیٹ ہی ہوں گے۔"

"ہوا کریں۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "میں نے آپ کو وہ قیمت بتا دی جو میں فوراً ادا کر سکتا ہوں۔ آگے آپ کی مرضی......اور ہاں۔ آپ کو ایک ضروری بات بتا دوں

کہ وہ رپورٹر میرا دوست ضرور ہے لیکن میرے کہنے پر وہ اپنے ارادے نہیں بدلتا۔ اگر وہ پیلس مجھے دلانے کا ارادہ کر چکا ہے تو پھر اسے اس سے باز رکھنا ناممکن ہے حتیٰ کہ میں خود بھی اس کے سامنے انکار نہیں کر سکتا۔"

"دو لاکھ لینے سے تو بہتر ہے کہ میں پیلس "تحفتاً" آپ کی خدمت میں پیش کر دوں۔" پرنس کے لہجے میں اب شکست خوردگی جھلک آئی تھی۔

"تحفے میں قبول نہیں کرتا۔" میں نے فوراً کہا۔ پرنس تھکن آمیز نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ غالباً اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کس قسم کا آدمی ہوں۔

"آپ نے پیلس غالباً صرف باہر سے دیکھا ہے۔" چند لمحے بعد وہ بولا۔ اب وہ مہذبانہ اور مودبانہ لہجے میں بات کر رہا تھا۔ آپ ایسا کریں کہ ایک نظر اسے اندر سے بھی دیکھ لیں، شاید اس کے بعد آپ رقم بڑھانے پر آمادہ ہو جائیں۔"

"رقم بڑھانے کا تو میں کسی بھی صورت میں ارادہ نہیں رکھتا۔" میں نے اس کی امیدوں پر پانی پھیرنے کی کوشش کی۔ "البتہ میں ایک نظر اسے دیکھنا ضرور چاہوں گا۔"

"تو پھر کسی بھی روز تشریف لائیے۔" پرنس نے فوراً کہا۔ اس کے لہجے میں کسی حد تک اب بھی امید کی جھلک تھی۔ "دراصل میں نے انڈیا میں بہت نقصان اٹھایا ہے۔ اب جبکہ میں نے اس ملک سے ناطہ توڑنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو میں چاہتا ہوں کہ آخری مرحلے پر تو لٹ کر نہ جاؤں۔"

"کیا کہا مسٹر پرنس؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "عین ممکن ہے کہ آپ انڈیا کو لوٹ کر لے جا رہے ہوں۔"

اس نے گہری نظروں سے میری طرف دیکھا لیکن میں نے ایسا ہی تاثر دیا جیسے یہ بات میں نے مذاق میں کی تھی۔ پھر میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "اتوار کو میں چھٹی کرتا ہوں۔ آئندہ اتوار کو میں آپ کے ہاں آنے کا پروگرام رکھ لیتا ہوں۔"

"بالکل ٹھیک ہے، دوپہر کا کھانا آپ میرے ساتھ کھائیں۔" پرنس نے جلدی سے کہا۔

"کھانے کا آپ تکلف نہ کریں۔" میں نے کہا، ویسے بھی شام ڈھلے آؤں گا۔ اتوار کو دن میں میرا کوئی نہ کوئی تفریحی پروگرام پہلے سے طے ہوتا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ ہفتہ بھر انسان ڈٹ کر ذہنی و جسمانی کام کرے تو ایک دن اسے بھرپور آرام اور تفریح کرنی چاہیے۔"

"شکریہ۔" میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "لیکن میرا خیال ہے کہ میری اور آپ کی لغت میں تفریحات کے معنی میں بڑا فرق ہے۔"

"اوہ۔" پرنس نے ہونٹ سکیڑے۔ "تو پھر آپ مجھے اپنی آمد کا وقت بتا دیجئے میں بوٹ ہاؤس پر آپ کے استقبال کے لیے موجود ہوں گا۔"

میں نے چند لمحے غور کیا‘ پھر اسے سات بجے کا وقت دے دیا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”اتوار‘ سات بجے ملاقات طے ہوئی۔ میں فروخت کے سلسلے میں تمام کاغذات تیار رکھوں گا۔ اس شام خواہ کچھ بھی طے پائے‘ بہرحال ہم سودا مکمل کر کے کاغذات پر دستخط کر دیں گے۔“

”بالکل ٹھیک ہے۔“ میں نے اٹھ کر اس سے مصافحہ کیا اور وہ رخصت ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد دیر تک میرے دل میں گدگدی سی ہوتی رہی۔ ابھی تک قسمت ہر موڑ پر میری مدد کر رہی تھی۔ مجھے مستقبل کے مالتی مندر جیسے دور دراز جزیرے پر واقع پرنس شومبی کے پیلس جیسی ایک عمارت کی سخت ضرورت تھی۔ قدرت نے نہ صرف میری مرضی کے عین مطابق جگہ کا بندوبست کر دیا تھا بلکہ وہ مجھے کوڑیوں کے بھاؤ پڑ رہی تھی۔ میں نے تو ایسے ہی اندھیرے میں ایک تیر پھینکا تھا مگر وہ مجھے نشانے پر بیٹھتا نظر آ رہا تھا۔

دوسرے روز اس ملاقات کے لیے گھر سے نکلتے وقت میں نے گھڑی دیکھی اور نہایت کم رفتار سے ڈرائیو کرتے ہوئے میں ساحل کی طرف روانہ ہو گیا۔ غیر ارادی طور پر میں دھیرے دھیرے سیٹی بھی بجا رہا تھا۔ بظاہر جیسے میں کہیں تفریح پر جا رہا تھا لیکن اندر ہی اندر میرے اعصاب کسی انجانی سنسناہٹ سے لحہ بہ لحہ چوکنا ہوتے جا رہے تھے۔

فشنگ ہاربر پر پہنچ کر میں نے اس موٹر بوٹ کی تلاش میں نظر دوڑائی جو ہماری کمپنی کے **فشنگ** کے شعبے کی ملکیت تھی۔ اس وقت ہماری **فشنگ** کمپنی کے پاس چار بوٹس تھیں۔ ان میں سے ایک وہی تھی جو کبھی چھنا کی ذاتی ملکیت تھی۔ اس وقت مجھے اسی کی تلاش تھی۔

بہت دور ایک مقام پر سورج کا کندلی تھال گویا سمندر ہی میں اترتا نظر آ رہا تھا۔ بار برداری کی بیشتر کشتیاں واپس آ چکی تھیں اور بہت سی آ رہی تھیں۔ وہائٹ شارک مجھے جلد ہی نظر آ گئی۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ میرے پاس دس منٹ فاضل تھے۔ میں وقت سے پہلے مالتی مندر نہیں پہنچنا چاہتا تھا۔ دس منٹ میں نے ڈاک پر ٹہلتے ہوئے گزار دیئے اور ٹھیک سات بجے میں نے پیلس منٹ پر وہائٹ شارک کی بندش کھولی اور اس میں مالتی مندر کی طرف روانہ ہو گیا۔

جزیرے کے آثار نظر آنے تک شام کا دھندلکا گہرا ہو چکا تھا‘ تاہم ابھی روشنیوں کی اتنی ضرورت نہیں تھی لیکن پرنس شومبی کے بوٹ ہاؤس پر مجھے دور سے ہی کئی بڑی بڑی لائٹیں آن نظر آئیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ اہتمام اس لیے کیا گیا ہے کہ کہیں میں بھٹک کر کسی اور طرف نہ نکل جاؤں۔

میں بوٹ کو سیدھا بڑی سی سرنگ سے مشابہ بوٹ ہاؤس میں لے گیا۔ بوٹ ہاؤس کا

دروازہ کھلا تھا۔ پرنس شومبی کو میں نے دور ہی سے ساحل پر کھڑے دیکھ لیا۔ اس کے دائیں بائیں دو اور اشخاص بھی مودبانہ انداز میں کھڑے تھے۔ دونوں ہی سوٹوں میں تھے۔ پرنس بھی سوٹ میں تھا لیکن اس کے ساتھ ہیٹ کے بجائے نہ جانے کیوں اس نے ترکی ٹوپی سر پر رکھی ہوئی تھی۔ مسلمان افریقی عموماً یہ انداز اختیار کرتے تھے کہ سوٹ کے ساتھ ترکی ٹوپی پہن لیتے تھے مگر پرنس شومبی **کرسچین** تھا۔

وہ تینوں مجھے ساحل پر اترتے دیکھ کر کچھ اس انداز سے آگے بڑھے جیسے پروٹوکول کے مطابق کسی ملک کے سرکاری مہمان کو ریسیو کرنے آئے ہوں۔ پرنس نے نہایت باوقار انداز میں مجھ سے ہاتھ ملایا اور پھر پہلے اپنے دائیں طرف کھڑے ہوئے شخص کا تعارف کرایا۔ ”مسٹر موگا بے شولا۔ میرے پرسنل سیکرٹری۔“

اس شخص نے ضرورت سے زیادہ منہ چوڑا کر کے مسکراتے ہوئے مجھ سے مصافحہ کیا۔ وہ درمیانے قد کا ایک ادھیڑ عمر آدمی تھا‘ باریک فریم کی نظر کی عینک لگائے ہوئے تھا۔

”مسٹر طورے گالا۔ میرے **اسٹیٹ منیجر**۔“ پرنس نے بائیں طرف کھڑے ہوئے شخص کا تعارف کرایا۔ یہ گٹھے ہوئے جسم کا ایک دراز قد نوجوان تھا لیکن آنکھوں سے نہایت تجربہ کار اور شاطر معلوم ہوتا تھا۔

میں نے پرنس کے پیچھے جھاڑیوں کے قریب دو اور سیاہ فام نوجوانوں کو کھڑے دیکھا۔ پرنس نے ان کے تعارف کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ وہ دونوں بھی سوٹوں ہی میں ملبوس تھے اور ہاتھ پشت پر کیے کھڑے تھے۔ مجھے ان کے بارے میں اندازہ لگانے میں دقت نہیں ہوئی کہ وہ پرنس کے باڈی گارڈ تھے۔

پرنس نے بوٹ ہاؤس کے اندر اور دور تک سمندر کی سطح پر نظر دوڑاتے ہوئے اپنے لہجے کو سرسری بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ تنہا ہی آئے ہیں؟“ اس کے لہجے میں دبی دبی حیرت بھی تھی۔

”جی ہاں۔ کیوں؟“ میں نے سادگی سے پوچھا۔ ”کیا مجھے کسی کو ساتھ لانا چاہیے تھا؟“

”نہیں۔ نہیں۔“ پرنس نے جلدی سے کہا۔ ”میں تو ویسے ہی پوچھ رہا تھا۔ آیئے تشریف لایئے۔“ اس نے مجھے ساتھ ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ چند قدم دور نیم پختہ پگڈنڈی پر ایک سیاہ مرسیڈیز اور اس کے پیچھے شیورلیٹ کھڑی تھی۔

میرا خیال تھا کہ پیلس پہنچ کر بھی مجھے پرنس کے ملازم خاصی تعداد میں نظر آئیں گے لیکن ایسا نہیں ہوا۔

ہارن سن کر لوہے کا اونچا سا گیٹ جس سیاہ فام شخص نے کھولا‘ اس کا قد کاٹھ اور جسم کی ساخت غیر معمولی تھی۔ وہ بے شمار سلوٹوں والی مصری غلاموں کی سی شلوار اور انہی کے طرز کی مختصر سی واسکٹ پہنے ہوئے تھا جو آگے سے کھلی تھی۔ کمبخت کا جسم گویا آبنوسی

پتھر سے تراشا گیا ایک شاہکار مجسمہ تھا۔ اس کا قد اتنا اونچا اور چھاتی اتنی چوڑی تھی کہ عام قسم کے دروازے تو اس کے گزرنے کے لیے کافی نہیں رہتے تھے۔ ذرا سی حرکت کے ساتھ اس کے بازوؤں کی مچھلیاں یوں پھڑکتی تھیں جیسے ابھی جلد پھاڑ کر باہر آجائیں گی۔

نہایت کشادہ ڈرائیو وے میں پرنس نے گاڑی روکی اور اتر کر مصری غلاموں جیسے حلیے والے اس شخص سے اشاروں میں کچھ پوچھا۔ اس نے اشاروں میں چند بے معنی سی آوازوں کے ساتھ کچھ جواب دیا اور تب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ گونگا تھا۔

اس سے بات ختم کرکے پرنس نے گویا مزید وضاحت کے لیے مجھے بتایا۔ "گونگا ہے بے چارہ ...... لیکن طاقتور اتنا ہے کہ میرے اور آپ جیسے آدمیوں کو صرف ایک گھونسے میں ہلاک کر سکتا ہے۔" میں مسکرا دیا۔ پرنس نے مجھے بھی اپنے ہی جیسے آدمیوں میں شمار کرلیا تھا۔ "کلہاڑی کے سوا یہ کوئی ہتھیار استعمال کرنا نہیں جانتا لیکن صرف کلہاڑی ہی سے ایک ہاتھی کا سر تن سے جدا کر سکتا ہے اور شیر کو ٹکڑوں میں تقسیم کر سکتا ہے۔ دیکھنے میں یہ انسان ہے لیکن میری نظر میں ایک بڑا نایاب قسم کا حیوان ہے۔"

میں ستائشی انداز میں مسکرا دیا۔

باڈی گارڈز' اسٹیٹ منیجر اور سیکرٹری بھی گاڑیوں سے اتر آئے تھے۔ میں نے سرسری نظر سے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ محل دو منزلہ تھا اور مشرقی و مغربی طرزِ تعمیر کا ایک خوبصورت امتزاج تھا۔ اس کی بالائی منزل پر سامنے کی طرف مغلیہ طرز کی ایک لمبی سی بالکونی تھی جس کی دیوار درحقیقت ماربل کے خوبصورت' چھوٹے چھوٹے ستونوں کی ایک لمبی قطار تھی۔ پیلس کی تعمیر میں بے حساب ماربل استعمال ہوا تھا۔ اونچی سی بیرونی چار دیواری پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بڑی بڑی فلڈ لائٹس نصب تھیں۔

چار دیواری کے وسط میں اصل عمارت تھی اور اس کے تین اطراف میں سرسبز لان پھیلا ہوا تھا جس کے ایک حصے میں بیضوی سوئمنگ پول نظر آرہا تھا۔ لان پر مجھے دور ایک جگہ پھولدار پودوں کی کیاروں پر دو مالی کام کرتے نظر آئے۔ انہوں نے کن انکھیوں سے ہماری طرف دیکھا اور دوبارہ کام میں لگ گئے۔ مجھے ان کا کام کرنے کا انداز مصنوعی سا لگا۔

پرنس نے باڈی گارڈز سمیت اپنے چاروں ملازموں کو مخاطب کیا۔ "آپ لوگ اپنے اپنے کمروں میں جائیں' جس کی ضرورت ہوگی' میں اسے بلوا لوں گا۔"

سب نے تعظیماً سر جھکایا اور مختلف سمتوں میں چلتے ہوئے عمارت کے پہلوؤں میں پہنچ کر غائب ہو گئے۔ اس طرف شاید بغلی دروازے تھے۔ باتیں کرتے کرتے ہم مرکزی دروازے سے پیلس میں داخل ہو چکے تھے اور ایک طویل و عریض لابی سے گزر رہے تھے جس کا ماربل کا پالش شدہ فرش آئینے کی طرح چمک رہا تھا اور ہماری ایڑیوں کی بازگشت یہاں یوں گونج رہی تھی جیسے ہم کسی بڑے سے گنبد کے نیچے چل رہے ہوں۔

"غالباً ہم اپنے اصل مقصد کی طرف تو توجہ ہی نہیں دے رہے۔" شہزادے نے ملامت سے کہا۔ "یعنی نہ میں آپ کو پیلس دکھا رہا ہوں اور نہ آپ دیکھ رہے ہیں۔ ہم دونوں ہی ناک کی سیدھ میں چلے جا رہے ہیں۔ ذرا پیچھے آیئے' دو کمرے ہم پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔"

ہم چند قدم پیچھے آئے۔ لابی کے اختتام پر دونوں گوشوں میں دو کمروں کے دروازے آمنے سامنے نظر آرہے تھے۔ دونوں کی بیرونی دیوار گولائی میں تھی۔ یہ نچلی منزل کا ڈرائنگ روم ہے۔ شہزادے نے دائیں ہاتھ والا دروازہ کھولتے ہوئے کہ۔ اس نے مجھے اندر چلنے کا اشارہ کیا لیکن میں نے دروازے پر ہی کھڑے ہو کر اندر کا جائزہ لیا۔ کمرہ آراستہ و پیراستہ تھا۔ اس میں اعلیٰ درجے کے ڈرائنگ روم کے تمام لوازمات موجود تھے۔

"نچلی منزل مرکزی طور پر ایئرکنڈیشنڈ ہے۔ سردیوں میں گرم رکھنے کا بھی بندوبست ہے۔" پرنس نے بتایا۔ اس کا لہجہ اب واقعی اس شخص کا سا ہو گیا تھا جو اپنی کوئی چیز فروخت کرنے لگا ہو اور اس کی خوبیاں گنوا رہا ہو۔

اس نے دوسرے کمرے کا دروازہ کھولا۔ یہ اسٹڈی ہے.....اس میں بھی تمام فرنیچر وغیرہ موجود تھا۔ اس کا جائزہ لینے کے بعد ہم دائیں ہاتھ پر راہداری میں مڑے جہاں فرش پر دبیز قالین پھیلا ہوا تھا۔

اس راہداری میں آمنے سامنے دو بہت وسیع بیڈ روم تھے جو لوازمات سے ہی نہیں' تعیشات سے بھی سجے ہوئے تھے۔ ہر ایک کی چھت اور دیواروں میں بیسیوں پہلو دار آئینے لگے ہوئے تھے۔ ایک گوشے میں بار بھی موجود تھا۔ پرنس نے کمرے کے وسط میں موجود بہت بڑے گول بیڈ کی طرف اشارہ کیا۔ یہ بیڈ اتنا بڑا تھا اور اس کے دبیز گدے پر پھیلی ہوئی بے شکن اور بے داغ چمکیلی' جھالردار چادر اس طرح روشنی میں جھلملا رہی تھی کہ اس پر بیڈ کے بجائے مغربی پہلوانوں کے رنگ کا گمان گزرتا تھا۔ صرف اس کے گرد رسے تان دیئے جاتے تو اس پر کشتی لڑی جا سکتی تھی۔ اس کے عین اوپر چھت میں ایک چھتری سی لٹکی ہوئی تھی۔ یہ دوسرا بیڈ روم تھا جو ہم دیکھ رہے تھے۔

"ان بیڈ رومز کی تمام روشنیاں ریموٹ کنٹرول سے جلتی بجھتی ہیں۔ بستر پر لیٹے ہوئے کوئی سی بھی بتی بجھا دیجئے' پرنس بتا رہا تھا۔ ریموٹ کنٹرول ہی سے چھت میں لٹکی ہوئی یہ مہین سی چھتری پھیل کر آپ کے بیڈ کو ڈھانپ لیتی ہے اور آپ محسوس کرتے ہیں کہ آپ بادلوں کے دوش پر پرواز کر رہے ہیں۔ چھتری ہٹا دی جائے تو آپ تمام آئینوں میں اپنے آپ کو دیکھ سکتے ہیں۔ بیڈ رومز میں ریموٹ کنٹرول پر تمام انتظامات ابھی صرف فرانس کے کروڑ پتیوں تک ہی محدود ہیں۔ انڈیا میں بڑے سے بڑے سیٹھ کے گھر میں اس طرز کا بیڈ روم نہیں ہوگا۔"

"خیر..... میرے لیے ان آسائشوں میں کوئی خاص کشش نہیں ہے۔" میں نے بے نیازی سے کہا۔ "اگر مجھے یہاں رہنا ہوتا تو بہت سی چیزیں مجھے یہاں سے ہٹانی پڑتیں۔"

"تو کیا آپ رہنے کے لیے پیلس نہیں خرید رہے؟" پرنس نے حیرت سے پوچھا۔

"جی نہیں۔" میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ "میرا بزنس شہر میں ہے اور روزانہ مجھے شہر کے مرکز سے یہاں تک آنے کے لیے ڈیڑھ گھنٹہ اور پھر جانے کے لیے ڈیڑھ گھنٹہ درکار ہوگا۔ کبھی سمندر کا مزاج اچھا ہوتا ہے اور کبھی غیر متوقع طور پر برہم ہو جاتا ہے۔ ایسے موقعوں پر میں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بھی نہیں بیٹھ سکتا۔ یہ جگہ یا تو ریٹائرمنٹ کے بعد رہنے کے لیے مناسب ہے یا پھر آپ جیسے شہزادوں کے لیے موزوں ہے۔"

"تو پھر اسے کس لیے خریدنا چاہتے ہیں؟" پرنس نے پوچھا۔

"ابھی تو مجھے خود بھی معلوم نہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "کاروباری لوگوں کی ویسے ہی عادت ہوتی ہے کہ سستے داموں کوئی چیز مل رہی ہو تو لے کر ڈال دیتے ہیں۔ کبھی نہ کبھی کام آجاتی ہے یا پھر اچھا منافع دے جاتی ہے۔ ممکن ہے کہ میں ریٹائرمنٹ کے بعد یہاں رہنا پسند کروں۔"

پرنس نے صرف ہنکارا بھرنے پر اکتفا کیا۔ اب ہم پیلس کے عقب میں آپہنچے تھے۔ یہاں بھی لابی ہی کی طرز کا ایک ہال تھا جس کے وسط میں ایک بہت موٹے ستون کے گرد گولائی میں نفیس قسم کی مخملیں گدوں والے کاؤچ لگے ہوئے تھے۔ بظاہر اس ہال کا کوئی مصرف نظر نہیں آتا تھا۔ یہ ایک طرح کی انتظارگاہ معلوم ہوتی تھی۔

"بالائی منزل بھی بالکل ایسی ہے۔" پرنس نے بتایا۔ اسے دیکھنے سے بہتر ہوگا کہ پہلے آپ تہہ خانہ دیکھ لیں۔"

تہہ خانے میں داخل ہو کر ہم ایک قدم آگے بڑھے۔ پرنس نے دروازہ کھلا ہی چھوڑ دیا تھا اور ایک لائٹ بھی آن کی تھی۔ اس کے باوجود یہاں روشنی ناکافی تھی۔ اندر قدم رکھتے ہی خنکی زیادہ محسوس ہونے لگی تھی۔ یہاں نمی اس قدر تھی کہ دیواروں پر بوندیں سی چمکتی نظر آرہی تھیں جیسے انہیں پسینہ آگیا ہو۔

"یہاں روشنی کا کوئی معقول انتظام کروانے کے سلسلے میں آج تک توجہ ہی نہیں دے سکا۔" پرنس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ "کیونکہ اسے بھی استعمال کرنے کی کبھی نوبت نہیں آئی، حالانکہ ہے بڑے کام کی جگہ۔"

"یہاں ہے ہی کیا جسے ہم دیکھنے آئے ہیں؟" میں نے کہا۔ "بس یہ ایک سیدھا سادہ تہہ خانہ ہے۔"

"اتنا سیدھا سادہ بھی نہیں ہے۔" پرنس نے کہا۔ "میں ابھی آپ کو دکھاتا ہوں۔" دفعتاً تہہ خانے میں روشنی کچھ اور کم ہو گئی کیونکہ دروازہ ایک زوردار کھٹکے کے ساتھ بند

ہو گیا تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھنا چاہا لیکن اس سے پہلے ہی چند طاقتور بازوؤں نے میرے بازوؤں کو گرفت میں لے کر پشت کی طرف موڑ دیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ جس پوزیشن میں میرے بازو پہنچ چکے ہیں، میں پوری طاقت بھی صرف کروں تو انہیں چھڑا نہیں سکتا۔ ان پر کم از کم دو طاقتور آدمیوں کی مضبوط گرفت تھی۔ انہوں نے میرے لیے الٹی چھلانگ لگانے کی بھی گنجائش نہیں چھوڑی تھی۔ میں نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔

میرا خیال تھا کہ اب پرنس فلمی ولن کی طرح فاتحانہ قہقہہ بھی لگائے گا مگر وہ خاموش رہا، وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر روشنی کے قریب جا کھڑا ہوا تھا اور پرخیال نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا جیسے کوئی سائنس دان اس چوہے کا جائزہ لے رہا ہو جس پر وہ تجربہ کر چکا ہو یا تجربہ کرنے کا ارادہ کر رہا ہو۔

سامنے اندھیرے گوشے سے دو اور آدمی نکل کر میری طرف بڑھے۔ یہ درمیانے قد کے گٹھے ہوئے سیاہ فام نوجوان تھے، وہ خاموشی سے میرے قریب آئے اور مشاقانہ انداز میں میرے لباس پر ہاتھ پھیر کر انہوں نے غالباً اطمینان کیا کہ میرے پاس کوئی ہتھیار موجود نہیں ہے اور غالباً یہی بات انہوں نے اپنی زبان میں پرنس کو بتائی۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" پرنس نے میری طرف دیکھتے ہوئے اپنے مخصوص فرانسیسی لب و لہجے میں انگریزی میں بڑبڑایا۔ "تم یہاں تنہا آئے ہو اور بغیر ہتھیار کے آئے ہو..... یہ ناممکن ہے۔" پھر وہ قدرے غصیلے لہجہ میں غالباً اپنی مادری زبان میں انہی دونوں نوجوانوں سے کچھ کہنے لگا۔ نوجوانوں نے اب باقاعدہ میری تلاشی لینا شروع کر دی۔ انہوں نے میری ہر جیب میں ہاتھ ڈال کر دیکھا، بغلیں ٹٹولیں۔ ٹانگوں پر ہاتھ مار کر دیکھا، پھر پرنس کی طرف دیکھتے ہوئے بے بسی سے نفی میں سر ہلایا۔

اس دوران میری توجہ انہی کی طرف رہی اور میں اس وقت چونکا، جب عقب سے ایک کھٹکے کے ساتھ میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی گئی۔ مجھے احساس ہوا کہ میرے ہاتھوں میں یوں ہتھکڑی لگ جانا میرے حق میں مہلک بھی ثابت ہو سکتا تھا۔

وہ دونوں آدمی بھی میرے دائیں بائیں آکھڑے ہوئے جنہوں نے میرے بازو پشت پر جکڑ رکھے تھے۔ تہہ خانے میں گہرا سکوت طاری تھا جیسے وہاں کوئی مقدس فریضہ انجام دیا جارہا ہو۔ دفعتاً میرے عقب میں بھاری قدموں کی دھپ دھپ سنائی دی۔ میں گردن ذرا سی گھمائے بغیر نہ رہ سکا۔ میرے پیچھے کسی تاریک گوشے سے وہی قوی ہیکل گونگا نکل کر روشنی کی طرف آرہا تھا۔ وہ کندھے پر بہت بڑے اور بھاری پھل کی کلہاڑی اٹھائے ہوئے تھا۔ اتنے چوڑے اور موٹے پھل کی کلہاڑی میں نے آج تک نہیں دیکھی تھی۔

گونگے کے موٹے موٹے بھدے ہونٹوں پر احمقانہ مسکراہٹ تھی لیکن اس میں ایک عجیب سی سفاکی بھی شامل تھی۔ اس کی ننھی موٹی آنکھوں سے خون کی پیاس جھلک رہی

تھی- میری طرف دیکھتے ہوئے اس نے کسی درندے کی طرح ہونٹوں پر زبان پھیری-

پرنس نے ایک دیوار کے قریب جا کر کوئی سوئچ دبایا اور پورے تہ خانے میں روشنی پھیل گئی- اب میں نے دیکھا کہ تہ خانے کا ایک حصہ عجیب و غریب کاٹھ کباڑ سے بھرا ہوا تھا- رسے' ہتھوڑے' چھریاں' چھوٹی بڑی کلہاڑیاں- لکڑی کا ایک بہت بڑا چوکور ٹھوس ٹکڑا- ایک کونے میں زمین میں کموڈ سے مشابہ ایک بہت بڑا پیالہ سا نصب تھا جس کے ساتھ فلش کی ٹینکی ہی کی طرح بڑی ٹینکی بھی منسلک تھی- ٹینکی کے ساتھ بڑے ہینڈل والی زنجیر بھی لٹکی ہوئی تھی- یہ گوشہ کسی جناتی مخلوق کا باتھ روم معلوم ہوتا تھا جو انسان سے کم از کم دس گنا بڑی ہو سکتی تھی-

"پرنس!" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا- "میں ایک بار پھر تمہیں خبردار کر رہا ہوں کہ تم نقصان اٹھاؤ گے- ابھی وقت ہے کہ تم مکاری سے مجھ پر قابو پانے کا خیال ترک کر دو تو میں تمہیں معاف کر دوں گا- کہیں ایسا نہ ہو کہ میں پھر چاہوں بھی تو تمہیں معاف نہ کر سکوں-"

"گویا ابھی تمہیں کوئی خوش فہمی باقی ہے؟" پرنس نے قدرے حیرت سے کہا- میں اس مرتبہ کچا کام نہیں کر رہا- تم جزیرے پر تنہا آئے ہو اور تمہارے پاس کوئی ہتھیار بھی نہیں' اس کے باوجود تم اتنے پراعتماد کیوں ہو؟ میں یہ راز جاننے کی کوشش کر رہا ہوں-"

"اس میں راز کی کوئی بات نہیں- میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں چاہوں بھی تو خوفزدہ نہیں ہو سکتا- موت میرے لیے ایک سادہ سی حقیقت ہے- اس کے تصور سے میں خوفزدہ نہیں ہو سکتا- مرنا تو بہرحال سب ہی کو ہے- کسی کو گھر کے آرام دہ بستر پر' کسی کو میدان جنگ میں اور کسی کو تم جیسے کمینے دشمنوں کے ہاتھوں سیلن زدہ تہ خانوں میں- اس لیے یہ تو کوئی تشویش کی بات نہیں مگر تم سوچ لو کہ اگر اچانک موت تمہارے سامنے آکھڑی ہوئی تو تم کیا کرو گے؟"

فی الحال میں محض باتوں سے خوفزدہ ہونے کے موڈ میں نہیں ہوں-" پرنس نے لاپروائی سے کہا- "اور تم جتنی چاہے شیخی بگھار لو......ابھی جب صحیح طور پر موت کو سامنے کھڑا دیکھو گے تو چیخیں مارو گے- رحم کی بھیک مانگو گے- تم جوان ہو' خوبصورت ہو' صحت مند ہو' تم جیسے نوجوانوں سے مجھے نفرت ہے- تمہارے قتلے ہوتے دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوگی-" اس نے ایک لمحہ توقف کیا- "ویسے اگر تم مجھے اپنے اس رپورٹر دوست کا نام و پتہ بتا دو جسے میرا ایک راز معلوم ہے اور جس نے مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش کی تھی تو میں تمہیں چھوڑ دوں گا- تمہارے حصے کی موت اس کی طرف منتقل ہو جائے گی- اس کا مقدر بن جائے گی-"

"ورنہ؟" میں نے پوچھا-

"ورنہ سیدھا طریقہ ہے .....پرانے زمانوں سے استعمال ہوتا آرہا ہے-" پرنس نے بے نیازی سے کہا- "میں نے اس میں صرف تھوڑا سا اضافہ کیا ہے' وہ بھی لاش کو ٹھکانے لگانے کے سلسلے میں- طریقہ یہ ہوگا کہ یہ چاروں آدمی تمہیں پکڑ کر لکڑی کے اس چبوترے پر جھکائیں گے اور یہ گونگا جس کا نام حباش ہے' کلہاڑی کے ایک ہی وار سے تمہاری گردن اڑا دے گا- یہ اتنی طاقت سے وار کرتا ہے کہ عین ممکن ہے تمہاری گردن کٹ کر تہ خانہ کی دیوار سے جا ٹکرائے-"

"اس کے بعد یہ اسی چبوترے پر چند منٹ کے اندر اندر تمہارے اعضاء الگ الگ کرکے اس بڑے کموڈ میں ڈالے گا اور ٹینکی کی زنجیر کھینچے گا' دوسرے ہی لمحے تم فلش ہو جاؤ گے- جس طرح لوگ باتھ روم میں غلاظت فلش کر دیتے ہیں' اسی طرح یہ تمہارے اس تندرست و توانا جسم کے ٹکڑوں کو فلش کر دے گا- فرش' کلہاڑی اور چوبی چبوترا دھو ڈالے گا اور یہاں تمہارا نام و نشان تک نہیں رہے گا- اس کموڈ کی نکاسی کا بہت بڑا پائپ سمندر میں جا کر نکلتا ہے- تمہارے اعضاء سیدھے سمندر میں جائیں گے- ان پر سے گوشت مچھلیاں نوچ کر کھا جائیں گی اور ہڈیاں ڈوب جائیں گی اور اگر تم اپنے آپ کو ان مراحل سے محفوظ رکھنا چاہتے ہو تو صرف اتنا کرو کہ مجھے اس رپورٹر کے بارے میں بتا دو تاکہ میں اسے صرف اتنا بتا دوں کہ بڑے لوگوں کو بلیک میل کرنے میں بے شک دولت بھی ہاتھ آتی ہے لیکن کبھی کبھی ایسی غلط جگہ ہاتھ پڑ جاتا ہے کہ زندگی بھر کی کمائی کا حساب برابر ہو جاتا ہے-"

خدا نہ کرے کہ مجھ پر کبھی ایسا وقت آئے کہ میں اپنے دوستوں کی زندگی کا سودا کرکے اپنی زندگی بچاؤں-" میں نے کہا- "تم اپنا کام شروع کرو-"

پرنس نے چاروں آدمیوں کو اشارہ کیا- وہ میرے کندھوں اور بازوؤں پر گرفت مضبوط کرکے مجھے چوبی چبوترے کی طرف لے چلے- اب مجھے اضطراب محسوس ہونے لگا تھا- مجھے اگر کوئی اطمینان تھا تو صرف یہ کہ میری ٹانگیں آزاد تھیں- جوڈوں کے استعمال کے سلسلے میں بعض اوقات ٹانگوں کا آزاد ہونا ہاتھوں کے آزاد ہونے سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے-

حباش کلہاڑی کندھے پر رکھے میرے آگے آگے چل رہا تھا- کلہاڑی کا پھل تیز روشنی میں چمک رہا تھا- اونچے سے چوبی چبوترے کے پاس پہنچ کر ان چاروں نے طاقت صرف کرکے مجھے چبوترے پر جھکا دیا- میں صرف دکھاوے کے لیے تھوڑی بہت مزاحمت کر رہا تھا- میں چاہتا تو ان چاروں کی گرفت سے نکل سکتا تھا لیکن میرا اصل مسئلہ یہ نہیں تھا کہ میں ان کی گرفت سے نکل جاؤں بلکہ میری سب سے بڑی ضرورت یہ تھی کہ کس طرح اس دیوزاد حباش کے ہاتھوں سے کلہاڑی نکل جائے- سب سے زیادہ خطرہ مجھے اس کی گرفت میں کلہاڑی کی موجودگی سے ہی تھا-

اس مقصد کے لیے میں جان پر کھیل کر ایک داؤ آزمانے جا رہا تھا۔ خطرہ مول لیے بغیر تو ویسے بھی چارہ نہیں تھا۔ چاروں آدمی مجھے چبوترے پر اس عالم میں جھکا چکے تھے کہ میری ناک اور پیشانی چوبی چبوترے کو چھو رہی تھی اور میں چبوترے میں رچی ہوئی لہو کی بو محسوس کر سکتا تھا۔ ویسے تو اسے نہ جانے کتنی مرتبہ کن کن طریقوں سے دھویا گیا ہوگا لیکن لہو کی بو شاید کسی بھی طریقے سے نہیں جاتی یا پھر میری قوت شامہ کو ہی اس کی کوئی خاص پہچان ہو گئی تھی حالانکہ ابھی میں نے اپنی زندگی میں زیادہ خونریزی نہیں دیکھی تھی۔

حباش نے پوزیشن سنبھال لی۔ ماحول پر بلا کا سکوت طاری تھا۔ اس سکوت میں، میں نے "شائیں" کی تیز آواز سنی اور پوری قوت صرف کرتے ہوئے بجلی کی سی تیزی سے اپنا سر چبوترے پر سے ہٹا لیا۔ وہ چاروں آدمی بری طرح لڑکھڑا گئے جنہوں نے مجھے قابو کیا ہوا تھا۔ کلہاڑی ایک زوردار آواز کے ساتھ چوبی چبوترے میں اتنی گہری گڑ گئی کہ فوری طور پر اسے نکالنا حباش کے لیے بھی ممکن نہ رہا۔ اگر کلہاڑی کو میری گردن سے گزرنا پڑتا تو شاید اس کی رفتار میں اتنی تیزی نہ رہتی اور وہ چوبی چبوترے میں اتنی نہ دھنستی البتہ میرا سر یقیناً ایک حقیر گاجر کے سرے کی طرح کٹ کر دور جا گرتا۔

حباش قدرے جھک کر کلہاڑی کو نکالنے کے لیے زور آزمائی کر رہا تھا۔ جب میں نے اس کی پسلیوں پر لات رسید کی۔ جوڈو کی اصطلاح میں یہ "چاپ سوئی" تھی۔ حبائش کی ایک دو پسلیاں ٹوٹی تھیں لیکن وہ نہ تو الٹ کر گرا اور نہ ہی زیادہ پیچھے ہٹا۔ محض ذرا سا لڑکھڑا کر سنبھل گیا۔ اس کے حلق سے غصیلے سانڈ کی سی ڈکراہٹ خارج ہوئی اور وہ کلہاڑی کا خیال ترک کرکے مجھ پر جھپٹا۔ میں جھکائی دے کر درمیان سے نکل آیا اور وہ بیک وقت ان چاروں آدمیوں کو ساتھ لیتے ہوئے فرش پر ڈھیر ہو گیا جنہوں نے چند لمحے پہلے تک مجھے گرفت میں لے رکھا تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ اٹھ سکتا، پیلس میں کہیں گولیوں کے دھماکے گونجنے لگے۔ سب اپنی جگہ ساکت ہو گئے۔ دفعتاً پرنس کے دو گرگوں نے ہولسٹروں سے پستول نکالے اور دروازے کی طرف لپکے۔ باقی دو گرگوں کو حباش کے ہاتھوں نہ جانے کہاں ضرب پہنچ چکی تھی کہ وہ تقریباً دہرے ہو چکے تھے اور بری طرح کراہ رہے تھے۔

"ٹھہرو۔" پرنس نے ان دونوں کو حکم دیا جو ریوالور لیے دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ پرنس سخت تذبذب میں نظر آتا تھا۔ دونوں سیاہ فام گرگے رک کر پلٹے لیکن اس سے پہلے کہ پرنس انہیں کوئی حکم دے پاتا، تہہ خانے کی بتیاں بجھ گئیں اور گھپ اندھیرا چھا گیا۔ میں فوراً ہی رینگ کر چوبی چبوترے کی آڑ میں چلا گیا۔ تہہ خانے میں گہرا سکوت چھا گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے سب نے سانسیں تک روک لی ہیں۔

اوپر فائرنگ بھی ختم چکی تھی۔ دفعتاً تہہ خانے کی سیڑھیوں پر دھڑ دھڑ کی آواز آئی۔

پھر کسی نے دروازے کو ٹھوکر ماری اور کہا۔ "باس! ہوشیار....."

دوسرے ہی لمحے نہایت مضبوط اور موٹا چوبی دروازہ ایک زبردست دھماکے کے ساتھ ٹکڑوں میں تبدیل ہو کر فرش پر آگرا اور تہہ خانے میں بارود کی بو پھیل گئی۔ دروازہ گرنیڈ سے اڑا دیا گیا تھا۔ اسی لمحے تہہ خانے کی بتیاں روشن ہو گئیں اور میں نے چھنا کو بلا خوف و خطر، آندھی طوفان کی طرح اندر آتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں اسٹین گن تھی۔ پرنس کے دونوں گرگے جنہیں میں نے ریوالور نکال کر دروازے کی طرف لپکتے دیکھا تھا، ابھی تک اپنی جگہ سلامت ہی کھڑے تھے لیکن ان کی عقل گویا خبط ہو کر رہ گئی تھی۔

پھر انہوں نے بے مقصد سے انداز میں ریوالور بلند کرنے کی کوشش کی لیکن چھنا نے بلاتوقف اسٹین گن سے برسٹ مارا۔ ان میں سے ایک کا جسم تو گویا دھڑ پر سے دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ دوسرا ہوا میں کئی فٹ اچھلا اور فرش پر گر کر ساکت ہو گیا۔ دوسرے جو فرش پر ڈھیرے تھے، ان میں سے ایک پناہ کی تلاش میں میرے قریب ہی آپہنچا۔ میں نے اس کی کنپٹی پر ٹھوکر رسید کی، وہ بلبلا کر دور جا گرا۔ دوسرے ہی لمحے اسٹین گن کی گولیاں اسے اور اس کے ساتھی کے علاوہ حباش کو بھی چاٹ گئیں۔





چھنا اسٹین گن کا کچھ زیادہ ہی آزادانہ استعمال کر رہا تھا۔ میں نے اسے اتنی خونریزی کی ہدایت نہیں کی تھی لیکن پھر مجھے یاد آیا کہ پرنس میرا کیا حشر کرنے لگا تھا اور اس سے پہلے یہاں نہ جانے کتنے انسانوں کو زمانہ قدیم کے جلاد صفت حکمرانوں کے روایتی انداز میں موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ تب میں نے چھنا کو اس سلسلے میں تنبیہ کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

میں نے چبوترے کی آڑ سے دیکھا.....چھنا اسٹین گن تھامے تہہ خانے کے وسط میں تنہا کھڑا تھا اور پرنس شومبی اس کے سامنے چند قدم کے فاصلے پر فرش پر اوندھا لیٹا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ گدی پر رکھے ہوئے تھے جس کا مطلب تھا کہ وہ کوئی مزاحمت نہ کرنے کا اعلان کر رہا ہے۔ اس کے حلق سے عجیب گھگھیائی ہوئی سی آوازیں نکل رہی تھیں۔

"باس! تم کہاں ہو؟" چھنا نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پکارا۔

میں چبوترے کی آڑ سے نکل آیا۔

"دلدار کہاں ہے چھنا؟" میں نے پوچھا۔

"باس! وہ پرنس کے محافظوں کی لاشیں کار میں ڈال کر سمندر میں پھینکنے جا رہا ہے۔" چھنا نے جواب دیا۔

دلدار یوں تو میری کمپنی میں سپروائزر تھا لیکن درحقیقت میرے جانثار ساتھیوں کے اس دستے میں شامل تھا جو میں اور چھنا مل کر تیار کر رہے تھے۔

ابھی تک میں اور چھنا ایسے صرف دو ساتھی ڈھونڈ پائے تھے۔ ایک کا نام دلدار اور دوسرے کا نام تحسین تھا۔ دلدار تو چوڑا چکلا اور خوبصورت جوان تھا۔ اس کی مضبوطی اس کی جسمانی ساخت سے ہی نمایاں تھی لیکن تحسین چھپا رستم تھا۔ بظاہر وہ فاقوں کا مارا کوئی مخنی سا شاعر نظر آتا تھا لیکن اس کے دبلے پتلے جسم میں قدرت نے حیرت انگیز خوبیاں بھر دی تھیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ بنیادی طور پر وہ الیکٹرک انجینئر تھا مگر اب یہ بات شاید اسے خود بھی صرف ضرورت پڑنے پر ہی یاد آتی تھی۔ اس بنیادی ہنر سے قطع نظر خنجر زنی' پیراکی' جمناسٹک' نشانے بازی اور شکار میں استعمال ہونے والے مختلف قسم کے شکنجے تیار کرنے میں اس کا ثانی ملنا مشکل تھا۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ اس قدر دبلا پتلا ہونے کے باوجود بلا کا طاقتور اور سخت جان تھا۔ آکٹوپس کی طرح اگر کسی کو گرفت میں لے لیتا تو وہ اپنے آپ کو چھڑا نہیں سکتا تھا.....اور سخت جان اتنا کہ تین چار دن مسلسل بھوکا رہنے کے باوجود اس کی جسمانی پھرتی اور صلاحیتوں میں کوئی فرق نہیں آتا تھا۔

"لاشیں سمندر میں بھجوانے کا تو تم نے ناحق تردد کیا۔" میں نے چھنا سے کہا اور جہازی سائز کے کموڈ کی طرف اشارہ کیا۔ "لاشیں سمندر میں پہنچانے کا تو یہاں نہایت اعلیٰ انتظام ہے۔" ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے پوچھا۔ "اور تحسین کہاں ہے؟"

"وہ سوئچ بورڈ میں گھپلا کر رہا تھا.....آ رہا ہوگا۔" چھنا نے جواب دیا۔

"اچھا.....پرنس کو تو میں سنبھالتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تم ان چاروں سیاہ فاموں کی تلاشی لو.....ان میں سے کسی کی جیب میں اس ہتھکڑی کی چابی ہوگی جو میرے ہاتھوں کو لگی ہوئی ہے۔"

چھنا چابی کی تلاش میں لاشوں کی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ میں نے پرنس کی ٹھوڑی پر ہلکی سی ٹھوکر رسید کی۔ "کیا حال ہے پرنس؟" میں نے پوچھا۔ "تم نے واقعی یقین کر لیا تھا کہ میں تم جیسے کمینے دشمن سے ملنے کے لیے بغیر کسی انتظام کے نکل کھڑا ہوں گا؟"

"مجھے مت مارنا.....خدا کے لیے....." پرنس نے میری بات پر دھیان دیئے بغیر گھگھیاتے ہوئے کہا۔

"تمہیں مارنا ہی تو میں نہیں چاہتا۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ "ورنہ پہلی ملاقات پر ہی تمہارا قصہ پاک کر دیتا۔"

چھنا نے ہتھکڑی ایک طرف پھینک دی اور پرخیال نظروں سے پرنس کی طرف دیکھا.....وہ بوکھلا کر بولا۔ "اب تم میرے ساتھ کیا سلوک کرو گے؟"

"سلوک؟" میں نے ملامت سے کہا اور چھنا کی طرف دیکھا۔ "پرنس کو بتاؤ کہ ہم انہیں ایک معمولی سی زحمت دینا چاہتے ہیں۔" چھنا نے تھیلے سے ٹائپ شدہ عدالتی اور سادہ کاغذات کا ایک پلندا نکال کر پرنس کے سامنے رکھ دیا اور ایک قلم اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "ان سب پر دستخط کر دو.....باقی کارروائیاں ہمارے وکیل نمٹاتے رہیں گے۔ ان کاغذات پر دستخط کے بعد یہ پیلس ہماری کمپنی کے کنسٹرکشن ڈویژن کی ملکیت ہو جائے گا۔"

اس نے فرش سے قلم اٹھایا اور جھک کر تیزی سے کاغذات پر دستخط کرنا شروع کر دیئے۔ چھنا اسٹین گن کی نالی سے اسے بتاتا جا رہا تھا کہاں کہاں دستخط کرنے ہیں۔

"اب.....؟" دستخطوں سے فارغ ہو کر اس نے تھوک نگلتے ہوئے پوچھا۔

"اب تم اوپر چلو گے.....اپنی ضرورت کی چیزیں ایک سوٹ کیس میں ڈالو گے.....اس کے بعد ہم تمہیں تمہارے طیارے تک چھوڑنے چلیں گے۔" میں نے اس کے پروگرام

سے اسے مطلع کیا- "ایئرپورٹ پر تم یہیں سے ریڈیو کے ذریعے اپنا فلائٹ پلان دو گے اور اپنی ریاست کی طرف پرواز کر جاؤ گے.....اور اگر زندہ رہنا چاہو گے تو کبھی ہندوستان کا رخ نہیں کرو گے-"

"میں....میں کبھی نہیں آؤں گا......میرا تو پہلے ہی سے یہی ارادہ تھا...." وہ جلدی سے بولا-

"اگر تم نے خوامخواہ چالاک بننے کی کوشش نہ کی ہوتی تو تمہیں دو لاکھ روپیہ بھی مل جاتا اور اتنے ساتھیوں سے ہاتھ بھی نہ دھونے پڑتے-" میں نے کہا-

"دراصل.....مجھے اندازہ نہیں تھا.....کہ یہاں اس پائے کے لوگ بھی پائے جاتے ہیں-" اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا-

پیلس میری مرضی کے مطابق سیٹ ہو چکا تھا اور ماہتاب' ایک گورنس اور ایک باڈی گارڈ کے ساتھ علاج کے لیے لندن جا چکی تھی- اب میں سوچ رہا تھا کہ کسی بھی روز ایک دن کے لیے پونا جاؤں- اپنے کالج فون کرکے میں نے مدن موہن کے گھر کا ایڈریس معلوم کر لیا تھا- میں چاہتا تو چھنا' دلدار یا تحسین میں سے کسی کو بھیج کر بھی مدن موہن کو اسی طرح اٹھوا سکتا تھا جس طرح نوکر کے ہاتھ بازار سے کوئی سودا منگوا لیا جائے.....لیکن پھر بھی جانے کیوں یہ کام میں خود کرنا چاہتا تھا-

پھر ایک روز میں اپنی خوش قسمتی پر خود ہی رشک کیے بغیر نہ رہ سکا- میں جس کی تلاش میں اتنے دن سے پونا جانے کا پروگرام بنا رہا تھا' وہ مجھے بمبئی میں ہی نظر آگیا- جس طرح پونا سے آنے کے بعد سے اب تک میری اپنی شکل و شباہت اور رکھ رکھاؤ میں خاصا فرق آگیا تھا' اسی طرح مدن موہن بھی ظاہری طور پر کافی بدل چکا تھا-

وہ وقت سے پہلے ہی بڑا پکا پکا سا نظر آنے لگا تھا- آنکھوں کے پپوٹے اور جبڑے خاصے بھاری ہو گئے تھے- بال اس نے بہت بڑھا رکھے تھے- سگریٹ کی جگہ سگار پینا شروع کر دیا تھا- بڑی نفیس تراش خراش کا سوٹ پہنے ہوئے تھا اور کوئی معزز کاروباری آدمی نظر آرہا تھا- میں پہلی نظر میں شاید اسے نہ پہچانتا اور اس کے قریب سے گزرتا چلا جاتا- مجھے صرف اس کی آواز نے چونکایا حالانکہ وہ بہت دھیمے لہجے میں بات کر رہا تھا اور کچھ اس کی آواز پر خمار کا بھی غلبہ تھا مگر جانے کیوں اس کا لب و لہجہ میری سماعت پر گویا نقش تھا-

وہ اس وقت نشاط نائٹ کلب کے ریوالونگ ڈور کے ایک طرف سے نکل رہا تھا اور میں دوسری طرف سے اندر جانے لگا تھا- ایک امریکی فرم کے دو نمائندوں سے یہاں میری ملاقات طے تھی جس کا وقت ہو چکا تھا- میں گھومتے دروازے سے اندر تو چلا گیا لیکن اس وقت میں مدن موہن کو پہچان چکا تھا' اس لیے دوسری طرف سے اس کے پیچھے پیچھے نکل

آیا-

اس کے ساتھ تیس پینتیس سال کی ایک انتہائی حسین عورت تھی جس کے ماتھے پر تلک چمک رہا تھا- وہ کاسنی ساڑھی میں تھی اور اس کا جسم گویا سانچے میں ڈھلا ہوا تھا- بظاہر وہ سیدھی سادی اور شرمیلی سی عورت نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن میں نے سامنے سے آتے وقت ایک لمحے کے لیے ہی اس کی طرف دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چھپی ہوئی مکاری کا جائزہ لے لیا تھا- اب میں اس کے پیچھے چلتے ہوئے اس پر نظر جمائے ہوئے تھا- مجھے یقین تھا کہ تعاقب کا شبہ اگر ہوا بھی تو اس عورت ہی کو ہوگا' مدن موہن کو اس کا ہوش نہیں تھا- اس کے قدم گو کہ لڑکھڑا نہیں رہے تھے مگر یہ اندازہ لگانا زیادہ مشکل نہیں تھا کہ وہ خاصی پیئے ہوئے ہے- اس نے عورت کا بازو تھامنے کے بہانے درحقیقت اس کا سہارا لے رکھا تھا-

پارکنگ لاٹ میں پہنچ کر وہ سبز رنگ کی ایک چھوٹی سی اسپورٹس کار میں بیٹھ گیا- اسٹیئرنگ عورت نے ہی سنبھالا تھا اور وہ اس کی گاڑی معلوم ہوتی تھی- اس نے قدرے جارحانہ سے انداز میں لیکن نہایت مشاقی سے گاڑی دوسری گاڑیوں کے درمیان سے نکالی- اس وقت تک میں بھی اپنی رولز رائس میں بیٹھ چکا تھا-

سبز اسپورٹس کار سڑک پر پہنچ چکی تو میں نے بھی گاڑی پارکنگ لاٹ سے نکالی اور اس کے تعاقب میں روانہ ہو گیا- درمیانی فاصلہ میں نے خاصا رکھا تھا کیونکہ ابھی شام کا دھندلکا گہرا نہیں ہوا تھا اور روشنی میں رولز رائس کچھ زیادہ ہی نظر میں آجاتی تھی-

چند منٹ کے سفر کے بعد ہی سبز اسپورٹس کار ایک نئی فیشن ایبل سی کالونی میں داخل ہوئی اور چند گلیوں میں چکرانے کے بعد ایک چھوٹے سے خوبصورت بنگلے کے پورچ میں جا رکی- اس بنگلے کی دیواروں پر عشق پیچاں کی بیلیں نہایت شاعرانہ انداز میں چڑھی ہوئی تھیں- گیٹ کے ستونوں پر صرف بنگلے کا نمبر نظر آتا تھا' کوئی نام نہیں تھا- میں آگے گزرتا چلا گیا-

گلی زیادہ چوڑی نہیں تھی- بنگلے کے آس پاس کہیں رکنا مجھے موزوں نظر نہ آیا لیکن گلی کے نکڑ پر ایک مناسب جگہ نظر آئی- یہاں درختوں کا ایک چھوٹا سا جھنڈ بھی تھا جس کی وجہ سے تاریکی نسبتاً گہری تھی- قریب ہی ایک بنگلہ بھی زیر تعمیر تھا- میں نے گاڑی بیک کی اور درختوں کے نیچے لے جا کر روکی-

وہاں گاڑی میں بیٹھے مجھے کافی دیر گزر گئی لیکن مدن کی واپسی کے کوئی آثار نظر نہ آئے بالآخر میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور رینگنے کی سی رفتار سے اس بنگلے کے سامنے سے گزرا- بنگلہ یوں سکوت اور تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا جیسے وہاں کوئی ذی روح موجود ہی نہ ہو- بالائی منزل پر صرف ایک چھوٹی سے کھڑکی میں روشنی نظر آرہی تھی' وہ بھی شیشوں اور

پردوں کے پیچھے۔ مدن کے نکلنے کے ابھی کوئی آثار نہیں تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس کا رات یہیں بسر کرنے کا ارادہ ہو۔

میں نے دوبارہ گاڑی درختوں کے نیچے لا کھڑی کی۔ ایک گھنٹے کے انتظار کے بعد جبکہ میں مایوس ہو کر بنگلے میں داخل ہو جانے کا ارادہ کر رہا تھا' مدن اچانک ہی مجھے باہر آتا دکھائی دیا۔ وہ عورت یا کوئی اور اسے گیٹ تک چھوڑنے بھی نہیں آیا تھا اور اس کے پاس کار وغیرہ بھی نہیں تھی۔ وہ جھومتا جھامتا پیدل ہی ایک طرف کو چل پڑا۔ اس کی چال میں اب باقاعدہ لڑکھڑاہٹ تھی۔ بنگلے میں غالباً اس نے اور بھی پی تھی اور شاید اسی پختہ کار اور حسین ساقی کے ہاتھوں سے پی تھی۔

جب وہ دوسری گلی میں مڑ چکا تو میں نے گاڑی کی لائٹیں آن کیں اور اس سے ایک قدم آگے پہنچ کر بریک لگا دی۔

"ارے....مدن.....! تم یہاں کیا کرتے پھر رہے ہو؟" ملگجے اندھیرے میں' میں نے کھڑکی سے سر نکال کر قدرے بدلی ہوئی آواز میں اسے پکارا۔ وہ ٹھٹھکا اور کچھوے کی طرح گردن آگے کر کے مجھے پہچاننے کی کوشش کرنے لگا' حالانکہ وہاں روشنی اس قدر کم تھی اور مدن پر خمار اتنا غالب تھا کہ اس کی یہ کوشش فضول ہی تھی۔

"ارے بھئی....پہچانا نہیں....میں ٹونی ہوں۔" میں نے شگفتہ لہجے میں کہا۔ کالج کے زمانے میں ٹونی' مدن کا گہرا یار ہوا کرتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آج کل وہاں وہ کہاں تھا' تاہم میں نے اندھیرے میں تیر چھوڑ دیا تھا۔

"ار...رے...ٹو...نی!" مدن نے لڑکھڑاتی آواز میں صرف اتنا کہا اور اس سے کہیں زیادہ لڑکھڑاتے قدموں سے میری طرف لپکا۔ قریب آ کر وہ کھڑکی کے راستے مجھ سے گلے ملنے کی کوشش کرنے لگا لیکن میں نے آہستگی سے اس کے بازو پیچھے کر دیئے۔

"یار...تو یہاں کہاں..... آن مرا....تو تو امریکہ گیا ہوا تھا۔" اس نے گھوم کر دوسری طرف سے آتے ہوئے کہا۔

"بس پرسوں ہی آیا ہوں.....تجھے اطلاع ہی نہیں دے سکا۔" میں نے اس کے لئے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ دروازہ کھلنے پر چھت کی مدھم سی بتی روشن ہوئی تو اس نے بیٹھے بیٹھے ٹھٹھک کر میرے بجائے کار کا جائزہ لیا۔ اس کی آنکھیں یوں چندھیا رہی تھیں جیسے کار میں کوئی سو واٹ کے بلب کی روشنی پھیلی ہوئی ہو۔

"کار تو بڑی شاندار ہے یار رے! کہاں سے مار کر لایا ہے.....امریکہ سے ہی ساتھ لایا ہے کیا؟" اس نے جملوں کے درمیان ہچکیاں لیتے ہوئے کہا اور میرے برابر سیٹ میں دھنس گیا۔ میں نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر دروازہ بند کر لیا اور کار میں ایک بار پھر اندھیرا پھیل گیا۔ صرف ڈیش بورڈ سے مختلف میٹروں کی نہایت ہی دھندلی سبز سی روشنی میرے

ہاتھوں اور اس کے ڈائمنڈ ٹائی پن پر پڑ رہی تھی۔

"یہاں پیدل کہاں دھکے کھا رہے تھے؟" میں نے کار آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"میری گاڑی نشاط کلب میں کھڑی ہے۔" اس نے قدرے سنبھلتے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "یہاں ایک اونچے درجے کی حرافہ کے ساتھ آیا تھا۔ پرانی واقف ہے لیکن تمہیں پتا ہی ہے.....یہ کام نکلنے کے بعد نوکر کو بھیج کر ٹیکسی تک منگا کر نہیں دیتیں۔ شکر ہے تم مل گئے...اس علاقے میں تو دور دور تک ٹیکسی بھی نہیں ملتی...."

ہم اس وقت لکشمی مینشن کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ یہ ایک چوڑی چکلی' پر رونق اور روشن سڑک تھی۔ مدن نے کھڑکی کے شیشے سے باہر دیکھتے ہوئے آنکھیں سکیڑیں۔ "تم نشاط کلب کی طرف نہیں جا رہے ہو کیا؟ میں وہاں سے اپنی گاڑی لے لیتا۔"

"بعد میں کسی کو بھیج کر منگا لیں گے....فی الحال اس عشرت کدے کی طرف چل جو تیرے اس خادم نے دریافت کیا ہے۔" میں نے کہا۔ "وہاں بھی اس قدر حسن و شباب کا ایک چھوٹا سا خزانہ ہمارا منتظر ہے۔"

میں نے جب گاڑی اپنی کوٹھی کے ڈرائیو وے میں موڑی تو روش کے دونوں طرف گلوب روشن تھے۔ میں گاڑی برآمدے کے چھجے کی طرف لے گیا جہاں روشنی کم تھی۔ مدن نے گاڑی سے اتر کر چندھی چندھی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھا اور مخمور لہجے میں بولا "یہ تو اپنے اڈوں سے بھی کوئی اونچا ہی اڈا معلوم ہوتا ہے.....! تو تو تھوڑے ہی عرصے میں بڑی اونچی چیز بن گیا ہے' اس نے میری کمر پر دھپ رسید کی' پھر حیرت زدہ لہجے میں بولا۔ "اور یہ تیرے جسم کو بھی تو معلوم نہیں کیا ہو گیا ہے.....بالکل پتھر کا ہو گیا ہے....جدھر ہاتھ مارو' ہاتھ ہی جھنجھنا جاتا ہے.....یار تجھے تو امریکہ کی ہوا بڑی راس آئی ہے۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور اس کا ہاتھ تھام کر بیرونی دروازہ کھول کر جلدی سے اسے ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ راہداری میں کرمو تیزی سے آتا دکھائی دیا تھا مگر میں نے دور ہی سے آواز دے کے اسے کہا کہ وہ اپنا کام کرے' لائٹیں وغیرہ میں خود ہی جلا لوں گا۔

ڈرائنگ روم میں پہنچ کر میں نے بیک وقت ساری لائٹیں آن کر دیں۔ مدن جو نشے کی وجہ سے پہلے ہی ذرا ذرا سی روشنی میں بھی آنکھیں سکیڑ رہا تھا' اب جیسے اندھا ہی ہو کر رہ گیا۔ ساؤنڈ پروف دروازے کو مقفل کر کے میں عین اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"ارے....." چند لمحے بعد اس نے آنکھیں پٹ پٹاتے ہوئے کہا۔ "تم ٹونی تو نہیں ہو...." پھر جیسے وہ اپنے آپ سے باتیں کرنے لگا۔ "یہ آنکھیں ....یہ ابرو.....یہ ناک....تمہارا چہرہ تو کافی حد تک جانا پہچانا لگ رہا ہے....صرف یہ ہیر اسٹائل اجنبی لگ رہا ہے۔ ارے....تم تو منصور ....." باقی الفاظ اس کے حلق ہی میں دم توڑ گئے اور آنکھیں

یوں پھیل گئیں جیسے اس نے اپنے سامنے کسی عفریت کو دیکھ لیا ہو جس کے بارے میں اس نے صرف قصے کہانیوں میں پڑھا ہو اور جس کے وجود پر اسے کبھی یقین نہ رہا ہو۔

اس کا نشہ یوں یک لخت ہرن ہو گیا تھا جیسے اسے بجلی سے شاک لگا دیا گیا ہو۔ پھر اس نے پھرتی سے کوٹ کی اندرونی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کے پاس بغلی ہولسٹر میں ریوالور موجود ہے لیکن اس سے پہلے کہ وہ اسے نکال پاتا' میں نے اس کے منہ پر الٹے ہاتھ کا تھپڑ رسید کیا۔ وہ ہلکی سی چیخ کے ساتھ دور جا گرا۔ اس کا ہاتھ ایک بار پھر بغل کی طرف بڑھنے ہی لگا تھا کہ میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر اس کی پسلیوں میں ٹھوکر رسید کی۔ بغل کی طرف بڑھتا ہوا اس کا ہاتھ یوں سختی سے پسلیوں پر جم گیا جیسے وہاں خنجر گھونپ دیا گیا ہو۔

میں نے اس کا ہاتھ پسلیوں سے ہٹا کر جوتے تلے دبا لیا اور جھک کر اس کے ہولسٹر سے ریوالور نکال لیا۔ ریوالور اپنی جیب میں رکھ کر میں مدن کو چھوڑ کر ایک طرف ہٹ گیا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش نہیں کی' وہیں پڑا زخمی کتے کی طرح ہانپتا رہا۔

"اٹھو میری جان.... مجھ پر حملہ کرو...... بڑی دعاؤں کے بعد تو تم سے ملاقات ہوئی ہے اور تم یوں تھکے ہوئے سور کی طرح لیٹ گئے ہو۔" میں نے ملامت سے کہا۔

"میں تم سے معافی مانگتا ہوں منصور۔" اچانک اس نے لیٹے ہی لیٹے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ "تمہیں تمہارے خدا کا واسطہ مجھے معاف کر دو۔"

"کس بات کی معافی مدن پیارے؟" میں نے پہلے سے بھی زیادہ ملامت سے پوچھا۔

"میں نے تمہارے ساتھ جو بھی زیادتیاں کی ہیں' ان سب کی۔" اس نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

"صرف میرے ساتھ؟" میں نے ہلکی سی حیرت سے پوچھا۔

اس کے چہرے کی زردی کچھ بڑھ گئی۔ "تو کیا ماہتاب سے تمہاری ملاقات ہو چکی....." سرسراتی سی آواز میں وہ صرف اتنا ہی کہہ سکا' جملہ مکمل نہ کر سکا۔

"ہاں....ماہتاب سے میری ملاقات ہو چکی۔ میں اس کا مسخ شدہ چہرہ دیکھ چکا۔ اس پر جو کچھ بیتی' وہ بھی سن چکا۔ میری ماں بھی مجھ سے اچانک ملاقات کے صدمے کی تاب نہ لا کر مر چکی۔ صرف ایک تمہاری ذات نے' صرف تمہاری خباثتوں نے کتنے انسانوں کو کیسی کیسی ناقابل تلافی تباہیوں سے دوچار کیا ہے.....کیا تمہارے خیال میں محض تمہارے معافی مانگنے سے یہ سب زخم بھر جائیں گے مدن؟"

تب اس نے محسوس کر لیا کہ معافی مانگنے سے کچھ نہیں بنے گا۔ موت کے جال میں پھنسے ہوئے درندے کی طرح مایوسی اور دل برداشتگی کی انتہا پر آخری اور بھرپور کوشش کے لیے وہ ساری توانائی مجتمع کر کے اٹھا اور مجھ پر جھپٹا۔ اس نے میری پسلیوں پر گھونسہ

رسید کرنے کی کوشش کی۔ یہ گھونسہ کلائی پر روکتے ہوئے میں نے اس کی کنپٹی پر کرانے کا نہایت ہلکا سا ہاتھ رسید کیا کہ کہیں وہ مر ہی نہ جائے۔ وہ ایک بار پھر قالین پر جا گرا اور سر کو یوں دائیں بائیں جھٹکنے لگا جیسے بینائی جاتی رہی ہو۔

چند لمحے بعد اس نے دوبارہ اٹھنے کی کوشش کی۔ اس کا چہرہ پسینے میں تر ہو چکا تھا۔ وہ مجھے انسان نہیں' کوئی غلیظ حیوان معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے دیوار گیر الماری سے وہ خاص قسم کا چابک نکال لیا جو نہ جانے کب سے ایسے ہی کسی موقع کے انتظار میں وہاں پڑا تھا۔ اس کی رسی درحقیقت چمڑے کے ریشوں کو بل دے کر تیار کی گئی تھی اور اگر زیادہ زور سے ماری جاتی تو گوشت میں اتر سکتی تھی۔

میں نے چابک گھمایا اور دوسرے ہی لمحے شائیں کی آواز کے ساتھ اس کی گردن پر رسید کیا۔ وہ یوں بلبلا کر اٹھ کھڑا ہوا جیسے غلطی سے قالین پر نہیں کانٹوں کی سیج پر گر گیا تھا۔ دوسرا وار میں نے اس کی ٹانگوں پر کیا' وہ ٹانگوں کو پکڑ کر دہرا ہوتے ہوئے ایک بار پھر قالین پر ڈھیر ہو گیا۔ میں اس کے اوپری دھڑ پر چابک نہیں مار رہا تھا کیونکہ مجھے اندازہ تھا کہ وہاں اس کے دبیز کوٹ کی وجہ سے اسے زیادہ تکلیف دہ ضرب نہیں پہنچے گی۔

"بچاؤ' بچاؤ....." مدن اب باقاعدہ کسی ایسی عورت کی طرح چیخنے لگا تھا جس کی عزت پر حملہ کیا جا رہا ہو۔

"چیخنے کا شوق بھی پورا کر لو میری جان!" میں نے چابک ہوا میں گھماتے ہوئے کہا۔ "تم جیسے مکروہ انسانوں کی آواز کو انہی دیواروں تک محدود رکھنے کا میں نے خاص اہتمام کر رکھا ہے۔"

اس بار میں نے چابک اس کے سینے پر ماری جہاں کوٹ کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ وہ تڑپ کر اوندھا ہوا تو میں نے اس کی پنڈلیوں پر وار کیا۔ "چوپایوں کی طرح چاروں ہاتھوں پیروں کے بل چلتے ہوئے اس کونے میں پہنچو مدن!" میں نے کمرے کے اس گوشے کی طرف اشارہ کیا جہاں کوئی فرنیچر وغیرہ نہیں تھا۔

وہ اب ابکائیاں سی لے رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر اس کی گردن پر چابک رسید کیا۔ وہ تقریباً سجدے کی سی حالت میں چلا گیا۔ میں نے ایک بار پھر اپنا حکم دہرایا.....وہ اس کی تعمیل کرتے ہوئے چاروں ہاتھوں پیروں کے بل چلتا ہوا کمرے کے گوشے میں پہنچا تو میں نے اسے قالین اٹھانے کا حکم دیا۔ قالین اٹھا کر وہ پیچھے ہٹ چکا تو میں نے سوئچ بورڈ پر ایک سوئچ دبایا جو بجلی کے دیگر سوئچوں سے ہی مشابہ تھا مگر اسے دبانے کا طریقہ مختلف تھا۔

جہاں سے قالین ہٹا تھا' وہاں فرش میں ایک چوکور خلا نمودار ہو گیا جس میں سیڑھیاں نیچے جاتی دکھائی دے رہی تھیں۔ میں نے ایک اور سوئچ دبایا' سیڑھیوں سے نیچے تک روشنی پھیل گئی۔

"چلو....." میں نے چابک لہراتے ہوئے مدن کو حکم دیا۔ "یونہی چوپایوں کی طرح ہی سیڑھیاں اترو۔"

وہ کچھ ہچکچایا تو میں نے اس کی پشت پر پوری قوت سے چابک رسید کیا۔ وہ بلبلا کر خلا کی طرف لپکا اور سر کے بل سیڑھیوں پر لڑھکتے لڑھکتے بچا۔ ہانپتے ہانپتے وہ چوپایوں کی طرح سیڑھیاں اترنے لگا۔ زیادہ شراب نوشی کے بعد سوٹ میں ملبوس ہوتے ہوئے چوپایوں کی طرح سیڑھیاں اترنا بڑا صبر آزما کام تھا' میں اس کے پیچھے تھا۔

تہ خانے میں پہنچ کر وہ گردن جھکا کر کئی لمحے تک بری طرح ہانپتا رہا' پھر اس نے خوفزدہ سی نظروں سے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ یہ ایک چھوٹا سا تہ خانہ تھا جس میں لکڑی کی کچھ سوراخ دار مضبوط پیٹیاں لوہے کی سلاخوں سے بنے ہوئے چند چوکور پنجروں اور کچھ دوسرے ضروری سامان کے علاوہ دو دیوار گیر الماریاں بھی تھیں۔ یہ بھی میری ضرورت کی کچھ چیزوں سے بھری ہوئی تھیں۔

میں نے ایک پنجرہ گھسیٹ کر تہ خانے کے وسط میں رکھا اور چابک جھٹکتے ہوئے مدن کو حکم دیا۔ "اسی طرح چاروں ہاتھوں پیروں کے بل رینگتے ہوئے اس میں داخل ہو جاؤ۔"

"نہیں.... نہیں......" وہ دہشت سے پھٹی پھٹی آواز میں چلا اٹھا۔ "تم کرنا کیا چاہتے ہو؟ مجھے پنجرے میں بند کر کے سمندر میں پھنکواؤ گے؟"

"نہیں میری جان! تمہیں ہلاک کرنا ہوتا تو میں اسی تاریک گلی میں تمہاری گردن توڑ گیا ہوتا' تمہارے سینے میں گولی اتار کر آ جاتا' تمہیں لفٹ دے کر یہاں تک نہ لاتا۔" میں نے جواب دیا۔ "موت تو تمہارے گناہوں کی سزا نہیں' وہ تو تم پر ایک احسان عظیم ہوگا اور میں فی الحال تم پر احسان عظیم کرنے کے موڈ میں قطعاً نہیں ہوں۔ تمہیں زندگی سے بڑا پیار ہے ناں.....؟ میں تمہیں زندہ رکھوں گا.....بے فکر رہو......چلو پنجرے میں چلو......"

وہ پھر ہچکچایا' پسینہ اس کے چہرے سے فرش پر ٹپک رہا تھا۔ میں نے اس کی پیٹھ پر چابک رسید کیا' وہ تڑپا لیکن پنجرے کا رخ اس نے اب بھی نہیں کیا۔ کسی بے ہنگم چوپائے کی طرح ادھر ادھر دوڑنے لگا۔ بوکھلاہٹ میں وہ میرے قریب سے بھی گزرا۔ میں نے اس کے منہ پر ٹھوکر رسید کرنا چاہی لیکن وہ اس کی کنپٹی پر پڑ گئی' وہ دونوں بازو پھیلا کر ہوا میں اچھلا' پھر اوندھے منہ گر کر ساکت ہو گیا۔

چوہے بلی کا کھیل اتنی جلدی ختم ہو جانے پر مجھے افسوس بھی ہوا' تاہم اب چونکہ اس کے جلد ہوش میں آنے کا کوئی امکان نہیں تھا' اس لیے میں نے الماری سے ڈوری اور ٹیپ نکالی' اس کے ہاتھ پشت پر باندھے' ہونٹوں پر چوڑی ٹیپ چپکائی اور اسے تقریباً دوہرا کرتے ہوئے چوکور پنجرے میں داخل کیا اور اس کا سلاخوں والا دروازہ بند کر دیا۔

یہ پنجرہ اٹھا کر میں نے لکڑی کی ایک پیٹی میں رکھا جس میں وہ بالکل فٹ آتا تھا۔ پیٹی

میں ہوا کی آمد و رفت کے لیے ننھے ننھے سوراخ موجود تھے۔ پیٹی کو تالا لگانے کے بعد میں نے اسے ہینڈل سے گھسیٹ کر سیڑھیوں کے قریب رکھا۔ الوداعی نظر تہ خانے پر ڈالی اور اپنا چابک لپیٹ کر کوٹ کی جیب میں پھنساتے ہوئے ہاتھ جھاڑ کر واپس اوپر ڈرائنگ روم میں آ گیا۔

چابک الماری میں رکھ کر میں فون کے قریب آ بیٹھا اور چھنا کے گھر کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ دوسری طرف ریسیور چھنا نے ہی اٹھایا۔

"لیس باس......" میری آواز سنتے ہی اس نے پر اشتیاق لہجے میں کہا۔

"ایک پارسل میرے ہاں تیار پڑا ہے۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "اسے پیلس کے تہ خانے میں پہنچانا ہے۔"

"ابھی......؟" اس نے پوچھا۔

"فوری طور پر تو نہیں۔" میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ "بہرحال آج رات کسی بھی وقت پہنچ جانا چاہیے۔ میں تو اب کھانا کھا کر سو جاؤں گا' تم کسی بھی وقت آ کر لے جانا۔ کرمو دروازہ کھول دے گا اور ڈلیوری روم میں جانے کا طریقہ تو تمہیں معلوم ہی ہے۔"

"آپ فکر نہ کریں باس۔" چھنا نے دھیمی آواز میں کہا۔ "اطمینان سے سو جائیں اور سمجھ لیں پارسل پیلس پہنچ گیا۔" میں نے فون بند کر دیا۔

دوسرے دن میں شام کو آفس سے فارغ ہو کر مالتی مندر پہنچا اور سیدھا پیلس کے تہ خانے میں چلا گیا۔ وہ پیٹی ایک طرف کونے میں رکھی تھی جس میں کل میں نے مدن موہن کو بند کیا تھا۔ میں نے پیٹی کا تالا کھولا اور لوہے کا پنجرہ کھینچ کر نکال لیا۔ مدن موہن کسی خوفزدہ لنگور کی طرح دونوں ہاتھوں سے سلاخیں مضبوطی سے پکڑے پنجرے میں اکڑوں بیٹھا تھا۔

اکڑوں بیٹھنے کے علاوہ اس پنجرے میں وہ صرف یہ کر سکتا تھا کہ چوپایوں کی طرح چاروں ہاتھوں پیروں کے بل کھڑا ہو جاتا۔ پنجرے کا سائز ایسا نہیں تھا کہ کوئی آرام دہ پوزیشن اختیار کر سکتا۔ اس کی آنکھیں گویا مستقل طور پر پھیل کر رہ گئی تھیں۔ چہرے پر وحشت تھی' ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ اس کا سوٹ کئی جگہ سے مسک چکا تھا۔ ٹائی ڈھیلی ہو کر مردہ کتے کی دم کی طرح لٹکی ہوئی تھی' بکھرے بالوں نے پیشانی ڈھانپ رکھی تھی۔

ایک ہی رات میں وہ کسی تباہ حال سیارے کی مخلوق بن کر رہ گیا تھا۔ اس مدن موہن کا تو جیسے کہیں نام و نشان نہیں رہا تھا جسے میں جانتا تھا۔ کئی لمحے تک تو وہ ایک ٹک مجھے دیکھتا رہا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر یکلخت ہی اس نے غالباً غیر ارادی طور پر اچھل کر کھڑا ہونے کی کوشش کی لیکن ٹھک سے اس کا سر پنجرے کی سلاخوں سے ٹکرایا

اور وہ کراہ کر پہلے ہی کی طرح آرام سے بیٹھ گیا۔

جب وہ بولا تو اس کی آواز میں برسوں کے مریض سے زیادہ نقاہت تھی۔ "پانی....دو گھونٹ پانی...پلا دو....."

"مجھے معلوم تھا تم سب سے پہلے پانی مانگو گے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیکن درحقیقت تمہیں سنبھلنے کے لیے کسی اور چیز کی ضرورت ہے۔" میں نے جیب سے برانڈی کی ایک چھوٹی اور ایک چپٹی بوتل نکالی۔ "دیکھو میں تمہارے لیے انگلینڈ کی سب سے عمدہ برانڈی لایا ہوں لیکن پلاؤں گا تمہیں قطرہ قطرہ کرکے....منہ کھولو۔"

اس نے بے تابانہ انداز میں نہ صرف منہ کھولا بلکہ زبان بھی ہانپتے ہوئے کتے کی طرح باہر نکال لی۔ میں نے نہایت احتیاط سے بے رنگ سیال کا ایک قطرہ شیشی کے تنگ دہانے سے اس کی زبان پر ٹپکایا اور وہ بری طرح چیخ کر ایک بار پھر اچھلا اور اس کا سر ایک بار پھر ٹھک کی آواز کے ساتھ پنجرے کی سلاخوں سے ٹکرایا' وہ دوبارہ نہیں اچھلا لیکن تنگ سوراخ میں پھنسے ہوئے چوہے کی طرح اذیت سے تڑپنے لگا۔ اس کے حلق سے عجیب سی چیخیں نکل رہی تھیں۔ کبھی وہ سانپ کی طرح زبان کو باہر نکالتا تھا اور کبھی اندر کر لیتا تھا۔ زبان پر جہاں میں نے قطرہ ٹپکایا تھا وہاں ایک ننھا سا قدرے گہرا داغ پڑ گیا تھا۔

میں نے اطمینان سے شیشی کو ڈھکنا لگایا اور احتیاط سے تہہ خانے کی ایک الماری میں رکھ دیا۔ میں واپس پنجرے کے قریب آیا' مدن موہن اب ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑے سلاخوں سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ گردن بھی ایک طرف کو ڈھلک سی گئی تھی' زبان اب اس نے باہر ہی کو لٹکا لی تھی۔

"کیسی لگی برانڈی مدن موہن؟" میں نے ملائمت سے پوچھا۔ "یہ پوری شیشی میں قطرہ قطرہ کرکے تمہیں استعمال کراؤں گا پیارے! تمہارے لیے یہ بڑا عمدہ ٹانک ثابت ہوگا۔ ایک دم میں تمہیں ساری شیشی استعمال نہیں کرنے دوں گا کیونکہ اس طرح بس تم ایک ہی دن اس کی لذت سے محظوظ ہو سکو گے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم ایک طویل عرصے تک اسی کی لذت سے محظوظ ہوتے رہو۔"

مدن موہن ہانپتا رہا اور یوں میری طرف دیکھتا رہا جیسے میری بات سن ہی نہیں رہا تھا' پھر جیسے بمشکل اس کے حلق سے آواز نکلی۔ "یہ.....یہ تیزاب تھا ناں؟" اس کی زبان جیسے کچھ تتلا گئی تھی۔

"ہاں....گندھک کا تیزاب نہایت طاقتور تیزاب۔" میں نے جواب دیا۔ "تمہیں معلوم ہی ہے کہ گندھک انسانی جسم کے لیے خاصا غیر ضروری عنصر ہے۔"

"منصور.....!" وہ بدستور ہانپتے ہوئے بولا۔ "اگر تمہیں مجھ سے میری زیادتیوں کا انتقام ہی لینا ہے تو مجھے گولی مار دو' مجھے ہلاک کر دو۔"

"حیرت ہے۔" میں نے کہا۔ "کل تک تو تم موت سے بڑے خوفزدہ تھے۔ آج موت کی فرمائش کر رہے ہو۔"

"مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ تم مجھے بہت زیادہ اذیتیں دے دے کر.....سسکا سسکا کر مارنا چاہتے ہو۔" وہ بدستور توتلی سی زبان میں بولا۔ "اور اس سے یکدم مرجانا بہتر ہے۔"

"اگر تمہیں اتنا اندازہ ہو گیا ہے کہ میں تمہیں بہت زیادہ اذیتیں دے کر اور سسکا سسکا کر مارنا چاہتا ہوں تو تمہیں یہ بھی اندازہ ہو جانا چاہیے تھا کہ میں ارادے کا بہت پکا ہوں اور تمہیں یہ اندازہ بھی لازماً ہو جانا چاہیے تھا کہ میں کوئی ایسا کام نہیں کر سکتا جو تمہارے خیال میں تمہارے لیے بہتر ہو۔" میں نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ "ویسے میں تمہیں ایک بات کا یقین دلا دوں کہ میں تمہیں جان سے کبھی نہیں ماروں گا' تم خود ہی مرگئے تو بات دوسری ہے لیکن تمہیں....ہلاک کرنا بہرحال میرا مطمع نظر نہیں ہے۔ فی الحال تو اس سبق کا صرف اولین مرحلہ شروع ہوا ہے جو میں نے تمہارے لیے تجویز کیا ہے۔ اس مرحلے میں تم صرف اس امر سے آگاہ ہو سکو گے کہ تیزاب سے جسم کا کوئی حصہ جلنے کی اذیت کیا ہوتی ہے اور احساس بے بسی کسے کہتے ہیں۔ تمہاری زبان پر صرف ایک قطرہ پڑا تو تم نے کیبرے ڈانسر کی طرح پھڑکنا شروع کر دیا۔ تمہیں کچھ اندازہ ہوا کہ ماہتاب کے پورے چہرے پر جب تیزاب پھینکا گیا ہوگا تو اس پر کیا گزری ہوگی؟ رفتہ رفتہ وہ مرحلہ آئے گا جب تم اس امر سے آگاہ ہو سکو گے کہ آج کل ماہتاب جب آئینہ دیکھتی ہوگی تو اس کے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔ رفتہ رفتہ تم ان تمام محسوسات سے آشنا ہو جاؤ گے جن سے تمہاری بدولت میں' ماہتاب اور نہ جانے کتنے دوسرے انسان گزر چکے ہوں گے..... اچھا اب میں چلتا ہوں.....آج کا سبق بس اتنا ہی تھا۔"

میں ایڑیوں کے بل گھوما اور تہہ خانے کے دروازے کی طرف چل دیا۔ مدن موہن بری طرح چلانے لگا۔ اس کی آواز پھٹی پھٹی سی تھی اور وہ پنجرے میں اچھلنے کودنے کی کوشش کر رہا تھا مگر یہ سلاخوں سے سر پھوڑنے والی بات تھی۔

"کیا بات ہے؟" میں نے مڑ کر اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"کیا میں.....یہاں.....یونہی بھوکا پیاسا مر جاؤں گا؟" اس نے ہانپتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں.....میں بتا تو چکا ہوں کہ تمہیں مارنا میرا مقصد نہیں ہے' اب کتنی مرتبہ پوچھو گے؟" میں نے بیزاری سے کہا۔

"تو پھر مجھے تھوڑا سا پانی پلا دو نا......؟" اس کے لہجے میں ان گنت التجائیں سمٹ آئی تھیں۔

"اچھا....ایسا کرو۔" میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "تم مجھے اس ایس ایچ او کا نام اور حلیہ وغیرہ بتاؤ جس نے ماہتاب کی ای کے قتل کا کیس بگاڑ کر عدالت میں پیش کیا تھا' یقینی

بات ہے' وہ تمہارا گہرا دوست رہا ہوگا۔"

"وہ اب ترقی پا کر ڈی ایس پی ہو گیا ہے۔" مدن نے بلا تامل کہا۔ "نرمل داس نام ہے اس کا.....اب وہ ماہتاب کے علاقے کے تھانے میں نہیں ہوتا' کوتوالی میں بیٹھتا ہے۔ بھاری بھرکم آدمی ہے۔ اس کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ اس کی ناک کی نوک پر موٹا مسہ ہے اور.....ویسے بھی وہ خاصا معروف آدمی ہے.....ذرا سا اتا پتا کرو گے تو تمہیں معلوم ہو جائے گا۔"

مدن موہن کے لہجے سے میں بخوبی اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہا تھا اور وہ دل سے چاہتا تھا کہ میں نرمل داس پر ہاتھ ڈالوں۔ اس کے خیال میں ایک ڈی ایس پی پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش میں میرے اپنے رگڑے جانے کے کافی امکانات تھے۔ سردست میں اس کی اس سوچ پر صرف مسکرا ہی سکتا تھا۔

تیسرا آدمی جس نے ماہتاب کی بربادی میں اہم کردار ادا کیا تھا' اس کی گلی ہی کا پراپرٹی ڈیلر تھا لیکن ماہتاب کی گفتگو سے مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ مدن موہن کا ساتھی نہیں تھا۔ اس نے صرف انتہاء درجے کے ایک مکار اور کمینے دلال کی طرح موقع سے فائدہ اٹھایا تھا۔ ایک مجبور لڑکی کی آخری پونجی لوٹی تھی' بہرحال سزا کا مستحق وہ بھی تھا..... تاہم فی الحال مجھے اس کی فکر نہیں تھی۔

"مدن! مجھے اس آدمی کا نام و پتہ چاہیے جس نے ماہتاب کے چہرے پر تیزاب پھینکا تھا۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

اس بار وہ کچھ ہچکچایا لیکن اس کے اندر کوئی ایسی روح نہیں تھی جو زیادہ مزاحمت کر سکتی' اس لیے جلد ہی ازخود بول اٹھا۔ "اس کا نام وشنو ہے' پونا کے چاندنی چوک کے قریب ہی ایک چھوٹی سی بار ہے.....چارلیز.....پاس پڑوس میں۔ چارلی کا شراب خانہ کے نام سے مشہور ہے.....وشنو ہر شام وہاں ہوتا ہے.....کاؤنٹر پر کوئی بھی موجود ہو' تم اس سے پوچھ سکتے ہو۔"

"نہیں.....مجھے اس کا حلیہ اچھی طرح بتاؤ تاکہ مجھے کسی سے پوچھنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔" میں نے کہا۔

"وہ تقریباً پینتیس کی عمر کا دبلا پتلا طویل القامت شخص ہے.....رنگت گہری سانولی ہے' چہرہ لمبوترا ہے.....آنکھیں اکثر سرخ رہتی ہیں۔ اس کی ایک خاص عادت یہ ہے کہ سگریٹ کا گل ایک انگلی سے جھاڑتا رہتا ہے۔" مدن خاموش ہو گیا۔

میں نے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا اور ساتھ ہی اس کے منہ پر تھوک دیا۔ نہ جانے کیوں مجھے اس کا چہرہ انسان کا نہیں کسی غلیظ حیوان کا دکھائی دیتا تھا۔ اس کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہ آئی' بس ساکت بیٹھا ایک ٹک میری طرف دیکھتا رہا۔ میں واپسی کے لیے مڑ

گیا۔

"کیا اب بھی پانی نہیں پلاؤ گے.....؟" اس نے کمزور سی آواز میں عقب سے پکارا۔ "تم نے جو کچھ پوچھا' وہ میں نے تمہیں بتا دیا۔"

"پانی خدا کی ایک نعمت ہے۔" میں نے مڑ کر دیکھے بغیر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "اور میرے خیال میں اس نعمت پر تم جیسے ظالموں' فرعونوں اور بے رحموں کا اتنا حق نہیں ہونا چاہیے کہ جب چاہو یوں تمہیں مل جائے۔"

اس کی بڑبڑاہٹ اس وقت بھی جاری تھی جب میں دروازہ کھول کر باہر آگیا۔ دروازہ بند کرتے ہی اس کی آواز اور میری سماعت کا ناطہ ٹوٹ گیا۔

جزیرے سے جب میں واپس بمبئی پہنچا تو میرے ذہن میں ان گنت خیالات ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ وشنو کو تلاش کرنے سے پہلے شیکھر سے مل لیا جائے۔

نہایت کم رفتار سے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے میں آنند نگر پہنچا۔ یہ چھوٹے چھوٹے مکانات اور فلیٹوں پر مشتمل ایک دور افتادہ بستی تھی اور نچلا متوسط طبقہ یہاں آباد تھا۔ یہاں کئی گلیاں ایسی بھی تھیں جن سے میری رولز رائس گزری تو لڑکے بالے ہی نہیں' اچھے بھلے سیانے بھی رک کر دیکھنے لگے۔

گلیوں ہی گلیوں میں چند منٹ کی ڈرائیو کے بعد میں قدرے کشادہ سڑک پر پہنچا' پھر ایک جگہ ایک ریستوران کے سامنے میں نے گاڑی روک دی۔ اس علاقے کی مناسبت سے یہ ایک خاصا عمدہ قسم کا ریستوران تھا۔ اس کا دروازہ شیشے کا تھا' بورڈ انگریزی میں لکھا ہوا تھا۔



مجھے وہ وقت یاد آیا جب یہ ریستوران بہت بری حالت میں تھا- یہاں کوئی گاہک نظر نہیں آتا تھا' صرف مکھیاں بھنکتی تھیں- اس وقت کا تصور کرتے ہوئے محاورتاً نہیں حقیقتاً کہا جا سکتا تھا کہ اب تو کایا ہی پلٹ چکی تھی- باہر لوگوں کو سرد کرنے والا ایک بیرا کچھ دیر تو دور سے میری طرف دیکھتا رہا' شاید وہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ کیا میں بھی اس ریستوران کا گاہک ہو سکتا ہوں؟ پھر وہ جھجکتے ہوئے انداز میں سڑک پار کرکے میری طرف بڑھا-

"کیا کھانا پینا پسند فرمائیں گے سرکار؟" بیرے نے قریب آکر کھڑکی پر جھکتے ہوئے پوچھا-

"کچھ نہیں-" میں نے ملائمت سے کہا- "ذرا اپنے صاحب کو بھیج دو-"

کچھ دیر بعد ریستوران سے ایک ادھیڑ عمر شخص برآمد ہوا- اس کے لمبے لمبے بال جن میں سفیدی غالب تھی' نہایت سلیقے سے سنورے ہوئے تھے- اس کا جسم زوال کی طرف مائل تھا لیکن چوڑا چکلا ڈھانچہ خصوصاً کندھوں کی ساخت اور آدھی آستین کی شرٹ سے جھانکتے ہوئے بازوؤں کی ڈھلکتی ہوئی مچھلیاں بتاتی تھیں کہ یہ عمارت کبھی بہت شاندار تھی-

اس نے سڑک پار کرتے ہی مجھے دیکھ لیا اور مستعدانہ انداز میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا میری طرف بڑھا- گزرے ہوئے برسوں نے اس کی شخصیت پر بردباری کے خواہ کتنے ہی نقش چھوڑ دیئے تھے' پھر بھی اس کی حالت اس وقت سے کہیں بہتر تھی جب میں نے آخری بار اسے دیکھا تھا.....اور یہ کوئی پرانی بات نہیں تھی-

وہ قریب آیا تو میں نے دیکھا کہ وہ حسب معمول ربر سول کے جوتے پہنے ہوئے تھا مگر فرق یہ تھا کہ اب اس کے جوتے نئے اور چمکیلے تھے- میں اس کے استقبال کو گاڑی سے اتر آیا- وہ لپکتے ہوئے بولا' آپ بیٹھے رہیے مالک.....میں وہیں آپ کے چرن چھو لوں گا....."

وہ میرے پیروں کی طرف جھکنے لگا-

"خدا کے لیے...." میں نے گھبرائے ہوئے سے انداز میں اسے بازو سے پکڑ کر فوراً سیدھا کرتے ہوئے کہا- "یہ تکلفات رہنے دو- یہ چرن ورن چھونے والی حرکت میرے

ساتھ مت کیا کرو- مجھ سے برابری کی سطح پر آکر ملا کرو-"

"یہ تکلفات نہیں سرکار!" وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا- "میری آتما کی پکار ہے.....اور میں بھلا آپ کے برابر کیسے آسکتا ہوں....میں گندی نالی کا کیڑا ہوں اور آپ اوتار ہیں....دیوتا ہیں...."

"اور دیکھو-" میں نے اس کی بات کاٹ دی- "مجھ سے ان ہندی اصطلاحوں کے ساتھ بھی بات مت کیا کرو- مجھے یوں معلوم ہونے لگتا ہے جیسے کوئی پجاری مندر میں اشلوک پڑھ رہا ہے- ویسے بھی تمہیں تو اچھی بھلی اردو آتی ہے-"

"کیوں نہیں سرکار!" وہ شرمیلے سے انداز میں ہنسا- "اردو ہی نہیں آپ کی دعا سے انگریزی' فرانسیسی' پنجابی' جرمن اور پرتگیزی بھی آتی ہے-"

"بلکہ تمہیں انسانوں کی زبانوں کے علاوہ جنگل کے تمام چرند' پرند اور درندوں کی زبانیں بھی آتی ہیں-" میں نے اس کا کندھا تھپک کر مسکراتے ہوئے کہا-

"بس جی....سب اوپر والے کا کرم ہے-" وہ انکساری سے بولا-

"آؤ....گاڑی میں بیٹھ جاؤ-" میں نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا- "اسی میں بیٹھ کر باتیں کریں گے-"

وہ گویا میرے برابر بیٹھنے کو گستاخی سمجھتے ہوئے ہچکچا رہا تھا لیکن میں نے اسے سیٹ پر دھکیل دیا اور گھوم کر دوسری طرف سے اس کے برابر آبیٹھا-

"کچھ پئیں گے نہیں؟" اس نے پوچھا- "کھانے کے لیے تو آپ کے شایان شان کوئی چیز نہیں ہے' اس لیے میں نے نہیں پوچھ رہا-"

"ارے نہیں....سب ٹھیک ہے-" میں نے لاپروائی سے کہا- "کھانے کا ویسے بھی وقت نہیں ہے ورنہ جو بھی کاٹھ کباڑ تمہارے ہاں میسر ہوتا' کھا لیتا- تم صرف پینے کے لیے دو فریش جوس منگوا لو....ویسے ریسٹورنٹ کو تم نے بڑا ٹھاٹ دار بنا لیا- میں تو پہچان ہی نہیں پایا تھا-"

"بس جی....اچھی نیت سے شروع کیا تھا- شاید اس لیے اوپر والے نے نظرکرم کر دی ورنہ لوگوں کا خیال یہی تھا کہ جس طرح پہلے والا مالک مکھیاں مارتا تھا' اسی طرح میں بھی مار کے رخصت ہو جاؤں گا- بس دو جوان بھانجیوں کی شادی کی نیت کی تھی' وہ بھگوان نے پوری کر دی- انھیں بیاہ دیا ہے- اب اپن کو کوئی فکر نہیں- اپنی تو نہ بیوی ہے' نہ بچہ.....نہ فکر نہ فاقہ- اب تو صرف شغل کے طور پر اسے چلا رہا ہوں- شغل ہی شغل میں پھیلتا جا رہا ہے....."

دفعتاً وہ میری طرف دیکھتے ہوئے شرمیلے بچے کی طرح جھینپے جھینپے سے انداز میں مسکرایا اور سر جھکا کر بولا ....."میں تو یونہی بکواس کیے جا رہا ہوں جیسے مجھ میں کوئی سرخاب

کا پر لگا ہوا تھا جو قسمت مجھ پر مہربان ہو رہی تھی حالانکہ آپ کا اشارہ نہ ہوتا..... آپ نے میرے سر پر ہاتھ نہ رکھا ہوتا تو قسمت بھی مجھے میرے پیروں پر کھڑا نہیں کر سکتی تھی..... میں راکٹ کھائے اسی نالی میں اوندھا پڑا رہتا جہاں سے آپ نے مجھے اٹھایا تھا۔"

اس کا لہجہ یوں مدھم ہو گیا جیسے اس کا تصور اسے ناگوار ماضی کے خارزار میں کھینچ لے گیا ہو۔ میں بھی ان باتوں کو تقریباً بھول ہی گیا تھا مگر اس نے ذکر چھیڑا تو جیسے ایک بھولی بسری سی کہانی ذہن میں ابھر آئی۔

ان دنوں میں نے نیا نیا ہی کاروبار کی دنیا میں قدم رکھا تھا اور میرے پاس وہی **جیکونر** ہوا کرتی تھی جو میں نے وکرم اور اس کے ساتھیوں کو ٹھکانے لگانے کے بعد قبضے میں کر لی تھی۔ ایک روز میں شارٹ کٹ سے چلنے کی غرض سے ایک میدان کی طرف نکلا جہاں کچھ عرصے سے کوئی معروف قسم کا بہت بڑا سرکس لگا ہوا تھا۔ میں میدان سے کترا کر نکلنے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن یہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا کہ سرکس وہاں سے رخصت ہو چکا تھا اور بے پناہ طویل و عریض میدان میں صرف اس کے پڑاؤ کے آثار باقی رہ گئے تھے۔

میدان کے گرد نیم دائرے میں گھوم کر میں جیسے ہی دائیں طرف مڑا تو پسماندہ سی بستی کی اس گلی میں دائیں طرف ہی ایک مکان کی دیوار کے قریب کوئی شخص یوں اوندھا پڑا دکھائی دیا کہ اس کا سر اور ایک ہاتھ نالی میں تھا۔ دونوں ٹانگیں پھیلی ہوئی تھیں جن پر ایک بوسیدہ سی میلی کچیلی خاکی پتلون منڈھی ہوئی تھی۔ پیروں میں ربر سول کے شکستہ سے جوتے تھے اور ربر سول میں دو سوراخ تھے۔ بادی النظر میں یہ دونوں سوراخ کسی لاوارث لاش کی آنکھوں کی طرح رحم طلب انداز میں پھیلے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

گلی سے میں نے دو آدمیوں کو گزرتے بھی دیکھا لیکن کسی نے نالی میں اوندھے پڑے ہوئے اس شخص کے قریب رکنے بلکہ صحیح طور پر اس کی طرف دیکھنے تک کی زحمت نہیں کی۔ میں بھی گاڑی تیزی سے آگے لے گیا لیکن اگلے موڑ پر پہنچنے سے پہلے ہی نہ جانے کیوں میرا پاؤں خودبخود بریک پر پہنچ گیا۔ کوئی چیز جیسے یکلخت ہی میرے لاشعور میں خنجر کی طرح پیوست ہو کر رہ گئی تھی۔

دراصل مجھے یاد آ گیا تھا کہ کبھی میں بھی اسی طرح بے ہوش ہو کر بمبئی کی کسی گلی میں گر پڑا تھا۔ آٹھ ڈاکو میرے تعاقب میں تھے اور میں بالکل تنہا اور بے یار و مددگار تھا۔ میری کلائی بری طرح زخمی تھی۔ تب مجھے بھی کوئی بصد دقت گھسیٹ کر اپنے گھر لے گیا تھا اور اپنی آخری پونجی اس نے میری مرہم پٹی کرانے کے لیے ڈاکٹر کی نذر کر دی تھی۔

میں اب سوچ رہا تھا کہ اگر اس رات طبلہ مجھے نہ اٹھاتا اور اپنی کھولی میں نہ لے گیا ہوتا تو آج میں کہاں ہوتا؟ میرا ذہن مجھے اس سوال کا کوئی واضح جواب نہ دے سکا' تاہم مجھے جھرجھری سی ضرور آ گئی۔ میری جلد کے نیچے جیسے بیسیوں سنپولیے سرسرانے لگے۔

ے ہاتھ میں اگر صرف ایک
بالکل مشینی انداز میں' میں نے گاڑی ریورس کی اور واپس وہیں ،
اوندھا پڑا تھا۔ گاڑی سے اتر کر میں نے اسے سیدھا کیا۔ اس کا چہرہ اور اید میرے دم بھی نہیں
پانی اور مٹی میں لتھڑا ہوا تھا لیکن یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ وہ مکمل طور پر بے ہوش ہو
نہیں تھا۔ سیدھا ہوتے ہی اس نے آنکھیں کھول کر مسکرانے کی کوشش کی' اس کی آنکھیں چڑھی چڑھی اور انگاروں کی طرح سرخ تھیں۔

اس کی باچھوں سے کف بھی بہہ رہا تھا جو غلیظ پانی میں مدغم ہو رہا تھا۔

"تم.....نے.....دریا سے کیوں .....نکالا......" وہ تقریباً ناقابل فہم سی آواز میں منمنایا۔

"مجھے مرجانے .....دیتے.....بزدل کہیں کے......تم کسی کو مرتے بھی..... نہیں.....دیکھ سکتے۔"

اب مجھے معلوم ہوا کہ موصوف کوئی زبردست قسم کا نشہ کیے ہوئے تھے اور نالی کو دریا سمجھ کر ڈوبنے کی کوشش فرما رہے تھے۔ پہلے تو میں نے ارادہ کیا کہ اسے وہیں چھوڑ کر گاڑی میں بیٹھوں اور اپنا رستہ لوں لیکن اس شخص کے خدوخال اور چہرے پر جو بردباری رقم تھی' اس کی تہہ میں سے مجھے ایک شاندار انسان اور اس کا روشن ماضی جھلکتا نظر آ رہا تھا۔ دوسرے اس نے اس مدہوشی کے عالم میں بھی جس لہجے میں مرنے کی حسرت کا اظہار کیا تھا' اس سے میرے دل میں بھی خراش سی آ گئی تھی۔ میرا دل جو بلاشبہ آتش فشاں تھا مگر جس پر میں نے غیر جذباتیت کی برفانی تہیں جما رکھی تھیں۔

اس شخص کے ہاتھ پیروں پر رعشہ سا طاری تھا اور وقفے وقفے سے اس کے حلق سے ہلکی ہلکی اور بے معنی سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ نہ جانے کیوں میں اسے چھوڑ کر نہیں جا سکا۔ میں نے اسے اٹھا کر گاڑی میں ڈالا اور گھر لے آیا۔

نوکر کو میں نے ہدایت کی کہ جس حد تک ممکن ہو اس شخص کا حلیہ درست کر کے میرے کپڑوں میں سے کوئی جوڑا پہنا کر اسے گیسٹ روم میں لٹا دیا جائے اور اگر وہ کچھ کھا سکے تو اسے کھلا بھی دیا جائے کیونکہ اس کا پیٹ مجھے کمر سے لگا ہوا نظر آ رہا تھا۔

دوسری صبح جب میں گیسٹ روم میں اسے دیکھنے گیا تو وہ بالکل ہی بدلا ہوا انسان نظر آیا۔ غالباً آج وہ نہایا تھا اور اس نے شیو بھی بنایا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے جسم پر میرا
ایک پرانا لیکن صاف ستھرا اور بیش قیمت سلیپنگ سوٹ تھا۔ اس لیے پچ رہ جاتی ہے وہ لڑکی
نکھرا نکھرا سا نظر آ رہا تھا۔ کل اور آج کے مختصر سے و... در موم کے آمیزے سے تخلیق کیا
مر دی گئی تھی۔"
میں زمین آسمان کا فرق پڑ چکا تھا اور قدرے حیرت کی با کا ہاتھ بجلی کے ننگے تار پر پڑ گیا ہو۔ پھر
ایک کاغذ پر کچھ لکھ رہا تھا۔
مجھے کمرے میں آتے دیکھ کر اس نے کاغذ تہہ طرف دیکھا جیسے اپنا مطلب مجھے سمجھا نہ سکنے
اٹھ کھڑا ہوا جیسے رخصت طلب کرنے کے لیے میرا
"بیٹھ جاؤ.....ابھی تم کہیں نہیں جا رہے.....نام کیا صاحب۔" چند لمحے بعد اس نے ماتمی سے لہجے

کا پر لگا ہوا تھا جو قسم۔ اس نے بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔ لہجہ ہر تاثر سے عاری تھا۔
میرے سر پر ہاتھ ھو! یہ تم ابھی کاغذ پر کیا لکھ رہے تھے؟" میں نے بھی ایک کرسی پر بیٹھتے
تھی... مہ پوچھا۔

"وہ لوگ جنہیں مرگی کے دورے پڑتے ہیں یا جو اس قسم کے نشے کرتے ہیں کہ چلتے چلتے گر پڑتے ہیں' اپنی جیب میں عموماً اس قسم کا رقعہ لکھ کر رکھتے ہیں کہ کوئی صاحب اگر انہیں کہیں پڑا ہوا پائیں تو فلاں ایڈریس پر پہنچا دیں....." اس نے روانی سے کہا۔

"اچھا۔" میں نے سرہلایا۔ "تو اس قسم کا رقعہ لکھنے کا تمہیں بھی خیال آگیا۔"

"نہیں۔" اس نے جلدی سے نفی میں گردن ہلائی۔ "میں تو یہ لکھ رہا تھا کہ جو شخص مجھے جہاں کہیں بھی پڑا پائے' وہیں پڑا رہنے دے' کہیں لے جانے کی زحمت نہ کرے اور اپنے کام سے کام رکھے۔"

"زندگی سے بہت بیزار ہو؟" میں نے اسے گھورا۔

"زندگی.....؟" دفعتاً" اس نے عجیب سے انداز میں قہقہہ لگایا جیسے کسی کھنڈر میں کوئی بدروح کھلکھلا اٹھی ہو۔ ساتھ ہی اسے کھانسی آگئی۔ اس کے **پھیپھڑے** بہت کمزور معلوم ہوتے تھے یا پھر ان پر کسی بیماری اور حالات کی ناہمواریوں کا اثر تھا۔

"خدا کے لیے اب کوئی فلمی قسم کا **ڈائیلاگ** نہ بولنا۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "سیدھی طرح بتاؤ تمہیں تکلیف کیا ہے بلکہ مجھے اپنے متعلق سب کچھ ہی بتا ڈالو۔ تمہارے سینے پر بہت بوجھ معلوم ہوتا ہے۔"

پہلی بار اس کی آنکھوں میں دلچسپی کی چمک پیدا ہوئی۔ "اس نوجوانی میں ہی بڑی مردم شناس نظر پائی ہے آپ نے۔" اس کے خشک ہونٹوں پر مسکراہٹ کی رمق نمودار ہوئی۔ "لیکن کیا آپ کے پاس اتنا وقت ہے؟ آپ بڑے آدمی معلوم ہوتے ہیں اور بڑے آدمیوں کا وقت بڑا قیمتی ہوتا ہے۔ چھوٹے آدمیوں کی زندگی سے بھی زیادہ قیمتی۔"

"زیادہ فلسفہ بگھارنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے ہاتھ اٹھ کر کہا۔ "اور میں اس قسم
ب کا بڑا آدمی نہیں ہوں جس قسم کا تم سمجھ رہے ہو۔ تمہید اور ادھر ادھر کی باتوں کو چھوڑو'
دراصل مجھے یاد آگیا ایا' وہ بتاؤ......سب سے پہلے میں یہ جاننا چاہوں گا کہ تم کرتے کیا ہو یا
گر پڑا تھا۔ آٹھ ڈاکو میرے تعاقب یہ
میری کلائی بری طرح زخمی تھی۔ تب مجھے تا جا رہا ہے۔ فرض کیجئے میں کچھ بھی بتانا پسند نہ کروں
اور اپنی آخری پونجی اس نے میری مرہم پٹی
میں اب سوچ رہا تھا کہ اگر اس رات طب۔" میں نے پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھتے ہوئے
ہوتا تو آج میں کہاں ہوتا؟ میرا ذہن مجھے اس مرنے کی کوشش کر رہے ہو' عین ممکن ہے کہ میں
مجھے جھرجھری سی ضرور آگئی۔ میری جلد کے نت ہی زندگی کا قرض تمہارے سر سے اتار دوں۔"

"آپ کو شاید یہ سن کر حیرت ہو..." وہ مسکرایا۔ "کہ میرے ہاتھ میں اگر صرف ایک ہنٹر دے دیا جائے تو شیر بھی میرے آگے دم ہلانے لگتا ہے۔"

"مگر تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں شیر نہیں ہوں اور اتفاق سے میرے دم بھی نہیں ہے جسے میں تمہارے آگے ہلا سکوں۔" میں نے خشک لہجے میں کہا۔ "اب شروع ہو جاؤ۔"

"اس کے کندھے گویا سکڑ گئے اور سر جھک گیا۔ چند لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے سر اٹھایا تو اس کی آنکھوں میں گویا صدیوں کی تھکن تھی۔

"میں ٹرینر ہوں۔" بالآخر اس نے مدھم سے لہجے میں کہا۔ "ہر طرح کے خطرناک جانوروں کو سدھاتا ہوں یا بقول آپ کے یوں کہنا چاہیے کہ سدھایا کرتا تھا کیونکہ اب میرا اس پیشے کو جاری رکھنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ جوانی میں بڑی آوارہ گردی کی' تقریباً ساری دنیا دیکھی لیکن پچھلے چند سال سے سپر سیون سرکس سے وابستہ ہو گیا تھا اور چند دن پہلے تک اس سے وابستہ تھا۔

"یہ وہی سرکس ہے ناں جو حال ہی میں بمبئی سے رخصت ہوا ہے اور جس کے اشتہارات اخباروں میں آیا کرتے تھے۔" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں۔" اس نے اثبات میں سرہلایا۔ "اور آپ کو شاید اس قسم کی تفریحات سے دلچسپی نہیں ورنہ بمبئی کی تقریباً ساری آبادی ہی یہ سرکس دیکھ چکی ہے۔ بڑی پٹاخہ قسم کی لڑکیاں کام کرتی ہیں اس میں۔ تارا بھی انہی میں سے ایک تھی....."

"اوہ...تو تم اب عشق کی المناک کہانی سناؤ گے؟" میں نے قدرے بیزاری سے کہا۔

"آپ نے تارا کو نہیں دیکھا۔" اس نے ایک طویل سانس لی۔ "ورنہ اس کے ذکر پر آپ اتنی حقارت کا اظہار نہ کرتے۔"

"خیر... تم اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے اپنی بات جاری رکھو۔" میں نے کہا۔

"وہ جمناسٹک کے کرتب دکھاتی ہے۔" **شیکھر** نے ایک لمحے کے توقف سے کہا۔

"یوں تو تقریباً ہر جمناسٹ کا جسم ہی بے حد سڈول ہوتا ہے مگر تارا کو تو قدرت نے عجیب ہی چیز بنا دیا ہے۔اسے دیکھ کر اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ جاتی ہے' وہ لڑکی نہیں صاحب....خوبصورتی کے سانچے میں ڈھلا ہوا ربڑ اور موم کے آمیزے سے تخلیق کیا گیا ایک عجوبہ تھا جس میں روح کی جگہ آسمانی بجلی بھر دی گئی تھی۔"

اس نے یوں جھرجھری سی لی جیسے واقعی اس کا ہاتھ بجلی کے ننگے تار پر پڑ گیا ہو۔ پھر اس نے عجیب رحم طلب سی نظروں سے میری طرف دیکھا جیسے اپنا مطلب مجھے سمجھا نہ سکنے پر معذرت خواہ ہو۔

"لڑکیاں تو سرکس میں بہت ہوتی ہیں صاحب۔" چند لمحے بعد اس نے ماتمی سے لہجے

میں گفتگو کا سلسلہ جوڑا۔ ”اکا دکا شادی شدہ بھی ہوتی ہیں۔ بعض نے شادی کے بغیر ہی نجی زندگی میں بھی کسی کو جوڑی دار بنا رکھا ہوتا ہے اور اکادکا ایسی بھی ہوتی ہیں جو اپنی مرضی سے بالکل تنہا اور خودمختار زندگی گزارتی ہیں۔ بہرحال سرکس کی دنیا میں ایک ضابطے کی بہت سختی سے پابندی ہوتی ہے جس پر آپ کے مہذب اور منظم معاشرے میں بیسیوں قوانین کی موجودگی میں بھی عمل نہیں ہوتا.....اور وہ یہ کہ لڑکی کی مرضی کے بغیر کوئی اسے چھو بھی نہیں سکتا۔ راتوں کو لڑکیاں کسی کنڈی تالے کے بغیر محض خیموں میں سوتی ہیں جن کے دروازے پر صرف پردہ جھول رہا ہوتا ہے مگر کیا مجال ہے کہ بلااجازت کوئی پردہ اٹھا کر اندر جھانک بھی لے۔ تارا بھی انہی لڑکیوں میں سے تھی جو سرکس کی دنیا میں صرف اور صرف کام سے غرض رکھتی ہیں۔ بڑے اسمارٹ، خوش شکل اور شہ زور نوجوانوں نے اس سے تعلق استوار کرنے کی کوشش کی مگر اس نے کسی کو منہ نہ لگایا.....اور پھر تین سال قبل وہ اچانک ہی مجھ پر مہربان ہو گئی.....“

آخری جملے کے ساتھ شیکھر نے یوں جھجکتے ہوئے میری طرف دیکھا جیسے اسے اندیشہ ہو کہ میں اس کی بات پر یقین نہیں کروں گا۔ میں بدستور ساکت بیٹھا اس کی طرف دیکھتا رہا۔

”شروع شروع میں مجھے خود بھی یقین نہیں آیا تھا کہ تارا مجھ پر مہربان ہو گئی ہے۔“ وہ گویا تازہ دم ہوتے ہوئے بولا۔ ”یہ تو بالکل ایسا ہی تھا جیسے آپ فاقہ کشی کی زندگی گزار رہے ہوں اور بیٹھے بٹھائے اچانک ہی کوئی آپ کی جھولی میں ہفت اقلیم کی دولت ڈال دے۔ وہ عمر میں مجھ سے کم از کم بیس برس چھوٹی تھی اور سرکس کا ہر نوجوان اس کے اشارے پر سر کٹانے کو تیار تھا۔ اس صورت میں، میں کسی خوش فہمی میں مبتلا ہونے کو تیار نہیں تھا مگر آتے آتے یقین آ ہی گیا۔ انسانی ذہن بھی بس ایک معمہ ہی ہے نا۔ کچھ پتا نہیں کب کونسی رگ کیا تماشا دکھا دے۔ تین سال تک اس برق صفت لڑکی نے اپنا آپ میرے سپرد کیے رکھا.....اس کا کہنا تھا کہ میں جس بے خوفی سے درندوں سے الجھتا رہتا ہوں اور جس طرح انہیں اشاروں پر نچاتا ہوں، یہ سب کچھ اسے بہت اچھا لگتا ہے اور محض اسی وجہ سے میں بھی اچھا لگنے لگا ہوں۔ یوں اس کی رفاقت میں تین سال ایک ہیجان خیز خواب کی طرح گزر گئے۔ پھر ایک روز جس طرح اچانک یہ خواب شروع ہوا تھا، اسی طرح یک لخت ٹوٹ گیا.....“ اس نے مغموم سے انداز میں سر جھکا لیا۔

میں نے اب بھی کچھ نہ پوچھا۔ چند لمحے بعد اس نے کہا۔ ”ایک دوسرے سرکس سے ایک جمناسٹ نے آکر ہمارے ہاں ملازمت کر لی۔ وہ لڑکا تھا تو نوعمر ہی، مگر اس کی مشاقی اور انوکھے پن کی دھوم تھی۔ اپنے سرکس والوں سے کسی بات پر ناراض ہو کر کلکتہ سے ہمارے ہاں آ گیا۔ وہ لڑکا کیا تھا صاحب.....وجاہت اور مضبوطی کا شاہکار تھا۔ بالکل ویسا ہی

یونانی شہزادہ لگتا تھا جیسے ہم تصویروں میں دیکھتے ہیں۔ اسے دیکھ کر عورتوں کی آنکھوں میں چمک آجاتی تھی مگر حیرت کی بات یہ کہ وہ بے حد شرمیلا تھا۔ مجھے کبھی شبہ تک بھی نہیں گزرا کہ تارا اس پر فریفتہ ہو چکی ہے کیونکہ تماشائیوں کے سامنے شو پیش کرنے کے سوا میں نے کبھی انہیں یکجا نہیں دیکھا تھا۔ میرے سر پر تو پہاڑ اس روز ٹوٹا جس روز میں نے اپنے خیمے میں سے تارا کو اپنا سامان سمیٹتے دیکھا۔ میں نے پوچھا تو اس نے بلاتامل نہایت سرد لہجے میں مجھے بتایا کہ وہ نئے جمناسٹ لڑکے پیرو کے خیمے میں منتقل ہو رہی ہے۔

”پہلے تو مجھے یہی محسوس ہوا جیسے میں مر گیا ہوں اور میری روح آسمان اور زمین کے درمیان کہیں یخ بستہ خلاؤں میں بھٹکتی پھر رہی ہے۔ میری آنکھیں اس وقت دیکھنے کے قابل ہوئیں جب تارا خیمے کے دروازے تک پہنچ چکی تھی۔ میں نے اسے کلائی سے پکڑ کر کھینچ لیا لیکن اس نے کچھ ایسی سرد نگاہوں سے میری طرف دیکھا کہ میرے ہاتھ سے اس کی کلائی خودبخود ہی چھوٹ گئی اور اس کے بعد میں اس برقی مشین کی طرح ناکارہ ہو کر رہ گیا جس کا کنکشن کٹ گیا تھا۔ کائنات کی گردش میرے لیے بے معنی ہو کر رہ گئی۔

مجھے یہ بتاتے ہوئے شرم آرہی ہے کہ میں نے تارا کی منت سماجت بھی کی۔ اس کے پیروں کو ہاتھ تک لگایا لیکن وہ ایک لفظ منہ سے نکالے بغیر مجھے ایک طرف دھکیل کر چلی گئی.....“

”اور اس کے بعد تم نے قسطوں میں خودکشی شروع کر دی۔“ میں نے لقمہ دیا۔

”ہاں۔“ اس نے تسلیم کیا۔ ”پہلے میں کبھی کبھار صرف شراب پیا کرتا تھا لیکن اس دن کے بعد شراب میرے لیے بے اثر ہو کر گئی تو میں نے سرکس کے ایک سائیس سے ایل ایس ڈی کے کیپسول لے کر کھانے شروع کر دیئے۔ زندگی سے کوئی دلچسپی ہی نہیں رہی تھی۔ ہر رات جب میں اپنے خیمے میں تارا کا خالی بستر دیکھتا تو میرے ہاتھ پاؤں مرگی کے مریضوں کی طرح مڑنے لگتے۔ پھر میں ایک راکٹ نگلتا اور خلاؤں کی سیر کو نکل جاتا اور گھنٹوں ان کے سامنے جانے کیا کیا اول فول بکتا رہتا۔ ایک بار تو میں رات بھر ایک شیر کے گلے میں بانہیں ڈالے.....نشے میں دھت پڑا رہا۔ شیر اپنے ٹرینر کا اس وقت تک ہی احترام کرتا ہے جب تک اس کے ہاتھ میں ہنٹر دیکھتا ہے لیکن اس شیر میں شاید کچھ وضع داری باقی تھی کہ بیچارہ اس عالم میں رات بھر ساکت بیٹھا رہا اور اپنی گردن میرے بازوؤں کے حلقے سے نہیں نکالی۔

”سرکس کے مالکان کی طرف سے مجھے سرزنش اور ڈانٹ ڈپٹ شروع ہو گئی تھی لیکن مجھ پر اب کسی بات کا اثر نہیں ہوتا تھا۔ مجھے اپنے کام سے بھی کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ میں محض اس لیے سرکس میں پڑا تھا کہ تنخواہ کی صورت میں جو ایک وظیفہ مل جاتا تھا، اس سے پیٹ کو ایندھن مل جاتا تھا۔

"پیرو اور تارا شو پیش کرتے تو میں بھی تماشائیوں میں جا بیٹھتا اور پورے شو کے دوران پلک جھپکائے بغیر ان دونوں کو ہی تکتا رہتا۔ اس کے علاوہ میں وحشت زدہ ہو کر کبھی کبھی سرکس کی حدود سے دور بھی چلا جاتا اور مدہوشی کے عالم میں رات رات بھر کہیں گلی کوچوں میں پڑا رہتا۔

"ڈراپ سین اس روز ہوا جب میں عین ہوش و حواس کے عالم میں ہنٹر لے کر پیرو کے خیمے میں گھس گیا۔ پیرو خیمے میں اکیلا ہی تھا۔ میں نے بے دریغ اس پر ہنٹر برسانے شروع کر دیئے۔" وہ نوجوان پھرتیلا اور مجھ سے کہیں زیادہ طاقتور تھا۔ چاہتا تو میری ہڈی پسلی ایک کر دیتا مگر خاموشی سے کھڑا ہنٹر کھاتا رہا۔ دفعتاً" تارا خیمے میں آئی اور اس نے مجھے کمر سے پکڑ کر سر سے اونچا اٹھا کے زمین پر دے مارا۔ میں بے ہوش ہو گیا۔

"وہ کسی تکلیف کا احساس تھا جس کی بدولت میں ہوش میں آیا۔ میں نے دیکھا' میں خیموں کے درمیان کھلی جگہ پر اوندھا پڑا تھا اور تارا مجھ پر ہنٹر برسا رہی تھی۔ سرکس کے بہت سے کارکن ہمارے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ جیسے روز تماشائیوں کو کھیل کرتب دکھاتے دکھاتے خود آج کوئی دلچسپ تماشا دیکھنے لگے ہوں۔

"مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر تارا نے گریبان سے پکڑ کے مجھے اٹھایا اور میرے منہ پر تھوکتے ہوئے بولی۔ "تین سال میں' میں نے ان گنت مسرتوں سے تیری جھولی بھر دی۔ تو ان پر اکتفا نہیں کر سکتا بڈھے؟ مجھے اپنی زرخرید لونڈی سمجھتا ہے؟ زندگی میری ہے..... میں اسے جس طرح چاہوں گی' گزاروں گی۔ جس کے ساتھ چاہوں گی' گزاروں گی۔ اگر آئندہ تو نے میری زندگی میں مداخلت کی تو ذبح کر کے تیرے ہی سدھائے ہوئے شیروں کے سامنے ڈال دوں گی۔" پھر اس نے مجھے زمین پر پٹخ دیا اور پیرو کے خیمے کی طرف چل دی۔

"پیرو اس کے پیچھے پیچھے سر جھکائے سعادت مند بچے کی طرح چل رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کچھ ایسے تاثرات تھے جیسے اسے اس سارے سلسلے میں سخت تکلیف پہنچی ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جمناسٹک کی ماہر ہونے کی وجہ سے تارا کے جسم میں بڑی عجیب و غریب قوتیں پوشیدہ تھیں لیکن میں چاہتا تو اسے زیر بھی کر سکتا تھا مگر مسئلہ یہی تھا کہ میں ایسا چاہ ہی نہیں سکتا تھا۔

"مجھے تارا کی طلب نے اندر سے کھنڈر کر کے رکھ دیا تھا اور راکٹ کے استعمال نے ذہنی طور پر مفلوج کر دیا تھا۔ ہوش و حواس میں رہتے ہوئے مجھے سخت تکلیف محسوس ہوتی تھی۔ اب میں اتنی دیر سے محض دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے اشتیاق میں آپ سے یہ قائمی ہوش و حواس باتیں کیے جا رہا ہوں ورنہ اتنی دیر ہوش میں رہنا مجھے گوارا نہیں ہوتا۔

بہرحال تارا سے یہ میری پہلی اور آخری جھڑپ تھی۔ اس کے بعد سرکس والوں نے مجھے نوکری سے نکال دیا' تاہم مجھے سرکس کی حدود سے نہیں نکالا کیونکہ ویسے بھی سرکس

کے شہر میں قیام کی مدت ختم ہو رہی تھی۔

بالآخر چند روز پہلے سارا سامان ٹرکوں میں لادا گیا اور سرکس کسی اور شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ مجھے یہیں چھوڑ کر' میں نے بھی ایک ٹرک میں چڑھنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے دھکے دے دے کر مجھے نیچے اتار دیا۔ میں نے اپنی زندگی کے سات طویل برس اس سرکس کے ساتھ گزارے تھے جن میں سے تین برس تو بہت ہی قیمتی تھے کہ ان میں مجھے تارا حاصل تھی۔

"اب کئی دن سے یہی معمول تھا کہ میں ادھر ادھر آوارہ گردی کرتا تھا لیکن گھوم پھر کر اسی میدان کی طرف جا نکلتا تھا جہاں سرکس کے پڑاؤ کے نشانات باقی تھے۔ میں راکٹ کھا کر میدان کے کنارے بیٹھ جاتا' پھر میری آنکھیں مجھے بڑے عجیب عجیب منظر دکھاتیں۔ مجھے سرکس جوں کا توں پڑاؤ ڈالے نظر آتا۔ اپنا خیمہ بھی دکھائی دیتا اور پہلو میں تارا بھی' پھر دھیرے دھیرے یہ سب کچھ غائب ہو جاتا۔ کوئی ڈراؤنا منظر اس کی جگہ لے لیتا اور میرا جی چاہنے لگتا کہ خودکشی کر لوں۔ پھر میں مرنے کے لیے کوئی موزوں جگہ ڈھونڈنے لگتا.....بس یہی اپنا معمول ہے اور یہی زندگی کی کل کہانی....." **شیکھر** خاموش ہو کر میری طرف دیکھتے ہوئے عجیب سے انداز میں مسکرایا اور اٹھتے ہوئے بولا۔ "اب اجازت ہے؟"

"اجازت کے بچے! بیٹھ جاؤ۔" میں نے اپنائیت آمیز سختی سے کہا۔ "میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔" وہ بیٹھ چکا تو میں نے کہا۔ "کبھی تم نے سوچا ہے کہ اپنے ساتھ تم جو کچھ کر رہے ہو' اس سے تمہیں کیا فائدہ ہو گا؟"

"فائدے اور نقصان کا وقت تو اب گزر گیا ہے صاحب!" وہ حقارت سے ہنس دیا۔ "یہ باتیں تو وہ سوچتے ہیں جنہیں زندگی گزارنی ہوتی ہے۔ اپن نے تو گزار لی' جتنی گزارنی تھی۔ اب تو سانسوں کا کچھ فاضل سرمایہ بچ گیا ہے جسے بیدردی سے لٹا رہے ہیں۔"

"باتیں تو بڑی عقلمندوں اور مفکروں والی کرتے ہو لیکن حرکتیں احمقوں والی ہیں۔" میں نے کہا۔ "مجھے صرف یہ بتاؤ کہ اگر تم اسی طرح ذلت و خواری سے زندگی کے بچے کھچے دن گزارتے رہے' راکٹ کھا کھا کر نالیوں میں گرتے رہے تو کیا تمہیں تارا مل جائے گی یا اس کو تمہارے حال کی خبر ملتی رہے گی اور اس کے دل میں تمہارے لیے ہمدردی پیدا ہو جائے گی؟"

"نہیں۔" اس نے تسلیم کیا۔ "لیکن میں اس غرض سے تو یہ سب کچھ نہیں کرتا۔ مجھے تو بس اپنے آپ کو برباد کرنے میں مزا آنے لگا ہے۔"

"بکواس۔" میں نے کہا۔ "اپنے آپ کو برباد کرنے میں کسی کو مزا نہیں آتا۔ یہ فلسفہ صرف اس وقت گھڑا جاتا ہے جب اپنے آپ کو سنوارنے کا کوئی بہانہ' کوئی وسیلہ نہیں رہتا۔ تم ایک ہوش مند انسان ہو اور اس مہلک نشے کا عادی ہوتے ہوئے بھی تمہیں زیادہ عرصہ

نہیں گزرا۔ تم نے اپنے آپ کو صرف اس لیے اس راہ پر ڈال لیا ہے کہ تمہارے سامنے کوئی اور راہ نہیں رہی یا یوں کہو کہ تمہیں بجھائی نہیں دے رہی۔"

وہ بغور میری بات سن رہا تھا۔ یہ ایک اچھی علامت تھی۔

"تارا کو بھول جاؤ۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ تمہیں بھول گئی۔ اسے اپنے ذہن سے اسی طرح نکال پھینکو جس طرح اس نے تمہیں اپنی زندگی سے نکال پھینکا ہے۔"

"یہ اب اپنے بس کی بات نہیں رہی صاحب!" اس نے ایک لمحے کی خاموشی کے بعد کہا۔

"کیوں نہیں رہی؟" میں نے ملامت سے کہا۔ "ہو سکتا ہے تمہیں صرف کسی کی تھوڑی بہت مدد کی ضرورت ہو۔ وہ تمہیں میں فراہم کروں گا' تم نئے سرے سے زندگی شروع کرو۔"

"اس عالم میں کہ جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں ہے اور تن پر کپڑے بھی پرائے ہیں۔" وہ اپنے سراپا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تلخ انداز میں ہنسا۔

"میں نے تمہاری مدد کا ارادہ ظاہر کیا ہے' اس سے میری مراد مالی مدد بھی ہے۔" میں نے کہا۔ "میں تمہاری اس حد تک مدد کر سکتا ہوں جس حد تک تم سوچ بھی نہیں سکتے لیکن شرط یہی ہے کہ تم چار دن انسانوں کی طرح گزار کر دوبارہ اس راہ پر نہیں پڑ جاؤ گے۔ نئے سرے سے پرعزم انسانوں کی طرح زندگی شروع کرو گے۔"

"آخر آپ میری مدد کرنے پر کیوں کمربستہ ہو گئے؟" اس نے شکی سے لہجے میں کہا۔

"صرف اس لیے کہ تم جیسے آدمیوں کو میں کام کے آدمیوں میں شمار کرتا ہوں اور انہیں یوں برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔" میں نے جواب دیا۔ "دوسرے عین ممکن ہے کہ کبھی مجھے بھی تمہاری مدد کی ضرورت پڑ جائے۔ تمہارے لیے موجود روش کو ترک کرنا کچھ اتنا زیادہ مشکل نہیں جتنا تم سمجھ رہے ہو' صرف کسی تعمیری کام کو اپنا مقصد حیات اور اپنی منزل قرار دے لو۔ کیا تمہیں ایسا کوئی کام یاد نہیں جس کے بارے میں تم نے کبھی حسرت محسوس کی ہو کہ کاش میں ایسا کر سکتا؟"

اس کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔ چند لمحے سوچنے کے بعد وہ بولا۔ "میری ایک بہن ہے' مدراس میں رہتی ہے' جوانی ہی میں بیوہ ہو گئی تھی تب سے محنت مزدوری کرکے گزر اوقات کرتی ہے۔ اس کی دو بچیاں سیانی ہو چکی ہیں اور ان کی شادی بیاہ کا کوئی وسیلہ نظر نہیں آتا۔ کبھی کبھی میں سوچا کرتا تھا کہ کاش میں ان بچیوں کی شادی کا بندوبست کر سکتا لیکن سرکس میں چونکہ مجھے تنخواہ صرف اتنی ہی ملتی تھی کہ تنہا اپنا ہی گزارہ کھینچ تان کر ہوتا تھا' اس لیے میں اس خیال کو ذہن سے جھٹک کر اپنے معمولات میں الجھ جاتا تھا' اب تو میں نے بہن کو خط لکھنا بھی چھوڑ دیا ہے۔"

"یہ تو بہت عمدہ مقصد حیات ہے۔" میں نے دبے دبے جوش سے کہا۔ سردست تم صرف اتنا ہی تہیہ کر لو کہ میں ان بچیوں کی شادی کا بندوست کرنے تک سرگرم عمل رہوں گا' اس کے بعد جو جی میں آئے گا' کروں گا۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے تم کسی چیز کو ناکارہ سمجھ کر پھینکنے کا تہیہ کر چکے ہو لیکن پھر سوچتے ہو کہ اس سے ایک اچھا کام لے لوں' پھر پھینک دوں گا۔"

وہ چند لمحے خاموش رہا پھریکایک ہی بیزاری سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "نہیں صاحب! میں اب زندگی کے بکھیڑوں میں الجھنا نہیں چاہتا....." اس نے ایک طویل جماہی لی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ "اب میرا نشہ ٹوٹ رہا ہے' مجھے پندرہ روپے عنایت کیجئے اور جانے کی اجازت دیجئے۔ آپ کی مہمانداری اور ہمدردی کا بہت بہت شکریہ۔"

میرے اتنا سمجھانے کے باوجود کتے کی دم ٹیڑھی کی ٹیڑھی ہی تھی۔ میرا جی چاہا کہ واقعی اس کی گردن پر ہاتھ رسید کرکے ایسے ہٹ دھرم اور انتہاء سے زیادہ مایوسی پرست انسان کا قصہ پاک کر دوں لیکن پھر مجھے ترس آگیا۔ بدبخت کو اپنی زندگی کی اہمیت کا اندازہ نہیں تھا۔ ایک متاع گراں مایہ کو لوگوں کے قدموں میں بکھیر کر ضائع کر رہا تھا۔

"تمہارا تو باپ بھی سیدھا ہو جائے گا میری جان!" میں نے یکلخت بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں میں خوف جھلک آیا۔ میں نے اپنے ملازم کرمو کو آواز دی اور جب وہ آیا تو اسے حکم دیا۔ "موصوف کو لے جا کر تہہ خانے میں بند کر دو۔" میں نے **شیکھر** کی طرف اشارہ کیا۔ "ان کو اچھے سے اچھا کھانا کھلانا' پلانا اور ہر طرح سے ان کے آرام و آسائش کا خیال رکھنا اور کوئی ذرا سی بھی خطرناک چیز ان صاحب کے آس پاس موجود نہ رہنے دینا جس سے یہ خودکشی کی کوشش فرما سکیں۔ دوسرے انہیں نشے کی کوئی چیز نہ پہنچنے پائے' نیند کی گولی تک نہیں' خواہ یہ کتنا ہی اچھلیں' کودیں' شور مچائیں۔ آواز تو تہہ خانے سے باہر جائے گی ہی نہیں۔ ایک ماہ بعد مجھے یاد دلانا کہ میں نے انہیں تہہ خانے میں بند کروایا تھا' پھر میں ان کا معائنہ کروں گا اور دیکھوں گا کہ کیا حال ہے۔"

"نہیں..... نہیں....." **شیکھر** دیوانہ وار چلانے لگا۔ "راکٹ کے بغیر میں مر جاؤں گا۔"

"نشہ نہ ملنے سے شاذ و نادر ہی کوئی مرتا ہے۔" میں نے لاپروائی سے کہا۔ "اور تمہیں تو نشہ شروع کیے چھ ماہ بھی نہیں گزرے۔"

کرمو نے **شیکھر** کو مجہول اور معمر آدمی سمجھ کر لاپروائی سے ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی لیکن **شیکھر** اس دیہاتی کتے کی طرح مستعد ہو چکا تھا جو شہری کتوں کے نرغے میں آن پھنسا ہو' اس کی خفیہ صلاحیتیں بھی شاید بیدار ہو گئی تھیں۔ وہ مچھلی کی طرح تڑپ کر کرمو

کی گرفت سے نکلا اور دروازے کی طرف لپکا۔ کرمو نے اس کا بازو پکڑنے کی کوشش کی لیکن اس نے بازو کو کچھ اس انداز سے جھٹکا دیا جیسے سانپ نے لہرا کھایا ہو اور کرمو اوندھے منہ گر پڑا۔ اب یقیناً اسے غصہ آگیا تھا اور اس کی بھی معرکہ آرائی کی وہ صلاحیتیں ابھر آئی تھیں جن سے میں بخوبی واقف تھا۔

اس نے فرش سے اٹھنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگائی۔ **شیکھر** اس وقت دروازہ پار کر چکا تھا' کرمو نے یوں اس پر چھلانگ لگائی جیسے کوئی عقاب فاختہ پر جھپٹتا ہو' پھر اسی انداز میں وہ چاروں ہاتھوں' پیروں کی مدد سے **شیکھر** کو دبوچ کر فرش پر اوندھا گر گیا۔ **شیکھر** کے لیے اب مچلنا تو درکنار جنبش کرنا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔

"صاحب جی! اس کی کوئی ہڈی وغیرہ تو نہیں ٹوٹی؟" کرمو نے گردن گھما کر بڑی سنجیدگی سے پوچھا' انداز ایسا ہی تھا جیسے پوچھ رہا ہو۔ "صاحب جی! آپ کی چائے میں چینی زیادہ تو نہیں ڈالی؟"

"نہیں..... قطعی نہیں۔" میں نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے جواب دیا۔ "بس جو کچھ میں نے بتایا ہے وہی کرو۔"

کرمو نے **شیکھر** کو اس طرح اٹھایا کہ اس کے دونوں بازو پیچھے کو مڑے ہوئے تھے اور کرمو کی آہنی گرفت میں تھے۔ وہ اسے دھکیلتا ہوا ڈرائنگ روم کی طرف لے گیا جہاں سے تہہ خانے کو راستہ جاتا تھا۔ اس کے بعد میں نے واقعی **شیکھر** کا تصور بھی ذہن سے جھٹک دیا۔

پورے ایک ماہ بعد کرموں نے حسب ہدایت مجھے **شیکھر** کی یاد دلائی۔ میں نے تہہ خانے میں جا کر اسے دیکھا اور حیران رہ گیا' وہ قطعی طور پر بدلا ہوا انسان لگ رہا تھا۔ صحت مند اور چست و چالاک صاف ستھرے کپڑوں میں خوب نکھرا نکھرا دکھائی دے رہا تھا۔

"اب کیا حال ہے؟ دماغ ٹھکانے پر آیا؟" میں نے پوچھا۔

"بالکل آگیا۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "میں نشہ چھوڑنے اور تارا کے سحر سے آزاد ہونے کو ناممکن سمجھتا تھا مگر یہ تو محض چند دن کی تکلیف ثابت ہوئی۔ مجھے دوبارہ زندگی سے محبت ہو گئی ہے۔"

"اب کیا چاہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میں آپ کو زیادہ تکلیف دینا نہیں چاہتا جتنا کچھ آپ نے کیا' یہی مجھ پر اتنا بڑا احسان ہے کہ میں اس کا صلہ نہیں دے سکتا۔" اس نے شائستگی اور ممنونیت سے کہا۔

"**تکلفات** چھوڑو.....میں ابھی تم سے صلہ مانگ بھی نہیں رہا' میں تمہیں کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کرا کے دے سکتا ہوں' اسے پھیلانے کی کوشش کرنا۔" میں نے کہا۔

"اور تو مجھے کسی کام کا کوئی خاص تجربہ نہیں۔" بالآخر اس نے سوچتے ہوئے کہا۔ "مجھے

کوئی غریبانہ سا ریستوران کھلوا دیجئے۔ مجھے امید ہے کہ اسے میں چلا لوں گا۔"

میں نے کوئی نئی جگہ لینے اور نئے سرے سے کام شروع کروانے کے بجائے **شیکھر** کو گاڑی میں ساتھ بٹھا کر دو تین بستیوں کا چکر لگایا۔ ایک دو جگہ بات کی اور بالآخر دس ہزار پگڑی پر ایک ریستوران مل گیا۔ اس کی حالت بہتر بنانے کے لیے میں نے **شیکھر** کو دس ہزار مزید دیئے اور اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

اس کے بعد اس سے میری دو مزید طویل ملاقاتیں ہوئیں۔ ایک مرتبہ میں اس کی طرف جا نکلا تھا جہاں وہ رہتا تھا اور ایک بار وہ میرے دفتر آیا تھا۔ فون وہ مجھے اکثر کرتا رہتا تھا۔ حالات بتاتے تھے کہ وہ بالکل صحیح ڈگر پر جا رہا تھا۔ میرے تجویز کردہ راستے پر چل رہا تھا۔ مجھے خوشی تھی کہ میں نے نہ صرف ایک کارآمد زندگی ضائع ہونے سے بچا لی تھی بلکہ ایک ایک کرکے نہایت منتخب قسم کے جو پودے میں لگا رہا تھا' ان میں ایک کا اضافہ ہو گیا تھا۔ ایک قیمتی بیج لوگوں کے پیروں تلے کچلے جانے اور ضائع ہونے سے بچ گیا تھا۔

"آپ کن خیالوں میں کھو گئے؟" **شیکھر** کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ بیرا بڑے سلیقے سے ٹرے میں اورنج جوس کے دو گلاس اٹھائے لے آیا تھا اور کار کی کھڑکی کے قریب کھڑا تھا۔ **شیکھر** نے انتہائی احترام سے ایک گلاس مجھے پیش کیا اور دوسرا خود تھام لیا۔

"**شیکھر!**" میں نے چند گھونٹ بھرنے کے بعد کہا۔ "تمہیں یاد ہوگا پچھلی ملاقات پر ہم نے ایک موضوع پر بڑی دلچسپ اور تفصیلی گفتگو کی تھی۔ میں نے کہا تھا کہ فطرت کے اعتبار سے کچھ لوگ درحقیقت حیوان کہلانے کے مستحق ہوتے ہیں لیکن قدرت نے فیاضی سے کام لیتے ہوئے انہیں انسان بنا دیا ہوتا ہے۔ تم نے حیوانوں کو سدھارنے میں زندگی گزار دی ہے' انہیں انسانوں کی سی حرکتیں کرنے کی تربیت دیتے رہتے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارے لیے اس تجربے کو الٹ طریقے سے کام میں لانا زیادہ آسان ہوگا یعنی تم انسانوں کو حیوان بننے کی تربیت دو گے۔ بنیادی طور پر تو انسان بھی حیوان ہے اور جن انسانوں کا میں ذکر کر رہا ہوں' ان میں چونکہ حیوانیت کا عنصر غالب ہے' اس لیے تمہیں کوئی زیادہ دقت پیش نہیں آئے گی۔ آزمائشی طور پر میں نے پہلا شکار ایک جزیرے پر پہنچا دیا ہے....."

پھر میں نے اسے مالتی مندر اور اپنے پیلس کے متعلق تفصیل سے بتایا اور کہا۔ "وہ جگہ تمہارے کام کے لیے موزوں ترین ہے' تہہ خانے میں ابتدائی مراحل مکمل کرنے کے بعد تمہیں بعد کے تجربات وغیرہ کے لیے وسیع و عریض جنگل بھی میسر ہوگا جہاں کوئی تمہیں دیکھنے والا یا تمہارے کام میں مداخلت کرنے والا نہیں ہوگا۔ میرا پہلا شکار جو تہہ خانے میں ایک پنجرے میں بند ہے' اس کے مظالم کا میں تمہیں کچھ پس منظر بتا دوں تاکہ تمہارے دل میں اس کے لیے کبھی رحم کی رمق نہ ابھرے....."

میں نے اسے مدن موہن اور اس کے کرتوت کے بارے میں بتایا۔ ماہتاب کے ساتھ اس نے جو کچھ کیا تھا' وہ بھی بتایا لیکن یہ واضح نہیں کیا کہ ماہتاب سے میرا کیا تعلق تھا' پھر میں نے کہا۔ "اس شخص کو انسان سے بن مانس بنانا ہے۔ تمہیں افریقہ کے شیطانی جراحوں کے طریق کار کے متعلق تو مکمل معلومات حاصل ہیں ناں؟"

"جی ہاں۔" **شیکھر** نے جواب دیا۔ "بلکہ مجھے ان کے بیشتر فارمولوں کا بھی علم ہے۔ انسان کو بن مانس کے قالب میں ڈھالنے کے لیے وہ اس کی جلد پر کچوکے لگا کر ایک محلول ملتے ہیں جس سے کھال کچی پڑ جاتی ہے اور ایک خاص قسم کا لیس چھوڑنے لگتی ہے۔ اس کیفیت کے دوران اس کے جسم پر بن مانس کی کھال منڈھ کر جگہ جگہ سے ایک خاص قسم کے دھاگے سے سی دی جاتی ہے۔ یہ دھاگہ بھی رفتہ رفتہ جزو بدن بن جاتا ہے اور کھال بھی اصل انسانی کھال ہی سے یک جان ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس دوران مختلف مرحلوں میں اس انسان کو خصائل کے اعتبار سے بھی بن مانس بنانے کا عمل جاری رہتا ہے۔ بالآخر رفتہ رفتہ وہ انسانوں کی طرح چلنا' کھانا' پینا حتیٰ کہ بولنا تک بھول جاتا ہے اور مکمل بن مانس بن جاتا ہے۔ بعض افریقی قبائل میں جس شخص کو سزا دینا مقصود ہوتا ہے' اسے اس طرح بن مانس بنانے کے لیے شیطانی جراحوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔





میں دل ہی دل میں اس کی معلومات کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے بالکل موزوں آدمی کا انتخاب کیا تھا۔

"بالکل درست۔" میں نے ستائشی لہجے میں کہا۔ "بن مانس کی کھال تمہیں جب ضرورت ہو' ایک ہفتے پہلے مجھے مطلع کر دینا۔ وہ تمہیں ایک خاص قسم کے بکس میں محفوظ کی ہوئی بالکل تازہ حالت میں مل جائے گی۔ اس سلسلے میں میرا دو شکاریوں سے معاہدہ ہو چکا ہے جو زیادہ تر سندر بن میں پڑاؤ ڈالے رہتے ہیں۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔" **شیکھر** نے دلچسپی آمیز لہجے میں کہا۔ "تو پھر میں کب سے اپنا کام شروع کروں؟"

"پرسوں تک تم اپنے یہاں کے معاملات نمٹا کر میرے آفس آجاؤ۔" میں نے کہا۔ "میرا ایک آدمی تمہیں پیلس میں چھوڑ آئے گا۔ تمہاری ضرورت کی بیشتر چیزیں تو پیلس میں موجود ہوں گی' پھر بھی اگر تمہیں کسی چیز کی کمی محسوس ہو تو اسی کو بتا دینا' وہ تمہیں پہنچا دے گا۔ اس کا نام چھنا ہے۔ میرے اس پہلے شکار کو بن مانس بنانے کا عمل جاری رکھنے کے دوران تم اس کے چہرے کی ساخت تبدیل کرنے کے لیے آلات جراحی تو استعمال کرو گے ہی لیکن ساتھ ساتھ اس کے چہرے پر روزانہ ایک یا دو قطرے تیزاب ضرور ڈالتے رہنا۔ یہ ایک اضافی سزا ہے جو میں اسے دینا چاہتا ہوں۔"

"ایسا ہی ہوگا۔" **شیکھر** نے سعادت مندی سے کہا۔ پھر وہ گاڑی سے اتر گیا۔ وہاں سے میں سیدھا گھر آیا اور چھنا کو فون کیا۔ اس سے میری گفتگو آدھے گھنٹے جاری رہی۔ اسے تمام ضروری ہدایات دینے اور بعض معلومات پر تبادلہ خیال کرنے کے بعد مطمئن ہو کر فون بند کر دیا۔

چھنا سے گفتگو سے فارغ ہو کر میں نے کھانا کھایا۔ کچھ دیر آرام کیا' پھر اٹھ کر اپنے حلئے میں معمولی سی تبدیلیاں کیں۔ یہ معمولی سی تبدیلیاں بھی مجھے ناقابل شناخت بنا دیتی تھیں۔ آئینے میں اپنا تنقیدی جائزہ لینے کے بعد مطمئن ہو کر میں نے اپنا خصوصی سفر میں استعمال ہونے والا بریف کیس اٹھایا اور گھر سے نکل کھڑا ہوا۔

کچھ دیر بعد میری کار پونا جانے والی سڑک پر رات کی تاریکی میں فراٹے بھر رہی تھی۔

پونا کے راستے میں جام نگر سے کچھ آگے ایک چھوٹا سا قبرستان تھا۔

میں غالباً اسی قبرستان کے قریب سے گزر رہا تھا جب ایک نہایت خوبصورت سراپا میری کار کی ہیڈ لائٹس کی زد میں آیا۔ لمحہ بھر میں' میں نے اس کا سرتاپا جائزہ لے لیا۔

وہ تھی تو لڑکی ہی مگر اس رس بھرے پھل سے مشابہ جو پک کر شاخ سے ٹپک چکا ہو۔ خاصی پختہ کار سی لگتی تھی۔ اگر پختہ کار نہ ہوتی تو رات کے اس پہر ہائی وے پر قبرستان کے نزدیک تنہا کیوں پائی جاتی؟ اس کا چہرہ بیضوی اور بال تراشیدہ تھے جو اس کے کندھوں کو چھونے کی کوشش کر رہے تھے۔ سر پر وہ ایک چھوٹی سی پی کیپ رکھے ہوئے تھی۔

وہ تنگ پتلون اور جرسی میں ملبوس تھی۔ پیروں میں جوتے بھی مردانہ تھے اور اپنے لمبے قد اور کسی یونانی دیوی کے مجسمے کی طرح ترسے ہوئے جسم کے ساتھ وہ خاصی پروقار نظر آرہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا سفری بیگ تھا جس کا لمبا فیتہ اس نے مٹھی کے گرد لپیٹ کر اسے لاابالی سے انداز میں لٹکایا ہوا تھا۔

اس نے بڑی ادا سے لفٹ کے لیے انگوٹھا ہلایا تھا لیکن میں گزرتا چلا گیا' تاہم غیر ارادی طور پر ایکسیلیٹر پر میرے پاؤں کا دباؤ ضرور کم ہو گیا تھا اور وہ اس لیے کہ اس لڑکی کی صورت مجھے کچھ شناسا محسوس ہوئی تھی۔ ذہن کے کسی گوشے میں کوئی گھنٹی سی بجی تھی۔

میں زیادہ دور نہیں جا سکا۔ رکتے رکتے بالآخر رک ہی گیا' پھر میں نے گاڑی ریورس کی۔ اس کے قریب پہنچ کر میں نے بریک لگایا اور وہ دروازہ کھول کر بغیر کچھ کہے' بغیر کچھ پوچھے میرے قریب آبیٹھی۔ دور سے وہ جتنی صاف ستھری اور تر و تازہ نظر آرہی تھی' اتنی شاید تھی نہیں۔ مجھے اس کے جسم سے پسینے کی ہلکی سی بو پھوٹتی محسوس ہوئی۔ کار میں دروازہ بند کرتے وقت وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ اس کا چہرہ کچھ ستا ہوا سا تھا۔ آنکھوں کے گوشوں کے قریب ہلکی ہلکی شکنیں تھیں۔ ہونٹ بھی خشک تھے' تاہم مجموعی طور پر اس کی ذات زہد شکن اور اس کی قربت راحت جاں تھی۔

"شکر ہے میں نے پہلی کار کو ہاتھ دیا اور اس میں لفٹ مل گئی۔" چند لمحے بعد وہ بولی۔ کچھ دیر پہلے دوڑنے کی وجہ سے ابھی تک اس کی سانسوں میں ارتعاش تھا۔ "ورنہ مجھے تو یہی اندیشہ تھا کہ اس وقت ویرانے میں تنہا لڑکی کو دیکھ کر کوئی شریف آدمی گاڑی نہیں روکے گا۔"

"گویا بالواسطہ طور پر تم نے یہ فیصلہ دے دیا کہ میں کوئی شریف آدمی نہیں ہوں۔" میں نے مدھم آواز میں کہا۔

"ہو سکتے ہو لیکن کچھ زیادہ نہیں۔" اس کے لہجے میں ہلکی سی شوخی تھی۔

"اور اگر تمہارے اندیشے کے مطابق کوئی شریف آدمی گاڑی نہ روکتا تب تم کیا

کرتیں؟" میں نے سرسری لہجے میں پوچھا۔

"کسی ٹرک میں تو لفٹ مل ہی جاتی۔" اس نے لاپروائی سے کہا۔

"ٹرک والوں سے تمہیں خوف نہ آتا؟" میں نے سادگی سے پوچھا۔

"خوف؟" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا' پھر دھیرے سے ہنس دی۔ اس کی ہنسی میں خمار کا بوجھل پن تھا اور اس کی وجہ نیند کی کمی نہیں تھی۔ اب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کوئی نشہ بھی کیے ہوئے تھی۔

"مذاق مت کرو۔" وہ کھنک دار لہجے میں بولی۔ "مجھے یہ تاثر دینے کی کوشش مت کرو کہ تم مجھے کوئی مصیبت ماری شریف زادی سمجھ رہے ہو۔ تمہیں بھی معلوم ہے کہ میں کوئی پاکیزہ بی بی نہیں اور مجھے بھی خاص حد تک اندازہ ہے کہ تم کتنے پانی میں ہو۔"

"میں دراصل پانی کا نہیں' خشکی کا جانور ہوں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ میں ذہن پر مسلسل زور دے رہا تھا اور یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کیا میں نے زندگی میں کبھی اسے کہیں دیکھا ہے؟

چند لمحے خاموش رہی۔ اس کی طرف دیکھے بغیر میں نے محسوس کیا کہ وہ کبھی سامنے اور کبھی عقب نما آئینے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ دور دور تک کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس نظر نہیں آرہی تھیں۔ تب لڑکی نے وہی حرکت کی جس کی مجھے کسی حد تک توقع تھی۔

اس نے نہایت غیر محسوس طور پر غالباً اپنے بیگ سے خنجر نکالا اور میری پسلیوں پر یوں ٹکا دیا کہ اس کی نوک میرے کپڑوں سے گزر کر کھال میں چبھنے لگی۔

"کوئی احمقانہ حرکت نہ کرنا۔ خنجر میرے ہاتھ میں آکر بہت حساس ہو جاتا ہے۔ کسی کی ذرا سی بے احتیاطی برداشت نہیں کرتا۔" اس نے میرے قریب یوں سرگوشی کی گویا کوئی فلمی ہیروئن محبت اور جذبات سے بوجھل کوئی مکالمہ بول رہی ہو۔

عین اسی لمحے میرے ذہن میں جیسے چھناکا سا ہوا اور اچانک ہی مجھے یاد آگیا کہ وہ کون تھی۔

کئی برس پہلے میں نے نوعمری میں ہی ایک خونخوار مقابلے کے بعد اپنے استاد شائی تن سے جوڈو اور کراٹے میں بلیک بیلٹ حاصل کی تھی اور تقریب ختم ہونے پر اپنے گھر جا رہا تھا تو احسان مرزا کے جن تین گرگوں نے مجھے اس کے سامنے پیش کرنے کے لیے اغوا کرنے کی کوشش کی تھی' ان میں سے ایک یہی لڑکی تھی۔ اس کے بارے میں اس کے ساتھیوں نے کہا تھا کہ خنجر استعمال کرنے میں اس کا ثانی ملنا مشکل ہے۔ مجھے یہ بھی یاد آگیا کہ انہوں نے اس کا نام شکنتلا بتایا تھا۔

"بات دراصل یہ ہے کہ مجھے اس وقت ایک کار کی سخت ضرورت ہے کیونکہ آوارہ گردی میری زندگی کی واحد مصروفیت ہے۔" اس نے بدستور سرگوشی نما لہجے میں کہا۔ "اور

ظاہر ہے رولز رائس میں بیٹھ کر انسان ہوٹلوں سے مفت کھانا وغیرہ کھاتا نہیں پھر سکتا' اس لیے مجھے پیسوں کی بھی ضرورت ہوگی- تم ایسا کرو کہ گاڑی ایک طرف روک کر بریف کیس اندر ہی چھوڑ کر اتر جاؤ-"

"جانِ من! ذرا سوچو تو اس ویرانے میں خالی ہاتھ گاڑی سے اتر کر میرا کیا بنے گا؟" میں نے مصنوعی لجاجت سے کہا..... "تم ایسا کیوں نہیں کرتیں کہ گاڑی بھی لے لو' پیسے بھی لے لو لیکن مجھے پونا تک چھوڑ دو-"

"یہ تو اسی صورت میں ممکن تھا جب میں پرلے درجے کی احمق ہوتی اور فرض کر لیتی کہ میں پونا تک گاڑی ڈرائیو کروں گی اور اس دوران تم نہایت سعادت مندی سے گردن جھکائے میرے پاس بیٹھے رہو گے- پونا پہنچ کر میرا شکریہ ادا کرکے اترو گے اور اپنا راستہ لو گے-" اس نے خنجر پر دباؤ بڑھا دیا- "بس اب روک لو اور شکاری مردوں کی طرح مزید گفتگو نہ کرنا- مجھے شکاری قسم کے مردوں سے سخت نفرت ہے- سیدھے سادھے اور معصوم مرد مجھے بہت اچھے لگتے ہیں مگر بدقسمتی سے ایسا کوئی مجھے مشکل ہی سے نظر آتا ہے اور نظر آتا ہے تو میرے قریب پھٹکتے ہوئے بھی ڈرتا ہے-"

"تم اپنی نظر خاص سے نہیں دیکھ رہیں ورنہ آدمی تو میں بھی خاصا سیدھا سادہ اور معصوم ہوں **شکنتلا** دیوی!" میں نے قدرے شوخی سے کہا-

وہ بڑی گھاگ تھی- حیرت سے اچھلی نہیں' تاہم اس کے ہاتھ میں دبا ہوا خنجر کچھ پیچھے ہٹ گیا- چند لمحے تک وہ خاموش رہی- گویا فیصلہ نہ کر پا رہی ہو کہ کیا کہے- میں نے ہاتھ بڑھایا اور سوئچ دبا کر چھت کی بتی جلا دی- کار میں دودھیا سی روشنی پھیل گئی- میں نے گردن گھما کر دیکھا' وہ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے مجھے گھور رہی تھی-

"تم کوئی پرانے شناسا معلوم ہوتے ہو-" بالآخر وہ بڑبڑائی..... "**شکنتلا** تو میرا اس دور کا نام ہے جب میں احسان مرزا کے پاس ہوا کرتی تھی- اب تو میرا نام کافی عرصے سے کیٹی چلا آرہا ہے-"

"گویا اب تم احسان مرزا کے پاس نہیں ہو؟" میں نے پوچھا-

"نہیں-" اس نے اختصار سے جواب دیا اور ایک لمحے کے توقف کے بعد دوبارہ میری شناخت کے موضوع پر آتے ہوئے بولی- "مجھے زندگی میں اتنے مردوں سے واسطہ پڑا ہے کہ میں ان سب کے نام اور صورتیں یادداشت کے خانے میں محفوظ نہیں رکھ سکتی' اس لیے تم خود ہی بتا دو کہ تم کون ہو!"

میں نے اسے بتایا تو یکدم وہ اچھل پڑی..... "ہاں.....ہاں ..... مجھے یاد آگیا-" وہ پرجوش لہجے میں بولی- "اس وقت تم بہت پیارے نوخیز سے' کیوٹ سے لڑکے تھے- عمر کے ساتھ پختگی تو تم میں آنی ہی تھی لیکن تم کچھ زیادہ ہی بدلے بدلے سے لگ رہے ہو ورنہ

میں مردوں کے بارے میں یادداشت بے حد کمزور ہونے کے باوجود شاید تمہیں پہچان لیتی کیونکہ پہلی بار جب میں نے تمہیں اسٹیج پر شائی تن سے مقابلہ کرتے دیکھا تھا تو میرے دل میں کھب کر رہ گئے تھے- تمہارے بارے میں' میں نے جانے کیا کیا خواب دیکھے تھے- ایک لمحے کے اندر اندر تصور ہی تصور میں تمہیں اپنی ذات میں مدغم کرکے جانے کن فضاؤں کی طرف پرواز کر گئی تھی-"

"ان خوابوں میں سے کوئی ایک آدھ ٹوٹا پھوٹا خواب بھی اب اسٹاک میں باقی نہیں رہا کیا؟" میں نے کن انکھیوں سے ایک لمحے کے لیے اس کی طرف دیکھ کر شریر لہجے میں پوچھا-

اس نے اب اپنی طرف کے دروازے سے ٹیک لگا کر جسم ڈھیلا چھوڑ دیا اور خنجر ڈیش بورڈ پر رکھ دیا- پھر اس نے اپنی پی کیپ اتار کر قدرے میلے میلے لیکن ملائم بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے تھکے تھکے لہجے میں کہا..... "نہیں.....اب کوئی خواب باقی نہیں-" میرے لہجے کی شرارت کے برعکس اس کے لہجے میں خمار میں لپٹی ہوئی ایک عجیب سی یاسیت شامل تھی- "وقت نے سارے خواب چھین لیے- ویسے بھی ہم جیسے لوگوں کو خوابوں کی نہیں' مکروہ حقائق کی دنیا میں رہنا ہوتا ہے- وہ تو میں ویسے ہی ذرا دل بہلانے کو خواب دیکھ لیا کرتی تھی- اب ان کی بھی عادت نہیں رہی-"

گرد و پیش پر نہایت بوجھل سا سناٹا چھایا ہوا محسوس ہونے لگا تھا- رات کے سناٹے میں صرف رولز رائس کے انجن کی آواز سوئی ہوئی بلی کی خرخراہٹ کی طرح ابھر رہی تھی یا پھر کبھی کبھار گونجنے والی کسی جھینگر یا گیدڑ کی آواز اس سکوت کو مجروح کر رہی تھی-

"ویسے تم اتنے زیادہ کیوں بدل گئے ہو؟" اس نے کھڑکی کے شیشے پر سر کا پچھلا حصہ ٹکا کر نیم وا آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا..... "مجھے کچھ زیادہ ہی اجنبی اجنبی لگ رہے ہو- نہ جانے میری کونسی حس کہہ رہی ہے کہ تمہیں ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا؟"

"بس.....تغیرات ہیں زمانے کے"..... میں نے مسکرا کر جواب دیا- میں نے اسے یہ جتانے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ میں نے اپنے حلیے میں معمولی سی تبدیلیاں بھی کر رکھی ہیں-

میں نے ایک لمحے توقف کے بعد پوچھا..... "احسان مرزا کا ساتھ چھوڑنے کے بعد کیا کرتی رہی ہو؟"

"بس میں عجیب و غریب زندگی گزارتی رہی- کٹی پتنگ کی طرح ادھر سے ادھر ڈولتی رہی- آوارہ گردی کرتی رہی-" اس نے تھکی تھکی سی طویل سانس لی- "کبھی میں کہیں ملازمت حاصل کر لیتی اور شریفانہ انداز میں شب و روز گزارنے لگتی- اس سے دل بھر جاتا تو **ہپیوں** کے کسی گروہ میں شامل ہو جاتی- اس سے بھی دل اکتا جاتا تو کسی سیٹھ کی دم-

بن جاتی لیکن سیٹھ لوگوں سے میری زیادہ نہیں بنتی تھی کیونکہ وہ جلد ہی محسوس کر لیتے تھے کہ میں کوئی خطرناک چیز ہوں اور شرفاء قسم کے سیٹھ بڑی بے ضرر قسم کی لڑکیوں کو دوست بناتے ہیں۔"

"کبھی میں یونہی کسی آسودہ حال قسم کے بابوؤں سے دوستی بڑھا لیتی اور اس سے اپنا خرچہ بندھوا لیتی۔ اگر یہ سلسلہ بھی ٹوٹ جاتا اور روپے پیسے کی طرف سے میرا ہاتھ بہت تنگ ہو جاتا تو میں فلم کا آخری شو دیکھ کر آنے والوں میں سے کسی کو کسی تاریک گلی میں روک کر اس کی گردن پر خنجر رکھ کر اس کی جیب میں جو کچھ ہوتا' نکلوا لیتی۔ کبھی میں لمبے سفر پر ہوتی اور مجھے کار وغیرہ کی ضرورت ہوتی تو وہ بھی میں اسی طرح لفٹ لے کر کسی سے چھین لیتی اور جب میری ضرورت پوری ہو جاتی تو کہیں چھوڑ دیتی۔"

دفعتاً" وہ عجیب سے انداز میں ہنسی اور خاموش ہو گئی۔ "خاموش کیوں ہو گئی؟" میں نے ایک لمحے کے انتظار کے بعد کہا۔ میں نے پوری کوشش کی تھی کہ میرے لہجے سے خاص تجسس کا اظہار نہ ہو۔

"پھر یہ کہ مجھے عشق ہو گیا اور وہ بھی ایک شکاری سے۔" اس نے پہلو بدل کر ایک بار پھر بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ "بڑا نر آدمی تھا۔ اس کے ساتھ رہ کر مجھے زندگی کارآمد محسوس ہونے لگی۔ ہم اکٹھے شکار پر جاتے۔ **کیمپنگ** کرتے۔ میں گویا بغیر شادی کے اس کی بیوی' بغیر کسی غرض کے اس کی دوست اور بغیر کسی معاوضے کے اس کی اسسٹنٹ بن گئی تھی۔ ایک مدت بعد مجھے کوئی شخص اچھا لگا تھا اور مجھے کئی بار گمان گزرا تھا کہ اب زندگی بس اسی ڈھب سے گزر جائے گی۔ عادت میری یہی ہے کہ جو ہستی اچھی لگتی ہے' اس سے زندگی کا کوئی پہلو خفیہ نہیں رکھتی' اس لیے بھگت سنگھ سے بھی میری کوئی بات پوشیدہ نہیں تھی۔ بھگت سنگھ اسی شکاری کا نام تھا جس کا میں ذکر کر رہی ہوں۔ اس کی نظر میں گویا کسی بات کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اہمیت تھی تو صرف میری۔

"ابھی چند دن پہلے ہم نے وہاں قریب ہی ریشم نگر کے نواح میں کیمپ لگایا جہاں سے تم نے مجھے لفٹ دی ہے۔ وہاں بھگت سنگھ کے بچپن کے دو اور شکاری دوست بھی مل گئے۔ انہوں نے بھی ہمارے قریب ہی خیمہ لگا لیا۔ رات کو انہوں نے ملاقات کا جشن منایا۔ خوب شراب پی۔ بہت سے بھنے ہوئے تیتر کھائے۔ میں اور بھگت سنگھ اپنے خیمے میں چلے گئے۔ دو گھنٹے بعد اچانک بھگت سنگھ نے مجھے کلائی سے پکڑا اور اپنے دوستوں کے خیمے میں لے جا کر بولا...... "سیاں! ہم تو جب بھی شکار پر نکلتے ہیں' اپنا سامان پورا رکھتے ہیں بلکہ خاطرداری کے لیے رات دو رات کی خاطر دوستوں کو ادھار بھی دے دیتے ہیں۔ لو موج کرو۔" یہ کہہ کر اس نے مجھے ان کی طرف دھکیل دیا۔

"میں یکلخت جیسے آسمان سے زمین پر آگری تھی۔ میں تو بھگت سنگھ کو دیوتا بنا کر پوجنے

کی تیاریاں کر رہی تھی' وہ تو دلالوں سے بھی بدترین بن گیا تھا۔ میں ٹکر ٹکر اس کی طرف دیکھنے لگی تو بولا...... "اتنی حیران کیوں ہو رہی ہے؟ تیرے لیے کوئی مشکل کام ہے کیا؟ یا کوئی نئی بات ہے؟"

"سوال تو اس کا برحق تھا لیکن اس گینڈے کے بچے کو یہ معلوم نہیں تھا کہ عورت کا مان بھی کوئی چیز ہوتا ہے۔ اس نے یہ مان توڑ دیا۔ میں صرف اسی کی ہو کر رہنے کا خواب دیکھنے لگی تھی مگر اس نے میرا یہ خواب توڑ دیا تھا۔ میرے ماضی کی وجہ سے مجھے محض ایک پتھر ہی سمجھا تھا کہ ٹھوکر ماری تو ادھر لڑھکا دیا اور ٹھوکر ماری تو ادھر اچھال دیا۔

"بھگت سنگھ نے مجھے دھکا کیا دیا' میرے سینے میں جیسے کوئی چیز چھن سے ٹوٹ کر رہ گئی۔ میں نے اس سے کہا...... "میں تمہاری باندی ہوں' تمہاری خوشی میری خوشی ہے لیکن پہلے اپنے خیمے میں چل کر میری ایک بات سن لو۔" وہ میرے ساتھ خیمے میں پہنچا تو میں نے اڑنگی لگا کر اسے گرایا اور اس کے گلے پر خنجر پھیر دیا۔ پھر میں نے باری باری اس کے دونوں دوستوں کو بھی آواز دے کر بلایا اور انہیں بھی قربانی کے بکروں کی طرح ذبح کر دیا......"

"تم نے ان تینوں کو قتل کر دیا؟" میں نے ہلکی سی حیرت سے کہا۔

"ہاں......فوری طور پر میرا یہی جی چاہا تھا......" اس نے سکون سے جواب دیا۔

"ایک بات بتاؤ **شکنتلا**......!"

"مجھے اب **شکنتلا** مت کہو۔" اس نے میری بات کاٹ دی۔ "یہ نام مجھے اب اجنبی اجنبی سا لگتا ہے اور جب احساس ہوتا ہے کہ مجھے ہی مخاطب کیا جا رہا ہے تو لاکھ بے حس ہو جانے کے باوجود کئی پرانے زخموں کی اذیت جاگ اٹھتی ہے۔

اب میں کیٹی کہلانے کی عادی ہو چکی ہوں۔ اب پوچھو' کیا پوچھنے لگے تھے؟"

"میں یہ پوچھنے لگا تھا کیٹی کہ اگر میں تمہیں اپنی دوست' اپنی ساتھی شمار کرنے لگوں تو تم کس حد تک مجھ سے وفادار ثابت ہو سکتی ہو؟"

"میں اب زندگی میں کسی بھی مرد سے کوئی وعدہ نہیں کر سکتی۔" اس نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔ "لیکن اپنے بارے میں ایک بات میں ضرور جانتی ہوں۔ کچھ عورتیں شہرت کی بھوکی ہوتی ہیں' کچھ محبت کی اور کچھ دولت کی لیکن میں صرف تھوڑی سی عزت کی بھوکی ہوں۔ میں نے دنیا میں سب کچھ دیکھ لیا' ہر چیز سے میرا دل بھر چکا ہے۔ میں نے جو کچھ گنوایا' اس پر مجھے کسی سے کوئی شکوہ نہیں۔ حالات کی مجھے کوئی شکایت نہیں۔ تقدیر سے مجھے کوئی گلہ نہیں۔ کچھ پانے کی کوئی تمنا نہیں۔ شاید میرے اندر مدفون عورت کی کسی رگ میں انا کی کوئی رمق باقی ہے جو مجھے تمام تر لاابالی پن کے باوجود بے چین رکھتی ہے۔ بس اب مجھے تھوڑی سی عزت' تھوڑا سا احترام چاہیے۔ میں چاہتی ہوں کہ میں اب کتوں کے

غول میں پڑی ہوئی ہڈی بن کر نہ رہوں.....کوئی ہو جو بے شک میرے وجود سے اپنا تن من پر چھائے لیکن اس کے صلے میں مجھے صرف عزت دیئے رکھے۔ میری کچلی ہوئی عزت نفس کو مزید نہ کچلے۔ میری ہی نظروں میں مجھے گرائے نہ رکھے۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا.....؟" اس کے لہجے میں الجھن بھی تھی اور ایک موہوم سی امید بھی۔

"خوب سمجھ رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ میرے ذہن کے کل پرزے تیزی سے حرکت کر رہے تھے..... "اور تم مجھے ملی بھی بڑے صحیح وقت پر ہو۔ ایسا وقت جو ہم دونوں ہی کے لیے بہت مناسب ہے۔ میں عام طور پر کسی پر اندھا اعتماد نہیں کیا کرتا لیکن تمہارے معاملے میں' میں جوا کھیل رہا ہوں۔ آج سے تم میرے رفیقوں میں ہو.....اور اپنے رفیقوں کو میں اپنے دست و بازو سمجھتا ہوں۔ میں صرف انہی سے جانثاری کی توقع نہیں رکھتا' خود کو بھی ضرورت پڑنے پر ان پر قربان ہو جانے کے لئے تیار رکھتا ہوں۔"

"مجھے تمہاری بات پر یقین ہے اور میں نے فرض کر لیا ہے کہ مجھے ہر سوال کا جواب مل گیا ہے۔" اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور سیٹ کے خاص ساخت کے پشتے سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ "میں اب سونے لگی ہوں۔ سفر ختم ہو جائے تو مجھے جگا دینا۔"

"سفر اب ختم ہونے ہی والا ہے' اب سونے کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "میں پونا آرہا تھا اور اب ہم پونا کے مضافات میں داخل ہو چکے ہیں۔"

"اوہ....." اس نے تھکے تھکے انداز میں آنکھیں کھول دیں اور میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ زندگی بھر کی جہاں گردی کے باوجود اس کمبخت کا چہرہ کسی لٹے پٹے مسافر کا چہرہ نہیں تھا۔ نہ جانے کتنے ندیدے لٹیروں نے اس خزینہ حسن و کشش کو لوٹا تھا مگر اب بھی اتنا کچھ باقی تھا کہ ایک نظر ڈالنے سے ہوش و خرد کے پاؤں ڈگمگاتے تھے۔ نہ جانے اس گم کردہ راہ لڑکی نے اپنا آپ کیسی بیدردی سے لٹایا تھا مگر خمیر میں دست قدرت نے جو ملاحت جو صباحت گوندھ دی تھی' اسے جدا کرنا شاید کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔

"تمہارا ٹھکانہ آج کل بمبئی میں ہے؟" اس نے پوچھا۔ میں نے سڑک کی طرف دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

"بڑا ذلیل شہر ہے۔" اس نے بلا تامل کہا۔ "لیکن کمبخت کی مٹی میں نہ جانے کونسا مقناطیس چھپا ہوا ہے کہ وہاں کا رہنے والا کہیں بھی چلا جائے' واپس اسی کی طرف کھنچا آتا ہے۔ میں سارا ہندوستان گھومی' مشرقی بنگال بھی چھان مارا۔ نیپال اور تبت تک چلی گئی لیکن گھوم پھر کر وہیں واپس آجاتی تھی۔ اب بھی میرا ارادہ کسی سے کار چھیننے کے بعد پہلے بمبئی ہی کی طرف جانے کا تھا۔ حالانکہ سردست وہاں میرا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔"

"اور میرا حالانکہ سب کچھ ہی بمبئی میں ہے۔" میں نے کہا۔ "پھر بھی جانے کیوں مجھے اپنا آپ وہاں مسافر مسافر لگتا ہے۔ بمبئی جیسے میرے لیے محض ایک پڑاؤ ہے۔ میری منزل

کوئی اور ہے جس کی طرف جلد یا بدیر مجھے جانا ہے۔"

"تم دراصل کوئی اونچی چیز ہو اور کسی لمبے ہی چکر میں ہو۔" وہ ٹانگیں پھیلاتے ہوئے بولی۔ "تمہاری روح ہم جیسوں سے کہیں زیادہ طاقتور ہے اور اتنی ہی مضطرب بھی۔"

میں صرف مسکرا کر رہ گیا۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ جتنی بھی شاطر اور گرگ باراں دیدہ قسم کی شخصیتوں سے میرا واسطہ پڑا تھا' چھوٹتے ہی ان سب نے میرے بارے میں کم و بیش یہی تبصرہ کیا اور یہ وہ سب لوگ تھے جنہیں کسی کو مکھن لگانے کی حاجت یا عادت نہیں تھی۔

اس کے بعد سفر خاموشی سے طے ہوا۔ چند منٹ بعد ہم پونا میں داخل ہوئے اور میں نے ہوٹل شامریس کا رخ کیا۔ شامریس پہنچ کر میں نے ایک ڈی لکس سوئٹ کی فرمائش کی جو ریزرویشن نہ ہونے کے باوجود خوش قسمتی سے مجھے مل گیا۔ کیٹی نے تو سوئٹ کے بیڈ روم میں پہنچتے ہی روم سروس سے اسکاچ وسکی کی ایک بوتل منگوائی اور بے صبری سے دو پیک تیار کر کے پیئے اور دھم سے بستر پر جا گری۔ میں ابھی جوتے بھی نہیں اتار پایا تھا کہ وہ گہری نیند سو گئی۔ اس کے ہونٹ نیم وا تھے اور ناک سے ہلکی خرخراہٹ کی آواز خارج ہو رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک مدت بعد اسے اطمینان اور آرام کی نیند نصیب ہوئی ہے۔

اسے سوتی چھوڑ کر میں کمرۂ نشست میں آیا اور ٹیلی فون اسٹینڈ کے قریب رکھی ہوئی ڈائریکٹری اٹھا کر اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ ڈی ایس پی نرمل داس کے آفس اور گھر کا فون نمبر اور ایڈریس مجھے بغیر کسی دقت کے مل گیا۔ اس کے گھر کے ایڈریس سے مجھے اندازہ ہوا کہ موصوف کو سول لائنز میں بنگلہ ملا ہوا تھا۔ سول لائنز زمانہ طالب علمی میں میرا دیکھا بھالا علاقہ تھا۔

اس کے گھر کا نمبر وغیرہ نوٹ کرنے کے بعد میں کپڑے بدل کر بستر پر جا لیٹا اور کچھ دیر سوچ بچار کرنے کے بعد میں سو گیا۔ صبح دن چڑھے میری آنکھ کھلی۔ کیٹی بدستور بے سدھ سو رہی تھی۔ میں تیار ہو گیا' تب بھی وہ سوتی رہی۔ میں نے اسے جگانا ضروری نہیں سمجھا اور اس کے لیے ایک رقعہ لکھ کر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا کہ جب وہ اٹھے تو ناشتہ وغیرہ منگوا لے' میرا انتظار نہ کرے' تاہم کمرے ہی میں موجود رہے۔

میں نے ناشتہ نیچے ڈائننگ ہال میں آکر کیا اور پھر بازار روانہ ہو گیا۔ میں بمبئی سے کچھ اور سوچ کر چلا تھا لیکن اب نئے حالات کی مناسبت سے میں نے اپنے لائحہ عمل میں کچھ تبدیلیاں کی تھیں اور اس تبدیلی کی وجہ سے میں نے بازار سے کچھ چیزیں خریدیں جن میں ایک فینسی برقع بھی شامل تھا۔

میں ہوٹل واپس آیا تو کیٹی ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر بیڈ پر آڑی ترچھی لیٹی اخبار

پڑھ رہی تھی۔ اس کا لباس گو کہ وہی تھا لیکن صرف غسل کرنے سے ہی گویا اس کی شخصیت بدل کر رہ گئی تھی۔ وہ اس قدر نکھری نکھری تازہ دم اور پرکشش لگ رہی تھی کہ میں ایک لمحے کے لئے اسے سرتاپا دیکھے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ گویا لڑکی نہیں چاندی کا ایک مجسمہ تھی جو کل تک میل کچیل میں لتھڑا ہوا تھا مگر آج کسی ماہر ہاتھ نے جیسے اسے کسی طلسمی محلول سے دھو دھا کر چکا دیا تھا۔ تھکن، اضمحلال اور گزرے ہوئے ظالم لمحوں کے نقش قدم بھی جیسے اس کی شخصیت پر سے یکسر معدوم ہو گئے تھے۔

میں اس کے لیے اندازاً سائز کا تعین کرکے ایک شلوار قمیص اور ایک جینز جیکٹ لے آیا تھا۔ سردست میں نے اسے شلوار قمیص پہننے کے لیے دی۔ پھر میں نے کیٹی کو اس کے حصے کا کام سمجھایا کہ اسے کیا کچھ کرنا ہے۔ اس نے صرف اسے ہی ذہن نشین کیا اور مجھ سے نہیں پوچھا کہ میں کیا کروں گا یا یہ کہ اس سلسلے کا سیاق و سباق کیا ہے یا اس کے بعد کیا ہوگا۔ ہر معاملے میں منجھی ہوئی لڑکی تھی۔ فالتو سوالات نہیں کرتی تھی۔

میری ہدایت کے مطابق پہلے اس نے نرمل داس کے گھر کے نمبر پر فون کیا۔ میں کمرہ نشست کی ایکس ٹینشن پر گفتگو سننے کے لیے موجود تھا۔ دوسری طرف سے ریسیور اٹھانے والی غالباً نرمل داس کی ملازمہ تھی۔ اس نے نہایت کوفت اور اجڈ سے لہجے میں "ہیلو" کہا۔

کیٹی نے انگریزی بولنی شروع کر دی۔ "نرمل داس صاحب کب گھر آئیں گے؟" اس نے شیریں لہجے میں پوچھا۔

"ہندی میں بات کرو بی بی!" دوسری طرف سے عورت نے بدستور اکھڑے اکھڑے لہجے میں کہا۔ "مجھے انگریزی وگریزی نہیں آتی۔"

"تم کون ہو؟ ملازمہ؟" کیٹی نے ہندی میں پوچھا۔

"پتا نہیں کیوں ہر ایک میری آواز سن کر مجھے ملازمہ ہی سمجھتا ہے۔" دوسری طرف سے عورت غالباً اپنی دانست میں بڑبڑائی لیکن یہ بڑبڑاہٹ بھی کچھ کم بلند نہیں تھی۔ "ارے بابا میں نرمل داس کی پتنی ہوں..... گھر والی..... جورو..... بیوی..... سمجھیں؟"

"عام طور پر وہ کس وقت گھر آتے ہیں؟" کیٹی نے پوچھا۔

"اس کا گھر آنے یا گھر سے جانے کا کوئی وقت مقرر نہیں، ویسے رات دس بجے سے پہلے بہرحال وہ زندگی میں کبھی گھر نہیں آیا....." نرمل داس کی بیوی نے کہا۔ پھر اس کے لہجے میں ہلکا سا شک آمیز تجسس در آیا۔ "کیا کام تھا تمہیں اس سے؟"

"وہ جی بس..... جائیداد کا ایک جھگڑا ہے....." کیٹی نے گویا جھجکتے ہوئے کہا۔ "میں رات نرمل صاحب سے آکر ملوں گی۔ مجھے ان کے ایک دوست نے ان سے رابطہ قائم کرنے کے لیے کہا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ نرمل صاحب چٹکی بجاتے ہی میرا مسئلہ طے کروا دیں گے....."

"کیوں نہیں، کیوں نہیں....." نرمل کی بیوی نے چہکتے ہوئے لہجے میں کہا..... "اسے اس کا حصہ مل جائے تو وہ واقعی چٹکی بجاتے ہی کام کر دیتا ہے..... خاص کر جوان اور خوبصورت مصیبت زدہ عورتوں کے کام آنے کا تو اسے زبردست شوق ہے۔" آدھی آدھی رات کو اٹھ کر ان کے ساتھ چل دیتا ہے۔" نرمل کی بیوی نے گویا مزید گفتگو کی ضرورت محسوس نہ کرتے ہوئے ریسیور رکھ دیا۔

پھر میں نے بیڈ روم میں بھی ریسیور کے رکھے جانے کی آواز سنی۔ ساتھ ہی کیٹی کا قہقہہ سنائی دیا۔ "بیچاری بہت ہی دکھیا معلوم ہوتی ہے۔" وہ وہیں سے باآواز بلند بولی۔

میں ایکس ٹینشن کا ریسیور رکھ کر بیڈ روم میں اس کے پاس پہنچا۔ رات ہونے کو ہے۔ میں ایک چھوٹا سا کام کر آؤں، تم تیار رہنا۔ میرے واپس آتے ہی ہمیں نرمل داس سے ملاقات کے لیے روانہ ہونا ہوگا۔"

"میں تمہیں تیار ملوں گی۔" اس نے ادھ کھلی آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ میرا دل پھر بے ایمان ہونے لگا تھا لیکن سر کو جھٹک کر میں سنگھار میز کی طرف بڑھ گیا۔

میں نے آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ میرا معمولی سا تبدیل شدہ حلیہ بدستور برقرار تھا۔ میں نے ابھی تک کیٹی کو احساس نہیں ہونے دیا تھا کہ میں نے اپنے حلیے میں کچھ تبدیلیاں کر رکھی ہیں۔ مطمئن ہو کر میں سوئٹ سے نکل آیا۔

گاڑی میں بیٹھ کر میں چاندنی چوک کی طرف چل دیا۔ دلی کے چاندنی چوک کی طرح پونا کا چاندنی چوک کوئی بارونق یا مصروف جگہ نہیں تھی۔ یہ ایک متوسط سی کالونی کا چوراہا تھا۔ پونا میں رہنے کے دوران وہاں سے آتے جاتے میں نے کبھی دھیان نہیں دیا تھا کہ وہاں کوئی شراب خانہ موجود ہے یا نہیں لیکن آج میں نے وہاں پہنچ کر ابھی چورنگی کے گرد چکر بھی مکمل نہیں کیا تھا کہ ایک گلی کے کونے پر مجھے "چارلیز" کا نیون سائن نظر آ گیا۔

چارلی کے بار کی بغلی دیوار کے ساتھ پارکنگ کے لیے خاصی جگہ موجود تھی۔ گاڑی پارک کرکے میں بار میں داخل ہوا تو میرا خیال یہی تھا کہ وہ کوئی معمولی درجہ کا شراب خانہ ہوگا لیکن اندر پہنچ کر میری یہ غلط فہمی دور ہو گئی۔ شراب خانے کی آرائش میں نہایت بیش قیمت سامان استعمال کیا گیا تھا۔

ہال کے آخر میں ایک گوشے میں مجھے ایک میز پر ایک سگریٹ کا سلگتا ہوا سرا نظر آیا جسے ایک انگلی بار بار مضطربانہ انداز میں چھو رہی تھی۔ مدن نے مجھے بتایا تھا کہ وشنو بے خیالی کے سے عالم میں بار بار انگلی سے سگریٹ کا گل جھاڑتا رہتا ہے۔ میں سیدھا اس میز کی طرف بڑھ گیا۔

اب میری آنکھیں مدھم روشنی سے مانوس ہو چکی تھیں اور جب میں کرسی کھینچ کر اس

شخص کے سامنے بیٹھ چکا تھا تو مجھے اس کی صورت بھی کافی حد تک صاف نظر آگئی۔ مدن کی بتائی ہوئی دیگر نشانیاں بھی اس میں موجود تھیں۔ وہ دبلا پتلا طویل القامت اور سانولا تھا۔ بال کی مدھم روشنی میں سیاہ فام ہی نظر آرہا تھا اور اس کی آنکھوں کی سرخی کچھ اور بھی گہری لگ رہی تھی۔

"مجھے مدن نے بھیجا ہے۔" میں نے سرگوشی نما لہجے میں کہا۔

"اوہ!" اس کے ہونٹوں سے اتنی ہلکی آواز نکلی جو بمشکل سنی جا سکتی تھی اور میں نے محسوس کیا کہ اس کے جسم پر چھایا ہوا تناؤ دور ہو گیا ہے۔

"کیا پیو گے؟" اس نے دوستانہ لہجے میں کہا۔

"ٹھنڈا پانی"......میں نے جواب دیا۔

"اس میں کچھ ملاؤ گے نہیں؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں......میں ہر چیز خالص پینا پسند کرتا ہوں۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"کیا کام ہے......بولو؟" اس نے مدھم اور سپاٹ لہجے میں کہا اور کچھ آگے کو جھک آیا۔

"یہاں نہیں....." میں نے محتاط انداز میں چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "باہر چلتے ہیں۔ گاڑی میں بیٹھ کر آوارہ گردی کریں گے اور ساتھ ساتھ بات بھی طے کر لیں گے۔"

"میں یہ ختم کر لوں۔" اس نے گلاس اٹھاتے ہوئے کہا۔ اس نے گلاس ایک ہی سانس میں خالی کر دیا اور ہم اٹھ کر باہر آگئے۔

"مدن آج کل غائب کہاں ہے؟" اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اس وقت بمبئی کے ایک عالیشان بنگلے میں ایک لونڈیا کے ساتھ بیٹھا ہوگا۔" میں نے جواب دیا۔

وہ جیسے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے بولا۔ "تمہیں مجھ سے کس نوعیت کا کام ہے؟ گولی کا، خنجر کا، تیزاب کا یا آتشزنی کا؟"

"بتاتا ہوں، ایسی جلدی بھی کیا ہے۔" میں نے کہا....ذرا شہر کی بھیڑ بھاڑ سے تو کہیں دور نکل چلیں....." پھر جیسے مجھے کچھ یاد آگیا۔ "ویسے تم نے اس لڑکی کے بارے میں بڑی صفائی کا مظاہرہ کیا تھا....وہی جس پر ریلوے سٹیشن پر تیزاب پھینکا تھا۔"

"وہ....ہاں....." اس نے مدھم مگر سفاکانہ سا قہقہہ لگایا۔ "اس کام میں لطف بھی کچھ زیادہ ہی آیا تھا۔ لڑکی بہت زیادہ خوبصورت تھی نا.....اور چیز جتنی زیادہ حسین ہو، اسے بگاڑنے یا مٹانے میں اتنا ہی زیادہ مزا آتا ہے مجھے....." وہ اپنے پتلے پتلے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔ میں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ وہ بظاہر سڑک کی طرف دیکھ رہا تھا مگر چشم تصور سے اسی منظر سے محظوظ ہو رہا تھا۔ اس لمحے میرا جی چاہا کہ وہیں گاڑی روک کر

اس بدبخت کو ککڑی کی طرح درمیان سے توڑ دوں لیکن پھر میں نے اپنے آپ کو سمجھایا۔ "جذباتیت تمہارے لیے ممنوع ہے برخوردار! صبر و سکون سے چلتے رہو۔"

کچھ دیر بعد ہم نہر کے کنارے پہنچ گئے۔ سڑک نہر کے کنارے کنارے تین چار فٹ کی بلندی پر تھی جس پر اس وقت آمد و رفت نظر نہیں آرہی تھی کیونکہ یہ سڑک محض دیہات کو آپس میں ملاتی تھی۔ ایک طرف درختوں کی قطار اور دوسری طرف نہر کی موجودگی نے اس تنگ سی سڑک کو بے حد خوبصورت بنا دیا تھا لیکن دو میل آگے جا کر یہ سڑک پگڈنڈی میں تبدیل ہو گئی تھی اور اس کے ایک کنارے پر جا بجا گھنے درختوں کے بڑے بڑے جھنڈ موجود تھے۔ اس علاقے سے کبھی کبھار کسی لرزہ خیز جرم کی بازگشت سنائی دے جاتی تھی۔ اس ویرانے میں درختوں کے ان بڑے بڑے جھنڈوں میں جرائم پیشہ لوگ ایسا ڈرامہ کھیل جاتے تھے جو عرصے تک زبان زد عام رہتا تھا۔ اسی لیے شرفاء سیر یا چہل قدم کی غرض سے بھی اس سڑک کا رخ نہیں کرتے تھے۔

ایسے ہی ایک جھنڈ کے قریب میں نے گاڑی روکی اور وشنو کو ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور خود اپنا بریف کیس اٹھائے ہوئے جھنڈ کی طرف چل دیا۔

ہم آمنے سامنے دو پتھروں پر بیٹھ چکے تو میں نے بریف کیس ایک طرف رکھتے ہوئے وشنو کی سرخ سرخ آنکھوں میں جھانکا اور یکلخت گویا کوئی غیر مرئی فرد جرم پڑھتے ہوئے کہا۔ "وشنو! اس وقت تم میرے ذاتی بیت الانصاف میں موجود ہو اور میں تمہیں محض تھوڑی سی دولت کی خاطر ایک بے گناہ لڑکی کا چہرہ تیزاب سے مسخ کرنے کے جرم میں موت کی سزا سناتا ہوں۔ میں تمہیں موت سے زیادہ اذیت ناک سزا دے سکتا تھا لیکن میں صرف اس لیے یہ سزا تجویز کر رہا ہوں کہ اس لڑکی کا چہرہ درست ہونا ممکن ہو گیا ہے۔ اگر یہ کام ناممکن ہوتا تو تمہاری سزا موت سے بھی زیادہ اذیت ناک ہو جاتی۔"

وہ ایک ٹک میری طرف دیکھ رہا تھا اور میرے الفاظ گویا اس کی سماعت سے بالا ہی بالا گزر رہے تھے۔ اس نے فوری طور پر کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا، تاہم اس کی آنکھوں میں ہلکے سے تمسخر کی چمک جھلک آئی تھی۔

"یہ کس قسم کا مذاق ہے یا کسی فلمی خدائی فوجدار کے مکالمے؟" اس نے پلکیں جھپکائے بغیر سنجیدگی سے پوچھا۔

"میں نے تمہارے لیے موت کا یہ طریقہ تجویز کیا ہے کہ" میں نے گویا اس کے سوال پر دھیان دیئے بغیر بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "تمہیں ذبح کرکے تمہاری لاش کے ٹکڑے کر کے نہر میں بہا دیئے جائیں۔ اب تم آرام سے آکر ادھر گھاس پر لیٹ جاؤ اور زیادہ اچھل کود مت مچانا تاکہ میرے کپڑے وغیرہ خراب نہ ہوں۔"

میں نے بازو کو ہلکا سا جھٹکا دیا اور میرا خنجر آستین سے پھسل کر میرے ہاتھ میں آگیا۔

وشنو نے اب بھی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ وہ بدستور پلکیں جھپکائے بغیر میری طرف دیکھ رہا تھا' تاہم میں اس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں تشویش کی ہلکی سی لہر نمودار ہوتے دیکھ رہا تھا۔

"تم پاگل تو نہیں ہو؟" اس نے پہلے سے زیادہ سنجیدگی سے کہا۔

"ہاں.....اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کے سلسلے میں میری سنجیدگی میرے شکار کو پاگل پن ہی محسوس ہوتی ہے لیکن صرف چند لمحوں کے لیے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر میں اٹھا اور خنجر ہاتھ میں تھامے اس کے قریب پہنچا۔ اس کا بدستور ساکت بیٹھے رہنا مجھے کچھ عجیب لگ رہا تھا۔

دفعتاً اس نے دونوں پاؤں جوڑ کر اتنی پھرتی سے میرے پیٹ پر مارنے کی کوشش کی جس کی میں اس سے توقع نہیں کر رہا تھا۔ اس کی ٹانگوں کی یہ حرکت ایسی ہی تھی جیسے حد سے زیادہ کھنچا ہوا ربر کا فیتہ اچانک ہی اپنی بندش سے نکل گیا ہو۔

میں نے اپنے آپ کو بچا تو لیا لیکن میری کلائی پر وشنو کے جوتے کے تلے سے خاصی زوردار چوٹ لگی اور خنجر پر میری گرفت اتنی ہلکی پڑ گئی کہ میں نے اسے چھوڑنا ہی بہتر سمجھا۔ وہ اس وقت تک اچھل کر سیدھا ہونے کے بعد مجھ پر چھلانگ بھی لگا چکا تھا۔ شراب کا نشہ اس پر اتنا غالب نہیں تھا جتنا میں سمجھ رہا تھا اور اس کا مجہول جسم بھی لچک' طاقت اور پھرتی سے اتنا عاری نہیں تھا جتنا میں سمجھ رہا تھا۔

اس کے گھٹنے میرے پیٹ سے ٹکرائے اور ساتھ ہی ایک بازو آکٹوپس کے بازو کی طرح میری گردن کے گرد لپٹ گیا۔ اسے اتنا موقع محض میرے اندازوں کی غلطی کی بنا پر ملا تھا۔ پیٹ پر اس کے گھٹنوں کی ضرب نے مجھے زیادہ تکلیف نہیں پہنچائی تھی البتہ گردن کے گرد لپٹے ہوئے بازو کا شکنجہ حیرت انگیز طور پر سخت تھا اور سانس روکنے کے ساتھ ساتھ گویا میری گردن بھی توڑنے ہی والا تھا۔

غالباً ایک سیکنڈ کے لیے میں نے اپنے آپ کو بدحواس بھی محسوس کیا۔ ایک شخص جسے انسان نے چوہے سے زیادہ حقیر سمجھا ہو' ایک لخت عفریت کی طرح جان کو آجائے تو ایسا محسوس ہونا فطری بات تھی۔ تب میں نے جھرجھری سی لی۔ ازسرنو اپنی توانائی مجتمع کی اور اس سانڈ کی طرح جسم کو جھٹکا دیا جس کی گردن سے کتا لپٹ گیا ہو۔ وشنو دور جا گرا۔ میں نے گردن کو ہلکا سا جھٹکا دے کر کھنچاؤ دور کیا اور عین اس وقت جبکہ وشنو زمین سے اٹھ کر دوبارہ مجھ پر چھلانگ لگانے کے لیے پاؤں زمین سے اٹھا چکا تھا' میں نے اس کی پسلیوں پر ٹھوکر رسید کی۔ وہ کچھ اپنے زور میں اور کچھ میری ٹھوکر کی وجہ سے ہوا میں خاصا اونچا اچھلا اور چاروں شانے چت زمین پر گرا۔

پھر یکلخت وہ ذبح کیے ہوئے بکرے کی طرح چیخنے لگا' شاید ریڑھ کی ہڈی میں درد کی لہر

اب اٹھی تھی۔ اس کا منہ بند کرنے کے بعد میں نے اس کے سینے پر گھٹنا رکھ کر اس کے ہونٹوں پر اچھی طرح ٹیپ چپکائی اور اسے چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

وہ زخمی سانپ کی طرح جسم کو بل دینے کی کوشش کر رہا تھا لیکن شاید کمر اجازت نہیں دے رہی تھی۔ اس کی پیشانی اور گردن پر کئی رگیں مسلسل پھول پچک رہی تھیں۔

"تم نے اپنی موت کو مزید تکلیف دہ بنا لیا وشنو!" میں نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا۔ "ابھی ابھی جبکہ میں تمہارے ہاتھ پاؤں باندھ رہا تھا تو تمہاری سزا پر عمل درآمد کا ایک اور طریقہ اچانک میرے ذہن میں آگیا۔ اب میں تمہیں ایک اور جگہ لے چلتا ہوں۔ اگر اس طریقے پر عمل درآمد نہ ہو سکا تو پھر تمہیں واپس لا کر ذبح کر دوں گا۔"

اس نے بے بسی سے سر کو دائیں بائیں جھٹکے دیئے لیکن میں نے مزید کچھ کہے بغیر اسے گود میں اٹھایا اور گاڑی میں پچھلی سیٹ پر ڈال دیا۔ میں دروازہ بند کرنے لگا تو اس نے بندھی ہوئی ٹانگیں دروازے میں پھنسانے کی کوشش کی۔

"اب اتنا کس لئے مچل رہے ہو۔ اگر اب جسم کے کسی حصے کو جنبش دی تو میں اسے توڑ دوں گا۔" میں نے اسے تنبیہہ کی۔

میں نے جھٹکے سے دروازہ بند کیا۔ واپس جھنڈ میں آکر اپنا بریف کیس اور خنجر اٹھایا' کپڑے جھاڑے اور گاڑی میں بیٹھ کر پل کی طرف روانہ ہوگیا۔



پل کے پار ایک بہت بڑا شمشان تھا جہاں ہندو اپنی ارتھیوں کو نذر آتش کیا کرتے تھے۔ شمشان کا نگراں بھی اندر ہی ایک جھونپڑی میں رہتا تھا۔

میں جب شمشان پر پہنچا تو گیٹ میری توقع کے مطابق کھلا ہی تھا۔ میں نے گاڑی باہر ہی ایک طرف درختوں کی اوٹ میں چھوڑ دی اور دروازے مقفل کرکے اتر آیا۔ شمشان کے اندر مجھے نگراں کی جھونپڑی کی تلاش میں کافی دور تک چلنا پڑا۔ جا بجا لکڑیوں کے اونچے چوکور انبار دیوپیکر ہیولوں کی طرح راستہ روکے کھڑے تھے اور ان کے درمیان ہوا یوں سرسرا رہی تھی جیسے نذر آتش ہو جانے والے جسموں کی روحیں کسی جائے پناہ کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹک رہی ہوں۔

بعض انبار جن پر ارتھیاں جلائی جا چکی تھیں اور مردے کی راکھ گنگا جل میں بہانے کے لیے لے جائی جا چکی تھی، ان کے موٹے موٹے کوئلوں کے ڈھیر ابھی تک بکھرے پڑے تھے۔ کبھی کبھار کوئی کوئلہ میرے پاؤں تلے آکر چیخ جاتا تھا تو رات کے گہرے سکوت میں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کسی عفریت نے کوئی ہڈی چبا ڈالی ہو۔

جھونپڑی کے قریب پہنچ کر میں نے دیکھا کہ دروازہ بند تھا البتہ بغلی دیوار میں موکھلا نما ایک کھڑکی کھلی تھی۔ میں نے احتیاط سے اس کے اندر جھانکا۔ میرے سامنے چارپائی پر ایک قوی ہیکل دھوتی پوش جوان نہایت بے ہودہ طریقے سے جھلنگا سی چارپائی پر اوندھا لیٹا تھا۔ اس کے منہ سے رال بہہ بہہ کر تکیے میں جذب ہو رہی تھی۔ چارپائی کے قریب ہی ایک کونڈی، سوٹا اور مٹی کا بڑا سا پیالہ پڑا ہوا تھا۔ کونڈی میں یقیناً بھنگ گھوٹی گئی تھی جو ابھی کافی مقدار میں باقی تھی۔ چارپائی پر نگراں موصوف بھنگ پی کر دنیا و مافیا سے بے خبر لیٹے ہوئے تھے۔ میں نے اطمینان کی سانس لی۔ کچھ کیے بغیر ہی مسئلہ حل ہو گیا تھا۔

جھونپڑی کے قریب ہی مٹی کے تیل کا ایک ڈرم رکھا تھا جس میں پیتل کی ٹونٹی لگی ہوئی تھی اور تیل نکالنے کے لیے ایک ڈبا بھی پاس ہی پڑا تھا۔ میں نے اطمینان سے ڈبا تیل سے بھرا اور جھونپڑی سے دور نکل آیا۔ میں نے لکڑیوں کا ایک انبار تلاش کیا جو میرے مقصد کے لیے موزوں تھا۔ یہ انبار نہ تو جھونپڑی سے زیادہ قریب تھا اور نہ چار دیواری سے۔ میں نے اس کے نچلے حصے پر اچھی طرح تیل چھڑکا اور ڈبا وہیں پھینک کر شمشان سے

باہر آگیا۔ گاڑی سے وشنو کو نکال کر میں نے بریف کیس سے اپنے ہنگامی سامان سے ایک لائٹر نکالا اور وشنو کو گود میں اٹھا کر شمشان میں لے آیا۔

اب وہ یقیناً میرا مقصد سمجھ چکا تھا۔ پہلے اس نے میری گرفت میں مچلنے کی کوشش کی مگر پھر شاید اس کی کمر کی تکلیف حد سے بڑھ گئی یا دہشت کی زیادتی نے اسے مفلوج سا کر دیا کہ وہ بالکل بے حس و حرکت ہو گیا۔ اس کی ٹانگیں بے جان سے انداز میں جھول رہی تھیں۔

لکڑیوں کا جو انبار میں نے منتخب کیا تھا، اس کے قریب لا کر میں نے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر وشنو کو ہاتھوں پر اٹھا کر اوپر لٹایا تب اس کے جسم میں گویا زندگی عود کر آئی اور اس نے زور لگا کر اوپر سے لڑھکنے کی کوشش کی لیکن میں نے اس کے منہ پر نفرت بھرا گھونسا رسید کرکے اسے دوبارہ چبوترا نما انبار کے وسط میں پہنچا دیا۔ پھر میں نے انبار پر سے ایک بڑی سی لکڑی اٹھا لی اور لائٹر سے آگ دکھا کر کچھ پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ لکڑی میں نے اسی خیال سے پکڑ رکھی تھی کہ اگر وشنو نے دوبارہ لڑھکنے کی کوشش کی تو اسے دور ہی سے واپس دھکیل دوں گا مگر اس میں شاید سکت نہیں رہی تھی یا وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ میری خواہش یہی تھی کہ وہ ہوش میں ہوتا اور شعلوں کو اپنا جسم چاٹتے کچھ دیر کے لیے ہی سہی، اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا۔

شعلے بلند ہوتے گئے۔ تیل آلود خشک لکڑیوں نے اتنی تیزی سے آگ پکڑی کہ میں حیران رہ گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وشنو کا جسم سرخ اور نارنجی شعلوں میں چھپ گیا۔ میں نے مزید وہاں رکنا ضروری نہ سمجھا۔

ہوا میں گوشت جلنے کی بو پھیل چکی تھی جو مجھے بے حد فرحت بخش محسوس ہو رہی تھی۔

گاڑی میں بیٹھتے وقت میں نے گھڑی دیکھی، گیارہ بج رہے تھے۔ مجھے بہت تاخیر ہو چکی تھی۔ میں کیٹی کو دس بجے کا وقت دے کر آیا تھا، میں تیز رفتار سے ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔

ہوٹل کے کمرے میں پہنچ کر مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ کیٹی سر کے بل بیڈ پر دیوار کے سہارے کھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ورزش......" اس نے آنکھیں کھولے بغیر جواب دیا۔

"یہ کونسا وقت ہے ورزش کا؟" میں نے کہا۔

"میں چونکہ وقت کی پابندی نہیں کر سکتی۔" وہ سیدھی ہوتے ہوئے بولی۔ "اس لیے جب بھی وقت ملتا ہے، کر لیتی ہوں۔ ویسے بھی تمہارا انتظار کرتے کرتے نیند آنے لگی

تھی۔ میں نے سوچا سو ہی نہ جاؤں۔"

"چلو.....اب فوراً نکل چلو۔" میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

اس نے چند سیکنڈ میں بال برش کیے اور ہینڈ بیگ اٹھا کر میرے پیچھے چل دی۔ سول لائنز جاتے ہوئے راستے میں کیٹی نے برقع پہن لیا اور چہرہ اس طرح نقاب میں چھپا لیا کہ صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ سول لائنز میں مطلوبہ نمبر کی کوٹھی تلاش کرنے میں ہمیں قدرے دقت پیش آئی کیونکہ درختوں سے گھرے ہوئے بل کھاتے راستوں پر روشنی نہیں تھی اور بیشتر کوٹھیاں بھی اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

مطلوبہ کوٹھی تلاش کرنے کے بعد میں نے گاڑی اس سے کچھ فاصلے پر کھڑی کی اور ایک کھڑکی کے قریب پودوں کے درمیان پوزیشن سنبھالی ہی تھی کہ اندر سے ایک بھاری اور کھردری مردانہ آواز سنائی دی۔ "آج تو دن مندا رہا بھگوان! صرف اڑھائی ہزار روپے کی اوپر کی آمدنی ہوئی ہے.....ایک تو آج کل مرغے پھنستے بہت کم ہیں' اوپر سے حصے بخرے زیادہ نکلنے لگے ہیں....."

میں نے کھڑکی کے پٹوں کے درمیان معمولی سی جھری سے جھانک کر دیکھا۔ ایک بھاری بھرکم شخص جو یقیناً نرمل داس تھا' پولیس کی وردی اتار رہا تھا۔ چوڑے سے سپاٹ چہرے اور بھری ہوئی ناک والی ایک ادھیڑ عمر عورت جس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی یاسیت تھی' اسے وردی اتارنے میں مدد دے رہی تھی۔ وہ یقیناً اس کی بیوی تھی۔ وہ قد میں میاں سے بھی نکلتی ہوئی تھی اور بے حد چوڑے چکلے جسم کی مالک تھی۔

کیٹی نے میرا سگنل پا کر کال بیل بجا دی۔ نرمل داس چونک اٹھا' اس کی آنکھوں میں اس درندے کی سی چمک ابھر آئی جس نے شکار کی بو سونگھ لی ہو۔ اس کی بیوی نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی اور نرمل داس اس کی طرف دیکھے بغیر کمرے سے نکل گیا۔

میں اندھیرے میں دیوار کے ساتھ چپک کر چلتا ہوا اس کونے تک آ پہنچا تاکہ سر ذرا آگے کو نکال کر دروازے کو دیکھ سکوں۔ کیٹی سر جھکائے دروازے پر کھڑی تھی۔ دفعتاً" دروازہ کھلا' نرمل داس نے محتاط انداز میں پہلے سر نکال کر باہر جھانکا۔ پھر ایک تنہا برقع پوش لڑکی کو دیکھ کر جلدی سے باہر آ گیا۔

"کیا بات ہے؟ کون ہو تم؟" اس نے بارعب لہجے میں پوچھا۔

"میرا نام رشیدہ ہے۔" کیٹی نے رومال انگلیوں پر لپیٹتے اور کھولتے ہوئے اور یوں اضطراب کی نہایت کامیاب اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے مدن نے آپ کے پاس بھیجا ہے.....اس نے کہا تھا کہ جس قسم کے جھگڑے میں' میں پھنس گئی ہوں' اس میں صرف آپ ہی میری مدد کر سکتے ہیں کیونکہ آپ بڑے دھڑلے کے آدمی ہیں....."

"کیا معاملہ ہے؟" نرمل داس کے لہجے کی سختی برقرار تھی۔

"تفصیل تو میں دوسرے فریق کے سامنے چل کر ہی بتاؤں گی کیونکہ وقت بہت قیمتی ہے۔ اگر آپ نے اس شخص کو نہ روکا جس سے میرا جھگڑا ہے تو آج رات چند گھنٹے بعد وہ یہاں سے بمبئی اور وہاں سے علی الصبح بذریعہ جہاز لندن روانہ ہو جائے گا اور پھر یہ معاملہ مہینوں آگے جا پڑے گا۔ لاکھوں کی جائیداد کا مسئلہ ہے اور کرنا صرف اتنا ہے کہ اس شخص سے ایک دستاویز واپس لینی ہے جس پر اس نے دھوکے سے میرے دستخط کروا لیے تھے۔"

"کون ہے وہ شخص؟" نرمل داس نے اب قدرے نرمی سے پوچھا۔

"میں نے فون پر آپ کی بیگم کو بھی بتایا تھا۔ شاید انہوں نے آپ کو نہیں بتایا۔" کیٹی نے نہایت مضطربانہ لہجے میں کہا۔ "رینالڈو اسٹیٹ ایجنسی کے نام سے کاروبار کرتا ہے۔ امیر شاہ نام ہے اس کا......"

"اوہ...." نرمل داس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"آپ جانتے ہیں اسے؟" کیٹی نے نہایت کامیابی سے اپنے لہجے میں امید کا تاثر پیدا کیا۔

"کسی حد تک....." نرمل داس نے جواب دیا اور ایک مونچھ کو پرخیال انداز میں بل دیتے ہوئے کیٹی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ "تمہیں مدن نے بھیجا ہے.....دوست ہو اس کی؟"

"یہی سمجھ لیجیے....." کیٹی نے نظریں جھکا کر جواب دیا۔

"تم اگر ذرا پہلے آ جاتیں تو بڑی آسانی رہتی۔" نرمل داس نے گال کھجاتے ہوئے کہا "میں اب سرکاری گاڑی بھی کوتوالی واپس بھیج چکا ہوں اور وردی بھی اتار چکا ہوں۔"

"گاڑی تو میرے پاس ہے۔" کیٹی نے اس سمت میں اشارہ کیا جہاں گاڑی اندھیرے میں کھڑی تھی۔ "میں گاڑی سے اتر کر آپ کا گھر تلاش کر رہی تھی۔ باقی رہی وردی کی بات تو میرے خیال میں اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ وردی کے بغیر بھی آخر آپ ڈی ایس پی رہیں گے.....اور پھر آپ امیر شاہ کو جانتے ہیں تو یقیناً وہ بھی آپ کو جانتا ہی ہو گا۔"

"ہاں میری جان!" دفعتاً" نرمل داس نے ٹھنڈی سانس لے کر بدلے بدلے لہجے میں کہا۔ "امیر شاہ مجھے اچھی طرح جانتا ہے.....بلکہ آدھا شہر مجھے اچھی طرح جانتا ہے لیکن شاید تم مجھے بالکل نہیں جانتیں ورنہ اتنی بچکانہ کہانی لے کر کبھی میرے پاس نہ آتیں۔ میری بدقسمتی یا شاید خوش قسمتی یہ ہے کہ میں شکل سے بڑا بے وقوف لگتا ہوں لیکن ایسا ہے نہیں۔ میں نے پولیس کے محکمے میں چودہ سال بھاڑ جھونکتے نہیں گزارے....." یہ کہہ کر وہ خباثت بھرے انداز میں مسکرایا اور نہایت ہی غیر متوقع طور پر اس نے اپنے بھاری بھرکم جثے کی مناسبت سے قطعی ناقابل یقین پھرتی کے ساتھ کیٹی کو کلائی سے پکڑ کر اندر گھسیٹ

لیا۔

دروازہ ایک دھماکے سے بند ہو گیا۔ کیٹی کی اضطراری سی چیخ مجھے ادھوری ہی سنائی دی کیونکہ اس دوران دروازہ بند ہو گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس کی آواز معدوم ہو گئی تھی۔ ایک لمحے کے لیے میں جیسے خالی الذہن سا ہو گیا۔ مجھے یوں بازی پلٹنے کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ اپنی دانست میں' میں نے بڑا مضبوط جال پھیلایا تھا۔ مجھے مسلسل چند ایسی کامیابیاں نصیب ہوئی تھیں کہ شاید میں تصویر کا دوسرا رخ دیکھنا بھول گیا تھا۔

یک لخت گویا ہوش میں آکر میں دروازے کی طرف لپکا اور ہینڈل گھمایا لیکن میرے اندیشے کے عین مطابق دروازہ مقفل ہو چکا تھا۔ میں دیوانوں کی طرح قلانچیں بھرتا اس کھڑکی کی طرف واپس آیا جس سے میں اندر جھانک رہا تھا کہ شاید نرمل داس کیٹی کو وہیں لائے گا لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کمرے کی بھی بتی بجھ چکی تھی اور اندر نرمل داس کی بیوی کی موجودگی کے بھی آثار محسوس نہیں ہو رہے تھے۔

پوری کوٹھی پر اندھیرا اور سکوت چھایا ہوا تھا۔ صورتحال بالکل ایسی ہی تھی جیسے سمندر سے سر نکال کر کسی خونخوار مگرمچھ نے اچانک ہی اپنے شکار کو دبوچا ہو اور آن واحد میں دوبارہ سمندر کی تہہ میں اتر گیا ہو اور سمندر کی سطح بالکل پہلے ہی کی طرح پرسکون ہو گئی ہو۔ میرے جسم میں سرد سی لہریں دوڑنے لگیں۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟

کھڑکی میں چونکہ سلاخیں لگی ہوئی تھیں' اس لیے میں ایک بار پھر دروازے کی طرف دوڑا۔ میں نے دروازے پر ہی طاقت آزمائی کا فیصلہ کیا۔

کرکٹ کے بولر کی طرح میں نے برآمدے کے کنارے پر پہنچ کر اسٹارٹ لیا اور بپھرے ہوئے سانڈ کی طرح اپنا بایاں کندھا پوری قوت سے دروازے سے ٹکرایا۔ ایک بار تو گویا سامنے کی دیوار ہی لرز کر رہ گئی۔ دروازے کے قبضے بھی شاید ذرہ برابر ڈھیلے ہوئے تھے لیکن اس عمل میں "دھم" کی خاصی زوردار آواز پیدا ہوئی تھی۔

میں اس وقت چوتھی بار دروازے کو ٹکر لگانے کے لیے اسٹارٹ لے رہا تھا' جب میں نے محسوس کیا کہ اندر بتیاں روشن ہونے لگی ہیں۔ میں نے چوتھی ٹکر تو بہرحال رسید کر ہی دی اور ساتھ ہی ریوالور جیکٹ کی جیب سے نکال کر دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

"دھیرج.....میری جان دھیرج!" میں نے دروازے کے عقب سے کیٹی کی سرگوشی سنی۔ "پوری کالونی کو جگاؤ گے کیا؟"

دروازہ اب کھڑکھڑانے لگا تھا اور مجھے پوری امید تھی کہ چھٹی یا ساتویں ٹکر پر تالا اپنے فریم سے ہی نکل جائے گا۔ کیٹی کی سرگوشی سن کر میری جان میں جان آئی۔ دوسرے ہی لمحے دروازہ کھل گیا اور باہر تک روشنی پھیل گئی۔ کیٹی میرے سامنے کھڑی اطمینان سے

مسکرا رہی تھی۔ حالانکہ میرے خیال میں اسے اپنی حالت کے پیش نظر تو مسکرانا نہیں چاہیے تھا۔

اس کے برقعے کا بالائی حصہ غائب تھا اور نچلے حصے کے بھی تمام بٹن ٹوٹے ہوئے تھے اور وہ کئی جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ کیٹی کے چہرے پر خون کے چھینٹے تھے اور وہ اپنا خون آلود خنجر پھٹے ہوئے برقعے سے صاف کرکے اپنی شلوار کا پائنچہ اٹھا کر ٹانگ پر بندھے ہوئے چھوٹے سے چرمی نیام میں رکھنے لگی تھی۔

"کیا ہوا؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"آکر خود دیکھ لو....." وہ سیدھی کھڑی ہوتے ہوئے بولی اور میرا ہاتھ تھام کر ایک چھوٹے سے ڈربہ نما کمرے میں لے گئی جہاں کوئی کھڑکی' روشندان حتیٰ کہ کوئی روزن تک نہیں تھا۔ اس کمرے میں ایک طرف بستر لگا ہوا تھا اور دوسری طرف میز پر کچھ عجیب و غریب چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ ان میں مڑی تڑی ہوئی تاریں' ایک پلاس' ایک موٹا سا ڈنڈا' چمڑے کا ایک چھتر اور ایک ہیٹر شامل تھا۔ ہیٹر پر لکڑی کے دستے والی دو نوکیلی سلاخیں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ کمرے کی چھت میں ایک کنڈے سے بندھی موٹی سی رسی بھی جھول رہی تھی۔

اسی رسی کے عین نیچے نرمل داس اور اس کی بیوی کی لاشیں آڑھی ترچھی پڑی تھیں۔ دونوں کی آدھی سے زیادہ گردن عجیب انداز میں کٹی ہوئی تھی۔ کیٹی کو غالباً اس مخصوص انداز میں بڑی مہارت حاصل تھی کہ وہ خنجر گردن کے پار کرکے اسے آگے کو جھٹکا دیتی تھی اور شہ رگ نرخرے سمیت کٹ جاتی تھی۔ اس نے نرمل داس اور اس کی بیوی کا کام تمام کرنے میں غالباً چند سیکنڈ بھی نہیں لگائے تھے۔ ان کی گردنوں سے خون ابھی تک تھوڑا تھوڑا بہہ رہا تھا۔

میں نے سوالیہ نظروں سے کیٹی کی طرف دیکھا تو وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر معذرت خواہانہ سے لہجے میں بولی۔ "میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ نرمل داس مجھے سیدھا اس کمرے میں لاتے ہی بھوکے بھیڑیئے کی طرح مجھ پر ٹوٹ پڑا' بلاوجہ نوچ کھسوٹ رہا تھا اور اول فول بک رہا تھا لیکن ساتھ ہی سچ بھی بول رہا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ میں اکثر جوان اور خوبصورت مشکوک لڑکیوں کو یہیں لاکر تفتیش کرتا ہوں۔ پھر ان چیزوں کی باری آتی ہے۔ یہ کہتے ہوئے نرمل داس نے چھت میں لٹکی ہوئی رسی اور میز پر رکھی ہوئی ان چیزوں کی طرف اشارہ کیا تھا۔"

میں نے کیٹی کو ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور کمرے سے نکل آیا۔ کار میں بیٹھ کر ہم ہوٹل واپس آگئے۔ احتیاطاً ہم عقبی راستے سے اندر پہنچے اور سیڑھیاں چڑھ کر اپنے سوئٹ میں چلے گئے۔

اگلے روز ہم بیدار ہونے کے بہت دیر بعد بستر سے نکلے۔ غسل اور ناشتے سے فارغ ہو کر وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جا بیٹھی اور بالوں میں برش کرنے لگی' پھر اس نے نہایت نفاست سے ہلکی سی لپ اسٹک لگائی۔ پھر اس نے سلیقے سے پرفیوم لگائی اور کمرے میں دھیمی اور خوابناک سی مہک پھیل گئی۔

پھر وہ دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر میرے سامنے آکھڑی ہوئی اور ایک ادائے دلبری سے بولی۔ ”میں اچھی لگ رہی ہوں ناں؟“

میں نے سرتاپا اس کا جائزہ لیا۔ بری وہ مجھے اس وقت بھی نہیں لگی تھی جب میں نے اسے پک کیا تھا لیکن اس وقت وہ مضحل' تھکی تھکی اور کچھ میلی میلی تھی۔ اب وہ تازہ دم شگفتہ اور بے حد نکھری لگ رہی تھی۔ چینل فائیو کی خوشبو سے قطع نظر' دو دن میں اس کا اپنا وجود بھی خوشبو دینے لگا تھا اور یہ خوشبو جیسے میرے ہر مسام جاں میں بھی سرایت کر گئی تھی۔ اس لڑکی کی قربت میں مجھے جانے کیوں بار بار روپا یاد آنے لگی تھی۔

”تم نہ صرف اچھی لگ رہی ہو بلکہ اچھی ہو بھی.....“ میں نے اس کے بال مٹھیوں میں جکڑ کر دوبارہ خراب کرتے ہوئے کہا۔ حالانکہ وہ بڑی محنت سے انہیں سنوار کر آئی تھی۔ ”تمہارا المیہ صرف یہ ہے کہ تمہیں تمہاری اچھائیوں کی قدر کرنے والا کوئی نہیں ملا۔ لوگ تمہاری اچھائیوں' برائیوں' جسم و ذہن' حسن و ہنر سب سے ہی کھیلتے رہے۔“

”جو گزر گئی' سو گزر گئی۔“ اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے میرا ماضی مت یاد دلاؤ' میں اپنا ہر گزرا ہوا کل ساتھ کے ساتھ دفن کر دیتی ہوں۔ میرے گزرے ہوئے روز و شب کی قبریں مت کریدو۔ صرف وہی گھڑی میری ہے جو گزر رہی ہے۔ میں دنیا میں تہی دست آئی تھی' تہی دست چلی جاؤں گی لیکن مجھے اب کسی بھی بات کا کوئی دکھ نہیں البتہ خوشی ضرور ہے کہ کچھ نہ کچھ دیر کے لیے تو ہمارے راستے ایک ہوئے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ تقدیر کی پٹاری میں میرے لیے کیا ہے لیکن مجھے پہلے بھی اس کی پروا نہیں تھی اور اب تو بالکل ہی نہیں رہی۔“

وہ جیسے عالم خواب میں بول رہی تھی۔ بمبئی سے چلتے وقت میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا کہ اتنی سچی اور کھری لڑکی مجھے اس سفر کے دوران مل جائے گی۔

”منصور!“ دفعتاً“ اس نے خوابناک سے لہجے میں سرگوشی کی۔

”ہوں۔“ میں نے قدرے چونکتے ہوئے ہنکارا بھرا۔

”آج مجھے اپنا وجود بے حد ہلکا پھلکا لگ رہا ہے۔“ وہ گویا گنگناتے ہوئے بولی۔ ”میں جیسے آسمانوں کے قریب قریب کہیں پرواز کر رہی ہوں۔ میرا جی چاہ رہا ہے کہ تم مجھے کہیں سیر کرانے لے چلو.....میری اس معصوم سی خواہش پر ہنسنا نہیں۔ راندۂ درگاہ قسم کی لڑکیاں اندر سے ایسی ہی معصوم اور شفاف ہوتی ہیں۔“

”کس جگہ چلنا پسند کرو گی؟“ میں نے ملائمت سے پوچھا۔

”کسی ایسی جگہ جہاں سبک خرامی سے ندی بہہ رہی ہو.....ڈھلوان کنارے پر سرسبز گھاس ہو۔ کہیں کہیں درخت بھی سایہ کیے کھڑے ہوں اور ہوا کی سرسراہٹ کے ساتھ جھک جھک کر گویا ندی سے سرگوشیاں کر رہے ہوں..... کہیں کہیں زرد اور نیم زرد پتے بکھرے پڑے ہوں....بولو لے چلو گے؟“ وہ آنکھیں کھول کر مسکرائی۔

”کیوں نہیں۔“ میں نے اس کے رخسار تھپتھپائے۔ پھر اس کا ہاتھ تھاما اور نیچے آکر ہم کرائے کی اوپل میں بیٹھ کر نہر کی طرف روانہ ہو گئے۔ موسم بے حد خوشگوار تھا.....سردیوں کی مدھم سی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ ہوا میں زیادہ خنکی نہیں تھی۔ میں نے کھڑکیوں کے شیشے اتارے ہوئے تھے اور چلتی کار میں ہوا سے کیٹی کے کھلے بال ادھر ادھر لہرا رہے تھے۔ کبھی کبھی کوئی لٹ میرے رخسار پر بھی گدگدی سی کر جاتی تھی۔

نہر کے کنارے پہنچ کر میں پختہ سڑک پر نہایت کم رفتار سے ڈرائیو کرنے لگا۔ بیٹھنے کے لیے مجھے کوئی موزوں جگہ نظر نہیں آرہی تھی حتیٰ کہ ہم اس علاقے میں پہنچ گئے جہاں سڑک ایک کشادہ سی پگڈنڈی میں تبدیل ہو جاتی تھی۔ یہاں بالآخر مجھے ایک ایسی جگہ نظر آ ہی گئی جیسا کیٹی نے تصور باندھا تھا۔ کار کو نشیب میں روک کر ہم اتر آئے۔

کچھ دیر تک ہم ڈھلوان اور سرسبز کنارے پر درختوں اور پھولدار پودوں کے درمیان بچوں کی طرح ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے رہے حتیٰ کہ کیٹی ہنستے ہنستے بے دم ہو کر گھاس پر لیٹ گئی۔ ہنسی جیسے جھرنے کی طرح خود بخود اس کے اندر سے پھوٹ رہی تھی۔ میں بھی کہنی کے بل اس کے قریب نیم دراز ہو گیا۔

دفعتاً“ آسمان کی طرف دیکھتے دیکھتے اس کی ہنسی تھم گئی۔ وہ یکلخت ہی یوں خاموش ہو گئی جیسے آسمان پر اس نے کوئی ڈراؤنا منظر دیکھ لیا ہو۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

”منصور! اگر بنگال کے قحط میں میرے ماں باپ نے بارہ روپے میں مجھے فروخت نہ کر دیا ہوتا تو آج شاید میں ایک سیدھی سادھی معصوم دیہاتی لڑکی ہی ہوتی۔“ وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔ ”شاید اس طرح نہر کا کوئی کنارہ ننھے ننھے سے کومل بچے اور تم سا کوئی ہم سفر میرا مقدر ہوتا لیکن آج میں کتنی تنہا ہوں۔“

”میری نظر میں تو تم آج بھی سیدھی سادی اور معصوم ہی ہو۔“ میں نے اس کی آنکھوں سے رخساروں پر ڈھلک آنے والے دو شفاف آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ”باقی رہی یہ بات کہ کیا کچھ تمہارا مقدر ہوتا.....تو انسان کا المیہ یہی ہے کہ وہ اکثر یہی سوچتا رہتا ہے کہ یوں ہوتا تو کیسا ہوتا اور یوں نہ ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ یہ بھی تو ممکن ہوتا کہ اگر قحط نہ پڑتا اور تمہارے ماں باپ نے تمہیں نہ بیچا ہوتا تو جوان ہوتے ہی کسی مدقوق اور مجہول سے اجڈ نوجوان سے تمہارا بیاہ ہو جاتا۔ وہ روز تاڑی پی کر تمہیں دھا دھم پیٹا کرتا۔ تمہارے بچے

دیسے نہ ہوتے جیسے تم چشم تصور سے دیکھتی ہو۔ غربت و افلاس کی وجہ سے وہ محض مسخ شدہ تصویروں کی طرح ہوتے۔ بھوک سے پسلیاں نکلی ہوئی' ناک بہتی ہوئی' جسم میل او چکٹ سے اٹے ہوئے اور آنکھیں مجسم سوال.....اور یہ بھی ممکن ہے کہ تمہارا مدقوق اور مجہول شوہر تمہیں طلاق تھما کر واپس بھیج دیتا۔ پھر تو تم اس سے بھی زیادہ تنہا ہوتیں.....اس لیے ایسی باتیں سوچ کر دل دکھی مت کیا کرو اور پھر تم تو کہہ رہی تھیں کہ جو گزر گئی' سو گزر گئی۔ میں اپنی ہر گزری ہوئی کل کو دفن کر دیتی ہوں.....بھول گئیں کیا؟"

"ہاں.....میں کہتی تو یہی ہوں۔" وہ نم آلود آنکھیں بند کرکے پیشانی مسلتے ہوئے عجیب سے انداز میں مسکرائی۔ "لیکن کبھی کبھی خود فریبی کے لبادے کا کوئی نہ کوئی تار کہیں سے ٹوٹ جاتا ہے۔ کئی زخم ہیں جن سے خون رسنا تو کب کا بند ہو چکا ہے مگر کسک نہیں گئی۔ میرے ماں باپ نے جس وقت مجھے بیچا' میں چار پانچ سال کی تھی۔ مجھے اچھا خاصا شعور تھا.....مجھے یاد ہے جب میری ماں مجھے اس بڑے سے مکان میں چھوڑ کر جانے لگی تو میں دہشت زدہ ہو کر رونے لگی تھی۔ میری ماں نے اپنی پھٹی ہوئی میلی کچیلی ساڑھی کے پلو سے اپنے اور میرے آنسو پونچھتے ہوئے کہا تھا۔ "بیٹا میں ذرا کام سے جا رہی ہوں.....تو ذرا دیر کو یہاں بیٹھ.....میں ابھی تجھے لینے آجاؤں گی۔" پھر وہ پلو میں منہ چھپا کر یوں پھاٹک کی طرف دوڑتی چلی گئی تھی جیسے اس کے قدموں تلے کسی نے انگارے بچھا دیئے ہوں۔ اس بات کو کم از کم پچیس برس بیت گئے ہیں۔ مجھے کبھی دوبارہ اپنی ماں یا باپ کی شکل نظر نہیں آئی۔ میری ماں کی "ذرا دیر" ابھی ختم نہیں ہوئی۔ منصور! کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ اپنا دو دھاری خنجر نکال کر ایک سرے سے اس دنیا کے سارے انسانوں کو قتل کرنا شروع کر دوں جہاں بارہ روپے کے لیے ماں باپ اپنی اولاد کو بیچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ جہاں ملکوں کا بٹوارہ شروع ہوتا ہے تو انسان' انسان کو گاجر' مولی کی طرح کاٹنا شروع کر دیتا ہے.....ماں باپ کے سامنے بچوں کو ذبح کر دیتا ہے.....باپ کے سامنے بیٹی کی عزت لوٹتا ہے.....کیا روئے زمین پر انسان سے بدتر بھی کوئی درندہ ہے؟؟"

"کیٹی ڈیئر!" میں نے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بوجھل لہجے میں کہا۔ "تم اچھے بھلے موڈ میں انسان کو افسردہ کر دیتی ہو" میں اٹھا اور جا کر نہر کے کنارے پر بیٹھ کر چہرے پر پانی کے چھینٹے مارنے لگا۔ پانی زیادہ گدلا نہیں تھا البتہ ٹھنڈا خوب تھا اور اس لیے مجھے بھلا لگ رہا تھا۔ میرا دوران خون جیسے یک لخت ہی بہت تیز ہو گیا تھا اور آنکھیں جلنے لگی تھیں۔ ان پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارنے سے مجھے سکون مل رہا تھا۔ کیٹی بھی اٹھ کر میرے قریب آبیٹھی اور وہ بھی چہرے پر چھینٹے مارنے لگی۔

"سوری منصور ڈیئر!" وہ قمیض کے دامن سے منہ پونچھتے ہوئے گویا سب کچھ ذہن سے جھٹک کر تازہ دم ہوتے ہوئے مسکرا کر بولی۔ "دراصل میری نس نس زخمی ہے اور ہر زخم

میں بے پناہ زہر بھرا ہوا ہے.....تم جیسا دوست زندگی میں پہلی بار ملا ہے' اس لیے ایک آدھ زخم چھیڑ بیٹھی تھی.....اب ہم اچھی اچھی باتیں کریں گے.....ارد گرد کھلے ہوئے رنگارنگ پھولوں کی.....سبک خرامی سے بہتی ہوئی اس ندی کی.....خوشگوار ہوا سے جھومتے ہوئے پودوں اور درختوں کی.....اور مدت کے بعد سیراب محسوس کرنے والی پیاسی روح کی۔"

"کیٹی!" میں نے واپس گھاس پر آکر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اگر تم اس لائن پر نہ پڑتیں جس میں پڑ چکی ہو تو یقیناً تم افسانہ نگار ہوتیں۔"

"نہیں.....اگر میں اس لائن پر نہ ہوتی تو شاید میں کچھ بھی نہ ہوتی۔" وہ میرے قریب آتے ہوئے بولی۔ "باتیں تو مجھے اسی لائن کے تجربات نے سکھائی ہیں۔"

مزید کچھ وقت نہر کے کنارے گزارنے کے بعد واپس روانہ ہونے کے لیے ہم گاڑی میں آبیٹھے۔ ہوٹل کے کمرے میں پہنچ کر میں نے جیکٹ اتار کر پھینک دی اور بستر پر ڈھیر ہو گیا۔

دوسرے روز بیدار ہونے کے بعد کیٹی نے پوچھا۔ "اب کیا پروگرام ہے؟"

"واپس بمبئی چلیں گے۔ یہاں ہمارا کام ختم ہو گیا۔ ایک مشن مکمل ہو گیا۔" میں نے جواب دیا۔

بمبئی پہنچ کر میں کیٹی کو پہلے اپنے دفتر لے جانا چاہتا تھا لیکن گاڑی پارکنگ لاٹ میں کھڑی کرکے ہم اوپر جانے ہی لگے تھے کہ نسواری سوٹ والا ایک دراز قد اور پختہ عمر شخص اچانک ہمارے سامنے آگیا۔ وہ کلین شیو تھا اور بظاہر اس کا حلیہ کسی معزز اور امن پسند تاجر کا سا تھا لیکن اس کی آنکھیں چغلی کھا رہی تھیں کہ وہ کسی اور طرح کا آدمی تھا۔

"ارے..... شکنتلا.....! تم کہاں؟" وہ گرمجوشی سے بولا۔

کیٹی نے سرد نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور بولی۔ "میں اب شکنتلا نہیں' کیٹی ہوں....."

"شکنتلا ہو یا کیٹی.....نام سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہم تو اب بھی تمہارے خادم ہیں۔ پہلے بھی تم ہماری باس تھیں' آج بھی ہمیں اپنے حکم کا غلام سمجھو۔" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکا۔

"احسان مرزا نے سن لیا تو تمہاری گردن کاٹ کر تمہاری کھوپڑی چڑیا گھر کے بندروں کو کھیلنے کے لیے بھجوا دے گا۔" کیٹی بولی۔

"نہیں..... نہیں....." وہ شخص ہنسا..... "وہ اب تم سے خفا نہیں ہے۔ حالات بہت بدل گئے ہیں۔ باس بھی بدل گیا ہے۔ اندر سے وہ بہت پریشان ہے بلکہ اگر تم میری ایک درخواست مانو.....اور چل کر اسے ملو تو چاہے وہ ظاہر نہ کرے مگر دل میں بہت خوش ہو گا....."

"آپ کی تعریف؟" میں نے اس شخص کی طرف اشارہ کرکے کیٹی سے پوچھا۔

"یہ بگا ہے....احسان مرزا کے خاص آدمیوں میں سے ایک ہے۔" کیٹی نے بے اعتنائی سے بتایا۔

میرے ذہن میں یادوں کی ایک تیز رفتار سی فلم چل پڑی۔ اس دوران کیٹی اس شخص سے مخاطب ہوئی۔ "مجھے احسان مرزا سے ملنے کا کوئی شوق نہیں لیکن میرے ساتھ یہ جو منصور مغل صاحب ہیں....اگر یہ مجھے اجازت دیں گے اور تم انہیں ساتھ لے کر چلنے کی ہامی بھرو گے تو ہم چلیں گے۔"

کیٹی نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے رضامندی کے سے اظہار کے لیے کندھے اچکا دیے۔ میں اس وقت اس سے مل لینے میں کوئی حرج نہیں سمجھ رہا تھا۔ بس ویسے ہی ذرا اس شخص کو دیکھنے کو جی چاہ رہا تھا کہ اتنے برسوں میں اس میں کیا تبدیلیاں آئی ہوں گی۔

"کیوں نہیں....کیوں نہیں......" بگا خوشی سے بولا۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں گویا مجھے تول لیا تھا اور فیصلہ کر لیا تھا کہ میں بھی کام کا آدمی تھا۔

پھر وہ بولا...."مگر تم دونوں کو میرے ساتھ میری گاڑی میں چلنا پڑے گا۔"

میں نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ ہم اس کے پیچھے چل دیے۔ سڑک کے پرلی طرف سیاہ رنگ کی ایک کیڈلک کھڑی تھی۔

میں اور کیٹی پچھلے دروازے کھول کر عقبی سیٹ پر پاس پاس بیٹھ گئے۔ بگا نے گاڑی اسٹارٹ کی اور چند لمحے بعد گاڑی سڑک پر فراٹے بھرنے لگی۔

بگا نہایت مشاق ڈرائیور تھا اور گاڑی بھی بہت عمدہ تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم میلوں کا فاصلہ طے کر گئے۔ چند منٹ کے لیے ہم شہر کی نواحی سڑکوں سے پرشور ٹریفک کے درمیان سے بھی گزرے لیکن ایک بار پھر ساحلی علاقے میں آگئے۔ کئی چھوٹی چھوٹی پرپیچ اور ویران سڑکوں پر سے گزرنے کے بعد گاڑی ایک قدرے کشادہ اور ہموار سڑک پر مڑ گئی جس کے آغاز پر ہی "پرائیویٹ" کا سائن بورڈ لگا ہوا تھا۔ اس سڑک کے دونوں طرف کھجور کے درختوں کی قطاریں تھیں۔

چند لمحے بعد ہی مجھے ایک پیلس دکھائی دے گیا۔ وہ عرب، مغل اور مغربی طرز تعمیر کا ایک عجیب و غریب امتزاج تھا۔ اس کی تعمیر میں ماربل بے تحاشا استعمال کیا گیا تھا۔ پیلس دو منزلہ تھا۔ اصل عمارت زیادہ بڑی نہیں تھی لیکن پرشکوہ تھی البتہ اس کے ارد گرد چار دیواری کے اندر بہت وسیع رقبہ چھوڑا گیا تھا۔

عظیم الشان آہنی گیٹ کھلا ہی تھا۔ گاڑی ڈرائیو وے میں داخل ہو گئی لیکن فوراً ہی رک گئی۔ ایک ایسی آہنی رکاوٹ سامنے آگئی تھی جیسی عموماً ریلوے کراسنگ پر ہوتی

ہے۔ گیٹ کے قریب واقع ایک کیبن سے جو ایک غیر رسمی سا واچ ہاؤس ہی معلوم ہوتا تھا، ایک شخص نکل کر گاڑی کی طرف لپکا۔ اس کا حلیہ چوکیداروں یا اس قبیل کے دیگر ملازموں جیسا نہیں تھا۔

وہ نہایت عمدہ تراش کے سوٹ میں تھا۔ ٹائی کی جگہ اس نے بو لگا رکھی تھی اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے چند منٹ بعد ہی وہ کسی ڈنر میں شرکت کرنے والا ہے۔ بال سلیقے سے بنے ہوئے تھے، سانولا چہرہ دھوپ میں چمک رہا تھا اور بالکل اسی طرح اس کے بوٹ بھی چمک رہے تھے۔

تاہم تمام تر مہذبانہ وضع قطع اور اجلے پن کے باوجود اس کے چہرے سے اس کی اصلیت کا اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا۔ اس کے اندر ایک نہایت سفاک اور شقی القلب انسان چھپا ہوا تھا۔ قریب آکر اس نے ذرا جھک کر بگا کی صرف جھلک دیکھی، مسکرایا اور ایک لفظ کہے بغیر واپس کیبن میں چلا گیا۔ آہنی رکاوٹ ہٹ گئی اور گاڑی آگے بڑھتی گئی۔

اصل عمارت کے قریب فرنٹ پورچ میں گاڑی سے اتر کر ہم ماربل کی چند سیڑھیاں چڑھ کر محرابی دروازوں سے گزر کر دروازے تک پہنچے۔ ایک باوردی ملازم نے بگا کو دیکھ کر جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ یہ دروازہ ایک ایسے طویل و عریض ہال کا تھا جس میں ایک طرف باقاعدہ ریسپشن بنا ہوا تھا۔ ایک طرف لاؤنج تھا۔ ہال کے وسط میں ایک بیضوی قالین بچھا ہوا تھا، دور سے محض سفید جھاگ کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ چھت میں بڑے خوبصورت فانوس آویزاں تھے۔ فرش کا جو تھوڑا بہت حصہ قالین سے ڈھکا ہوا نہیں تھا، پالش شدہ تھا اور مدھم روشنی میں بھی چمک رہا تھا۔

لاؤنج میں سینٹر ٹیبل پر اخبارات، رسالے حتیٰ کہ شیلفوں میں کتابیں تک موجود تھیں۔ اس جگہ کی ترتیب و آرائش نہایت عمدہ تھی۔ ریسپشن پر ایک خوبصورت اور مستعد سی لڑکی بھی موجود تھی جس کے ارد گرد اور سامنے کاؤنٹر پر وہ تمام لوازمات موجود تھے جو ایک ریسپشنسٹ کے پاس ہونے چاہییں۔ وہ بگا کی طرف دیکھ کر مسکرائی لیکن اس نے انٹرکام یا سوئچ بورڈ کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔ بگا کو غالباً رسمیات کی ضرورت نہیں تھی۔

تاہم لڑکی نے پنسل اٹھا کر ایک رجسٹر میں کچھ لکھا تھا۔ بگا اس کے قریب سے گزرا تو اس نے سرگوشی نما لہجے میں بتایا۔ "باس تو سوئمنگ پول پر ہے۔ تم باہر سے ہی گھوم کر چلے جاتے۔"

"اب تو اندر آگیا ہوں، اندر ہی سے جاؤں گا۔" بگا نے بھی مدھم لہجے میں جواب دیا اور ہمیں ساتھ لیے بڑھتا چلا گیا۔ اس ہال سے گزر کر ہم ایک راہداری میں پہنچے۔ بگا نے کسی اور کمرے کا رخ نہیں کیا، سیدھا چلتا رہا۔ راہداری کے اختتام پر ہمیں ایک بٹلر ملا۔ بگا کو دیکھ کر وہ بھی مسکرایا۔

"انہیں اپنی ذمہ داری پر لے جا رہے ہونا؟" بٹلر نے ہماری طرف اشارہ کرتے ہوئے بگا سے پوچھا۔ "تمہیں معلوم ہے نا باس کن کن مقامات پر نئے آدمیوں کی آمد کو پسند نہیں کرتا۔"

"یہ نئے آدمی نہیں ہیں گدھے!" بگا نے اسے ایک طرف ہٹایا اور بڑھتا چلا گیا۔

پچھلے دروازے سے نکل کر ماربل کی چند سیڑھیاں اتر کر ہم کھلے لان میں پہنچ گئے۔ سامنے ہی نہایت خوبصورت بیضوی سومنگ پول تھا جس کے کناروں پر دو طرف ڈائیونگ بورڈ اور رنگین چھتریاں نصب تھیں۔ ایک طرف کئی ربڑ بیڈ اور آرام دہ کرسیاں بکھری ہوئی تھیں۔ سومنگ پول کے پرلے کنارے پر ایک ربڑ بیڈ پر احسان مرزا نیم دراز تھا۔

وہ ذرا بھی تو نہیں بدلا تھا۔ گزرے برسوں نے اس کے سراپا پر اپنا کوئی نقش نہیں چھوڑا تھا۔ وہی مختصر سا جسم' وہی بندر کی شکل اور وہی چھوٹے چھوٹے چھدرے بال جو پانی میں بھیگے ہونے کے باوجود سیدھے کھڑے تھے۔

چار نہایت کم عمر اور نوخیز لڑکیاں تیراکی کے لباس میں اس کے گرد موجود تھیں۔ ان میں سے دو کسی لوشن سے اس کی مالش اور مساج کر رہی تھیں۔ ایسے مناظر دیکھ کر مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا کرتا تھا۔ کیا عورت اتنی ہی سستی تھی کہ صرف دولت سے خریدی جا سکے؟

بگا نے ہمیں وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور خود پول کے گرد گھوم کر دوسری طرف چلا گیا۔ احسان مرزا نے ہماری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا' وہ صرف بگا کو دیکھ رہا تھا۔ ہم گویا وہاں موجود ہی نہیں تھے۔

"سور کا بچا.....!" کیٹی اس کی طرف دیکھتے ہوئے غیر محسوس طور پر بڑبڑائی۔ "میں نے اپنی زندگی کے سنہری سال اس شخص کی بھینٹ چڑھا دیئے.....نہ جانے کتنی مرتبہ اپنی زندگی خطرے میں ڈال کر اسے کروڑوں کا فائدہ پہنچایا اور آج یہ میری طرف دیکھ بھی نہیں رہا۔"

میں خاموشی سے کھڑا بالوں میں انگلیاں پھیرتا رہا اور گرد و پیش کا جائزہ لیتا رہا۔ بگا کئی منٹ تک احسان مرزا سے مصروف گفتگو رہا' پھر اس نے ہماری طرف بھی اشارہ کیا۔ احسان مرزا نے صرف ایک نظر ہماری طرف دیکھا اور دوبارہ بگا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ پھر بگا نے ایک ہینڈ بیگ اس کے حوالے کیا۔ وہ غالباً کسی مہم سے کامیاب واپس آیا تھا اور اس کی تفصیل احسان مرزا کے گوش گزار رہا تھا۔ احسان مرزا نے بیگ کھول کر دیکھا اور دوسرے ہی لمحے اس کے حلق سے ایک پتلی لیکن تیکھی اور تیز مجنونانہ سی آواز نکلی۔

نہایت ہی غیر متوقع طور پر وہ بیٹھے بیٹھے یکلخت ہی ہوا میں کئی فٹ اونچا اچھلا اور غڑپ سے سومنگ پول میں جا گرا۔ وہ مچھلی کی سی تیزی و مشاقی سے سومنگ پول میں چکر کاٹ رہا تھا اور ہاتھ پیروں کو برائے نام جنبش دے کر نہایت تیزی سے تیر رہا تھا۔ کئی بار اس

نے پانی سے سر نکالا اور نیم حیوانی سا قہقہہ لگایا۔

خوشی کے اظہار کا یہ عجیب ہی طریقہ تھا۔ میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ بگا بھی اپنی جگہ کھڑا مسکرا رہا تھا اور چاروں لڑکیاں کاہلی آمیز سی نظروں سے سومنگ پول کی طرف دیکھ رہی تھیں جیسے ان کا بس چلے تو وہیں لیٹ کر سو جائیں' بالآخر احسان مرزا سومنگ پول سے نکل آیا۔

لڑکیوں نے اس کا اشارہ پا کر اسے گاؤن اور سلیپر پہنائے۔ وہ بگا کے ساتھ ہماری طرف آیا۔ جب وہ میرے سامنے کھڑا ہوا تو بالکل بونا معلوم ہو رہا تھا۔ میری طرف اس نے اب بھی نہ دیکھا اور کیٹی کو سرتاپا گھورنے کے بعد سوں سوں کرتے ہوئے بولا۔ "تمہاری صورت دیکھنا میں صرف اس لیے گوارا کر رہا ہوں کہ تم اس وقت ایک خوشخبری کے ساتھ آئی ہو....."

"اور ہم دونوں تمہاری صورت دیکھنا اس لیے گوارا کر رہے ہیں کہ بگا ہمیں بصد اصرار ساتھ لے آیا ہے۔" میں نے گویا کیٹی کی طرف سے جواب دیا۔ "ورنہ ہم میں سے کسی کو تمہارا یہ حسین چہرہ دیکھنے کا اشتیاق نہیں تھا۔"

بگا کا رنگ فق ہو گیا اور ایک لمحے کے لیے تو کیٹی کی رنگت بھی متغیر ہو گئی۔ احسان مرزا بندر کی طرح خوخیایا۔ پھر اس نے براہ راست میری طرف دیکھا۔ اس کے پتلے پتلے ہونٹ نیم وا تھے اور ان پر ایک نیم حیوانی سا کھنچاؤ تھا۔ ان کے عقب سے اس کے چھوٹے چھوٹے چھدرے لیکن نوکیلے سے دانت یوں جھانک رہے تھے جیسے کسی بھیڑیئے نے شکار کی بو سونگھ لی ہو۔

اس نے مجھے یوں سرتاپا دیکھا جیسے فیصلہ کر رہا ہو کہ میرے پارچے بنوانے کے لیے کونسا طریقہ موزوں رہے گا۔

"مرزا جی!" کیٹی جلدی سے بول اٹھی۔ "شاید آپ کو یہ جان کر خوشی ہو کہ یہ نوجوان کون ہے.....یہ وہی ہے جس کا آپ نے اسٹیج پر جوڈو کراٹے کا مقابلہ دیکھا تھا اور اسے تنظیم میں شامل ہونے کی دعوت بھی دی تھی' آج کل یہ بہت بڑا بزنس مین ہے۔"

"منصور مغل.....؟" احسان مرزا اپنی پلکوں سے محروم آنکھیں جھپکائے بغیر ایک ٹک میری طرف دیکھتے ہوئے خودکلامی کے سے لہجے میں بڑبڑایا اور میں اس کی یادداشت پر دنگ رہ گیا پھر اس نے یہ کہتے ہوئے اور بھی حیران کر دیا۔ "لیکن مجھے اس میں کچھ ایسی تبدیلیاں نظر آ رہی ہیں جو نہیں ہونی چاہیے تھیں۔ بے شک یہ اس وقت کمسن تھا مگر اب جوان ہو گیا ہے لیکن اب ایسی بھی کیا تبدیلی۔ اس وقت اس کے بال بھورے تھے' اب سیاہ نظر آ رہے ہیں۔ اس وقت اس کی ناک کے قریب مسا نہیں تھا۔"

"بال میں نے ڈائی کیے ہیں۔ مسا مصنوعی ہے۔" میں نے اپنے لہجے میں قدرے

بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"اوہ....تو گویا تم واقعی منصور مغل ہو...." احسان مرزا مسرت سے چلایا۔ وہ اپنی توہین کو یکدم بھول گیا۔ "یہی تو میں سوچ رہا تھا کہ احسان مرزا سے اس لہجے میں گفتگو کرنے کی جرات کون کرسکتا ہے؟ بہت خوب....بہت خوب....میں بتا نہیں سکتا کہ تمہیں دوبارہ دیکھ کر مجھے کس قدر خوشی ہو رہی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی دیہاتی باپ کا بیٹا ولایت پاس کر آیا ہو۔ معلوم نہیں کیوں مجھے تم سے ایسی انسیت سی کیوں ہوتی ہے....اگر شکنتلا اپنے لیے تمہاری سفارش لے کر آئے تو میں اسے تنظیم میں نہایت عزت سے دوبارہ رکھنے کو تیار ہوں...."

"نہیں....اسے رکھنے کی ضرورت نہیں...." میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "اسے میں نے رکھ لیا ہے۔"

"اوہ..." احسان مرزا نے شریر نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "تم نے اس جوانی ہی میں عورتیں رکھنی شروع کر دیں یا پھر تم نے بھی کوئی تنظیم بنا لی ہے؟"

"نہیں....مجھے نہ تو عورتیں رکھنے کا شوق ابھی پیدا ہوا ہے اور نہ ہی میں گروہ بازی میں پڑا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "میں ایک شریف اور جائز کاروبار میں یقین رکھنے والا بزنس مین ہوں۔"

"لیکن یہ لڑکی جائز اور شریفانہ کام تو کوئی نہیں کر سکتی۔" احسان نے ہونٹ سکیڑ کر مصنوعی سنجیدگی سے کیٹی کی طرف دیکھا۔ کیٹی کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے خجالت کے آثار ابھرے تھے لیکن فوراً ہی اس کا چہرہ تاثر سے عاری ہو گیا تھا۔

"یہ تو اپنی اپنی سمجھ کا پھیر ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اچھا....چلو....چلو اندر چلو۔" احسان مرزا نے میری کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ پھر وہ بگا کی طرف مڑا۔ "مال کو ٹھکانے پر پہنچوا دو۔ تمہیں معلوم ہے میں اپنی رہائش گاہ پر اس قسم کی چیزوں کی چند منٹ سے زیادہ موجودگی پسند نہیں کرتا۔ شکنتلا کو گیسٹ ہاؤس میں لے جاؤ اور اس کے آرام و آسائش کے لیے خصوصی ہدایات دے دو۔ یہ دونوں کم از کم آج تو یہیں رہیں گے....اور منصور! تم میرے ساتھ اندر چلو۔ میں تم سے تخلیے میں بہت ساری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

بگا کیٹی کو ساتھ لیے ایک طرف چلا گیا اور میں احسان مرزا کے ہمراہ اندر آگیا۔ راہداری میں چند قدم چل کر اس نے بائیں ہاتھ پر ایک دروازہ کھولا۔ یہ ایک طویل و عریض آراستہ و پیراستہ کمرہ تھا۔

میں ایک نرم صوفے میں دھنس چکا تو احسان مرزا دیوار گیر بار کی طرف بڑھ گیا اور اپنے لیے جام تیار کرتے ہوئے بولا۔ "تمہارے لیے کیا بناؤں؟"

"شکریہ....! میں پیتا نہیں ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"بہت خوب!" وہ بولا۔ "تم میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو میں اپنے کسی پسندیدہ ترین آدمی میں دیکھنا چاہتا ہوں اور جو مجھے ابھی تک نہیں ملا۔"

جام، بوتل، آئس ٹرے، سوڈا اور سائفن وغیرہ ٹرالی پر سجائے وہ میرے مقابل آبیٹھا۔ چند گھونٹ بھرنے کے بعد وہ بولا۔ "تمہیں اندازہ ہوگا میرے پاس بے پناہ بہادر، تجربے کار اور وفادار ساتھیوں کی کمی نہیں لیکن ایک ایسے ساتھی کی کمی مجھے ہمیشہ محسوس ہوتی رہی ہے جو محض اسلحے اور گروہی طاقت کے بل پر ہی نہ چلتا رہے، وہ خود بھی اپنی ذات میں ایک تنظیم، ایک گروہ ہو۔ اس کے پاس بے پناہ ذہانت بھی ہو اور ایک ایسا ہمہ صفت انسان ہو جو وقت پڑنے پر کسی بحران سے نکل سکے۔ کسی یلغار کا مقابلہ کر سکے۔ ایسے ساتھی کی مجھے عارضی ضرورت نہیں۔ میرے بعد شاید میرا جانشین بھی وہی ہو کیونکہ میری کوئی اولاد تو ہے نہیں اور میں صاحب اولاد بننے کا کوئی ارادہ بھی نہیں رکھتا۔ یہ ضرورت مجھے بہت عرصے سے ہے لیکن کچھ عرصے سے تو یہ ضرورت بہت شدید ہو گئی ہے....بالکل اسی طرح جیسے کسی جاں بہ لب مریض کو خون کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"اگر تمہاری نگاہ انتخاب مجھ پر ہے تو مجھے افسوس ہے کہ تمہیں مایوسی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔" میں نے کہا....





میرا خیال تھا کہ میرا کورا سا جواب سن کر احسان مرزا کی خوش مزاجی جواب دے جائے گی لیکن یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ اس کے تاثرات بدلے نہیں تھے۔

"آخر کیوں؟ تمہیں اعتراض کیا ہے؟" وہ تحمل سے بولا اور جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے مزید کہا۔ "کیٹی کی زبانی میں نے سن لیا ہے کہ تم بہت بڑے بزنس مین بن گئے ہو لیکن میں تمہیں ماضی کی طرح کسی نوکری وغیرہ کی پیشکش نہیں کر رہا۔ میں تو تمہیں اپنا ساتھی بنانا چاہتا ہوں اور وہ بھی اس طرح نہیں کہ تم اپنا کاروبار چھوڑ کر مجھ سے آن ملو۔ نہیں.... تم اپنا کاروبار حسب معمول چلاتے رہو گے' زندگی حسب معمول گزارتے رہو گے۔ مجھ سے تمہارا صرف خفیہ رابطہ ہوگا۔ ضرورت پڑنے پر تم مجھے مشورہ دو گے۔ کبھی کبھی میری کسی خاص الخاص مہم کی قیادت کرو گے۔ کبھی صرف مہم کے انتظامات تمہاری زیرہدایت ہوں گے۔ بس یہ سلسلہ ہوگا۔ اسے بڑا بول نہ سمجھنا اور نہ میں تمہیں متاثر کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کیونکہ تم متاثر ہونے والی چیز نہیں ہو۔ محض تمہاری معلومات کے لیے بتا رہا ہوں کہ بمبئی کے نجانے کتنے بڑے بڑے بزنس مین احسان مرزا کی دوستی اور تعاون حاصل کرنے کے لیے اس کے پاؤں چاٹنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔"

"رہتے ہوں گے۔" میں نے لاپروائی سے کہا۔ "طاقت کی پوجا ازل سے ہوتی آئی ہے۔"

"منصور! تمام تر ذہانت و چالاکی کے باوجود دراصل تم اپنی کم عمری کی وجہ سے بعض معاملوں میں غیر ضروری حد تک بے نیاز ہو۔" احسان مرزا نے اپنا جام دوبارہ بھرتے ہوئے کہا۔ "تمہیں صحیح طور پر اندازہ نہیں کہ احسان مرزا کی رفاقت کا مطلب کیا ہے یا اس کی جانشینی کیا معنی رکھتی ہے۔ جب میں کسی کو جانشین بنانے کی بات کرتا ہوں تو یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی بادشاہ ایک بہت بڑی سلطنت کسی کے سپرد کرنے کی بات کر رہا ہو۔ میری رفاقت کا مطلب کئی صوبوں کا غیر رسمی اقتدار حاصل ہو جانا ہے۔"

"مجھے بخوبی اندازہ ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن مجھے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔ دراصل میں بالکل صاف ستھری لائن پر چل رہا ہوں۔ میرا جتنا بھی بزنس ہے' قانونی اور جائز ہے۔ مجھے بے شک تمہارے مقابلے میں بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ محض چند ایک حکام سے میری

شناسائی ہے لیکن وہ سب میری عزت کرتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ میرا نام ایک اسمگلر کے نام سے نتھی ہونے کی افواہیں کسی کے کانوں تک پہنچیں' خواہ یہ افواہیں زیرزمین حلقوں تک ہی محدود ہوں۔ برا مت ماننا.... تمہیں خواہ کتنی ہی طاقت حاصل ہے لیکن تمہاری شہرت تو ایک بہت بڑے اسمگلر کی ہے ناں...."

میری بات اس نے نہایت تحمل سے سنی اور مسکرایا۔ "بات تمہاری درست ہے لیکن تمہاری معلومات میں اضافے کے لیے بتاتا چلوں کہ مجھ پر آج تک نہ اسمگلنگ کے الزام میں کیس چلا ہے اور نہ ہی مجھے کبھی گرفتار کیا گیا ہے۔" اس نے کہا۔ "البتہ میرے خلاف اور بہتیرے کیس چلے ہیں۔ میرے جائز کاروباروں میں ٹیکس کے معاملات میں محکمے سے اختلافات ہوئے اور کیس بنے۔ جائیداد اور لین دین کے معاملوں میں کبھی کبھار براہ راست میرے خلاف مقدمہ بنا۔ تیز رفتاری سے کار چلانے میں میرا چالان ہوا۔ اس طرح کے بیسیوں معاملات میں مجھے قانونی کارروائیوں سے واسطہ پڑا لیکن مجھ پر اسمگلنگ کے الزام میں کبھی مقدمہ قائم نہیں ہوا۔ اس معاملے میں کبھی میرے خلاف ذرہ برابر ثبوت حاصل نہیں کیا جا سکا اور اگر کسی بہت ہی ہٹیلے افسر نے بغیر ٹھوس بنیادوں کے میرے پیچھے پڑنے کی کوشش کی تو قانونی یا غیر قانونی کسی نہ کسی طریقے سے اس کا پتا صاف ہو گیا۔"

وہ ایک بڑا سا گھونٹ بھر کر یوں مسکرایا گویا اپنی گفتگو سے خود ہی لطف اندوز ہو رہا ہو۔ پھر وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "ایک بار مجھے پتا چلا کہ میرے خلاف وفاقی سطح پر تحقیقات ہو رہی ہے اور مجھے کسی نہ کسی طرح گھیرنے کا پروگرام بنایا جا رہا ہے۔ وہ کپاس کی چنائی کا سیزن تھا۔ میں نے کئی صوبوں کی منڈیوں میں اپنے آدمی پھیلادیے۔ کپاس منڈیوں سے نکلنے ہی نہیں پائی۔ وہیں چند روپے زیادہ کے ریٹ پر خرید لی گئی اور کرائے کے گوداموں میں پہنچا کر مقفل کر دی گئی۔ ٹیکسٹائل وغیرہ کی صنعت سے وابستہ افراد نے جب منڈیوں کا رخ کیا تو روئی کا پھایا تک کہیں موجود نہیں تھا۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ کیا طوفان مچا تھا۔ ٹیکسٹائل کی صنعت ٹھپ ہو گئی۔ ملوں کو تالے لگ گئے۔ مزدوروں کی ہڑتالوں سے ہنگاموں کا سیلاب امڈ آیا۔ صوبائی سیکرٹری بھاگے بھاگے میرے پاس آئے۔ میں نے بڑے تحمل سے ان کی تقریریں سنیں اور صرف اتنا کہا کہ وفاقی سیکرٹریٹ میں میرے متعلق ایک فائل پڑی ہے۔ وہ لا دیجئے' اس سے اگلے دن کپاس منڈیوں میں آجائے گی۔ صوبائی سیکرٹریوں نے مرکز میں جا کر رونا پیٹنا مچایا کہ صوبوں کی معیشت کا معاملہ ہے اور صرف معیشت ہی نہیں امن و امان بھی تباہ ہو کر رہ جائے گا۔ قصہ مختصر یہ کہ فائل مجھے مل گئی اور تحقیقات وہیں کی وہیں رہ گئیں۔ مجھے صرف ایک ڈیڑھ کروڑ کا خسارہ اٹھانا پڑا تھا لیکن اس کے بعد سے ابھی تک تو کسی کو کچھ کرنے کی جرات نہیں ہوئی البتہ ذخیرہ اندوزی کے خلاف پارلیمنٹ میں ایک نیا بل ضرور پاس ہوا جس کے بعد ذخیرہ اندوزی کے خلاف

قوانین مزید سخت کیے گئے لیکن میرے لیے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں اب بھی چاہوں تو ایک اشارے سے معیشت اور امن و امان درہم برہم کر سکتا ہوں۔ مثلاً نمک ایک ایسی چیز ہے جسے اگر میں کچھ نقصان برداشت کرتے ہوئے صرف ایک صوبے کی منڈیوں سے بھی اٹھوا کر سمندر میں پھینکوا دوں تو میرے یا میرے ایجنٹوں کے خلاف ذخیرہ اندوزی کا کوئی ثبوت نہیں ہوگا اور ہاہاکار مچ جائے گی.....تو میری جان......یہ بادشاہت یونہی نہیں چل رہی۔"

"مجھے یہ سب کچھ سن کر کوئی حیرت نہیں ہوئی۔" میں نے قدرے مبالغے سے کام لیا "البتہ اپنی معلومات میں مزید اضافے کے لیے میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اپنی اس بے پناہ طاقت اور جاہ و جلال کے باوجود تمہیں اپنی بادشاہت میں مجھ جیسے ایک حقیر آدمی کی ضرورت کیوں ہے؟"

"ہاں.....میں تمہیں یہی بتانے جا رہا تھا۔" وہ جام ہاتھ میں اٹھائے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ "مسائل بہت پھیل گئے ہیں۔ بادشاہت جتنی وسیع ہو چکی ہے، مسائل بھی اتنے ہی وسیع ہیں۔ کچھ عرصے سے صورتحال کچھ ایسی ہے کہ فیصلوں اور انتظامات کے معاملے میں تنہا اپنی ذات کو ناکافی محسوس کر رہا ہوں اور پھر یہ لائن کچھ ایسی ہے کہ ادھر آپ سے ذرا سی چوک ہوئی، کسی ساتھی یا کسی عہدیدار کے انتخاب میں ذرا سی غلطی ہوئی اور آپ گئے....." اس نے ہاتھ سے گردن کٹنے کا اشارہ کیا۔ "بہرحال یہ معاملات تو جوں توں کر کے چلتے ہی رہتے ہیں لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ میری بادشاہت کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ میری سلطنت کی دیواریں لرز رہی ہیں۔"

اس کے چہرے پر فکرمندی جھلک آئی تھی اور وہ کھڑکی کے قریب کھڑا جام کو دھیرے دھیرے انگلیوں میں گھما رہا تھا۔

"کیا کوئی دوسرا گروہ تمہارے مال پر ہاتھ ڈالنے لگا ہے؟" میں نے کہا۔

"یہی تو اصل مسئلہ ہے۔" وہ میری طرف دیکھ کر مربیانہ انداز میں مسکرایا۔ "اگر وہ محض ایک گروہ ہوتا تو احسان مرزا کب سے اس کا شیرازہ بکھیر چکا ہوتا۔ مسئلہ اس سے کہیں زیادہ سنگین ہے.....تم نے کبھی مافیا کے بارے میں کچھ سنا ہے؟"

"سنا تو نہیں.....میں نے اس کے بارے میں پڑھا بہت ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"بہت خوب......" اس نے ایک گھونٹ بھر کر کہا۔ "تو پھر تمہیں اس تنظیم کی طاقت، ہیبت اور وسعت کا بھی اندازہ ہوگا لیکن وہ محض اندازہ ہی ہوگا، حقیقت سے آگاہی نہیں۔ اٹلی سے یہ تنظیم اٹھی تھی اور جس طرح اس نے امریکہ، انگلینڈ، فرانس اور چند ایک یورپی ممالک میں پنجے گاڑے ہیں، اس کا کچھ کچھ تمہیں علم ہی ہوگا اور یہ بھی تم پڑھ چکے ہوگے کہ ترقی یافتہ ممالک اس نظام کے سامنے کس طرح بے بس ہو چکے ہیں۔ تمہیں معلوم ہی

ہے کہ ترقی یافتہ ممالک میں قانون کی بالادستی کا نظام ہی اس تنظیم کے لیے امرت بن گیا۔ ترقی یافتہ ممالک میں کسی جرم کے ثبوت کے بغیر تو بڑے سے بڑا لاٹ صاحب بھی کسی غریب سے غریب آدمی کو نہیں پکڑ سکتا۔ اپنے ہندوستان والا حساب تو ہے نہیں کہ غریب آدمی دیکھا تو سپاہی نے بھی چار جھانپڑ رسید کر دیئے یا تفتیش کی زد میں آیا تو تھانے سے ہاتھ پاؤں تڑوا کر نکلا۔ وہاں تو پولیس ربڑ کے پائپ سے کسی بہت ہی خطرناک اور سخت جان مجرم سے کچھ اگلوانے کے لیے دو چار ضربیں لگا دیتی تھی تو اب اسے بھی وحشیانہ اور غیر انسانی تشدد قرار دے کر ختم کروا دیا گیا ہے۔ قانون کی اس بالادستی سے جہاں ان ملکوں نے بے پناہ ترقی کی ہے وہیں اس قسم کی لچک کی آڑ میں ہی درحقیقت مافیا پروان چڑھی ہے۔"

وہ جام سے گھونٹ بھرنے کے لیے خاموش ہو گیا۔

"یہ سب کچھ تو مجھے معلوم ہے۔" میں نے کہا۔

"میں محض یاددہانی کے طور پر بتا رہا ہوں۔" وہ مسکرایا۔ "اور ابتداء سے اصل موضوع پر آ رہا ہوں۔ تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ اس تنظیم کا نظام بالکل اسی طرح چلتا ہے جس طرح حکومت برطانیہ کا نظام اس وقت چلتا تھا جب اس کی سلطنت پر سورج غروب نہیں ہوتا تھا یعنی دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک نہ جانے کتنے ملکوں پر اس کی عملداری تھی۔ مافیا کی بھی جہاں جہاں عملداری ہے، وہاں اس کے ہاتھوں بکے ہوئے پولیس افسروں، ججوں، سیاستدانوں اور انتظامیہ کے عہدیداروں کا تو کچھ شمار ہی نہیں ہے۔ باقاعدہ کارکنوں کے علاوہ ہر علاقے کا انتظام چلانے کے لیے ایک بہت ہی سربرآوردہ قسم کا خاندان مقرر ہوتا ہے جس کا کوئی خاص نام نہیں ہوتا۔ اسے بس "فیملی" کہا جاتا ہے۔ فیملی ہی میں سے ایک شخص مافیا کو علاقائی طور پر قانونی حکمت عملی کے مطابق چلاتا ہے۔ اس شخص کا بھی بظاہر کوئی خاص عہدہ نہیں ہوتا۔ اسے بس "کونسلر" کہا جاتا ہے۔ بظاہر فیملی بڑی عزت و آبرو کی زندگی بسر کرتی ہے اور ان سے زیادہ حلیم الطبع اور پابند قانون شہری بڑی مشکل سے دیکھنے کو ملتے ہیں۔"

"یہ بھی مجھے معلوم ہے۔" میں نے کہا۔

"نئی بات میں تمہیں اب بتانے لگا ہوں۔" احسان مرزا نے کہا اور تپائی کے قریب آ کر اپنے لیے نیا جام تیار کرنے لگا۔ "نئی بات یہ ہے کہ ہندوستان میں بھی "فیملی" کا تقرر ہو گیا ہے۔"

"نہیں....." میں اچھل پڑا۔ "یہ کیسے ممکن ہے.....سات سمندر پار....."

"برطانوی سرکار بھی سات سمندر پار اور نہ جانے کن کن صحراؤں کے پار اور تاریک براعظم افریقہ کے بھی نہ جانے کن کن دور افتادہ گوشوں میں اپنے زیرنگیں ملکوں کا نظام چلایا کرتی تھی۔" احسان مرزا نے میری بات کاٹ کر کہا اور جام تیار کر کے ایک بار پھر ٹہلنے

لگا- "اس لیے مافیا جیسی تنظیم کے لیے بھی یہاں فیملی کا تقرر کر دینا کوئی مشکل کام نہیں- جس طرح انگریز ہندوستان کو سونے کی چڑیا سمجھ کر دوڑا آیا تھا' اسی طرح مافیا کو بھی اپنے نقطہ نظر سے یہ ملک سونے کی چڑیا ہی لگا ہوگا اور اس نے دیکھا ہوگا کہ جرم کے فروغ کے لیے یہاں کی فضا بڑی سازگار اور زمین بڑی زرخیز ہے' اس لیے اس کے پنجے یہاں تک پہنچ گئے ہیں- اب مسئلہ یہ ہے کہ فیملی کا سب سے پہلا کام ہوتا ہے کہ سب سے پہلے وہ ان لوگوں کو تباہ کرکے رکھ دے جو جرائم کی دنیا میں اس کی برابری کر سکتے ہوں یا اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑے ہو سکتے ہوں- قانونی اداروں کو ہموار کرنے کی طرف وہ بعد میں توجہ دیتی ہے....."

"اس حکمت عملی کے مطابق فیملی کی نظر سب سے پہلے تم پر پڑی ہے-" میں نے خیال ظاہر کیا-

"تم بالکل صحیح سمجھے-" احسان مرزا بولا- "میری سلطنت پر بڑے بھرپور انداز میں چاروں طرف سے حملے کیے جا رہے ہیں- میرے بہترین آدمیوں کو چن چن کر مارا جارہا ہے- میرا مال لوٹا جا رہا ہے- میری بوٹس ڈبوئی جا رہی ہیں- میری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو مافیا کی دہشت سے ہی ملک چھوڑ کر بھاگ چکا ہوتا لیکن میں ڈٹا ہوا ہوں اور آخری دم تک ڈٹا رہوں گا- اس مخاصمت کے سلسلے میں تصادم کے جو واقعات قانونی اداروں کے علم میں ہیں' ان میں ان کا کردار کسی قدر لاتعلقی کا سا ہے- حکومت کو یہ تو معلوم نہیں کہ دوسری قوت کو درحقیقت مافیا کی پشت پناہی حاصل ہے- وہ اسے محض کوئی دوسرا گروہ سمجھتی ہے اور اندر ہی اندر خوش ہے کہ چلو اس طرح دو بڑے گروہ آپس میں ٹکرا ٹکرا کر ختم ہو جائیں گے- میرے مسائل بہت بری طرح الجھ گئے ہیں.....مالی اور جانی نقصان تو جو ہو رہا ہے' ہو رہا ہے لیکن اس سے بھی بڑا مسئلہ یہ ہے کہ کارکنوں میں خوف و ہراس اور بددلی پھیل رہی ہے-"

"لیکن تم اپنی جس طاقت و ہیبت کا نقشہ کھینچ رہے تھے' اس کی مناسبت سے تو یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں-" میں نے کہا- "تم فیملی پر براہ راست چڑھ دوڑو- اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دو- مروا دو سب کو....."

"یہاں آکر تو مسئلے کی تان ٹوٹتی ہے-" احسان مرزا نے ایک طویل آہ بھر کر کہا- "ایک تو مافیا نے فیملی کا تقرر اتنا سوچ سمجھ کر کیا ہے کہ داد دینے کو جی چاہتا ہے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے اس فیملی کو پیدا ہی شاید اس مقصد کے لیے کیا تھا- کسی زمانے میں وہ بے پناہ طاقتور و مضبوط فیملی رہی ہے- پوری ایک ریاست کا نظام اس کے سربراہ کے ہاتھ میں رہا ہے اور کردار کے اعتبار سے وہ پوری طرح مافیا کے مطلب کا آدمی تھا- میں بھی بہت برا آدمی ہوں لیکن اس کی تو شاید پچھلی سات پشتوں میں بھی کوئی اچھائی

کسی کو چھو کر نہیں گزری- بہرحال..... میرے لیے یہ بھی کوئی اتنا اہم مسئلہ نہیں تھا کہ فیملی بہت طاقتور ہے اور اس کے پیچھے مافیا ہے- میں اس کے باوجود چڑ کر شاید کچھ نہ کچھ کر گزرتا لیکن فیملی صرف طاقتور ہی نہیں بلا کی مکار بھی ہے- اسے میری قوت کا اندازہ تھا' لہٰذا عملی طور پر میدان جنگ گرم کرنے سے پہلے اس نے بعض ضروری انتظامات مکمل کیے اور ترقی یافتہ ملکوں میں سرگرم عمل مافیا کی فیملیوں کے برعکس یہ فیملی ایک طرح سے انڈر گراؤنڈ چلی گئی- کہلانے کو تو یہ فیملی ہی کہلاتی ہے لیکن درحقیقت یہ صرف دو باپ بیٹا ہیں- میں ان دونوں کو اس وقت سے اچھی طرح جانتا ہوں جب انہیں فیملی کا "اعزاز" نہیں ملا تھا لیکن کچھ عرصہ پہلے یہ دونوں میری نظروں سے یوں اوجھل ہو گئے ہیں گویا کبھی دنیا میں تھے ہی نہیں- اب مجھے یہ سب کچھ معلوم ہے کہ مافیا کی فیملی کونسی ہے لیکن مجھے یہ نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے- میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا- ان کا جو آدمی بھی ہمارے ہاتھ لگا ہے' اس پر تشدد کرکے کچھ معلوم کرنے کی کوششیں اب تک بے سود رہی ہیں- مافیا کے نظام میں اس قسم کے سقم کی گنجائش نہیں ہوتی البتہ مافیا کی طرف سے مجھے پیغام مل چکا ہے کہ مجھے تباہ و برباد کرکے ایک روز سیمنٹ کے پائپ میں لٹا کر دونوں طرف کنکریٹ بھر کے سمندر میں پھینک دیا جائے گا- اگر میں امریکہ میں ہوتا تو اب تک ایسا کیا بھی جا چکا ہوتا- بہرحال مجھے اپنے انجام کے لیے تیار رہنا چاہیے- میری سلطنت بکھرنے اور میرے ٹھکانے لگ جانے کے بعد فیملی منظرعام پر آجائے گی' اطمینان سے حکومت کرے گی اور مافیا کے پاؤں ہندوستان میں بھی خوب مضبوط کر لے گی-"

"آخر وہ فیملی ہے کون سی؟" میں نے پوچھا-

"نواب شرافت علی خان اور اس کا سب سے بڑا بیٹا-" احسان مرزا نے ہوا میں کسی غیر مرئی چیز کو دیکھتے ہوئے سرگوشی کی-

"نواب شرافت علی خان.....!" میرے حلق سے سرسراتی ہوئی سی آواز نکلی اور میں بے اختیار اٹھ کھڑا ہوا-

مجھے احساس ہوا کہ احسان مرزا مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا ہے- ظاہر ہے اسے مجھ سے اس قسم کے ردعمل کی توقع نہیں تھی کیونکہ اس کے خیال میں' میں کسی بھی بات پر حیران یا خوفزدہ ہونے والا انسان نہیں تھا اور پھر اس کی توقع کے مطابق تو نواب شرافت علی کا نام میرے لیے اجنبی ہی ہونا چاہیے تھا لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ یہ نام میرے لیے کیا معنی رکھتا ہے-

تاہم میں نے حتی الامکان پھرتی سے دوبارہ بیٹھتے ہوئے پوچھا- "کیا نام بتایا تم نے؟"

"نواب شرافت علی....." احسان مرزا نے جواب دیا-

"اوہ....." میں نے مصنوعی اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے ایک گہری سانس لی- "میں

سمجھا تھا کہ تم نے نواب سلامت علی کا کہا ہے' اسی لیے مجھے حیرت ہوئی تھی کیونکہ نواب سلامت علی میرے ایک دوست کے والد تھے لیکن وہ تو بے حد شریف آدمی تھے اور ویسے بھی وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔"

"اوہ....." احسان مرزا خوشدلی سے مسکرایا۔ میں نے اپنے تاثرات پر بہت جلد قابو پایا تھا ورنہ وہ چونک ہی گیا تھا۔ جب سے میں نے اپنے جذبات و احساسات پر قابو رکھنے کی مشق شروع کی تھی' یہ پہلا موقع تھا کہ میرا ردعمل اتنا واضح ہو گیا تھا۔ بہرحال بات بن ہی گئی تھی۔

میں نے ذہن پر زور دینے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ "ویسے میں غائبانہ طور پر نواب شرافت علی کو بھی جانتا ہوں لیکن میری معلومات کے مطابق تو وہ بہت بڑا نواب ہے۔ بہت بڑی جاگیر کا مالک ہے.....بے پناہ دولت ہے اس کے پاس۔ اسے بھلا مافیا کا آلۂ کار بننے کی کیا ضرورت تھی؟"

"تمہارا یہ سوال بڑا اہم ہے اور مجھے قدرے تفصیل سے اس کا جواب دینا ہوگا تاکہ پس منظر تمہارے ذہن میں محفوظ رہے۔" احسان مرزا نے جام سے ایک بڑا سا گھونٹ بھرنے کے بعد گلاس رکھتے ہوئے کہا۔ "سب سے پہلی بات تو یہ کہ نواب شرافت علی جتنا بڑا زمیندار ہے یا یوں کہو کہ جتنا بڑا زمیندار تھا' اتنا ہی بڑا اس کا خاندان ہے۔ اس کی غیر شرعی بیویوں کا تو کوئی شمار ہی نہیں تھا' تاہم اس کی شرعی بیویوں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں تھی جن میں سے بہت سی بیویوں کو وہ بتیس روپے آٹھ آنے حق مہر دے کر طلاق بھی دے چکا تھا لیکن بہت سی عورتیں نمایاں یا بڑے خاندانوں سے بھی تھیں یا بعض ویسے ہی اچھی شرائط پر نواب سے بیاہی گئی تھیں۔ غرضیکہ اس طرح نواب کی اولاد کا سلسلہ بھی گویا لامحدود سا ہی ہے۔

"ادھر سرکار نے جب زرعی اصلاحات کا غوغا مچایا اور بڑی جاگیریں ضبط ہونے کی افواہ گرم ہوئی تو نواب نے جاگیریں اور جائیداد تقسیم کرکے بقدر حصہ اپنی اولادوں کے نام کرنی شروع کر دی۔ اس سلسلے میں اس کے بعض سرکش بیٹوں اور بیگمات کا دباؤ بھی اس پر کافی عرصے سے بڑھ رہا تھا۔ جاگیر وغیرہ تقسیم ہونے کے بعد نواب کی حالت کچھ ایسی ہی ہو گئی تھی جیسے ہاتھی سکڑ کر چوہا بن گیا ہو۔ حالانکہ روپے پیسے کی اب بھی اس کے پاس کوئی کمی نہیں آئی تھی لیکن وہ جو ایک ہوس ہوتی ہے ناں.....بڑے بڑے خطوں پر حکومت کرنے کی' بڑے بڑے علاقوں کا حاکم کہلانے کی.....وہ انسان کو قناعت نہیں کرنے دیتی۔ یہی ہوس قبل از تاریخ کے دور سے بادشاہوں کو دوسرے ملکوں پر چڑھائی کرنے پر اکساتی رہی ہے اور یہی ہوس درجہ بدرجہ نچلی سے نچلی سطح تک کسی نہ کسی روپ میں موجود رہتی ہے۔ ایک تو اس ہوس نے نواب شرافت علی کو بے چین رکھا ہوگا اور مافیا کی "فیملی" کے طور پر

تقرر کی پیشکش سن کر اس کی رال ٹپک پڑی ہوگی کیونکہ فیملی بننے کا مطلب بھی ایک الگ ہی انداز سے اقتدار حاصل ہونا ہے اور اس کے ساتھ ہی بے اندازہ دولت کا دریا بھی بہتا چلا آتا ہے۔ فیملی کے اشارے پر بڑے بڑے کام ہونے لگتے ہیں۔ وہ سیاست پر بھی اثرانداز ہوتی ہے.....اور یہ میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں کہ شرافت علی مزاجاً مافیا کا آدمی ہے۔

اس سے شاید زندگی میں کبھی بھول کر بھی کوئی اچھا کام سرزد نہیں ہوا۔ مثلاً اس کے مقابلے میں خود میں بھی بہت برا آدمی ہوں۔ میں جو کچھ بھی بنا ہوں' بہت برے پیشے سے بنا ہوں لیکن کبھی کبھی جیسے خودبخود ہی اندر سے کوئی نیکی پھوٹ پڑتی ہے۔ خودشناسی سے قطع نظر بتاتا رہا ہوں کہ میرا ہر بڑے شہر میں کسی نہ کسی نام سے کوئی ٹرسٹ قائم ہے جس کی آمدنی سے بیواؤں کو وظیفے ملتے ہیں۔ غریب طالب علموں کی فیسیں ادا ہوتی ہیں۔

ایسے ہی ایک ٹرسٹ کی "آڑ" میں' میں نے بمبئی میں کئی سال پہلے آٹھ سو نہایت سستے فلیٹس ان لوگوں کے لیے بنوائے تھے جو فٹ پاتھوں پر رہائش پذیر تھے۔ یہ خیال شاید مجھے اس لیے آیا تھا کہ میں بھی فٹ پاتھ پر پیدا ہوا تھا۔ بہرحال حکومت نے سب سے پہلا کام یہ کیا تھا کہ اس پروجیکٹ کے رفاہی پہلو کی طرف دھیان دیئے بغیر اس پر تمام مروجہ ٹیکس لگا دیئے تھے۔ بہرحال میں یہ مثال اس لیے دے رہا ہوں کہ مجھ جیسے گناہگاروں سے بھی کوئی نہ کوئی اچھا کام سرزد ہو ہی جاتا ہے لیکن میں نہایت وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ نواب شرافت علی سے کوئی اچھائی غلطی کے طور پر بھی سرزد نہیں ہو سکتی۔

نواب کی شریف اولادیں اپنے اپنے حصے لے کر ادھر ادھر بکھر چکی ہیں۔ اس کے کچھ بیٹے' بیٹیاں دوسرے ملکوں میں رہائش اختیار کر چکے ہیں۔ بہرحال ہمیں شریف اولادوں سے کوئی غرض نہیں' فساد کی جڑ نواب اور اس کا بڑا بیٹا ہے۔

وہ تمام دھندے جو مافیائیں کرتی ہیں' ان کی سربراہی میں ہو رہے ہیں۔ ان کے بہت سے آدمی میرے آدمیوں کے ہاتھوں اور ہمارے بہت سے آدمی ان کے آدمیوں کے ہاتھوں مارے جا چکے ہیں۔ گینگ وار چلتی رہتی ہے۔

"ہندوستان میں اب زیرزمین دنیا میں ہم دو ہی بڑی طاقتیں ہیں اور ہم میں چونکہ اتحاد نہیں ہو سکتا' اس لیے ہم میں سے کوئی ایک ہی باقی رہے گا۔ میرا ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ میرے پاس لڑاکے تو بہت اونچے درجے کے موجود ہیں لیکن ذہین آدمیوں کی میرے پاس سخت کمی ہے۔ ایسے لوگ جو سربراہی کر سکیں' سربراہی صرف مجھے ہی کرنا پڑتی ہے۔ شروع ہی سے میں نے اپنا نظام کچھ ایسا بنایا تھا کہ چھوٹے سے چھوٹا معاملہ بھی میری نظر سے گزرے بغیر سرانجام نہ پائے۔

یہی نظام اب میرے لیے تکلیف دہ ثابت ہو رہا ہے۔ تنہا میری ذات اب تمام محاذوں

پر لڑنے کے لیے ناکافی ثابت ہو رہی ہے۔ دوسری بات یہ کہ اگر اسی رفتار سے میرے آدمی مرتے رہے تو میرے پاس جو کام کے آدمی ہیں' وہ بھی رفتہ رفتہ میرا ساتھ چھوڑ کر فرار ہونے لگیں گے۔ ان مسائل میں گھرا ہوا ہوں میں....." وہ میری طرف دیکھ کر عجیب' مجبور سے انداز میں مسکرایا۔ "اس لیے مجھے تم جیسے ایک ساتھی کی ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔"

وہ خاموش ہو گیا اور اپنے لیے نیا جام تیار کرنے لگا۔ "کیا تمہارے خیال میں محض میرا ساتھ مل جانے کے بعد تمہارے حالات میں انقلاب آجائے گا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں اتنا مجھے یقین ہے۔" اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "میرے وجدان نے مجھے کبھی دھوکا نہیں دیا۔"

میں ہنس دیا لیکن وہ بدستور سنجیدہ رہا۔ پھر اس نے جام اٹھاتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ "کیا کہتے ہو؟" وہ اپنی آنکھوں کو ہر جذبے سے عاری رکھنے کی پوری پوری کوشش کر رہا تھا لیکن آنکھیں بڑی چغل خور ہوتی ہیں' اس کی آنکھیں بھی چغلی کھا رہی تھیں کہ وہ امید و بیم کی کیفیت میں مبتلا ہے۔

"چاہو تو چند دن غور و خوض کر کے جواب دے دینا۔" اس نے کہا

"میں دنوں کے حساب سے غور و خوض نہیں کرتا' منٹوں کے حساب سے کرتا ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "بلکہ بعض اوقات تو فیصلے پر پہنچنے میں چند سیکنڈ ہی لگاتا ہوں۔ احسان مرزا! تم نے دوسری مرتبہ اتنے خلوص سے دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے کہ اسے قبول نہ کرنے کی ہمت نہیں پڑ رہی۔ آج سے تم مجھے اپنے دوستوں میں شمار کر سکتے ہو۔"

"کیا واقعی؟" اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور اس نے جام شیشے کی تپائی پر تقریباً پٹخ دیا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ چیخ مار کر اچھلا اور کمرے کے وسط میں جا کودا۔ انداز ویسا ہی تھا جیسا میں نے سومنگ پول پر دیکھا تھا۔ اس کی چیخ قطعی غیر انسانی لگتی تھی اور چھلانگ وہ بندر ہی کی سی پھرتی سے لگاتا تھا۔ پھر وہ محاورتاً نہیں' حقیقتاً ناچنے لگا۔ یہ عجیب سا رقص تھا۔ افریقی قبائلیوں جیسا۔ سختی سے مٹھیاں بھینچے' وہ بازوؤں کو مجنونانہ انداز میں جھٹکے دے رہا تھا اور اچھل اچھل کر دونوں پاؤں زور زور سے زمین پر مار کر نیم دائرے میں گھوم رہا تھا۔

بلاشبہ وہ ایک عجیب آدمی تھا۔ جذبات کا اظہار یا تو سرے سے کرتا ہی نہیں تھا اور کرتا تھا تو اتنا بے ساختہ اور بھرپور کہ دیکھنے والے کا خون بھی گرما جاتا تھا۔ پھر وہ ہنستے ہنستے بے حال ہو گیا اور قالین پر لوٹنے لگا۔ اس کے مختصر سے چہرے پر نسیں یوں ابھر آئی تھیں [illegible] لگا تھا کہ کوئی نس پھٹ ہی نہ پڑے۔

بالآخر میں اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکا' میں اٹھ کر اس کے قریب پہنچا' اسے کمر سے پکڑ کر کسی گڈے کی طرح اٹھایا' ہوا میں دو چار چکر دیئے اور ایک جھٹکے سے فرش پر کھڑا کر دیا۔ اس کی ہنسی تھم چکی تھی۔

"شکریہ۔" اس نے ناک رگڑ کر سوں سوں کرتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے کہا اور کاؤچ پر آبیٹھا۔

"میری سمجھ میں نہیں آرہا۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بڑے فکرمندانہ لہجے میں بولا۔ "کہ اپنی زندگی کے اس نہایت پرمسرت موقع پر کس قسم کے جشن کا اہتمام کروں؟ تم ہی کچھ بتاؤ۔ کسی قسم کی فرمائش کرو' کچھ تو کہو۔"

"کسی جشن وغیرہ کی ضرورت نہیں۔" میں نے ہاتھ اٹھا کر حتمی لہجے میں کہا۔ "یہ کوئی فلمی سچوایشن نہیں ہے۔ ہمیں صرف کام کی بات کرنی چاہیے۔ یہ بتاؤ کیا تمہارے پاس دشمنوں کا کوئی بھی سراغ نہیں؟"

"ایک سراغ ہے تو سہی۔" وہ گاؤن کی جیبوں میں ہاتھ ٹھونستے ہوئے بولا۔ "لیکن پوری طرح یقین نہیں کہ وہ کوئی سراغ ہے بھی یا نہیں۔"

"پھر بھی.....بتاؤ تو سہی۔" میں نے کہا

"بتانے سے پہلے تمہیں کچھ دکھانا پڑے گا۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "میرے ساتھ آؤ۔"

اس کمرے سے نکل کر اس کی رہنمائی میں' میں ایک اور کمرے تک پہنچا۔ کمرے میں داخل ہو کر احسان مرزا نے دروازہ بند کر دیا۔ یہاں گھپ اندھیرا تھا اور ایک ہلکی سی خاص بو بتا رہی تھی کہ یہ کمرہ یا تو سرے سے استعمال ہی نہیں ہوتا یا پھر کبھی کبھار کھولا جاتا ہے۔

احسان مرزا نے نہایت مدھم سے کھٹکے سے کوئی سوئچ دبایا اور کمرے میں روشنی پھیل گئی۔ تب میں نے دیکھا کہ وہ مستطیل کمرہ ایک باقاعدہ پروجیکشن روم تھا۔ اس کی ایک دیوار کے آگے بلندی پر ایک کاؤنٹر سا لگا ہوا تھا جس پر تین مختلف سائزوں کے پروجیکٹر نصب تھے۔ دائیں بائیں دونوں دیواروں پر نیچے سے چھت تک شیلف بنے ہوئے تھے جن میں غالباً ترتیب سے چھوٹے بڑے اسپول اور فلموں کے ڈبے رکھے ہوئے تھے۔

اس کاؤنٹر سے آگے چار قطاروں میں کچھ آرام دہ کرسیاں بھی نصب تھیں اور فرش بتدریج نیچا ہوتا جارہا تھا۔ سامنے والی دیوار پر ایک باقاعدہ اسٹیج سا تھا جس پر اسکرین تھی۔ اسکرین کے گرد ایک خاص قسم کا سیاہ فریم نظر آرہا تھا۔ یہ ایڈجسٹ ایبل فریم تھا۔ غالباً اس کے ذریعے خودکار نظام کے تحت اسکرین چھوٹی یا بڑی کی جا سکتی تھی۔

وہ مجھے ساتھ لیے کاؤنٹر کے پیچھے ہی جا کھڑا ہوا۔ کاؤنٹر کے نیچے ہاتھ ڈال کر اس نے

کوئی خاص دراز کھولی اور اس میں سے ایک ڈبہ نکالا۔ ڈبے میں دو چھوٹی چھوٹی فلمیں تھیں۔ اس نے ایک فلم آٹھ ایم ایم کے **پروجیکٹر** میں لگائی۔ **پروجیکٹر** کا سوئچ آن کرکے اس نے کمرے کی لائٹ بجھا دی۔

چند لمحے بعد ہلکی سی سرسراہٹ کے ساتھ پروجیکٹر چلنے لگا اور اسکرین روشن ہو گئی۔ چند سیکنڈ اسکرین سادہ رہی' پھر اچانک ہی اس پر ایک منظر ابھر آیا۔ فلم رنگین تھی اور یہ منظر کسی کلب کا بھی ہو سکتا تھا اور کسی گھر میں منعقد ہونے والی رقص و سرود کی محفل کا بھی۔ اس میں صرف چند جوڑے پرجوش انداز میں رقص کرتے نظر آ رہے تھے۔ ان کے چہرے تمتما رہے تھے۔ فلم کے ساتھ ساؤنڈ نہیں تھی' تاہم صرف نظر آ رہا تھا کہ رقص مغربی موسیقی ہی کی دھن پر تھا گو کہ بیشتر جوڑے ہندوستانی تھے' دو تین سفید فام لڑکیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔

کیمرہ ہجوم پر چند لمحے ادھر ادھر چکراتا رہا' پھر جیسے خاص طور پر چند جوڑوں پر ساکت ہو گیا۔ پھر میرے قریب ہی احسان مرزا کی آواز ابھری۔ یہ بمبئی ہی کے واک ان کلب کا منظر ہے۔ ان جوڑوں کے وسط میں نیلے سوٹ میں جو نوجوان پیلے اسکرٹ والی ایک دیسی لڑکی کے ساتھ رقص کر رہا ہے' اسے غور سے دیکھنا۔"

اس نوجوان کا چہرہ کبھی کبھار ہی کیمرے کی طرف ہو رہا تھا۔ پھر جیسے کیمرہ اس کے کچھ قریب پہنچ گیا اور دیگر دو ایک جوڑوں کے ساتھ وہ مجھے واضح نظر آنے لگا۔ وہ نیلی آنکھوں اور بھورے بالوں والا ایک دراز قد اور وجیہہ نوجوان تھا۔ لڑکیاں بلاشبہ اس پر مرتی ہوں گی۔ اس کی ہم رقص قد میں اس سے کہیں چھوٹی تھی لیکن شاید اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کے گلے میں جھول ہی جائے۔ وہ پارے کی طرح تھرک رہی تھی۔

سب جوڑے رقص اور اپنے ہم رقص میں مگن تھے۔ دفعتاً" اس نوجوان نے دزدیدہ سی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنی ہم رقص کو کوئی اشارہ کیا۔ وہ مخمور سے انداز میں مسکرائی۔ پھر وہ دونوں رقص کرتے ہوئے جوڑوں کے درمیان سے راستہ بناتے ہوئے غیر محسوس طور پر بھیڑ سے نکل گئے۔

وہ سیڑھیوں کی طرف جا رہے تھے اور کیمرہ ان کا تعاقب کر رہا تھا۔ پھر فلم میں چند سیکنڈ کا وقفہ آیا۔ پھر جیسے کیمرے کے سامنے کرئی جالی سی آئی جو جلد ہی ہٹ گئی۔ وہ دونوں ایک بار پھر کیمرہ کے سامنے تھے اور دونوں ہی پر گویا شیطان سوار تھا مگر پھر وہ ایک طرف کو مڑے اور کیمرے کی زد سے نکل گئے۔ کیمرے نے ادھر ادھر تھوڑی سی حرکت کی۔ چند چیزیں اس کی زد میں آئیں جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کہیں بلندی سے کسی کمرے کا منظر گرفت میں لینے کی کوشش کر رہا تھا مگر کوئی رکاوٹ درمیان میں حائل تھی' بالآخر اسکرین تاریک ہو گئی۔

اس نوجوان کی صورت ذہن نشین ہو گئی ہے ناں؟" احسان مرزا نے پوچھا۔

"ہمیشہ کے لیے۔" میں نے جواب دیا۔

"اب ذرا یہ دوسری فلم دیکھو۔" اس نے **پروجیکٹر** کے بلب کی مدھم روشنی میں ہی فلم تبدیل کی۔

اس بار آٹھ ایم ایم کی چھوٹی سی اسکرین پر جو فلم شروع ہوئی' وہ بلیک اینڈ وائٹ تھی۔ پہلے چند ٹنڈ منڈ درخت دکھائی دیئے جن پر برف جمی ہوئی تھی۔ پھر اچانک ہی کیمرہ کسی لمبے اور نیم تاریک سے ہال میں پہنچ گیا۔ یہ ہال کسی خانقاہ سے مشابہ تھا۔ اس کی دیواروں پر **مشعلیں** روشن تھیں۔

یہ ہال لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ کچھ دو زانوں بیٹھے تھے اور کچھ اکڑوں۔ ان کے سروں پر مختلف بناوٹ کی اونی یا فرکی ٹوپیاں تھیں۔ ان کے لباسوں کا کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ مجموعی طور پر وہ حلیے سے پٹھان معلوم ہوتے تھے لیکن پٹھان نہیں تھے۔ ان میں سے جتنی بھی شکلیں واضح نظر آئیں' وہ نیپالی صورتیں معلوم ہوتی تھیں۔ کیمرہ ان پر سے ہوتا ہوا ایک بہت بڑے اسٹیج نما حصے پر جا ٹھہرا۔

اسٹیج پر دو بڑی بڑی **انگیٹھیاں** روشن تھیں جن سے کثیف سا دھواں اٹھ رہا تھا۔ ان کے درمیان دو پستہ قد لیکن تناسب اور خوبصورتی کے سانچے میں ڈھلی ہوئی دو لڑکیاں ہاتھوں میں تھال اٹھائے سر جھکائے کھڑی تھیں۔ ان کے جسموں پر منی اسکرٹ سے مشابہ سفید لبادے تھے جو بظاہر بغیر سلے ہی معلوم ہوتے تھے۔ ان کے کھلے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔

ان کے درمیان ایک شخص زمانہ غار کے سے انسانوں کا ریچھ کی کھال کا مختصر سا لباس پہنے آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اس کا سر اور شاید بھنویں بھی منڈی ہوئی تھیں اور اس کے گول مٹول چہرے پر بڑی بڑی سرخ آنکھیں کچھ زیادہ ہی نمایاں نظر آ رہی تھیں۔ بالوں سے بے نیاز اس کا بڑا سا گھٹا ہوا سر اور سفید سفید سا چہرہ کسی بہت بڑے انڈے سے مشابہ نظر آ رہا تھا۔

اس کا جسم کسرتی اور چوڑا چکلا تھا۔ وہ ہاتھ گود میں ٹکائے بیٹھا تھا اور اس کے بازوؤں کی مچھلیاں نمایاں نظر آ رہی تھیں۔ اس کے گلے میں موٹے موٹے منکوں والی کئی مالائیں تھیں۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ دھیرے دھیرے اس کے ہونٹوں کی حرکت میں تیزی آتی گئی اور ان کے گوشوں سے کف سا بہنے لگا۔ پھر اس نے بڑے جوشیلے انداز میں بازو ہلا کر سوالیہ نظروں سے حاضرین کے ہجوم کی طرف دیکھا۔

کیمرہ ہجوم کی طرف مڑا۔ لوگ جوش و خروش سے بازو ہلا کر کچھ کہہ رہے تھے۔ انداز کسی کی تائید میں نعرے لگانے کا سا تھا۔ ان میں سے کچھ اٹھ بھی کھڑے ہوئے تھے۔ کیمرہ

ایک بار پھر اسٹیج کی طرف مڑ گیا۔ وہ شخص مشفقانہ انداز میں دونوں بازو ہلا ہلا کر انہیں بیٹھ جانے کا اشارہ کر رہا تھا۔

پھر غالباً اس خانقاہ نما ہال میں سکوت چھا گیا اور وہ سر منڈا آنکھیں بند کر کے یوں دائیں بائیں سر ہلانے لگا جیسے وجد میں آ رہا ہو۔ اس کے دائیں بائیں دونوں لڑکیاں جو بتوں کی طرح ساکت کھڑی تھیں، دھیرے دھیرے جیسے ان میں جان پڑنے لگی۔

پہلے انہوں نے تھرکنا شروع کیا، پھر وہ باقاعدہ رقص کرنے لگیں۔ اس دھندلی سی بلیک اینڈ وائٹ فلم کی صورت میں بھی یہ رقص دیکھ کر میرے جسم میں چونٹیاں سی دوڑنے لگیں تھیں۔ تھال اب بھی لڑکیوں کے ہاتھ میں تھے۔ کبھی وہ اسے دائیں ہاتھ پر ٹکا لیتی تھیں اور کبھی بائیں ہاتھ پر۔ ان میں سے بار بار کسی چیز کی مٹھی بھر بھر کر وہ حاضرین کی طرف اچھالتی جا رہی تھیں، نہ جانے کیا چیز تھی۔ اسکرین پر چنوں سے مشابہ نظر آ رہی تھی۔ فلم یکلخت ختم ہو گئی۔

احسان مرزا نے پروجیکٹر بند کیا۔ لائٹ آن کی اور میرا ہاتھ تھام کر کاؤنٹر کے عقب سے نکل آیا۔ چند لمحے بعد ہم دوبارہ اسی کمرے میں آ گئے جہاں پہلے بیٹھے تھے۔ احسان مرزا نے اپنا وہی جام اٹھا لیا جو اس نے خوشی میں میز پر پٹخ دیا تھا اور جو آدھے سے زیادہ چھلک چکا تھا۔ میں بیٹھ چکا تو اس نے ایک گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے پوچھا۔ "ان دونوں فلموں میں تمہیں سب سے خاص بات کیا نظر آئی؟"

"یہی کہ بمبئی کے ایک ماڈرن کلب میں تھری پیس سوٹ پہن کر رقص کرنے والا اور زمانہ غار کے انسانوں کی طرح کھال لپیٹ کر اسٹیج پر بیٹھا ہوا وہ شخص ایک ہی ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"بہت خوب۔" وہ اپنی ران پر ہاتھ مار کر تقریباً چلا اٹھا۔ "تم بلاشبہ ایک بے مثال انسان ہو۔ اس حقیقت کو شاید ہی کوئی محسوس کر پاتا۔ رنگین فلم تقریباً چار سال پہلے کی ہے اور بلیک اینڈ وائٹ فلم ایک سال سے زیادہ پرانی نہیں۔ صحیح عرصے کا تعین بہرحال نہیں کیا جا سکتا۔ یہ فلمیں مجھ تک کیسے پہنچیں یا کیوں اور کیسے بنائی گئی تھیں، یہ ایک علیحدہ اور طویل کہانی ہے جسے ہم فی الحال نہیں چھیڑیں گے۔

رنگین فلم میں تم نے جس سوٹڈ بوٹڈ نوجوان کو دیکھا ہے، اس کا نام حشمت علی خان ہے۔ یہ نواب شرافت علی کی سب سے پہلی بیوی کا سب سے بڑا بیٹا ہے۔ میں بھی تقریباً پریقین ہوں کہ دوسری فلم میں نظر آنے والا شخص بے پناہ مختلف نظر آنے کے باوجود درحقیقت یہی ہے لیکن جب میں یہ غور کرتا ہوں کہ تین سال یا اس سے بھی کم عرصے میں یہ کایا کیسے پلٹی، وہ اس مقام پر کیسے پہنچا جہاں کی وہ تصویر ہے اور وہاں اس نے اتنے گہرے پنجے کیونکر گاڑے تو پھر میرا یقین متزلزل ہونے لگتا ہے کہ وہ نواب زادہ حشمت علی

ہی ہے۔

دوسری فلم میں تم نے جو ہال سا دیکھا ہے، وہ ایک عبادت گاہ ہے۔ اتنا تو تمہیں اندازہ ہو ہی گیا ہوگا۔ یہ عبادت گاہ ایک ایسی چھوٹی سی وادی میں واقع ہے جسے آباد ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ نیپال کی سرحد کے قریب واقع یہ وادی ایک پیالے کی سی شکل کی ہے۔ اس کے تین اطراف میں بلند و بالا پہاڑوں کی دیواریں ہیں۔

اندر جانے اور باہر آنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے۔ پتھروں کو تراش کر بنائی گئی یہ سڑک صرف چودہ پندرہ میل لمبی ہے اور ویرانوں اور دشوار گزار راستوں سے گزر کر اس تک پہنچا جا سکتا ہے۔ ہندوستانی نقشے کے مطابق تو یہ علاقہ ہندوستان ہی کی ملکیت ہے لیکن درحقیقت یہ تبت، نیپال اور ہندوستان کے درمیان پھیلی ہوئی اس کٹی پھٹی سی پٹی میں ہی شامل ہے جہاں ان تینوں علاقوں کے معتوب بلکہ کبھی کبھی ریڈ چائنا کے باغی بھی آ گھستے ہیں اور برسوں یہاں کے پرپیچ پہاڑوں یا وادیوں میں روپوش رہتے ہیں۔

عملاً یہ علاقہ آزاد ہی ہے۔ اب اس پٹی پر کئی بستیاں تو "مستقلاً" آباد ہو چکی ہیں اور ان کا اپنا اپنا ہی نظام ہے۔ یہ وادی جس کا میں ذکر کر رہا ہوں، انہی بستیوں میں سے ایک ہے۔ اس کی آبادی تقریباً پانچ ہزار ہے۔ اس کے باشندے نسلی طور پر تبتی ہیں لیکن سب کے سب نہیں..... ان میں دوغلے نیپالی بھی شامل ہیں۔ ان کے مذہبی نظریات اور معاشرتی نظام بھی نہ تو نیپالیوں سے ملتا ہے اور نہ تبتیوں سے۔

نیپال کے بیشتر قبیلوں میں سانپ کی پوجا کی جاتی ہے۔ یہ لوگ سانپ کے سخت دشمن ہیں۔ تبت والوں کا مذہبی پیشوا لامہ اور سب سے بڑا پیشوا دلائی لامہ ہوتا ہے لیکن یہ لوگ اپنے مذہبی پیشوا کو منوچی کہتے ہیں۔ اس کا مفہوم وہی ہے جو ہمارے ہاں پیر سائیں کا ہوتا ہے۔

ان کا ایک حکمران بھی ہوتا ہے جو صرف ایک سال کے لیے منتخب ہوتا ہے۔ وہ انہی میں سے کوئی معتبر اور عمر رسیدہ شخص ہوتا ہے۔ اسے "پائی" کہا جاتا ہے اور اسے ہمارے قبائلی جرگوں سے مشابہ ایک کونسل منتخب کرتی ہے لیکن وہ برطانیہ کی ملکہ کی طرح محض دکھاوے کا سردار ہوتا ہے۔ اصل اقتدار جرگے اور منوچی کے پاس ہی ہوتا ہے۔ خاص خاص فیصلے انہی کے اشاروں پر ہوتے ہیں۔

"یہ تو تم سمجھ ہی چکے ہو گے کہ حشمت علی ان کا "منوچی" بنا بیٹھا ہے اور اسکا باپ نواب شرافت علی ان لوگوں کا "پائی" بنا بیٹھا ہے۔ انہوں نے یہ مقام کیسے حاصل کیا اور زبان پر عبور کیسے حاصل کیا، یہ سوچ کر مجھے حیرانی ہوتی ہے۔ بے شک وہ لوگ بیوقوفی کی حد تک سادہ لوح اور بھیڑ چال کے عادی ہیں، پھر بھی اجتماعی طور پر ان کی لگام ہاتھ میں لے لینا بہت ہی چالاکی کی بات ہے۔

اس کا ایک جواز تو میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ وادی ایک طرح سے بسائی ہی حشمت علی نے تھی- دو تین سال پہلے تک یہاں صرف پانچ سات سو افراد تھے- دوسری بات یہ کہ اس نے تمام مذاہب کے پیروں' فقیروں کے برعکس شروع شروع میں لوگوں سے نذرانے وغیرہ لینے کے بجائے ان میں اشیائے ضرورت تقسیم کیں- انہیں مختلف کاموں کا ڈھنگ سکھایا-

"اس کے وہاں جا بسنے کی وجوہات سمجھنا کچھ مشکل نہیں- یہ حکمت عملی خواہ ان لوگوں کی اپنی تھی یا مافیا کی تجویز کردہ لیکن بہرحال تھی بہت خوب- میں اب بھی اس پر غور کرتا ہوں تو عش عش کر بیٹھتا ہوں- اتنی لمبی پلاننگ ہم شہری قسم کے مجرم کبھی نہیں کر سکتے اور نہ ہی تمدن زندگی سے دور ہونے کا تصور کر سکتے ہیں-

ہمیں اس طرح کے دور دراز علاقے میں ایسی وحشیانہ زندگی گزارنا شاید بہت تکلیف دہ معلوم ہو' حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر ایسے علاقوں میں انسان کو پانچ سات ہزار انسانوں پر بھی اقتدار حاصل ہو جائے تو کہیں زیادہ تعیشات اور فطرت کی نہ جانے کتنی خوبصورتیاں اس کی غلام ہوتی ہیں-

اب تم اس حشمت علی کو ہی دیکھ لو- تم نے اس کی تین چار سال پہلے کی شہری زندگی کی فلم بھی دیکھی ہے- ٹھیک ہے کہ اس وقت بھی وہ صحت مند اور وجیہہ تھا لیکن اسے دیکھ کر پھر بھی پلپلے پن اور نزاکت کا احساس سا ہوتا تھا- پھر تم نے دوسری فلم میں اسے دیکھا- فلم بہت ناقص سی تھی لیکن تم نے دیکھا' وہ کتنا تومند کڑیل اور سخت جان نظر آرہا تھا؟ ٹارزن کی اولاد بن گیا ہے-

"اسے وہاں کس چیز کی کمی ہے؟ فطرت کے تمام مظاہر اور تمام تعیشات اپنے اصل روپ میں اسے افراط سے میسر ہیں- بہترین جانوروں کا گوشت وہ کھاتا ہے- بہترین شرابیں وہ پیتا ہے- شہر کی گھاگ لڑکیوں کی جگہ اچھوتی' کمسن اور حقیقی معنوں میں حسین لڑکیاں اس کے ایک اشارے پر قربان ہونے کے لیے دست بستہ کھڑی رہتی ہیں- ہزاروں بیوقوف اس کے لیے سر کٹانے کو تیار رہتے ہیں- آلائشوں سے پاک' مصفا اور فولاد کی آمیزش والا پہاڑی پانی اسے پینے کے لیے میسر ہے- گرد اور دھوئیں سے پاک تازہ ہوا میں وہ سانس لیتا ہے- میں سمجھتا ہوں کہ وہ ہم سے کہیں بہتر زندگی گزار رہا ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ لوٹ کر بمبئی آئے تو چار دن میں بیمار پڑ جائے-"

اس کے لہجے میں رشک نہیں' غصہ اور دبی دبی جھنجلاہٹ تھی- میں نے محسوس کیا کہ وہ اصل موضوع سے ہٹ رہا تھا' تاہم میں خاموش رہا-

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ خود ہی اصل موضوع پر آگیا- گہری سانس لے کر بولا- "اب میں اس معاملے کے دوسرے اور اصل پہلو کی طرف آتا ہوں- جیسا کہ میں نے کہا کہ اس خبیث نے خوب تاڑ کر یہ جگہ منتخب کی ہے- تم ذرا چشم تصور سے اس چھوٹی سی وادی کی بناوٹ ذہن میں لاؤ- تقریباً چاروں ہی طرف بلند و بالا پہاڑوں کی دیواریں ہیں- صرف ایک ہی راستے سے وادی میں داخل ہونا ممکن ہے اور وہ بھی گاڑیوں پر لیکن کسی بڑے ہجوم کی صورت میں نہیں یعنی اس وادی میں رہتے ہوئے اگر صرف سو دو سو مسلح اور جانباز اس علاقے کے بھیدی اور آپ کے اشارے پر سر کٹانے والے آپ کے ساتھ ہوں تو آپ اچھی بھلی فوج کو بھی اندر آنے سے نہ صرف روک سکتے ہیں بلکہ اگر وہ زیادہ ہی جرات مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پیش قدمی جاری رکھیں تو قسطوں میں انہیں بھون بھی سکتے ہیں-

"یہ تو ہوئی دفاعی نقطہ نظر سے اس کی اہمیت.....اب آؤ دوسرے سلسلوں کی طرف- ان لوگوں کا کوئی خاص ذریعہ معاش نہیں ہے- جہاں تک میں معلومات جمع کر سکا ہوں' یہاں لوگ کچھ برفانی لومڑیوں اور ریچھوں کا شکار کرتے ہیں اور ان کی چربی اور کھالیں وغیرہ نیپال یا کسی قریبی علاقے کی طرف بھجوا دیتے ہیں مگر یہ کام ایک طرح سے سیزن ہی کا ہے-

"اصل معاملہ یہ ہے کہ وادی کے پچھلے حصے میں نشیب ہیں اور خارجی راستے کے دائیں بائیں ڈھلانوں میں جو نرم اور بھربھری زمین ہے' وہ سب کی سب قدرتی طور پر ہی بھنگ' افیون اور ان تمام چیزوں کے پودوں سے اٹی پڑی ہے جن سے منشیات تیار ہو سکتی ہیں-

حشمت علی یعنی منوچی صاحب نے یہ کیا ہوا ہے کہ بیشتر باشندوں کو باقاعدہ کھیتی باڑی میں لگا کر روزگار فراہم کیا ہے اور کھیتی باڑی انہی منشیات کے پودوں کی ہوتی ہے- سادہ لوح باشندوں کو اس سے غرض نہیں کہ منوچی صاحب فصلوں کا کیا کرتے ہیں- انہیں تو اس بات سے مطلب ہے کہ انہیں ضروریات زندگی اور رائفلیں ملی ہوئی ہیں-

"ویسے بھی ان علاقوں میں منشیات کوئی اتنی معیوب چیزیں نہیں ہیں- گو کہ وہ لوگ

خود منشیات برائے نام ہی استعمال کرتے ہیں لیکن ان کو دیگر عام چیزوں ہی کی طرح سمجھتے ہیں۔ ادھر نیپال قریب ہی ہے جہاں سے منشیات کی نقل و حرکت یا مقامی طور پر فروخت قطعاً دشوار نہیں۔ میں نے سنا ہے کہ اسی وادی سے منشیات کچی شکل میں کھٹمنڈو کی ایک بہت بڑی لیبارٹری میں جاتی ہیں جو معقول معاوضے پر ان سے ہیروئن تیار کر کے دیتی ہے۔

"لیبارٹری ویسے تو دوائیاں تیار کرتی ہے اور اس کا جائز اور قانونی بزنس بہت بڑا ہے لیکن یہ کام گویا وہ "اوور ٹائم" کے طور پر کرتی ہے۔ لیبارٹری والوں کو یہ نہیں معلوم ہونے پاتا کہ کھیپ کہاں سے آتی ہے اور کہاں جاتی ہے......یا ممکن ہے اس کے مالکان میں سے کسی کو معلوم ہو لیکن میرے لوگوں کو اس کا پتا نہیں چل سکا۔

بظاہر یہ بڑا حقیر اور زیادہ دردسری کے مقابلے میں کم آمدنی کا سلسلہ معلوم ہوتا ہے لیکن تمہیں سن کر حیرت ہوگی کہ معاملہ کروڑوں کی سالانہ آمدنی تک پہنچا ہوا ہے اور دن بدن پھل پھول رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ حشمت علی اور شرافت علی کے دائرہ اقتدار اور قوت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ وہیں بیٹھ کر یہ دوسرے جرائم کو کنٹرول کر رہے ہیں۔ ہندوستان کی زیرزمین دنیا کے بہت بڑے حصے کا کنٹرول ان کے پاس ہے۔ مین پاور بھی ان کے پاس موجود ہے۔ کھٹمنڈو کے راستے ان کا رابطہ بمبئی وغیرہ سے قائم ہے۔ دونوں باپ بیٹا ایک محفوظ جگہ بیٹھ کر وہاں بھی اور یہاں بھی حکومت کر رہے ہیں۔

مزے کی بات یہ ہے کہ نیپال یا ہندوستان دونوں میں سے کوئی بھی حکومت اس طرف متوجہ نہیں ہو رہی ہے۔ میں نے ادھر توجہ دلانے کے لیے دو ایک ڈوریاں ہلائیں مگر ایک تو ہر حکومت کو اس سے کہیں زیادہ بڑے اور اہم مسئلے درپیش ہیں جن میں وہ ہمہ وقت الجھی رہتی ہے' دوسری بات یہ کہ نازک سرحدی علاقوں اور خونخوار مسلح قبائلیوں کو کوئی بھی حکومت نہیں چھیڑتی۔

کوئی پتا نہیں ہوتا کہ یہ قبائلی جب بپنے لگیں تو کس ملک کے آلہ کار بن جائیں۔ جس دوغلے قبیلے کا میں نے تمہیں بتایا ہے' وہ بھی بظاہر پرامن' سادہ لوح اور بے ضرر ہے لیکن اس کے باوجود اڑنے اور لڑنے کے معاملے میں وہ کچھ کم خطرناک نہیں۔ اگر کوئی حکومت اس قسم کے قبیلوں سے ٹکرائے بھی تو خونریزی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اس کا کوئی نتیجہ تو کبھی نکل سکتا ہے کہ ہندوستان جیسی کوئی بڑی حکومت یہ تہیہ ہی کر لے کہ اسے اس پٹی پر اپنی حکمرانی ہر حال میں قائم کرنی ہے۔

"عالم یہ ہے کہ ایک بار حکومت نے کچھ قبائلیوں پر سختی کی تو وہ ایک آتش فشاں پہاڑ پر چڑھ کر اس کے دہانے کے اندر گھس کر بیٹھ گئے۔ کئی ماہ کی کوششوں کے بعد بالآخر جب فوج انہیں نکالنے میں کامیاب ہوئی اور انہیں نیچے لایا گیا تو وہ زمانہ غار کے انسانوں سے بھی بدتر نظر آرہے تھے۔"

ان کے بال اور داڑھیاں جھاڑ جھنکاڑ کی طرح بڑھی ہوئی تھی۔ جسموں پر میل کی تہیں تھیں اور جگہ جگہ جوئیں قطار در قطار چل رہی تھیں۔ ان کے وجود سے بدبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ پہاڑوں پر انہوں نے اس عالم میں دن گزارے کہ جو بھی جانور یا پرندہ ہاتھ لگتا تھا' اسے کاٹ کر کچا کھا جاتے تھے۔ تقریباً سب کے سب ٹی بی کا شکار تھے اور خون تھوک رہے تھے مگر انہیں جیسے کسی بھی بات کی کوئی پروا نہیں تھی۔

ان کی رائفلیں اور مشین گنیں گو کہ خالی ہو چکی تھیں مگر وہ انہیں ایک لمحے کے لیے بھی اپنے سے جدا کرنے کے لیے تیار نہیں تھے اور بار بار متوقع نظروں سے اپنے سردار کی طرف دیکھتے تھے کہ اگر وہ اب بھی لڑنے کا حکم دے تو وہ خالی بندوقوں سے ہی لڑنا شروع کر دیں۔ میرے ایک دوست سرکاری افسر نے بہت سے اس قسم کے واقعات مجھے سنائے تھے۔

یہ مثال میں اس لیے تمہارے گوش گزار کر رہا ہوں کہ تمہیں صحیح طور پر اندازہ ہو سکے کہ حشمت علی اور شرافت علی اپنی عملداری میں کتنے محفوظ ہیں۔ میرے پاس "مافیا فیملی" کا یہی ایک سراغ ہے اور اس کے پیچھے بھی کئی جانیں ضائع کر چکا ہوں۔ میں نے موت کے کئی ہرکارے اس وادی کی طرف بھیجے لیکن کوئی زندہ واپس نہیں آسکا حتیٰ کہ کوئی وادی میں داخل تک نہیں ہو سکا۔

مجھے صحیح طور پر علم تو نہیں لیکن میرا اندازہ یہی ہے کہ حشمت علی نے لوگوں کی شناخت اور داخلے کا کوئی ایسا نظام ضرور وضع کر رکھا ہے جس سے گزر کر کسی مشکوک اجنبی کا وادی میں داخل ہونا ممکن نہیں اور اس قسم کا انتظام کرنا اس کے لیے کوئی بڑی بات نہیں تھی کیونکہ وادی میں داخل ہونے کا تو ایک ہی راستہ ہے.....اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ شاید تقدیر بھی اس کے ساتھ ہے۔ اپنی ایک اور کمزوری بھی میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ میرے پاس ایسے ذہین آدمیوں کی سخت کمی ہے جو تنہا اپنی ذات میں ایک گروہ ہوں۔ کسی مہم کو اپنے طور پر سر کر سکتے ہوں۔ ضروری نہیں کہ تم وہاں پہنچنے کے بعد بھی انہیں ختم کر سکو۔

"اس لحاظ سے یہ ایک طرح کا جوا بھی ہے......لیکن ایک بات تو بہرحال طے ہے کہ اگر میرا یہ اندازہ جس کے درست ہونے کا قوی امکان ہے' درست ہی ہوا تو اس ایک سراغ سے سراغ ملتا چلا جائے گا اور ہم اس پوری سلطنت کی بساط لپیٹ دیں گے جو دن بدن پھیلتی اور مضبوط ہوتی جا رہی ہے۔ اب بولو.....کیا تم یہ جوا کھیلنے کے لیے تیار ہو؟"

احسان مرزا خاموش ہو گیا لیکن ساتھ ہی مضطربانہ انداز میں ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ اس کی نظر مجھ پر ہی جمی ہوئی تھی۔ میں نے نہایت توجہ اور خاموشی سے اس کی طویل گفتگو کا ایک ایک لفظ سنا تھا اور میرا ذہن اس وقت اتنا مستعد تھا کہ ٹیپ ریکارڈ کی طرح ہرلفظ کو

گویا ریکارڈ کرتا جا رہا تھا۔

میں نے گہری سانس لی، بالوں میں انگلیاں پھیریں اور سر جھٹک کر بغور اس کی طرف دیکھا۔ معلوم نہیں کیوں بے پناہ طاقت کا مالک یہ مختصر سا شخص مجھے بھی اسی طرح اچھا لگنے لگا تھا جس طرح بقول اس کے، میں اسے اچھا لگتا تھا۔ مجھے بھی اس سے انسیت سی محسوس ہونے لگی تھی۔ اس کی بشری برائیاں اپنی جگہ سہی لیکن مجھے اس کی سچائی اور کھرا پن بہت پسند آیا تھا۔ کم از کم مجھے جب سے اس نے دوست کہا تھا، تب سے میں محسوس کر رہا تھا کہ میں اس پر انحصار کر سکتا ہوں۔ میرے لیے وہ دنیا کا ہر وہ کام کر سکتا ہے جو اس کے بس میں تھا۔ اس کے انداز میں کچھ کچھ شفقت اور بزرگی سی بھی تھی۔ وہ میری طرف دیکھتا تھا تو اس کی نظروں میں کچھ ایسا تفاخر اور مان نظر آتا تھا جیسے واقعی بقول اس کے کسی دیہاتی کا بیٹا ولایت پاس کرکے آگیا ہو۔ ایسے ساتھی، دوست اور...... پشت پناہی کرنے والے کی مجھے ضرورت تھی۔

"احسان مرزا!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تمہارا دوستی کا ہاتھ تھام کر بھی تو میں نے جوا ہی کھیلا ہے، اب مزید خطرات کی کیا پروا کرنا۔ وہ جو ایک محاورہ ہے نا کہ اونٹوں والوں سے دوستی ہو تو گھر کے دروازے اونچے رکھنے پڑتے ہیں، لہٰذا جناب! جب دوستی احسان مرزا سے ہو تو پھر خطرات سے کیا گھبرانا۔ اگر یہ جوا ہے تو جوا ہی سہی، تمہاری خاطر کھیلیں گے ضرور......"

"جیو پیارے!" اس نے جام رکھ کر قریب آکر دونوں ہاتھوں سے میرے کندھے زور زور سے تھپتھپائے۔ "ایک طویل عرصے بعد کسی طرف سے قلب کو اطمینان دینے والی ہوا کا جھونکا آیا ہے۔"

مجھے اپنے آپ پر قدرے حیرت بھی ہوئی۔ حالات نے مجھے ڈپلومیسی سکھا دی تھی۔ جوا مجھے اس کی خاطر نہیں، اپنی خاطر، اپنی ماں اور اپنے گم شدہ وقار کی خاطر کھیلنا تھا لیکن احسان مرزا اسے اپنی گردن پر احسان شمار کر رہا تھا۔

"تو پھر کتنے عرصے تک جانے کا ارادہ رکھتے ہو؟" چند لمحے بعد اس نے پوچھا۔

"عرصے کا کیا سوال ہے۔" جتنی جلدی بھی ممکن ہوا، میں چلا جاؤں گا۔ اس نوعیت کے کاموں میں تاخیر قطعی مناسب نہیں ہوتی۔ میں پرسوں یا زیادہ سے زیادہ اس سے اگلے روز روانہ ہونے کا ارادہ رکھتا ہوں۔"

"بہت خوب......" اس کی آنکھوں میں دنیا جہاں کی ستائش سمٹ آئی۔ "تمہاری تیاریاں کیا کیا ہوں گی؟"

"کچھ نہیں......" میں نے جواب دیا۔ "مجھے صرف ایک چھوٹی سی چیز کی ضرورت ہوگی۔ اس کی تمہیں زحمت دوں گا۔ وہ بھی اس لیے کہ وہ چیز مجھے جلدی چاہیے اور اس

لائن میں میری کوئی خاص واقفیت نہیں۔"

میں نے اپنے گلے سے اپنا طلائی لاکٹ نکالا اور احسان مرزا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اس میں مجھے مختصر ترین حجم کی کوئی ایسی ڈیوائس فٹ کروا دو کہ اس لاکٹ کے ارد گرد چند سو گز کے دائرے میں ہونے والی گفتگو میں کسی ریسیونگ سیٹ پر سن سکوں۔ ریسیور کا دائرہ عمل جتنا زیادہ ہو، اتنا ہی بہتر ہے۔"

لاکٹ اس نے میرے ہاتھ سے لے لیا اور سرسری نظروں سے دیکھ کر مسکرایا۔ "بس تمہیں صرف اسی چیز کی ضرورت ہوگی؟"

"بس......" میں نے حتمی لہجے میں کہا۔ "اور کسی چیز کی ضرورت ہوگی بھی تو اس کا میں خود ہی انتظام کر لوں گا۔"

"یہ تو خیر کوئی مشکل کام نہیں...... یہ تمہیں صبح تک مل جائے گا۔ کیا اکیلے ہی جاؤ گے؟"

"نہیں۔ شکنتلا عرف کیٹی میرے ساتھ ہوگی۔" میں نے جواب دیا اور اگر ضروری ہوا تو میرے ساتھ کچھ ساتھی بھی ہوں گے۔"

"میں دراصل یہ بتا رہا تھا کہ اصل مرحلہ وادی میں داخل ہوتے وقت ہی شروع نہیں ہوتا۔" وہ اصل موضوع پر آتے ہوئے بولا۔ پھر وہ بچوں کی طرح شریر انداز میں مسکرایا۔ "اس سے پہلے ہی راہ وفا میں امتحان شروع ہو جاتے ہیں۔" انداز ایسا تھا جیسے کوئی نوآموز اپنا پہلا شعر موزوں کرکے خوش ہو رہا ہو۔

"کچھ پتا نہیں چلتا کہ جال کہاں تک پھیلا ہوا ہے۔" اس نے سنجیدگی سے سلسلہ کلام جوڑا۔ "مافیا" کا ہاتھ کہاں تک ہے اور "فیملی" کے اپنے وسائل کہاں تک کام کر رہے ہیں۔ میرے وہ موت کے ہرکارے جن کے ریکارڈ پر مجھے فخر تھا، جو جہاں بھی گئے، اپنے شکار کو پیغام اجل پہنا کر ہی آئے، ہمیشہ کامیاب اور کامران ہی لوٹے۔ ان میں سے کوئی تو بھوٹان تک بھی پہنچتے نہیں پایا۔ کوئی وادی کے نواح میں ہی مارا گیا۔ کوئی کسی پہاڑ پر پہنچ کر لڑھک گیا۔ صرف ایک تھا جو وادی میں داخل ہونے میں کامیاب ہوا لیکن رات وہاں نہیں گزار سکا۔ رات اس کی عالم بالا میں ہی گزری، اس لیے میں کہتا ہوں کہ تم الٹی طرف سے آنا۔ کھٹمنڈو میں ہر رنگ و نسل کے لوگوں کا ہجوم رہتا ہے۔ مجھے اس امر کا امکان بہت کم نظر آتا ہے کہ موت وہاں سے تمہارا تعاقب شروع کر دے گی...... بہرحال فیصلہ تمہیں خود کرنا ہے۔ رات کو ہم نقشے سامنے رکھ کر تفصیل سے پروگرام طے کریں گے...... فی الحال تم آرام کرو۔"

اس کے ٹھیک چار دن بعد میں اور کیٹی جاپان ایئر لائنز کے ایک طیارے میں نیپال کی طرف محو پرواز تھے لیکن ہم دونوں ساتھ نہیں تھے اور نہ ہی ہم میں کوئی تعلق نظر آتا

تھا۔ وہ مجھ سے کئی نشستیں آگے گزرگاہ کے قریب تھی۔ اس کے قریب ایک انگریز جوڑا اور ایک جاپانی نوجوان بیٹھا تھا۔ میں فرسٹ کلاس کی نشستوں کی آخری قطار میں کھڑکی کے قریب تھا جہاں دو جڑواں نشستیں ہوتی ہیں۔ میرے قریب ایک ادھیڑ عمر مارواڑی سیٹھ فولڈنگ ٹیبل کھولے حساب کتاب میں مصروف تھا۔

کیٹی اس وقت کوئی آسودہ حال اور لا ابالی یوریشن لڑکی دکھائی دے رہی تھی اور میں ایک نودولتیا نوجوان...... سامان ہمارے پاس برائے نام تھا۔ محض ایک ایک بیگ اور وہ بھی اتنا چھوٹا کہ اسے لگیج میں بھیجنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔

میں نے احسان مرزا کی ہدایات سے بھی زیادہ احتیاط سے کام لیا تھا اور سفر کا آغاز ہی ایک غیر ضروری اور طویل چکر سے کیا تھا۔ پہلے ہم انڈین ایئر لائنز کی ایک پرواز سے بمبئی سے دہلی آئے تھے اور وہاں سے کھٹمنڈو جانے کے لیے جاپان ایئرلائن کی یہ پرواز پکڑی تھی جو ایمسٹرڈیم سے آرہی تھی۔ یہ پرواز کابل اور راولپنڈی سے ہوتی ہوئی کھٹمنڈو جاتی تھی۔

پورے سفر کے دوران میں نے ایک لاپروا امیرزادے کا رول ادا کرنے کی کوشش کی تھی۔ کئی لڑکیوں کو ندیدے پن سے گھورا بھی تھا لیکن پھر گویا ان سے متعارف ہونے کی جرات محسوس نہ کرتے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ بظاہر گویا مجھے گرد و پیش کا کوئی ہوش نہیں تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ میں نے اس امر کا پورا پورا خیال رکھا تھا کہ ہمارا تعاقب تو نہیں کیا جا رہا لیکن ایسے کوئی آثار نظر نہیں آئے تھے۔

کیٹی نے نیلم اور سنگ مرمر سے بنی ہوئی آنکھ والا لاکٹ پہن رکھا تھا۔ اس میں ڈیوائس فٹ تھی۔ میرے کوٹ کی بریسٹ پاکٹ میں ماچس کی ڈبیا کے برابر ایک آلہ تھا جو بظاہر آلۂ سماعت معلوم ہوتا تھا اور اس کا ننھا سا ایئرفون بھی میرے کان میں لگا ہوا تھا۔ درحقیقت یہ صرف اس ڈیوائس کا ریسیور تھا جو کیٹی کے لاکٹ میں فٹ تھی۔ کیٹی کے آس پاس ہونے والی گفتگو میں بہ آسانی سن رہا تھا۔ لاکٹ کیٹی نے اس طرح پہنا ہوا تھا کہ آسانی سے نظر آتا رہے۔

وہ لاکٹ میرا ہی تھا لیکن اسے اس شکل میں احسان مرزا نے ہی ڈھلوایا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ مافیا کے کارندے یہ نشان اپنی شناخت آپس میں واضح کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ اسے امید تھی کہ یہ نشان دیکھ کر مافیا کا کوئی آدمی کیٹی کی طرف متوجہ ہوگا اور وہاں سے سرا میرے ہاتھ آجائے گا۔

کھٹمنڈو کے ایئرپورٹ پر اترتے ہی مجھے سردی کا احساس ہوا۔ طیارے کی حرارت آمیز فضا سے نکل کر لاؤنج تک آتے آتے بہرحال میرا جسم اس خنکی سے قدرے مانوس ہوگیا۔ مسافروں میں صرف میں اور کیٹی ہی ایسے تھے جن کے پاس صرف ایک ایک بیگ تھا اور ہمیں متحرک بیلٹ کے قریب کھڑے ہو کر سامان کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

چنانچہ ہم دونوں سیدھے باہر آگئے لیکن پہلے ہی کی طرح ایک دوسرے سے لاتعلق انداز میں۔

الگ الگ ٹیکسیوں میں بیٹھ کر ہم کیمپ ہوٹل کی طرف روانہ ہو گئے۔ احسان مرزا کے ایک ایجنٹ نے ہمارے لیے ایک ہی فلور پر دو کمرے ریزرو کروا رکھے تھے لیکن یہ کمرے ساتھ ساتھ نہیں تھے۔ ان کے درمیان اور بھی کئی کمرے تھے۔ یہ ہدایت میں نے ہی کر دی تھی کہ کمرے ساتھ ساتھ نہیں ہونے چاہئیں۔

میں اپنی ٹیکسی کو ذرا فاضل چکر دے کر ایک دکان سے کوئی چیز خریدنے کے بہانے قدرے تاخیر سے ہوٹل تک لایا تاکہ اس دوران کیٹی اپنے کمرے میں جا چکے۔ میں جب ہوٹل میں پہنچا تو کاؤنٹر کلرک نے میرا نام سنتے ہی ایک چابی میرے حوالے کر دی اور دستخط کرنے کے لیے اندراجات کا کارڈ میری طرف کھسکا دیا۔

دستخط کرکے میں مڑا تو پورٹر کی وردی میں ایک نوعمر نیپالی لڑکا دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا میرے بیگ کو بغور دیکھ رہا تھا جو فرش پر رکھا تھا۔ اس کی نظر درحقیقت بیگ پر چسپاں ایک اسٹیکر پر تھی۔ مجھے مڑتے دیکھ کر وہ مسکرایا اور بیگ اٹھانے کے لیے آگے بڑھا۔ بیگ اٹھا کر وہ لفٹ کی طرف چل دیا۔ میں اس کے پیچھے تھا۔

کمرے میں پہنچ کر وہ بیگ رکھ چکا تو میں نے اسے ٹپ دی۔ وہ سلام کرکے جانے کے لیے مڑا لیکن جاتے جاتے اپنے بش کوٹ کی جیب سے ایک چھوٹا سا سفید کارڈ نکال کر مجھے تھما گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے کارڈ پر نظر دوڑائی۔ اس پر انگریزی میں مختصر سا ٹائپ شدہ مضمون تھا۔

"کیبن ریستوران..... آسن تول..... شام چار بجے...... آپ کی جیب میں سفید رومال نظر آنا چاہیے۔"

بھیجنے والے کی ذات کی طرف کوئی اشارہ موجود نہیں تھا' تاہم مجھے معلوم تھا کہ یہ پیغام دوستوں کی طرف سے تھا۔ احسان مرزا نے مجھ سے کہا تھا کہ کھٹمنڈو پہنچ کر جو ابتدائی مسائل مجھے پیش آسکتے ہیں' انہیں حل کرنے کا انتظام خودبخود ہی ہوتا چلا جائے گا' مجھے اس سلسلے میں فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

میرا سب سے پہلا مسئلہ تو یہ تھا کہ میں ہندوستان سے آتے وقت کم از کم دو ہیوی گنیں ساتھ لانا چاہتا تھا مگر میں ایک بھی نہیں لا سکتا تھا کیونکہ سکیورٹی چیکنگ بہت سخت تھی۔ سامان میں ساتھ لانا نہیں چاہتا تھا ورنہ گنیں سوٹ کیسوں میں جوڑ علیحدہ کرکے بھی رکھی جا سکتی تھی۔ سوٹ کیس تو سیدھے لگیج میں چلے جاتے لیکن پھر بھی خطرہ موجود تھا کہ ان کے غیر معمولی وزن پر کوئی شبہ نہ کر بیٹھے۔

ہیوی گنیں میری نظر میں ویسے بھی کوئی خاص کام کی چیز نہیں تھیں لیکن محض اس

لیے ساتھ رکھنا چاہتا تھا کہ اگر سب تدبیریں ناکام ہو جائیں تو آمنے سامنے باقاعدہ میدان جنگ کی سی کیفیت پیدا کر کے دہشت پھیلائی جا سکے۔ بہرحال احسان مرزا نے اس سلسلے میں میری تشویش دور کر دی تھی اور کہہ دیا تھا کہ کھٹمنڈو یا نیپال کے کسی اور مقام پر بھی مجھے جس قسم کے اسلحے کی بھی ضرورت ہو گی، مل جائے گا اور اس کے آدمی مختلف مراحل پر خود ہی مجھ سے رابطہ قائم کرتے رہیں گے۔ اسی طرح مجھے کسی بھی ملک کی کرنسی اور سواری کے لیے کار یا جیپ بھی مل سکتی تھی۔

اس طرح میرے کافی تفکرات کم ہو گئے تھے۔

دروازہ مقفل کرنے کے بعد میں نے کپڑے بھی نہیں بدلے اور سب کچھ ذہن سے جھٹک کر سو گیا۔ جب میری آنکھ کھلی تو میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا کیونکہ کھڑکیوں کے بلائنڈز کھلے ہونے کے باوجود کمرے میں اندھیرا سا پھیلا ہوا محسوس ہو رہا تھا لیکن گھڑی دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا۔ ابھی تین ہی بجے تھے البتہ آسمان پر بادلوں نے سورج کو یوں ڈھانپ لیا تھا جیسے زمانہ دولت مندوں کے گناہوں کو چھپا لیتا ہے۔ اسی لیے کمرے میں اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔

تیار ہو کر میں نے ایک بار پھر وہ کارڈ دیکھا۔ اس کے مطابق مجھے کیبن ریستوران میں پہنچنا تھا جو آسن تول کے علاقے میں واقع تھا۔ کمرے سے نکلنے سے پہلے میں نے کارڈ پرزے پرزے کر کے فلش کر دیا۔

کیٹی کے کمرے کے سامنے سے گزرتے وقت میں نے دروازے کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا اور لفٹ سے نیچے آ گیا۔ ہوٹل کے صدر دروازے کے قریب ہی کئی ٹیکسیاں کھڑی تھیں لیکن میں پیدل ہی ایک طرف کو روانہ ہو گیا۔ ہوٹل سے تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر ہنومان دیوتا کا ایک بہت بڑا بت نصب تھا۔ اس کے عقب میں بھاوانی کا مندر سر اٹھائے کھڑا تھا۔ یہاں سڑک کافی چوڑی تھی اور خوب چہل پہل نظر آ رہی تھی۔

چلتے چلتے میں نے اچانک ہی ایک ٹیکسی کو ہاتھ دے کر روکا اور اس میں بیٹھتے ہی ڈرائیور کو ایک بغلی گلی کی طرف مڑنے کا حکم دیا۔ کئی گلیوں میں چکرانے کے بعد میں نے اسے آسن تول کی طرف چلنے کو کہا۔ مجھے تقریباً یقین تھا کہ کوئی میرا تعاقب نہیں کر رہا تھا لیکن میں حتی الامکان احتیاط برت رہا تھا۔

ٹیکسی جب کیبن ریستوران کے سامنے رکی تو ایک لمحے کے لیے مجھے شبہ سا ہوا کہ کیا واقعی مجھے اسی جگہ پہنچنے کے لیے کہا گیا ہے؟ کیبن ریستوران میری توقعات سے بہت ہی مختلف تھا۔

دراصل یہ ایک پانچ منزلہ عمارت کا تہہ خانہ سا تھا لیکن اس کی حالت ایک بڑے چھپر سے مشابہ تھی جس کی دیواریں، ستون اور چھت میل کچیل اور داغ دھبوں کے علاوہ

دھوئیں کی سیاہی سے بھی اٹی ہوئی تھی۔ بے ہنگم میز اور کرسیاں بے ترتیبی سے ادھر ادھر بکھری ہوئی تھیں اور صرف یہی نہیں، دیواروں کے چاروں طرف بنچیں بھی لگی ہوئی تھیں۔

ریستوران کی پیشانی پر بہت لمبا چوڑا رنگ برنگا بورڈ آویزاں تھا۔ ریستوران کا مینو بھی اسی بورڈ پر درج تھا اور اس مینو میں بھنگ کے پکوڑوں سے لے کر حشیش کے بھرے ہوئے سگریٹ اور افیون والا سالن تک شامل تھا۔

اندر نیم تاریک چھپر نما ہال میں ہر رنگ و نسل کے افراد موجود تھے جن میں مرد اور عورتیں ہی نہیں، تیسری جنس کے نمائندے بھی شامل تھے۔ دیواروں پر جا بجا ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں درج نوٹسوں میں آوارہ گردوں کو نوید سنائی گئی تھی کہ وہ بے شک دن بھر یہاں بیٹھے رہیں، کھڑے رہیں اور دل چاہے تو لیٹے رہیں اور جو جی چاہے کریں لیکن رات گزارنے کے لیے کوئی اور ٹھکانہ تلاش کر لیں۔

ہال میں حشیش کا دھواں چکرا رہا تھا۔ اس جگہ کی ایک خوبی میں نے جلد ہی محسوس کر لی کہ ہر گاہک خواہ وہ مرد تھا یا عورت، اگر وہ تنہا تھا تب بھی اپنے آپ میں مگن تھا اور اگر کسی کا ساتھی موجود تھا تو وہ ایک دوسرے ہی میں گم تھے، کسی اور کی طرف کسی کا دھیان نہیں تھا۔

ایک چھوٹی سی میز خالی پا کر میں ایک کرسی سنبھال کر بیٹھ گیا اور گھڑی دیکھی چار بجکر چند منٹ ہو چکے تھے۔ ذرا ہی دور ایک میز پر مجھے کیٹی بھی نظر آ گئی، اسے بھی یقیناً میرے ہی جیسا پیغام ملا تھا۔ وہ بالکل صحیح وقت پر یا چند منٹ پہلے ہی یہاں پہنچ گئی تھی۔ اس کی انگلیوں میں ایک سگریٹ سلگ رہا تھا، وہ دھیرے دھیرے اس کے کش لے رہی تھی اور اس کی نیم وا آنکھوں میں تیرتی ہوئی نمی سی بتا رہی تھی کہ سگریٹ میں حشیش بھری ہوئی تھی۔

ابھی میں نے اسے کچھ خاص ہدایات دینی شروع نہیں کی تھیں شاید اس لیے کام کو سنجیدگی سے نبھانے کے ساتھ ساتھ اپنی طبیعت کی آوارگی کی تسکین کا بھی ہلکا پھلکا سامان کر رہی تھی۔

ایک ویٹر ٹین کی ایک خالی بیضوی ٹرے گھٹنے پر بجاتا میرے قریب آیا، وہ ویٹر کم اور بن مانس زیادہ معلوم ہوتا تھا۔ ایسا بن مانس جس کی صحت معمول سے کچھ کمزور ہو گئی ہو، اس نے جھک کر اپنے چوڑے چوڑے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے مجھ سے کچھ پوچھا۔

میں نے ایک کان پر ہاتھ رکھ کر آگے کو ہوتے ہوئے کچھ یوں ظاہر کیا کہ جیسے مجھے اونچا سنائی دیتا ہے۔ اس نے دوبارہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں پوچھا کہ میں کیا کھانا پسند کروں گا۔ میں نے یہی ظاہر کیا کہ میں اس کی بات نہیں سن سکا ہوں، پھر میں نے اپنا ننھا سا آلہ

سماعت جیکٹ کی اندرونی جیب سے نکال کر سامنے والی جیب میں رکھا اور ایرفون لگاتے ہوئے مسکرا کر ویٹر سے انگریزی میں کہا کہ اب وہ بات کرے۔

اس نے تیسری مرتبہ پھر وہی سوال کیا تو میں نے کہا۔ "اگر ہو سکے تو ایک ایسا سینڈ وچ لے آؤ جس میں کوئی نشہ آور چیز شامل نہ ہو اور گوشت بھی اگر ہو تو بکری' مرغی یا گائے کے سوا کسی اور جانور کا نہ ہو اور اس کے ساتھ اورنج جوس کا ایک ڈبہ لے آؤ۔"

ویٹر نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا' تاہم اثبات میں سرہلا کر چلا گیا۔ مجھے احساس تھا کہ اگر میں ایسی جگہ ہی آگیا ہوں تو مجھے اپنے آپ کو اس ماحول کا عادی ظاہر کرنا چاہیے لیکن میں اپنے آپ کو اس پر آمادہ نہیں کر سکا تھا نتیجہ خواہ کچھ بھی ہوتا۔

معلوم نہیں یہ ریستوران کی انتظامیہ کی نوازش تھی یا ویٹر کی ذاتی کوشش کا نتیجہ کہ جلد ہی میرے شریفانہ آرڈر کی تعمیل ہوگئی۔ میں نے اورنج جوس کے ڈبے کی سیل کھولی اور جوس کے ایک ایک گھونٹ کے ساتھ نیم دلی سے سینڈوچ چبانا شروع کیا جو خاصا بدذائقہ تھا مگر جوس کے ساتھ آسانی سے نگلا جا رہا تھا۔

ابھی میں نے چند ہی لقمے حلق سے اتارے تھے کہ دو آدمیوں کو کیٹی کی میز کی طرف بڑھتے دیکھا' وہ اس وقت تک سگریٹ ختم کر چکی تھی اور ایک بیئر کے بڑے سے گلاس سے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھر رہی تھی۔

ان میں سے ایک دراز قد سفید فام تھا جو ڈھیلی ڈھالی سیاہ پتلون اور ڈھیلا سا چیک کا کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس کی ٹائی ڈھیلے ڈھالے انداز میں گردن میں جھول رہی تھی۔ دونوں ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں تھے اور ایک جیب کا ابھار معمول سے زیادہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے موٹے موٹے ہونٹ بھی لٹکے ہوئے تھے اور دانتوں میں سگار دبا ہوا تھا۔ اس کے پپوٹے بھاری تھے اور وہ شکل ہی سے بدطینت اور جرائم پیشہ نظر آتا تھا۔

دوسرا ہندوستانی معلوم ہوتا تھا۔ وہ درمیانہ قد اور کسرتی جسم کا نوجوان تھا۔ اس کا رنگ سانولا اور چمکیلے سیاہ بال تیل میں چپڑے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھ کے جوڑ پر پیشہ ور پہلوانوں کی طرح چمڑے کی چوڑی سی پٹی لپٹی ہوئی تھی۔ مجھے امید نہیں تھی کہ احسان مرزا کے آدمیوں کا حلیہ ظاہری طور پر ہی اتنے سستے پن کا مظہر ہوگا۔

میں ایک لمحے ہی میں ان کا سرتاپا جائزہ لے چکا تھا اور یہ بھی دیکھ چکا تھا کہ وہ بے تکلفی سے کرسیاں گھسیٹ کر کیٹی کے سامنے بیٹھ رہے تھے اور کیٹی نے پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے تیکھی نظروں سے انہیں دیکھا تھا۔

".....ہاں تو.....اور سناؤ جان من! کیا حال چال ہے؟" کسرتی جسم والے نوجوان نے اردو نے کہا۔ میرا اندازہ غالباً درست ہی تھا.....وہ ہندوستانی ہی معلوم ہوتے تھے۔ اس نے گفتگو یوں شروع کی تھی جیسے وہ کافی دیر سے کیٹی کے پاس ہی بیٹھا تھا اور اس دوران ذرا

دیر کے لیے کسی اور طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ وہ مجھ سے اتنے فاصلے پر تھے کہ عام لب و لہجے میں ان کے درمیان ہونے والی گفتگو میں نہیں سن سکتا تھا لیکن کیٹی کے لاکٹ اور اپنے آلہ سماعت کی وجہ سے میں ان کی آوازیں صاف طور پر سن رہا تھا' تاہم بظاہر میں انہماک سے اپنا سینڈوچ کھانے میں مصروف تھا۔

"کیا تم اجنبی عورتوں کے سامنے یونہی اچانک بکواس شروع کر دینے کے عادی ہو؟" کیٹی نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"خوامخواہ یوریشین بننے کی کوشش نہ کرو....." ہندوستانی بولا۔ "ہمیں معلوم ہے کہ تم خالصتاً انڈین ہو۔"

"اگر میں انڈین بھی ہوں تو اس سے تمہیں کیوں پریشانی ہو گئی ہے جو بلبلاتے ہوئے یہاں آن بیٹھے ہو؟" کیٹی نے بدستور سخت لہجے میں اور انگریزی ہی میں کہا۔

"لیکن نہیں! بادل گرجتے ہیں' بجلی کڑکتی ہے اور بارش ہوتی ہے اور مینڈک اور مینڈکی کی شادی ہو جاتی ہے....." ہندوستانی نوجوان کا لہجہ معنی خیز معلوم ہوتا تھا جواباً خاموشی رہی' میں نے غیر محسوس طور پر کن انکھیوں سے ان کی طرف دیکھا۔

کیٹی ایک ٹک سانولے نوجوان کو گھور رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نشے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ معلوم نہیں کیوں نوجوان کا بے تکا اور بے سروپا سا جملہ مجھے کھٹکا تھا.....اچانک مجھے احساس ہوا کہ وہ کوڈ ورڈز میں بات کر رہے تھے۔ کیٹی کوڈ ورڈ سمجھ نہیں پائی تھی جس سے وہ شک میں پڑ گئے تھے۔

"میرے خیال میں تو اس وقت مینڈکی کو زکام ہو رہا ہے اور اس کا علاج میں جانتی ہوں....." بالآخر کیٹی نے برہمی سے کہا۔ "اب تم چلتے پھرتے نظر آؤ ورنہ میں کسی پولیس والے کو بلاتی ہوں اور اگر اس کا موقع نہ ملا تو پھر مجبوراً مجھے تمہاری آنتیں نکالنی پڑیں گی۔"

"بمل! تم بلاوجہ وقت ضائع کر رہے ہو....." یہ سفید فام کی بھاری آواز تھی اور وہ اپنے ساتھی سے مخاطب تھا.... "نشانہ غلط ہے..... آؤ گولی کو اٹھا کر گھر لے چلتے ہیں....." یہ جملہ بھی معنی خیز انداز میں کہا گیا تھا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو گورے!" سانولا نوجوان جسے بمل کے نام سے مخاطب کیا گیا تھا' شہدوں والے انداز میں بولا۔ مجھے اب یقین ہو چکا تھا کہ وہ احسان مرزا کے آدمی نہیں تھے' گویا جس امید پر میں نے کیٹی کو بلیو آئی والا لاکٹ نمایاں طور پر پہننے کی ہدایت کی تھی' اس کے نتائج ظاہر ہونے لگے تھے مگر اتنی جلدی یہ نتائج ظاہر ہونے کی مجھے امید نہیں تھی۔ ابھی تو ہم کھٹمنڈو میں آکر سنبھلنے بھی نہ پائے تھے اور پھر یہ نتائج بھی کچھ ہمارے حق میں نظر نہیں آرہے تھے۔

سفید فام شخص اب براہ راست کیٹی سے مخاطب ہوا..... "میری جیب میں جو ریوالور

ہے' اس کا نام بیریٹا ہے۔ قریب سے اس کی گولی بے حد خطرناک ثابت ہوتی ہے' اٹھو اور باہر چلو۔"

"آخر تم پنجے جھاڑ کر میرے ہی پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؟" کیٹی نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یہاں اور بھی لڑکیاں موجود ہیں' کئی تو مجھ سے بھی زیادہ خوبصورت ہیں' آخر تم چاہتے کیا ہو؟"

"ہم تمہاری کچھ خدمت کرنا چاہتے ہیں۔" سفید فام نے بدستور بھاری آواز میں کہا...... "یہاں کئی ایسے امیرزادوں سے ہماری شناسائی ہے جو چند راتوں کے عوض ہندوستانی لڑکیوں کی جھولیاں دولت سے بھر دیتے ہیں۔ ہم ان میں سے ایک آدھ کو تم سے ملوا دیں گے۔"

"بہت خوب!" کیٹی نے طنزیہ لہجے میں کہا...... "بڑا معززانہ دھندا اختیار کر رکھا ہے تم لوگوں نے......ویسے کیا تمہارے خیال میں تمام ہندوستانی لڑکیاں اسی طرح دولت سے جھولیاں بھرنے کے لیے بے تاب پھر رہی ہوتی ہیں؟ جسم فروشی کے سوا ان کے پاس دولت کمانے کا کوئی اور ذریعہ نہیں۔"

"میں سب کی باتیں نہیں کر رہا۔" سفید فام نے سگار کو دانتوں ہی دانتوں میں ادھر سے ادھر منتقل کرتے ہوئے کہا...... "میں تو تمہاری اور صرف تمہاری بات کر رہا ہوں اور تم یقیناً اسی ٹائپ سے تعلق رکھتی ہو جس کی میں بات کر رہا ہوں۔"

"فرض کرو میں اسی ٹائپ سے تعلق رکھتی ہوں۔" کیٹی نے گویا تحمل مزاجی سے کام لیتے ہوئے کہا...... "لیکن میں تمہارے ساتھ نہیں جانا چاہتی' تب تم کیا کرو گے؟"

"میں نے ابھی بیریٹا ریوالور کا ذکر کیا تھا۔" سفید فام نے مختصراً کہا......

"آخر تمہیں میری دلالی کرنے کی اتنی اشد ضرورت کیوں آن پڑی ہے۔ اب کیٹی کا لہجہ تمسخرانہ ہو گیا۔

"دلالی کی بات تو یونہی بیچ میں آگئی تھی۔" سفید فام نے کھسیائے بغیر کہا...... "اصل میں تو ہمیں تمہاری ضرورت ہے' تمہاری دلالی کی نہیں۔"

"میں نے کہہ جو دیا کہ میں اس وقت کہیں نہیں جاؤں گی۔" کیٹی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا......اور اگر پندرہ سیکنڈ تم دونوں یہاں سے نہ اٹھے تو میں شور مچاؤں گی۔"

"تمہاری مرضی ہے۔ ہم تمہارا یہ شور مچانے کا شوق بھی پورا کروا دیں گے۔" سفید فام نے لاپروائی سے کہا...... "ہم چاہیں تو ریوالور کی بھی ضرورت نہ پڑے۔ ہم یونہی تمہیں دونوں بازوؤں سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے یہاں سے لے چلیں۔ جتنا دل چاہے چیختی رہنا' کوئی نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔ اس معاملے میں اس ریستوران کا ماحول امریکہ کے کسی زیرزمین کلب سے زیادہ سازگار ہے۔ یہاں سب لوگ اپنے کام سے کچھ زیادہ ہی کام رکھتے ہیں۔ سب کو معلوم ہے یہاں چیخنے چلانے والی لڑکیاں نہیں آتیں اور اگر کوئی کبھی کبھار

چیختی نظر آبھی جائے تو سب اس خیال پر پہلے سے متفق ہوتے ہیں کہ یہ اس لڑکی کی غلطی تھی جو یہاں آن گھسی' اسے کسی شریفانہ جگہ پر جانا چاہیے تھا......"

"اتنی لاقانونیت ہے یہاں؟" کیٹی نے قدرے حیرت سے پوچھا...... "کہ تم اتنے لوگوں کے درمیان سے مجھے کھینچتے ہوئے لے جاؤ گے اور کوئی دخل اندازی نہیں کرے گا۔"

"قانون کمزوروں کے لیے ہوتا ہے...." سفید فام نے میرا مقولہ دہرایا۔ "یا پھر ان کے لیے جو اس کی پروا کرتے ہیں' ہم تو پیدائشی طور پر ہی اس خانے میں فٹ نہیں ہیں۔"

میں نے گھڑی دیکھی' چار بجکر پچیس منٹ ہو رہے تھے۔ مجھے حیرت یہ تھی کہ اگر یہ دونوں احسان مرزا کے آدمی نہیں تھے تو پھر احسان مرزا کا آدمی کہاں مر گیا تھا؟ اس نے کیوں اب تک مجھ سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں تو سفید رومال بھی جیکٹ کے سامنے والی جیب میں صلح کے جھنڈے کی طرح سجائے بیٹھا تھا۔ کیٹی کی میز پر بھی مجھے ایک سفید رومال پڑا نظر آرہا تھا۔

"اچھا تو بہت طاقتور ہو تم لوگ؟" کیٹی نے آنکھیں پھیلا کر پوچھا۔ میں بار بار کن انکھیوں سے غیر محسوس طور پر ادھر دیکھ رہا تھا لیکن بظاہر مجھے گویا اپنے سینڈوچ کو کترنے کے علاوہ دنیا کی کسی چیز سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ایرفون پر مجھے ان کی مکالمے بازی کسی کھیل کی کمنٹری کی طرح سنائی دے رہی تھی۔

"بھئی کیا بکواس ہے؟" سفید فام نے بیزاری سے کہا۔ "لڑکی! اب اٹھ بھی چکو کیوں خوامخواہ یہاں دہشت پھیلا کر ان بیچارے امن پسند نشے بازوں کا سکون درہم برہم کرنا چاہتی ہو؟ ان کے لیے یہ لمحے بڑے قیمتی ہوتے ہیں......"

"میرے لیے بھی یہ لمحے بڑے قیمتی ہیں۔" یہ کہتے ہی کیٹی نے یکلخت میز الٹ دی' میز نہ تو زیادہ بڑی تھی اور نہ ہی بھاری۔ سانولا نوجوان تو نہایت پھرتی سے اچھل کر ایک طرف ہٹ گیا۔ سفید فام کرسی سمیت الٹ گیا اور میز اس کی ٹانگ پر گری لیکن وہ اسے ایک طرف دھکیل کر تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ریوالور اب اس کی جیب سے نکل آیا تھا لیکن وہ فائر کرنے کے معاملے میں تذبذب میں رہا اور اس دوران سانولے نوجوان نے کیٹی کے بال مٹھی میں جکڑنے کے لیے اس کے سر پر ہاتھ مارا مگر کیٹی نے نہایت پھرتی سے اس کی ٹھوڑی پر گھونسا رسید کیا اور وہ لڑکھڑا گیا۔

ہال میں کچھ ہیجان پھیلا تھا لیکن یہ ہیجان بھی بڑا پرسکون قسم کا تھا۔ کچھ لوگ بمشکل تمام آنکھیں پوری کھولنے کی کوشش کرتے ہوئے مسکرا رہے تھے اور کچھ خوفزدہ ہو کر میزوں کے نیچے گھسنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بیرے دیواروں سے لگے بڑی دلچسپی سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ ان کی باچھیں کھلی پڑی تھیں گویا انہیں ایک مدت بعد کوئی دلچسپ فلم دیکھنے کو ملی ہو۔ ان میں سے ایک تو کچن کی طرف منہ کرکے غالباً خانساماں وغیرہ کو بھی باہر

آنے کی دعوت دے رہا تھا۔ سانولے نوجوان نے گھبرا کر پہلے اپنے سر پر دوہتڑ مارا' پھر مٹھیاں بھینچ کر اور دانت کچکچا کر کیٹی پر جھپٹا لیکن کیٹی نے نیچے سے اسے ہلکی سی اڑنگی لگا دی جس کی اسے توقع ہی نہیں تھی اور وہ اپنے ہی زور میں اوندھا گر پڑا۔

کیٹی میزوں' کرسیوں اور لوگوں سے بچتی بچاتی دروازے کی طرف دوڑی۔ دروازہ کیا بس نکاسی کا ایک کھلا راستہ تھا جس میں کوئی پٹ وغیرہ نہیں تھا۔ سانولا نوجوان نہایت پھرتی سے اٹھ کر اس کے تعاقب میں چھلانگ لگا چکا تھا لیکن اس وقت تک کیٹی کا خنجر اس کے اسکرٹ کی آستین سے اس کے ہاتھ میں منتقل ہو چکا تھا۔ وہ سانولے نوجوان پر وار کرنے کے لیے رکی نہیں' تاہم اس نے جاتے جاتے نوجوان کو اس کی جھلک دکھا دی تھی اور وہ راستے ہی میں رک گیا تھا۔ اس کے پاس یا تو کوئی ہتھیار تھا ہی نہیں یا پھر وہ اسے نکالنے سے گریز کر رہا تھا۔

"رک جاؤ ورنہ گولی مار دوں گا......" سفید فام چلایا مگر کیٹی رکی نہیں۔ وہ اب تک یہ سب کچھ میری ہدایات کے بغیر آزادانہ طور پر کر رہی تھی اور میں سردست فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ وہ صحیح کر رہی ہے یا غلط۔

سفید فام نے واقعی فائر کر دیا لیکن یہ فائر اس نے چھت کی طرف کیا تھا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ کیٹی پر فائر کرنے کی صورت میں گولی اسے جانے لگتی یا نہ لگتی لیکن راستے میں موجود کئی افراد کے زخمی ہونے یا کسی نہ کسی کے ہلاک ہونے کا قوی امکان تھا۔ ویسے بھی میرا اندازہ یہی تھا کہ وہ کیٹی کو کوئی گزند پہنچانا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی چلائی ہوئی گولی سے چھت سے کچھ پلستر اکھڑ کر ایک میز پر آگرا تھا۔

کیٹی دروازے پر پہنچی تو وہ کچھ بلندی پر آگئی اور ایک لمحے کے لیے کھلے دروازے میں اس کا وجود ہیولے کی طرح نظر آیا جو صاف طور پر نشانے پر تھا۔ سفید فام نے اس کے پاؤں کے قریب فائر کیا۔ چوکھٹ کی جگہ سے اینٹ یا سیمنٹ کے کچھ ٹکڑے اچھلتے دکھائی دیئے لیکن اس وقت تک کیٹی غائب ہو چکی تھی۔

سفید فام اپنے راستے میں آنے والی ہر چیز کو پھلانگتا اس کے تعاقب میں چل پڑا تھا۔ میں بھی اپنی جگہ سے اٹھا اور پرسکون انداز میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا دروازے کی طرف چل دیا۔ دروازے کے قریب بن مانس نما ویٹر نے جو دیوار سے یوں چپکا کھڑا تھا کہ مجھے نظر ہی نہیں آیا تھا' اچانک بازو پھیلا کر مجھے روک لیا اور پرسکون لہجے میں کہا......"مانا کہ یہاں گولیاں چل رہی ہیں مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ آپ پیسے دیئے بغیر چلے جائیں۔"

میں نے جیب سے ایک نوٹ کھینچ کر دیکھے بغیر اس کے ہاتھ پر رکھا کہ یہ اس کا حق تھا اور ساتھ ہی میں نے اس کے منہ پر الٹے ہاتھ کا ایک تھپڑ بھی رسید کیا کیونکہ اس کے روکنے پر مجھے طیش بھی آیا تھا۔

دروازے پر پہنچتے ہی میں نے دائیں طرف دیکھا جدھر کیٹی مڑتی نظر آئی تھی۔ وہ تنگ

سی گلی کے سرے پر پہنچ چکی تھی۔ سانولا نوجوان کسی ایتھلیٹ کی طرح اس کے پیچھے دوڑتے ہوئے بس اسے پکڑنے ہی والا تھا۔ سفید فام ریوالور لہراتا اس کے پیچھے تھا۔ گلی سنسان پڑی تھی اور شام کا دھندلکا سا پھیل رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ کیٹی کسی دوسری گلی میں داخل ہوتی' دائیں طرف سے قدیم طرز کے ایک مکان کی اوٹ سے بجلی کی سی سرعت سے ایک ہاتھ نکلا اور کلہاڑی کی طرح کیٹی کے بازو پر پڑا۔ خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر پتھریلی سڑک پر گرنے کی کھنک مجھے سنائی دی۔ اسی لمحے وہ شخص بھی مکان کی اوٹ سے نکل آیا اور اس سے پہلے کہ کیٹی کا وہ بازو دوبارہ حرکت میں آتا' وہ شخص اس کے بازو کو مروڑ کر اس کی پشت پر لے گیا۔

بائیں طرف سے ایک اور مکان کی اوٹ سے بھی اسی پھرتی سے ایک شخص نکلا تھا اور اس نے کیٹی کا دوسرا بازو قابو میں کر لیا تھا۔ اب وہ بالکل بے بس ہو چکی تھی۔ اس کے بازو بڑی غلط پوزیشن میں تھے'۔ معمولی جھٹکے سے اس کے کندھوں کے جوڑ الگ ہو سکتے تھے۔ میں نے آلہ سماعت کے ایرفون پر اس کی کراہ سنی' اسے قابو میں کرنے والوں میں سے ایک کی آواز میں نے سنی۔

"ہمارا اندازہ ٹھیک ہی تھا بے بی!" وہ کہہ رہا تھا....."کہ تم اگر وہاں سے نکل بھاگیں تو سیدھی ادھر ہی آؤ گی' دوسری طرف گلی بند جو ہے۔"

سانولا نوجوان اور سفید فام بھی اس کے قریب پہنچ چکے تھے۔ سانولے نے کیٹی کی پشت پر گھٹنا رسید کیا۔ وہ چیخ اٹھی لیکن میں اس کی مدد کے لیے جانے کے بجائے ایک مکان کی بڑھی ہوئی دیوار سے چپک گیا۔ اب میں بھی اوٹ میں تھا اور اس وقت تک ان کی نظر میں نہیں آسکتا تھا جب تک وہ واپس آکر باقاعدہ اس طرف معائنہ نہ کرتے۔

میرا خیال تھا کہ وہ کیٹی کو آگے لے جائیں گے لیکن یہ دیکھ کر مجھے قدرے تشویش ہوئی کہ وہ اسے واپس لا رہے تھے لیکن وہ زیادہ آگے نہیں آئے۔ جہاں وہ رکے تھے' وہاں دو مکانوں کے درمیان کچھ جگہ خالی تھی۔ چند سیکنڈ بعد ہی میں نے کسی کار کا انجن بیدار ہونے کی آواز سنی۔ اس دوران سانولے نے کیٹی پر وار کرنے کی کوشش کی تھی لیکن سفید فام نے چلا کر اسے منع کیا تھا۔

مکانوں کے درمیان خالی جگہ سے گاڑی گلی میں رینگ آئی۔ اسٹیرنگ پر سفید فام ہی تھا۔ کار کا رخ اس نے اسی طرف کر دیا تھا جدھر چند لمحے پہلے کیٹی قلانچیں بھرتی جا رہی تھی۔

○

میرے پاس بھی اس وقت ہتھیار صرف اپنا وفادار خنجر ہی تھا اور ابھی میں نے اسے بھی نہیں نکالا تھا۔ اس وقت مجھے ہتھیار سے زیادہ گاڑی کی ضرورت تھی جو مجھے میسر نہیں تھی اور چند لمحے کے لیے تو میں پریشان ہو گیا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟ ابھی کار روانہ نہیں ہوئی تھی۔ میں چاہتا تو ان سے الجھ سکتا تھا مگر اس طرح شاید میں ان کا ٹھکانا دیکھنے اور جڑیں تلاش کرنے سے محروم رہ جاتا۔ وہ بدستور کیٹی کو قابو کیے ہوئے تھے۔

سانولا نوجوان جسے سفید فام نے بمل کے نام سے مخاطب کیا تھا' آگے اسی کے برابر بیٹھ گیا تھا اور وہ دونوں نئے حملہ آور بدستور کیٹی کو قابو میں رکھتے ہوئے بڑی مشاقی سے ایک ہی دروازے سے کار کے پچھلے حصے میں سما چکے تھے۔

"اس کے حسین چہرے پر غلاف چڑھا دو۔" میں نے سفید فام کی آواز سنی۔ "کہیں یہ راستے میں اپنے حسن کی بجلیاں گراتی چلے اور یہ بھی خیال رکھنا کہ کوئی احمق ہمارے تعاقب میں نہ چل پڑے۔"

"تم فکر نہ کرو شوار" یہ غالباً ان میں سے ایک کی آواز تھی' جنھوں نے کیٹی کو قابو میں کیا ہوا تھا۔ "بس تم ایکسیلیٹر پر پاؤں رکھ کر بھول جاؤ۔"

"تمہیں معلوم ہے میں بھولنے بھلانے کا قائل نہیں۔" سفید فام نے ہلکے سے قہقہے کے ساتھ کہا۔ "اور جلدبازی کی بھی کوئی خاص ضرورت نہیں۔ جب کام صبروسکون سے صحیح طریقے سے ہو رہا ہو تو بھگدڑ اور افراتفری سے کیا فائدہ؟ سوائے اپنے آپ کو تھکانے کے۔"

کار اب چل پڑی تھی۔ تاہم میں نے عقبی شیشے سے اتنا ضرور دیکھ لیا تھا کہ کیٹی کو ایک لمبا سوٹوپ پہنایا جا رہا تھا' جس میں چہرہ بھی چھپ جاتا ہے' پھر اس کا سریوں نیچے کر دیا گیا کہ عقبی شیشے سے اسے نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔

کار نے جیسے ہی موڑ کاٹا اور میری نظر سے اوجھل ہوئی۔ میں دیوار کی اوٹ سے نکل کر دوڑا۔ گلی کے سرے کی طرف جاتے وقت مجھے کیٹی کا خنجر وہیں پڑا نظر آیا' جہاں گرا تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر جیکٹ کی جیب میں ڈال لیا۔

میں گلی کے سرے پر پہنچا تو گاڑی دوسری گلی کو بھی عبور کرکے مین روڈ کی طرف مڑ

چکی تھی لیکن میری خوش قسمتی یہ رہی کہ فوراً ہی مجھے ٹیکسی مل گئی۔

فاصلہ تو اتنا ہی رہنے دو لیکن وہ جو کافی دور کریم کلر کی ایک فورڈ جا رہی ہے' اس کا تعاقب کرو۔" میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو ہدایت کی۔ "لیکن ہوشیاری سے' میں تمہیں ٹپ دوں گا۔"

"وہ ٹپ میرے کفن دفن پر تو استعمال نہیں ہو گی نا؟"

اگنیشن میں چابی گھماتے ہوئے اس ڈرائیور نے خوشدلی سے پوچھا۔

"نہیں' معاملہ اتنا بھی خطرناک نہیں۔" میں نے بھی نیم سنجیدگی سے ہی اسے تسلی دی۔ وہ باریک باریک سی بھوری مونچھوں والا ایک خوش شکل نوجوان تھا اور خاصا خوش مزاج بھی معلوم ہوتا تھا۔ جس مین روڈ پر اس نے فورڈ کا تعاقب شروع کیا تھا' وہ خاصی طویل تھی اور اس پر ٹریفک بھی بہت تھا' اس لیے ان لوگوں کو یہ شبہ نہیں ہو سکتا تھا کہ ان کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔

البتہ کچھ دیر بعد فورڈ ایک سڑک پر مڑی جو آگے چل کر ایک ایسی سڑک پر نکلی جس پر اکادکا ہی گاڑیاں یا سائیکل رکشا رواں تھے۔ میرے آلہ سماعت نے ایک بار پھر میری مدد کی۔ میں نے سفید فام کی آواز سنی۔ "ایک بار پھر دیکھ لو۔ ہمارا تعاقب تو نہیں کیا جا رہا نا؟"

چند لمحے بعد ایک آواز ابھری۔ "ایک ٹیکسی کافی فاصلے پر آ تو رہی ہے' لیکن یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ وہ ہمارے پیچھے آ رہی ہے۔ اس میں کوئی نظر بھی نہیں آ رہا۔"

میں نے فوراً ڈرائیور سے کہا "غیرمحسوس طور پر رفتار بڑھاتے ہوئے اس گاڑی سے آگے نکال لے جاؤ۔" ساتھ ہی میں سیٹ پر کچھ اور سیدھا ہو کر لیٹ سا گیا تاکہ فورڈ والوں کو نظر نہ آسکوں۔ ڈرائیور میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے نہایت عمدگی سے انھیں اوورٹیک کرتا ہوا گزر گیا۔

دوسرے ہی لمحے میں نے سفید فام کی اطمینان بھری آواز سنی۔ "اوہ' یہ تو خالی تھی۔ ڈرائیور اپنی راہ جا رہا ہے۔"

وہ لوگ غالباً ایک بار پھر کیٹی کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ کیونکہ کافی دیر کی خاموشی کے بعد میں نے کیٹی کی آواز سنی۔ وہ غصیلے لہجے میں کسی سے کہہ رہی تھی "اگر تم نے ہاتھ نہ ہٹایا تو میں جان کی پروا کیے بغیر چیخنا شروع کردوں گی۔" ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ بات وہ متعلقہ شخص کے بجائے درحقیقت مجھے سنا رہی تھی۔

"اب تم بڑے شوق سے چیخو میری جان!" اس کے قریب ہی سے کسی نے کہا۔ "تمہاری چیخوں میں تمہارے بازوؤں کی ہڈیاں ٹوٹنے کی صدا بھی شامل ہوگی۔"

کیٹی کراہ کر خاموش ہوگئی۔

چند لمحے بعد ایک دوراہا آگیا۔ میں نے ڈرائیور کو بائیں طرف مڑنے کی ہدایت کی' لیکن چند لمحے بعد میں نے مڑ کر دیکھا' فورڈ دائیں طرف مڑ چکی تھی۔ ہم مخالف سمتوں میں بڑھتے چلے گئے۔ اب اندھیرا پھیلنے لگا تھا اور ہیڈلائٹس روشن کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی۔ ایئرفون سے مجھے سفید فام کی آواز سنائی دے رہی تھی جو دھیرے دھیرے ناقابل فہم سی بھنبھناہٹ میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔

پھر یہ بھنبھناہٹ بھی معدوم ہو گئی۔ گویا وہ میرے ٹرانسمیٹر کی رسائی سے نکل چکے تھے۔ میں نے ڈرائیور کو یو ٹرن لینے کی ہدایت کی۔ چند لمحے بعد ٹیکسی اس سمت میں فراٹے بھرنے لگی' جدھر فورڈ گئی تھی۔ اب ٹیکسی کی ہیڈلائٹس روشن ہو چکی تھیں اور نیون سائن نما وہ لائٹ بند تھی جس پر ٹیکسی لفظ دور ہی سے چمکتا نظر آتا ہے۔ اس لیے اگر فورڈ والے عقب نما آئینے میں دیکھتے بھی تو انہیں محض دو ہیڈ لائٹس ہی نظر آتیں جو کسی بھی کار کی ہو سکتی تھیں۔

فورڈ کی ٹیل لائٹس بہت دور نظر آرہی تھیں لیکن ٹرانسمیٹر پر مجھے پہلے بھنبھناہٹ اور پھر سفید فام کی آواز صاف سنائی دینے لگی۔ وہ بڑے شگفتہ لہجے میں غالباً کیٹی ہی سے کہہ رہا تھا "کیا واقعی کھٹمنڈو میں تمہارا کوئی ساتھی موجود نہیں؟"

"یہی تو افسوس ہے۔" کیٹی نے جلے کٹے انداز میں کہا۔ "میرا ساتھی یہاں موجود ہوتا تو وہ تم سب کو درمیان سے چیر دیتا۔"

سفید فام نے بلند آہنگ قہقہہ لگایا جس کے دوران اسے کھانسی آگئی۔ "ایک تو تم ہندوستانیوں کو یہ درمیان سے چیرنے کی بات کرنے کا بڑا شوق ہوتا ہے۔ گویا انسان نہ ہوا چیڑ کا درخت ہوگیا۔"

اس کے بعد کوئی کچھ نہ بولا۔ ٹیل لائٹس مجھے بائیں طرف میدانی سے حصے کی طرف مڑتی دکھائی دی تھیں۔ یہ علاقہ غالباً نیا نیا آباد ہو رہا تھا۔ کہیں کہیں مکمل اور کہیں نامکمل مکانات پھیلے ہوئے تھے۔ بیشتر پلاٹ خالی تھے اور ان کے درمیان کہیں کہیں پلے گراؤنڈ بھی تھے۔ فورڈ ایسے ہی ایک گراؤنڈ کے کنارے کنارے پتلی سی سڑک پر جا رہی تھی۔ وہاں روشنی بہت کم تھی اور اونچے نیچے مکانات محض ہیولوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔

میری ٹیکسی جب اس پگڈنڈی نما سڑک پر گھومی اس وقت تک فورڈ بہت آگے ایک گلی میں مڑ چکی تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور گاڑی کو سیدھا لے گیا۔ میں نے دیکھ لیا کہ بائیں ہاتھ کی گلی میں فورڈ ایک بنگلے کے سامنے رک چکی تھی۔ ٹیکسی نے مزید کچھ فاصلہ طے کیا تو سامنے پھر ایک پلے گراؤنڈ آگیا۔ میں نے ایک مناسب جگہ دیکھ کر ٹیکسی رکوائی اور ڈرائیور سے پوچھا کہ کیا وہ میرا انتظار کرسکتا ہے۔ اس نے بڑا عقلمندانہ جواب دیا کہ اسے اگر خطرے کے کوئی آثار دکھائی نہ دیئے تو وہ انتظار کرے گا لیکن اگر ذرا بھی گڑبڑ دکھائی دی تو بھاگ

لے گا۔ میں نے اسے چند نوٹ دیے اور واپس اس گلی کی طرف چل دیا' جہاں میں نے فورڈ کو رکتے دیکھا تھا۔

ٹرانسمیٹر پر میں نے کیٹی کی آواز سنی۔ "آخر تم لوگ چاہتے کیا ہو' کیوں لے آئے ہو مجھے یہاں؟"

"ابھی معلوم ہو جائے گا جان من!" یہ سانولے نوجوان کی آواز تھی۔ میں جب مکانوں کی دیواروں سے چپکتا گلی میں داخل ہوا تو وہ لوگ گلی میں نظر نہیں آ رہے تھے۔ بنگلے میں داخل ہو چکے تھے۔ گاڑی بھی بنگلے کے پورچ میں داخل ہو چکی تھی لیکن پورچ میں اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔

میں اس وقت محتاط انداز میں اندر کا جائزہ لینے کے بعد کمپاؤنڈ وال سے کود رہا تھا۔ جب میں نے سانولے نوجوان کی آواز سنی معلوم نہیں وہ کس سے کہہ رہا تھا "باس! ہمیں غلط ٹپ نہیں ملی تھی لیکن میں اس لڑکی کے گلے میں لاکٹ دیکھ کر گڑبڑا گیا تھا' پھر میں نے کوڈ ورڈ بولا لیکن اس نے کوئی جواب ہی نہیں دیا۔ تب ہم نے اس پر ہاتھ ڈال دیا۔"

"ہوں" میں نے ایک بوجھل ہنکارا سنا۔ اس کے ساتھ ہی کیٹی کی آواز سنائی دی۔ "اگر تم لوگ اس لاکٹ کی وجہ سے کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو تو میں بتا دوں کہ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی مجھے اس کے بارے میں کچھ علم ہے۔ مجھے یہ تو پونا میں ایک نہر کے کنارے پڑا ملا تھا۔ مجھے اچھے لگا' میں نے اٹھا کر پہن لیا۔"

کئی افراد کا ہم آہنگ سا قہقہہ گونجا جسے میں ٹرانسمیٹر کی مدد کے بغیر بھی سن سکتا تھا۔ اسی آواز نے میری رہنمائی کی اور میں اس کمرے کی کھڑکی تک جا پہنچا جہاں وہ لوگ موجود تھے۔ اسی دوران میں نے سانولے نوجوان بھل کی آواز سنی۔ "اب اتنی بھولی نہ بنو۔ ابھی میں وہ گھونسا نہیں بھولا جو تم نے میری ٹھوڑی پر رسید کیا تھا اور تمہارا خنجر گھمانا تو کسی ماہر فن ہی کی تربیت کا نتیجہ معلوم ہوتا تھا۔"

"میں یہ تو نہیں کہہ رہی کہ میں کوئی شریف زادی ہوں۔" کیٹی نے بدمزگی سے کہا۔ "میں تو صرف یہ سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ تم لوگ مجھے نہ جانے کس معاملے سے متعلق سمجھ رہے ہو' جب کہ میں بس ایک عام سی آوارہ گرد ہوں۔"

میں جس کھڑکی پر پہنچا وہ وہ بند تھی۔ اس کے پٹ شیشے کے تھے لیکن ان کے عقب میں لوہے کی گرل تھی' تاہم اس میں اتنی درز موجود تھی کہ میں اندر کا منظر کھڑکی کو چھیڑے بغیر دیکھ سکتا تھا۔ نوتعمیرشدہ اس بنگلے کے اس طویل و عریض کمرے میں برائے نام فرنیچر تھا۔ دیواروں پر رنگ و روغن' فرش پر قالین یا کھڑکیوں پر پردے نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ بنگلے میں ابھی فنشنگ کا کام باقی تھا۔

وہ لوگ جس شخص کے سامنے پیش ہوئے تھے وہ ایک پھولے پھولے سے صوفے پر

بیٹھا تھا۔ وہ مضبوط جسم کا ایک ناٹا لیکن چوڑا چکلا جوان تھا۔ اس کی ناک نیپالیوں کی طرح قدرے بیٹھی ہوئی تھی۔ لیکن اس ناک کے نیچے موٹی موٹی سیاہ مونچھیں عجیب لگ رہی تھیں۔ اس کی ٹانگ کے قریب ہی ایک ٹامی گن صوفے کے ساتھ ٹکی ہوئی تھی۔ وہ سفاک اور پھرتیلا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے نہایت اونچی ایڑھی کے فل بوٹ پہنے ہوئے تھے۔

سفید فام قدرے ہٹ کر کھڑا تھا اور لاپروائی سے سگار کے کش لے رہا تھا۔ باقی تینوں مونچھوں والے کے سامنے مودب نظر آرہے تھے۔ مونچھوں والا سرخ سرخ آنکھوں سے کیٹی کو گھور رہا تھا۔ کیٹی کے ہاتھ اس کی پشت پر بندھے ہوئے تھے اور اس مقصد کے لیے غالباً سفید فام کی ٹائی استعمال کی گئی تھی۔

"لڑکی!" دفعتاً" مونچھوں والا' انگریزی میں دھاڑا۔ اس نے کیٹی کے لیے ایک غلط لفظ استعمال کیا تھا۔ "سچ سچ بتاؤ تمہیں یہ لاکٹ دے کر بھیجے جانے کا مقصد کیا ہے؟ یہ تو ہمیں معلوم ہے کہ تمہیں بھیجنے والا احسان مرزا ہے' لیکن اس نے تمہیں یہ بلیو آئی لاکٹ کیوں دیا تھا' یہ تم ہمیں بتاؤ گی۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ایک نوجوان بھی تمہارے ساتھ آیا تھا۔ ہمارے ایک آدمی کی ذرا سی سستی سے وہ ہماری نظر سے اوجھل ہوگیا ہے۔ خیر پریشانی والی کوئی بات نہیں۔ جلد ہی وہ بھی ہمارے سامنے پہنچ جائے گا۔ تم اس کے بھروسے پر زیادہ اکڑفوں نہ دکھاؤ۔ وہ تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکے گا۔ اس لیے ابھی سے زبان کھول دو تو بہتر ہوگا۔ جتنی تاخیر کروگی اتنی ہی زیادہ تکلیفیں اٹھاؤ گی۔"

میں کھڑکی کے قریب کھڑے کھڑے گویا سن ہوگیا۔ ان کی معلومات نے مجھے ششدر کرکے رکھ دیا تھا۔ میں تو اپنی دانست میں بڑا آرسین لوپن بنا ہوا تھا اور بڑی بین الاقوامی جاسوسوں والی ٹیکنیک استعمال کر رہا تھا۔ لیکن مجھے کیا خبر تھی کہ میری احتیاطوں کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ جنہیں میرے خیال میں جو انہیں معلوم نہیں ہونا چاہیے تھا وہ سب کچھ معلوم تھا اور مجھے صحیح طور پر یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ تھے کون؟ وہ مافیا کے اصل آدمی تھے؟ فیملی سے ان کا تعلق تھا یا وہ کوئی تیسری ہی پارٹی تھی؟ میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

میں یہ سمجھنے سے بھی قاصر تھا کہ ان کی معلومات کے ذرائع کیا ہوسکتے تھے؟

ایک لمحے کے لیے تو مجھے محسوس ہوا جیسے مونچھوں والے کو یہ بھی علم ہے کہ میں اس وقت کھڑکی میں کھڑا محو تماشا ہوں اور کسی بھی لمحے وہ تمسخرانہ انداز میں کھڑکی کی طرف رخ کرکے کہے گا "اندر آجاؤ برخوردار! وہاں کھڑے کھڑے کون سا تیر مار لو گے۔"

لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس کی شعلہ بار نگاہیں بدستور کیٹی پر مرکوز رہیں۔ "بولتی کیوں نہیں؟" وہ اسے خاموش پاکر پہلے سے زیادہ برہمی سے دھاڑا۔ وہ بہت جلد اور خطرناک حد تک اشتعال میں آجانے والا آدمی معلوم ہوتا تھا۔

"میں کہہ تو چکی ہوں کہ مجھے کچھ نہیں معلوم۔"

کیٹی نے بیزاری سے کہا "اب تم اپنی ہی ہانکے جاؤ تو میں کیا کرسکتی ہوں۔" اس نے لاپروائی سے کندھے اچکا دیئے۔ اور اس کے اس انداز نے گویا مونچھوں والے کے رہے سہے صبروضبط کے فلیتے میں آگ لگا دی۔ وہ بھڑک کر اٹھا اور شکاری کتے کی طرح کیٹی پر جھپٹا۔ اس کا ہاتھ درندے کی طرح کیٹی کے گریبان پر پڑا تھا اور کیٹی کا اسکرٹ نیچے تک چاک ہوگیا تھا۔

کیٹی اس دوران اپنی جگہ سے ہلی تک نہیں تھی' لیکن پھر اس مونچھوں والے شیطان نے نہ جانے کیا کیا کہ وہ یوں بلبلا کر چیخی کہ میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ میرے خیال میں اب مصلحت کی حدود ختم ہو چکی تھیں اور نتائج کی پروا کیے بغیر میرا میدان عمل میں کود پڑنا ضروری ہوگیا تھا۔

ابھی میں کھڑکی سے ہٹنے بھی نہیں پایا تھا کہ مونچھوں والے نے ایک جھٹکے سے کیٹی کو نیچے گرا دیا اور بے رحمانہ انداز میں اس کے گلے پر پاؤں رکھ دیا۔ اور شاید وہ سانس بھی نہیں لے پا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں ابل آئی تھیں۔

میرے سینے میں وہی آتش فشاں پھٹ پڑا جو کبھی کبھار ہی مجھے مغلوب الغضب ہو کر اور فرشتہ اجل بن کر مخالفین کی تعداد کی پروا کیے بغیر ان پر ٹوٹ پڑنے پر مجبور کر دیا کرتا تھا۔ شاید میرے پلٹنے کی رفتار بہت تیز تھی جو میں اس خنجر سے بچ گیا جو عقب سے میرے پہلو میں گھونپنے کے لیے گھمایا گیا تھا۔

وہ شخص نہ جانے کب اور کس طرح میرے پیچھے آن پہنچا تھا کہ میری چھٹی حس نے مجھے ذرا بھی چوکنا نہیں کیا تھا۔ حالانکہ ایسا شاید ہی کبھی ہوا ہو۔ اکثراوقات تو میری چھٹی حس یوں کام کرتی تھی جیسے میری گدی پر بھی آنکھیں ہوں۔

گویا میرا وہ اندیشہ کسی حد تک درست ہی تھا کہ وہ لوگ شاید کھڑکی پر میری موجودگی سے بھی باخبر ہوں۔ اگر وہ نہیں تو ان کا یہ ساتھی بہرحال ضرور باخبر ہو چکا تھا۔ وہ میرا تعاقب کرتے ہوئے ہی وہاں تک پہنچا ہو۔

میں تعاقب میں اتنا محو تھا کہ اپنے تعاقب کا مجھے خیال ہی نہیں آیا تھا۔

خنجر میرے پہلو میں گھسنے کے بجائے دیوار سے ٹکرایا تھا۔ سب سے پہلا خیال تو اس وقت مجھے یہ آیا تھا کہ اب کوئی آواز اندر نہیں پہنچنی چاہیے کیونکہ اگر اندر والے پانچوں کے پانچ بیک وقت باہر کو لپک پڑتے تو میں مصیبت میں پھنس جاتا' بلکہ شاید میری مصیبتوں اور مسرتوں سب ہی کا خاتمہ ہو جاتا کیونکہ مونچھوں والے کے پاس ٹامی گن بھی موجود تھی۔

مری خوابیدہ قوتیں تو بیدار ہو ہی چکی تھیں' جسم بھی بجلی بن گیا تھا۔ میں نے حملہ آور کے بازو پر کراٹے کا وار کیا۔ خنجر اس کے ہاتھ سے گر گیا اور بازو کی ہڈی ٹوٹنے کی وجہ

سے اس کا بازو ڈھیلے ڈھالے انداز میں جھول گیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ اس کے حلق سے کوئی آواز نکل پاتی' میرا ایک ہاتھ سختی سے اس کے منہ پر جم چکا تھا اور چشم زدن میں دوسرے ہاتھ میں اس کی پیشانی دبا کر میں نے مخصوص جھٹکا دیا اور اسے آرام سے فرش پر لٹا دیا۔ وہ مرچکا تھا۔ گردن ٹوٹنے کی وجہ سے۔

میں کمرے کے دروازے کی طرف دوڑا۔ دروازہ بند نہیں تھا۔ میں نے ٹھوکر سے اسے کھولا۔ میرا خنجر اس وقت نوک کی طرف سے میرے انگوٹھے اور انگلی کے درمیان دبا ہوا تھا۔ مونچھوں والے کے چاروں ساتھی ہڑبڑا کر پلٹے۔ خود مونچھوں والے کا رخ تو دروازے ہی کی طرف تھا اور اس وقت بھی اس کا پاؤں کیٹی کے گلے ہی پر تھا اور دباؤ غالباً کچھ اور بڑھ چکا تھا۔ کیونکہ کیٹی بری طرح پاؤں پٹخ رہی تھی۔

مونچھوں والا میرے اندازے کے مطابق واقعی بے حد پھرتیلا تھا اور صرف پھرتیلا ہی نہیں ذہین بھی۔ اس نے پلٹ کر صوفے کے سہارے کھڑی ہوئی ٹامی گن اٹھانے کے بجائے بیلٹ میں اڑسا ہوا ریوالور اتنی پھرتی سے نکالا کہ مجھے اس پر انسان کے بجائے کسی مشین کا گمان گزرا۔ لیکن خنجر ایک بار آپ کی دو انگلیوں کے درمیان سے ایک خاص انداز میں نکل جائے تو پھر انسان خواہ کتنا ہی پھرتیلا ہو اس کی رفتار کو مات نہیں دے سکتا۔

مونچھوں والے کو غالباً یقین ہی نہیں آیا تھا کہ خنجر اس کے حلقوم میں دستے تک پیوست ہو چکا ہے اور فرش پر گرنے تک تو وہ یقین اور بے یقینی محسوس کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو ہی چکا تھا۔ وہ چت گرا تھا اور اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔

میرے پاس کیٹی کا خنجر بھی موجود تھا اور وہ میرے ہاتھ میں بھی منتقل ہو چکا تھا۔ لیکن اسے استعمال کرنے کی مجھے مہلت نہیں مل سکی۔ کیونکہ سفید فام اور ایک دوسرے بدمعاش کا ریوالور نکل آیا تھا۔ جب تک انہوں نے فائر کیا تب تک میں بگولے کی طرح ان کے درمیان سے گزر کر صوفے کے سہارے کھڑی ٹامی گن اٹھا چکا تھا۔ کیٹی کا خنجر میں نے صوفے پر پھینک دیا تھا۔

اس سے پہلے کے فائر کرنے والے میری طرف گھوم سکتے' میں نے انہیں ہی نہیں' ان کے باقی دو ساتھیوں کو بھی چھلنی کردیا تھا۔ جو ابھی تک سمجھ ہی نہیں پائے تھے کہ ہوا کیا ہے۔ یہ سب کچھ شاید تین یا چار سیکنڈ میں ہو گیا تھا۔ پانچ لاشیں میرے سامنے پڑی تھیں اور فرش پر خون یوں پھیلتا جا رہا تھا جیسے فرش ہی سے ابل رہا ہو۔

ٹامی گن بغل میں دبا کر میں نے صوفے سے کیٹی کا خنجر اٹھایا اور اس سے کیٹی کے ہاتھوں کی بندشیں کاٹیں۔

وہ بری طرح اپنا سینہ اور گلا مسلنے لگی' پھر اس نے نفرت سے مونچھوں والے کی لاش کو ٹھوکر ماری اور پھنسی پھنسی سی آواز میں بولی۔ "یہ دو دو ٹکے کے بدمعاش کسی کو مجبور پا

کر فوراً ہی قہروغضب کے دیوتا بن جاتے ہیں۔"

میں اس کے حلقوم سے اپنا خنجر نکال کر اسے صوفے کی پوشش سے صاف کرنے لگا۔ کیٹی کا خنجر میں نے اس کو تھما دیا تھا۔ دفعتاً" دروازے کی طرف سے ایک آواز سن کر میں تیزی سے گھوما۔

"سر اب وقت ضائع نہ کیجئے اور جلد از جلد یہاں سے نکل چلئے۔" بڑے مودبانہ لیکن پروقار لہجے میں کہا گیا تھا۔

میں نے دیکھا وہ بے داغ سفید سوٹ میں ملبوس ایک پختہ عمر شخص تھا۔ وہ کلین شیو تھا اور بال سلیقے سے سنورے ہوئے تھے۔ جوتے تک یوں چمک رہے تھے جیسے وہ برابر والے گھر سے یہاں کسی تقریب میں آیا ہو۔ اس کے ہونٹوں پر دوستانہ مسکراہٹ تھی اور ہاتھ میں کوئی ہتھیار بھی نظر نہیں آ رہا تھا' تاہم میں نے فوراً ٹامی گن بغل سے ہاتھ میں منتقل کرلی۔ وہ ہاتھ اٹھا کر مسکراتے ہوئے بولا "دیکھئے مجھے بھی چھلنی مت کردیجئے گا' جتنی فائرنگ ہو چکی ہے اتنی ہی کافی ہے۔ یہ علاقہ نیم ویران ضرور ہے مگر پولیس پارٹیاں عموماً یہاں گشت کرتی رہتی ہیں' کیونکہ یہاں مار دھاڑ اور دیگر دھندے کچھ زیادہ ہی ہوتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ کوئی پارٹی اس طرف آنکلے یا کوئی اسے یہاں تک لے آئے' آپ میرے ساتھ چلئے۔"

"تمہاری تعریف۔" میں نے سخت نگاہوں سے اسے گھورا۔

"میں وہی ہوں جسے کیبن ریستوران میں آپ سے ملنا تھا۔" وہ مربیانہ انداز میں مسکرایا۔ "لیکن افسوس کہ میں حادثاتی طور پر کچھ لیٹ ہو گیا اور آپ کو یہ ساری تکلیف اٹھانی پڑی۔ میں نے آپ کو اس وقت دیکھا اور سفید رومال کی وجہ سے پہنچانا' جب آپ ٹیکسی میں سوار ہو رہے تھے۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں گاڑی موڑ کر ون وے کی پابندی کرتے ہوئے آپ کے پیچھے لاتا' آپ بہت دور جا چکے تھے۔ بہرحال میں آپ کا تعاقب کرتا رہا لیکن اس علاقے میں پہنچ کر ایک گلی کے قریب میں نے آپ کا سراغ کھو دیا۔ اب فائرنگ کی آواز سے متوجہ ہو کر یہاں پہنچا ہوں۔ آیئے' اب وقت ضائع نہ کیجئے۔"

وہ چلنے کے لئے مڑ گیا۔ میں نے کیٹی کی طرف دیکھا۔ وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے کندھے اچکائے اور سفید پوش اجنبی کے پیچھے چل پڑا۔ کیٹی میرے ساتھ ہو لی۔ وہ دونوں ہاتھ بغلوں میں دیئے اپنی چاک گریبانی کا مداوا کر رہی تھی۔

چلتے وقت اجنبی کے کندھے عجیب سے انداز میں اٹھے ہوئے تھے۔ میرے لیے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا کہ اس کی دونوں بغلوں میں ہولسٹر اور ان میں ریوالور موجود تھے۔ وہ کمپاؤنڈ وال کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ہمیں بنگلے کے عقبی حصے کی طرف لے جا رہا تھا۔

"تم نے اپنا نام نہیں بتایا؟" میں نے مدھم آواز میں کہا۔

"رام پرشاد" اس نے مڑ کر دیکھے بغیر شگفتہ لہجے میں جواب دیا۔

عقبی گلی میں کچھ دور رام پرشاد کی کار دیوار کے قریب ہی کھڑی تھی میں اور کیٹی عقبی نشست پر بیٹھ چکے تو اس نے اسٹیئرنگ وھیل سنبھالتے ہوئے کہا "ٹامی گن سیٹ کے نیچے ڈال دیجئے۔ ہمیں جہاں سے گزرنا ہے وہاں کافی ٹریفک ہوگا۔ اور ابھی حقیقتاً رات بھی نہیں ہوئی۔

میں نے گھڑی دیکھی جسے میں نیپال کے وقت سے ملا چکا تھا۔ ابھی صرف ساڑھے چھ بجے تھے لیکن گھرے سیاہ بادلوں اور سردی کی وجہ سے یوں لگ رہا تھا جیسے رات آدھی سے زیادہ بیت چکی ہے۔

میں نے ٹامی گن سیٹ کے نیچے گھسیڑ دی لیکن نال ہاتھ ہی میں تھامے رکھی۔ رام پرشاد گاڑی ریورس کرنے لگا تو مجھے یاد آیا "ادھر میدان کے قریب ایک ٹیکسی والا میرے انتظار میں کھڑا ہوگا۔ میں اسے رخصت کردیتا تو بہتر تھا۔"

"وہ کب کا رخصت ہو چکا ہے۔" رام پرشاد نے بتایا "میں نے اتفاق سے اس کی ٹیکسی درخت کی اوٹ میں کھڑے دیکھ لی تھی اور اس سے آپ کے متعلق پوچھا تھا۔ لیکن اس نے نفی میں گردن ہلا دی، تھی اور اس سے پہلے کہ میں اس کی کھڑکی کا شیشہ توڑ کر اس کی گردن پکڑتا وہ گاڑی اسٹارٹ کرکے چل دیا تھا۔ اگر رکا بھی رہتا تو فائرنگ کی آواز سن کر تو بہرحال رفوچکر ہو ہی جاتا۔"

"بے شک" میں نے اس سے اتفاق کیا اور سیٹ کے پشتے سے ٹیک لگا لی۔ کیٹی دونوں ہاتھ بدستور بغلوں میں دیئے دروازے کے قریب سکڑی سمٹی بیٹھی تھی۔ وہ خاصی مضحمل نظر آرہی تھی۔

"اتنی چپ چاپ کیوں ہو؟" میں نے پوچھا۔

"اس موچھوں والے مردود نے گویا گردن ہی توڑ کر رکھ دی ہے۔" وہ بیٹھی بیٹھی سی آواز میں بولی۔

"میں نے اسے اس کے کیے کی سزا بھی تو دے دی" میں نے کہا۔

"ہاں تبھی تو دل کچھ ٹھنڈا ہوا ہے" وہ گہری سانس لے کر بولی۔ "ویسے میں اسے اتنی جلدی اور اتنی کم تکلیف کے ساتھ مرتے دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔"

"معاف کرنا اس وقت جلدی میں یہی کچھ بن پڑا" میں نے یوں کہا گویا کوئی میزبان بے وقت آنے والے مہمان سے معذرت کر رہا ہو کہ معاف کیجئے گا اس وقت آملیٹ ہی پیش کر سکتا ہوں۔ گھر میں پکانے کے لیے کچھ ہے نہیں اور بازار بند ہو چکا ہے۔

"بہرحال" میں نے تسلی دینے والے انداز میں کہا "ان کے مزید ساتھی ہاتھ لگے تو انہیں تمہاری مرضی کے عین مطابق کیفرکردار تک پہنچاؤں گا۔ خواہ قتلے بنوانا خواہ سالم ہی

فرائی کروالینا۔"

وہ دھیرے سے ہنسی اور اس کے پژمردہ چہرے پر زندگی کے کچھ آثار لوٹ آئے۔ میں نے رام پرشاد کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا "کون تھے یہ لوگ؟"

"دشمن ہی رہے ہوں گے۔" اس نے محتاط لہجے میں کہا۔

"واہ' بڑا عمدہ انکشاف کیا ہے تم نے۔" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں تو انہیں اپنا جاں نثار دوست ہی سمجھ رہا تھا اور کیٹی بھی یہی سمجھ رہی تھی کہ وہ اسے گدگدی کرکے ہنسانے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"آپ تو برا مان گئے؟" رام پرشاد جلدی سے بولا۔

"میرا مطلب تھا کہ میں ان کے بارے میں صحیح طور پر کچھ نہیں جانتا۔ میں تو خود آج انہی لوگوں کی کارروائی کا شکار ہو گیا تھا۔ اسی وجہ سے مجھے آپ تک پہنچنے میں تاخیر ہوئی۔ کسی نے نہ جانے کب میری گاڑی کے ایک وھیل کے نٹ ہی بالکل ڈھیلے کر دیئے تھے۔ میں نہ جانے کس خیال میں تھا کہ ڈرائیونگ کے دوران میں نے کوئی فرق محسوس نہیں کیا۔ پتا تو اس وقت چلا جب وہ پہیہ عین ایک چوراہے پر نکل کر لڑھکتا ہوا سیدھا ٹریفک سارجنٹ سے جا ٹکرایا۔"

اس نے قہقہہ لگایا لیکن میں نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔

"بنگلہ تو تم نے دیکھ ہی لیا ہے" میں نے کہا "اس کی مدد سے کوئی سراغ نہیں لگ سکتا"

"بنگلہ" اس بار اس نے گویا میرے بچکانہ پن پر قہقہہ لگایا۔ "ارے صاحب بنگلہ تو کسی شریف آدمی کا ہوگا' اسے تو علم بھی نہیں ہو گا کہ جو بنگلہ وہ چاؤ سے بنوا رہا ہے اس میں آج رات کیا ہوا ہے۔ اسے تو اب پولیس ہی جا کر سب کچھ بتائے گی اور اسے بھی شامل تفتیش کرلے گی۔ ان کے بارے میں کچھ جاننا آسان نہیں۔ میں بہت کوشش کر چکا ہوں۔

مزید چند منٹ کے سفر کے بعد ہم ایک کشادہ گلی میں داخل ہوئے اور ایک بلند و بالا اپارٹمنٹ ہاؤس کے قریب رام پرشاد نے گاڑی روک لی۔ گلی میں سناٹا تھا۔ میں اسٹین گن لے کر اترنے لگا تو رام پرشاد جلدی سے بولا "اوہ' براہ کرم اسے گاڑی ہی میں رہنے دیجئے۔ اس عمارت میں بڑے ہی نرم دل قسم کے شرفاء رہتے ہیں۔ کوئی راستے میں ٹکرا گیا تو ٹامی گن دیکھ کر ہی بے ہوش نہ ہوجائے۔"

میں نے گن سیٹ ہی کے نیچے چھوڑ دی۔

رام پرشاد کی رہنمائی میں ہم لفٹ کے ذریعے پانچویں منزل پر ایک اپارٹمنٹ میں پہنچے۔ یہ ایک لگژری اپارٹمنٹ تھا اور اس کی آرائش شاہانہ اور متاثر کن تھی۔ قرائن بتاتے تھے کہ یہاں وہ تنہا ہی رہتا تھا۔ اس نے ہمیں ڈرائنگ میں بٹھایا اور باتکلف میزبانوں کی طرح

پوچھنے لگا کہ ہم کیا پینا پسند کریں گے۔

میں نے کافی اور کیٹی نے برانڈی طلب کی جو اس نے چند منٹ میں حاضر کردی۔ اپنے لیے وہ بربن کا ایک گلاس تیار کرنے لگا۔ جام تیار کرکے وہ کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ اب میں نے پہلی بار اسے گہری نظروں سے کیٹی کا جائزہ لیتے دیکھا۔ لیکن اس کی نظروں میں لفنگاپن نہیں تھا۔ وہ مکمل طور پر ایک مہذب اور شائستہ آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اسے اور اس کے انداز و اطوار کو دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جرم کی دنیا سے اس کا کوئی تعلق ہوگا۔

"میں اب تک نہیں سمجھ سکا۔" میں نے کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے کہا "کہ کیبن ریستوران میں ہماری جو ملاقات ہوئی تھی' اس کا مقصد کیا تھا؟"

"مقصد تو آپ سے رابطہ پیدا کرنا اور آپ کی ضروریات سے آگاہی حاصل کرنا ہی تھا۔" اس نے گلاس کو پر خیال انداز میں انگلیوں میں گھماتے ہوئے کہا "مجھے یہ احکامات ملے ہیں کہ میں آپ کی ضرورت کی ہر چیز مہیا کروں۔ لیکن تمام تر احتیاط صرف آپ کی آمد کو خفیہ رکھنے کے لیے کی جا رہی تھی۔ بدقسمتی سے یہ احتیاط کچھ زیادہ کارآمد نہیں رہی۔ آثار بتاتے ہیں کہ دشمنوں کو نہ صرف آپ کی آمد کا علم ہے بلکہ شاید وہ آپ کے مشن سے بھی آگاہ ہیں حالانکہ میں اس سے بے خبر ہوں۔"

وہ مسکرایا اور گلاس خالی کرکے کھڑکی ہی میں رکھ کر ٹہلنے لگا۔ ایک سائیڈ ٹیبل پر ایک بارعب اور شاندار جرمن ریوالور یوں رکھا تھا جیسے وہ بھی سجاوٹ کی کوئی چیز ہو۔ اس کا چیمبر مجھے خالی ہی معلوم ہوتا تھا۔ رام پرشاد نے ٹہلتے ٹہلتے بے توجہی کے عالم میں اسے اٹھا لیا' اور ہتھیلی پر رگڑ کر اس کی چرخی کو گھماتے ہوئے بولا "آپ دونوں چاہیں تو ہوٹل سے اب یہیں اٹھ آئیں۔ آج رات ساڑھے سات اور آٹھ کے درمیان احسان مرزا صاحب کی کال آنے کی توقع ہے۔ میری براہ راست انہی سے بات ہوگی۔ میں انہیں حالات سے مطلع کردوں گا۔"

"اس سلسلے میں میں صبح کوئی جواب دوں گا۔" میں نے کہا "میرے خیال میں اب زیادہ احتیاط کی بھی ایسی ضرورت نہیں رہی۔ اس لیے اگر تم برا محسوس نہ کرو تو مرزا صاحب سے میں بھی بات کرلوں۔"

"میں تو خود آپ سے یہی درخواست کرنے والا تھا۔"

رام پرشاد جلدی سے بولا۔ "بہرحال اب آپ یہ بتا دیجئے کہ آپ کو کس کس چیز کی ضرورت ہے؟"

"نہ جانے کیوں اب میں کسی بھی چیز کی کوئی خاص ضرورت نہیں محسوس کر رہا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کافی کا کپ تپائی پر رکھتے ہوئے کہا۔ "اور اگر کسی چیز کی ضرورت پڑی

بھی تو شاید میں اپنے ہی طور پر حاصل کرلوں' البتہ ایک سوال کا جواب حاصل کرنے میں سخت ضرورت محسوس کر رہا ہوں۔"

"وہ کیا سر؟" اس نے ٹہلتے ٹہلتے رک کر پوچھا۔

"وہ سوال یہ ہے کہ دشمنوں کے ہاتھ تم کتنی قیمت میں بکے ہوئے ہو؟" میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

"کیا؟" اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ریوالور اس کے ہاتھ میں ساکت تھا مگر اس کی چرخی اب بھی گھوم رہی تھی۔

"میں نے ایک سیدھا سادا سوال کیا ہے رام پرشاد۔" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "میں کم عمر بھی ہوں اور بعض معاملات میں اناڑی بھی۔ لیکن میں احمق ہرگز نہیں ہوں۔ تم نے ہمیں مروانے کا بڑا عمدہ بندوبست کیا تھا' لیکن جب بازی پلٹتے دیکھی تو معصوم بن کر سامنے آگئے۔ پرانے کھلاڑی ہو نا۔"

"تمہیں یقیناً غلط فہمی ہوئی ہے۔" وہ سنبھل کر بولا۔ "تمہیں مروا کر مجھے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔"

"یہ تو تم ہی بہتر بتا سکتے ہو۔" میں نے کہا۔ "تاہم تھوڑا بہت اندازہ مجھے ضرور ہے۔ ہماری آمد سے تمہارے کچھ مفادات متاثر ہونے کا خطرہ پیدا ہو چلا ہوگا۔ احسان مرزا کی نظروں سے دور بیٹھ کر یقیناً تمہاری پانچوں گھی میں ہوں گی اور پھر ہمارا سودا تو تم نے ویسے بھی سستے داموں نہیں کیا ہوگا۔"

"تم دیکھنے میں ہی بچے نہیں تمہاری باتیں بھی بچکانہ ہیں۔" وہ کھوکھلے انداز میں ہنسا۔ "میں بارہ سال سے احسان مرزا کے ساتھ ہوں۔"

"پہلے تم یقیناً اس سے مخلص رہے ہوگے۔" میں نے تسلیم کیا۔ "اس ساکھ کی وجہ سے وہ تم پر شبہ نہیں کر سکا ہوگا۔ بہرحال اب تم جلدی سے بتا دو کہ تمہیں ہمارے متعلق کیا کچھ معلوم ہے؟ تم نے ان لوگوں کو کس حد تک بتایا تھا۔ جو میرے ساتھوں مارے جا چکے ہیں؟ اور یہ کہ تمہاری مخبری کی وجہ سے ہمیں مزید کیا خطرات درپیش ہوسکتے ہیں۔"

"تم نے تو میرے سامنے پورا ایک امتحانی پرچہ رکھ دیا ہے۔" وہ مسکرایا۔ "آخر تمہیں کیونکر یقین ہوگا۔"

"گفتگو کو طول مت دو رام پرشاد۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "میں اس وقت تک فیصلے کرنے کے معاملے میں سخت عجلت پسند ہو چکا ہوں۔ تم یہ مت سمجھنا کہ میں کوئی انتہائی قدم اٹھانے کے لیے احسان مرزا سے اجازت یا مشورہ طلب کروں گا۔"

رام پرشاد بدستور مسکرا رہا تھا۔ اور اس طرح مسکراتے مسکراتے اچانک اس نے خالی ریوالور مجھ پر کھینچ مارا۔ مجھے اس کی طرف سے حملے کی توقع تو تھی مگر میرا خیال تھا کہ وہ

بغلی ہولسٹر سے ریوالور نکالنے کی کوشش کرے گا اور اس کے لیے میں تیار تھا لیکن مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ خالی ریوالور مجھ پر کھینچ مارے گا۔ تاہم اضطراری طور پر میں ایک طرف ہو گیا تھا اور اس جبلی سے ردعمل نے مجھے بچا لیا۔

کاؤچ جس دیوار کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ ریوالور اس سے یوں ٹکرایا جیسے کوئی وزنی ہتھوڑا اس پر مارا گیا ہو۔ اگر ریوالور میرے چہرے پر پڑا ہوتا تو یقیناً عمر بھر کے لیے میرے نقوش ہی تبدیل ہو جاتے۔

رام پرشاد کا ہاتھ بغلی ہولسٹر تک پہنچ چکا تھا' لیکن اس وقت تک میں اس پر چھلانگ لگا چکا تھا۔ ہاتھا پائی کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ میں نے اس کی گردن پر کراٹے کا پہلا ہی ہاتھ فیصلہ کن رسید کیا۔ اس نے ایک ہچکی سی لی اور قالین پر چت گر کر ساکت ہو گیا۔ اس کی گردن ٹوٹ چکی تھی۔

"تم تو واقعی بہت عجلت پسند نظر آ رہے ہو۔" کیٹی نے برانڈی کا چھوٹا سا گلاس تپائی پر رکھ کر سرسری سے لہجے میں کہا اور بیزاری سے رام پرشاد کی لاش کی طرف دیکھا جیسے وہ محض کاٹھ کباڑ کا ایک ڈھیر ہو۔

"میں جنگل کے درندوں کو تو کچھ چھوٹ دے سکتا ہوں۔ آستین کے سانپوں کو نہیں۔" میں نے ٹہلتے ہوئے کہا "ایک بار اگر معلوم ہو جائے کہ آستین میں سانپ موجود ہے تو پھر اس کو مارنے میں تاخیر کرنا خودکشی کے مترادف ہے اور فی الحال میں خودکشی کے موڈ میں نہیں ہوں۔"

دفعتاً فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

چند لمحے کے لئے میں الجھن میں رہا لیکن جب گھنٹی دوبارہ بجی تو میں نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھا لیا۔

"ٹو تھری نائن ٹو سکس" ایک مترنم نسوانی آواز نے پوچھا۔ میں نے ٹیلی فون پر نمبر دیکھتے ہوئے کہا "یس"

"ہولڈ کیجئے۔ بمبئی سے آپ کی کال ہے" آپریٹر نے کہا اور دوسرے ہی لمحے کلک کلک شروع ہو گئی۔ میں نے گہری سانس لی۔ چند سیکنڈ بعد ہی جس آواز نے ہیلو کہا اسے میں ہزاروں میں بھی پہچان سکتا تھا۔ "کیا خبر ہے؟" اس نے پوچھا۔

"خبر کچھ اچھی نہیں۔" میں نے دھیرے سے کہا۔

"اوہ' تو تم یہاں موجود ہو۔" احسان مرزا نے بھی گہری سانس لے کر کہا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ جس طرح میں اس کی آواز ہزاروں میں پہچان سکتا ہوں اس طرح وہ بھی میری آواز سے بخوبی آشنا ہو چکا ہے۔

"پروگرام کے مطابق تو اس وقت تمہیں یہاں نہیں ہونا چاہیے تھا۔" اس نے کہا۔

"اس سے تم اندازہ کر سکتے ہو کہ پروگرام کس حد تک خراب ہو چکا ہے۔" میں نے کہا۔

"رام پرشاد کہاں ہے؟" اس نے پوچھا۔

"افق کے پار۔" میں نے جواب دیا "وہ بک چکا تھا بلکہ نہ جانے کب سے بکا ہوا تھا۔ اسے طویل سفر پر بھیجنا بہت ضروری ہو گیا تھا۔"

"اوہ!" احسان مرزا نے ہولے سے کہا اور چند لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔

"تاسف کا شکار ہو گئے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں نہیں" وہ جلدی سے بولا۔ "میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ مجھے بڑی تاخیر سے پتا چلا۔ اور اب اپنی ناکامیوں کی وجہ بھی سمجھ میں آ گئی۔ پھر قدرے توقف سے بولا۔ "بہرحال تمہیں اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو اس کے لیے ایک ایڈریس اور نوٹ کر لو۔" اس نے مجھے ایک شخص کا نام و پتا نوٹ کرایا۔

"اور کچھ۔" آخر میں اس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے کہا۔ "زبانی ہی باتیں ہوں گی۔ بشرط زندگی۔"

"گڈ لک۔" اس نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا کیٹی اپنے گلاس میں کچھ اور برانڈی انڈیل رہی تھی۔

"فی الحال تم اس کا پیچھا چھوڑ دو۔" میں نے گلاس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "جتنی جلد ہم یہاں سے نکل چلیں اتنا ہی بہتر ہے۔ ہم اب ہوٹل واپس چلتے ہیں۔ راستے میں البتہ اس شخص سے ملتے چلیں گے جس کا ایڈریس احسان مرزا نے نوٹ کرایا ہے۔ یہ ایک دکان کا پتا ہے کہیں بند ہی نہ ہو چکی ہو۔"

کیٹی گلاس چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے تپائی پر سے رام پرشاد کی گاڑی کی چابی اٹھائی اور دروازے کی طرف بڑھا۔ کیٹی لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"اس کا کیا بنے گا؟"

"اسے پولیس کے لیے چھوڑ دو۔" میں نے کہا۔ "پولیس اگر لاشیں بھی ٹھکانے نہیں لگائے گی تو آخر کیا کرے گی؟"

"یہ بھی درست ہے۔" کیٹی مسکراتے ہوئے بولی اور میرے ساتھ چل دی۔

نیچے آ کر رام پرشاد کی شاندار گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ میں نے سنبھالی۔ پوچھتے پاچھتے ہم جس علاقے میں پہنچے اس کا نام چائنا ٹاؤن تھا۔ یہاں کی گلیاں تنگ و تاریک اور اینٹوں سے بنی ہوئی تھی۔ ایک مقام پر پہنچ کر ہمیں کار چھوڑ ہی دینی پڑی' کیونکہ پر پیچ گلیوں سے اس کا گزرنا ممکن نہیں رہا تھا۔ ان گلیوں میں کوئی شخص آتا جاتا نظر نہیں آ رہا تھا جس سے ہم مزید آگے راستہ دریافت کر سکتے۔ اس لیے ہم محض اندازے سے ہی آگے بڑھتے جا

رہے تھے۔

گلیاں بے شک تنگ و تاریک تھیں لیکن مکانات کئی کئی منزلہ تھے اور اوپر کی منزلیں آمنے سامنے گویا ایک دوسرے سے بغلگیر ہو رہی تھیں۔ کہیں کہیں کسی کونے پر کمزور سی روشنی کا کوئی گرد آلود بلب آویزاں تھا ورنہ کہنہ سال دیواریں ملگجی تاریکی کا لبادہ اوڑھے کھڑی تھیں۔ کھلی نالیوں کی بدبو کے علاوہ درودیوار سے بھی سیلن کی بوپھوٹ رہی تھی۔ قدم قدم پر ایک عجیب سی وحشت کا احساس ہوتا تھا۔یوں لگتا تھا کہ ابھی کہیں تاریکی سے کوئی ہاتھ برآمد ہوگا اور پہلو میں خنجر گھونپ دے گا۔

ہم شاید کسی کی مدد کے بغیر مطلوبہ ایڈریس پر نہ پہنچ پاتے لیکن یہ اتفاق ہی تھا کہ سطح زمین سے کافی نشیب میں ایک مکان کے تہہ خانہ نما حصے کے دروازے پر ہمیں ایک جاپانی لالٹین ٹنگی نظر آئی۔ یہ لالٹین دراصل ایک سائن بورڈ پر آویزاں تھی۔

"گرد آلود سائن بورڈ پر اوپر سے نیچے کئی سطروں میں چینی میں نہ جانے کیا تحریر تھا۔ لیکن ایک طرف انگریزی میں ٹیڑھے میڑھے حروف میں لیوتانگ کی نوادرات کی دکان بھی لکھا ہوا نظر آرہا تھا۔ میں نے اطمینان کی ایک گہری سانس لی' مجھے اسی جگہ کی تلاش تھی۔

تین سیڑھیاں اتر کر ہم دروازے تک پہنچے۔ دروازہ خود نوادرات میں شمار ہو سکتا تھا۔ یوں تو اس میں شیشہ بھی لگا ہوا تھا مگر گرد اور میل کی موٹی تہہ کے باعث اس کے پار دیکھنا ممکن نہیں تھا اور نہ ہی اس پر کوئی ایسی تختی آویزاں تھی جس سے علم ہو سکتا کہ دکان بند ہے یا کھلی۔ تاہم جب میں نے دروازے پر ہاتھ رکھ کر ہلکا سا دباؤ ڈالا تو وہ مسلسل چرچراہٹ کے ساتھ یوں کھلتا چلا گیا' جیسے اندر موجود کسی شخص کو خبردار کر رہا ہو۔

باہر سے اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ دکان اتنی طویل و عریض ہو گی۔ چھت کو کئی بھدے سے ستون سہارا دیئے کھڑے تھے۔ جو مدھم سی روشنی میں جناتی ہیولے معلوم ہو رہے تھے۔ دیواروں کے ساتھ کہیں کہیں گردآلود شوکیس اور چند ایک شیلف بھی موجود تھے جن میں مختلف بناوٹ کی کچھ زنگ آلود چھریاں' مٹی کے کچھ ٹوٹے پھوٹے کھلونے اور فن آرائش کا مذاق اڑانے والی کچھ آرائشی اشیاء اور پھٹی ہوئی سالخوردہ کتب اور کاغذات موجود تھے۔ کچھ نوادرات اس اعتبار سے واقعی نادر تھے کہ ان کے بارے میں یہ اندازہ لگانا ممکن نہیں تھا کہ وہ کیا چیز تھیں۔ دکان میں تمباکو کی بو پھیلی ہوئی تھی لیکن اس کا مخرج کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔

ٹہلنے کے سے انداز میں ہم نے تقریباً پوری دکان کا چکر لگا لیا۔ کہیں کوئی شخص دکھائی نہ دیا۔ میں نے ہانک لگائی۔ "کوئی ہے؟" میں نے سوال انگریزی میں کیا تھا۔

"میں یہاں ہوں۔" ایک شوکیس کے عقب سے منمناتی ہوئی سی آواز سنائی دی۔

ہم وہاں پہنچے تو بنچ پر ایک عجیب الخلقت سا انسان گاؤتکیے کے سہارے لیٹا نظر آیا۔ وہ

ایک سوکھا سڑا سا چینی تھا مگر پیٹ یوں پھولا ہوا تھا جیسے سانپ نے انڈا نگل رکھا ہو۔

اس ٹھٹھرا دینے والی سردی میں وہ صرف ایک تہمد لپیٹے' حقے کی نے منہ میں دبائے لیٹا تھا۔اس کے پیٹ کی جلد پیلی پیلی سی تھی اور اس پر نیلی رگیں پھیلی نظر آرہی تھیں اور صرف اسی کی وجہ سے وہ چت پڑے ہوئے کسی بڑے سے مینڈک سے مشابہ نظر آرہا تھا۔

اس کی لمبی سی نوکیلی اور کھچڑی داڑھی ڈھیلے ڈھالے انداز میں ایک طرف کو ڈھلکی ہوئی تھی اور گدلی گدلی سی آنکھیں گویا بینائی سے محروم تھیں۔ میں اندازہ نہیں کر سکا کہ اس نے ہمیں دیکھ لیا تھا یا نہیں' بہرحال اس نے اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"مجھے احسان مرزا نے بھیجا ہے۔" میں نے کسی قسم کے کوڈ ورڈ کا تکلف کیے بغیر براہ راست کہا۔ وہ یک لخت یوں اٹھ بیٹھا جیسے کسی طاقتور اسپرنگ نے اسے اچھال دیا ہو۔ "کیا حکم ہے میرے آقا؟" اس نے چراغ الہ دین کے جن والے سٹائل میں پوچھا۔ حلیے کے اعتبار سے بھی وہ چراغ الہ دین کے جن کا چھوٹا ماڈل معلوم ہوتا تھا۔ مجھے ہنسی آتے آتے رہ گئی۔



میں ایک لمحے خاموش رہا۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ مجھے جو کچھ درکار تھا' وہ اس سے مل بھی سکتا ہے یا نہیں؟ پھر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ مقصد بیان تو کر دینا چاہیے۔

"مجھے دو تین خاص ہتھیار چاہئیں۔" میں نے مدھم لہجے میں کہا۔

اس نے بنچ سے پاؤں لٹکا کر گھسے پٹے سے سلیپروں میں پھنسائے اور اٹھ کر ہمیں پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے دکان کی عقبی دیوار کی طرف چل پڑا۔ دیوار کے عین قریب پہنچ کر مجھے اندازہ ہوا کہ اس میں ایک دروازہ موجود تھا۔ بوڑھے نے جس کا نام غالباً لیو تانگ تھا' تاب دبا کر دروازہ کھولا اور ہم اونچی چھت والے نیم تاریک ہال میں داخل ہوئے۔ دائیں طرف ایک راہداری میں کچھ دور چلنے کے بعد ہم جس کمرے میں پہنچے' وہ قدیم لیکن شاہانہ طرز کی ایک نشست گاہ تھی۔ اس کمرے کا قالین اور فانوس بلاشبہ بے حد بیش قیمت تھے۔

قالین کے ساتھ ہی گویا لیو تانگ بھی ہمارے قدموں میں بچھا جا رہا تھا۔ کاؤچ نما ایک مخملیں نشست پر ہمیں بٹھانے کے بعد اس نے خالصتاً شاہانہ انداز میں تالی بجائی۔ چند لمحے بعد متصل کمرے کا دروازہ کھلا اور جو لڑکی اندر آئی' اسے دیکھ کر میں چند لمحے کے لیے آنکھ جھپکنا ہی بھول گیا۔ اسے بلا جھجک چین کی ملکہ حسن قرار دیا جا سکتا تھا۔

بوٹا سا قد' پھول سے رخسار' ریشم سے بال اور سانچے میں ڈھلا ہوا جسم' جس کے نشیب و فراز سادہ سے چینی لباس میں بھی قیامت ڈھا رہے تھے۔ آنکھیں چھوٹی اور ناک قدرے چپٹی ہونے کے باوجود ہندوستانی معیار سے بھی اس کے حسن بلاخیز اور کشش میں کوئی کمی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ وہ ہماری طرف دیکھ کر مسکرائی تو گویا کمرے میں آویزاں فانوسوں کی جگمگاہٹ کچھ اور بڑھ گئی۔

"یہ میری بیٹی پی چن ہے۔" لیو تانگ نے سرخم کرتے ہوئے بتایا۔ پھر پی چن کی طرف مڑ کر بولا۔ "اور یہ ہمارے آقا کے بھیجے ہوئے مہمان ہیں۔" اس نے ہمارے نام جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"خوش آمدید......" لڑکی نے بھی قدرے خم ہو کر ایک بار پھر اپنی مسکراہٹ سے کمرے کو مزید منور کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ کیٹی بھی اسے ایک ٹک گھور رہی تھی۔ معلوم

نہیں وہ بھی اس کے بے پناہ حسن سے متاثر تھی یا مجھے متاثر دیکھ کر رشک و حسد کے ملے جلے جذبات کا شکار تھی۔ میں تو بہرحال اس تضاد پر بھی حیران تھا کہ چھپکلی نما ایک شخص کی بیٹی اس قدر حسین کیونکر تھی۔

لیو تانگ نے چینی میں لڑکی سے کچھ کہا اور وہ اثبات میں سر ہلا کر کمرے سے نکل گئی۔ لیو تانگ ہمارے سامنے ایک نشست پر مودبانہ انداز میں یوں جھک گیا گویا مراقبے میں چلا گیا ہو۔ کیٹی اور میں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا دیئے۔

چند لمحے بعد پی چن ایک نہایت خوبصورت نقرئی ٹرے پر تراشیدہ ہیرے کی طرز پر بنے ہوئے تین بلوری گلاس رکھے واپس آئی۔ جن میں ارغوانی رنگ کا کوئی مشروب موجود تھا۔ قریب آکر وہ گلاس تپائی پر رکھنے کے لیے جھکی تو اس کے وجود سے اٹھتی ہوئی مہک نے مجھے مسحور سا کر دیا۔

لیو تانگ نے مراقبے سے سر اٹھا کر ہمیں گلاس اٹھانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "بلا تکلف پیجئے۔ یہ شراب نہیں ہے' تاہم اگر کسی بھی قسم کی شراب یا وہسکی وغیرہ کی ضرورت ہو تو بلا جھجک حکم دیجئے گا' حاضر کر دی جائے گی۔"

"شکریہ! بس جو کچھ ہے' یہی ٹھیک ہے۔" میں نے مسکرا کر گلاس اٹھاتے ہوئے کہا۔

"یہ قدیم چین کے امراء کا مشروب خاص ہے۔" اس نے ایک گلاس خود اٹھاتے ہوئے کہا۔

مجھے نہیں معلوم کہ مشروب پینے کے بعد کیٹی کی کیا حالت ہوئی تھی' تاہم میری اپنی تو چند لمحے بعد یہ حالت تھی کہ رگوں میں دوڑتا ہوا خون جیسے آتش سیال بن گیا تھا۔ کانوں کی لویں بری طرح تپنے لگی تھیں اور جی چاہنے لگا تھا کہ میں اپنے جسم پر کوئی گرم کپڑا باقی نہ رہنے دوں۔

"کھانے میں آپ کیا پسند فرمائیں گے؟" لیو تانگ نے پوچھا۔

"ان تکلفات کی ضرورت نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "بس ہمیں دو ٹامی گنیں غیر اسمبل شدہ حالت میں اور ایک موبرگ ریوالور اسمبل شدہ حالت میں عنایت کر دیجئے۔"

لیو تانگ نے چینی زبان میں پی چن سے کچھ کہا اور وہ ایک بار پھر متصل کمرے کے دروازے میں لہراتا ہوا پردہ اٹھا کر' اس کے پیچھے غائب ہو گئی۔ چند لمحے بعد وہ کئی ڈبے بازوؤں پر اٹھائے ہوئے واپس آئی۔ ان ڈبوں پر مختلف کھلونوں کی تصویریں چھپی ہوئی تھیں۔ پی چن نے ڈبے تپائی پر رکھ دیئے۔

لیو تانگ نے ان میں سے دو ڈبے منتخب کر کے کھولے۔ ان میں دو ٹامی گنیں غیر اسمبل شدہ حالت میں رکھی تھیں۔ ایک ڈبے سے اس نے تمام پارٹس نکال دیئے اور علیحدہ ہی رکھتے ہوئے ایک چھوٹے سے ڈبے سے دو مختلف سائزوں کے اسکریو ڈرائیور نکالتے ہوئے

بولا۔ "یہ ٹامی گنیں جرمنی کی بنی ہوئی ہیں اور جدید ترین ساخت کی ہیں۔ شاید آپ کو اسمبل کرنے میں کوئی دشواری پیش آئے۔ ایک گن میں اسمبل کرکے دکھا دیتا ہوں۔ اس کے بعد آپ کو کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔"

اس کی انگلیاں گن کے پارٹس سے اس مشاقی سے کھیلنے میں مصروف تھیں گویا کوئی ماہر فن استاد ستار کے تاروں پر کوئی نغمہ چھیڑ رہا ہو۔ دیکھتے دیکھتے ہی اس نے دو اسکریو ڈرائیورز کی مدد سے ان پارٹس کو جوڑ کر گن تیار کر دی جو ایک چھوٹے سے ڈبے میں سمائے ہوئے تھے۔ طریقہ ذہن نشین کرنے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی' تاہم اطمینان کی خاطر لیو تانگ نے دوسری گن مجھ سے اسمبل کروا کے دیکھی۔ مطمئن ہو کر اس نے محض چند سیکنڈ میں دونوں گنیں کھول کر پارٹس کی صورت میں ڈبوں میں بند کر دیں۔ پھر ایک ڈبے سے موبرگ نکال کر مجھے دکھایا۔

یہ لمبی نال والا اور نو گولیوں والا ایک تباہ کن ریوالور تھا۔ اس کا دستہ نہایت چھوٹا اور چپٹا تھا اور اسے نہایت آسانی سے کلائی یا ٹانگ کے ساتھ فیتے کی مدد سے باندھ کر چھپایا جا سکتا تھا۔

"اگر آپ ضرورت محسوس کریں تو میں ایک اور ننھا سا لیکن نہایت کارآمد ہتھیار آپ کی خدمت میں پیش کروں۔" لیو تانگ نے مودبانہ انداز میں کہا۔ "ایک قدیم فارمولے کو جدید ہتھیار کی شکل دی گئی ہے۔ نازک اور خاص حالات میں نہایت کام کی چیز ہے۔"

"ضرور دکھایئے۔" میں نے اشتیاق سے کہا۔

اس نے ایک چھوٹا سا ڈبہ کھول کر کھلونا نما ایک چمکیلا پستول نکالا۔ سائز میں یہ ایک عام سگریٹ لائٹر کے برابر تھا اور اس کی نال لمبائی اور موٹائی میں سگریٹ سے بھی کہیں چھوٹی تھی اور تقریباً ٹھوس ہی تھی۔ اس کے درمیان صرف اتنا ہی سوراخ تھا کہ قدرے پرانی ساخت کے گراموفون کی سوئی ہی اس سے گزر سکتی تھی' جو اب بھی کہیں کہیں مستعمل تھے۔

"یہ نہایت جدید ڈارٹ گن ہے۔" لیو تانگ نے بتایا۔ "اس کی مار بیس گز ہے اور ایک وقت میں اس میں زہر میں بجھی ہوئی بیس سوئیاں لوڈ ہوتی ہیں اور سوئی کسی بھی جاندار کی کھال میں اتر جائے تو اس کی موت یقینی ہے' اور پھر آواز بھی قطعاً پیدا نہیں ہوتی۔"

"واقعی بڑے کام کی چیز ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ بھی میرے لیے رکھ دیجئے۔"

اس نے ایک اور چھوٹی سی ڈبیا کھولی۔ یہ گراموفون ہی کی سوئیوں جیسی چھوٹی چھوٹی سوئیوں سے بھری ہوئی تھی' لیکن یہ سوئیاں چمکیلی سیاہ تھیں۔ "یہ پانچ سو سوئیوں کی ڈبیا ہے۔" لیو تانگ نے بتایا۔ پھر وہ ڈارٹ گن کو لوڈ اور ان لوڈ کرنے کے علاوہ بے خطا نشانہ

لگانے کے سلسلے میں مزید ضروری ہدایات دینے لگا۔

مزید چند ضروری معاملات پر گفتگو کرنے کے بعد ہم نے اس سے اجازت طلب کی۔ لیو تانگ اور اس کی بیٹی ہمیں دروازے تک چھوڑنے آئے۔ رخصت ہوتے وقت میری نظریں ایک بار پھر لی چن سے ملیں اور میں نے اس کی آنکھوں میں ایک سوال کا ستارہ جھلملاتے دیکھا۔ میں کوئی فلمی یا افسانوی ہیرو نہیں تھا جو یقین کر لیتا کہ اس مختصر سی پہلی ملاقات میں وہ مجھ پر عاشق ہو چکی ہے لیکن اس سوال کے مفہوم میں بہرحال کوئی شبہ نہیں تھا۔ "کیا پھر بھی کبھی آؤ گے اجنبی؟"

میں نے اس خاموش سوال کی چبھن محسوس کی' لیکن جبراً اسے اپنا وہم اور خوش قسمتی قرار دے کر منہ پھیر لیا اور باپ بیٹی کو الوداع کہہ کر کیٹی کا ہاتھ تھام کر چل دیا۔

میرا خیال تھا کہ راستے میں کیٹی لی چن پر کوئی تبصرہ کرے گی' اس کے بارے میں میرے محسوسات جاننے کی کوشش کرے گی' لیکن اس کے بجائے کافی دیر کی خاموشی کے بعد اس نے پوچھا۔ "اور اس ٹامی گن کا کیا کرو گے جو رام پرشاد کی گاڑی میں موجود ہے؟"

"میں اسے گاڑی ہی میں چھوڑ کر گاڑی رام پرشاد کے اپارٹمنٹ ہاؤس کے قریب ہی چھوڑ دوں گا۔" میں نے جواب دیا۔

دوسرے روز ہم برانچ لائن کی ایک ٹرین کے ذریعے کھٹمنڈو سے ایک سرحدی گاؤں موتیلا کی طرف روانہ ہوئے۔ اب ہم دونوں ہی حلیے کے اعتبار سے اینگلو انڈین سیاح معلوم ہو رہے تھے۔ ہم دونوں ہی کی کمر پر کینوس کے تھیلے بندھے ہوئے تھے۔

موتیلا پہنچتے پہنچتے ہمیں شام ہو گئی۔ وہ رات ہمیں گاؤں ہی میں ایک شخص میگھنا کے گھر گزارنی پڑی۔ یہ بھی احسان مرزا کا ایجنٹ تھا۔ دوسری صبح اس نے آٹھ سو سی سی کی ایک طاقتور اور مضبوط موٹر سائیکل ہمارے حوالے کی جس کے ساتھ فاضل پرزوں کا ایک بڑا ڈبہ بھی منسلک تھا۔

پروگرام اور روٹ تو پہلے ہی سے طے تھا لیکن میں نے ایک بار پھر نقشہ کھول کر میگھنا سے تفصیلی طور پر تبادلہ خیال کر لیا۔ میگھنا نے واضح نشانیوں کے ساتھ اس پٹی کے بارے میں بتایا جس پر سفر کرتے وقت سرحد عبور کرنا بقول اس کے ایسا ہی تھا جیسے آدمی اپنے گھر کا صحن عبور کرکے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں چلا جائے۔

ابتداء میں چالیس پچاس میل کے سفر میں ہمیں کچھ دشواری پیش آئی کیونکہ کافی راستہ ہمیں پہاڑی علاقوں میں طے کرنا پڑا' جہاں کہیں کہیں برف جمی ہوئی تھی اور بعض مقامات پر تو راستے کی چوڑائی ایک گز سے بھی کم تھی۔ ان راستوں پر واقعی طاقتور موٹر سائیکل کے علاوہ کسی سواری کا چلنا ناممکن ہی تھا۔

مزید پچاس میل کے سفر میں ہم پہاڑوں کی بلندیوں سے نشیب میں آگئے۔ کہیں چٹیل میدان، کہیں جنگل اور کہیں دلدلی علاقہ بھی آیا۔ ایک جگہ تو ہماری موٹرسائیکل دلدل میں اترتے اترتے ہی بچی۔ چند میل ہموار راستے پر کیٹی نے بھی موٹرسائیکل چلائی، لیکن دشوار گزار راستوں پر چلانا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔

اس وقت دھوپ ڈھلنے لگی تھی، جب ہم ایک ایسے ناہموار میدانی سے علاقے میں پہنچے جہاں جابجا چھوٹے بڑے ٹیلے سر اٹھائے کھڑے تھے اور مٹی نارنجی سے رنگ کی تھی۔ یہاں ایک ٹیلے کی اوٹ میں بیٹھ کر ہم نے ڈبوں میں بند خوراک سے پیٹ کی آگ بجھائی۔ پانی پیا اور کچھ دیر ستانے اور گپ شپ کرنے کے بعد ہم نے ایک بار پھر سلسلہ سفر جوڑا۔

ہم بمشکل تین چار میل ہی فاصلہ طے کر پائے تھے کہ ایک ٹیلے کی اوٹ سے نکلتے ہی اچانک ایک وردی پوش ہمارے سامنے آگیا۔ میں شاید موٹرسائیکل کو لہرا کر اس سے بچتا ہوا نکل جاتا لیکن میں نے اس کے ہاتھ میں دور مار رائفل دیکھ لی تھی۔ یوں تو میرے پیچھے بیٹھی ہوئی کیٹی کی بیلٹ میں موبرگ اڑسا ہوا تھا جو جیکٹ کی آڑ میں تھا لیکن فوری طور پر نکالا جاسکتا تھا، مگر میں نے کیٹی کو ٹھوکا دے کر ریوالور نکالنے اور وردی پوش کو گولی مارنے سے باز رکھا۔ کیونکہ میں نے کچھ ہی دور ایک نیم پختہ کوٹھڑی اور ایک خیمے پر مشتمل سرحدی چوکی کی ایک جھلک دیکھ لی تھی۔

میکھنا نے ایسا کوئی امکان ظاہر نہیں کیا تھا کہ راستے پر میرا سامنا سرحدی فوجیوں سے بھی ہو سکتا ہے اور میں راستے سے بھٹکا بھی نہیں تھا۔ کچھ دیر پہلے ہی پڑاؤ کے دوران بھی میں نے نقشہ کھول کر قطب نما کی مدد سے بھی دیکھا تھا کہ ہم صحیح راستے پر جا رہے تھے۔

بہرحال میں نے اسے بچاتے ہوئے موٹرسائیکل روکی اور ہر ہنگامی قدم اٹھانے کے لیے تیار ہو گیا۔

سرحدی فوجی جس کے جسم پر بھارتی وردی اور کندھے پر دو ستارے بھی سجے ہوئے تھے، دور مار رائفل کو لاپروائی سے ہلاتا اور میرے بجائے کیٹی کو پر تجسس نظروں سے دیکھتا قریب آگیا۔ اس کی مونچھیں گلہری کی دم کی طرح پھولی پھولی اور اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں۔

"یہ کس قسم کا مال لیے جا رہے ہو؟" اس نے رائفل کی نال سے کیٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے استہزائیہ سے لہجے میں پوچھا۔ کیٹی گو کہ جینز جیکٹ میں تھی بال کٹے ہوئے تھے، سر پر شکاریوں والی ٹوپی تھی لیکن یہ دیکھنا بہرحال زیادہ مشکل نہیں تھا کہ وہ لڑکی تھی۔

"بڑا عمدہ قسم کا مال ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "ہاتھ لگا کر دیکھو کرنٹ مارے گا۔"

اس نے کھل کر قہقہہ لگایا۔ گویا میں نے اسے لطیفہ سنا دیا ہو اور وہ اس سے خوب محظوظ ہوا ہو۔ پھر اس نے چاروں طرف گھوم کر ہمارا اور موٹرسائیکل کا اوپر نیچے سے اچھی طرح جائزہ لیا اور سامنے آکر قدرے حیرت زدہ سے لہجے میں بولا۔ "تمہارے پاس تو واقعی کوئی مال نظر نہیں آ رہا..... پھر سرحد پار کیا کرنے جا رہے ہو؟ یا محض اس لونڈیا ہی کو ایکسپورٹ کرنے جا رہے ہو؟"

"مال تو واقعی میرے پاس کوئی نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "مال لے کر جاؤ یا بغیر مال کے جاؤ، ہمارا خرچہ تو دے کر ہی جانا پڑے گا۔ اگر مال لے کر نہیں جا رہے تو یہ تمہاری بے وقوفی ہے، ہماری نہیں۔"

"کون سی کرنسی میں خرچہ چاہیے اور کتنا؟" میں نے ادھر ادھر کی باتوں میں مزید وقت ضائع کیے بغیر فوراً پوچھا۔ "ہمارے پاس امریکی ڈالر بھی ہیں اور بھارتی روپیہ بھی۔"

"انڈین کرنسی میں ہی دے دو ...... پانچ سو روپے۔"

اس نے سوچ کر جواب دیا۔ "تم خالی ہاتھ جا رہے ہو اس لیے تم سے خاص رعایت ہے۔"

میں نے کیٹی کو اشارہ کیا۔ اس نے کندھے سے لٹکے ہوئے چھوٹے سے بیگ سے سو سو کے پانچ نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیئے جو اس نے لے کر اطمینان سے اپنی جیب میں رکھ لیے اور چوکی کی طرف چل دیا جس کے دروازے پر ایک اور وردی پوش کھڑا تھا۔ میرے سامنے ہی انہوں نے ہمارے نوٹوں کو بانٹ لیا اور ہاتھ ہلا کر ہمیں الوداع کہا۔

میں نے موٹرسائیکل کو گیئر لگایا۔ راستہ ایسا زیادہ دشوار گزار نہیں تھا، اس لیے ہم خاصی تیزرفتاری سے فاصلہ طے کرنے لگے۔ تیز ہوا اور موٹرسائیکل کے شور کی وجہ سے ہمیں جو بھی بات کرنی ہوتی تھی چلا کر کرنی پڑتی تھی۔ کیٹی میرے کان میں چلائی۔ "اب تمہاری سمجھ میں آگیا ہو گا کہ اسمگلنگ اتنی پھولتی پھلتی کیوں جا رہی ہے۔"

"میری سمجھ میں بہت عرصہ پہلے ہی آ چکا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

تقریباً بیس میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم ایک ایسے راستے پر پہنچے جو بڑے بڑے تودوں کو تراش کر اس طرح بنایا گیا تھا کہ بارہ چودہ فٹ چوڑی اور اونچی دیوار سے مشابہ نظر آتا تھا۔ اس کے دونوں طرف نشیب میں کائی زدہ زمین تھی اور کہیں کہیں خود رو جھاڑیوں کے جھنڈ نظر آ رہے تھے۔ جن کے درمیان کوئی کوئی جنگلی خرگوش پھدکتا نظر آ رہا تھا۔ یہ دیوار نما سڑک اس بات کی بھی نشانی تھی کہ وہ وادی اب زیادہ دور نہیں جو ہماری منزل تھی اور جس کا نام احسان مرزا نے جو بتایا تھا اس کا اردو میں مطلب "تاریک وادی" بنتا تھا، حالانکہ بقول اس کے وہاں روشنی کی کوئی کمی نہیں تھی۔ دیوار نما سڑک بڑے عجیب و غریب طریقے سے آگے بڑھ رہی تھی۔ کبھی اس میں کوئی ایسا موڑ آجاتا جہاں دونوں طرف

چٹانیں وغیرہ یوں اس پر جھکی نظر آتیں کہ راستہ مسدود معلوم ہوتا تھا لیکن قریب پہنچنے پر پتا چلتا کہ وہاں سے سڑک نشیب میں چلی گئی ہے اور کہیں کسی چٹانی سلسلے کے گرد چکر کاٹنے کے بعد احساس ہوتا کہ ہم دوبارہ وہیں پہنچ گئے ہیں جہاں کچھ دیر پہلے تھے' لیکن بغور جائزہ لینے پر احساس ہوتا کہ ایسی بات نہیں ہے۔

اس سطح اور چکنی سڑک پر نہ جانے کیوں ہلکی سی نمی موجود تھی۔ جس کی وجہ سے اس پر بظاہر معمولی اور درحقیقت بے حد خوفناک پھسلن تھی۔ گویا اس سڑک پر موٹرسائیکل چلانا درحقیقت موت کے گولے کے کرتب دکھانے ہی کے مترادف تھا۔

تقریباً چار میل کے سفر کے بعد یہ سڑک بتدریج تنگ ہونے لگی اور ایک مقام ایسا بھی آیا جہاں سڑک ایک فٹ سے بھی کم چوڑی رہ گئی۔ اس پر موٹرسائیکل چلانا تو درکنار پیدل بھی ایک وقت میں ایک ہی آدمی گزر سکتا تھا اور وہ بھی محتاط ہو کر۔ ایک سے زیادہ آدمی اس پر قطار ہی بنا کر چل سکتے تھے۔ ہم اس مقام سے کچھ پیچھے ہی رک چکے تھے۔ مجبوراً میں نے موٹرسائیکل کا انجن بند کیا اور اسے تنگ ہی سڑک پر یوں ترچھی کرکے کھڑا کردیا کہ راستہ ہی بند ہو گیا۔ اس کے بعد ہم نے اپنے چھوٹے چھوٹے بیگ کمر سے باندھے اور پیدل آگے چل دیئے۔ ہمارے اردگرد نشیب میں اب بہت ہی چھوٹے چھوٹے ٹیلے نظر آرہے تھے اور زمین بھربھری اور سیاہی مائل ہو چلی تھی۔ سرسری نظر میں یہ صحرائی علاقہ معلوم ہوتا تھا لیکن ہوا بلند ترین پہاڑی مقامات ہی کی طرح منجمد کر دینے والی تھی۔

تنگ راستے پر میرے پیچھے آتے آتے کیتھی بولی۔ ”منصور! اگر ہم اس مہم میں مارے گئے تو کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا کہ ہمارا کیا بنا یا یہ کہ ہم کہاں مارے گئے تھے؟“

”ایسی بات نہیں ہے۔“ میں نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔ ”میں ایسے انتظامات کر آیا ہوں کہ میرے متعلق میرے پیچھے والوں کو کچھ ایسی بے خبری بھی نہیں رہے گی بلکہ اس کام کی ڈور بھی جہاں میرے ہاتھ سے چھوٹے گی وہاں سے کوئی اور اس کو تھام لے گا۔“ پھر میں نے اسے چھیڑنے کی خاطر کہا۔ ”البتہ تمہارا کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ تمہارا پہلے بھی دلی والی وارث نہیں تھا۔ اب بھی کسی کو تشویش نہیں ہو گی کہ تم کہاں گئیں۔“

”تم بھی اگر ساتھ ہی مر گئے پھر تو مجھے اپنے یوں گمنام بلکہ یوں کہو کہ بے ننگ و نام مرجانے پر کوئی پروا نہیں ہو گی۔“ اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ہمارا انداز ایسا ہی تھا جیسے خوش فکروں کا کوئی جوڑا پکنک پر کہیں جا رہا ہو۔ حالانکہ ہمیں معلوم تھا کہ آزمائش کا میدان زیادہ دور نہیں۔ کیتھی جب سے مجھے ملی تھی' اس مختصر سے دور میں ہی ہم پر بہت بڑے مرحلے آ چکے تھے' لیکن اس نے ابھی تک کسی بھی مرحلے پر تھکن' بیزاری' خوف'

پسپائی یا عدم دلچسپی کا اظہار نہیں کیا تھا اور نہ ہی شکوے کا کوئی لفظ اس کی زبان پر آیا تھا۔ میرا یہ یقین پختہ ہوتا جا رہا تھا کہ وہ صحیح معنوں میں ایک اچھی ساتھی تھی۔

تقریباً ایک میل کا راستہ طے کرنے کے بعد میں نے دیکھا کہ دیوار نما سڑک کی بلندی اب بہت کم رہ گئی تھی۔ اٹھارہ بیس فٹ کے قریب محتاط اور مخصوص انداز میں چھلانگ لگائی جاتی تو کوئی ہڈی وغیرہ ٹوٹنے کا اندیشہ نہیں تھا۔ اس مقام پر رک کر میں نے اندرونی جیب سے ہاتھ کا بنا ہوا ایک چھوٹا سا نقشہ نکال کر دیکھا اور اس فیصلے پر پہنچا کہ اب مزید دیوار پر ہی چلتے رہنا زیادہ تیزی سے موت کے قریب جانے کے مترادف تھا۔ اب مجھے آگے بڑھنے کے لیے دوسرا انداز اختیار کرنا تھا۔

نقشہ جیب میں رکھنے کے بعد میں نے پہلے کیتھی کا ہاتھ پکڑ کر اسے اس طرح نیچے لٹکایا کہ اسے کم سے کم اونچائی سے چھلانگ لگانی پڑے۔ پھر میں نے دیوار سے پاؤں لٹکا کر پنجوں کے بل چھلانگ لگائی۔ اب ہمارے سامنے اونچے نیچے ٹیلے' نالے' کھائیاں اور جھاڑیاں تھیں اور سطح زمین بتدریج بلند ہو رہی تھی۔ ہم انہی چٹانوں کے گرد چکر کاٹتے ہوئے بلندی کی طرف آگے بڑھنے لگے۔ نیچے چلنے کے لیے بندروں کی طرح کرتب دکھانا ضروری تھا۔ کہیں کوئی نالہ پھلانگنا پڑتا تھا' کہیں کسی کائی زدہ تودے سے پھسل کر گرنے سے اپنے آپ کو بچانا ہوتا تھا۔ کہیں جھاڑیوں سے بچنے کے لیے کافی طویل چکر کاٹنا پڑتا تھا۔

اور تو اور کئی مرتبہ تین تین چار چار بھیڑیوں کی ٹولیاں بھی متجسس نظروں سے ہمیں دیکھتی ہوئی گزریں لیکن انہوں نے ہم پر حملہ آور ہونے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی۔ بھیڑیا درندگی میں جتنا آگے ہے اتنا ہی اپنی جان کو محفوظ رکھنے کے معاملے میں چالاک بھی ہوتا ہے۔ ہتھیار کی بو گویا دور ہی سے سونگھ لیتا ہے۔ مسلح آدمی پر شاذونادر ہی حملہ آور ہوتا ہے۔ نہتے پر بھی بھیڑیے عموماً اسی وقت بے خوف ہو کر حملہ کرتے ہیں جب تعداد میں کم از کم دس بارہ ہوں۔

دیوار پر چلنے کا یہی فائدہ نظر آتا تھا کہ قباحتوں سے گزرنے سے انسان محفوظ رہتا تھا' لیکن اس آسانی سے صرف وہی استفادہ کر سکتے تھے جو تاریک وادی میں رہتے تھے۔ سورج غروب ہونے میں زیادہ وقت نہیں رہ گیا تھا۔ ہم نے تھکن کے باوجود کچھ اور تیز چلنا شروع کردیا۔ ہوا میں اب دلدلی زمین کی بو رچی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

ہم اس مقام تک جا پہنچے جہاں سے ڈھلان شروع ہو رہی تھی۔ ڈھلان کے اختتام پر نیچے طویل و عریض میدان پھیلا ہوا تھا' لیکن یہ میدان چٹیل نہیں تھا۔ اس پر تاحد نظر سبزہ ہی سبزہ پھیلا ہوا تھا اور حد بندیوں کے ذریعے بیسیوں حصوں میں تقسیم تھا۔ یہ سبزہ درحقیقت دو ڈھائی فٹ کے پودے تھے جو سیاہی مائل پانی میں کھڑے تھے۔ تین چار سو افراد اس طویل و عریض میدان میں پھیلے ہوئے تھے اور یہاں باقاعدہ اسی طرح کام ہو رہا تھا

جس طرح بڑے بڑے کھیتوں پر ہوتا ہے۔

کہیں پانی گزارنے کے لیے نالا کھودا جا رہا تھا' کہیں گوڈی کی جا رہی تھی اور کہیں تیار فصلوں سے ڈوڈی اتاری جا رہی تھی۔ کہیں پودوں کو سنوارا جا رہا تھا۔ کہیں کچھ بیج نما چیزوں یا ڈوڈیوں کے ٹوکرے بھر بھر کر کچھ لوگوں کے سروں پر لادے جا رہے تھے جو انہیں دور ایک بڑی نیم پختہ سی عمارت کی طرف لے جا رہے تھے۔ دور سے وہ عمارت فلور ملز یا پھر کولڈ اسٹوریج سے مشابہ نظر آتی تھی' حتیٰ کہ یہاں کچھ ایسی جدید قسم کی مشینری بھی نظر آ رہی تھی جو باقاعدہ جائز قسم کی کھیتی باڑی کرنے والوں کو بھی میسر نہیں تھی۔

ایک جگہ ایک ٹیوب ویل اور ایک جگہ نشیب میں اس سے ملتی جلتی کوئی اور مشین بھی نظر آ رہی تھی۔ ٹیوب ویل غالباً ڈیزل سے چلتا تھا یا پھر اس کے لیے کہیں کوئی طاقتور جنریٹر موجود تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ یہ سب مشینری یہاں تک پہنچی کس طرح تھی؟ میری معلومات کے مطابق بھی اور مشاہدے و اندازے کے مطابق بھی یہاں تک پہنچنے کا راستہ تو وہی ایک نظر آتا تھا جس سے ہم آئے تھے اور وہ مشینری یا کسی بھی قسم کی وزنی اشیاء کی نقل و حمل کے لیے قابل استعمال نہیں تھی۔ گویا یہ تاریک وادی تو نہیں البتہ وادی عجائبات ضرور تھی۔ ابھی میری آنکھوں کو اور نہ جانے کیا کیا دیکھنا تھا۔

میں اور کیٹی ایک بڑے سے تودے کے پیچھے چھپے ہوئے تھے اور اس قسم کے تودے ڈھلان پر جگہ جگہ موجود تھے' لیکن ان کے درمیان عموماً خاصا فاصلہ تھا۔ اگر ہم ڈھلان کی طرف سفر کرتے وقت ایک تودے سے دوسرے تودے کی طرف بڑھتے اور اس دوران منشیات کے کھیتوں میں کام کرنے والوں میں سے کسی کی نظر بلندی کی طرف اٹھ جاتی تو ہمیں نہایت آسانی سے دیکھا جاسکتا تھا۔

کھیتوں میں صرف مرد ہی نہیں عورتیں بھی مصروف کار تھیں۔ ان سب کے لباس ڈھیلے ڈھالے' موسم کی مناسبت سے بھاری بھرکم اور گہرے رنگوں کے تھے۔ ان کی تراش خراش پٹھانوں کے ملبوسات سے بہت ملتی جلتی تھی۔ میں نے ایک مرد اور ایک عورت کو تاڑا۔ گوکہ ان دونوں کے درمیان کافی فاصلہ تھا اور وہ ایک دوسرے سے لاتعلق نظر آ رہے تھے تاہم وہ ایک دورافتادہ سے گوشے میں پودوں پر جھکے جھکے کچھ کر رہے تھے۔ میں نے کیٹی کی توجہ بھی ان کی طرف دلائی پھر کہا۔ "ہمارے شکار کے طور پر مجھے یہی موزوں ترین نظر آ رہے ہیں۔ یہ دونوں باقی لوگوں سے کافی فاصلے پر ہیں۔ ان کی طرف کوئی متوجہ نہیں ہے اور ان سے چند گز کے فاصلے پر ہی چند درختوں کی اوٹ بھی میسر ہے۔"

"بے شک!" کیٹی نے ان کا جائزہ لیتے ہوئے تائید کی۔

"میرا خیال ہے ہم الگ الگ اور اپنا اپنا طریق کار اختیار کرتے ہوئے نیچے پہنچتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "تم عورت کو قابو میں کرنا میں اس مرد کو قابو میں کروں گا۔ ہمارا

مقصد صرف انہیں بے ہوش کرکے ان کا لباس وغیرہ حاصل کرنا ہے تاکہ ہم ان کا روپ دھار کر انہیں لوگوں میں گھل مل سکیں۔ بہرحال اگر خنجر وغیرہ کے استعمال کی ضرورت پڑ جائے تو ہچکچانے کی ضرورت نہیں' کیونکہ یہ کوئی اتنی معصوم روحیں تو ہیں نہیں۔"

کیٹی نے اثبات میں سر ہلایا اور مجھ سے کافی دور چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ میری نظر سے اوجھل ہو گئی۔ میں نے پتھروں کی آڑ لیتے ہوئے اور کہیں کہیں چوپائے کی طرح چلتے ہوئے نشیب میں اترنا شروع کیا۔

میں نشیب میں پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ نیچے پہنچ کر میرے دیکھ لیے جانے کا خطرہ بے حد کم ہو گیا لیکن سیدھا کھڑا ہونا اب بھی خطرے سے خالی نہیں تھا' کیونکہ پودے زیادہ اونچے نہیں تھے۔ البتہ کہیں کہیں بعض چیزوں کے انبار وغیرہ موجود تھے۔ ان کے پاس درختوں کے عقب میں پہنچ کر سیدھ کھڑا ہوا جا سکتا تھا۔ تاہم اپنے مطلوبہ شخص کے عقب میں مجھے چاروں ہاتھوں پیروں کے بل ہی پہنچنا پڑا اور عین اس وقت جبکہ میں توقع کر رہا تھا کہ وہ جھکنے لگا ہے اور میں اس کی کنپٹی پر وار کرسکوں گا' اس لمحے اچانک ہی وہ نہ جانے کیوں گھوم گیا۔

مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ یوں دم بخود رہ گیا جیسے کسی بھرے پرے شہر کے بیچوں بیچ رہنے والے مہذب و شائستہ انسان نے اپنے آراستہ و پیراستہ ڈرائنگ روم میں کسی برفانی ریچھ کو داخل ہوتے دیکھ لیا ہو۔ ایک لمحے کے لیے تو میں بھی گڑبڑا کر رہ گیا تھا اور چاروں ہاتھ پیروں کے بل یوں کھڑا رہ گیا تھا جیسے کوئی پہاڑی بکرا سوالیہ نظروں سے کسی اجنبی کی طرف دیکھ رہا ہو۔ لیکن اس سے پہلے کہ اس شخص کے ہونٹ حرکت میں آتے میں نے بجلی کی سی تیزی سے اس کی ٹانگ کھینچی اور جیسے ہی وہ گرا' اس کی کنپٹی پر "چاپ" رسید کردی۔ اسی لمحے وہ ساکت ہو گیا۔

اس غریب کو شاید یہ سمجھنے کی مہلت ہی نہیں ملی تھی کہ اس کے ساتھ ہوا کیا تھا اور اس پر حملہ آور ہونے والا "جانور" کون سا تھا؟ میں اسے تیزی سے گھسیٹ کر درختوں کے جھنڈ میں لے گیا۔ وہ کچھ اکھڑی اکھڑی سی سانسیں لے رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ جلدی میں شاید اس کی کنپٹی پر چاپ کچھ زیادہ ہی زوردار پڑ گئی تھی۔ بہرحال میں نے اپنی کمر پر بندھا ہوا چھوٹا سا بیگ اتارا اور اس کے کپڑوں وغیرہ سے اپنا لباس کا تبادلہ شروع کردیا۔ مجھے اس کام میں اور اپنے حلیے کو مکمل طور پر شک و شبہے سے بالاتر بنانے میں خاصی دیر لگ گئی۔

جب میں اپنے تنقیدی جائزے سے مطمئن ہو کر جھنڈ سے نکلنے کا ارادہ کر رہا تھا تو اپنے عقب میں ایک نسوانی آواز سن کر مجھے تیزی سے گھومنا پڑا۔ اس نے کسی ناقابل فہم زبان میں کچھ کہا تھا۔ میں نے دیکھا وہ کاشتکار عورتوں میں سے کوئی ایک تھی۔ شاید میرے

شکار کی بیوی ہی رہی ہو- وہ چادر میں تقریباً پورا چہرہ چھپائے کھڑی تھی- صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں- میں ایک "چاپ" اسے بھی رسید کرنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ وہ غالباً میرا ارادہ بھانپتے ہوئے میرا ہاتھ حرکت میں آنے سے پہلے ہی اچھل کر دور ہٹ گئی- اس کی آنکھیں اصلی حالت پر آگئیں اور تب ان آنکھوں کو میں نے پہچان لیا- ساتھ ہی اس نے چہرے سے چادر ہٹا دی اور بے آواز طریقے سے ہنسنے لگی-

میں بھی دھیرے سے ہنس دیا- وہ کیٹی تھی- جو مجھ سے پہلے ہی اور مجھ سے کچھ بہتر طور پر حلیہ تبدیل کرکے آن پہنچی تھی-

"اس عورت کا تم نے کیا کیا؟" میں نے پوچھا-

"وہی جو تم نے اپنے شکار کا کیا-" اس نے جواب دیا-

سورج تقریباً غروب ہو چکا تھا اور کام کرنے والے مرد اور عورتیں بڑی بڑی ٹولیوں کی صورت میں ایک طرف کو چل پڑے تھے- ہم بھی ایک ٹولی کے پیچھے پیچھے چل دیئے- ہم نے اپنے درمیان تھوڑا سا فاصلہ رکھا تھا- مجھے اندیشہ تھا کہ کوئی شخص ہم دونوں میں سے کسی کو مخاطب نہ کر بیٹھے- لیکن جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کا امکان بے حد کم تھا- ایک تو وہ سب تھکے ہارے نظر آ رہے تھے- اس عالم میں ویسے ہی انسان ایک دوسرے سے بات کرنے سے بیزار ہوتا ہے- بس جلد از جلد گھر پہنچ کر تھکن اتارنے اور حسب حیثیت آسائشوں سے محظوظ ہونے کا خیال ذہن میں جاگزیں ہوتا ہے- کچھ ویسے بھی یہ لوگ قدرے فلسفیانہ اور یاس زدہ سے انداز میں خاموش رہنے کے عادی معلوم ہوتے تھے لیکن اپنی زندگی سے عدم دلچسپی یا اپنے معمولات سے بیزاری بھی ان کے چہروں سے عیاں نہیں تھی-

وہ مطمئن، مسرور اور آسودہ حال بھی نظر آتے تھے- ان میں سے بہت کم لوگ آپس میں باتیں کر رہے تھے- ہم ایک نہایت طویل و عریض سبزہ زار سے گزرے جو غالباً مویشیوں کے لیے چراگاہ کا کام دیتا تھا- اس کے ایک حصے میں بہت بڑا باڑہ بھی نظر آ رہا تھا جہاں کئی آدمی مختلف کاموں میں مصروف تھے- یہ لوگ غالباً رکھوالے اور گوالے تھے-

سبزہ زار سے گزرنے کے بعد ایک مختصر سا چٹیل میدان آیا پھر تھوڑی سی چڑھائی چڑھنے کے بعد لوگ ایک فٹ سے بھی کم چوڑی اسی سڑک پر پہنچ گئے جس پر میں اور کیٹی سفر کرتے رہے تھے اور پھر نشیب میں اتر گئے تھے- اس سڑک پر لوگوں نے چڑھنا شروع کردیا تو خودبخود ہی قطار بنتی چلی گئی جو کافی طویل تھی- کیٹی میرے آگے تھی اور ہم اس قطار کے تقریباً وسط میں تھے-

سڑک آگے چل کر تقریباً عمودی سی چٹانوں کے ایک دائرے میں گویا غائب ہو رہی تھی- قطار کا اگلا سرا اس موڑ پر پہنچا تو قطار کے آگے کھسکنے کی رفتار کچھ کم پڑ گئی، لیکن

مجھے چونکہ موڑ سے آگے کا منظر نظر نہیں آ رہا تھا اس لیے میں اس کی وجہ جاننے سے قاصر تھا- شام کے سائے بھی گہرے ہو چکے تھے-

جب کیٹی اور میں موڑ سے ذرا آگے پہنچے تو سامنے کا منظر دیکھ کر میں ایک لمحے کے لیے ٹھٹھک سا گیا- چند گز آگے وہ تنگ سی سڑک چٹانوں کے درمیان تراشے گئے ایک بہت چوڑے مسطح چبوترے سے مل گئی تھی اور اس چبوترے پر نہایت بلند و بالا آہنی پھاٹک نصب تھا-

اس قسم کے پھاٹک عموماً زمانہ قدیم کی یادگاروں اور قلعوں وغیرہ میں نصب نظر آتے تھے- دائیں بائیں دونوں طرف سے یہ پھاٹک گویا چٹانوں ہی میں نصب تھا اور دوسری طرف پہنچنے کے لیے اسی میں سے گزرنا ضروری تھا-

پھاٹک اس وقت کھلا ہی تھا اور اس کے پار نشیب میں اونچے نیچے جھونپڑی نما اور کچھ جاپانی طرز کے مکانوں کے ہیولے نظر آ رہے تھے- پھاٹک پر دونوں طرف دو محافظ اسٹین گن لیے کھڑے تھے-

ایک محافظ کے قریب ہی بجلی کے واٹر کولر سے مشابہ ایک مشین پتھریلے فرش پر کھڑی تھی- دراصل اس مشین ہی کا استعمال دیکھ کر میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی تھی اور ایک لمحے کے لیے میں پریشان سا ہو گیا تھا-

صورت حال یہ تھی کہ قطار میں موجود ہر شخص اس مشین کے قریب سے گزرتے وقت اس پر بنے ہوئے ایک خانے پر انگوٹھا رکھتا تھا اور آگے بڑھ جاتا تھا- اس کے انگوٹھا رکھتے ہی مشین کی پیشانی پر سبز روشنی جھلملا اٹھتی تھی- انگوٹھا ہٹتے ہی یہ روشنی غائب ہو جاتی تھی پھر دوسرا شخص انگوٹھا رکھتا تو دوبارہ جھلملا اٹھتی تھی-

ظاہر ہے یہ روز کا معمول تھا اور اس وقت بھی یہ عمل اتنے تسلسل سے جاری تھا کہ مسلح محافظ بھی قدرے بے نیازی کے عالم میں ہی کن انکھیوں سے ایک نظر سبز روشنی کی جھلملاہٹ دیکھتے تھے اور دوسرے ہی لمحے وہ شخص جس نے مشین پر انگوٹھا رکھا ہوتا تھا اس کے درمیان سے گزرتا چلا جاتا تھا- اس کے چہرے کی طرف محافظ نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے-

مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ بجلی کے واٹر کولر سے مشابہ وہ مشین دراصل کمپیوٹر تھا جس میں ان تمام لوگوں کے انگوٹھوں کے نشانات محفوظ تھے جو کھیتوں پر کام کرنے جاتے تھے- کمپیوٹر اس وقت ان میں سے ہر ایک انگوٹھے کے نشان کی تصدیق کر رہا تھا-

خطرے کے احساس سے تو میرے جسم میں سنسنی دوڑ رہی تھی لیکن ساتھ ہی شدید حیرت کا حملہ بھی ہوا تھا- کمپیوٹر کا استعمال تو ابھی صحیح طور پر بمبئی میں بھی شروع نہیں ہوا تھا جبکہ یہ تو ایک دور افتادہ گوشہ کوہستان تھا جہاں شاید کوئی تہذیب و تمدن کی موجودگی کا

بھی گمان نہ کرسکتا۔ چہ جائیکہ کمپیوٹر کی موجودگی۔ یہ سب کچھ اس قدر بعید از قیاس تھا کہ تقریباً مضحکہ خیز لگتا تھا۔

کیٹی نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور غیر محسوس انداز میں مسکرائی۔ صورت حال کو یقیناً وہ بھی سمجھ چکی تھی لیکن اس لڑکی کی دیگر خوبیوں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ وہ غیرضروری طور پر خوفزدہ نہیں ہوتی تھی۔ وہ اس حقیقت کو سمجھ چکی تھی کہ خوفزدہ ہونے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اس حقیقت کو سمجھتے تو ویسے بہت سے لوگ ہیں لیکن اس فطری ردعمل پر قابو پانا کسی کسی کے ہی بس کی بات ہوتی ہے۔

وہ دوبارہ سامنے دیکھتے ہوئے سست روی سے آگے بڑھنے لگی۔ اس سے آگے اب صرف تین آدمی رہ گئے تھے۔ وہ بھی یکے بعد دیگرے اطمینان سے کمپیوٹر پر انگوٹھا لگاتے ہوئے گیٹ عبور کر گئے۔ کیٹی نے بھی اپنی باری آنے پر بلا تامل انگوٹھا کمپیوٹر کی مخصوص پلیٹ پر رکھ دیا۔ پلیٹ کھٹ سے تاش کے پتے کی طرح اندر چلی گئی اور دوسرے ہی لمحے گویا ماحول پر چھائی تمام غنودگی ایک دھماکے سے فضا میں تحلیل ہو گئی۔

کمپیوٹر کی چھوٹی سی سکرین پر سبز کے بجائے سرخ روشنی جھلملا اٹھی تھی اور اس کے ساتھ ہی سماعت کو بے حد کریہہ محسوس ہونے والا ایک سائرن بھی چیخ اٹھا۔ محسوس یہی ہوا تھا جیسے کمپیوٹر کا ایک آدھ تار ان کے جسموں سے بھی منسلک تھا۔

انہوں نے اسٹین گنیں مشینی انداز میں سیدھی کرکے پوری قطار کو کور کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس سے بھی زیادہ تشویشناک بات یہ تھی کہ لوہے کا وہ عظیم الشان گیٹ ہلکی سی گڑگڑاہٹ مگر نہایت تیز رفتار سے بند ہونے لگا تھا۔

میں نے دیگر تمام عزائم ارادے اور تدابیر بالائے طاق رکھ دیں اور پہلا کام یہ کیا کہ کیٹی کو ایک طرف دھکیل کر اپنی تمام تر صلاحیتوں کو مجتمع کرتے ہوئے اس شیر کی طرح چھلانگ لگائی جس کی زندگی کا دارومدار ہی ایک چھلانگ پر رہ گیا ہو۔

میں کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح آہنی گیٹ کے دونوں پٹوں کے درمیان سے گزرا اور اس حقیقت سے روشناس ہوا کہ اگر مجھے چھلانگ لگانے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو پھر یہ کام ناممکن ہی تھا کیونکہ میرے گزرتے ہی دونوں پٹ آپس میں مل گئے تھے اور دوسرے ہی لمحے وہ گولیوں کی بوچھاڑ سے جھنجھنا اٹھے تھے۔ محافظوں کو برسٹ مارنے میں ایک لمحے کی تاخیر ہو گئی تھی۔

میں نے اپنے آپ کو ایک ناہموار پہاڑی راستے پر پایا جو بتدریج نشیب میں جا رہا تھا۔ شام کے دھندلکے میں دو چار گز کے فاصلے کی چیزیں بھی محض ہیولوں کی طرح دکھائی دے رہی تھیں۔ راستہ صرف وہی نہیں تھا جس پر میں دوڑ پڑا تھا' کچھ اور پگڈنڈیاں بھی مختلف سمتوں میں پھیلی ہوئی تھیں اور کچھ آگے چل کر ان کے دونوں طرف نیم پختہ اور جھونپڑی نما مکانات بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ جو لوگ مجھ سے پہلے پھاٹک سے

گزرے تھے ان میں سے کچھ تو انہی پگڈنڈیوں پر پہنچ چکے تھے اور کچھ مجھ سے پیچھے رہ گئے تھے۔ کچھ یقیناً اپنے گھروں میں بھی پہنچ چکے ہوں گے۔

جو لوگ سائرن اور آہنی گیٹ پر گولیوں کی جھنکار سن چکے تھے وہ ٹھٹھک گئے تھے لیکن غالباً وہ نہ تو یہ سمجھ پائے تھے کہ جس کی وجہ سے سائرن بجا ہے ان میں سے ایک پھاٹک کے پار پہنچ چکا ہے اور نہ ہی غالباً انہیں معلوم تھا کہ ان حالات میں انہیں کیا کرنا چاہیے۔ وہ بے چارے محض مزدور یا دوسرے لفظوں میں "عوام" دکھائی دیتے تھے جن کا کام بس سدھائے ہوئے مویشیوں کی طرح محنت کرنا اور اپنے "آقاؤں" کے لیے دولت پیدا کرنا تھا۔

سائرن صرف چند سیکنڈ اور سنائی دیا پھر خاموش ہو گیا۔ میں نے دوڑتے دوڑتے پلٹ کر دیکھا۔ گیٹ کھل چکا تھا اور کچھ متحرک روشنیاں اور انسانی ہیولے اندر چھلانگیں لگاتے اور میری سمت میں دوڑتے نظر آ رہے تھے۔ جس سڑک پر میں دوڑ رہا تھا یہ گویا ایک قسم کی "سرکلر روڈ" تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ بستی کے گرد احاطہ کیے ہوئے تھی۔ اس کے دونوں طرف درختوں کا گھنا سلسلہ تھا۔

میں نے اندر آنے کے لیے ایک کمرے سے کیٹی کو چارے کے طور پر استعمال کیا تھا۔ تاہم اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ مجھے اس کی زندگی کی کوئی پروا نہیں تھی۔ میرے کان جو فرکی ٹوپی سے ڈھکے ہوئے تھے ان میں سے ایک میں جو "آلہ سماعت" لگا ہوا تھا اس پر مجھے کیٹی کی خیریت کی اطلاع مل رہی تھی۔ مختلف آوازوں کے بے ہنگم شور کے رمیان اس کی تیز تیز آواز مجھے سنائی دے رہی تھی جیسے وہ خاص طور پر مجھے ہی سنانے کے لیے کہہ رہی ہو۔ "میں کہہ تو رہی ہوں ...... مجھے کچھ نہیں معلوم ...... اس نے مجھے کھٹمنڈو میں اپنے جال میں پھنسایا تھا ...... کہہ رہا تھا کہ ایک بہت بڑا خزانہ حاصل کرنے کا چکر ہے اور اگر میں اس کا ساتھ دوں تو ہم دونوں کروڑپتی ہو جائیں گے ...... سنو ...... دیکھو ...... آہ ......"

وہ انگریزی میں بات کر رہی تھی اور غالباً کسی نے تھپڑ مار کر اسے چپ کرایا تھا۔ پھر انگریزی میں ہی اسے ڈانٹا گیا۔ "جب تمہیں کہا جائے تب صفائی پیش کرنا۔ یہ فیصلہ تمہیں منوچی صاحب کے حضور پیش کرنے کے بعد ہی ہو گا۔ تم جھوٹ بول رہی ہو یا سچ ......"

مجھے اطمینان ہو گیا کہ ابھی خاصی دیر تک کیٹی کی جان کو بہرحال کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے۔ میں اس وقت جس رفتار سے دوڑ رہا تھا اس سے میں دنیا کے کسی بھی حصے میں منعقد ہونے والا دوڑ کا مقابلہ یقینی طور پر جیت سکتا تھا۔ بستی کے مکانات وغیرہ غالباً مربع صورت میں پھیلے ہوئے تھے کیونکہ میں اچانک ہی ایک موڑ پر جا پہنچا تھا اور ابھی میں اپنی جھونک میں اپنے آپ کو درختوں میں جا گھسنے سے بچانے کے لیے ہی کوشاں تھا کہ میری نظر کونے پر کھڑی ہوئی ایک مینار نما عمارت پر پڑی۔

ابھی میں نے سوچا ہی تھا کہ شاید یہ عمارت واچ ٹاور کا کام دیتی ہوگی کہ اسی لمحے اس کے بالائی حصے سے جیسے روشنی کا آبشار پھوٹ پڑا۔ بستی پر چھائی ہوئی تاریکی اور کسی کسی مکان کی کھڑکی یا روشن دان میں جھلملاتی ہوئی مدھم سی روشنی بتاتی تھی کہ بستی میں بجلی نہیں ہے اور وہاں چراغوں یا **لالٹینوں** وغیرہ سے ہی کام چلایا جاتا ہے۔ لیکن اس واچ ٹاور کی بلندی پر فلڈلائٹس روشن ہوئی تھیں۔

یقیناً اس مینار نما عمارت میں طاقتور جنریٹر اور واچ ٹاور کے دیگر لوازمات بھی موجود تھے۔ میری خوش قسمتی یہ تھی کہ میں فلڈلائٹس کی رسائی سے چند گز آگے نکل آیا تھا۔ لائٹس آن ہوتے وقت ان کا رخ کچھ اس طرح تھا کہ انہوں نے اس راستے کا بیشتر حصہ منور کر دیا تھا جس پر میں دوڑتا ہوا آیا تھا۔

دوسرے ہی لمحے موڑ سے آگے سڑک کا وہ حصہ بھی روشنی میں نہا گیا جس پر میں جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ صرف موڑ پر چند گز کا ٹکڑا روشنی سے محروم رہ گیا تھا لیکن دونوں زاویوں پر روشن ہونے والی فلڈ لائٹس ساکت نہیں' متحرک تھیں اور وہ اس انداز میں حرکت شروع کر چکی تھیں کہ یہ حصہ بھی کسی بھی لمحے روشنی میں نہانے والا تھا۔

میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا کہ میں درختوں کے جھنڈ میں جاگھسوں۔ میں نے یہی کیا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ جنگل میں زمین ناہموار ہوگی۔ ایک جگہ میں ...... ٹھوکر کھا کر گرا چوٹ تو مجھے کم ہی لگی لیکن ایک بار گویا دماغ ہل کر رہ گیا' تاہم میں فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا اور زیادہ گھنے درختوں کی طرف دوڑ پڑا۔

ایک جگہ رک کر میں نے سڑک کی جھلک دیکھنے کی کوشش کی' لیکن درخت بہت گھنے تھے اور میں جنگل میں اتنا اندر آ گیا تھا کہ سڑک کی جھلک دیکھنا بھی ممکن نہیں تھا' تاہم فلڈ لائٹس کی حرکت کا اندازہ ہو رہا تھا۔ پھر کچھ آوازوں سے یہ اندازہ بھی ہوا کہ جو لوگ گیٹ کی طرف سے میرے تعاقب میں دوڑے تھے وہ موڑ تک آ پہنچے تھے۔ وہ تعداد میں زیادہ معلوم نہیں ہوتے تھے لیکن مجھے توقع تھی کہ جلد ہی ان کی تعداد میں اضافہ ہو جائے گا۔

میرا خیال تھا کہ وہ پہلے "سرکلر روڈ" کا چکر لگائیں گے یا اس پر کافی آگے تک ضرور جائیں گے اس کے بعد مختلف سمتوں میں بکھر کر کسی باقاعدہ حکمت عملی کے تحت تلاش شروع کریں گے۔ اسی لمحے گولیوں کی تڑتڑ سنائی دی۔ غالباً کسی غلط فہمی کی بنا پر واچ ٹاور سے ہلکی مشین گن کے ذریعے باڑھ ماری گئی تھی۔ پھر کچھ لوگوں نے چلا چلا کر ایک دوسرے سے کچھ کہا۔ تاہم میں چونکہ کافی دور نکل آیا تھا اس لیے مجھے یہ آوازیں مدھم ہی سنائی دیں اور چند لمحے بعد خاموشی چھا گئی۔ وہ لوگ غالباً آگے نکل گئے تھے۔

اسی دوران ایک بار پھر ایئرفون پر مجھے کیٹی کی آواز سنائی دی۔ "او خبیث! رسیاں تو آہستہ باندھ ...... اور یہ اتنی سخت گرہیں لگانے کی کیا ضرورت ہے ...... میرے ہاتھ پاؤں توڑنے ہیں کیا؟"

"دیکھتی جاؤ تمہارا کیا کچھ ٹوٹے گا ...... ذرا اس بندر کے بچے کو ہاتھ آ لینے دو جو تمہارے ساتھ تھا۔" کسی نے غرا کر کہا۔ "جائے گا کہاں؟" اس وادی میں تو ہم کھوئی سوئی بھی ڈھونڈ نکالتے ہیں۔"

"اس احمق کو معلوم نہیں کس نے خزانے کی پٹی پڑھا دی تھی۔" کیٹی نے جھلائی ہوئی آواز میں کہا۔ "اور میں بھی اس کی باتوں میں آ کر اس کے ساتھ ماری جاؤں گی ...... حالانکہ اب مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ اگر یہاں کوئی خزانہ موجود بھی ہے تو ہمیں کم از کم دو تین سو ساتھیوں کے ہمراہ اس وادی پر باقاعدہ حملہ کرنا چاہیے تھا۔"

"اس صورت میں بھی تمہارا زیادہ سے زیادہ ایک ہی آدمی اندر پہنچ پاتا۔ بشرطیکہ وہ بھی اتنا ہی پھرتیلا ہوتا جتنا یہ تھا۔" مردانہ آواز نے جواب دیا۔ باقی سب کے سب گولیوں سے چھلنی ہوتے۔ حتیٰ کہ تم نے بھی اگر فوری طور پر ہاتھ نہ اٹھا دیئے ہوتے تو موت تمہارا بھی مقدر تھی۔"

"کیٹی ہولے سے کراہ دی۔ اسی لمحے بہت سی ملی جلی ناقابل فہم آوازوں کی بھنبھناہٹ سنائی دینے لگی۔ گویا ابھی میں کیٹی کے گلے میں موجود لاکٹ میں چھپے ہوئے ٹرانسمیٹر کے حلقہ عمل سے نکلا نہیں تھا۔ ایک اندازہ مجھے یہ بھی ہوا کہ جس وقت میں نے گیٹ سے اندر چھلانگ لگائی تھی اس وقت وہاں صرف وہی دو محافظ موجود نہیں تھے جو مجھے نظر آئے تھے۔ کہیں نہ کہیں کچھ اور گرگے بھی موجود تھے' کیونکہ کچھ محافظ میرے تعاقب میں دوڑے تھے اور کچھ وہیں کیٹی کے پاس موجود تھے۔ یہ محافظ بھی یقیناً عام سے آدمی نہیں تھے' جو انگریزی بولتے تھے۔ وہ یقیناً حشمت علی خان کے خاص آدمیوں میں سے تھے۔ جن لوگوں کو میں نے کھیتوں سے آتے دیکھا تھا۔ وہ انگریزی سے نابلد ہی نظر آتے تھے۔

جب آوازیں تقریباً معدوم ہو چکیں تو میں نے اپنے ڈھیلے ڈھالے کپڑوں کی بہت سی جیبوں میں سے ایک جیب کو ٹٹولا۔ اس سے ایک مخصوص ساخت کی چھوٹی سی فلیش لائٹ نکال کر میں نے روشن کر کے ایک مخصوص جگہ پر رکھی۔ اس کی روشنی دائرے کی صورت میں ایک محدود سی جگہ پر پڑ رہی تھی۔ میں نے اپنے لباس کے نیچے سینے پر بندھا ہوا ایک چپٹا سا ڈبا نکال کر روشنی کے اس دائرے میں لا کر کھولا ......

قزاقہ لا[illegible] [illegible] گسٹر

گول چند [illegible] یمیوالی

اس ڈبے میں اسٹین گن کے پارٹس اور ایک مخصوص ساخت کا اسکریو ڈرائیور موجود تھا۔ یہ ایک عجیب اتفاق ہی تھا کہ جیسے ہی میں نے گن اسمبل کرنی شروع کی' اپنے ایئرفون پر بھی مجھے گن کا ہی تذکرہ سنائی دیا۔ کوئی دوسرا محافظ کیٹی سے کہہ رہا ...... "بڑی زبردست گن سینے سے لگا رکھی ہے اور وہ بھی پارٹس کی صورت میں۔ ویسے تو بڑی معصوم بن رہی تھیں......"

"میں نے کب معصومیت کا دعویٰ کیا ہے۔" کیٹی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "میں یہاں خزانے کی تلاش میں آئی تھی' کسی کی سالگرہ کی تقریب میں شرکت کرنے کے لیے نہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ میں پھولوں کے ہار ساتھ لے کر آتی۔"

میں نے اس گفتگو سے دھیان ہٹا لیا اور گن اسمبل کرنا شروع کردی۔ گن اسمبل کرنے میں مجھے صرف ایک منٹ اور لگا۔ اسے قمیص کے نیچے نیفے میں اڑس کر میں نے اپنے دیگر ہتھیار چیک کیے۔ وہ سب اپنی اپنی جگہ پر موجود تھے۔ فلیش لائٹ بجھا کر میں نے جیب میں ڈالی اور ایک سمت کا تعین کرکے دوڑ پڑا۔ جنگل کی تاریکی میں یوں بھاگتے ہوئے میں اپنے آپ کو زمانہ غار کا کوئی وحشی محسوس کر رہا تھا۔

وادی کی طرف سے وقفے وقفے اور مختلف فاصلوں سے سنائی دینے والی کچھ آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ سکوت اب درہم برہم ہو چکا ہے اور میری تلاش کی مہم زور پکڑتی جا رہی ہے۔ دوڑتے دوڑتے میں واپس جنگل کے اس حصے میں آ گیا جہاں سے سڑک اور سڑک کے پرلی طرف بکھرے ہوئے مکانات سے قریب تر رہ سکتا تھا کہ ادھر کیا ہو رہا ہے۔

میرا اندازہ درست ہی تھا۔ بستی کے چاروں کونوں پر ہی واچ ٹاور موجود تھے اور ان سب سے جس طرح روشنی پھینکی جا رہی تھی اس سے گویا بستی کے گرد روشنی کا ایک متحرک ہالہ سا قائم تھا۔ میں ایک درخت کے عقب سے کچھ دیر سڑک کا جائزہ لیتا رہا۔ اندر بستی میں یقیناً ہلچل شروع ہو چکی تھی۔ میں سڑک کے متوازی کچھ اور آگے چلا گیا۔ مجھے ایک ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں داخل ہونا بے حد دشوار نظر آئے تاکہ وہاں میری موجودگی کا شبہ نہ کیا جاسکے اور اس جگہ کا تعلق اسی شخصیت سے ہوتا جس کے بارے میں میں سوچ رہا تھا تو پھر سونے پر سہاگے والی بات ہوتی۔

مجھے مزید کئی فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ صرف ایک جگہ مجھے کچھ فاصلے پر ایک ٹولی آتی دکھائی دی۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں اور وہ متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے جا رہے تھے۔ کبھی کبھی وہ گپ شپ کے سے انداز میں باتیں بھی کرنے لگتے تھے۔ ان میں سے چند کو میں نے قہقہہ بھی لگاتے سنا۔ میرے لیے باعث حیرت یہ تھا کہ ان میں سے کوئی بھی جنگل کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ رہا تھا جو چھپنے کے لیے بہترین جگہ تھی۔

پھر میں نے ان میں سے چند ایک کو بکھرتے دیکھا۔ وہ لوگ مختلف مکانوں کے دروازوں پر دستکیں دینے لگے تھے۔ باقی آگے بڑھ گئے تھے میں جنگل میں کچھ اندر چلا گیا اور اندازاً سڑک کے متوازی چلنے لگا۔ میں جب دوبارہ سڑک کے قریب نکلا تو مجھے ان میں سے کوئی نظر نہ آیا۔ البتہ کچھ فاصلے پر مجھے ایک مکان نظر آیا جو اپنے مقصد کے لیے مجھے بے حد موزوں معلوم ہوا۔

یہ مکان دیگر عام مکانوں کی قطاروں سے کچھ ہٹ کر تھا اور صرف پختہ ہی نہیں خاصا طویل و عریض بھی تھا۔ ابھی تک پوری بستی میں مجھے یہی مکان ممتاز نظر آیا تھا۔ صرف اس لیے نہیں کہ وسعت یا طرزتعمیر کے لحاظ سے اس کے مکینوں کی آسودہ حالی عیاں تھی بلکہ کئی اور پہلوؤں سے بھی اس کی اہمیت میرے پیش نظر تھی۔

اس مکان کی چار دیواری زیادہ اونچی نہ تھی مگر اس پر خاردار تاریں لگا کر اسے اونچا کیا گیا تھا۔ چاردیواری کے اندر خاصا وسیع چو طرفہ لان نما حصہ تھا۔ اصل عمارت اس کے وسط میں تھی جو زیادہ بڑی نہیں تھی۔ اگر اس کے گردوپیش سے قطع نظر اسے دیکھا جاتا تو وہ اوسط درجے کا ایک چھوٹا سا دو منزلہ مکان تھا۔ طرز تعمیر کچھ جاپانی سا تھا۔ اصل عمارت تو اندھیرے میں ہی ڈوبی نظر آ رہی تھی۔ لیکن اس کے اردگرد لان نما حصے پر خوب روشنی پھیلی ہوئی تھی اور یہ روشنی برقی قمقموں کی پیداوار تھی یہاں تو میں نے رات کے سکوت میں نہایت مدھم سی گھرگھراہٹ بھی سنی جو غالباً کسی کیس میں بند جنریٹر کی تھی۔

سب سے خاص بات یہ تھی کہ اس مکان کے گیٹ پر دو مسلح محافظ موجود تھے۔ جہاں میں موجود تھا وہاں سے مجھے لان کے بیشتر حصے اور اندرونی دروازہ بھی دکھائی دے رہا تھا۔ اس پر بھی دو محافظ موجود تھے۔ میں چند منٹ وہاں کھڑا صورت حال کا جائزہ لیتا رہا۔ مکان کے عقب سے مجھے دو اور محافظ بھی آتے دکھائی دیئے۔ ان کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اصل عمارت کے گرد چکر لگا رہے ہیں۔

اندرونی دروازے پر تعینات محافظوں کے قریب رک کر انہوں نے رازدارانہ انداز میں کچھ باتیں کیں پھر آگے بڑھے۔ سب سے پہلا مسئلہ گیٹ پر موجود محافظوں کا صفایا تھا۔ بہرحال اس فیصلے پر تو میں پہنچ ہی چکا تھا کہ میری مہم کا پہلا مرحلہ اسی مکان میں داخل ہونا

تھا۔ غالباً یہی وہ کان تھا جس کی مجھے تلاش تھی۔

کیٹی کی آواز وقفے وقفے سے مجھے اب بھی ایئرفون پر سنائی دے جاتی تھی۔ وہ جان بوجھ کر اس طرح مکالمہ کرتی تھی کہ مجھے صورت حال کا کافی حد تک اندازہ ہوتا رہے۔ اس وقت تک مجھے یہی اندازہ ہوپایا تھا کہ اسے کہیں لے جانے کے لیے فی الحال باندھ کر کسی کیبن نما کمرے میں بٹھا دیا گیا تھا۔

میں نے گیٹ پر موجود محافظوں اور اپنے درمیان حائل فاصلے کا جائزہ لیا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ اتنے فاصلے پر میری ڈارٹ گن کی سوئیاں انہیں ہلاک کرسکیں گی۔ البتہ اگر میں اس درخت کے عقب میں پہنچ جاتا جو عین سڑک کے درمیان ہی موجود تھا تو سوئیوں کا موثر طاقت کے ساتھ ان تک پہنچنا اور جسم میں پیوست ہونا ممکن تھا۔

میں چونکہ سڑک سے قدرے بلندی پر تھا اور محافظ اس طرف نہیں دیکھ رہے تھے' اس لیے مجھے مذکورہ درخت تک پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ سینے کے بل لیٹ کر میں نے ڈارٹ گن سے پہلے ایک محافظ کے رخسار کا نشانہ لیا۔ اس کے گال خوب پھولے پھولے نظر آرہے تھے۔

ڈارٹ گن فائر کرتے وقت ہلکی سی "ٹھک" کی آواز پیدا کرتی تھی کیونکہ اس میں ہر بار ٹریگر دبانے پر ایک چھوٹے پسٹن میں ہوا بھرتی تھی اور اسی کے دباؤ سے سوئی نشانے پر جا کر لگتی تھی۔ معلوم نہیں یہ اس آواز کا اثر تھا یا رخسار میں سوئی پیوست ہونے کا کہ وہ محافظ بری طرح اچھل پڑا اور اس کا ہاتھ رخسار پر آن جما۔ دوسرا محافظ چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوا مگر اس سے پہلے کہ وہ حرکت میں آتا خود اس کا اپنا ہاتھ بھی رخسار پر پہنچ گیا۔

رخسار ملتے ملتے ہی وہ دونوں ڈھیر ہو گئے۔ بمشکل تین یا چار سیکنڈ بعد وہ ساکت ہو چکے تھے۔ میں نے چند سیکنڈ مزید انتظار کیا۔ پھر ادھر ادھر کا جائزہ لے کر سڑک عبور کرکے گیٹ کے قریب چاردیواری تک پہنچا۔ گیٹ کے قبضوں اور دیوار کے درمیان اتنا خلا موجود تھا کہ میں اس سے نہ صرف اندرونی دروازے کا جائزہ لے سکتا تھا بلکہ ڈارٹ گن کی نالی بھی اس میں داخل کر سکتا تھا۔

وہ دونوں محافظ اس وقت سرگوشیوں میں آپس میں باتیں کر رہے تھے اور بار بار گیٹ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شاید انہوں نے باہر والے محافظوں کے گرنے کی آواز سن لی تھی یا ان کی چھٹی حس انہیں کسی خطرے کا احساس دلا رہی تھی۔ میں نے انہیں بھی ٹھکانے لگانے میں تاخیر مناسب نہ سمجھی اور موت کا پیغام لے کر چلنے والی دو سوئیاں ان پر بھی پھینک دیں۔

عین اس وقت جبکہ وہ اپنے اپنے گلے سے سوئیاں نکالنے کی کوشش کرتے ہوئے اور

کسی خوابیدہ بلی کی طرح خرخر کی سی آوازیں نکالتے ہوئے ڈھیر ہو رہے تھے' مکان کے کونے پر وہ دو محافظ بھی نمودار ہو گئے جو گشت پر تھے اور انہوں نے ان کو گرتے ہوئے دیکھ لیا۔ انہیں فوراً کسی گڑبڑ کا احساس ہو گیا لیکن اضطراری کیفیت کا شکار ہونے کی وجہ سے وہ کوئی صحیح قدم نہیں اٹھا سکے۔

انہیں سب سے پہلے پوزیشن سنبھالنی چاہیے تھی۔ اس کے بجائے وہ رائفلیں سیدھی کرکے محافظوں کی طرف دوڑ پڑے' جو دروازے کے آگے پختہ روش پر ڈھیر ہو چکے تھے۔ عین ممکن تھا کہ وہ احمق شور بھی مچانا شروع کردیتے۔ میں نے ان کی پشت اور گدیوں پر کئی کئی سوئیاں داغ دیں۔ وہ اپنے ساتھیوں تک پہنچ تو گئے لیکن ان کی کوئی مدد کرنے یا حقیقت کا سراغ لگانے کے بجائے خود بھی ان پر ڈھیر ہو گئے۔ میں بے حد مسکرایا۔

اب میں گیٹ کی طرف متوجہ ہوا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس پر باہر کی طرف سے تالا پڑا ہوا ہے۔ اس کی چابی مجھے قریب ہی پڑے محافظوں میں سے ایک کی جیب سے مل گئی اور میں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر تالا کھول کر اندر پہنچ گیا۔ محافظوں کی لاشیں بھی اندر گھسیٹ کر میں نے گیٹ بند کردیا۔ گیٹ کو بے آواز طریقے سے کھولنے اور بند کرنے میں ہی مجھے زیادہ وقت لگا۔ اس دوران میں مکان کی طرف بھی متوجہ رہا' لیکن اس پر سکوت ہی طاری تھا۔

ایک لمحے کے لیے تو میں الجھ گیا۔ کہیں میں ایک خالی مکان پر ہی تو وقت ضائع نہیں کر رہا؟ لیکن پھر میں نے یہ سوچ کر دل کو تسلی دی کہ محافظ خواہ کتنے ہی فرض شناس کیوں نہ ہوں لیکن جس وقت مکان خالی ہوتا ہے اس وقت وہ اتنی باقاعدگی سے پہرہ نہیں دیتے اور نہ ہی اتنے مستعد نظر آتے ہیں' جتنے یہ بے چارے نظر آرہے تھے۔

ان چھ لاشوں کو ایک جگہ دیوار کے ساتھ لگا کر میں دیوار ہی کی وجہ سے پیدا ہونے والی اندھیرے کی پٹی پر چلتا مکان کے عقب میں پہنچا۔ ادھر میری توقع کے مطابق عقبی دروازہ تو موجود تھا' لیکن میری توقع کے برخلاف وہاں دو مزید محافظ بھی موجود تھے۔ میں شاید اچانک ہی ان کے سامنے جا پہنچتا' کیونکہ وہ دروازے کے قریب ہی بنی ہوئی ایک محراب سی میں کھڑے تھے۔

دفعتاً ان میں سے ایک محراب نما حصے سے نکل آیا۔ دوسرا کچھ کہتے ہوئے اس کے پیچھے لپکا اور میں بروقت دیوار سے چپک گیا۔ وہ مجھ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھے۔ اگر میں دیوار سے مزید ایک انچ بھی آگے کھسکتا تو وہ مجھے دیکھ سکتے تھے۔ وہ میری ہی طرف آرہے تھے۔ اس لیے مجھے ایک بار پھر اپنی ڈارٹ گن کو زحمت دینا پڑی۔ ورنہ میں عین دیوار کے زیر سایہ کھڑے ہو کر ذرا سی بھی آواز پیدا کرنا نہیں چاہتا تھا۔

ان میں سے ایک نے کچھ اس قسم کی آواز نکالی جیسے اپنے ساتھی سے کہنا چاہتا ہو۔

"دیکھ ...... میں نہ کہتا تھا کہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔" اس نے اپنے کندھے سے رائفل بھی اتارنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کا یہ عمل ادھورا رہ گیا۔ سوئیاں واقعی اتنی سریع الاثر تھیں جیسے سائنائیڈ کسی چیز میں ملائے بغیر براہ راست زبان پر رکھ لیا گیا ہو۔

میں دل ہی دل میں ڈارٹ گن کے موجد کو داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ تقریباً تین منٹ میں اس مکان کی حدود میں آٹھ لاشیں گر چکی تھیں مگر سکون ذرا بھی متاثر نہ ہوا تھا۔ اس لحاظ سے یہ چیز مجھے اس اسٹین گن سے بھی زیادہ فائدہ مند محسوس ہوئی تھی جو میں نے شلوار میں اڑس رکھی تھی اور جو جھکتے وقت مجھے خاصی تکلیف دہ حد تک چبھ رہی تھی۔ بہرحال اسٹین گن کا یہ فائدہ ضرور تھا کہ وہ مارتی بھی تھی اور دہشت زدہ بھی کرتی تھی۔

ڈارٹ گن کا استعمال بہرحال محدود تھا۔ ہر جگہ وہ کام نہیں دے سکتی تھی۔ ان دونوں لاشوں کو بھی دیوار کے ساتھ لگانے کے بعد میں عقبی دروازے پر پہنچا۔ اب میں نے ڈارٹ گن جیب میں رکھ لی اور اس ہاتھ میں موبرگ نکال کر تھام لیا تھا۔ جو اب تک میری پنڈلی سے بندھا ہوا تھا۔ دوسرے ہاتھ میں میں نے اپنا وفادار خنجر سنبھال لیا۔ اس کے بعد میں نے محتاط انداز میں ایک طرف کو رہتے ہوئے جوتے کی نوک سے دروازے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا۔

دروازہ کھلا تھا۔ اندر بلا کا اندھیرا تھا' جیسے موت منہ کھولے کھڑی ہو۔ دروازہ کافی حد تک وا کرنے کے بعد بھی میں دیوار سے چپکا کھڑا رہا' لیکن کوئی ردعمل ظاہر نہ ہوا۔ تب میں نے اندر قدم رکھ دیا اور دروازے کے قریب ہی دروازے سے چپک گیا۔ مزید چند لمحے انتظار کے بعد میں نے دروازہ آہستگی سے بند کردیا۔

میری حسیات مجھے بتا رہی تھیں کہ اس کمرے میں کوئی نہیں ہے۔ فرنیچر نام کی بھی کوئی چیز وہاں نہیں تھی۔ میں دیوار ہی کے ساتھ رگڑ کھاتا ایک اور دروازے تک پہنچا یہ بھی مجھے کھلا ہی ملا لیکن جیسے ہی میں اس کمرے میں داخل ہوا ...... لائٹ آن ہوگئی۔

مجھے کمرے میں قدم رکھتے ہی احساس ہوگیا تھا کہ یہاں کچھ ہو گا لیکن اس وقت تک بہرحال میں قدم رکھ چکا تھا۔ فوری طور پر میں گھٹنوں کے بل گر گیا لیکن اسی لمحے ایک مدھم آواز سنائی دی جسے سرگوشی بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہوا کہ اسے میرے علاوہ کوئی سن بھی نہیں سکتا تھا۔

یہ آواز تضادات کا مجموعہ تھی۔ اس میں موسیقیت بھی تھی اور کچھ کھردراپن بھی' التجا بھی تھی اور اندیشہ بھی۔ نہایت شستہ انگریزی میں کہا گیا تھا۔ "جلد بازی میں کچھ مت کر بیٹھنا۔"

مجھے ہتھیار پھینکنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔ اس لیے میں نے اندھا دھند کچھ کر گزرنے کے بجائے ذرا بہتر طور پر اس شخصیت کا جائزہ لینے کو ترجیح دی جس کی زبان سے یہ الفاظ

نکلے تھے۔ وہ ایک عجیب و غریب عورت تھی۔

عجیب و غریب اس لحاظ سے کہ آواز کی طرح اس کی شخصیت بھی تضادات کا مجموعہ تھی۔ کہنے کو تو وہ عورت تھی مگر اس کا قد شاید چھ فٹ سے کسی طرح بھی کم نہیں تھا۔ اس کے ہاتھ پیروں سے بیک وقت مضبوطی بھی عیاں تھی اور نزاکت بھی۔ اس کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں میں شفقت اور مہربانیوں کے سائے بھی تھے اور سنگدلی و نامہربانی کی کرختگی بھی۔ تاہم اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ مجموعی طور پر وہ ایک بے پناہ خوبصورت عورت تھی۔ ملیح رنگت کتابی چہرہ رخساروں کی ہڈیاں کچھ ابھری ہوئی تھیں' لیکن لمبی پلکوں سے مزین بڑی بڑی سیاہ آنکھوں کی وجہ سے ہڈیوں کا ابھار بے حد خوبصورت معلوم ہو رہا تھا۔

اس کے ترشے ہوئے رسیلے ہونٹوں کے گوشوں پر خفیف سا کھنچاؤ تھا جو اس کی طبیعت میں چھپی ہوئی سفاکی کی نشاندہی کرتا تھا۔ اس کے بال کٹے ہوئے تھے ...... اور بے ترتیبی سے اس کی پیشانی پر جھکے ہوئے تھے' لیکن اس بے ترتیبی نے اس کے حسن اور دلکشی میں اضافہ کیا ہوا تھا۔

وہ تقریباً بوری جیسے موٹے کپڑے کی ایک ڈھیلی ڈھالی شرٹ اور اسی سے ملتے جلتے لیکن مختلف رنگ کے کپڑے کی پتلون پہنے ہوئے تھی۔ پتلون کے پائنچے اور شرٹ کی آستین چڑھی ہوئی تھی اور اس کی مضبوط اور پرکشش کلائیاں اس بھاری بھرکم وکٹورین اسٹائل کی کرسی کے ہتھوں پر ٹکی ہوئی تھیں' جس پر اس وقت وہ نیم دراز تھی ...... اس کے ایک پاؤں میں سمور کا جوتا تھا۔ دوسرا جوتا کرسی سے کچھ دور پڑا تھا۔

اس کی عمر پینتیس سال سے کم تو نہیں رہی ہو گی لیکن اس کے خدوخال پر نوخیزی و کم عمری کی شگفتگی تھی۔ صرف اس کی آنکھوں کی پختگی اور جسمانی اٹھان اس شگفتگی کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ ورنہ وہ بے حد کم عمر لڑکی معلوم ہوتی' لیکن خصوصیات کا تضاداتی ملاپ بھی بے حد خوبصورت اور حیران کن تھا۔ اس لیے مجھے کوئی تشبیہ نہیں سوجھی سوائے اس کے کہ وہ اس لڑکی کی طرح تھی جو خود ہی اپنی ماں بھی معلوم ہوتی ہو۔

"دروازہ بند کردو اور اطمینان سے اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ۔" اس کا سرگوشی نما مکالمہ سن کر ایک بار پھر نہ جانے کیوں میرا دل اور محسوسات کچھ اتھل پتھل سے ہونے لگے۔

میں نے لات مار کر دروازہ تو بند کر دیا لیکن اٹھ کھڑے ہونے والی ہدایت پر عمل نہیں کیا۔ اس کے بجائے میں دیوار سے ٹیک لگا کر قالین پر بیٹھ گیا۔ خنجر اور ریوالر بدستور میرے ہاتھ ہی میں تھا۔ گو کہ میں یہ دیکھ چکا تھا کہ عورت کے پاس نہ تو کوئی ہتھیار وغیرہ نظر آ رہا تھا اور نہ ہی جیب وغیرہ میں موجودگی کے آثار نظر آ رہے تھے۔

وہ کمرہ جس میں ہم دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ کچھ عجیب سے انداز میں سجا ہوا تھا۔

جیسے کسی دولت مند نے دنیا کے کسی دور دراز گوشے میں گھر بنوایا ہو اور وہیں جو کچھ بھی اچھی سے اچھی چیز دستیاب ہو سکتی ہو اس سے گھر کو آراستہ کر لیا ہو۔ قالین نہایت دبیز اور کھڑکیوں پر پڑے ہوئے پردے موٹے موٹے اور کچھ شاہانہ قسم کے تھے لیکن فرنیچر کچھ ایسا تھا جیسے نہایت پرانی اشیاء فروخت کرنے والی کسی دکان سے خریدا گیا ہو۔ ایک بات میں نے خاص طور پر محسوس کی کہ پردے وغیرہ کھڑکیوں پر اس انداز سے کھینچے تھے اور روشن دانوں کو اس انداز میں بنایا گیا تھا کہ روشنی باہر نہ جانے پائے۔

مجھے کمرے کا جائزہ لیتے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی محض ایک رمق ابھری۔ سرگوشی نما مکالمے نے ایک بار پھر میری سماعت کو نوازا۔ "مجھے معلوم تھا کہ تم یہیں آؤ گے ...... میں اس وقت ایک کھڑکی کی درز سے تمہیں دیکھ رہی تھی جب تم محافظوں کی لاشیں ٹھکانے لگا رہے تھے۔ اس وقت میں چاہتی تو ان لاشوں میں تمہاری لاش بھی شامل ہو سکتی تھی، لیکن مجھے فوراً ہی احساس ہوا کہ یہ تو میری بہت بڑی غلطی ہو گی ......"

اس نے مکالمے کو تشنہ چھوڑ کر شرٹ کی سامنے والی جیب میں ایک ہاتھ ڈالا اور دوسرا ہاتھ اٹھا کر گویا مجھے خبردار کرتے ہوئے بولی۔ "گولی وغیرہ مت چلانا۔ میں جیب سے کوئی ہتھیار نہیں، سگار نکالنے لگی ہوں۔"

اس نے ایک چھوٹا لیکن موٹا سا سگار نکالا۔ اس کا سرا دانتوں سے توڑ کر قالین پر پھینکا اور دوسری جیب سے لائٹر نکال کر اسے سلگایا۔ اس نے اتنا طویل کش لے کر دھواں اگلا کہ ایک لمحے کے لیے تو مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ پورا کمرہ ہی دھوئیں سے بھر جائے گا۔ کسی عورت کو سگار پیتے میں نے پہلی بار دیکھا تھا اور وہ بھی اتنی لگن سے گویا ایک ہی کش میں سگار ختم کر دینا مقصود ہو۔

اس کی باتیں الجھی الجھی سی تھیں۔ میں نے بولنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ وہ دوبارہ خبردار کرنے کے سے انداز میں ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولی۔ "میری ہی طرح نیچی آواز میں بولنا۔ برابر کے کمرے میں میرا شوہر موجود ہے گو کہ وہ کچھ سننے یا سمجھنے کی پوزیشن میں نہیں ہے لیکن احتیاط بہرحال اچھی چیز ہے۔"

میں نے سردست کچھ کہنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور متوقع نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"حلیہ تو تم نے یہیں والوں جیسا بنا رکھا ہے۔" وہ بولی۔ "لیکن آئے بہرحال کہیں اور سے ہو۔ کیا نام ہے تمہارا؟"

"کیا میری صورت پر لکھا ہے کہ میں کہیں اور سے آیا ہوں؟" میں نے پہلی بار زبان کھولی۔

اس نے ایک طویل سانس لیا اور گہری نظر سے میری طرف دیکھا۔ اس نظر میں میرے لیے ایک خاص دلچسپی کی جھلک موجود تھی اور اس بات کو محسوس کرتے ہوئے نہ جانے کیوں میری دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ دل کی یہ خفیف سی اتھل پتھل میرے لیے باعث حیرت تھی۔

"یہ ٹھیک ہے کہ مجھے ایک طویل عرصے سے اپنی بستی میں آزادانہ پھرنے کا موقع نہیں ملا۔" وہ بولی۔ "اور مجھے بستی کے ہر فرد کی صورت بھی یاد نہیں رہ سکتی، لیکن مجھے اتنا ضرور معلوم ہے کہ صورتیں اگر یہ نہیں بتا سکتیں کہ ان کا تعلق کس جگہ سے ہے تو کم از کم یہ ضرور بتا سکتی ہیں کہ ان کا تعلق اس جگہ سے نہیں ہے۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

"سمجھ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اب اتنا ناسمجھ بھی نہیں ہوں۔"

"ہاں ...... اس پر میں تم سے متفق ہوں۔" وہ ایک بار پھر مسکرائی۔ "کم عمر ضرور ہو لیکن ناسمجھ نہیں۔ تم نے بڑی صفائی سے میرا سوال گول کر دیا ہے۔ بہرحال ......"
اس نے نہایت ہی خوبصورت انداز میں کندھوں کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔ "اگر تم نہیں بتانا چاہتے تو مت بتاؤ۔ لیکن میں تمہیں اس سرزمین پر خوش آمدید کہتی ہوں۔ تم تازہ ہوا کے ایک جھونکے کی طرح آئے ہو۔ اب تو میرا بہت ہی دم گھٹنے لگا تھا اور میں اس زندگی پر موت کو ترجیح دینے کے بارے میں سوچنے لگی تھی ...... زندگی بہت ہی گراں گزرنے لگی تھی۔ حالانکہ بظاہر کوئی تکلیف بھی نہیں ......"

میری الجھن دوچند ہوگئی۔ وہ مجھے خوش آمدید کہہ رہی تھی۔ ویسے تو خیر یہ کچھ ایسا بعید از امکان بھی نہیں تھا۔ شوہر کی اپنی ایک شخصیت ہوتی ہے اور بیوی کی اپنی۔ بعض اوقات بیوی شوہر کی بداعمالیوں اور مجرمانہ سرگرمیوں میں ایک عرصے تک شریک رہتی ہے، مگر زندگی کے کسی موڑ پر اس کا ضمیر بیدار ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے اسی طرح یہ عورت بھی خواہ مخواہ اپنی مرضی سے حشمت علی خاں کا ساتھ دیتی رہی ہو، لیکن اب یہ سوال کچھ اس کی برداشت سے باہر ہو گیا ہو۔

"...... لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ یہ عورت مجھے جال میں پھانس رہی ہو؟" میں نے سوچا۔ وہ تھی بھی ایسی چیز۔ بڑے بڑے پتھر کے صنم بھی اس کی ایک جنبش ابرو سے موم کی طرح پگھل سکتے تھے اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس کے بارے میں یقین سے کچھ کہنا مشکل تھا۔ میرے جیسے انسان کے لیے بھی اس کی تہہ میں اترنا مشکل تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اندر سے وہ کیا تھی، کیا سوچ رہی تھی اور کیا کرنا چاہتی تھی۔

میں نے محتاط لہجے میں کہا۔ "تم بہت ذہین نظر آتی ہو لیکن کیا حشمت علی خان سے شادی کرتے وقت تمہاری ذہانت نے تمہیں خبردار نہیں کیا تھا کہ تمہاری زندگی میں کبھی ایسا

موڑ بھی آسکتا ہے؟"

"حشمت علی خان سے شادی؟" اس کی روشن پیشانی پر ہلکی سی شکنیں ابھر آئیں۔ پھر وہ دھیرے سے ہنس دی اور میرے اعصاب میں جیسے گدگدی سی ہونے لگی۔

"شاید تم مجھے حشمت علی خان کی بیوی سمجھ رہے ہو؟" وہ بولی۔ "اس خبیث کی بیوی نہیں ہوں۔ ویسے بھی کسی ایک باضابطہ اور باقاعدہ بیوی کی کیا ضرورت ہے۔"

مجھے حیرت کا جھٹکا سا لگا۔ وہ حشمت کی بیوی نہیں تھی تو کون تھی؟ لیکن اس سے پہلے کہ میں اس سے کوئی سوال کرتا اس نے مجھ سے پوچھ لیا۔ "تو تم اس گھر کو حشمت علی خان کی رہائش گاہ سمجھ کر گھسے تھے؟"

میں نے اثبات میں سرہلا دیا۔ وہ جیسے کسی بچے کی معصومانہ شرارت پر مسکرا دی اور بولی۔ "راست قدم اٹھانے کے کچھ زیادہ ہی عادی معلوم ہوتے ہو۔ حیرت ہے کہ اس قدر کم معلومات کے باوجود تم یوں اس وادی میں گھس پڑے۔ تمہاری اس جرات پر تمہیں سلام کرنے کو بھی جی چاہتا ہے اور اس امر پر دیوتاؤں کا شکریہ بھی ادا کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تم کسی غلط جگہ نہیں گھس گئے۔ تمہاری اطلاع کے لیے بتائے دیتی ہوں کہ حشمت علی خان کے گھر میں گھسنا اس سے کہیں زیادہ مشکل کام ہے۔ اس کے تمام محافظوں کو ہلاک کرنے کے بعد بھی تم اندر نہیں جاسکتے۔ جب تک وہ خود تمہیں اندر نہ بلانا چاہے اور پھر وہ اپنے مکان کی اصل عمارت میں بھی نہیں رہتا' تہہ خانے میں رہتا ہے ......"

میری الجھن بڑھ رہی تھی۔ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "خیر ...... اب حشمت علی خان کو تو گولی مارو۔ یہ بتاؤ کہ تم کون ہو؟"

"حشمت علی خان اس بستی کا منوچی ہے۔ شاید تمہیں علم نہ ہو کہ منوچی ......"

"مجھے معلوم ہے کہ منوچی کیا ہوتا ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"تو پھر تمہیں یہ بھی معلوم ہو گا کہ پائی کیا ہوتا ہے۔" وہ پہلو بدلتے ہوئے بولی۔ گفتگو میں وقفہ پاتے ہی وہ سگار کا کش لینا نہیں بھولتی تھی۔ میں نے اثبات میں سرہلایا تو وہ بولی۔ "میں اس بستی کے سابق پائی کی بیوی ہوں۔ سینڈریلا میرا نام ہے۔ میں یوریشین ہوں۔" وہ مسکرائی۔ لیکن اس بار اس کی مسکراہٹ میں حزن و یاس کا پرتو تھا۔ "ایک تو وہ بچوں کی کہانیوں والی سینڈریلا تھی' جس کی جوتی کھو گئی تھی۔ میں وہ سینڈریلا ہوں جس کا سب کچھ ہی کھو گیا ہے۔"

"اوہ ......" میں نے ایک طویل سانس لیا۔ اب بات صاف ہو گئی تھی۔ وہ سابق پائی کی بیوی تھی۔ جسے غالباً زبردستی "سابق" بنا دیا گیا تھا۔ "میرے خیال میں تو پائی کی بیوی کو ایک سیدھی سادی ان پڑھ پہاڑی عورت ہونا چاہیے تھا۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔ "تم تو بہت ہی اونچی مخلوق ہو۔ انگریزی بھی نہایت عمدہ بولتی ہو۔"

"میں آکسفورڈ کی پڑھی ہوئی ہوں۔" وہ بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔ "میں ہی نہیں پائی بھی آکسفورڈ کا پڑھا ہوا ہے۔ وہ کوئی معمولی آدمی نہیں۔ اس کا خاندان صدیوں سے اس قبیلے کا سردار چلا آرہا تھا۔ جس کا بہت قلیل سا حصہ اس وادی میں آکر آباد ہوا تھا۔ بعد میں معلوم نہیں یہاں کون کون آکر گھس گیا۔ بہت گند پڑ گیا یہاں۔ ہماری پرسکون زندگی میں زہر گھلتا گیا۔"

"کچھ تفصیل سے بتاؤ۔" میں نے فرمائش کی۔

"تفصیل میں کیا رکھا ہے۔" وہ سر کو خفیف سا جھٹکا دے کر بولی۔ "اختصار میں بھی بات وہی ہے۔ تین سال پہلے تک پائی ہی بستی کا سردار تھا۔ منوچی کی حیثیت رسمی سی ہوتی تھی۔ وہ ایک طرح کا مذہبی رہنما ہوتا تھا۔ پائی اگر ضروری سمجھتا تھا تو کسی معاملے میں اس سے مشورہ کر لیتا تھا' لیکن اس کے مشوروں پر عمل کرنے کا پابند نہیں ہوتا تھا۔ تاہم وہ اپنی ہر دلعزیزی اور مقبولیت ثابت کرنے کے لیے سال میں ایک مرتبہ رائے شماری کروا لیتا تھا' تاہم وہ رائے شماری کے نتائج کو بھی تسلیم کرنے کا پابند نہیں ہوتا تھا۔ اس سے اسے صرف اپنی مقبولیت کا اندازہ کرنے میں مدد ملتی تھی۔ اگر وہ محسوس کرتا تھا کہ اس کی مقبولیت کم ہو رہی ہے تو وہ اپنی اصلاح کے لیے ضروری اقدامات کرتا تھا۔ مشیروں کی خدمات حاصل کرتا تھا لیکن ......"

اس نے متفکرانہ سی نظروں سے اپنے سگار کو دیکھا جو کافی مختصر ہو چکا تھا' لیکن ابھی وہ اس کا پیچھا چھوڑنے پر قطعی تیار نظر نہیں آتی تھی۔ حسب عادت ایک طویل کش لے کر اس نے سلسلہ کلام جوڑا۔ "لیکن پھر نہ جانے کس طرح حشمت علی خان یہاں آیا اور منوچی بن بیٹھا اور پھر ہر چیز الٹ ہوتی گئی۔ وادی کی آبادی بہت بڑھ گئی۔

پھر یہاں حشمت علی کا باپ شرافت علی بھی آ گیا۔ انہوں نے طاقت کے ذریعے پائی کو ایک طرف بٹھا دیا۔ صرف طاقت ہی نہیں' انہوں نے کچھ اور حربے بھی استعمال کیے۔ پائی کے اصل اختیارات شرافت علی کے پاس چلے گئے۔ یہاں عجیب عجیب دھندے ہونے لگے۔ عجیب عجیب سازوسامان آنے لگا۔ اقتدار اعلیٰ منوچی کے پاس چلا گیا اور پائی کی حیثیت رسمی سی ہو کر رہ گئی۔ رائے شماری کی رسم بھی ختم ہو گئی۔ پائی کا وجود بھی شاید محض اس لیے باقی رکھا گیا کہ وہ مٹھی بھر لوگ جو قدامت پسند سمجھے جاتے ہیں' روایت پرست ہیں اور قدیم اقدار کو سینے سے لگائے رکھتے ہیں' کوئی شورش برپا نہ کر دیں۔ بغاوت خواہ تھوڑے سے ہی آدمی کریں' بہرحال خطرناک ہوتی ہے۔"

وہ کش لینے کے لیے خاموش ہوئی تو میں نے کہا۔ "پائی کو اپنی ذات اور اپنے قبیلے کو اس شر سے بچانے کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے تھی۔"

"جدوجہد؟" وہ ایک بار پھر قدرے مغموم سے انداز میں مسکرائی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

اب اس کا حسن اور دلکشی کچھ اور نمایاں ہوگئی- اس کا لباس عمدہ نہیں تھا مگر اس کا جسم دلکشی کے لیے گویا کسی بھی لباس کا محتاج نہیں تھا- اس کے نقوش کا اگر الگ الگ جائزہ لیا جاتا تو شاید وہ کوئی ایسے بے مثال محسوس نہ ہوتے لیکن انہوں نے مل جل کر گویا اسے لاکھوں میں ایک بنا دیا تھا- اس کا چہرہ میک اپ سے بے نیاز تھا' لیکن اس کی رنگت کی ملاحت' ہونٹوں کا رسیلاپن اور آنکھوں کے قدرتی ڈورے ہزار آرائشوں پر بھاری تھے-

"میرے ساتھ آؤ-" وہ سگار کے ٹوٹے کو انگلی اور انگوٹھے کے درمیان گھماتے ہوئے بولی- "لیکن تم دروازے کے پیچھے ہی رہنا اور ذرا دور سے ہی پائی کا دیدار کرنا-"

اس نے پچھلی دیوار میں موجود ایک دروازہ کھولا- میں اس کے پیچھے تھا- اس کے تراشیدہ بالوں یا پھر شاید اس کے جسم سے ایک عجیب سی مہک اٹھ رہی تھی- اس نے مجھے دروازے ہی پر رکنے کا اشارہ کیا اور اسے تھوڑا سا کھلا چھوڑ کر کمرے میں چلی گئی- اس کمرے میں مدھم اور خوابناک سی روشنی پھیلی ہوئی تھی جو جلد ہی تیز روشنی میں تبدیل ہو گئی اور تب میں نے دیکھا کہ وہ بیڈ روم تھا' جس میں سینڈریلا داخل ہوئی تھی-

اس کمرے میں آرائش بھی کچھ جدید تھی اور کچھ قدیم- کسی چیز کو دیکھ کر امارت اور خوشحالی کا اور کسی چیز کو دکھ کر غربت و افلاس کا احساس ہوتا تھا- کچھ عجیب تضادات کا سا مجموعہ تھا وہ کمرہ- ایک طرف دیوار کے ساتھ پرانی طرز کا ایک ڈبل بیڈ لگا ہوا تھا جس پر شب خوابی کے لباس میں گاؤ تکیے کے سہارے ایک شخص دراز تھا-

اس نے غالباً تیز روشنی محسوس کرتے ہوئے آنکھیں کھولی تھیں یا یوں کہنا چاہیے کہ کھولنے کی کوشش کی تھی' لیکن اس میں کچھ زیادہ کامیاب نہیں ہو رہا تھا- عجیب گولائی لیے ہوئی سی آنکھیں تھیں اس کی- ان میں کچھ زیادہ ہی نمی تیر رہی تھی-

وہ شخص گویا ایک عالیشان عمارت کا ڈھانچہ تھا- اس کا رواں رواں بتا رہا تھا کہ کبھی وہ قابل رشک شخصیت کا مالک رہا ہوگا-

اس کے دیکھنے کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے سینڈریلا کی صورت صاف نظر نہیں آرہی' تاہم اس نے ایک مجبوری کی سی مسکراہٹ کیساتھ کچھ کہنے کی کوشش کی تھی' لیکن ناقابل فہم انداز میں منمنا کر رہ گیا- سینڈریلا نے اسے سینے تک کمبل سے ڈھانپ دیا اور ہتھیلی سے یوں اس کی آنکھیں بند کردیں جیسے اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی ہو- اس شخص نے دوبارہ آنکھیں کھولنے کی کوشش نہیں کی-

اور سینڈریلا واپس اس کمرے میں آگئی جہاں کچھ دیر پہلے تک ہم باتیں کر رہے تھے-

اس نے درمیانی دروازہ بند کردیا اور مجھے ایک دیوان پر بیٹھنے کا اشارہ کیا- میں نے نیفے میں اڑسی ہوئی اسٹین گن کچھ اور اوپر کو کھسکائی اور بیٹھ گیا- خنجر اور ڈارٹ گن میں نے پہلے ہی اپنے ٹھکانوں پر رکھ لیے تھے-

سینڈریلا دوبارہ اپنی کرسی پر جابیٹھی- سگار کا ایک آخری اور نہایت طویل کش لینے کے بعد جب اس کی انگلیاں جلنے کو ہوئیں تو اس نے ٹوٹا دور کونے میں رکھے ہوئے ایک اگالدان کی طرف اس مہارت سے پھینکا کہ وہ سیدھا اندر جاگرا- دونوں ہاتھ بغلوں میں دبا کر اس نے دھیرے دھیرے دھواں اگلا اور میری طرف دیکھتے ہوئے عجیب سے انداز میں مسکرائی- اس مسکراہٹ میں بے بسی بھی تھی اور اس شیر کی سی متانت بھی جو مدتوں سے پنجرے میں بند ہو مگر اس کی روح شکست قبول کرنے کے لیے آمادہ نہ ہو سکی ہو- اس مسکراہٹ میں التجا بھی تھی اور زخمی انا کا کھنچاؤ بھی- دوستی بھی تھی اور تکلف بھی' طلب بھی تھی اور گریز بھی- احتیاط بھی تھی اور اعتماد بھی-

"تم جدوجہد کی بات کر رہے تھے-" وہ دھیمے سے لہجے میں بولی- "اب تم نے دیکھ ہی لیا ہوگا- زندہ لاشیں بھلا کیا جدوجہد کرسکتی ہیں-"

میرے دل میں تاسف کی ایک لہر سی ابھری' لیکن میں نے کوشش کی کہ میں جذباتیت کی کسی لہر کی زد میں نہ آنے پاؤں- کمرے میں چند لمحے بوجھل سا سناٹا طاری رہا-

"حشمت علی جب یہاں آکر سابق منوچی کی رضامندی سے اسے سبکدوش کرکے خود منوچی بنا تو ظاہر ہے اس کا میرے شوہر سے بہت زیادہ رابطہ رہا- پائی اور منوچی کا ہمیشہ ہی رابطہ رہتا تھا لیکن مجھے نہیں معلوم کہ کب اور کس طرح پائی ہیروئن کے انجکشنوں کا عادی ہوا- مجھے جب علم ہوا تو پانی سر سے گزر چکا تھا- ایک انجکشن کے لیے وہ گڑگڑاتا تھا' بلبلاتا تھا اور تڑپتا تھا- میں نے زبردستی یہ خوفناک لت چھڑانے کی کوشش کی تو اندیشہ محسوس ہوا کہ وہ مر ہی نہ جائے- یہ نشہ جب ایک خاص سٹیج پر پہنچ جائے تو اس سے پیچھا چھڑانے کے لیے ایک خاص ماحول اور کچھ دواؤں کی ضرورت ہوتی ہے جو مجھے یہاں میسر نہیں تھیں- اس لیے میں مجبور ہوگئی- خاموش تماشائی بن گئی-"

اس نے ہاتھ بغلوں سے نکال کر کرسی کے ہتھوں پر رکھ لیے اور ایک لمحے کے توقف سے بولی- "میں سوچتی تھی کہ چلو وہ زندہ تو ہے- شاید کبھی رہائی اور چھٹکارے کی کوئی صورت نکل آئے- اس وقت تک صورت حال یہی ہو چکی تھی- جو تم نے کچھ دیر پہلے دیکھی تھی کہ ہماری حیثیت قیدیوں کی سی ہو چکی تھی- میں چونکہ چالاک تھی اس لیے مجھ پر خاص نظر رکھی گئی اور مجھے اس طرح گھیر گھار کر گھر میں محبوس کر دیا گیا کہ میں کسی سے رابطہ قائم نہ کرسکوں- کسی کو معلوم نہ ہونے پائے کہ ہم پر کیا گزر رہی ہے اور خود بستی کے لوگوں کے ساتھ کیا ہو رہا ہے- انہیں کس طرح آلہ کار بنایا جا رہا ہے- اس لیے ہم ان مسلح محافظوں کے نرغے میں ایک طرح سے قید تھے- یہ محافظ ہماری حفاظت کے لیے نہیں' ہمیں یہاں قید رکھنے کے لیے تھے-

"اس خبیث حشمت کو معلوم تھا کہ مجھے اگر ایک بار بھی کسی اجتماع سے خطاب کرنے

کا موقع مل گیا تو میں اگر بازی الٹ نہ بھی سکی تب بھی ایک ہلچل ضرور پیدا کردوں گی' جو پھیل سکتی ہے۔ اس کے لیے مہلک ثابت ہو سکتی ہے۔ یہ درست ہے کہ اس کے اپنے خاصے آدمی موجود ہیں جو شاید تادم آخر اس کا ساتھ دیں اور جن کے پاس بہ کثرت اسلحہ موجود ہے لیکن اگر ایک بار بستی کے عام لوگ اس کے خلاف ہو جائیں' ان کے غیظ و غضب کا رخ اس کی اور اس کے ساتھیوں کی طرف مڑ جائے تو وہ خاصی خونریزی کے بعد ہی سہی لیکن بہرحال مارے جائیں گے۔ اس لیے مجھے بے دست و پا کرنے پر پوری کوشش صرف کی گئی۔

"مجھے قتل کرنے یا علی الاعلان مار ڈالنے کی کوشش اس لیے نہیں کی گئی کہ ہم میاں بیوی کا بہرحال بستی کے لوگوں میں کچھ نہ کچھ احترام باقی ہے۔ ہم میں سے کسی ایک کے اچانک اور اعلانیہ قتل سے شکوک و شبہات اور لوگوں میں بغاوت پیدا ہو سکتی تھی۔ تاہم میں ایک عرصے سے موت کا انتظار کر رہی ہوں جو شاید بظاہر حادثہ معلوم ہوگی۔ ہو سکتا ہے کسی روز اس مکان کے کسی کمرے کی چھت گر پڑے۔ ممکن ہے کسی روز کچن میں آگ لگ جائے۔ میری احتیاط کا یہ عالم ہے کہ میں نے حشمت کی طرف سے مہیا کیے گئے ہر ملازم اور ملازمہ کو نکال دیا ہے۔ معلوم نہیں ان میں سے کون کب مجھے زہر دے دیتا۔ میں اپنا ہر کام اپنے ہاتھ سے کرتی ہوں۔

دفعتاً" میں اضطراری طور پر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے اپنے ایئرفون پر کیٹی کی چیخ سنی تھی۔ یہ ایک غیرمعمولی چیخ تھی۔ میرے اعصاب میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ میں کوئی انتہائی قدم اٹھانے کے ارادے سے دروازے کی طرف لپکا ہی تھا کہ میں نے ایئرفون پر ایک مردانہ آواز سنی جو اس سے پہلے مجھے سنائی نہیں دی تھی۔ "نہیں ...... نہیں ...... لڑکی پر تشدد مت کرو ...... باس نے کہا تھا کہ اسے کوئی گزند پہنچانے کی ضرورت نہیں ...... وہ خود ہی واپس آ کر اس بارے میں جو مناسب سمجھیں گے کریں گے ...... وہ ڈیتھ اسکواڈ کے ساتھ اس شخص کی تلاش میں بہ نفس نفیس گئے ہوئے ہیں ...... ہمارا کام تو صرف اتنا ہے کہ اسے قید خانے میں پہنچا دیں ......"

اس دوران پس منظر میں کہیں کیٹی کے ہولے ہولے کراہنے کی آواز سنائی دیتی تھی۔ پھر اس نے باآواز بلند ان سب کو چند گندی گندی گالیاں دیں جس سے مجھے یہ اطمینان ہوا کہ ابھی وہ خطرے کی حالت میں نہیں تھی اور اس کا حوصلہ بھی بدستور بلند تھا۔ میں اس وقت تک اس کی طرف سے بے فکر رہ سکتا تھا جب تک اس کا حوصلہ برقرار تھا۔

"کیا ہوا؟" تم اتنی محویت سے کیا سننے لگے۔ مجھے تو کچھ سنائی نہیں دے رہا۔" سینڈریلا کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"کیا اس آلہ سماعت کی وجہ سے تمہیں مجھ سے زیادہ سنائی دے رہا ہے؟"

میری نظر گو کہ بدستور اسی پر تھی لیکن ان گزشتہ چند لمحوں میں جیسے اس کا وجود میری نظر سے اوجھل ہی ہو رہا تھا۔ اب میں نے دیکھا کہ وہ بھی کرسی سے اٹھ چکی تھی اور اس کی پیشانی پر شکنیں تھیں۔ وہ بھی جیسے کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے اسے اس حد تک حقیقت سے آگاہ کرنے میں کوئی حرج نہ سمجھا کہ کس طرح میں وادی میں داخل ہوا تھا اور کس طرح کیٹی گیٹ پر پکڑی گئی تھی اور یہ کہ کس طرح میں ابھی تک اس کی آواز سن رہا تھا۔

"وہ تو قید خانے میں پہنچ چکی ہوگی۔" سینڈریلا بولی۔

"قیدخانے کا صحیح علم تو مجھے بھی نہیں لیکن میرا اندازہ ہے کہ وہ حشمت علی کی رہائش گاہ کے تہہ خانے میں ہی کہیں واقع ہے۔ تم نے اپنا مقصد ابھی تک نہیں بتایا۔" وہ اپنی مسکراہٹ کو سمیٹتے ہوئے بولی۔ "ظاہر ہے تم یونہی منہ اٹھا کر تو یہاں نہیں چلے آئے ہو گے۔ کسی بڑے مقصد کے لیے ہی جان کی بازی لگائی جاتی ہے۔"

"بے شک!" میں نے تائید کی۔ "میرا مقصد چند ذاتی اور چند انسانی وجوہات کی بناء پر صرف حشمت علی' شرافت علی اور ان کے جاں نثاروں کو قتل کرنا تھا لیکن اب یہ بات بھی میرے مقاصد میں شامل ہو گئی ہے کہ صرف انہیں قتل کرنا ہی کافی نہ سمجھا جائے بلکہ اس انداز میں ان کا اور ان کے ساتھیوں کا صفایا کیا جائے کہ آئندہ کوئی اس کی جگہ نہ لے سکے اور نہ ہی کوئی دوسرا حشمت اس طرح پنجے جما سکے۔ یہ وادی اس کے چنگل سے نکل آئے۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ اس کے اپنے آدمیوں کے علاوہ بستی کے عام آدمیوں کا اس کے بارے میں کیا رویہ ہے؟ کیا عام لوگ اس کی آواز پر لبیک کہتے ہیں؟ اس کے کہنے پر عمل کرتے ہیں؟"

"سردست تو یہی صورت ہے۔ اس نے انہیں ایسی عیاری اور مکاری سے شیشے میں اتارا ہوا ہے کہ وہ اس کے احکامات پر عمل درآمد کرنا عبادت سمجھتے ہیں لیکن اگر مجھے اتنا موقع مل سکے کہ میں لوگوں کا ایک بڑا اجتماع بلا سکوں' اپنے شوہر کو لے کر ان کے سامنے جاسکوں اور اس کی حالت دکھا کر ایک ولولہ انگیز تقریر میں سارے حقائق بیان کرسکوں اور بستی والوں کو احساس دلا سکوں کہ وہ کس طرح بے وقوف بن رہے ہیں تب بازی پلٹ سکتی ہے لیکن ظاہر ہے یہ ممکن نہیں۔ یہ طویل عمل بغیر کسی مداخلت کے تو انجام نہیں پاسکتا۔ فی الوقت اگر میں باہر پہنچ بھی جاؤں اور لوگوں کو جمع کرنا شروع کردوں تو چار جملے بولنے سے پہلے ہی حشمت تمام تر خطرہ مول لیتے ہوئے مجھے گولی مروا دے گا۔ بعد میں وہ کسی نہ کسی طرح تاویلوں سے بستی والوں کو مطمئن کر لے گا۔"

"اگر تمہیں کوئی ایسا موقع مل جائے ......" میں نے کہا "کہ بہت دیر کے لیے حشمت اور اس کے ساتھی اپنی ہی مصیبت میں پھنس جائیں اور تمہیں بھی باہر جانے سے روکنے

ٹوکنے والا کوئی نہ ہو تب تو تم اپنا کام دکھا سکتی ہو نا؟"

"یقیناً ...... میں کوشش تو کر ہی سکتی ہوں جس میں کامیابی کی مجھے زیادہ توقع ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"حشمت اور اس کے ساتھیوں سے تو میں ہر طریقے سے نمٹ لوں گا۔" میں نے کہا۔ "میں یہی چاہتا تھا کہ عام لوگوں کا ریلا میری طرف نہ بہنے پائے۔ خوفزدہ تو میں ان سے بھی نہیں ہوں لیکن میں نہیں چاہتا کہ بے گناہوں اور سیدھے سادے لوگوں کا خون بہے۔"

وہ مسکرائی۔ "بات تو اس طرح کر رہے ہو گویا تنہا نہیں بلکہ پوری رجمنٹ لے کر آئے ہو اور کوئی توپخانہ بھی ساتھ ہے۔"

"اس وادی جیسی جگہ پر اگر اوسان بحال رکھے جائیں تو تنہا آدمی رجمنٹ کے برابر ہوسکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اور چند دور مار رائفلیں۔ توپ خانے کا کام دے سکتی ہیں۔" وہ کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ دور سے کچھ شور سنائی دیا۔





وہ ایک لمحے کے لیے کان لگا کر سننے کے بعد بولی۔ "کچھ لوگ یقیناً اس طرف آرہے ہیں.....یہ بات طے ہے کہ تمہیں میرے گھر میں ضرور تلاش کیا جائے گا.....یہ بتاؤ کہ تم سانس کتنی دیر کے لیے روک سکتے ہو؟"

"تمہارے اندازوں سے کہیں زیادہ دیر کے لیے۔" میں نے جواب دیا۔

"میرے اندازوں کو حقیقت سے اتنا دور بھی مت سمجھو۔" وہ معمولی سی گھبراہٹ اور بہت زیادہ عجلت کے باوجود مسکرائی۔ "مجھے پہلے ہی اندازہ ہو چکا ہے کہ تم نے یوگا میں بہت محنت کر رکھی ہے۔" اس دوران اس نے قدیم طرز کی لکڑی کی ایک وارڈ روب میں سے ایک پرانا سا تالا ڈھونڈ کر نکال لیا تھا اور وارڈ روب ہی کو لگا دیا تھا۔

"نفسیاتی چال چلنے کی کوشش کر رہی ہوں۔" اس نے خود ہی وضاحت کی۔ "ہر دیکھنے والے کا خیال سب سے پہلے اسی الماری کی طرف جائے گا' خصوصاً اسے تالا دیکھ کر شک قوی تر ہو گا جبکہ میں تمہیں جس چھپاؤں گی' وہ بالکل کھلی ہوگی...."

اس نے مجھے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور اس دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بتی بجھا دی جس سے میں اندر آیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی دائیں ہاتھ پر ایک اور دروازہ تھا۔ دروازہ کیا بس لوہے کی ایک چھوٹی سی گرل تھی جو کھلی ہوئی تھی۔ اندر پہنچ کر مجھے اندازہ ہوا کہ یہ ایک طویل و عریض کچن تھا جس کی دو دیواریں ان دونوں کمروں سے ملتی تھیں جو میں اب تک دیکھ چکا تھا۔ اس کچن کے ایک کونے میں مٹی کے تیل سے جلنے والے چولہوں پر مشتمل وہ نظام موجود تھا جس سے برفباری کے دنوں میں مکان کو گرم رکھا جا سکتا تھا۔

کچن میں ایک دیوار کے ساتھ جست کی چادر کی ایک بہت بڑی تابوت نما پیٹی رکھی تھی جس کا ڈھکن اس وقت اٹھا ہوا تھا۔ قریب پہنچ کر میں نے دیکھا کہ وہ پیٹی آدھی سے زیادہ گندم سے بھری ہوئی تھی۔ میں سینڈریلا کا مقصد سمجھ گیا اور جب وہ جھک کر دونوں ہاتھوں سے پیٹی کے درمیان سے گندم کناروں کی طرف ہٹانے لگی تو میں بھی اس کا ہاتھ بٹانے لگا۔

چند سیکنڈ میں ہی گندم کی قبر تیار ہو گئی تو سینڈریلا نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور میں پیٹی میں داخل ہو کر اس قبر میں لیٹ گیا۔ اس نے جلدی میں ہاتھ آنے والا پتلا سا

ایک صافی نما کپڑا میرے چہرے پر ڈال دیا اور گندم کی سطح برابر کرنے لگی۔ اس دوران باہر سے گیٹ دھڑ دھڑائے جانے کی آواز سنائی دینے لگی تھی۔ جلد ہی گندم نے مجھے ڈھانپ لیا تو آواز خاصی مدھم ہو گئی' تاہم گندم کی قبر سے باہر کی دنیا سے میرا سماعت کا رشتہ یکسر نہیں ٹوٹا حتیٰ کہ میں نے سینڈریلا کے دوڑ کر کچن سے باہر جانے تک کی آواز سنی۔

چند لمحے بعد مجھے کہیں قریب ہی سے کچھ افراد کے بولنے کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ یقیناً کافی تیز و تند آوازوں میں باتیں کر رہے تھے مگر مجھے مدھم سنائی دے رہی تھیں۔ پھر ان میں ایک واضح تحکمانہ اور گرجدار آواز سنائی دی....."ادھر ادھر ہانکنے کی ضرورت نہیں.....ہم نے بستی کے تقریباً ہر گھر سے پتا کروا لیا ہے اور مجھے یہ بھی معلوم ہے اس بستی میں سب میرے ماننے اور چاہنے والے ہیں۔ میری اجازت کے بغیر کوئی کسی اجنبی کو پناہ نہیں دے سکتا۔ صرف تم ہی ہو جو کسی اجنبی کو خوش آمدید کہہ سکتی ہو اور یہاں اس کی آمد کا ثبوت بھی موجود ہے۔ تمام محافظ مرے پڑے ہیں....."

"میں نے کب کہا ہے کہ وہ یہاں نہیں آیا۔" سینڈریلا کی جارحانہ آواز سنائی دی۔ "تم کسی اور کی بات تو سنتے ہی نہیں ہو.....اپنی ہی بکواس شروع کر دیتے ہو۔"

"تمیز سے بات کرو سینڈریلا!" گرجدار آواز نے اس کی بات کاٹ دی۔ "یہاں تو صرف میرے خاص آدمی ہی موجود ہیں جو میرے اشارے کے بغیر حرکت نہیں کرتے لیکن اگر تم باہر بستی کے عام لوگوں میں' میرے عقیدت مندوں میں کھڑے ہو کر اس طرح مجھ سے بات کرو تو وہ تمہاری بوٹیاں نوچ ڈالیں گے....."

"حشمت خان!" سینڈریلا کی آواز میں بھی بلا کی تندی آگئی۔ "اگر تمہیں اتنا ہی زعم ہے تو مجھے باہر کیوں نہیں نکلنے دیتے.....؟ ایک بار عام لوگوں میں جانے دو' پھر دیکھو وہ تمہاری بوٹیاں نوچتے ہیں یا میری۔"

"رسی جل گئی مگر بل نہیں گیا۔" وہی آواز جو یقیناً حشمت خان کی تھی' گویا زہر میں بجھ کر نکلی تھی۔ "اب یہ خیال دل سے نکال دو کہ باہر کے لوگوں کے دلوں میں تمہارے لیے کچھ عقیدت باقی رہ گئی ہے' لوگ تو تمہارا نام بھی بھول گئے ہیں۔"

"تبھی تم نے اتنے محافظوں کے گھیرے میں اتنے عرصے سے مجھے محبوس کر رکھا ہے۔" سینڈریلا گرجی۔

"اچھا اس بکواس کو چھوڑو۔ میں تمہارا باہر آنے کا ارمان بھی پورا کر دوں گا۔" حشمت خان غرایا۔ "فی الحال صرف اس اجنبی کی بابت بتاؤ' کہاں چھپایا ہے اسے تم نے؟"

"گھر تمہارے سامنے ہے' تلاشی لے لو۔" سینڈریلا نے ناگواری سے کہا۔ "میں نے اسے پناہ دینے اور چھپانے کی کوشش کی تھی لیکن اس بدبخت نے مجھ پر بھروسہ نہیں کیا۔ اپنے سائے سے بھی محتاط تھا۔ چھلاوے کی طرح آیا' محافظوں کو مارا' مجھ سے چند سیکنڈ بات

کی اور پچھلی دیوار پھلانگ کر نکل گیا۔ میری جان بھی اس لیے بخش گیا کہ میں نے اسے ہر طرح کے تعاون کی پیشکش کر دی تھی جو اس نے احتیاطاً قبول نہیں کی بہرحال وہ قائل ضرور ہو گیا تھا کہ میں تمہارے بہی خواہوں میں سے نہیں ہوں۔ ویسے تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ وہ اس گھر کو تمہارا گھر سمجھ کر گھسا تھا۔"

ایک لمحے کے لیے سکوت چھا گیا۔ سینڈریلا انسانی نفسیات کے پیچ و خم سے بخوبی واقف تھی اور گفتگو سے دوسروں کو قائل کرنے کا فن بھی جانتی تھی۔

"باتوں سے متاثر کرنے کی تمہاری صلاحیت سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔" حشمت خان کی آواز نے سکوت توڑا۔ "لیکن میں خود چونکہ اس فن میں تمہارا حریف ہوں' اس لیے آنکھیں بند کر کے یقین کرنے سے تو رہا۔"

"تو پھر باتوں میں اپنا اور میرا وقت کیوں ضائع کیے جا رہے ہو۔" سینڈریلا نے غصے اور بیزاری سے کہا۔ "میں سونے جا رہی ہوں۔ تمہارا جو جی چاہے کرو۔ جہاں جی چاہے' اسے تلاش کرو۔" میں نے محسوس کیا کہ وہ شاید سونے کے لیے سچ مچ خواب گاہ کی طرف چلی گئی تھی۔

دفعتاً" ایک دھماکے نے مجھے جھرجھری سی لینے پر مجبور کر دیا۔ دھماکہ گو کہ مجھے زیادہ زوردار محسوس نہیں ہوا تھا لیکن دھمک سے گویا زمین بھی ہل کر رہ گئی تھی لیکن ساتھ ہی میں نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ یہ دھماکہ بم یا بندوق کا نہیں تھا۔

"اب اسے الٹ کر کھولو.....اگر وہ مردود اندر ہے تو بے ہوش ہو چکا ہوگا وگرنہ تم دروازہ کھلتے ہی اسے چھلنی کر دینا۔" یہ حشمت خان ہی کی آواز تھی اور تب ہی میں سمجھ گیا تھا کہ دھماکہ کس چیز کا تھا۔ دراصل ان لوگوں نے دیوار کے ساتھ کھڑی بھاری بھرکم الماری کو فرش پر گرا دیا تھا۔ اگر اس کے اندر کوئی موجود ہوتا تو یقیناً ایک بار تو اس کا بھیجا ہل جاتا۔ گویا سینڈریلا کا نفسیاتی حربہ کامیاب رہا تھا۔ سب سے پہلے اس کی توجہ الماری ہی کی طرف گئی تھی۔

کھڑبڑ کی کچھ اور آوازیں سنائی دیں' پھر کسی نے کہا۔ "اس میں تو بیکار کپڑوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔"

"بہرحال مکان کی تلاشی لو۔ کوئی گوشہ نظر انداز نہ کیا جائے۔" حشمت خان نے حکم دیا۔ اس کے بعد وقفے وقفے سے کوئی آواز سنائی دینے لگی۔ وہ لوگ کچن میں بھی آئے' کسی نے پیٹی پر زور سے کوئی چیز بھی ماری جو غالباً بندوق کا کندہ تھا۔ اس کی یہ حرکت مجھے تلاش کرنے کی خواہش سے زیادہ جھنجلاہٹ کی آئینہ دار معلوم ہوتی تھی۔

"اس میں تو گندم بھری ہوئی ہے۔" ایک آواز آئی۔

"گندم میں بھی چھری وغیرہ مار کر دیکھ لو۔" دوسری آواز نے مشورہ دیا۔

"تمہارا تو دماغ خراب ہو گیا ہے راج!" پہلی آواز میں بیزاری در آئی۔ "ہم کسی لاش کو نہیں' زندہ انسان کو تلاش کر رہے ہیں۔ جب سے ہم آئے ہیں تب سے کیا کوئی شخص گندم میں دب کر زندہ رہ سکتا تھا؟"

اس کے بعد کوئی آواز سنائی نہ دی' سوائے دھب دھب کے۔ یہ ان کے بھاری جوتوں کی آواز تھی جو دور ہوتی چلی گئی۔ میں نے آواز معدوم ہونے کے بعد بھی تقریباً ایک منٹ انتظار کیا اور اس دوران میں نے یوگا کی مشق سے بھی مکمل طور پر کام نہیں لیا۔ میں نے محسوس کیا کہ گندم میں جتنی گہرائی میں' میں دبا ہوا تھا' وہاں سانس تو باقاعدہ طور پر نہیں لی جا سکتی تھی لیکن کوئی ایئر ٹائٹ ڈبے کی سی کیفیت نہیں تھی۔ عام آدمی بھی چار پانچ منٹ تو گزار ہی سکتا تھا۔

میں نے اپنے آپ کو مزید زیر مشق نہ رکھا اور سر گندم کی قبر سے نکال لیا۔ کچن میں بدستور مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی اور کوئی شخص موجود نہ تھا' تاہم میں نے باہر آنے کی کوشش نہیں کی۔ گندم سے سر نکالے وہیں لیٹا رہا۔

کچھ دیر بعد مجھے آوازوں سے اندازہ ہوا کہ وہ لوگ ملحقہ کمرے میں ایک بار پھر جمع ہو چکے تھے۔ پھر کسی نے رپورٹ دی۔ "مکان میں پائی اور سینڈریلا کے سوا کوئی موجود نہیں باس! ہم نے چپے چپے کا......"

حشمت خان نے اس کی بات کاٹ دی۔ "میں نے تمہیں کتنی بار منع کیا ہے' مجھے میرے گھر سے باہر کہیں بھی باس کہہ کر مخاطب نہ کیا کرو۔ منوچی کہا کرو مگر تمہاری سمجھ میں بات ہی نہیں آتی۔"

"یہاں کونسا کوئی غیر موجود ہے باس.... میرا مطلب ہے منوچی!" پہلی آواز نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "سب اپنے ہی ہیں اور پھر ہم تو بات بھی انگریزی میں کر رہے ہیں۔ مقامیوں میں سے تو کوئی کوئی ہی تھوڑا بہت انگریزی سمجھ سکتا ہے۔"

"تمہاری سمجھ میں آج تک یہ نہیں آیا کہ حکم بہرحال حکم ہی ہوتا ہے۔ میرے حکم کے سامنے منطق جھاڑنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔" حشمت خان نے ناگواری سے کہا' تاہم اس کی آواز میں پہلا سا دبدبہ اور طنطنہ نہیں تھا۔ "اور اگر بات منطق اور جواز ہی کی ہے تب بھی تمہیں یاد رکھنا چاہیے کہ اس وقت ہم اپنے سب سے بڑے دشمن کے گھر میں کھڑے ہیں۔ تمہیں کیا معلوم کہ اس سانپ کے پھن پر میں نے کس چالاکی سے پاؤں رکھا ہوا ہے۔ ذرا دباؤ کم ہو تو ہمارا داؤ الٹا ہمیں ہی پڑ سکتا ہے۔"

"سانپ تو تم ہو حشمت خان!" کچھ فاصلے سے سینڈریلا کی غصیلی آواز سنائی دی۔ "جس نے اس وادی کے حقیقی وارثوں کو ڈس لیا ہے۔ کاش ہم نے اسی وقت تمہارا سر کچل دیا ہوتا' جب تم گھگھیاتے ہوئے اس گھر میں آیا کرتے تھے۔ ہم میاں بیوی اس وقت

تم پر ترس کھایا کرتے تھے۔"

اگر تم نے ہندوستان کی تاریخ پڑھی ہوتی تو تم کبھی ایسی حماقت نہ کرتیں۔" حشمت خان نے کھسیانے کے بجائے استہزائیہ سا قہقہہ لگا کر کہا۔ "انگریزوں نے اسی طرح تو مغلوں سے پورا ہندوستان ہتھیا لیا تھا۔"

"تم بھی مجھے کسی انگریز ہی کا پلا لگتے ہو اور وہ بھی کسی کمینے قسم کے انگریز کا۔" سینڈریلا نے جل کر کہا۔

حشمت خان حالات کی تمامتر ناگواری کے باوجود شاید فی الحال کوئی شدید ردعمل ظاہر کرنے کے موڈ میں نہیں تھا کیونکہ اس کی طرف سے کوئی سخت جواب سنائی نہیں دیا۔ "تمہارے اندازے کے مطابق وہ کہاں چھپا ہوگا؟ کوئی غلط اندازہ ہی ظاہر کر دو" اس نے کہا۔

"ہو سکتا ہے وہ جنگل میں جا چھپا ہو۔" سینڈریلا نے ایک لمحے کے توقف سے جواب دیا۔

"جنگل میں؟" حشمت خان نے ایک بار پھر استہزائیہ سا قہقہہ لگایا۔ "تمہیں شاید علم نہیں ہے کہ جنگل میں ہمارے سدھائے ہوئے چند درندے بالکل اسی طرح گھومتے رہتے ہیں جس طرح کسی علاقے کے چوکیدار گشت پر ہوتے ہیں۔ مشکوک انداز میں گھومتا ہوا کوئی بھی شخص ان کے عتاب سے نہیں بچ سکتا۔"

"تب تو شاید وہ اب تک اگلے جہان کو سدھار بھی چکا ہو۔ تم خوامخواہ ہی پریشان ہوتے پھر رہے ہو۔" سینڈریلا نے کہا۔

"تمہارے گھر کی تلاشی لینے کے بعد میں بھی تقریباً اسی نتیجے پر پہنچا ہوں۔" حشمت خان بولا۔ اب اس کی طمانیت کی وجہ میری سمجھ میں آگئی۔ وہ میرے سلسلے میں کافی حد تک بے فکر ہو چکا تھا اور یہی میں چاہتا تھا۔ وہ مزید بولا۔ "لیکن اپنی تسلی کے لیے میں ایک بار پھر بستی میں اعلان کروا دیتا ہوں کہ جو بھی اس اجنبی کو پناہ دے گا' وہ دیوتاؤں کے رحم و کرم اور میری دعاؤں کے اثر سے محروم ہو جائے گا۔"

اس بار سینڈریلا نے کچھ نہیں کہا۔ صرف ایک قہقہہ لگایا جس میں دنیا بھر کی نفرت طنز اور زہر بھرا ہوا تھا۔ حشمت خان کی چبھتی ہوئی سی آواز سنائی دی۔ "کچھ عرصہ اور دل کھول کر قہقہہ لگا لو میری جان! تمہارا یہ لنگور نما شوہر ملک عدم کو سدھار جائے گا اور میرا بھی شعلہ صفت جوان حسیناؤں سے دل بھر جائے گا تو میں تمہیں بھی اٹھا کر اپنی کنیزوں کی ٹولی میں ڈال لوں گا۔ پنچایت بڑی خوش ہوگی کہ میں نے پائی کی بیوہ کو سہارا دیا ہے۔"

"یہ امید پوری ہونے تک تمہاری اپنی ہڈیاں نہ گل سڑ چکی ہوں۔" سینڈریلا نے جواب دیا۔

حشمت خان نے غالباً اس کی طرف سے توجہ اب ہٹا لی تھی اور اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا تھا۔ "تم چاروں اب اس مکان کے گرد گشت پر رہو گے اور بہت ہوشیاری سے نگرانی کے فرائض انجام دو گے۔ صبح تک میں کچھ اور آدمی بھیج دوں گا۔ ڈیوٹی بدلتے رہنا اور سنو....." اس کے بعد اس کی آواز بہت مدھم ہو گئی، غالباً وہ کچھ اور ضروری ہدایات دے رہا تھا۔

میں اب لیٹے لیٹے بے حد بور ہو رہا تھا۔ دشمن برابر والے کمرے میں موجود تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ خنجر یا اسٹین گن لے کر ادھر گھس پڑوں اور لاشوں کے ڈھیر لگا دوں لیکن نہ جانے کیوں فی الحال ذہن اس پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔ ایسا کرنا خلاف مصلحت سا لگ رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کسی ایسی جگہ حشمت خان سے معرکہ آرائی ہو جہاں صرف اس سے اور اس کے ساتھیوں سے سامنا ہو دیگر لوگ نہ الجھنے پائیں۔

بالآخر کچھ دیر بعد مکمل سکوت چھا گیا لیکن میں گندم کی پیٹی سے نہیں نکلا۔ کچھ دیر بعد مجھے دروازے کی طرف سے کپڑوں کی سرسراہٹ سنائی دی، پھر سینڈریلا نے پیٹی میں جھانکا اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "سرگوشی میں ہی بات کرنا۔ وہ لوگ کمروں کی دیواروں کے پاس ہی ٹہل رہے ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔" میں نے سرگوشی کی۔

"گویا تم کافی دیر سے یونہی گردن نکالے پڑے ہو اور میں خوامخواہ تمہاری فکر میں مری جا رہی تھی۔" میں نے مدھم روشنی میں بھی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھ لی۔ وہ بن رہی تھی۔ مجھے معلوم تھا وہ فکر میں مرنے والی عورت نہیں تھی۔ اگر وہ فکر میں مر سکتی تو شاید کبھی کی مر چکی ہوتی۔ وہ تو پتھر کے کوئلے کی طرح تھی۔ جتنی زیادہ گہرائی میں جتنے زیادہ وزن تلے جتنے زیادہ عرصے دبی رہی تھی، اس کی سخت جانی میں اتنا ہی اضافہ ہو گیا تھا۔ سلگنے پر اب وہ اتنا ہی زیادہ تاؤ دے سکتی تھی۔

میں نے پہلے ایک بازو گندم سے نکالا جسے تھام کر سینڈریلا نے مجھے سہارا دیا کیونکہ کھڑا ہوتے وقت میں اپنے وزن سے بار بار گندم میں دھنسا جا رہا تھا۔ باہر آکر میں نے اس کا ہاتھ چھوڑا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا ہاتھ کسی ننگے تار سے لپٹ گیا ہو جس میں خاصی طاقتور برقی رو دوڑ رہی تھی۔

میں نے اپنے کپڑے جھاڑے۔ میرے ایک کان میں گندم کے کچھ دانے گھس گئے تھے، وہ نکالے۔ پھر سرگوشی میں اس سے پوچھا۔ "چار آدمی تو یہاں چھوڑ گیا ہے، اس کے ساتھ مزید کتنے آدمی تھے؟"

"چودہ آدمی اور تھے۔" سینڈریلا نے جواب دیا۔ "ویسے میری معلومات اور اندازے کے مطابق اس کے جانثاروں کی کل تعداد تیس بتیس سے زیادہ نہیں مگر پھر بھی اس وادی پر

اس کی گرفت بہت مضبوط ہے۔ اس کی حکمت عملی نہ جانے کن کن چالاکیوں پر مبنی ہے کہ ان تیس بتیس آدمیوں سے وہ ایک بہت بڑی اور خوفناک تنظیم کا سا کام لیتا ہے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ ان لوگوں کے پاس دولت اور اسلحہ بہت ہے۔"

"خیر.....میں دیکھتا ہوں کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔" میں نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"کہاں چلے؟" اس نے پوچھا۔

"میں کوشش کروں گا کہ اس کے تعاقب میں جا سکوں۔" میں نے کہا۔

"پاگل ہو گئے ہو؟" وہ آگے بڑھ کر میرا بازو پکڑتے ہوئے بولی۔ "ابھی راستے میں جگہ جگہ لوگوں کی ٹولیاں کھڑی ہوں گی۔ حشمت خان کے باقی ساتھی بھی بستی میں بکھرے ہوئے ہیں۔ ذرا صبر کرو۔ میں تمہیں اس کے گھر پہنچنے کا ایک محفوظ راستہ بتا دوں گی۔ اس کا گھر ایک چھوٹا سا قلعہ ہے۔ اگر تم اس کے محافظوں کو ہلاک کر کے اندر پہنچنے میں کامیاب ہو جاؤ تو پھر اندر خواہ کچھ بھی ہوتا رہے، کسی کو علم نہیں ہوگا اور عام لوگ مداخلت کے لیے نہیں پہنچ سکیں گے.....اور یوں جنگل کا تو بھول کر بھی رخ نہ کرنا۔ تم نے سن ہی لیا ہوگا کہ وہاں درندے پھرتے رہتے ہیں۔"

اس نے مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور ہم ایک بار پھر اس کمرے میں آبیٹھے جہاں پہلے بیٹھے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس بار کمرے میں روشنی نہیں تھی اور وہ میرے سامنے بیٹھنے کے بجائے میرے قریب ہی دیوان پر بیٹھی تھی۔ میں اس کے وجود کی خوشبو محسوس کر سکتا تھا۔ پھر اس خوشبو پر سگار کی خوشبو غالب آگئی۔ اس نے لائٹر کے شعلے کو ہاتھوں کے حلقے میں رکھتے ہوئے سگار سلگا لیا تھا اور فوراً ہی لائٹر بجھا لیا تھا۔ میں نے تاریک پس منظر میں نارنجی روشنی میں اس کا چہرہ چند لمحے کے لیے دیکھا تو یہی محسوس ہوا جیسے وہ ایک حسین یاد تھی جو ذہن کے تاریک افق پر جگمگائی تھی اور پھر معدوم ہو گئی تھی۔ اس کی پیشانی پر فکرمندی کی لکیریں تھیں۔

"تمہارے شوہر کی کیا کیفیت ہے؟" میں نے پوچھا۔ "اس سارے ہنگامے میں مجھے اس کی ذرا سی بھی آواز سنائی نہیں دی۔"

"اس کی آواز تو شاید تم یہاں بمباری شروع ہونے کے بعد بھی نہ سن سکتے۔" وہ مجروح سے لہجے میں بولی۔ "کبھی کبھی تو میری قوت برداشت جواب دینے لگتی ہے.....ایسے مرد کا ساتھ بھی کوئی ساتھ ہے کہ جس کی حفاظت عورت کو کرنی پڑے لیکن بس پھر یہی سوچ کر ترس آجاتا ہے کہ اس کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے.....برق رفتاروں کے ساتھ چلنے کا تمنائی تو سارا زمانہ ہی ہوتا ہے لیکن گرے ہوئے کا ہاتھ تھامنے کی روایت بھی تو کسی کو قائم رکھنی چاہیے۔ وہ جو زندگی بھر کا ساتھ نبھانے کا وعدہ ہوتا ہے، اسے اس حال میں بھی

نبھایا جائے' تب بات ہے.....میں یوریشین ہوں اور میری آدھی سے زیادہ عمر یورپ اور
انگلینڈ میں گزری ہے مگر مجھ میں عہد نبھانے والی روح شاید مشرق کی کسی لوک رومانی
داستان سے نکل کر گھس گئی ہے مگر اب میرے اور شوہر کے درمیان صرف رواداری اور
ترحم کا رشتہ رہ گیا ہے اور یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ اچھی علامت نہیں ہے۔"
"سب ٹھیک ہو جائے گا۔" میں نے اندھیرے میں اس کا کندھا تھپکا۔ "حالات اتنے
خراب بھی نہیں جتنے تم سمجھ رہی ہو۔ صرف احساس تنہائی نے تمہارے حوصلے کو کمزور کیا
ہے اور کوئی بھی خاص بات نہیں۔ میں تو بہت زیادہ مشکلات اور خطرات کی توقع لے کر
اس وادی میں داخل ہوا تھا لیکن اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میرا مشن خوامخواہ ہی میرے
لیے ہوا بنا ہوا تھا۔ تم سے ملنے کے بعد مجھے اپنا کام بہت آسان لگنے لگا ہے۔ شاید میری
بدولت بھی تمہیں بہت سے کام آسان محسوس ہونے لگیں۔
مجھے نہیں معلوم تھا کہ ایک مدت سے اس کے سینے میں مقید آنسوؤں کا غبار یکدم ہی
پھوٹ پڑے گا۔ اس نے ایک بازو میری گردن میں حمائل کر دیا اور میرے کندھے پر سر
رکھ کر خاموش سسکیاں لینے لگی۔ رونا بھی اس کی مجبوری تھی اور آواز کو باہر جانے سے
روکنا بھی۔

"تم سے مل کر میرے محسوسات عجیب سے ہو گئے ہیں۔" اس نے آنسوؤں میں بھیگی
سرگوشی میں کہا۔ "میں بیک وقت تمہیں اپنا بھی محسوس کر رہی ہوں اور غیر بھی۔ تم مجھے
دوست بھی لگ رہے ہو اور محبوب بھی۔ حالانکہ محبت میں نے زندگی میں اس شخص کے
سوا کسی سے نہیں کی جو آج بھی میرا شوہر ہے۔ میرا تمہیں خوش آمدید کہنے کو جی بھی چاہتا
تھا اور ساتھ ہی ہر معاملے میں اتنی سردمہری بھی محسوس ہو رہی تھی کہ سوچ رہی تھی بس
خاموش تماشائی بنی بیٹھی رہوں۔ صحیح طور پر میری اب بھی سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا
کروں؟"

تم کچھ بھی مت کرو۔ میں نے اس کے آنسو پونچھے۔ تم جیسی بلند و بالا چٹانوں کو یکلخت
ہی یوں چٹختے دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔ اپنے شوہر کے سلسلے میں بھی تم ابتداء ہی سے غلطی
کر گئیں۔ سال دو سال کی کسی بھی نشے کی عادت ایسی نہیں ہوتی جو چھڑائی نہ جا سکے۔ مجھے
ایل ایس ڈی کا ایک رسیا ٹکرایا تھا۔ ایک ماہ تہہ خانے میں بند رکھا' معمولی سی تدابیر اختیار
کیں' ٹھیک ہو گیا۔ آج بڑا کام کا آدمی بنا ہوا ہے۔ بس اس میں کچھ دن محنت کرنے کی
ضرورت تھی۔ اذیت اسے بے شک بہت اٹھانی پڑتی لیکن بہرحال وہ مر نہیں سکتا تھا۔ اب
بھی تمہیں یہی کرنا پڑے گا۔ ایک ماہ یا زیادہ سے زیادہ دو ماہ اس پر اور اس کے ساتھ ساتھ
خود پر جبر کرنا پڑے گا اور سب ٹھیک ہو جائے گا۔"
"تمہاری باتوں نے مجھے ایک بار پھر وہی پرانی سینڈریلا بنا دیا ہے۔ اس کی آواز گو کہ

اب بھی سرگوشی سے بلند نہیں تھی مگر اب اس میں ایک عزم نو کی آمیزش تھی حتیٰ کہ اب
تو میں اپنے اندر اتنی ہمت محسوس کر رہی ہوں کہ اگر تم مجھے کوئی ہتھیار دے دو تو میں باہر
گشت کرتے ہوئے چاروں آدمیوں کو ٹھکانے لگا کر بڑے میدان میں پہنچ جاؤں جہاں عموماً
حشمت خان بستی کے لوگوں کو خطاب کرتا ہے۔ میں بستی کے لوگوں کو ایک آواز دوں گی تو
چند منٹوں کے اندر اندر ایک سرے سے دوسرے سرے تک خبر پہنچ جائے گی....."
"فی الحال اس کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "سردست شاید میں اکیلا تمہاری
حفاظت نہ کر سکوں اور کسی سمت سے آنے والی گولی تمہیں خاموش کر جائے تو شاید میں
پلٹتی ہوئی بازی کو بھی نہ سنبھال سکوں۔ تم صرف صبح تک انتظار کر لو' صبح بہرحال تمہیں
یہی کرنا ہوگا۔ آج رات کے اندر اندر میں اس فتنے کا سر کچل دوں گا۔ اس کے بعد عام
لوگوں کے سیل رواں کے عتاب سے مجھے بچانا تمہارا کام ہوگا۔"
"اس کی تم فکر نہ کرو۔" وہ بولی۔
"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "فی الحال میں صرف ان چار بدبختوں کی فکر کرتا ہوں جو
باہر ٹہل رہے ہیں۔"
ہم دونوں دوبارہ کمرے میں آئے جس کے راستے میں اندر آیا تھا۔ ایک کھڑکی سے ذرا
سا پردہ ہٹا کر اس نے ایک پٹ میں مجھے چھوٹا سا گول سوراخ دکھایا اور سرگوشی میں بولی۔
"یہاں سے میں تمہیں دیکھ رہی تھی۔"
کمرے میں چونکہ اندھیرا تھا اور باہر لان پر تیز روشنی اس لیے میں نے کسی خاص
احتیاط کی ضرورت محسوس کیے بغیر اس روزن سے آنکھ لگا دی۔ لان پر کئی قدم کے فاصلے پر
اس وقت ایک محافظ دونوں ہاتھوں سے اسٹین گن سنبھالے اس طرح گزر رہا تھا جیسے دشمن
بس اس کے سامنے ہی ہے اور وہ اگلے قدم پر اس کا جسم چھلنی کرنے جا رہا ہے۔
مجھے اس کے انداز پر ہنسی آتے آتے رہ گئی لیکن دوسرے ہی لمحے میں یہ دیکھ کر
تشویش زدہ ہو گیا کہ آنکھوں کے سوا اس کے جسم کا کوئی حصہ اس حالت میں نظر نہیں آرہا
تھا کہ اس پر ڈارٹ گن کی سوئی اثرانداز ہو سکتی۔ اس کا لباس تو تھا ہی موٹا اور دبیز لیکن
اس نے چہرے پر بھی برفانی موسم میں پہنی جانے والی موٹی فر کی وہ نقاب نما ٹوپی پہنی ہوئی
تھی جو سر سے لے کر گردن تک آنکھوں کے سوا ہر چیز کو ڈھانپ لیتی ہے' ہاتھوں پر چرمی
دستانے تھے۔
اس کا مطلب تھا کہ انہوں نے محافظوں کی لاشوں کا اچھی طرح معائنہ کیا تھا اور وہ
ان کی موت کے سبب سے آگاہ ہو چکے تھے۔ انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ ان محافظوں کو
ڈارٹ گن سے ہلاک کیا گیا تھا' اس لیے انہوں نے اپنے بچاؤ کا انتظام کر لیا تھا اور اس
قدر مستعد نظر آ رہے تھے۔

میرے خیال کی جلد ہی تصدیق ہو گئی جب باقی تین محافظ بھی یکے بعد دیگرے میرے سامنے سے گزرے۔ ان کے بھی چہروں پر فرکی نقاب اور ہاتھوں پر چرمی دستانے نظر آرہے تھے بلکہ ایک محافظ کو غالباً فرکی ٹوپی میسر نہیں تھی تو اس نے کمبل کا کوئی ٹکرا چہرے، گردن اور سر کے گرد لپیٹا ہوا تھا۔ ان میں سے ایک تو یوں کھڑکی کی طرف دیکھتا ہوا گزرا جیسے اسے معلوم ہو کہ اس کے ایک روزن سے کسی کی آنکھ اسے دیکھ رہی ہے۔ وہ آگے بڑھ چکا تو میں ایک طویل سانس لے کر سینڈریلا کی طرف مڑا۔

"کیا حشمت اور اس کے ساتھی محافظوں کی لاشیں لے گئے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔" سینڈریلا نے جواب دیا۔ جس بگھی میں وہ آئے تھے، اس میں لاشیں ڈال کر لے گئے ہیں۔ حشمت خان اور اس کے دو خاص محافظوں کے سوا باقی سب پیدل گئے ہیں۔ بہرحال اب وہ سب حشمت کے ٹھکانے پر پہنچ گئے ہوں گے۔"

دفعتاً میں نے اپنے ایئرفون پر کیٹی کی سرگوشی سنی۔ "منصور، منصور۔ اگر میری آواز تم تک پہنچ رہی ہے تو غور سے سنو۔ ابھی ابھی مسلح محافظ میری کوٹھڑی کے دروازے سے ہٹ کر کسی کام سے گیا ہے تو میں اپنی آواز تم تک پہنچانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ مجھے حشمت خان کے مکان کے تہہ خانے میں پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ اس کا ذاتی عقوبت خانہ معلوم ہوتا ہے۔ میرے اردگرد کی کوٹھڑیوں میں بہت سے مرد اور عورتیں ناگفتہ بہ حالت میں قید ہیں۔ مجھے جیسے ہی یہاں پہنچایا گیا، ویسے ہی حشمت خان اپنے ساتھیوں کو لے کر تمہاری تلاش میں نکل گیا تھا اور میرے بارے میں کہہ گیا تھا کہ مجھ سے وہ واپس آکر خود ہی نمٹے گا۔ مجھے لگتا ہے منصور کہ مجھ پر بہت زیادہ تشدد کیا جائے گا۔ اگر پہنچ سکتے ہو تو میری مدد کو پہنچو اور اگر اب اس دنیا میں ہماری ملاقات نہ ہو سکے تو میری کوتاہیوں کے لیے مجھے معاف کر دینا اور اگر مجھ سے کچھ اچھائیاں سرزد ہوئی ہوں تو ان کے حوالے سے مجھے اچھے الفاظ سے یاد رکھنا۔"

یہ سب کچھ سننے کے دوران میرے اعصاب پر تناؤ سا طاری رہا۔ کیٹی اس قسم کی باتیں کرنے والی لڑکی نہیں تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ مایوسی نے اس پر غلبہ پا لیا تھا جبکہ میں پہلے کی نسبت زیادہ پرامید ہو چکا تھا۔ اپنا کام مجھے زیادہ آسان محسوس ہونے لگا تھا لیکن یہ بات میں اسے نہیں بتا سکتا تھا، اسے تسلی نہیں دے سکتا تھا کیونکہ میرے پاس ٹرانسمیٹر کا صرف ریسیونگ سیٹ تھا۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ کاش میں نے محض چند پرزوں کا اضافہ کرکے اپنے سیٹ کو پیغام پہنچانے کے قابل بھی بنوا لیا ہوتا لیکن اس وقت میرا خیال تھا کہ اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ صرف کیٹی کی آواز سنتے رہنا ہی میرے لیے کافی ہوگا۔

دفعتاً میں نے دوبارہ کیٹی کی آواز سنی۔ "یہ لو...وہ آگئے..."

ساتھ ہی ایک کرخت آواز سنائی دی۔ "اے لڑکی....! یہ تم لاکٹ ہونٹوں سے لگائے کیا باتیں کر رہی تھیں؟ ادھر لاؤ....ذرا دکھاؤ مجھے...." یہ آواز حشمت خان کی بہرحال نہیں تھی۔

"نہیں....نہیں۔" کیٹی کی خوفزدہ سی آواز سنائی دی۔ "یہ لاکٹ مجھ سے مت چھینو۔ یہ میرے ایک پیارے دوست کی نشانی ہے۔"

"لیکن بستی کے گیٹ پر محافظوں کو تم نے بتایا تھا کہ یہ تمہیں کھٹمنڈو کی ایک گلی میں پڑا ملا تھا۔ تیسری بار پوچھا جائے تو شاید تم کچھ اور سناؤ گی۔ ویسے تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ہم اس لاکٹ کو پہچانتے ہیں۔"

اس پر ایک قہقہہ سنائی دیا جو یقیناً حشمت خان نے لگایا تھا۔ اس کے بعد کیٹی کی آواز سنائی نہیں دی البتہ کھٹ پٹ کی چند آوازوں کے بعد وہی کرخت آواز ابھری۔ دیکھا باس یہ اندازہ درست ہی تھا۔ اس میں ٹرانسمیٹر پوشیدہ ہے۔"

لاؤ ذرا اسے ہم بھی استعمال کرکے دیکھیں۔ حشمت خان نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

بیچارے اپنی دانست میں بڑی جدید چیز لے کر آئے ہیں۔ پھر وہ کھنکار کر بولا۔ "اس لڑکی کے ساتھ آنے والے اجنبی! اگر تمہیں اس لڑکی سے ذرا بھی لگاؤ ہے یا اس کی جان کی پروا ہے تو دس منٹ کے اندر اندر اپنے آپ کو میرے حضور پیش کر دو ورنہ اس لڑکی کی شہ رگ کاٹ دی جائے گی۔ میرے ہاں پہنچنے کے لیے تم بستی میں نظر آنے والے کسی بھی فرد سے کہہ دینا کہ تمہیں منوچی کے گھر پہنچا دیا جائے۔ وہ تمہیں میرے دروازے تک چھوڑ جائے گا۔ یاد رکھنا۔ "ٹھیک دس منٹ۔" اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔

"کیا بات ہے تم یکلخت خاموش ہو گئے ہو؟" سینڈریلا نے اندھیرے میں سرگوشی کی۔

"میں تمہاری صورت نہیں دیکھ پا رہی مگر محسوس کر رہی ہوں کہ تم یکلخت مضطرب ہو گئے ہو؟ کیا ٹرانسمیٹر پر کوئی بری خبر سنائی دی ہے؟"

"تمہارے خیال میں کیا ہم اس وقت اچھی خبریں سننے کی پوزیشن میں ہیں؟"

میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔ حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ میری مسکراہٹ نہیں دیکھ سکے گی۔ پھر میں نے اسے تیزی سے بتایا کہ میں نے ٹرانسمیٹر پر کیا سنا ہے۔ اس کے بعد میں نے کہا، اب شیر کو کچھار سے باہر آنا پڑے گا۔ سینڈریلا! میری ماں نے مجھے وصیت کی تھی کہ میں بیک وقت شیر کی طرح بہادر بننے کی بھی کوشش کروں اور لومڑی کی طرح مکار بھی۔ میں اب ان دونوں خصوصیات کو ساتھ لے کر چلنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن حشمت خان کا پیغام سننے کے بعد میرے اندر کی لومڑی کسی کھوہ میں جا سوئی ہے اور صرف شیر باہر رہ گیا ہے۔ حشمت خان کے چھپے ہوئے تمسخر نے جیسے میرے اندر سینے میں کسی آتش فشاں کا دہانہ کھول دیا ہے، اس کے للکارنے کا انداز بتاتا ہے کہ وہ مجھے بہت ہی حقیر

انسان سمجھ رہا ہے۔ وہ خود مافیا کا ایجنٹ ہے اور شاید اس نے مجھے بھی مافیا کے کسی گھٹیا ایجنٹ کی طرح کوئی موقع پرست' اچکا اور بدمعاش سمجھا ہے۔ میں اسے بتانے جا رہا ہوں کہ میں کون ہوں' کیا ہوں۔ بخدا میں اسے بیٹی سے بدسلوکی کرنے' تمہارے شوہر کی زندگی سے کھیلنے اور اس بستی کے معصوم لوگوں کو آلہ کار بنانے کی بڑی بھیانک سزا دوں گا۔"

"تم جذباتی ہو رہے ہو۔" وہ مضطربانہ انداز میں میرے ساتھ ہی اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کی انگلیاں سختی سے میری بازوؤں پر جم گئیں۔ اس کی گرفت میں مردانہ سختی تھی۔

"ایک عرصے بعد تو مجھ پر جذباتیت غالب آگئی ہے۔" میں نے آہستگی سے اس کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔ "اب شعلہ بھڑک ہی اٹھا ہے تو اس سے کوئی کام لینے دو۔"

"تمہیں شاید احساس نہیں کہ وہ تمہارے لیے چارہ پھینک رہا ہے۔ وہ لڑکی کو اتنی جلدی ہلاک نہیں کرے گا۔" سینڈریلا نے گویا مجھے سمجھایا۔

"مجھے معلوم ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "میں اس کے باوجود اس کے جال میں جا رہا ہوں۔ اسے یہ بتانے کے لیے کہ لومڑیاں خواہ تعداد میں کتنی ہی کیوں نہ ہوں' شیر کو قابو میں نہیں کر سکتیں۔"

"وہی جذباتی اور افسانوی باتیں....." سینڈریلا قدرے بیزاری سے بولی۔ میں کہتی ہوں....."

"تم کچھ بھی مت کہو۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ مجھے صرف حشمت کے گھر تک پہنچنے کا محفوظ راستہ بتا دو' پھر دیکھو کیا ہوتا ہے۔" وہ ایک لمحے تک خاموش رہی' پھر گہری سانس لے کر بولی۔ "ہمارے گیٹ کے عین سامنے پتھریلی سڑک کے وسط میں پتھر کا ایک بلاک تمہیں علیحدہ ہی رکھا نظر آئے گا۔ اس میں آہنی کنڈا بھی لگا نظر آئے گا۔ اس بلاک کو اٹھا کر اطمینان سے نیچے اتر جانا۔ وہ گٹر لائن جیسا ایک پائپ ہوگا لیکن بالکل صاف ستھرا اور خشک۔ اس میں تمہیں ذرا جھک کر چلنا پڑے گا اور اترتے وقت ذرا سمت کا خیال رکھنا کہ ہمارے گیٹ کی عین مخالف سمت میں چلنا۔ دائیں ہاتھ کی طرف نہیں۔ جہاں پہنچ کر پائپ لائن نما یہ چوکور سرنگ ختم ہو جائے' وہیں تمہیں ایک اور بلاک ہٹانا پڑے گا۔ تم جہاں نکلو گے' وہاں تمہارے سامنے ہی حشمت خان کے مکان کی عقبی دیوار ہوگی۔ شرافت بھی وہاں رہتا ہے۔"

"یہ سرنگ جس کے متعلق تم بتا رہی ہو' درحقیقت ہے کیا؟" میں نے پوچھا۔

"درحقیقت یہ پتھر کی سلوں سے بنائی گئی ایک ٹینکی ہے جو کئی گلیوں میں پھیلی ہوئی ہے۔"

سینڈریلا نے بتایا۔ برفباری کے دنوں میں اس میں پانی ذخیرہ کیا جاتا ہے کیونکہ جب درجہ حرارت نقطہ انجماد سے بھی گر جاتا ہے تو پانی کہیں بھی رکھا جائے' جم جاتا ہے اور اس

زمین دوز ٹینکی میں نہیں جمتا۔ افغانستان وغیرہ میں تو اسے کاریز کہتے ہیں' یہاں اسے ڈبلائی کہا جاتا ہے۔

میں نے نیفے میں اڑسی ہوئی اسٹین گن نکال کر دیوان کے نیچے رکھی اور سینڈریلا کو ہدایت کی۔ "اس کا استعمال مت شروع کرو۔ فی الحال شور شرابے کی ضرورت نہیں۔"

گن رکھ دینے کے بعد میں نے اپنے آپ کو کافی ہلکا پھلکا سا محسوس کیا۔ وہ اب تک میری آزادانہ نقل و حرکت میں رکاوٹ بن رہی تھیں۔ میں نے اپنا مخصوص ساخت کا خنجر نکالا اور ایک بار پھر کھڑکی کے روزن سے آنکھ لگا کر دیکھا۔ ایک گارڈ مکان کے کونے تک پہنچ چکا تھا اور دوسرا میرے اندازے کے مطابق دوسرے کونے سے نمودار ہونے والا تھا۔

میں نے آہستگی سے دروازہ کھولا اور تاریکی کی پٹی ہی میں رہتے ہوئے کونے کے قریب دیوار سے چپک گیا۔ میں یہاں کچھ ایسی محفوظ پوزیشن میں نہیں تھا۔ مسلح محافظ اگر موڑ عبور کرنے کے بعد دیوار کی طرف دیکھتا تو نہایت آسانی سے مجھے بھی دیکھ سکتا تھا اور میرے خنجر کی جھلملاہٹ کو بھی لیکن دوسرا نگران جیسے ہی مکان کے کونے سے ایک قدم آگے آیا' میں نے اسے دیوار کی طرف دیکھنے کی مہلت دیئے بغیر روشنی ہی میں اس پر جھپٹ کر بائیں ہاتھ سے خنجر اس کے دل میں اتارا اور ساتھ ہی دائیں ہاتھ سے اس کی گردن پر کراٹے کا وار کیا۔ میرے خیال میں بیک وقت ان دونوں کارروائیوں کا نشانہ بننے والا نہ تو یہ اندازہ کر سکتا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے اور نہ اسے یہ سوچنے کی مہلت مل سکی کہ وہ مر رہا ہے۔ یہ عمل بس ایسے ہی تھا جیسے آپ اچانک جھٹکے سے کوئی ڈوری توڑ دیں' زندگی کی ڈوری۔

اس سے پہلے کہ اس کا بے جان جسم لان کی گھاس کو چھوتا' میں نے اسے اندھیرے میں گھسیٹ لیا اور دیوار کے ساتھ لٹا دیا۔ اس دیوار کے سائے میں آج نہ جانے کتنے بے جان جسموں کو پناہ گزین ہونا تھا۔ اگر میں اسے فوراً نہ گھسیٹتا تو شاید پیچھے سے مکان کے دوسرے کونے سے نمودار ہونے والا نگراں اسے گرتے دیکھ لیتا۔ چند سیکنڈ بعد وہ میرے سامنے نمودار ہوا اور اس کا بھی چشم زدن میں یہی حشر ہوا۔

تین چار منٹ کے اندر اندر ہی وہ چاروں ذبیحہ مرغیوں کی طرح دیوار کے سائے میں پڑے تھے۔ میں نے ان کی صورتیں تک دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔ میرے جسم میں دوڑتا ہوا خون جیسے آتش سیال بن گیا تھا۔ نس نس میں جیسے بجلیاں کوند رہی تھیں۔ میں نے ان میں سے دو کی اسٹین گنیں اٹھا کر کندھوں پر لٹکائیں۔ یہ جدید ساخت کی نہایت عمدہ جرمن اسٹین گنیں تھیں لیکن مجھے جو گن کھٹمنڈو میں لی چن نے دی تھی' وہ ان سے بھی عمدہ تھی۔ وہ اتنی بھاری اور سائز میں بڑی نہیں تھی لیکن محض دیکھنے میں ہی ان سے کہیں بہتر لگتی تھی۔ کچھ ایمونیشن بھی میں نے کمر سے باندھ لیا۔ لپک کر واپس میں کمرے میں آیا'

اس وقت تک سینڈریلا نے بتی جلا لی تھی' وہ یقیناً دیکھ چکی تھی کہ چاروں نگراں مرچکے تھے۔ میں نے سینڈریلا کی طرف دیکھے بغیر دیوان کے نیچے سے اپنی اسٹین گن نکالی' اسے دوبارہ نیفے میں اڑسا اور ایک بار پھر دروازے کی طرف لپکا۔

"میری بات تو سنو......" سینڈریلا نے میرا بازو تھامنے کی کوشش کی' میں نے رک کر اس کی طرف دیکھا تو اس نے گویا گھبرا کر ہاتھ کھینچ لیا۔

میں دوبارہ دروازے کی طرف لپکا اور اس سے نکل کر اس درندے کی طرح گیٹ کی طرف بھاگا جسے کئی دن بھوکا رہنے کے بعد شکار نظر آیا ہو۔ کاریز کے دہانے پر رکھی ہوئی موٹی سی پتھر کی سل مجھے فوراً ہی نظر آگئی۔ میں نے اس کا آہنی کنڈا پکڑ کر اسے اٹھایا تو وہ مجھے بے حد ہلکی پھلکی معلوم ہوئی۔ میرے اندازے کے مطابق عام طور پر اسے کم از کم چار افراد مل کر اٹھاتے ہوں گے۔

میں کاریز میں اترا اور سینڈریلا کی بتائی ہوئی سمت میں دوڑتا چلا گیا۔ کاریز میں پانی بے شک نہیں تھا لیکن نمی اور پھسلن کافی تھی۔ دو ایک مرتبہ پتھریلی دیواروں سے ٹکرانے کے بعد مجھے سنبھل کر چلنا پڑا۔

گہری تاریکی میں مجھے زیادہ دیر نہیں چلنا پڑا۔ جلد ہی میرے سامنے دیوار آگئی۔ اس مقام پر میں نے بازو بلند کرکے اوپر کو زور لگایا تو پتھر کا ایک مستطیل ٹکڑا اوپر کو اٹھتا چلا گیا۔ میں نے ایک جھٹکے سے اسے دور اچھال دیا۔ اس کے الٹ کر گرنے سے کافی آواز پیدا ہوئی لیکن اب جیسے میری زندگی میں احتیاط کا عمل دخل تو ختم ہی ہوگیا تھا۔

شاید اسی آواز کا ردعمل تھا کہ میں جیسے ہی اچھل کر مستطیل دہانے سے باہر آیا' میرا استقبال گولیوں سے ہوا۔ یہ میری خوش قسمتی یا پھر شاید میرے اچھل کر نکلنے کا نتیجہ تھا کہ میں گولیوں کی بوچھاڑ سے بچ گیا تھا۔ اگر میں نے اطمینان سے نکلنے کی کوشش کی ہوتی تو شاید میری کھوپڑی کے پرخچے اڑ جاتے کیونکہ گولیوں کی باڑ عین کاریز کے دہانے پر پڑی تھی۔

میں زمین پر لوٹتا ہوا کچھ دور چلا گیا۔ اتنا میں نے دیکھ لیا تھا کہ گولیوں کی یہ باڑ سامنے ہی نظر آنے والی ایک دیوار کی طرف سے آئی تھی جو غالباً ایک قلعہ نما مکان کی عقبی دیوار تھی۔ اس پر باقاعدہ قلعے کی دیوار کی طرح کنگورے بھی بنے ہوئے تھے۔ اس دیوار کے عقب میں تھوڑی سی روشنی تھی اور دیوار سے باہر کو جھانکتے ہوئے کچھ انسانوں کے اوپری دھڑ تاریک پرچھائیوں کی طرح نظر آرہے تھے۔ اس منظر سے قدیم زمانے کے انہی شاہی قلعوں کا تصور ذہن میں ابھرتا تھا جن کے گرد دشمنوں کی فوجیں محاصرہ ڈال لیتی تھیں اور محصور فوجی کبھی کبھی دیواروں کے عقب سے حفاظتی چوکیوں سے سر نکال کر ان پر تیر برسانے لگتے تھے۔

ابھی میں سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ روشنی کا ایک سیلاب سا امڈ پڑا جس نے اس سڑک اور اس کے دونوں اطراف کے نشیبی حصوں کو منور کردیا جس پر میں نے دوڑ لگائی تھی۔ اسٹین گن اس وقت میرے ہاتھ میں تھی لیکن میں جوابی فائر کرنے سے پہلے اپنی جگہ سے ہٹ جانا بہتر سمجھا۔ نشیب میں کچھ میں مجھے ایک تناور درخت نظر آیا تھا۔ میں نے اسی کے عقب میں پناہ لینے کے لیے چھلانگ لگائی تھی اور اسی چھلانگ نے ایک بار پھر مجھے بچا لیا۔ میں نے جو جگہ چھوڑی تھی' دوسرے ہی ثانیے اس جگہ گولیوں نے زمین کے خاصے بڑے ٹکڑے کو ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔ گولیاں صرف ایک ایک ثانیے کی تاخیر سے میرا تعاقب کر رہی تھیں اور یہ ایک ایک ثانیہ ہی میرے لیے زندگی کا پیغام بن رہا تھا۔

درخت کے تنے کی آڑ لیتے ہوئے میں نے سب سے پہلے روشنی کے ماخذ ختم کرنے کے لیے گولیاں برسائیں۔ وہ صرف تین فلڈ لائٹس تھیں جو دیوار پر مجھے ڈوبتے سورج کی طرح دہکتی نظر آئی تھیں۔ میری پہلی کوشش میں تینوں لائٹس چکنا چور ہوگئیں اور ساتھ ہی دیوار سے جھانکتی ہوئی پرچھائیاں بھی کچھ کم ہوگئیں۔ اس سے پہلے کہ باقی لوگ اپنے بچاؤ کے لیے کچھ کر پاتے یا کم از کم سر نیچے کرکے دیوار کے پیچھے پناہ ......ہی لے پاتے' میں نے ان کا بھی صفایا کردیا۔

فائرنگ تھم گئی تو میں مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے درخت پر چڑھ گیا۔ اس کے سوا مجھے کوئی ایسی جگہ نظر نہیں آرہی تھی جس پر چڑھ کر میں چار دیواری کے اندر کا منظر دیکھ سکتا۔ فی الحال دیوار کے قریب جانے کا خطرہ میں مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ درخت پر گویا میں بروقت ہی چڑھا تھا کیونکہ ابھی دو شاخوں پر پاؤں جما کر اور اسٹین گن صحیح طور پر تھام کر سنبھلا ہی تھا کہ چار دیواری کے اندر مجھے کئی افراد رائفلیں وغیرہ اٹھائے اس عقبی دیوار کی طرف دوڑتے نظر آئے۔ یہ غالباً وہ محافظ تھے جو مکان کے سامنے والے حصے کی طرف تعینات تھے۔ وہ اندھا دھند دوڑے چلے آرہے تھے۔

میں بے شک درندگی اور جوش سے تقریباً بے قابو ہو کر یہاں تک آیا تھا لیکن اس عالم میں بھی میری ایک حکمت عملی تھی اور وہ یہ کہ ان لوگوں میں بھگدڑ مچا دی جائے' انہیں اندھا دھند ہر قدم اٹھانے پر مجبور کر دیا جائے اور خود حتی الامکان پرسکون رہتے ہوئے ان کی بدنظمی اور افراتفری سے فائدہ اٹھایا جائے۔

اس سے پہلے کہ وہ لوگ دیوار تک پہنچ پاتے' میں نے انہیں چھلنی کرنا شروع کر دیا۔ کھلے لان نما حصے پر وہ صاف نظر آرہے تھے لیکن وہ بوکھلاہٹ میں اندازہ نہیں کر پا رہے تھے کہ گولیاں کدھر سے آرہی ہیں اور غالباً وہ اس غلط فہمی میں بھی مبتلا ہوگئے تھے کہ ان پر فائرنگ کرنے سے ایک سے زیادہ ہیں کیونکہ انہوں نے جوابی فائرنگ کی کوشش کی تو ان میں سے ہر ایک کی فائرنگ کا رخ مختلف تھا۔

انہیں زیادہ فائر کرنے کا موقع نہیں ملا- وہ ایک دوسرے پر ڈھیر ہوتے چلے گئے- ان میں سے ایک جو نسبتاً زیادہ چالاک اور ہوش مند معلوم ہوتا تھا' واپس بھاگنے لگا اور شاید وہ بچنے میں کامیاب بھی ہو جاتا لیکن عین اس وقت میرے نشانے پر آگیا جب وہ اصل عمارت کے موڑ پر پہنچ کر میری نظر سے اوجھل ہونے والا تھا-

اس کے بعد عمارت پر جیسے سکوت چھا گیا- مجھے حیرت سی ہونے لگی کہ کیا یہی وہ لوگ تھے جن کے بل پر حشمت اور شرافت اتنے طاقتور بنے ہوئے تھے یا ان کی طاقت کا راز محض یہ تھا کہ انہیں کسی نے چیلنج نہیں کیا تھا- کوئی ان کے مقابلے پر نکل نہیں سکا تھا؟ بعض استحصالی صرف اس قوت تک بہت طاقتور لگتے ہیں جب تک کوئی ان کے مقابلے پر نہیں اترتا-

میں نے شش و پنج یا انتظار میں مزید وقت ضائع نہیں کیا اور درخت سے اتر کر دیوار کی طرف دوڑا- گن کندھے سے لٹکا کر میں نے ایک مخصوص حصہ تلاش کرکے اچھل کر دیوار کا کنگرا پکڑا اور دوسری طرف کودتے ہوئے سینے کے بل زمین پر گر گیا- گن کندھے سے اتارتے ہی سب سے پہلے میں نے لان پر لگے ہوئے چھوٹے چھوٹے کھمبوں پر سے وہ آرائشی گلوب گولیوں سے اڑا دیئے جن کی وجہ سے اس حصے پر روشنی پھیلی ہوئی تھی- اس کے ساتھ ہی میں نے اپنی جگہ چھوڑ دی اور چھپکلی کی طرح تیزی سے کچھ آگے بڑھ کر تاریکی میں اندازاً ان دو کھڑکیوں پر فائرنگ کی جو چند لمحے پہلے مجھے نظر آئی تھیں-

آوازوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ گولیاں کسی ٹھوس شے سے ٹکرائی تھیں- کھڑکیوں کے پیچھے یا تو لوہے کے شٹرز تھے یا پھر پٹ نہایت موٹی اور ٹھوس لکڑی کے تھے' چند سیکنڈ تک کوئی ردعمل ظاہر نہ ہوا تو میں چوپایوں کی طرح دوڑتا ہوا اصل عمارت کے اس موڑ تک پہنچا جہاں اس شخص کی لاش پڑی تھی جس نے اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر موت سے فرار حاصل کرنے کی کوشش کی تھی-

اس موڑ سے آگے بھی روشنی تھی- میں نے اس حصے میں موجود آرائشی قمقموں کا بھی صفایا کر دیا- یہ سامنے کا حصہ تھا' ادھر کھڑکیوں کے وسط میں ایک دروازہ بھی موجود تھا- میں نے ان کھڑکیوں اور دروازے پر بھی بے تحاشہ گولیاں برسائیں لیکن نہ تو ان پر کوئی اثر ہوا اور نہ ہی کوئی جوابی کارروائی عمل میں آئی- اس وقت لان کے صرف ایک گوشے کو چھوڑ کر تمام بیرونی حصہ تاریکی میں ڈوب چکا تھا اور اصل عمارت میں تو کوئی روزن' کوئی کھڑکی ایسی نظر ہی نہیں آرہی تھی جس سے روشنی کا کوئی سراغ ملتا ہو-

پوری عمارت بس ایک جناتی محل سرا کی طرح سر اٹھائے کھڑی تھی- میری نہ جانے کونسی حس مجھے کچھ کچھ مضطرب تو کر رہی تھی کہ کوئی آنکھ ان ٹھوس دیواروں کے عقب سے مجھے دیکھ رہی ہے لیکن اگر کوئی مجھے دیکھ رہا تھا تو اس نے مجھے ٹھکانے لگانے کی کوشش

کیوں نہیں کی تھی؟ وہ مجھے اتنا کھل کھیلنے کی مہلت کیوں دے رہا تھا؟

ادھر میں ......اپنی کوششوں سے دراصل یہ تاثر دینے میں مصروف تھا کہ حملہ آور تنہا نہیں بلکہ عمارت کو کئی افراد نے گھیرے میں لے رکھا ہے لیکن مجھے خود بھی احساس تھا کہ میں اپنی اس کوشش میں کچھ زیادہ کامیاب نہیں تھا-

اسی اثناء میں مجھے دور کہیں سے بہت سے آدمیوں کی ملی جلی آوازیں سنائی دیں- ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حشمت خان کے مکان پر فائرنگ کے ہنگامے کی وجہ سے بہت سے لوگ گھروں سے نکل آئے تھے یا جو پہلے ہی نکلے ہوئے تھے' وہ بھی اسی طرح متوجہ ہو گئے تھے اور چیخ چیخ کر ایک دوسرے کو اسی طرف چلنے کا مشورہ دے رہے تھے- چیخ و پکار کے دوران میں نے انہیں بار بار منوچی منوچی کہتے سنا-

میں وہیں زمین سے چپک کر ساکت ہو گیا- کیا بستی ... سیل رواں اس مکان کا
رخ کر رہا تھا؟ شاید اسی لیے مکان کے اندر حشمت ... ماندہ ساتھی کوئی
جوابی کارروائی نہیں کر رہے تھے کہ بستی والے ... یعنی میری
تکا بوٹی کر ڈالیں اور اس ٹکراؤ میں اگر جانے ...
میرے لئے یہ امر بڑی تشویش کا
تھے اور اپنی سادگی اور کم علمی کی
اور زیراطاعت تھے- ان پر گ...
دفعتاً" سینڈریلا کی ...



سینڈریلا کی آواز بھی ہجوم کے قریب ہی کہیں سے آئی تھی اور یہ شاید میری کسی
نامعلوم حس کا ہی کمال تھا کہ میں نے اس آواز کو پہچان لیا تھا ورنہ یہ اس آواز سے تو
قطعی مختلف تھی جو میں نے سینڈریلا کے گھر میں سنی تھی۔ جو آواز اب میں سن رہا تھا'
گرجدار اور خطیبانہ تھی۔ نسوانیت کے باوجود اس میں زبردست رعب اور دبدبہ تھا۔
الفاظ میری سمجھ میں نہیں آرہے تھے لیکن انداز سے میں سمجھ سکتا تھا کہ وہ لوگوں کو اپنی
طرف بلا رہی تھی۔ اس کی آواز بلند ہوتے ہی دیگر آوازوں کا شور یکلخت ختم ہو گیا تھا۔
سینڈریلا خاموش ہوئی تو ایک گونجدار مردانہ آواز سنائی دی۔ سینڈریلا نے جو کچھ کہا
تھا' یہ آواز غالباً اس کا انگریزی میں ترجمہ کر رہی تھی۔ وہ یہ ترجمہ شاید گنتی کے چند افراد یا
پھر صرف مجھے ہی سنانے کے لیے کیا جا رہا تھا۔ وہ شخص اعلان کر رہا تھا۔
"بستی کے لوگو! تمہارے لیے آسمانوں سے خوشخبری آئی ہے۔ دھماکوں اور گولیوں کی
آواز سے خوف یا پریشانی میں مبتلا ہونے کی کوئی ضرورت نہیں......دراصل یہ ایک بہت
بڑے فریب کا پردہ چاک ہو رہا ہے۔ جھوٹ اور دھوکہ بازی کا ایک خوفناک ڈرامہ اپنے
اختتام کو پہنچ رہا ہے ......یہ ساری حقیقت تم لوگوں کے سامنے مقدس پائی کی اہلیہ بیان
کریں گی۔ سب لوگ فوراً میدان میں جمع ہو جائیں۔ کوئی شخص منوچی کے مکان کے قریب
نہ جائے......ورنہ آسمانی بلائیں اسے اپنی گرفت میں لے لیں گی......کیونکہ اس وقت دیوتا
منوچی سے ان تمام دھوکوں کا حساب لے رہے ہیں جو اس نے گزشتہ تین برسوں میں اس
بستی کے معصوم لوگوں کو دیئے ہیں۔ مقدس پائی کی اہلیہ اڑھائی سال کی قید تنہائی سے آزاد
ہو کر بڑے میدان کی طرف جا رہی ہیں۔ وہاں تم لوگ مقدس پائی کا دیدار بھی کر سکو گے
اور اپنی آنکھوں سے دیکھ سکو گے کہ گزشتہ اڑھائی برسوں میں تم نے ان کی خبر نہ لی تو اس
دوران ان پر کیا بیتی ......سب لوگ جلد از جلد بڑے میدان میں پہنچیں۔ جو شخص منوچی
کے مکان کی طرف جائے گا' اس کی زندگی کی ضمانت نہیں دی جا سکے گی۔ آسمانی بلاؤں کے
غیظ و غضب کا رخ اس کی طرف بھی بڑھ جائے گا۔"
میں نے یہ سب کچھ سن کر بے آواز طریقے سے اطمینان بھری سانس لی۔ حشمت خان
اور شرافت خان نے تو اس وادی میں ڈھائی تین سال اپنا ڈرامہ بڑی کامیابی سے چلایا تھا

لیکن سینڈریلا کو بھی جیسے ہی موقع ملا تھا' اس نے جوابی ڈرامہ بڑی عمدگی سے شروع کیا تھا اور صورتحال کو سنبھال لیا تھا۔ اس نے گویا مجھے موقع فراہم کر دیا تھا کہ "لو میاں منصور! عام آدمیوں کے ہجوم کو تو میں ایک طرف لے جاتی ہوں' اب تم جو تیر چلا سکتے ہو' چلا لو۔"

میں نے ایک بار پھر لوگوں کا شور بلند ہوتے سنا لیکن یہ شور بتدریج مدھم پڑتا جا رہا تھا۔ جیسے ہجوم کا رخ کسی اور طرف کو ہو گیا ہو۔ اس سے میرے حوصلے بلند ہو گئے۔ میں نے ایک بار پھر مکان کی کھڑکیوں اور دروازوں پر فائرنگ شروع کر دی۔ میں ایک بار چوہے کو بل سے نکال لینا چاہتا تھا لیکن چوہا بھی بڑا مکار تھا۔ معلوم نہیں کہاں دم سادھ کر بیٹھا ہوا تھا۔

میں اب اس بلند و بالا دروازے کی سیدھ میں تاریکی میں زمین سے چپکا ہوا تھا جو اس عمارت کا واحد دروازہ معلوم ہوتا تھا۔ میں نے چند سیکنڈ اس دروازے پر گولیاں برسائیں لیکن دروازہ یقیناً ٹھوس لوہے کا تھا کیونکہ اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا اور گولیوں کے ٹکرانے سے بے تحاشہ چنگاریاں بھی اڑی تھیں۔

میں اس وقت تقریباً پوری عمارت کے گرد چکر کاٹ چکا تھا اور مجھے کوئی ایسی جگہ نظر نہیں آرہی تھی جس سے میں اندر گھسنے کی کوشش کر سکتا اور یہ بات میرے لیے بے حد پریشان کن تھی ......آخر میں تنہا انسان کب تک اس عمارت کے چاروں طرف نظر رکھ سکتا تھا۔ جیسے اس وقت میں اس کے سامنے والے حصے کی طرف موجود تھا تو عقبی حصے کی طرف سے کوئی بھی کھڑکی کے راستے فرار ہو سکتا تھا۔ مجھے اس کا علم کافی دیر بعد ہوتا یا شاید نہ ہوتا۔

میرے پاس صابن کی ٹکیہ کے برابر ایک بم موجود تھا جو میرے سینے سے بندھا ہوا تھا۔ یہ اپنے سائز سے قطع نظر نہایت خطرناک اور تباہ کن بم تھا لیکن اسے میں نے کسی انتہائی آڑے وقت کے لیے بچایا ہوا تھا۔ ایک طرح سے وہ میرا آخری حربہ تھا' تاہم میں نے اس کی دھمکی دینے میں ......کوئی حرج نہ سمجھا۔

میں نے آہنی دروازے پر مزید کچھ گولیاں ضائع کیں۔ پھر للکارنے والے انداز میں کہا۔ "شرافت اور حشمت خان! یہ عمارت اس وقت چاروں طرف میرے ساتھیوں کے نرغے میں ہے۔ اگر تم ہتھیار ڈال کر باہر آجاؤ تو شاید وہ مسئلہ مذاکرات سے طے پا جائے جس کی خاطر میں تم پر حملہ آور ہوا ہوں......میں تمہیں صرف پانچ منٹ دوں گا۔ اس کے بعد ہم عمارت پر بم برسانے شروع کر دیں گے اور تم اپنے بچے کھچے ساتھیوں سمیت ملبے میں دفن ہو جاؤ گے۔"

میں نے محض دھمکی ہی دی تھی لیکن دوسری طرف سے سچ مچ ہی بم پھینک دیا گیا۔

میں نے اپنے حق میں اچھا کام یہ کیا تھا کہ بات ختم کرتے ہی اپنی جگہ چھوڑ دی تھی اور کافی آگے کھسک کر چیری کی ایک باڑھ کی اوٹ میں جا لیٹا تھا۔ اسی لمحے میں نے دروازے کے قریب ہی ایک کھڑکی کا شٹر بے آواز طریقے سے ذرا اوپر اٹھتے دیکھا۔ شٹر زیادہ نہیں کھلا اور میں نے قدرے لمبوتری ایک گیند سی ہوا میں اچھلتے دیکھی۔

یہ ایک چھوٹا ہینڈ گرنیڈ تھا جو عین اس جگہ پر جا کر گرا جہاں لیٹے لیٹے میں نے باپ بیٹے کو للکارا تھا۔ لان کی مٹی' ڈھیلے اور نہ جانے کس کس چیز کے ٹکڑے اڑتے ہوئے میرے اوپر سے گزر کر خاصی دور تک جا گرے۔ اگر میں نے اپنی موجودہ پوزیشن پر سینے کے بل لیٹا ہونے کے بجائے کھڑا ہوتا تو یقیناً زخمی ہوتا اور اگر سابق پوزیشن پر ہی ہوتا تو یقیناً میرے اعضاء بکھر چکے ہوتے۔

بہرحال اس سے ایک بات ظاہر تھی کہ اندر موجود افراد اگر مجھے دیکھ نہیں پا رہے تھے تو میری آواز ان تک ضرور پہنچ رہی تھی اور آواز ہی سے انہوں نے میری پوزیشن کا اندازہ کیا تھا۔ اس دوران کھڑکی کا جو شٹر گر چکا تھا' مجھے دوبارہ اٹھتا نظر آیا لیکن اس سے پہلے کہ کھڑکی سے کچھ باہر آتا' میں نے اس مختصر سے خلا میں گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ کھڑکی کا شٹر تو فوراً ہی گر گیا لیکن میں نے گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے ہم آہنگ ہو جانے والی ایک چیخ ضرور سن لی تھی۔

معاملہ طول پکڑتا جا رہا تھا۔ کچھ کر گزرنا ضروری ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے سینے سے چپکا ہوا تباہ کن بم علیحدہ کیا' اس پر لپیٹا ہوا ایک خاص ٹیپ کھولا' سیفٹی پن ہٹائی اور اسے کھڑکی پر دے مارا۔

احسان مرزا نے جب یہ بم صابن کے پیکٹ کی شکل میں میرے حوالے کیا تھا تو اس کی تباہ کاری کے متعلق اشارتاً بتایا تھا لیکن مجھے امید نہیں تھی کہ اتنا مختصر سا سادہ بم ایک بہت بڑی بکتربند گاڑی سے مشابہ اس عمارت کو اتنا نقصان پہنچائے گا اور اس طرح اس علاقے میں چند لمحے کے لیے زلزلہ سا برپا کر دے گا۔

دھماکے سے ایک بار تو میں بھی سٹپٹا گیا اور فوراً سانپ کی طرح رخ بدل کر پیچھے کو بھاگا۔ محفوظ فاصلے پر رک کر میں نے مڑ کر دیکھا۔ سامنے والی دیوار جو بلاشبہ کچھ دیر پہلے تک سیسہ پلائی ہوئی دیوار سے زیادہ مضبوط اور ٹھوس نظر آ رہی تھی' اس کا بیشتر حصہ اور اس کے ساتھ چھت کا بھی کچھ حصہ ملبے کا ڈھیر بن چکا تھا اور ایک طویل و عریض بھیانک خلاء منہ کھول چکا تھا۔

میرے خیال میں یہ پیش قدمی کے لیے موزوں ترین وقت تھا۔ اس خلا کے عقب سے کچھ کمروں کی نیم شکستہ دیواریں اور ایک آدھ دروازہ دکھائی دے رہا تھا لیکن جہاں تک میری نظر کام کر رہی تھی' کسی انسان کی موجودگی کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔

میں اٹھ کر جھکا جھکا اس طرف دوڑا۔ دیوار کے ملبے پر چڑھتے وقت میں نے اردگرد فائرنگ کر کے کچھ گولیاں ضائع کیں لیکن ان کا کوئی ردعمل ظاہر نہیں ہوا۔ ملبے کے دوسری طرف اتر کر میں نے دیکھا کہ دو مردوں کی مسخ شدہ لاشیں تو آدھی ملبے تلے دبی پڑی تھیں اور دو کی ان سے کچھ فاصلے پر پڑی تھیں جنہیں بظاہر کچھ زیادہ چوٹیں وغیرہ تو نہیں آئی تھیں جتنی آئی تھیں' وہ ان کی ہلاکت کے لیے کافی ثابت ہوئی تھیں۔

ان سے ذرا پیچھے نیم شکستہ کمرے کی پچھلی دیوار کے قریب ایک لڑکی برائے نام لباس میں پڑی زخمی حالت میں آخری سانسیں لے رہی تھی۔ اس کی گردن میں نجانے کس چیز کا ٹکڑا پیوست تھا۔ اس کا جسم ......اندھیرے میں برفی کی ڈلی کی طرح چمک رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد یہ جسم سرد ہونے والا تھا۔ اتنا مجھے اندازہ تھا۔ میں اس کے قریب رکا نہیں' تاہم میں نے مردوں کی لاشوں کو ایک نظر دیکھا مگر ان میں کوئی بھی حشمت یا شرافت نہیں تھا۔

میں نیم شکستہ کمرے کے عقبی دروازے کی طرف دوڑا جو نیم وا نظر آ رہا تھا۔ کسی ممکنہ شکنجے سے بچنے کے لیے میں نے دروازہ لات مار کر کھولا اور ساتھ ہی ایک طرف ہٹتے ہوئے اندھا دھند کمرے میں چاروں طرف گولیاں برسائیں۔ یہاں بھی کسی کی موجودگی کے آثار نظر نہ آئے۔ میں اس کمرے میں گھس پڑا' اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ فرنیچر بھی جوں کا توں تھا۔

میں اس سے گزر کر ایک ہال میں پہنچا۔ وہ بھی خالی تھا' ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عمارت سے زندگی کے آثار ہی مفقود ہو چکے ہیں لیکن ہال کے ایک کونے میں مجھے تنگ سی سیڑھیاں نیچے جاتی نظر آ گئیں۔ میں نے جھانک کر دیکھا' ان کے اختتام پر لکڑی کا ایک دروازہ تھا جو نہ صرف بند تھا بلکہ مجھے یقین تھا کہ وہ مقفل بھی تھا......میں واپس وہیں آیا جہاں میں نے لاشیں دیوار کے ملبے تلے دبی دیکھی تھیں۔ میری توقع کے مطابق یہاں مجھے ایک ہینڈ گرنیڈ محفوظ حالت میں پڑا مل گیا۔ یہ گرنیڈ اٹھا کر میں واپس اسی ہال کی طرف دوڑا۔ مجھے معلوم تھا کہ میرا اصل دشمن ابھی تہہ خانے میں محفوظ ہے اور وہاں شاید کچھ دشواریاں بھی میری منتظر ہیں لیکن اب منزل مجھے سامنے ہی نظر آ رہی تھی۔

راستہ وہی تھا ......جس سے میں پہلے بھی گزر کر اندر آیا تھا اور دوبارہ منہدم شدہ دیواروں کی طرف گیا تھا لیکن اس بار جیسے ہی میں واپس ہال میں پہنچا تو دو قدم چلتے ہی یکلخت جیسے میرے پیروں کے نیچے سے فرش کا کچھ حصہ غائب ہو گیا۔ میں نے سنبھلنے کی بہت کوشش کی لیکن جب انسان کے پیروں تلے زمین ہی نہ رہے تو وہ کیسے سنبھل سکتا ہے؟

اسٹین گن' بم سب کچھ میرے ہاتھوں سے چھوٹ گیا۔ غنیمت تھا کہ ابھی میں نے اس کی سیفٹی پن نہیں ہٹائی تھی ورنہ شاید میرے چیتھڑے اسی کی بدولت اڑتے۔ میں ایک تاریک خلاء میں نیچے کی طرف جا رہا تھا اور سب سے زیادہ تشویش کی بات یہ تھی کہ میں

ہال کے فرش کی سطح سے نیچے آتے ہی الٹا ہو گیا تھا یعنی اب میں سر کے بل نیچے جا رہا تھا اور کسی بھی لمحے میرا سر اس خلا کی تہہ سے ٹکرا کر پاش پاش ہو سکتا تھا۔ میں نے قلابازی لگا کر سیدھا ہونے کی کوشش کی لیکن مجھے قدرے تاخیر ہو گئی۔ کافی حد تک بچاؤ ہو جانے کے باوجود میرا سر ٹھوس فرش سے ٹکرا ہی گیا اور میرے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے' مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

مجھے ہوش ازخود نہیں آیا۔ پہلا احساس مجھے یہی ہوا کہ کوئی مجھے بالوں سے پکڑے میرے سر کو جھٹکے دے رہا تھا اور میرے چہرے پر پانی کے چھینٹے مار رہا تھا۔ میں نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی لیکن پپوٹے جیسے سیروں وزنی ہو گئے تھے۔ پھر میں نے ہاتھوں کو حرکت دینے کی کوشش کی تو احساس ہوا کہ وہ میری پشت پر بندھے ہوئے تھے۔

میں سر اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ یوں جھکا جا رہا تھا جیسے گردن کا منکا ہی سلامت نہ رہا ہو۔ بمشکل تمام آنکھیں ذرا کھلیں اور گردن کچھ سیدھی ہوئی تو احساس ہوا کہ میں دوزانو بیٹھا ہوا تھا۔ جسم پر صرف ایک بنیان اور شلوار نما پاجامہ رہ گیا تھا' شاید اسی لیے مجھے سردی محسوس ہو رہی تھی۔

میرا بٹھائے جانے کا انداز ایسا تھا جیسے میں کسی رومن شہنشاہ کا قیدی ہوں اور شہنشاہ کے یاد فرمانے پر مجھے گھسیٹ کر دربار میں لایا گیا ہو۔ میری گردن میں کئی من وزنی زنجیریں ہیں جن کے بوجھ سے گردن جھکی جا رہی ہے اور آداب شہنشاہی کے مطابق مجھے دوزانو بٹھایا گیا ہے۔

حتیٰ کہ جب میری نظر کچھ بہتر ہوئی تو مجھے اپنے سامنے ایک شہنشاہ بھی بیٹھا نظر آ گیا۔ پہلے تو یہ سب کچھ مجھے ایک واہمہ یا خواب محسوس ہوا لیکن میں نے سر کو جھٹکا دیا تو درد کی ایک شدید لہر اٹھنے اور معدوم ہونے کے بعد مجھے اس شہنشاہ کی صورت کچھ مانوس معلوم ہوئی۔

پھر اچانک ہی میرے ذہن نے کام کرنا شروع کر دیا۔ جیسے کسی برقی مشین کا سوئچ اتفاقاً آن ہو گیا ہو۔ میں نے اس شہنشاہ کو پہچان لیا۔ وہ حشمت خان تھا جو انتہائی رعونت سے ایک سجے سجائے اور تخت نما دیوان پر مخملیں گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا......اس کے جسم پر ایک زرق برق شاہانہ لبادہ تھا۔ میں نے فلم کی صورت میں اس کے جو دو روپ دیکھے تھے' ان میں سے ایک میں اس کا سر صفا چٹ تھا اور دوسرے میں بال تھے لیکن اس وقت اس کے سر پر ایک خوبصورت تاج تھا جس میں ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے پر صرف رعونت ہی نہیں آنکھوں سے بھی گویا خون ٹپک رہا تھا۔ وہ بڑے غیظ و غضب میں نظر آ رہا تھا اور وجہ غضب غالباً میں ہی تھا کیونکہ اس کی نظر مجھ پر ہی جمی ہوئی تھی۔

وہ شخص جو میرے بالوں کو پکڑ کر جھٹکے دیتے ہوئے ایک برتن [illegible] رہا تھا' اسی طرح اس کے چھینٹے مارے جا رہا تھا' مجھے سنبھلتے دیکھ کر قدرے پیچھے ہٹ[illegible]۔
میرے دائیں بائیں دو آدمی کھڑے تھے جن کے ہاتھوں میں ٹامی ۔ہو گیا ہوں۔ میرے میری ہی طرف تھا۔ ان دونوں آدمیوں کے چہرے ہر قسم کے تاثر سے نے سب سے بڑا وقت وہاں کل یہی افراد موجود تھے اور ان میں سے صرف وہ دو ہی اسلحہ بردار فراہم کر تھے۔ مجھے ہوش میں لانے والا اور حشمت خان نہتا ہی معلوم ہوتا تھا۔

میں غالباً زیادہ دیر بے ہوش نہیں رہا تھا اور اسی تہہ خانہ میں تھا جس میں داخل ہونے کی غرض سے میں اس کا دروازہ دھاکے سے اڑانے کے لیے گرنیڈ اٹھائے دوڑا آ رہا تھا۔ تہہ خانے کا دروازہ بھی شاید کھلا ہی تھا یا کسی اور راستے سے ہوا یہاں تک پہنچ رہی تھی کیونکہ فضا میں بارود کی ہلکی سی بو محسوس ہو رہی تھی۔

میں نے محسوس کیا کہ حشمت خان مجھ سے بات کرنے کے لیے اپنے غیظ و غضب پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ بالآخر وہ سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں کوئی خوفناک سزا دینے سے قبل میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آخر تم ہو کون اور تمہیں ایسا کیا دورہ پڑا تھا کہ تم نے پاگلوں کی طرح گھس کر میرا بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا؟“

میرا ذہن اس وقت کچھ زیادہ مستعد تو نہیں تھا لیکن رفتہ رفتہ کئی پہلوؤں پر بیک وقت سوچنے کی میری صلاحیت بحال ہو رہی تھی۔ سر میں اٹھتی ہوئی درد کی ٹیسیں اسی بحالی کے راستے میں کسی حد تک رکاوٹ بن رہی تھیں ورنہ یہ عمل شاید اس مختصر سے وقفے میں ہی مکمل ہو چکا ہوتا۔

”میرے خیال میں اب تمہارے سوال کا جواب دینے میں کوئی حرج نہیں۔“ میں نے لاپروائی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ”اس لیے بتا دیتا ہوں کہ مجھے احسان مرزا نے تمہیں تمہارے ساتھیوں سمیت نیست و نابود کرنے کا کام سونپا تھا اور بہت بھاری معاوضہ دیا تھا۔“

”بکواس کرتے ہو تم۔“ وہ گرجا۔ ”معاوضہ خواہ کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو لیکن معاوضے پر کام کرنے والے اتنی بے جگری سے موت کے منہ میں نہیں کودتے۔ وہ صرف محفوظ کام کرتے ہیں۔ وہی بازی کھیلتے ہیں جس کے جیتنے کا یقین ہوتا ہے۔“

”کسی حد تک تمہارا نظریہ درست ہے۔“ میں نے تسلیم کیا۔ ”میں نے اس کام کو صرف بھاری معاوضے کے لالچ میں ہی نہیں' ایک چیلنج سمجھ کر ہی قبول کیا تھا کیونکہ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ تم نوابزادہ شرافت علی خان کے بیٹے ہو۔“

میں نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے پر کسی قدر تناؤ آ گیا تھا۔

”کس نے بتایا تمہیں؟“ وہ غرایا۔

اور کس نے؟" میں نے کہا۔ "میں اس کام کی حامی نہیں بھر
ہاں کے فرش کی سطح سے سنا کہ تم نوابزادہ شرافت علی خان کے بیٹے ہو تو میں نے یہ چیلنج
اور کسی بھی لمحے میرا
لگا کر سیدھا ہو نے پوچھا۔
کے باوجود م باپ کی طرف میرے باپ کی زندگی کا قرض نکلتا ہے۔" میں نے اپنے لہجے
میں ش لامکان تلخی سمو دی۔ "میرے باپ نے تمہارے باپ کے ذاتی قید خانے میں
ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دم توڑا تھا اور میں نے اپنی ماں سے وعدہ کیا تھا کہ میں اپنے باپ کی اس
ایک ایک سانس کا انتقام لوں گا جو اس نے تمہارے باپ کے قید خانے میں لی ہوگی۔ میں
ایک مدت تک تمہارے باپ کو ڈھونڈتا رہا س کی شہ رگ کاٹنے کے لئے میں نے خاص
طور پر ایک خنجر رکھا ہوا تھا لیکن مجھے تمہارے باپ کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ پھر اتفاقاً ہی
احسان مرزا سے تمہارا صفایا کرنے کی بات چلی اور تمہاری اصلیت معلوم ہونے پر میں نے
ٹھیکہ قبول کر لیا۔"

"لیکن تم ہو کون؟" حشمت خان کے لہجے میں اب وہ گھن گرج نہیں رہی تھی۔ اس کی جگہ خفیف سی دلچسپی جھلک آئی تھی۔

"کیا اب بھی بتانے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ "ظاہر ہے "ٹھیکیدار" ہوں۔ موت و حیات کی کشمکش کے ٹھیکے لینا میرا پیشہ ہے ...... لیکن میرا معاوضہ کوئی کوئی ہی ادا کر سکتا ہے اور میں ان کاموں میں ہاتھ ڈالتا ہوں جن سے میری لائن کے ہر آدمی نے انکار کر دیا ہوتا ہے۔"

"تمہارا نام؟" اب تو اس کا لہجہ تقریباً نارمل ہی ہو چکا تھا البتہ لہجے سے رعب و دبدبے کا اظہار کرنا شاید اس کی عادت بن چکی تھی' وہ ہنوز برقرار تھی۔

"طاہر شاہ......" میں نے جواب دیا۔

"توجہ سے میری بات سنو طاہر شاہ!" وہ اب اچھی طرح سنبھل کر بیٹھ گیا۔ "تم نے میرے ساتھ جو کچھ کیا ہے اور اپنی احمقانہ سوچ کی پٹڑی پر چلتے ہوئے مجھے جتنا بڑا نقصان پہنچایا ہے' اس پر میرا ارادہ تو یہی تھا کہ تم سے کوئی بات کیے بغیر تمہارے لیے قسطوں میں موت کی سزا کا حکم صادر کر دوں۔ قسطوں میں موت کا مطلب میرے ہاں یہ ہوتا ہے کہ پہلے انسان کی انگلی کاٹی جاتی ہے' پھر دوسری ...... انگلیوں کے بعد ناک' کان اور آنکھ وغیرہ کا نمبر آتا ہے...... ایک ایک کرکے تمام اعضاء کٹتے رہتے ہیں لیکن گردن کا نمبر مشکل ہی سے آیا تا ہے۔ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ تمہارے لیے اس سزا کا حکم صادر کرنے سے پہلے میں نے تم سے دو دو باتیں کرنے کا فیصلہ کر لیا اور یوں کئی پہلو سامنے آگئے۔"

حشمت خان کے چہرے پر ایک مکارانہ سی مسکراہٹ رینگ آئی تھی۔ میرے لیے یہ

اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ جس طرح میرا ذہن مستعدی سے کام کر رہا تھا' اسی طرح اس کے شیطانی ذہن کے کل پرزے بھی تیزی سے حرکت میں مصروف تھے۔

"میں اب صورتحال پر ایک نئے زاویئے سے غور کرنے پر مجبور ہوگیا ہوں۔ میرے تقریباً تمام ساتھی مر چکے ہیں' رائے عامہ میرے خلاف ہو چکی ہے۔ تم نے سب سے بڑا نقصان نادانستگی میں مجھے یہ پہنچایا ہے کہ اس سینڈریلا کی بچی کو باہر آنے کا موقع فراہم کر دیا۔ وہ گویا ایک عفریت تھا جسے میں نے غار میں بند کیا ہوا تھا' جن تھا جسے بوتل میں قید کر رکھا تھا اور ٹھکانے لگانے کے لیے مناسب موقع کا انتظار کر رہا تھا لیکن اب میں پچھتا رہا ہوں کہ میں ساری مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر یہ کام کر ہی گزرا ہوتا تو بہتر تھا۔ بڑی چوک ہوئی مجھ سے۔ بہرحال یہ وقت غلطیوں پر ہاتھ ملنے کا نہیں ہے۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں عار نہیں تم ایک بے مثل آدمی ہو۔ میں جس بحران میں پھنس گیا ہوں' اس میں میرے لیے تمہاری قدر و قیمت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ اب اگر تم عقل استعمال کرتے ہوئے میرے ساتھ مل جاتے ہو تو میں وادی میں اپنی پوزیشن بحال کرنے کی ازسرنو جدوجہد کر سکتا ہوں۔ سینڈریلا عنقریب ہی جس سیل رواں کو لے کر میری اس پناہ گاہ کا رخ کرنے والی ہے' اس کا سامنا کرنے کی کوئی فوری حکمت عملی تیار کر سکتا ہوں اور ہاری ہوئی بازی کو جیتنے کی کوئی صورت نکال سکتا ہوں۔ ہم دوبارہ اپنے اپنے پاؤں مضبوط کر چکیں تو اس کے بعد تم چاہو تو اچھے دوستوں کی طرح یہاں سے رخصت ہو سکتے ہو اور اپنے انتقام کے اصل ہدف یعنی میرے ابا حضور کی تلاش کا کام ازسرنو شروع کر سکتے ہو۔ میں اس معاملے میں قطعی غیرجانبدار رہوں گا۔ اصولاً تو تمہیں ان کی زیادتیوں کا حساب انہی سے طلب کرنا چاہیے۔ اگر تم ان کا سراغ لگانے میں ناکام رہتے ہو اور ان کے گناہوں کا بوجھ کسی اور طرف منتقل کر دیتے ہو تو یہ تمہارے بہادر ہونے کی نہیں' کمزور اور تن آسان ہونے کی نشانی ہے ......بولو کیا کہتے ہو؟"

میں نے نہایت ہی محتاط انداز میں یہ تاثر دینے کی خفیف سی کوشش کی کہ میں الجھن میں پڑ گیا ہوں۔

"جلدی بولو......وقت بہت کم ہے۔" اس نے قدرے مضطرب سے لہجے میں کہا۔ "میری یہ پناہ گاہ اب کچھ زیادہ محفوظ نہیں رہی۔"

"کیا میں زندگی کے توشے سے چند فاضل سانسیں چرانے کے لیے واقعی تمہارے جھانسے میں آجاؤں؟" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ پھر پوچھا......

"اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ بازی پلٹنے کے بعد تم دھوکے سے مجھے راہ سے نہیں ہٹا دو گے؟"

"میں نے جو کچھ بھی کہا ہے' وہ ایک بہادر آدمی کا دوسرے بہادر آدمی سے وعدہ

ہے۔" وہ مسکرایا۔ "اور پھر آزاد حالت میں تم اتنی آسانی سے مرنے والی چیز نہیں ہو......میں نے تمہیں تول لیا ہے۔"

میں نے ایک لمحے توقف کیا، پھر ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "بالفرض میں تمہارے ساتھ مل جاتا ہوں اور بازی بھی پلٹ جاتی ہے تو مجھے جان بچ جانے کے زبانی وعدے کے علاوہ کیا حاصل ہوگا؟"

"اپنے پیشے میں پکے ہو۔" وہ مسکرایا۔ "جان کو اتنی اہمیت نہیں دے رہے جتنی مال کو دے رہے ہو۔ بہرحال......مال کے سلسلے میں تو یہی کہہ سکتا ہوں کہ احسان مرزا سے بھی معاوضہ تم نے پیشگی ہی لے لیا ہوگا اور تمہاری ہی باتوں سے ظاہر ہے کہ وہ کچھ کم نہیں رہا ہوگا......لیکن یہاں تم جتنی دولت لے جا سکتے ہو، اتنی تم نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی ہوگی۔ یہ خطہ نہ جانے کتنی شکلوں میں دولت اگلتا ہے اور شکر ہے کہ مہذب دنیا کے قدم ابھی یہاں تک نہیں پہنچے ......میں کھلے دل کا آدمی ہوں۔ تمہیں جو کچھ اٹھا کر لے جانے کی اجازت دوں گا، اسے دیکھ کر تمہاری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی۔"

"مجھے منظور ہے۔" بالآخر میں نے گویا فیصلے پر پہنچتے ہوئے کہا۔

"بہت خوب......" اس نے جوشیلے سے انداز میں چٹکی بجائی۔ "اب یہ بھی بتا دو کہ وہ لڑکی کون ہے جو وادی کے گیٹ پر پکڑی گئی تھی؟"

"اسے احسان مرزا ہی نے میرے ساتھ کیا تھا۔ اس کے خیال میں وہ بہت کام کی لڑکی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"معلوم نہیں اس کا اشارہ کس کام کی طرف تھا۔" حشمت خان اس سنگین صورتحال میں بھی خباثت بھرے انداز میں مسکرایا۔ "بہرحال تمہارا اس سے کوئی دلی تعلق تو نہیں ہے نا؟"

"دلی تعلق؟" میں استہزائیہ انداز میں ہنس دیا۔ "کیا ہم لوگ دلی تعلق رکھنے کے متحمل ہو سکتے ہیں؟"

"بڑے کام کی بات کی ہے تم نے۔" وہ دوستانہ لہجے میں بولا۔ "گویا میرا اندازہ درست ہی تھا۔ تمہارا اس سے ذرا سا بھی قلبی تعلق ہوتا تو تم کبھی بھی اسے ڈھال بنا کر بستی میں داخل نہ ہوتے۔" پھر اس نے اس شخص کو اشارہ کیا جو مجھے ہوش میں لایا تھا۔

اس شخص نے دائیں ہاتھ کی دیوار میں موجود ایک نفیس سا دروازہ کھولا اور میں نے چوکھٹ کے پار کیٹی کو کھڑے دیکھا۔ وہ ایک ٹک مجھے گھور رہی تھی۔ اس نے اب تک کی گفتگو یقیناً لفظ بہ لفظ سنی تھی۔ اسکے ہاتھ بھی پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ کپڑے تار تار تھے۔ ایک آنکھ سوج کر تقریباً بند ہو چکی تھی اور متورم حصہ نیلا پڑ چکا تھا۔ رخساروں کی ہڈیوں والے ابھاروں پر بھی نیل تھے۔ نچلا ہونٹ پھٹ چکا تھا اور اس سے خون کی ایک لکیر

نرخرے تک آکر خشک ہو چکی تھی۔ پیشانی پر ایک گومڑ صاف نظر آرہا تھا اور بال جھاڑ جھنکاڑ کی طرح الجھے ہوئے تھے۔

اسے یقیناً بری طرح مارا پیٹا گیا تھا اور اس کی حالت بتا رہی تھی کہ اس کی جگہ کوئی عام لڑکی ہوتی تو شاید اس وقت اس میں اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی سکت نہ ہوتی۔ میری رگوں میں سست روی سے گردش کرتا ہوا خون یکلخت سنسنانے لگا لیکن میرے ہاتھ جکڑے ہوئے تھے اور وہ بھی رسیوں سے نہیں، زنجیروں سے۔ دو ٹامی گنوں کی نالیں میری جانب ساکت تھیں اور ان کے ٹریگرز پر جمی ہوئی انگلیاں گویا میری کسی خفیف سی غلط حرکت کی منتظر تھیں اور حشمت خان کی سانپ جیسی آنکھیں بھی ایک لمحے کے لیے میری طرف سے غافل نہیں ہو رہی تھیں۔

نہتے شخص کا اشارہ پا کر کیٹی مشینی سے انداز میں قدم اٹھاتی آگے آگئی اور مجھ سے کچھ فاصلے پر رہ گئی۔ وہ اب بھی ایک ٹک میری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں سوال کی چبھن، مایوسی کا اندھیرا اور شکوک کے سائے لرزاں تھے۔ اس کے متورم اور زخمی ہونٹ کپکپائے جیسے اس نے کچھ کہنا چاہا ہو مگر اس کے حلق سے کوئی آواز نہ نکلی۔

"طاہر شاہ کے ہاتھ پاؤں کھول دو۔" حشمت خان نے نہتے شخص کو حکم دیا۔ اس نے حکم کی تعمیل کی اور میں نے سیدھے کھڑے ہو کر ہاتھ پیروں کے جوڑوں پر ذرا سی مالش کرنے کے بعد حشمت خان کی طرف دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کی تاکہ میری اندرونی کیفیات کا کوئی سراغ نہ مل سکے۔ پوزیشن اب بھی ایسی نہیں تھی کہ میں حرکت میں آسکتا۔ میں قطعی طور پر اسٹین گنوں کی زد پر تھا اور جن آدمیوں کے ہاتھوں میں یہ گنیں تھیں، میرے اندازے کے مطابق اس قسم کی صورتحال میں ان کی یکسوئی، مستعدی اور سردمہری کی نظیر ملنی مشکل تھی۔ وہ کمبخت آنکھ تک نہیں جھپک رہے تھے اور مجھے یقین تھا کہ میری ذرا سی بھی خلاف توقع حرکت پر وہ مشینی انداز میں فائر کریں گے۔

"طاہر شاہ!" حشمت خان نے نہایت ملائمت سے مجھے مخاطب کیا۔ "مزید گفتگو سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ تم گولی مار کر اس لڑکی کا قصہ تو پاک کر دو۔"

کیٹی نے گردن کو جھٹکے سے انداز میں حرکت دیتے ہوئے ایک نظر حشمت خان کو پھر ایک نظر میری طرف دیکھا۔ انداز میں شکستگی تھی۔ اس کے وجود میں گویا زندگی کی امنگ مر گئی تھی۔

حشمت خان نے اپنے دیوان کے موٹے گدے تلے سے ایک ریوالور نکالا اور میری طرف اچھالنے سے پہلے کہا۔ "میں نے تم پر اعتماد تو شروع کر دیا ہے لیکن اتنا بھی نہیں کہ تم اس ریوالور کا غلط استعمال کر سکو۔ نہایت محتاط رہنا اور ریوالور کو غلط سمت میں ذرا بھی حرکت دینے کی کوشش مت کرنا ورنہ خوامخواہ ہی تمہاری قیمتی زندگی آن کی آن میں ضائع

ہو جائے گی۔" اس نے ریوالور میری طرف اچھال دیا جسے میں نے نہایت احتیاط سے کیچ کر لیا۔

"لیکن کیا لڑکی کو قتل کرنا ضروری ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں......یہی تو اس بات کا ثبوت ہے کہ تم نے وفاداری تبدیل کر لی ہے۔" حشمت خان نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "اور یہ کہ تم میرے ساتھ معاہدے میں سنجیدہ ہو' ہر اہم معاہدے میں آخر دکھانے کے لیے کچھ تو ہونا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے۔ جیسے تمہاری مرضی۔" میں نے لاپروائی سے کہا اور ریوالور سے کیٹی کے سینے کا نشانہ لے لیا۔ میرے خیال میں آخری جدوجہد کا اور کوئی موقع مجھے میسر نہیں آسکتا تھا' اس لیے میں نے یکلخت ہی گھٹنوں کے بل گرتے ہوئے ریوالور کو قوس کی شکل میں گھمایا اور نشانہ لینے کا چونکہ کوئی موقع ہی نہیں تھا' اس لیے اندازاً حشمت خان کی طرف رخ ہوتے ہی میں نے ٹریگر دبا دیا۔

دھماکہ ضرور ہوا......لیکن وہ میری کھوپڑی کے کسی حصے میں ہوا تھا۔ ریوالور سے محض ایک ہلکی سی "کلک" کی آواز سنائی دی تھی۔ ریوالور خالی تھا۔ دوسری کی آواز جو میں نے سنی' وہ حشمت خان کی زہریلی ہنسی کی تھی۔ "......میں یہی دیکھنا چاہتا تھا۔ اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم مر سکتے ہو لیکن میرے ساتھ نہیں مل سکے......"

حشمت خان اور اس کے محافظوں کا خیال یہ تھا کہ حیرت کے اس جھٹکے سے میرے اعصاب چند لمحے کے لیے ضرور مختل ہو جائیں گے لیکن میں نے ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا اور میرا رخ گو کہ حشمت خان کی طرف تھا لیکن میں نے نیم دائرے میں گھومتے ہوئے خالی ریوالور ایک اسٹین گن والے کے منہ پر دے مارا۔

اعشاریہ چار پانچ کا ریوالور خوب وزنی تھا۔ یقیناً ایک بڑے ہتھوڑے کی طرح اس کے منہ پر پڑا ہو گا۔ ریوالور پھینکتے ہی میں لڑھک کر اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ کچھ میری اس حکمت عملی سے اور کچھ امداد غیبی سے میں موت کو چکمہ دینے میں کامیاب ہو گیا۔ ہوا یہ کہ جس کے منہ پر ریوالور پڑا تھا' وہ اندھوں کی طرح لڑکھڑایا اور اسٹین گن اس کے ہاتھوں سے بری طرح لہرا گئی۔ ساتھ ہی غالباً غیر ارادی طور پر اس سے ٹریگر دب گیا۔ اس وقت گن کا رخ اس کے اپنے ہی ساتھی کی طرف ہو چکا تھا۔

ایک ہی برسٹ میں وہ چھلنی ہو کر گر پڑا لیکن اس سے پہلے وہ زمین پر اس جگہ برسٹ مار چکا تھا جہاں میں ایک ثانیے پہلے تک موجود تھا۔ پختہ فرش سے سیمنٹ کی تہہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اچھلی' کچھ ٹکڑے شاید مجھے بھی لگے تھے لیکن مجھے کچھ ہوش نہیں تھا۔ میں نے تو لڑھکتے وقت سب سے پہلے یہ دیکھا تھا کہ جس کے منہ پر ریوالور پڑا تھا' وہ فرش پر گر چکا تھا۔ اسٹین گن اس کے ہاتھوں سے چھوٹ چکی تھی۔

نہتا شخص جو کیٹی کو عقوبت خانے سے لے آیا تھا' یوں اسٹین گن پر جھپٹا جیسے پانی میں غوطہ لگانے لگا ہو لیکن میں نے کہنی کے بل قدرے اوپر کو ہوتے ہوئے اس کے منہ پر پوری قوت سے ایسی ٹھوکر رسید کی کہ وہ ربڑ کے گڈے کی طرح ہوا میں کئی فٹ اچھلا اور اوندھے منہ چھپکلی کی طرح پٹ سے فرش پر گرا۔

جس شخص کے چہرے پر ریوالور پڑا تھا' اس کا آدھے سے زیادہ چہرہ مسخ ہو چکا تھا اور وہ بری طرح تڑپ رہا تھا جس کی وجہ سے غالباً اس کی آنکھوں میں تکلیف تھی۔ اس کی ایک آنکھ تو حلقے سے باہر ہی لٹک آئی تھی۔

میں نے جھپٹ کر اسٹین گن اٹھائی۔ اس سارے عمل میں بمشکل چند سیکنڈ صرف ہوئے تھے لیکن جب میں نے اسٹین گن سیدھی کرتے ہوئے پلٹ کر دیکھا تو حشمت خان تخت سے غائب تھا۔ اس ہال نما کمرے سے جانے کے صرف دو ہی راستے تھے۔ ایک وہ دروازہ جدھر سے کیٹی کو لایا گیا تھا اور دوسرا تہہ خانے کا دروازہ جدھر سے مجھے لایا گیا تھا۔

اندرونی دروازے کی طرف تو وہ یقیناً نہیں گیا تھا البتہ تہہ خانے سے باہر جانے والے دروازے کی طرف مجھے ریشمی چمکیلے لبادے کی ایک جھلک نظر آئی جو دوسرے ہی لمحے کسی واہمے کی طرح معدوم ہو گئی۔ میں نے اپنے عقب میں کیٹی کی کراہ سنی لیکن اس طرف توجہ دیئے بغیر میں دروازے کی طرف بھاگا۔

راہداری کے موڑ تک پہنچنے سے پہلے مجھے آگے دروازہ دھڑ سے بند ہونے کی آواز آئی اور جب میں راہداری کا موڑ عبور کر کے آندھی طوفان کی طرح دوڑا تو اپنے ہی زور میں بند دروازے سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ دروازے کی ناب گھمائی تو وہ حسب توقع مقفل ہو چکا تھا۔ میں نے اسٹین گن سے صرف تالا ہی نہیں اس کے ارد گرد کا کچھ حصہ بھی اڑا کر رکھ دیا اور دروازہ ایک جھٹکے سے کھول کر باہر کو لپکا ہی تھا کہ چھٹی حس کی مستعدی نے مجھے گھٹنوں کے بل جھکنے پر مجبور کر دیا۔

اگر ایسا کرنے میں مجھے ایک لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو میری کھوپڑی میں سوراخ ہو چکا ہوتا۔ پچھلے چند سیکنڈ کی کشمکش شاید میری زندگی کی تیز ترین معرکہ آرائی تھی جس میں موت کئی بار مجھے چھو کر گزر چکی تھی۔ وہ کم بخت حشمت خان عملی لڑائی کا ہی نہیں نفسیاتی معرکہ آرائی کا بھی ماہر معلوم ہوتا تھا۔

اس کے پاس ریوالور غالباً اس وقت موجود تھا جب میں اس کی طرف سے غافل تھا لیکن اس وقت یا تو وہ ریوالور بروقت نکال نہیں سکا تھا یا پھر اس نے خطرہ مول نہیں لیا تھا کہ اگر میں پہلی گولی سے بچ گیا اور اس دوران اسٹین گن میرے ہاتھ میں آگئی تو اس کی موت یقینی ہو گی۔ اس نے پہلے محفوظ جگہ پر پہنچنا یعنی جنگی حکمت عملی کے عین مطابق پہلے مورچہ بند ہونا ضروری سمجھا تھا اور بلاشبہ یہ ایک شاندار نفسیاتی چال بھی تھی کہ جب میں

یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ جان بچانے کے لیے اندھا دھند بھاگا جا رہا ہے اور دروازہ مقفل ہونے کے بعد جلد از جلد زیادہ سے زیادہ دور نکل جانے کی کوشش کرے گا' اس وقت وہ سیڑھیوں کے بالائی حصے پر چھپا میرے نکلنے کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ تو شاید اس کے ہاتھ کی خفیف سی حرکت تھی جس نے میری غیر معمولی چھٹی حس کو بروقت مرتعش کر دیا تھا۔

حشمت خان نے دوسرا فائر نہیں کیا اور میں نے اس کے قدموں کی دھمک دور تک جاتے محسوس کی' تب میں اٹھا اور ایک بار پھر اس کے تعاقب میں دوڑا' سیڑھیاں چڑھ کر جب اوپر آیا تو میں نے اپنے آپ کو ایک طویل و عریض ہال میں پایا جس کا فرش کسی چکنے پتھر کا بنا ہوا معلوم ہوتا تھا اور ملگجی روشنی میں جھلملا رہا تھا۔ اس ہال میں فرنیچر وغیرہ کچھ نہیں تھا لیکن چاروں طرف بھاری بھاری پردے لٹکے ہوئے تھے۔ غنیمت تھا کہ یہ پردے فرش سے کافی اونچے تھے' اس لیے میں پہلی ہی نظر میں یہ جائزہ لینے میں کامیاب ہو گیا کہ ان کے پیچھے حشمت خان نے پناہ نہیں لی تھی۔

اس ہال سے گزر کر میں دوسرے کمرے میں پہنچا تو یک لخت ہی جیسے کم گہرے تالاب میں کود گیا اور میرے جوتوں تلے کچھ نرم نرم چیزیں کچلی گئیں۔ غیر ارادی طور پر میں اچھل کر واپس دہلیز پر چڑھ گیا اور غور سے ملگجی روشنی میں دیکھنے لگا۔ اس گہرے اور طویل و عریض کمرے کے وسط میں گویا ایک اور ہی کمرہ کھڑا تھا جس کی دیواروں اور چھت کا بیشتر حصہ شیشے اور لکڑی کے تختوں پر مشتمل تھا۔

اس حصے کے اندر کا منظر انسان کی جلد تلے سرسراہٹ پیدا کر دینے کے لیے کافی تھا۔ شیشے اور لکڑی کے اس کمرے نما صندوق میں لاتعداد چھوٹے بڑے سانپ' بچھو اور دیگر زہریلے کیڑے مکوڑے ایک دوسرے کے اوپر نیچے رینگ رہے تھے۔ یہی نہیں ایک طرف کچھ انسانی کھوپڑیاں اور ہڈیاں بھی پڑی نظر آ رہی تھیں۔ کوئی لاش شاید ابھی گلنے سڑنے کے عمل سے گزر رہی تھی کیونکہ تعفن کا احساس ہو رہا تھا۔ حالانکہ صندوق نما حصے کا دروازہ کھلا نہیں تھا' صرف اس کا ایک کونا ٹوٹا ہوا نظر آ رہا تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ چھت سے سیمنٹ کے کچھ بڑے بڑے ٹکڑے علیحدہ ہو کر اس پر گر پڑے تھے۔

اس شکستہ گوشے ہی سے کچھ سانپ وغیرہ نکل کر اردگرد کے حصے میں بھی پھیل گئے تھے اور اسی دروازے کی طرف آن جمع ہوئے تھے جس سے میں کمرے میں داخل ہوا تھا۔ وہ اوپر چڑھ کر ہال نما کمرے میں آنے کے لیے کوشاں تھے مگر فی الحال انہیں کامیابی نہیں ہوئی تھی۔

اس کمرے سے گرے ہوئے سیمنٹ سے میں نے اندازہ لگایا کہ میں مکان کے اس حصے کے قریب ہی تھا جس پر میں نے بم پھینکا تھا۔ اس کمرے میں کوئی اور دروازہ نظر نہیں آ رہا تھا تو پھر حشمت خان کدھر گیا تھا؟ میں نے قدرے حیرت سے سوچا اور واپس ہال میں آیا۔

میں نے تیزی سے پردے ہٹا ہٹا کر دیکھا۔ ایک پردے کے عقب میں بڑی سی کھڑکی کھلی تھی اور یہ کھڑکی ایک منہدم شدہ کمرے میں کھلتی تھی جس کا ملبے کا ڈھیر کچھ آگے تک پھیلا ہوا تھا۔ میں نے نیچے چھلانگ لگائی اور ملبے کے انبار پر پہنچ کر چاروں طرف دیکھا۔

دھندلی چاندنی میں بہت دور ایک ہیولا مجھے تیزی سے حرکت کرتا نظر آیا۔ ویسے تو اسے پہچاننا شاید ممکن نہ ہوتا لیکن اس کا لمبا چوڑا لبادہ جس طرح ہوا میں لہرا رہا تھا' اس کی وجہ سے میں نے بہ آسانی پہچان لیا کہ وہ حشمت خان ہی تھا۔ اس کی رفتار حیران کن تھی۔ زمین پر تو اس کے قدم گویا پڑ ہی نہیں رہے تھے اور وہ کچھ اوپر ہی اوپر اڑا جا رہا تھا۔

اس کا رخ جنگل کی طرف تھا جس کی لمبائی' چوڑائی کا مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا اور اگر ایک بار حشمت خان جنگل میں داخل ہو جاتا تو پھر میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں اکیلا اسے تلاش کر لوں گا۔ بستی کی سمت میں کہیں دور سے ہوا کے دوش پر مجھے اجتماعی نعرے بازی کی آوازیں وقفے وقفے سے سنائی دے رہی تھیں۔ سینڈریلا اپنی حکمت عملی کے مطابق اپنی بگڑی ہوئی بازی سنوارنے میں مصروف تھی یا شاید وہ اپنا کام مکمل کر چکی تھی۔ حشمت خان کا معاملہ شاید اس نے مکمل طور پر مجھ پر چھوڑ دیا تھا۔ شاید اس کا خیال یہی رہا ہو کہ اس ضمن میں مجھے کسی کمک کی ضرورت نہیں تھی۔ کمک کی ضرورت تو واقعی مجھے نہیں تھی لیکن اس علاقے میں اجنبی ہونا قدم قدم پر میرے آڑے آ رہا تھا۔

میں نے اپنی توانائی مجتمع کی اور حشمت خان کے پیچھے دوڑا۔ جنگل میں پہنچ کر مجھے قدرے اطمینان ہوا کہ اس مقام پر جنگل اس سے بھی کم گھنا تھا جہاں میں ایک مرتبہ داخل ہو چکا تھا' تاہم حشمت خان نہ جانے کس طرف کو نکل چکا تھا اور مجھے نظر نہیں آ رہا تھا لیکن ایک چیز میری رہنمائی کر رہی تھی اور وہ تھی پرندوں کی آواز۔

حشمت خان گو کہ درندہ نہیں تھا' نہ ہی وہ کوئی آواز نکال رہا تھا اور نہ ہی درختوں پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر پرندے اپنے آرام کے وقت کسی کی بھی بھاگ دوڑ پسند نہیں کرتے اور فوراً ہی شور شرابا یا کم از کم چوں چاں ضرور شروع کر دیتے ہیں۔ یہی آوازیں مجھے بتا رہی تھیں کہ حشمت خان کدھر کدھر سے گزر رہا ہے اور میں ادھر ہی بڑھتا جا رہا تھا۔

ایک تناور درخت کے قریب سے گزرتے ہوئے اچانک ہی میں کسی سے بغل گیر ہوتے ہوتے رہ گیا۔ اگر اچانک ہی میں نے کسی کی موجودگی کا احساس ہوتے ہی مشینی انداز میں اپنے آپ کو نہ روک لیا ہوتا تو میں یقیناً سیدھا اس کے پھیلے ہوئے بازوؤں میں پہنچ جاتا۔ وہ ایک نہایت جسیم ریچھ تھا جو موٹے تنے کے پیچھے نہایت مکارانہ انداز میں چھپا ہوا پچھلی دونوں ٹانگوں پر کھڑا تھا۔

یہ یقیناً انہیں درندوں میں سے ایک تھا جن کا ذکر میں نے سینڈریلا کے مکان پر حشمت

خان کی زبانی سنا تھا اور جن میں سے ایک آدھ پہلے ہی میرے ہاتھوں مارا جا چکا تھا۔ ریچھ یقیناً یہ بھی سدھایا ہوا ہی تھا ورنہ حشمت خان بھی ادھر سے گزرا تھا' اسے بھی اس نے روکنے کی کوشش کی ہوتی۔

ریچھ نے دیکھا کہ میں اس کے بازوؤں کے حلقے میں پہنچنے سے بال بال بچ گیا ہوں تو فوراً مجھ پر جھپٹا لیکن اس کے مجھ تک پہنچنے سے پہلے اسٹین گن کی گولیاں اس کے جسم سے پار ہو چکی تھیں' وہ چاروں شانے چت گر پڑا۔ اس کے گرنے سے زمین میں خاصی دھمک پیدا ہوئی۔ اس کے چاروں ہاتھ پاؤں تشنج کی کیفیت میں ایک دوسرے سے آن ملے اور وہ گٹھڑی سی بن گیا لیکن دوسرے ہی لمحے ڈھیلا پڑ گیا۔

گوشت کے اس چھوٹے سے پہاڑ کے نیچے خون کا تالاب بہنا شروع ہو گیا تھا۔ میں نے اسے پھلانگا اور آگے دوڑا لیکن یکلخت مجھے رک جانا پڑا۔ پرندوں کی آوازیں جو میری رہنمائی کر رہی تھیں' یکلخت ہی تھم چکی تھیں۔ پورے جنگل میں ایسا اعصاب شکن سکوت چھا گیا جیسے میلوں دور تک کوئی ذی روح موجود ہی نہیں ہے۔ دراصل رات کے وقت اسٹین گن کی تڑتڑاہٹ اس مقام پر کچھ زیادہ ہی خوفناک محسوس ہوئی تھی اور پرندوں نے دم سادھ لیا تھا۔ اب میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مجھے کس طرف جانا چاہیے۔

حشمت خان نے خود ہی میری مشکل آسان کر دی۔ وہ کمبخت کچھ ہی آگے کسی درخت کے عقب میں چھپا ہوا تھا۔ اسے امید رہی ہوگی کہ میں ریچھ کے شکنجے میں ضرور آجاؤں گا اور مجھے ہلاک کرنے میں ریچھ کو اگر کوئی دقت پیش آئی تو وہ اس کا ہاتھ تو بٹائے گا لیکن مجھے موت سے بچتے دیکھ کر اس نے ایک اور گولی داؤ پر لگا دی تھی۔ یہ گولی شاید زندگی مجھ سے چھین کر لے گئی ہوتی لیکن ایک تو شاید روشنی کی کمی اور دوسرے راہ میں کسی نہ کسی زاویئے سے کوئی نہ کوئی درخت حائل ہونے کی وجہ سے میں بچ گیا۔ یا پھر شاید یہ وجہ بھی نہیں تھی' وجہ صرف اتنی سی تھی کہ نیلی چھتری والے نے ابھی میری زندگی اپنی امان میں رکھنے سے ہاتھ نہیں کھینچا تھا۔

خشک پتوں اور ٹہنیوں کی چرچراہٹ نے مجھے بتا دیا کہ حشمت خان ایک بار پھر دوڑ پڑا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے پاس ریوالور کی فاضل گولیاں نہیں تھیں' اس لیے وہ انہیں بڑی احتیاط سے استعمال کر رہا تھا لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا تھا کہ وہ جانا کہاں چاہتا تھا' وہ اتنا احمق تو نہیں ہو سکتا کہ مجھے تھکا مارنے کے ارادے سے دوڑتا رہتا۔ اگر وہ وادی سے فرار ہونے کا ارادہ رکھتا تھا تو اسے گیٹ کی طرف جانا چاہیے تھا کیونکہ میری معلومات کے مطابق وادی میں داخل ہونے یا نکلنے کا وہی ایک راستہ تھا یا پھر کوئی اور بھی خفیہ راستہ رہا ہوگا جس کا علم صرف حشمت خان کو ہی ہوگا۔

بہرحال اب میں اس کا سراغ پا چکا تھا۔ ایک جگہ رک کر میں نے اس پر فائرنگ بھی

کی لیکن درخت آڑے آئے۔ قریب پہنچے بغیر فائرنگ کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ پھر اچانک ہی درختوں کا سلسلہ ختم ہو گیا اور چاندنی بلا رکاوٹ زمین تک پہنچتی دکھائی دینے لگی لیکن روشنی کا سلسلہ بند ہوتے ہی حشمت خان مجھے صاف نظر آنے کے بجائے الٹا میری نظروں سے غائب ہو گیا۔

میں جب اس مقام پر پہنچا جہاں وہ میری نظروں سے غائب ہوا تھا تو مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ دراصل نشیب میں اتر گیا تھا' وہاں سے ایک تنگ سا خشک نالا شروع ہو رہا تھا جو بل کھاتا نہ جانے کہاں تک جا رہا تھا اور جس کی گہرائی بتدریج بڑھتی جا رہی تھی۔ میں بھی اس نالے میں اتر گیا اور چند ہی قدم چل کر اپنے قد سے بھی زیادہ گہرائی میں چلا گیا' تاہم میں ہر ممکن تیز رفتاری سے دوڑنے کے باوجود سنبھلے رہنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اچانک ہی کہیں کسی گڑھے یا کھائی میں نہ جا گروں۔

حشمت خان مجھے اب بھی کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا کیونکہ خندق نما اس نالے میں پیچ و خم بہت زیادہ تھے اور وہ مجھ سے کافی آگے تھا۔ اس کے راستے میں نہ جانے کتنے موڑ حائل تھے۔ اس نالے میں میرے اندازے کے مطابق میں کم از کم ایک میل کا فاصلہ طے کر چکا تھا۔ جب میں نے محسوس کیا کہ اس کی گہرائی بتدریج کم ہونے لگی تھی اور پھر اچانک ہی میں نالے سے نکل آیا۔





میں نے اپنے آپ کو ایک ایسی ناہموار چٹان پر پایا جو زیادہ بلند نہیں تھی اور کچھ آگے اس پر ایک افقی اور مسطح چٹان نے یوں سایہ کیا ہوا تھا جیسے قدرت نے کسی خاص مقصد سے وہاں چھپر تان دیا ہو۔

اس قدرتی چھپر کے نیچے ہٹ کی طرز کا ایک بڑا سا مکان صحرائی جھاڑیوں میں گھرا کھڑا تھا۔ لکڑی کے بڑے بڑے تختوں' بلیوں اور گھاس پھوس سے بنا ہوا یہ مکان بظاہر متروک نظر آتا تھا لیکن اس کا دروازہ شاید کھلا ہی تھا کیونکہ میں نے اس وقت حشمت خان کو دروازے پر پہنچتے دیکھا تھا۔ جب میں نالے سے نکلا اور دوسرے ہی لمحے وہ دروازے کو دھکیلتا ہوا غائب ہو چکا تھا۔ مکان کے اندر پھیلی ہوئی تاریکی نے جیسے اسے اپنی پناہ میں لے لیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے مکان میں روشنی پھیلتی دیکھی۔

میں مکان تک پہنچا تو دروازہ چوپٹ کھلا تھا اور گویا میرا ہی انتظار کر رہا تھا لیکن میں اب اتنا بے صبرا نہیں تھا کہ سیدھا اندر گھستا چلا جاتا۔ ایک طرف کو ہٹ کر میں نے سن گن لینے کی کوشش کی لیکن مکان پر یوں سناٹا چھایا ہوا تھا جیسے اندر کوئی ذی روح موجود نہ ہو۔

دروازے اس قسم کے تھے کہ اگر ان کی اوٹ میں کوئی چھپا ہوتا تو مجھے پتا چل جاتا۔ بالآخر میں نے یونہی دروازے کے پٹوں پر اور اندر لگاتار گولیاں برسائیں۔ ایک پٹ کے بیشتر حصے کے تو پرخچے ہی اڑ گئے۔ فائرنگ کا تسلسل روکے بغیر ہی میں نے اندر چھلانگ لگا دی اور پاؤں زمین پر ٹکتے ہی نیم دائرے کی صورت میں گھومتے ہوئے ایک برسٹ مارا حالانکہ مجھے احساس ہو گیا تھا کہ وہاں کوئی موجود نہیں ہے۔

ایک حصہ ایک مستطیل کمرے سے مشابہ تھا لیکن اس میں خشک گھاس کے گٹھوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ سامنے لکڑی کے تختوں سے بنی ہوئی ایک دیوار میں ایک اور دروازہ نظر آ رہا تھا۔ وہ بھی نیم وا تھا۔ میں نے ٹھوکر سے اسے کھولا اور اندھا دھند اندر بھی گولیاں برسائیں' پھر اس کا جائزہ لیا۔ یہ پہلے کمرے کی نسبت چھوٹا تھا لیکن حالت اس کی بھی وہی تھی' وہی گھاس پھوس' کاٹھ کباڑ اور گندگی۔ صرف ایک فرق تھا کہ یہاں ایک تخت موجود تھا جس پر گاؤ تکیہ لگا ہوا تھا۔ چند گولیاں اس گاؤ تکیے میں بھی پیوست ہوئی تھیں۔

اس کمرے میں بھی کوئی نہیں تھا۔ اس سے گزر کر میں چھوٹے سے صحن نما ایک حصے میں جا پہنچا جہاں ایک طرف دو کیبن سے بنے ہوئے تھے جن سے غالباً کبھی کبھی کچن اور باتھ روم کا کام لیا جاتا تھا۔ اس حصے پر چھت نہیں تھی لیکن اس کی چوبی دیواریں بھی باقی حصے کی دیواروں جتنی ہی بلند تھیں اور اتنی ہی تنگ جگہ میں کسی شخص کا چھلانگ لگا کر ان میں سے کسی بھی طرف کی دیوار کو پار کر جانا ناممکن ہی تھا۔ ان دیواروں میں کوئی دروازہ نہیں تھا۔

گویا مکان میں داخل ہونے اور نکلنے کا وہی ایک دروازہ تھا جس سے میں نے حشمت خان کو اندر آتے دیکھا تھا اور جس سے میں خود بھی اندر آیا تھا لیکن اب یہاں کہیں وہ نظر نہیں آ رہا تھا تو پھر آخر وہ کہاں گیا؟

اگر وہ گھاس پھوس کے گٹھوں یا کسی انبار تلے چھپا ہوتا تو اتنی دیر میں یقیناً اسے ایسے مواقع میسر آ چکے تھے کہ وہ مجھے گولی کا نشانہ بنا سکتا تھا۔ امکان تو یہی نظر آتا تھا کہ اس کے ریوالور میں گولیاں موجود تھیں' تاہم یہ بھی ممکن تھا کہ وہ مجھ پر گولی چلانے کا موقع پانے سے پیشتر ہی اسٹین گن کی گولی کا نشانہ بن گیا ہو اور اس وقت مردہ حالت میں گھاس پھوس کے ڈھیر تلے ہی کہیں پڑا ہو۔

یہی سوچ کر میں نے چھوٹے کمرے میں آ کر گھاس پھوس اور کاٹھ کباڑ کے انبار اسٹین گن کی نال سے الٹنے پلٹنے شروع کیے اور پھر میری آنکھیں چند لمحے کے لیے تو کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ گھاس پھوس تو کم ہی تھا' ایک دیوار کے ساتھ لکڑی کی تین اونچی اونچی پیٹیاں رکھی نظر آ رہی تھیں جن میں بھاری بھاری تالے جھول رہے تھے۔ بلاشبہ یہ اسلحے کی پیٹیاں تھیں۔ ان پر ان ہتھیاروں کی ساخت وغیرہ کی تفصیل لکھی نظر آ رہی تھی۔

زیادہ حیرت مجھے اس وقت ہوئی جب میں نے دوسری دیوار کے ساتھ لگے ہوئے گھاس پھوس کے انباروں کو کریدا۔ ان کے نیچے مجھے کینوس کے تین خاصے بڑے بڑے تھیلے نظر آئے جو بالکل اسی انداز میں کھلے رکھے تھے جس طرح آٹا' دال بیچنے والے دکانداروں کی بوریاں تھڑوں پر رکھی ہوتی ہیں۔ فرق یہ تھا کہ ان میں آٹا' دال یا مرچیں وغیرہ نہیں تھیں۔

ان میں سے ایک تھیلے میں تو نوٹوں کی گڈیاں بھری نظر آ رہی تھیں۔ اوپر جو گڈیاں نظر آ رہی تھیں' وہ سب کی سب سو سو کے امریکی ڈالروں کے نوٹوں کی تھیں' باقی بھی غالباً یہی تھیں۔ دوسرے تھیلے میں ہیرے بھرے ہوئے تھے۔ جی ہاں ہیرے! چھوٹے بڑے جگمگ جگمگ کرتے ہیرے جن کی چمک دمک سے آنکھیں خیرہ ہوئی جا رہی تھیں۔ تیسرے تھیلے میں سونے کے مختلف نئے اور پرانے زیورات کاٹھ کباڑ کی طرح بھرے ہوئے تھے۔

یہ نظارہ مجھ جیسے انسان کو بھی حیران کر دینے کے لیے کافی تھا۔ ایسا بیش بہا خزانہ اس

دور افتادہ مقام پر اس عالم میں کیوں رکھا ہوا تھا؟ کیا حشمت خان کو ان نوٹوں' ان ہیروں اور ان بیش قیمت زیورات کے لیے ڈھنگ کے صندوقچے وغیرہ بھی میسر نہیں تھے؟ آخر انہیں یوں آٹے' دال کی طرح رکھنے میں کیا مصلحت پوشیدہ تھی جبکہ یہ کسی قسم کی درویشی کا اظہار بھی نہیں تھا۔ حشمت خان کی تو زندگی ہی حصول زر کے لیے وقف تھی۔ دولت ہی اس کی زندگی کا محور و مرکز تھی۔

ایک حیران کن مسئلہ یہ بھی تھا کہ کرنسی امریکی تھی اور اسلحہ چینی۔ ان دنوں ان دونوں طاقتوں میں جغرافیائی طور پر ہی نہیں' تعلقات کے لحاظ سے بھی بعد المشرقین تھا۔

دفعتاً" میں نے ان سب سوچوں کو ذہن سے جھٹک دیا اور ایک بار حشمت خان کے متعلق سوچا۔ آخر وہ کہاں غائب ہو گیا تھا؟ اس کا یہاں آنے کا مقصد صرف اتنا ہی تو نہیں تھا کہ میں اس بیش بہا خزانے کو دیکھ کر ششدر رہ جاؤں' باقی ہر چیز کو بھول جاؤں اور وہ جس خفیہ راستے پر گامزن تھا' اس پر زیادہ سے زیادہ دور نکل جائے؟

میں نے بڑے کمرے میں پہنچ کر تیزی سے وہاں موجود گھاس پھوس کو بھی الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس کے نیچے کچھ موجود نہیں تھا۔ میں متوحش و پریشان تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ وہ حشمت خان جس کے لیے ساری صعوبتیں برداشت کی تھیں اور بیچاری کیٹی کو اتنی اذیتوں میں ڈالا تھا۔ جس بیچاری کا اس معاملے سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا' وہی حشمت خان اب یوں آخری مرحلے میں چکنی مچھلی کی طرح میرے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔

مجھ پر دیوانگی سی طاری ہونے لگی۔ میں ایک بار پھر صحن نما حصے میں جانے کے ارادے سے چھوٹے کمرے میں آیا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ یہاں کی ہر چیز کو تہس نہس کر دوں مگر وہاں تھا ہی کیا؟ لکڑی کا ایک تخت اور گرد آلود تکیہ۔ میں نے لات مار کر گاؤ تکیے کو دور پھینک دیا اور تخت کے نیچے جوتے کی نوک ٹکا کر اسے بھی الٹ کر دور پھینک دیا۔

پھر میں مجنونانہ سے انداز میں عقبی دروازے کی طرف بڑھا اور فرش کے اس حصے پر سے گزرا جس پر ایک لمحے پہلے تک تخت بچھا ہوا تھا اور جہاں فرش کے بیشتر حصے کی طرح خشک گھاس کی تہہ سی پھیلی ہوئی تھی۔ اس لمحے مجھے احساس ہوا کہ وہ تہہ کچھ اکھڑی اکھڑی سی نظر آرہی تھی لیکن جب تک مجھے احساس ہوا' تب تک تاخیر ہو چکی تھی۔ مجھ پر گویا پاتال کا دروازہ کھل چکا تھا اور میں تیزی سے نیچے جا رہا تھا۔

گھاس کی وہ تہہ ہٹا کر یقیناً مجھ سے پہلے بھی کوئی نیچے چھلانگ لگا چکا تھا جو یقیناً حشمت خان ہی تھا مگر وہ اس راستے کی حقیقت سے واقف تھا' دیکھ بھال کر سلیقے' طریقے سے کودا ہوگا۔ میں تو انجانے میں ہی گویا گڑھے میں آگرا تھا۔ بہرحال اب یہ سوچنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

خلاف توقع میں زیادہ گہرائی میں نہیں گرا۔ جلد ہی میرے پاؤں زمین سے لگے لیکن زمین نرم اور بھربھری تھی۔ میں تقریباً گھٹنوں تک دھنس گیا۔ اسٹین گن میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی لیکن میں نے ہڑبڑا کر فوراً ہی ادھر ادھر ہاتھ مار کر اسے تلاش کر لیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ وہاں حشمت خان میری گھات میں نہ بیٹھا ہو لیکن کئی لمحے تک کسی بھی طرف سے کوئی مجھ پر حملہ آور نہ ہوا اور نہ ہی گولی چلنے کا دھماکہ گونجا۔ تب میں نے قدرے زور آزمائی کے بعد پاؤں مٹی سے نکالے اور سنبھل کر کچھ آگے بڑھا۔

اب پاؤں مٹی میں نہیں دھنس رہے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ سرنگ نما ایک راستہ تھا لیکن وہاں اتنا گہرا اندھیرا بھی نہیں تھا جتنا مجھے محسوس ہوا تھا شاید اوپر کمرے کی طرف سے روشنی کا کچھ انعکاس ہو رہا تھا۔ آس پاس جب مجھے کسی کی موجودگی کے آثار نظر نہ آئے تو میں نے دوڑنا شروع کر دیا۔ آگے یہ سرنگ بالکل گنز لائن سے مشابہ ہو گئی تھی اور میں ہاتھ بلند کر کے اس کی چھت کو چھو سکتا تھا۔

شاید یہ کوئی طویل غار تھا جس کے سرے پر غالباً کسی طرح نکاسی کا راستہ بنا لیا تھا اور شاید اس غار ہی کی خصوصی اہمیت کے پیش نظر اس کے دہانے پر جھونپڑی نما مکان بنایا گیا تھا۔ جوں جوں میں بڑھتا گیا' اندھیرا گہرا ہوتا گیا حتیٰ کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی دینا ممکن نہ رہا۔ میں حیران تھا کہ حشمت خان نے اب تک فرشتہ اجل بن کر میرا استقبال کیوں نہیں کیا تھا۔ یہ تاریک سرنگ اس کی تو دیکھی بھالی تھی۔ یہاں چھپ کر کسی اجنبی کو گولی کا نشانہ بنانا تو بے حد آسان تھا لیکن شاید اس وقت اس کے سر میں صرف فرار کا سودا سمایا ہوا تھا اور شاید وہ مجھ سے اس حد تک خوفزدہ بھی ہو چکا تھا کہ اب مزید خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔

اس سرنگ میں سفر دیر تک جاری رہا۔ سمت کا مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا۔ بس سرنگ کی طوالت کا احساس تھا اور مجھے بلامبالغہ یہ اندیشہ محسوس ہو رہا تھا کہ اگر میں اسی طرح چلتا رہا تو کسی دوسرے ہی ملک میں نہ جا نکلوں۔

خدا خدا کر کے اس سرنگ کا دہانہ نظر آیا اور تب احساس ہوا کہ سپیدہ سحر نمودار ہو چکا تھا۔ چاند نجانے کہاں جا چھپا تھا لیکن صبح کی روشنی دھیرے دھیرے کائنات کو آغوش میں لے رہی تھی۔ میں جب عین سرنگ کے دہانے کے قریب پہنچا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں صدیوں بحر ظلمات کی تہہ میں پڑا رہنے کے بعد اپنی دنیا کی طرف لوٹنے لگا ہوں۔

میں دہانے سے دو تین قدم ہی کے فاصلے پر تھا جب اچانک ہی میرے دائیں ٹخنے پر جیسے قیامت ٹوٹ پڑی۔ میں اس وقت جوش مسرت میں زمین کی طرف تو دیکھ ہی نہیں رہا تھا۔ میرے ٹخنے پر دونوں طرف سے بہت شدید چوٹ لگی تھی اور اگر میں اس وقت موٹے چمڑے اور فرکی پوشش والے ٹخنوں سے اونچے جوتے نہ پہنے ہوتا تو شاید میرا ٹخنہ علیحدہ ہی

ہو جاتا یا پھر ہڈی ٹوٹ جاتی۔ ایک لمحے کے لیے تو میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ سرنگ کے دہانے سے جس چاند کی مجھے جھلک نظر آئی تھی وہ ان گنت نیلے پیلے دھبوں میں تبدیل ہو گیا۔

عافیت ہی رہی کہ دوسرے ہی لمحے میں سنبھل گیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میرا پاؤں ایک نہایت مضبوط آہنی شکنجے میں پھنس چکا تھا۔ میں نے بہت زور لگایا لیکن سوائے ٹانگ کی ہڈی کو تکلیف پہنچانے کے کچھ حاصل نہ ہوا۔ تب اچانک ہی حشمت خان کے زوردار قہقہے نے فضا کے سکوت کو مرتعش کر دیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ میرے قدموں ہی میں کہیں موجود تھا۔ میں نے قدرے وحشت زدہ ہو کر اپنے پیروں کی طرف دیکھا۔ میں جہاں پہنچ چکا تھا' وہ اب اندھیرا اتنا گہرا نہیں تھا کہ میں نیچے کا منظر نہ دیکھ سکتا۔

میرے قدموں میں سوائے شکنجے کے کچھ نہیں تھا۔ شکنجہ نہایت سادہ سا لیکن بے حد مضبوط اور سخت تھا۔ سرنگ کی زمین جو ابتداء میں بالکل کچی تھی' بتدریج سخت ہوتی گئی تھی اور یہاں پہنچنے تک تقریباً پتھریلی ہو چکی تھی۔ شکنجہ دراصل اس زمین میں پیوست تھا۔

"اس شکنجے میں زور آزمائی بے کار ہے طاہر شاہ!" حشمت خان کی آواز آئی۔ "یہ ایک شیر کو بھی قابو میں رکھنے کے لیے کافی ہے اور اس کی چابی صرف میرے پاس ہے۔ اب تم اسٹین گن سرنگ سے باہر پھینک دو کیونکہ اس وقت تم میرے ریوالور کی زد پر ہو گو کہ تم مجھے نہیں دیکھ سکتے۔"

جواباً میں نے سکوت اختیار کیے رکھا تو ایک دھماکہ ہوا اور گولی میرے کندھے پر سے میری اس دبیز اونی جیکٹ کو چھوتی ہوئی گزر گئی جو میں نے ڈھیلی ڈھالی شلوار قمیص کے اوپر پہن رکھی تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ میں اب بھی دھماکے کی سمت متعین نہیں کر پایا تھا۔ سرنگ میں دھماکے سے پیدا ہونے والی گونج نے میرے لیے کوئی اندازہ قائم کرنا ناممکن بنا دیا تھا۔

"یہ گولی تمہاری گردن سے بھی گزر سکتی تھی۔" حشمت خان کی آواز آئی۔ "مگر میں تمہیں اتنی آسان موت مارنا نہیں چاہتا۔ ایسا میں صرف انتہائی مجبوری کی حالت میں کروں گا۔ اسٹین گن پھینک دو۔"

میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور بالآخر اسٹین گن سرنگ سے باہر' اپنی دسترس سے دور پھینک دی۔ میں نے روشنی میں اسے زمین پر گرتے اور پھر نشیب کی طرف پھسلتے ہوئے دیکھا جہاں آخر وہ میری نظر کی رسائی سے دور ہو گئی کیونکہ سرنگ کا یہ حصہ بتدریج اونچا ہو رہا تھا جبکہ دہانے سے آگے زمین غالباً نشیبی تھی۔ تاہم میں نے کسی کو اسٹین گن اٹھانے کے لیے بڑھتے نہیں دیکھا۔

"بہت خوب۔" میں نے حشمت خان کی آواز سنی۔ "مجھے تمہاری اسٹین گن کی

ضرورت نہیں تھی طاہر شاہ......اور ہاں......فی الحال میں تمہیں طاہر شاہ ہی کے نام سے مخاطب کر رہا ہوں گو کہ مجھے یقین ہے کہ یہ تمہارا اصل نام نہیں ہے......اسٹین گن میں نے تم سے اس لیے پھینکوا دی ہے کہ یہیں پھنسے رہ کر جب تم دو تین دن تک بھوک پیاس میں بسر کرو گے تو تمہارا خودکشی کرنے کو جی چاہنے لگے گا لیکن میں نہیں چاہتا کہ تم اسٹین گن کی مدد سے اپنی موت کو آسان بنا لو۔ میری خواہش ہے کہ تم جتنا زیادہ طاقت کے زعم میں مبتلا ہو' اتنا ہی بے بسی سے سسک سسک کر اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرو۔ طاقتور آدمی کو گولی مار دینا اس کے لیے بہت بڑی سزا نہیں ہے۔ کاش میں تمہیں چوہے دان میں پھنسے ہوئے چوہے کی سی موت مرتے دیکھ سکتا لیکن افسوس کہ تم نے وادی میں میرا رہنا ممکن نہیں رہنے دیا......میں اپنا خزانہ بھی جلد ہی اپنے اصل ٹھکانے پر منتقل کرنے والا تھا لیکن تم نے میرے تمام پروگرام تہہ و بالا کر دیئے۔ بہرحال......وادی والوں کو تو وہ خزانہ نہیں مل سکتا۔ میں تین چار دن بعد پھر آؤں گا اور اسی خفیہ راستے سے گزر کر وادی کے حالات کا جائزہ لینے جاؤں گا۔ ممکن ہے میں وادی پر دوبارہ قبضہ کر لوں ورنہ واپسی پر اپنا خزانہ تو لیتا ہی جاؤں گا۔ اس وقت تک تو امید ہے کہ میں تمہاری لاش ہی پھلانگ کر گزروں گا اور اگر اس وقت تک تم زندہ رہے' تب بھی تمہاری حالت لاش سے بدتر ہی ہو گی اور تمہیں ٹھوکر مار کر گزرنا پرلطف عمل ہو گا......اچھا خدا حافظ!"

تب مجھے معلوم ہوا کہ وہ کہاں چھپا ہوا تھا۔ مجھ سے چند ہی فٹ آگے سرنگ کی چھت میں غالباً کوئی کھوہ سی موجود تھی جس میں وہ سمایا ہوا تھا۔ وہاں سے اس نے چھلانگ لگائی تو عین سرنگ کے دہانے پر جا پہنچا۔ وہ میرے سامنے کھڑا تھا مگر میں اسے چھو نہیں سکتا تھا۔

وہ ایک بار پھر استہزائیہ سے انداز میں ہنسا اور مڑ کر اطمینان سے چل دیا۔ کچھ دیر تک وہ مجھے نظر آتا رہا لیکن چونکہ وہ بتدریج نشیب کی طرف جا رہا تھا' اس لیے رفتہ رفتہ غائب ہو گیا۔ میں سینے کے بل لیٹ گیا۔ اس طرح میرا سر دہانے کے بے حد قریب پہنچ گیا اور میں باہر دور تک کا منظر دیکھنے کے قابل ہو گیا۔

نشیب میں ایک بیضوی مسطح میدان نظر آ رہا تھا جس کے اردگرد نہایت خوبصورت درخت گھیرا ڈالے کھڑے تھے اور جس چیز کو دیکھ کر میں دم بخود رہ گیا' وہ سرخ اور سفید پٹیوں والا ایک نہایت خوبصورت ہیلی کاپٹر تھا جو اس میدان میں کھڑا تھا۔ یہ مقام گویا ایک الگ ہی چھوٹی سی وادی سے مشابہ تھا۔ چاروں طرف چھوٹی چھوٹی چٹانیں سر اٹھائے کھڑی تھیں اور ہیلی کاپٹر گویا ایک پیالے کے پیندے میں کھڑا تھا۔

حشمت خان نہایت اطمینان سے اسی ہیلی کاپٹر کی طرف جا رہا تھا اور اس قدر مطمئن اور بے فکر نظر آ رہا تھا کہ اس نے راستے میں رک کر اسٹین گن بھی اٹھانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ میری کمند گویا لب بام آ کر ٹوٹ گئی تھی۔ شکار تقریباً ہاتھ میں آنے

کے بعد نکلا جا رہا تھا اور میں زندہ سلامت لینا اسے جاتے دیکھ رہا تھا۔ یہ منزل کے سلسلے میں میری پہلی کامیابی ہو سکتی تھی مگر یہ کوشش ہی ادھوری رہ گئی تھی۔ منزل تو ابھی بہت دور تھی۔

یہ سوچتے ہوئے پہلے تو ناامیدی و مایوسی نے مجھے مغلوب کیا مگر پھر جیسے رگ و پے میں ایک آگ سی بھڑک اٹھی جس نے منجمد اور خفیہ قوتوں کو بھی شعلوں میں بدل دیا۔ میری مٹھیاں بھنچ گئیں کہ ناخن گوشت میں اترنے لگے اور کنپٹیاں پھٹنے لگیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ اگر میں نے اپنے اندر امل پڑنے والی اس قوت کو کہیں استعمال نہ کیا تو میرا سارا جسم یا کم از کم کنپٹیوں کی نسیں ضرور پھٹ جائیں گی۔

میں نے اس قوت کو مہمیز دینے کے لیے یوگا کے ایک خاص انداز میں سانس کو بھی جسم میں مقید کر لیا اور پھر اٹھ کر شکنجے کو کھینچنا شروع کیا۔ وہ پتھریلی سی زمین میں یقیناً کافی گہرائی میں پیوست تھا۔ پہلی کوشش میں تو اس نے جنبش تک نہ کی۔ تب میں نے جھک کر اس کی سلاخوں میں ہاتھ پھنسائے اور سانس لیے بغیر اس مرحلے کو زندگی کا آخری مرحلہ سمجھتے ہوئے تمام تر قوت صرف کرنا شروع کر دی اور پھر چند سیکنڈ کے اندر اندر وہ شکنجہ جو بقول حشمت خان کے ایک شیر کو بھی قابو میں رکھنے کے لیے کافی تھا' زمین سے اکھڑتا چلا آیا۔

شکنجے کا جو حصہ پتھریلی زمین میں پیوست تھا' وہ تقریباً چار فٹ لمبی موٹی سی پیچدار سلاخ پر مشتمل تھا اور اسکریو کی طرح زمین میں فٹ کیا گیا تھا۔ یہ اس قسم کا شکنجہ نہیں تھا جو ویسے ہی زمین پر رکھ دیا جاتا بلکہ یہ انتہائی طاقتور جانوروں کو بے بس کرنے والا شکنجہ تھا۔

زمین میں ایک گڑھا سا پڑ گیا تھا اور بہت سے پتھریلے ٹکڑے ادھر ادھر بکھر گئے تھے۔ میرا پاؤں اب بھی شکنجے کی گرفت میں تھا' تاہم میں شکنجے کو پاؤں کے ساتھ ساتھ گھسیٹتے ہوئے چل سکتا تھا گو کہ شکنجے کا وزن کچھ کم نہیں تھا۔ میرے دل میں مسرت سے گدگدی سی ہونے لگی تھی۔ حشمت خان کے خیال میں جو کام ناممکن تھا اور جسے میں بھی تقریباً ناممکن ہی سمجھتا تھا' وہ بالاخر ہو گیا تھا مگر جب میں نے سرنگ کے دہانے پر پہنچ کر میدان کی طرف دیکھا تو میری خوشی ماند پڑ گئی۔

حشمت خان ہیلی کاپٹر تک پہنچ چکا تھا اور اوپر چڑھ کر کاک پٹ کا دروازہ کھول رہا تھا۔ میں شکنجے کو گھسیٹتا لنگڑے انسانوں کے سے انداز میں حتی الامکان تیزی سے اس کے تعاقب میں بڑھا۔ راستے میں رک کر میں نے اسٹین گن اٹھائی۔ جب میں نے دوبارہ ہیلی کاپٹر کی طرف دیکھا تو اس کے پر گھومنے لگے تھے اور انجن کی گڑگڑاہٹ سے فضا میں ارتعاش پیدا ہو چکا تھا۔

ہیلی کاپٹر کسی بھی لمحے فضا میں بلند ہونے والا تھا۔ میں نے اضطراری طور پر اسٹین گن

سے اس پر برسٹ مارا لیکن یہ اسٹین گن سے نکلنے والی گولیوں کی آخری بوچھاڑ تھی کیونکہ اس کا میگزین ختم ہو چکا تھا۔ میں نے کئی بار ٹریگر دبانے کے بعد جھنجھلا کر اسے ایک طرف پھینک دیا۔

چند گولیاں شاید ہیلی کاپٹر کے پچھلے حصے پر لگی تھیں لیکن اسے کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا تھا۔ کاک پٹ میں بیٹھا ہوا حشمت خان مجھے نظر نہیں آرہا تھا لیکن اس نے شاید مجھے دیکھ لیا تھا۔ مجھے شیشے کے بلبلہ نما حصے میں اس کا سر گھومتا نظر آیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے ہیلی کاپٹر ہوا میں بلند ہو گیا۔

کچھ بلندی پر پہنچ کر اس نے ہچکولا سا لیا' نیم دائرے میں گھوما اور مزید بلندی پر پہنچ کر ایک طرف کو پرواز کرنے لگا۔ میں وہیں کھڑا ہاتھ مل رہا تھا' جب میں نے محسوس کیا کہ گڑگڑاہٹ کی ایک اور آواز جسے میں حشمت خان ہی کے ہیلی کاپٹر کی آواز سمجھ رہا تھا' اب الگ سنائی دینے لگی تھی اور قریب آتی جا رہی تھی۔

میں نے آواز کی سمت سر گھمایا۔ ایک اور چھوٹا سا سفید ہیلی کاپٹر جس کے پہلو پر بڑا سا نیلا دائرہ چمک رہا تھا' تیزی سے اسی طرف آرہا تھا۔ میں تذبذب کے عالم میں اسے قریب آتے اور پھر میدان میں اترتے دیکھنے لگا۔ قسمت میرے ساتھ عجیب آنکھ مچولی سی کر رہی تھی۔ ایک لمحے میرا ساتھ دینے لگی تھی تو دوسرے لمحے دغا دے جاتی تھی۔

اب یہ ہیلی کاپٹر نہ جانے میرے کسی ہمدرد کا تھا یا دشمن کا۔ میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔ شاید یہ ہیلی کاپٹر بستی میں موجود تھا اور سینڈریلا نے اسے میری مدد کے لیے روانہ کیا تھا۔ اسی امید پر میں ہیلی کاپٹر کی طرف دوڑا جو اب زمین پر ٹکنے لگا تھا۔

اس ہیلی کاپٹر کا شیشے کا ہڈ اوپر کو کھلتا تھا۔ میں جب اس کے قریب پہنچا تو ہڈ کھل چکا تھا اور پائلٹ اپنی سیٹ سے اٹھ کر نیچے جھانک رہا تھا۔ اس کا سر اور چہرہ ہیلمٹ میں چھپا ہوا تھا' اس لیے میں اسے پہچاننے سے قاصر تھا' تاہم ہیلمٹ کے شفاف نیلے نقاب میں سے مجھے اس کی آنکھیں دھندلی دھندلی سی نظر آئی تھیں اور وہ نہ صرف حسین بلکہ کچھ شناسا بھی محسوس ہوئی تھیں۔ وہ پھولی پھولی سی سیاہ جیکٹ پہنے ہوئے تھا' ہاتھوں پر بھی دستانے تھے۔ وہ ہاتھ ہلا ہلا کر مجھے بلا رہا تھا۔

میں ہیلی کاپٹر کے پنکھے کی ہوا سے لڑتا لپک کر اس کے قریب پہنچا اور بلا توقف پائیدان پر چڑھ گیا۔ تب اس نے ایک لمحے کے لیے ہیلمٹ کا ہڈ اٹھایا اور شناسائی کی روشنی یوں میرے سامنے ابھری کہ ایک لمحے کے لیے تو میری آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ وہ لیو تانگ کی بیٹی لی چن تھی جس سے میں کھٹمنڈو میں صرف ایک بار ملا تھا بلکہ ملا بھی کیا تھا' ہماری صرف نظریں ہی ملی تھیں۔ اور ہمیں ایک دوسرے کا نام معلوم ہوا تھا۔ اس نے ہتھیاروں کے ڈبے میرے سامنے لا کر رکھے تھے۔

اس وقت اس کے حسن بلاخیز نے مجھے مبہوت کر دیا تھا اوراب اس کی آمد مجھے ششدر کر دینے کے لیے کافی تھی۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں جب اس کے ہاں سے رخصت ہوا تھا تو اس کی حسین آنکھوں میں یاسیت میں لپٹا ہوا ایک مبہم سا سوال محسوس کیا تھا جیسے اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھ سے پوچھا ہو......"پھر کب آؤ گے اجنبی؟" لیکن اس سوال کو میں نے اپنی لاشعوری خوش فہمی پر محمول کیا تھا۔

میں تو اس کے پاس نہیں جا سکا تھا لیکن وہ نجانے کس طرح اس نازک گھڑی میں میرے پاس آن پہنچی تھی۔

اس نے ہیلمٹ کا ہڈ نیچے کر لیا اور مجھے اوپر آنے کا اشارہ کرتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔ میں نے جلدی سے سیٹ پر بیٹھنے کی کوشش کی لیکن میرے پیروں کے ساتھ جو شکنجہ نتھی ہو چکا تھا' وہ اس موقع پر بھی آڑے آیا اور دروازے میں پھنسنے لگا لیکن میں نے جلدی سے کسی نہ کسی طرح پاؤں اوپر اٹھا کر اسے بھی اندر کر لیا کیونکہ میں سامنے بھی دیکھ رہا تھا حشمت خان کا ہیلی کاپٹر لحہ بہ لحہ دور ہوتا جارہا تھا۔

میرے بیٹھتے ہی پی چن نے ہڈ گرا دیا اور تھروٹل کھینچنے لگی۔ چند لمحے بعد ہی ہمارا ہیلی کاپٹر بلندی پر پہنچ چکا تھا اور ہم حشمت خان کے تعاقب میں روانہ ہو چکے تھے۔ میں نے جب پی چن کو پہلی بار دیکھا تو مجھے گمان بھی نہیں گزرا تھا کہ وہ اس قسم کے معاملات میں اتنی مستعد اور ہیلی کاپٹر اڑانے میں اتنی مشاق ہو گی۔ حالانکہ میں خود بمبئی فلائنگ کلب میں مختلف قسم کے طیارے اڑانے کی تربیت کے دوران تین ٹریی ایوارڈ اور ایک سپر فلائر ایوارڈ جیت چکا تھا لیکن اس نرم و نازک لڑکی کی مشاقی و مہارت دیکھ کر حیران تھا جو اس وقت بھاری بھرکم اور پھولے پھولے لباس میں قطعاً نرم و نازک نظر نہیں آرہی تھی۔ ہیلی کاپٹر سدھائے ہوئے پرندے کی طرح گویا اس کے اشاروں کا تابع تھا۔ اس کی آمد صحیح معنوں میں میرے لیے امداد غیبی تھی۔

ہیلی کاپٹر چونکہ اوپر سے کھلا نہیں تھا' اس لیے ہمیں گفتگو کرنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ گفتگو کا آغاز پی چن نے کیا۔ "میں پہلے وادی میں اتری تھی۔" وہ بولی' پھر بتانے لگی۔ "لوگ منوچی کے منہدم شدہ گھر کے سامنے جمع ہو رہے تھے۔ میں نے ان سے تمہارے بارے میں پوچھا تو پائی کی بیوی سینڈریلا نے بتایا کہ وہ لوگ خود تمہاری تلاش میں نکلے ہوئے ہیں۔ پھر میں نے اتفاقاً ادھر سے ہیلی کاپٹر ہوا میں بلند ہوتے دیکھ لیا اور میں ادھر آگئی۔"

"گویا تمہیں اس وادی اور یہاں کے لوگوں کے متعلق خاصی حد تک معلومات حاصل ہیں۔" میں نے کہا۔ "احسان مرزا نے تو ایسا کوئی اشارہ نہیں دیا تھا۔"

"احسان مرزا کو تو خود اچھی طرح معلوم نہیں کہ ہم کیا کچھ جانتے ہیں۔ اس سے ہمارا

صرف چند معاملات میں تعاون کا معاہدہ تھا۔ ہمارے اپنے بھی اس کے علاوہ بہت سے معاملات ہیں۔" وہ قدرے لاپروائی سے بولی۔ "تمہارے جانے کے بعد میں نے فون پر اس سے رابطہ قائم کرکے پوچھا تھا کہ اس نے تمہیں کہاں بھیجا ہے اور جب ہمیں معلوم ہوا کہ تمہاری منزل تاریک وادی ہے تو کم از کم مجھے بے حد خوشی ہوئی کیونکہ مجھے بھی یہاں تقریباً وہی کام درپیش تھا جس کے لیے تم آئے ہو لیکن مجھے اس کے لیے مدد کی ضرورت تھی۔ تم جیسے کسی آدمی کی۔" وہ ایک نظر میری طرف دیکھ کر مسحور کن انداز میں مسکرائی۔

میں دم بخود سا رہ گیا۔ "تمہیں کیوں آن پڑا یہ کام؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "کس نے تمہارے سپرد کیا یہ کام؟"

"میری قوم نے۔" وہ بڑے اطمینان سے بولی۔ "حشمت خان کے ذمے میری قوم کا بہت سا ادھار نکلتا ہے۔ اس نے چینی قوم کو بھی بہت سے نقصانات پہنچائے ہیں۔ اس کا باپ شرافت علی ہمارے خلاف ایجنٹ کے طور پر کام آتا رہا ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ اس وقت ہیلی کاپر میں اس کا باپ بھی موجود ہے۔"

"اس ہیلی کاپٹر میں شرافت علی بھی موجود ہے؟" میں نے بے یقینی سے پوچھا۔

"ہاں......" اس نے اثبات میں سرہلایا۔

"پھر تو جلد از جلد اس تک پہنچنے کی کوشش کرو۔" میں نے کہا۔

پی چن نے ہیلی کاپٹر کی رفتار بڑھائی۔ درمیانی فاصلہ کم ہو گیا تو میں نے پی چن کے اشارے پر سیٹ کے نیچے سے ٹامی گن اٹھائی' ہڈ اوپر کیا اور دوسرے ہیلی کاپٹر پر برسٹ مارا۔ اس کے شکم سے دھواں خارج ہونے لگا۔ میں نے دوسرا برسٹ مارا۔ ہیلی کاپٹر فضا میں ڈولنے لگا۔ پھر وہ نیچے اترنے لگا۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ گر نہیں رہا تھا۔ حشمت خان اسے خود نیچے اتار رہا تھا۔ شاید اس نے سوچا تھا ہیلی کاپٹر گرنے کی صورت میں تو پاش پاش ہو جاتا اور اس کا مطلب یقینی موت تھا۔ شاید نیچے اتر کر وہ اپنی قسمت آزمائی کرنا چاہتا تھا۔ لگتا یہی تھا کہ ان کے پاس اب کوئی لوڈیڈ ہتھیار نہیں تھا۔ اس لیے جواباً ادھر سے کوئی گولی نہیں آئی تھی۔

وہ ہیلی کاپٹر کو بحفاظت اتارنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے دروازہ کھلتے اور حشمت خان کو چھلانگ لگا کر اترتے دیکھا' پھر میں نے دیکھا وہ ایک نہایت عمر رسیدہ آدمی کو سہارا دے کر ہیلی کاپٹر سے اتارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے بال برف کی طرح سفید مگر صورت الٹے توے کی طرح سیاہ تھی۔ اس کی کمر جھکی ہوئی تھی۔

حشمت خان کے سہارے وہ بڑی مشکل سے ہیلی کاپٹر سے اترنے میں کامیاب ہوا اور وہ دونوں گرتے پڑتے پہاڑی راستے پر بھاگنے لگے۔ نواب شرافت کی وجہ سے اس کے بیٹے کو بھاگنے میں دقت پیش آرہی تھی کیونکہ نواب سے بھاگا نہیں جا رہا تھا۔ اس کے بوڑھے

جسم میں طاقت ہی کہاں تھی۔

میں اس کھنڈر ہوتے انسان کو دیکھ کر دم بخود سا رہ گیا۔ میں اس سے انتقام لینے آیا تھا؟ وہ تو میرا ایک تھپڑ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اسے دہشت کے عالم میں لنگڑاتے اور گرتے پڑتے اپنے بیٹے کے ساتھ گھسٹتے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے تو مجھے ترس آیا مگر پھر مجھے امی کی ڈائری کے مندرجات یاد آگئے اور میرے جسم میں گویا انگارے بھر گئے۔ ہر مسام جاں سے شعلے پھوٹنے لگے۔

اس وقت تک پی چن نے بھی ہیلی کاپٹر نیچے اتار لیا تھا۔ اس نے اپنا ہیلمٹ وغیرہ ہٹا لیا تھا۔ حشمت اور شرافت کے پاس یقیناً کوئی لوڈیڈ ہتھیار نہیں تھا ورنہ وہ رک کر ہم پر فائر کرنے کی کوشش ضرور کرتے۔

پی چن قدرے حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "تم ان پر برسٹ مار کر ان کا قصہ ختم کیوں نہیں کر دیتے؟"

میں نے گویا کسی خواب سے چونکتے ہوئے کہا۔ "میں انہیں اتنی آسان موت مارنا نہیں چاہتا۔"

تاہم میں نے اس طرح فائر کیا کہ حشمت خان کی صرف ایک ٹانگ میں گولی لگی' وہ گر پڑا۔ اس کا باپ گولی کھائے بغیر ہی اس کے ساتھ گر پڑا۔ انہوں نے اٹھ کر دوبارہ بھاگنے کی کوشش کی مگر ان سے دو قدم بھی نہ چلا گیا۔

تب میں ہیلی کاپٹر سے اتر کر ایک پاؤں گھسیٹتا ان کے قریب پہنچا۔ گن میں نے پی چن کو تھما دی تھی۔ میں خالی ہاتھ تھا۔ میں نے ایک ایک ہاتھ سے ان دونوں کو بالوں سے پکڑ کر اٹھایا۔ نواب شرافت علی کی شکل واقعی اس کے اعمال کی طرح کریہہ تھی لیکن بیٹا وجیہہ تھا۔ نہ جانے وہ اس کا بیٹا تھا بھی یا نہیں؟ لیکن اعمال تو یہی بتاتے تھے کہ اس کی رگوں میں ایسے ہی باپ کا خون دوڑ رہا تھا۔

"بس.....اتنی ہی طاقت تھی بھاگنے کی؟" میں نے پوچھا' مجھے خود اپنی آواز سانپ کی پھنکار سے مشابہ محسوس ہوئی۔

نواب شرافت علی خوف' مشقت اور نقاہت کے باعث تھرتھر کانپ رہا تھا۔ کوئی وقت ہوگا کہ اسے دیکھ کر نہ جانے کتنے لوگ کانپتے ہوں گے مگر آج اس کی کیفیت خزاں رسیدہ پتے کی سی تھی۔ میں نے ان دونوں کے منہ پر تھوک دیا۔

حشمت خان نے مجھے ہنستا دیکھ کر گھونسہ رسید کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے ایک ہی بازو سے اسے پتھریلی زمین پر پٹخ دیا۔ پھر میں نے انہیں ایک پاؤں کی ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ میرے مضبوط جوتے ٹوٹ چکے تھے لیکن اب بھی ان کی ٹھوکریں تکلیف دہ تھیں۔ وہ تڑپنے اور بلبلانے لگے۔ شرافت علی کو میں کم ٹھوکریں رسید کر رہا تھا کہ وہ کہیں جلدی نہ

مر جائے۔

کچھ ہی دیر میں وہ لہو میں لتھڑے ہوئے گوشت کی گٹھڑیاں سی بن کر رہ گئے۔ اس دوران وہ تڑپتے رہے' سسکتے رہے' معافیاں مانگتے رہے مگر ان کے الفاظ میری سماعت کے گنبدوں سے ٹکرا کر لوٹتے رہے۔ آخرکار ان میں چیخنے چلانے کی بھی سکت نہ رہی۔ وہ اب صرف ہچکیاں اور سسکیاں سی لے رہے تھے۔ ان کے وجود گویا پلپلے ہو چکے تھے اور تشنجی سے انداز میں جھٹکے کھا رہے تھے۔

میں نے شرافت علی کے خون میں لتھڑے ہوئے سفید بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر اس کا چہرہ اوپر کیا اور اس پر جھکتے ہوئے کہا۔ "مجھے پہچاننے کی کوشش کرو نواب شرافت علی خان! میں عزیزہ خانم کا بیٹا ہوں..... تمہیں یاد ہے عزیزہ خانم کون تھی اور تم نے اس کے ساتھ کیا کچھ کیا تھا؟"

اس کے خون آلود چہرے کے عضلات پھڑپھڑائے اور اس نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی مگر خون اس کی آنکھوں میں پھسل آیا۔ میں چاہتا تھا' وہ کچھ بولے' کوئی جواب دے مگر وہ کچھ بھی نہیں بول رہا تھا۔

پی چن میرے قریب آئی' وہ گویا مقصد سمجھتے ہوئے بولی۔ "تم انہیں کسی عبرت انگیز طریقے سے مارنا چاہتے ہو ناں"

میں صرف اثبات میں سرہلا کر رہ گیا۔ شدت غیظ و غضب سے میرے حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ چہرے ان دونوں کے لہولہان تھے لیکن خون درحقیقت مجھ پر سوار تھا۔

"ذرا نیچے دیکھو....." اس نے پہاڑی کے نشیب میں اشارہ کیا۔

میں نے جھک کر دیکھا' نشیب میں ایک گدلی نہر سی بہ رہی تھی۔ پاٹ خاصا چوڑا تھا۔ اسے چھوٹا موٹا دریا کہا جا سکتا تھا۔ پی چن بولی۔ "انہیں اس میں پھینک دو۔"

"ڈوب کر مرنا کوئی ایسی عبرت انگیز موت تو نہیں ہے۔" میں نے گھٹی گھٹی آواز میں بڑی مشکل سے کہا۔

"ان کے ڈوب مرنے کی نوبت نہیں آئے گی۔" پی چن بولی۔ "اس ندی میں مگرمچھ پائے جاتے ہیں.....اور تمہیں معلوم ہے مگرمچھ اپنے شکار کو کیسے کھاتا ہے؟"

"شاید وہ انہیں نگل جاتا ہے۔" میں نے کہا۔

پی چن نے نفی میں سرہلایا۔ "انسان جتنے بڑے شکار کو وہ نہ تو نگل پاتا ہے اور نہ ہی اس کے دانت چبانے کے کام آتے ہیں۔ وہ انسان کو جبڑے میں نوکیلے دانتوں کی مدد سے پھنسا کر کسی درخت پر مارتا ہے اور اس وقت تک مارتا رہتا ہے جب تک اس کا جسم ملغوبہ نہیں بن جاتا۔ اس ملغوبے کو وہ نگلتا ہے۔

میں نے طمانیت سے سرہلایا اور دونوں باپ بیٹوں کو گھسیٹ کر نشیب میں پھینک دیا۔

ان میں بولنے اور حرکت کرنے کی سکت نہیں تھی مگر اس وقت ان کی چیخیں فضا میں گونج
کر رہ گئیں- پانی میں ان کے گرنے کا زوردار چھپاکا سنائی دیا- میں نے جھانک کر دیکھا-
چند لمحے بعد وہ دونوں سطح آب پر نمودار ہوئے مگر اس طرح کہ حشمت خان کا سر اور
کندھے ایک دیو پیکر مگرمچھ کے جبڑوں میں تھے اور نواب شرافت علی خان کی ٹانگیں-
مگرمچھ اس طرح انہیں دبوچے بڑے ست اور کاہلی آمیز انداز میں کنارے پر آئے-
درخت خاصے دور تھے مگر وہ دھیرے دھیرے چلتے ہوئے ان کے پھڑکتے جسموں کو منہ میں
دبائے ان تک پہنچ ہی گئے- پھر وہ انہیں اس طرح درختوں پر مارنے لگے جیسے دھوبی کپڑوں
کو سل پر پٹختا ہے- وہ میری زندگی کا ایک حیرت انگیز اور ناقابل فراموش منظر تھا- چند لمحے
بعد خون کے چھینٹے اڑ اڑ کر دور تک جانے لگے- کچھ دیر دیکھتے رہنے کے بعد مجھے ابکائی سی
آگئی اور میں پیچھے ہٹ آیا- میرے وجود میں ٹھنڈک سی اتر آئی تھی مگر میرے اعصاب
اب بھی مرتعش تھے-

آخرکار نیچے سے دھمک کی سی آوازیں سنائی دینا بند ہو گئیں- اس کے چند لمحے بعد ہی
میں نے نیچے جھانک کر دیکھا تو وہاں نہ حشمت خان تھا اور نہ ہی اس کا باپ شرافت خان-
مگرمچھ بھی واپس پانی میں چلے گئے تھے- بس درختوں کے تنے گوشت اور خون کے ملغوبے
سے لتھڑے رہ گئے تھے-

ایک صرف صرف ایک جوتا پڑا رہ گیا تھا اور اس میں پنڈلی کی ہڈی اٹکی رہ گئی تھی-
اس ہڈی پر ذرا بھی گوشت نہیں تھا- جوتے سے نکلی ہوئی وہ لمبی سی ہڈی نہ جانے کیوں کچھ
ڈراؤنی سی لگ رہی تھی- میں جھرجھری سی لے کر اور کراہیت سی محسوس کرتے ہوئے پیچھے
ہٹ آیا-

چند لمحے تک میں وہیں کھڑا گہری گہری سانسیں لیتا رہا- پی چن نے بھی مجھ سے واپس
چلنے کے لیے نہیں کہا- وہ بغور میری کیفیت کا جائزہ لے رہی تھی- میرے دل میں اس
وقت ایک عجیب سناٹا پھیلا ہوا تھا جبکہ میرے ذہن میں خیالات کا ایک ہجوم تھا- اپنی ساری
جدوجہد کی ایک فلم سی میری نگاہوں میں گھوم رہی تھی- اک عمر کی تلاش اور ایک طویل
جاں گسل جدوجہد کے بعد اصل دشمن چند سیکنڈ میں ٹھکانے پر لگ گیا تھا- انتقام کی ایک
طویل اور اذیت ناک کہانی کو چند لمحوں میں اختتام مل گیا تھا-
جب یہ منزلیں سر نہیں ہوئی تھیں تو میں ان کے بارے میں سوچتا تھا' نہ جانے کیا کیا
تیاریاں کرتا تھا' کیا کیا پروگرام بناتا تھا- مجھے محسوس ہوتا تھا کہ مجھے صدیوں کا سفر درپیش تھا
لیکن اب جبکہ سفر طے ہو گیا تھا تو جیسے رگ و پے میں ایک یخ بستگی سی پھیل گئی تھی اور
میں اپنے آپ سے پوچھ رہا تھا- "بس......! اتنی سی بات تھی-"
میں نے اس عفریت کو نیست و نابود کر دیا تھا اور میں اب محسوس کر رہا تھا کہ یہ تو

محض ایک ہوا تھا جو وقت نے میرے سامنے کھڑا کر دیا تھا- ویسے بھی جب انتہائی دشوار کام
بھی تکمیل پا جاتے ہیں تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ تو کچھ ایسا مشکل کام نہیں تھا- آدھ
پون گھنٹہ پہلے تک مجھے اپنی زندگی کا بھروسہ نہیں تھا- ہر قدم پر میں یہی محسوس کر رہا تھا
کہ موت مجھے نگلنے لگی ہے......لیکن میں موت سے بچتا چلا آیا تھا اور اس خبیث کے لیے
موت بن گیا تھا جس کا ایک خبیث جانشین بھی اس سے زیادہ طاقت پکڑ رہا تھا-
آخر پی چن میرا ہاتھ تھامتے ہوئے ملامت سے بولی- "چلو......اب واپس چلتے ہیں-"
میں اپنے پاؤں میں پھنسے شکنجے کو گھسیٹتا اس کے ساتھ واپس ہیلی کاپٹر میں آبیٹھا- اب
وہاں رکنا فضول تھا- مجھے معلوم تھا کہ جذبات کی آندھیاں تو نہ جانے کب تک میرے وجود
میں چلتی رہیں گی لیکن مجھے کچھ ضروری کام نمٹانے تھے- ہیلی کاپٹر فضا میں بلند ہو چکا تو میں
نے نیچے چٹانوں کے لامتناہی سلسلے پر نظر ڈالتے ہوئے پوچھا- "اب تم واپس وادی کی طرف
جا رہی ہو ناں؟"
اس نے اثبات میں سر ہلایا تو میں نے کہا- "پرواز ذرا نیچی ہی رکھو تو میں راستے میں وہ
مقام بھی دیکھ لوں جہاں میں کچھ دیر کے لیے اترنا چاہتا ہوں-"
"وہی جگہ تو نہیں جہاں سے تم میرے ساتھ روانہ ہوئے تھے-" اس نے ہیلی کاپٹر کو
بتدریج نیچے لاتے ہوئے پوچھا-
"نہیں......میرا خیال ہے' وہ جگہ اس سے کافی آگے ہوگی- صحیح محل وقوع کا مجھے
اندازہ نہیں-" میں نے جواب دیا- "بہرحال وہاں چوبی تختوں اور گھاس پھوس سے بنا ہوا
ایک مکان موجود ہے جو دور سے ہی نظر آجائے گا-"
اب ہم چٹانوں کی چوٹیوں کو تقریباً چھوتے ہوئے گزر رہے تھے- وہ میدان ہمیں نظر
آچکا تھا جہاں سے ہم حشمت خان کے تعاقب میں روانہ ہوئے تھے- اس کے بعد کا وہ
راستہ جو میں نے سرنگ میں طے کیا تھا اور مجھے میلوں طویل محسوس ہوا تھا' اب بے حد
مختصر لگا- سرنگ تو نہ جانے کہاں تھی' وہ مکان البتہ مجھے جلد ہی نظر آگیا-
ایک مناسب سی جگہ دیکھ کر پی چن نے ہیلی کاپٹر اتارا- میں ہیلی کاپٹر سے اترنے لگا تو
میرے پاؤں میں پھنسا ہوا شکنجہ ایک بار پھر دروازے میں پھنس گیا-
"اوہ......اس کو تو میں بھول ہی گئی تھی-" پی چن چونک کر بولی- "پہلے تو اس کا علاج
کرنا چاہیے- اس نے کنٹرول بورڈ کے نیچے بنا ہوا ایک خانہ کھولا- اس میں طرح طرح کے
چھوٹے بڑے اوزار بھرے ہوئے تھے- اس نے دھات کاٹنے والی ایک پتلی سی آری نکالی
اور مسکراتے ہوئے بولی- "یہ مہماتی ہیلی کاپٹر ہے- اس میں بڑی بڑی عجیب چیزیں ہیں بلکہ
یوں کہو کہ بے شمار الجھنوں کے حل موجود ہیں-"
وہ آری سیدھی کرکے میرے پاؤں کی طرف جھکنے لگی لیکن میں نے آری اس کے ہاتھ

سے لے لی اور سیٹ پر بیٹھے ہی بیٹھے جھک کر شکنجے کا ایک نسبتاً پتلا حصہ منتخب کرکے اس پر آری چلانی شروع کی۔ عمدہ آری نے چند منٹ میں ہی اس سلاخ نما حصہ کو کاٹ ڈالا اور میرا پاؤں اس عذاب سے آزاد ہو گیا۔ میں نے جوتا اور اونی موزہ اتار کر دیکھا۔ اتنی دبیز تہوں کے تحفظ کے باوجود میرے ٹخنے کی کھال پھٹ چکی تھی اور خاصا خون موزے میں جمع ہو چکا تھا۔ پی چن سے ایک کپڑا لے کر پاؤں صاف کرکے میں نے دوبارہ جوتا پہن لیا۔ شکنجہ دروازے میں سے نکال کر ایک طرف پھینکا اور پی چن کو وہیں بیٹھنے کا اشارہ کرکے میں مکان کی طرف چلا گیا۔

کچھ دیر میں ہیروں کا تھیلا اٹھائے واپس آیا تو پی چن کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "کیا یہ پورا کا پورا ہیروں سے بھرا ہوا ہے؟" اس نے بے چینی سے پوچھا۔

"بے شک......" میں نے جواب دیا۔

"اور یہ اس جھونپڑی میں پڑا ہوا تھا؟" وہ حیرت سے بولی۔ "اگر ہم اسے لے کر بلجیم چلے جائیں تو ہیروں کی مارکیٹ میں ہول سیل ڈیلر کے طور پر کاروبار کر سکتے ہیں۔"

"ابھی ذرا دیکھتی جاؤ۔" میں تھیلا پچھلی سیٹ پر رکھ کر اس کا منہ بند کرکے دوبارہ مکان کی طرف گیا۔ دوسرے چکر میں نوٹوں سے اور تیسرے چکر میں بیش قیمت زیورات سے بھرا ہوا تھیلا بھی اٹھا کر میں ہیلی کاپٹر میں رکھ چکا تو پی چن انگشت بدنداں رہ گئی۔

"دولت ہمیشہ ہمارے ہاتھ کا میل رہی ہے....." وہ بالآخر بولی۔ "اس کے باوجود مجھے یہ اعتراف کرنے میں عار نہیں کہ یکمشت اتنی دولت میں نے پہلی بار دیکھی ہے۔"

"یہی بات میں بھی کہہ سکتا ہوں۔" میں نے کہا "حالانکہ کمانے میں کچھ کسر ہم نے بھی نہیں چھوڑی۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ اس بدبخت کی زندگی کا ہر لمحہ دولت جمع کرنے میں صرف ہوتا تھا۔" وہ ہیلمٹ پہنتے پہنتے میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ "ویسے میں تمہیں ایک سچی بات بتاؤں......اگر اتنی دولت میں تمہارے اور اپنے باپ کے سوا کسی اور کے پاس دیکھتی تو شاید اسے گولی مار کر ساری کی ساری لے اڑتی۔" ہیلی کاپٹر ہوا میں بلند ہو چکا تھا تو اس نے پوچھا۔ "اب تم کیا کرو گے اس دولت کا؟ بمبئی لے جاؤ گے؟"

"نہیں......" میں نے جواب دیا۔ "دیکھتی جاؤ۔"



اس بار پی چن نے ہیلی کاپٹر جہاں اتارا' اس ہموار قطع زمین سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک طویل و عریض میدان نظر آرہا تھا جس کے گرد خاردار تاروں کی باقاعدہ حد بندی موجود تھی اور ایک سرے پر خوبصورت اسٹیج اور شامیانہ سا لگا ہوا نظر آرہا تھا۔ یہ غالباً وہی بڑا میدان تھا جس کا ذکر میں کئی بار سن چکا تھا۔ بستی کے تمام اہم اجتماعات غالباً یہیں ہوتے تھے۔

اس وقت بھی وہاں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ کچھ لوگ خالی اسٹیج کے گرد جمع تھے۔ کچھ کسی طرف جا رہے تھے۔ کچھ کسی طرف اور کسی کسی طرف سے مردوں اور عورتوں کی ٹولیاں واپس آرہی تھیں۔ ہیلی کاپٹر کی آواز سن کر سب ہماری طرف متوجہ ہو چکے تھے۔

پھر میں نے ایک طرف سے ایک خوبصورت اور شاہانہ طرز کی بگھی آتے دیکھی۔ کچھ لوگ اس کے ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے۔ اس وقت میں اور پی چن ہیلی کاپٹر سے اتر چکے تھے اور میدان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جب بگھی رکی اور اس کا پردہ اٹھتے ہی سینڈریلا نیچے کودی' وہ اس وقت ایک لمبا سا سفید لبادہ پہنے ہوئے تھی۔ سر پر ایک اسکارف سا باندھا ہوا تھا۔ پیروں میں فل بوٹ تھے۔ وہ دور سے شاید راہبہ نظر آتی لیکن اسکا چہرہ کسی راہبہ کا چہرہ ہرگز نہیں تھا۔ اس چہرے پر زندگی کی تب و تاب اور حسن و دلکشی کا ہالہ دور سے ہی دیکھا جا سکتا تھا جو سراسر رہبانیت کی ضد تھا۔ اس وقت تو یہ چہرہ کچھ اور بھی دمک رہا تھا' تمتما رہا تھا۔

اس نے سہارا دے کر بگھی سے جسے اتارا' وہ کیٹی تھی۔ اسی لمحے سینڈریلا نے مجھے اور پی چن کو دیکھ لیا اور کیٹی کو وہیں چھوڑ کر تیزی سے ہماری طرف لپکی۔ "تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟ میں تو سو طرح کے وسوسوں میں مبتلا ہو گئی تھی۔ مجھے اندیشہ ہو چلا تھا کہ حشمت خان سے معرکے میں خدانخواستہ ......" اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

میں کچھ کہے بغیر تیزی سے کیٹی کی طرف بڑھا جو بگھی کا سہارا لیے کھڑی تھی۔ اس پر جتنا تشدد ہو چکا تھا' اس کے باعث اس کی حالت تو ابتر تھی ہی لیکن اب میری طرف دیکھتے ہوئے اس کے زخمی چہرے اور تھکی تھکی سی آنکھوں میں ایک عجیب سی یاسیت سمٹ آئی تھی جیسے اسے شکوہ ہو کہ میں سینڈریلا اور پی چن جیسی حسیناؤں کی موجودگی میں اسے بھول

سیٹھا تھا حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اس نے ذہنی اور جسمانی طور پر اتنی تکلیف اٹھائی تھی کہ اس کی آنکھوں میں یہ تاثر جھلک آیا تھا ورنہ وہ گلہ شکوہ کرنے والی عورت نہیں تھی۔

میں نے اسے کندھوں سے تھام لیا۔ اس کی متورم آنکھوں میں جھانکا اور صرف اتنا کہا۔ "کیٹی! میں ہمیشہ تمہارا شکرگزار رہوں گا کہ میری خاطر تم نے اتنی تکلیف برداشت کی۔"

وہ جیسے اپنی ساری تکلیف بھول کر میری بانہوں میں سمٹ آئی اور سوجے ہوئے ہونٹوں کو بمشکل حرکت دے کر مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ "بس مجھے صلے میں یہی چند الفاظ درکار تھے۔"

مجھے اس وقت وہ دنیا کی حسین ترین عورت معلوم ہو رہی تھی۔ "بس کچھ دیر اور بے آرامی برداشت کر لو کیٹی! پھر ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے اور میں جلد از جلد تمہارے آرام و آسائش اور علاج کا انتظام کروں گا۔"

"تم میری فکر نہ کرو۔" اس نے ایک بار پھر مسکرانے کی کوشش کی اور مجھ سے قدم ملا کر چلنے لگی۔ "میں اتنی بری حالت میں نہیں ہوں' جتنی میں نظر آ رہی ہوں۔"

بلا کا حوصلہ تھا اس میں!

سینڈریلا اور پی چن ہم سے آن ملی تھیں۔ میں نے ان کا تعارف کرانے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور سینڈریلا نے بھی پی چن کے متعلق کچھ نہیں پوچھا۔

"اب کیا پروگرام ہے؟ پی چن نے یوں پوچھا جیسے اسے واپس جانے کی جلدی ہو۔ "کیا تم میرے ساتھ واپس کھٹمنڈو چلنا پسند کرو گے؟"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ "لیکن ذرا ٹھہر کر......"

"کچھ دیر نہیں' تمہیں بہت دن یہاں ٹھہرنا پڑے گا۔" سینڈریلا جلدی سے بولی۔ "میں بستی والوں سے خطاب کرتے وقت تمہارا تفصیلی ذکر کر چکی ہوں۔ تمہیں اپنا اور اس بستی کا نجات دہندہ قرار دے چکی ہوں۔ ابھی تو تمہیں بستی والوں سے خطاب بھی کرنا پڑے گا۔"

"مجھے بخش دو سینڈریلا!" میں نے جلدی سے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ "تقریر وغیرہ میرے بس کی بات نہیں۔ مستقبل میں بھی میرا لیڈر بننے کا کوئی ارادہ نہیں۔ اس لیے تمہیں بستی والوں سے جو کچھ کہنا ہے' خود ہی کہتی رہو۔ ویسے بھی مجھے ان کی زبان نہیں آتی اور انگریزی سب ہی تو نہیں سمجھتے ہوں گے۔"

"تمہاری تقریر کا ترجمہ ساتھ ساتھ سنوایا جائے گا۔" سینڈریلا بولی۔

"میں اس کے باوجود تیار نہیں۔" میں نے دوبارہ ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ "البتہ بستی

والوں کی ایک امانت میرے پاس ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ تم بستی والوں میں فرداً فرداً تقسیم کر دو۔ یہ سب تمہارے عقیدت مند تو ہیں ہی لیکن یوں وہ ہمیشہ کے لیے تمہارے بے دام غلام بن کر رہ جائیں گے کیونکہ میں جہاں تک سمجھ پایا ہوں' دنیا کے بیشتر انسانوں کی طرح ان کا مسئلہ بھی معاشی ہے۔"

ہم اس وقت میدان سے قدرے فاصلے پر ایک چھپر کے نیچے قدرے کم روشنی میں کھڑے تھے۔ لوگ جو غالباً میدان ہی سے گئے ہوئے تھے' تیزی سے آ رہے تھے اور میدان بھرتا جا رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تھوڑی دیر بعد وہاں تل دھرنے کو جگہ نہیں رہے گی۔

سینڈریلا کی سمجھ میں شاید میری بات نہیں آسکی تھی لیکن جب میں نے اسے ساتھ لے جا کر ہیلی کاپٹر سے ہیروں' نوٹوں اور زیورات کے بڑے بڑے تھیلے اتار کر دکھائے تو وہ بھی پی چن کی طرح خاصی حیران نظر آئی لیکن اس کی حیرت اس وقت دوچند ہو گئی۔ جب میں نے کہا۔ "دو تین آدمیوں کو بلا کر یہ تھیلے اسٹیج پر پہنچاؤ اور اپنی اس رعایا میں تقسیم کر دو۔"

"کس طرح تقسیم ہوگی؟ یہ مختلف مالیتوں کی چیزیں ہیں۔" وہ قدرے پریشانی سے بولی۔

"لنگر کی طرح۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ تم مالیت کی فکر میں نہ پڑو۔ بس یہ دیکھنا کہ ہر ایک کو کچھ نہ کچھ مل جائے۔ کسی کو ہیرا' کسی کو نقدی' کسی کو زیور اور کوئی محروم نہ رہ جائے۔"

پھر میں نے تھیلے ہیلی کاپٹر سے اتار کر زمین پر رکھتے ہوئے کہا۔ "اور میری تعریف میں بستی والوں کے سامنے زمین و آسمان کے قلابے ملانے کی ضرورت نہیں۔ میں تو ایک بہت حقیر سا انسان ہوں اور پھر میں بستی والوں پر کوئی احسان کرکے نہیں جا رہا۔ میں یہاں اپنے ایک کام سے آیا تھا' وہ پورا کرکے جا رہا ہوں۔"

میں نے پی چن کو پائلٹ سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود کیٹی کو سہارا دے کر اوپر چڑھایا۔ ہم دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ ہیلی کاپٹر میں پائلٹ سمیت چار افراد کی گنجائش تھی۔ ہم بیٹھ چکے تھے تو میں نے جھک کر کہا۔ "بس ......ہم تو اب جا رہے ہیں' تم اپنا کام کرو۔"

سینڈریلا دم بخود سی کھڑی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں نمی کی جھلملاہٹ بھی محسوس کی۔ اس جھلملاہٹ کے ساتھ ساتھ ایک بے عنوان سی حیرت بھی اس کی آنکھوں میں جاگزیں تھی جیسے اسے یقین نہ آرہا ہو کہ میں یہ سب کچھ کرکے اس طرح اچانک رخصت بھی ہو سکتا ہوں۔ ان گنت' ان کہی باتیں گویا اس کے ہونٹوں پر ہی دم توڑ کر رہ گئی تھیں۔ وہ نہ جانے کیا کچھ سوچ بیٹھی تھی لیکن میں اب کئی وجوہات کی بنا پر یہاں ایک ٹ بھی فاضل گزارنا نہیں چاہتا تھا۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ میرا مشن ختم ہو چکا تھا اور

محض جذباتیت کے مظاہروں' فضول کاموں یا ستانے میں وقت ضائع کرنے کا میں خواہش مند نہیں تھا۔

دوسری بات جو زیادہ اہم تھی' وہ یہ کہ سینڈریلا انہی عورتوں میں سے تھی جنہیں میں اصطلاح میں ساحر عورتیں کہا کرتا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ میں جتنا زیادہ وقت اس کے ساتھ گزاروں گا' اتنا ہی وہ مجھے مسحور کر لے گی' اپنی ذات کا اسیر بنا لے گی اور میری زندگی میں کسی کی بھی ذات کا اسیر بننے کی گنجائش نہیں تھی۔ گو کہ مجھے اپنی ذات پر اعتماد بھی تھا کہ جب تک میں خود نہ چاہوں' مجھ پر کسی کا سحر اثرانداز نہیں ہو سکتا لیکن میں پھر بھی ایسے معاملات میں فی الحال خود پر بھی بھروسہ نہیں کرتا تھا۔

ہیلی کاپٹر کے پر تیزی سے گھومنے لگے تو سینڈریلا دور چلی گئی۔ اب دن کی روشنی پوری طرح اس پر پڑ رہی تھی۔ وہ اب بھی دم بخود سی نظر آرہی تھی گویا جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھ رہی ہو جس نے اسے حیرتوں کے چنگل میں دھکیل دیا ہو۔ اب سبھی ہماری طرف متوجہ ہو چکے تھے۔ کچھ لوگ سینڈریلا کے گرد جمع ہو چکے تھے۔ وہ بستی کے معززین معلوم ہوتے تھے جو ہیلی کاپٹر کی طرف اشارہ کرکے سینڈریلا سے غالباً ہمارے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ وہ کافی پرجوش نظر آرہے تھے لیکن سنڈریلا جیسے ان کی آوازیں سن ہی نہیں رہی تھی۔ کچھ لوگ ہچکچاہٹ آمیز انداز میں ہیلی کاپٹر کی طرف بھی بڑھے لیکن پی چن نے اسی وقت تھروٹل کھینچا اور ہیلی کاپٹر ہوا میں بلند ہونے لگا۔

کچھ دیر بعد وادی' اس کے مکین' سینڈریلا سب نیچے اور بہت پیچھے رہ گئے۔ میں افق پر پھیلی کنکنی دھوپ کو دیکھ رہا تھا اور اب مجھے بھی گزری ہوئی شب محض ایک خواب محسوس ہونے لگی تھی۔ ایک پرہنگامہ خواب مگر جسم و جان میں اب جو تھکن اور سستی محسوس ہونے لگی' وہ گواہی دے رہی تھی کہ گزشتہ شب کے ہنگامے خواب نہیں حقیقت تھے۔

پی چن نے جب سے پرواز شروع کی تھی' وہ بالکل چپ چپ اور لاتعلق سی نظر آرہی تھی۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ میری آنکھیں غنودگی میں بند نہ ہو جائیں۔ میں نے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے کیٹی کی طرف دیکھا۔ وہ بھی خلاء میں نہ جانے کس چیز کو گھور رہی تھی' چونک کر میری طرف متوجہ ہوئی' پھر جھرجھری سی لے کر میرے کچھ اور قریب کھسک آئی جیسے اب بھی کچھ غیر مرئی عفریت اسے ڈرا رہے ہوں۔

کھٹمنڈو پہنچ کر کیٹی کو ایک پرائیویٹ ہسپتال میں داخل کرنا پڑا جہاں کے ڈاکٹروں نے بتایا کہ اسے مکمل طور پر صحت یاب ہونے میں کئی دن لگیں گے اور اگر اس کے علاج میں مزید ذرا بھی تاخیر کی گئی تو اس کی چوٹیں اور زخم وغیرہ بگڑتے چلے جائیں گے۔ پی چن اور اس کے باپ لیوتانگ نے اسے داخل کرانے کا بندوبست کیا تھا اور مجھے اپنے ساتھ گھر لے آئے تھے۔ چائنا ٹاؤن میں واقع وہی پراسرار سا گھر جس کے بیرونی حصے میں نام نہاد

نوادرات کی وہ عسرت زدہ سی دکان تھی۔

اندر سے لیوتانگ کا گھر آراستہ و پیراستہ' نہایت شاندار اور پرآسائش تھا۔ پہلے دن تو میں لمبی تان کر سوتا رہا۔ اپنی پیشانی اور خساروں پر گرم و گداز ہاتھوں کا لمس محسوس کرکے میں بیدار ہوا۔ طویل و عریض اور اونچی چھت والی خوابگاہ جس کی کھڑکیوں اور دروازوں پر قدیم طرز کے ریشمی پردے سرسرا رہے تھے' ملگجے اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ خوابناک نیلگوں روشنی والے نائٹ لیمپ نے اندھیرا ہلکا کر رکھا تھا اور میں اپنے بیڈ کے کنارے بیٹھی ہوئی پی چن کے دلکش سراپا کو خاصی حد تک صاف طور پر دیکھ سکتا تھا۔ وہ مجھے نہ بھی نظر آتی تب بھی میں اس کی موجودگی محسوس کر سکتا تھا۔ اب مجھے اس کے وجود کی خوشبو کی پہچان ہو چکی تھی۔

"رات کے نو بج رہے ہیں۔" وہ مجھے آنکھیں کھولتے دیکھ کر سرگوشی میں بولی۔ "اٹھ کر کم از کم کھانا ضرور کھا لو۔ اس کے بعد خواہ دوبارہ سوتے رہنا۔"

اس نے کھانے کا نام لیا تو جیسے میرے معدے میں یک لخت ٹیس سی اٹھی اور مجھے احساس ہوا کہ میں نے گزشتہ چھتیس گھنٹوں میں صرف آج دوپہر پی چن کے گھر پہنچنے کے بعد سوپ کا ایک پیالہ پیا تھا۔

پی چن کی قربت شاید میرے اعصاب میں آگ لگا دیتی' اس لیے میں فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا اور باتھ روم میں جا گھسا۔ کچھ دیر بعد میں نہا دھو کر کھانے کی میز پر پہنچا تو وہاں پی چن اور اس کے باپ لیوتانگ کے علاوہ ایک نوجوان بھی موجود تھا۔ اس کی عمر غالباً انیس بیس سال سے زیادہ نہیں تھی لیکن اس کا جسم ایک سانڈ کی طرح مضبوط اور پھیلا پھیلا نظر آرہا تھا۔ قد اس کا چھوٹا ہی تھا' اس لیے جسم کا پھیلاؤ کچھ زیادہ ہی نمایاں معلوم ہوتا تھا۔

اس کا چہرہ خاصا چوڑا' رنگت سرخ اور ناک عام چینیوں کی طرح چپٹی تھی لیکن اس کی آنکھیں عام چینیوں کی طرح زردی مائل یا دھندلائی ہوئی سی نہیں تھیں بلکہ شعلوں کی طرح دہک رہی تھیں اور ان سے خونخواری عیاں تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہر وقت ہی بیٹھا کسی نہ کسی بات پر خار کھاتا رہتا ہے حتیٰ کہ اس نے میری آہٹ سن کر میری طرف بھی دیکھا تو اس طرح دیکھا جیسے میں نے اس کا کچھ چرا لیا ہو۔

پی چن تو جیسے ماحول سے لاتعلق بنی سر جھکائے بیٹھی رہی البتہ لیوتانگ نے اس نوجوان سے میرا تعارف کرایا۔ اس کا نام لی ین تھا اور یہ سن کر مجھے نہ جانے کیوں کچھ حیرت سی ہوئی کہ وہ پی چن کا منگیتر تھا۔ اس نے میز کے دوسری طرف سے مصافحے کے لیے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس کا ہاتھ بیلچے کی طرح مضبوط تھا۔ میرے تعارف کے جواب میں اس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ میں بھی خاموشی سے اس کے مقابل بیٹھ گیا۔ لیوتانگ نے بتایا کہ لی ین اسی گھر میں اوپر کی منزل پر رہتا ہے۔

کھانا یوں خاموشی سے کھایا گیا جیسے کوئی تعزیتی اجلاس منعقد ہو رہا ہو اور میرے خیال میں یہ لی ین کی موجودگی کا اثر تھا۔ مجھے کچھ بدمزگی سی محسوس ہوئی اور میں کھانے سے فارغ ہوتے ہی دوبارہ اس خوابگاہ میں آلیٹا جو میرے لیے مخصوص کی گئی تھی۔ وہ اسپتال جس میں کیٹی کو داخل کرایا گیا تھا گو کہ پرائیویٹ تھا لیکن رات کے وقت ملاقاتیوں کی آمد پر وہاں بھی سخت پابندی تھی ورنہ شاید اس وقت میں وہیں چلا جاتا۔ بہرحال کچھ دیر کروٹیں بدلنے کے بعد میں سو گیا۔

رات کے نہ جانے کس پہر ایک حسین خواب شروع ہوا جس کا محور و مرکز لی چن تھی اور جب وہ طویل خواب اختتام پذیر سا ہونے لگا تو نہ جانے کیونکر مجھے احساس ہوا کہ درحقیقت وہ خواب نہیں تھا' لی چن کا گرم و گداز وجود حقیقتاً میری گرفت میں تھا۔ خاصے طویل وقفے کی خاموشی کے بعد میں نے اس کے مہکتے ریشمی بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ "تمہارے منگیتر سے مل کر قطعاً خوشی نہیں ہوئی۔"

"میں بھی اس کی منگیتر کہلا کر قطعاً خوش نہیں ہوں۔" اس نے سرگوشی میں جواب دیا۔

"پھر کیا مجبوری ہے؟ تم کوئی دیہات کی پروردہ ان پڑھ اور مجبور لڑکی تو نہیں ہو۔" میں نے کہا۔

"بعض معاملات میں ہم لوگ ان پڑھ دیہاتیوں اور بلا کے رجعت پسندوں سے بھی بدتر ہیں۔" وہ گہری سانس لے کر بولی۔ "بغاوت نہیں کر سکتے...... عہد نہیں توڑ سکتے۔" اس کے لہجے میں دکھ' تاسف اور محرومی تھی۔ "مجھے معلوم ہے کہ تم محض ایک خواب ہی ہو' نسیم سحری کا ایک جھونکا ہو' آج یہاں ہو' کل نجانے کہاں ہو گے......اور میری طلب محض جسم کی طلب نہیں ......لی ین بھی ظاہر ہے ایک جسم ہی کا نام ہے ......سب کچھ جانتے بوجھتے بھی نجانے کیوں میں تمہارے پہلو میں سمٹ آئی ہوں...... مجھے اپنے آپ پر اختیار نہیں رہا۔ شاید میری مثال تپتے صحرا میں سفر کرتے اس مسافر کی سی ہے جسے کوئی شجر سایہ دار نظر آجائے تو بے اختیار اس کی چھاؤں میں جا بیٹھے' محض ستانے کے لیے ......یہ تو اسے بھی معلوم ہوتا ہے کہ چھاؤں میں وہ سدا نہیں بیٹھ سکتا اور نہ ہی درخت کو یا چھاؤں کو ساتھ لے کر چل سکتا ہے۔ شاید تم یقین نہ کرو کہ میں اس قسم کی لڑکیوں میں نہیں ہوں جو ہر ہینڈسم مرد کو دیکھتے ہی دل ہاتھ سے چھوڑ بیٹھیں لیکن تمہیں پہلی بار ہی دیکھ کر دل کو نجانے کیا ہونے لگا تھا......"

"میں اسے اپنی خوش قسمتی پر محمول کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔

کچھ دیر بعد وہ چلی گئی۔ بالکل اسی طرح جیسے گلشن کے تمام پھولوں سے خوشبو چلی جائے۔ میرے دل میں وہ ایک عجیب سی نقش چھوڑ گئی تھی۔ میں دیر تک ملگجی روشنی میں

آنکھیں کھولے پڑا رہا اور اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ کچھ دیر پہلے تک وہ میرے اتنے قریب موجود تھی۔ کچھ دیر بعد بالآخر میں ایک بار پھر بے سدھ سو گیا۔

دوسری صبح لی چن نے میری ہدایت کے مطابق مجھے علی الصبح ہی جگا دیا۔ میں جلد از جلد کیٹی کی خبرگیری کے لیے جانا چاہتا تھا اور میرا دن بھر اسپتال میں رہنے کا ارادہ تھا۔ لی چن اور لیو تانگ تو پہلے ہی صبح جلد اٹھنے کے عادی معلوم ہوتے تھے۔ میں جب ناشتے کی میز پر پہنچا تو وہ دونوں ہی نہیں بلکہ لی ین بھی میز پر موجود تھا اور وہی گزشتہ رات کی سی بوجھل خاموشی میری منتظر تھی۔

ایک خاموش طبع ملازمہ نے ہم چاروں کو اپنی اپنی پسند کا ناشتہ دیا۔ ناشتہ کرکے میں نے لباس تبدیل کیا۔ لی چن نے نجانے کہاں سے میرے لیے ایک معقول قسم کے سوٹ کا بندوبست کر دیا تھا جو میرے جسم پر خاصا جچ گیا تھا۔ تیار ہو کر میں گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ چائنا ٹاؤن کی گلیاں اتنی تنگ تھیں کہ چھوٹی سے چھوٹی کار بھی ان میں آسانی سے نہیں گزر سکتی تھی۔ لیو تانگ یا لی چن کو کہیں دور جانا ہوتا تھا تو وہ گیرج تک پیدل جاتے تھے۔ گیرج میں دیکھ چکا تھا اور اس وقت ان کی کار کی چابی میرے ہی پاس تھی۔

میں نے ناشتے میں بلیک کافی بھی پی تھی۔ اس کے باوجود گھر سے نکلتے ہی مجھے احساس ہو رہا تھا کہ مجھ پر کچھ سستی سی طاری ہے جو کم ہونے کے بجائے لحہ بہ لحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک گلی سے گزرنے کے بعد میں دوسری گلی میں داخل ہوا تو چند قدم چل کر میری پلکیں بوجھل ہونے لگیں اور دل چاہنے لگا کہ میں وہیں لیٹ کر سو جاؤں۔ تنگ گلیوں اور اینٹوں کا ناہموار فرش بھی اس وقت مجھے بھلا معلوم ہونے لگا تھا لیکن ان گلیوں میں دونوں طرف گندے پانی کے نکاس کی نالیاں تھیں۔ ایک بار تو مجھے اندیشہ ہوا کہ میں نالی ہی میں نہ گر پڑوں۔

میں نے سالخوردہ اینٹوں پر ہاتھ رکھ کر ایک دیوار کا سہارا لیا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔ جو بار بار سر جھٹکنے کے باوجود دور نہیں ہو رہا تھا۔ اس لمحے مجھے یقین ہو گیا کہ مجھے کافی یا ناشتے کی کسی اور چیز میں کوئی خواب آور دوا دی گئی تھی اور چونکہ میں لی چن کے گھر میں اس قسم کا گمان بھی دل میں نہیں لا سکتا تھا' اس لیے میں نے کسی چیز کے ذائقے پر کوئی توجہ نہیں دی۔ حالانکہ مجھے ڈوز یقیناً خاصا طاقتور دیا گیا تھا جو اتنی تیزی سے میرے اعصاب شل ہوتے جا رہے تھے حتیٰ کہ واپسی کی بھی میں اپنے اندر ہمت نہیں پا رہا تھا۔

میرا آخری احساس یہ تھا کہ گلی کا فرش جیسے تیزی سے میرے چہرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ شاید میں نے دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر فرش کو اپنے چہرے سے ٹکرانے سے باز رکھنے

کی بھی کوشش کی تھی، اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا۔

آنکھ کھلی اور میرے حواس مکمل طور پر بحال ہوئے تو میں نے دیکھا کہ میرے ارد گرد بہت سے افراد موجود تھے۔ وہ دراصل ایک بہت بڑا مستطیل کمرہ تھا جو تہہ خانہ ہی معلوم ہوتا تھا۔ اس کی چھت بہت نیچی تھی اور وہاں روشنی بھی بہت زیادہ نہیں تھی۔ کچھ تو ہال ویسے ہی سیلن زدہ تھا۔ کچھ میرے جسم پر کوئی گرم کپڑا بھی باقی نہیں رہا تھا حتیٰ کہ پیروں میں جوتے بھی نہیں تھے اور میں کمرے کے وسط میں فرش پر چت پڑا تھا۔ یہ محسوس کرکے میں نے سکھ کی سانس لی کہ میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے نہیں تھے۔

میرے ارد گرد دیواروں کے ساتھ بالکل اسی طرح لکڑی کے بنچ لگے ہوئے تھے جس طرح ریلوے کی تھرڈ کلاس کی انتظارگاہوں میں لگے ہوتے ہیں۔ یہ بنچ خالی نہیں تھے، ان پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بالکل اسی انداز میں دس بارہ اشخاص بیٹھے ہوئے تھے جیسے وہ ٹرین کی آمد کے منتظر ہوں اور اس دوران نیم دلی سے ایسے دیہاتی کا تماشہ دیکھنے لگے ہوں جو اس کے درمیان فرش پر صندوق سرہانے رکھ کر سو گیا ہو۔

یہ بات میں نے پہلی ہی نظر میں محسوس کی کہ وہ سب کے سب چینی تھے۔ زرد چہرے، گول گول سی آنکھیں، چپٹی ناکیں، وہ مختلف عمروں اور مختلف جسامتوں کے لوگ تھے۔ ان میں سے کوئی نہایت ہی نحیف و نزار نظر آرہا تھا اور کوئی گٹھے ہوئے جسم کا مالک، لباس بھی کسی کا قدیم خلعت شاہانہ سے مشابہ تھا تو کوئی صرف بنیان اور پاجامے میں ہی تھا اور جیسے قبر سے اٹھ کر سیدھا ادھر ہی آگیا تھا۔

پھر میں نے کمرے کے ایک حصے میں گیس کا ایک بہت بڑا چولہا بھی دیکھا جس سے گیس کا بڑا سا سلنڈر منسلک تھا۔ اس چولہے پر جہاز سائز کی ایک کڑاہی رکھی تھی۔ میں چونکہ فرش پر لیٹا تھا، اس لیے یہ نہیں دیکھ سکتا تھا کہ کڑاہی خالی تھی یا اس میں کچھ موجود تھا، تاہم چولہا بند ہی تھا۔

میں نے ہاتھ پاؤں ہلانے کی کوشش کی لیکن میری ایک انگلی تک بھی حرکت میں نہیں آئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مجھے جو محلول پلایا گیا تھا، وہ جسم اور ذہن کو شل کر دینے کے معاملے میں انتہائی سریع الاثر اور طاقتور تھا۔ میرا ذہن تو کسی نہ کسی طرح دوبارہ کام کرنے کے قابل ہو گیا تھا لیکن جسم ابھی تک شل ہی تھا اور یہ بات ان سب کو معلوم تھی۔ اسی لئے وہ اتنے مطمئن بیٹھے تھے۔

دفعتاً کمرے کا دروازہ کھلا اور دو اشخاص تیزی سے اندر آگئے۔ ان میں سے ایک پی چن کا منگیتر لی ین تھا۔ وہ صرف ایک سیاہ پتلون پہنے ہوئے تھا۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا اور کسرتی جسم کے ٹھوس عضلات کسی بے عنوان بے چینی کی وجہ سے پھڑک رہے تھے۔ اس وقت وہ غصے میں بھرا ہوا گینڈا معلوم ہو رہا تھا۔

اس کے ساتھ آنے والا شخص ایک معمر اور پستہ قد چینی تھا۔ اس کے سر پر میلی سی ترکی ٹوپی تھی۔ وہ مخمل کا ایک لمبا سا سیاہ لبادہ پہنے ہوئے تھا جس کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ اس کے گلے میں نہایت خوبصورت اور چمکیلے موتیوں کی ایک مالا تھی۔ اس کی فومانچو کٹ مونچھیں ڈھیلے ڈھالے انداز میں نیچے کو جھول رہی تھیں۔ اندر آتے وقت مجھے ہوش میں دیکھ کر لی ین نے اس سے فیصلے انداز میں چینی میں کچھ کہا۔ معمر شخص نے مربیانہ انداز میں سر ہلایا اور دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر کمرے کے وسط میں آکھڑا ہوا۔ لی ین اس کے ساتھ ساتھ تھا اور کھا جانے والی نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ اس کے جسم، خصوصاً سینے اور بازوؤں کے عضلات کچھ اور تیزی سے پھڑکنے لگے تھے جیسے وہ ہر چیز کو توڑ پھوڑ دینے اور در و دیوار کو منہدم کر دینے کے لیے بے چین ہو۔

کمرے میں موجود افراد اٹھ کھڑے ہوئے تھے لیکن رکوع کی سی حالت میں تھے، تاہم یہ تعظیم ترکی ٹوپی والے معمر چینی کے لیے تھی، لی ین کے لیے نہیں تھی۔ ترکی ٹوپی والے نے ہاتھ ہلا کر انہیں بیٹھ جانے کا حکم دیا اور وہ سب پہلے کی طرح خاموشی سے بیٹھ گئے۔

"تو میری کافی میں خواب آور دوا تم نے ڈالی تھی؟" میں نے انگریزی میں لی ین کو مخاطب کیا۔ میں نے حتی الامکان خوشدلی سے بولنے کی کوشش کی تھی لیکن میرے حلق سے عجیب منمناتی ہوئی سی آواز برآمد ہوئی۔

"ہاں۔" لی ین سانپ کی طرح پھنکارا۔ "اور اب زیادہ سوال و جواب کی ضرورت نہیں۔ اس سے کوئی تمہاری موت آسان یا تمہارے گناہوں کا بوجھ کچھ کم نہیں ہو جائے گا۔"

"برسبیل تذکرہ..... کیا آپ ان گناہوں پر کچھ روشنی ڈالنا پسند فرمائیں گے جناب لی ین صاحب؟" میں نے کمزور مگر استہزائیہ لہجے میں کہا۔

میرے سوال کا جواب لی ین کی بجائے ترکی ٹوپی والے معمر چینی نے دیا۔ "تمہیں عبرتناک طریقے سے سزائے موت دینے کے لیے تو تمہارا یہی گناہ کافی ہے نوجوان کہ تم نے لی ین کی محبوبہ اور منگیتر پر ڈاکہ ڈالا جبکہ تمہیں اس کے وجود سے کھیلنے کا تو کیا اس سے ربط و ضبط بڑھانے کا بھی کوئی اختیار یا حق حاصل نہیں تھا۔" معمر چینی سلجھے ہوئے اور باوقار لہجے میں انگریزی بول رہا تھا۔

"اور میرے اس جرم کا ثبوت کیا ہے؟" میں نے بدستور کمزور لہجے میں پوچھا۔

"میں نے خود پی چن کو گزشتہ رات تمہارے کمرے سے نکلتے دیکھا ہے اور اس کی چال بتا رہی تھی کہ ......" لی ین نے اچانک اس طرح چلا کر یہ الفاظ کہے تھے جیسے اس کے سینے میں کوئی آتش فشاں پھٹ پڑا ہو مگر وہ بات مکمل نہیں کر سکا تھا اور اس کی آواز بیٹھ گئی تھی۔

مجھے اس الو کے بچے پر بہت غصہ آیا۔ اگر اس نے پی چن کو میرے کمرے سے نکلتے دیکھ ہی لیا تھا اور اس معاملے میں اتنا ہی غیرت مند تھا تو اسے اسی وقت کچھ کرنا چاہیے تھا۔ اس کے برعکس اس نے نہ صرف ٹھنڈے دل سے صبح کا انتظار کیا بلکہ یہاں تک پہنچانے کے لیے باقاعدہ سازش سے بھی کام لیا تھا۔

"میرے لیے کیا سزا تجویز کی گئی ہے؟" میں نے اپنے لہجے میں کچھ اور نقاہت سمو لی جیسے میں بالکل ہی ہمت ہار چکا ہوں۔

میرے سوال کا جواب لی ین نے دیا۔ وہ فخریہ انداز میں کڑاہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "اس کڑاہی میں موجود محلول میں تمہیں ابال کر ایک ایسا مرہم تیار کیا جائے گا جو بنی نوع انسان کے لیے بے شمار تکالیف کا علاج ہے۔ ایسی تکالیف جن میں سے بیشتر کو جدید دور کے ڈاکٹر اور سرجن ناقابل علاج سمجھتے ہیں۔"

لی ین کے چہرے پر خونخوار سی مسکراہٹ نمودار ہو چکی تھی۔ اس نے اپنی پتلون کی پھولی پھولی سی جیب سے آڑو کے برابر کوئی چیز نکالی اور میرے قریب آتے ہوئے بولا۔ "اور تمہاری کھوپڑی اس طرح محفوظ کر لی جائے گی......" وہ چیز اس نے میری آنکھوں کے سامنے کر دی اور تب میں نے محسوس کیا کہ وہ آڑو جتنی چیز دراصل ایک مکمل انسانی کھوپڑی تھی جسے گویا جادو کے زور سے چھوٹا کر دیا گیا تھا لیکن فوراً ہی مجھے یاد آگیا کہ اس میں جادو والی کوئی بات نہیں تھی۔

کئی افریقی قبائل خصوصاً دریائے ایمزن کے کنارے بسنے والے وحشی قبائل اپنے دشمن کو ہلاک کرنے کے بعد اسی طرح ان کی کھوپڑیاں محفوظ کر لیا کرتے تھے اور انہیں فتوحات کی نشانیاں شمار کرتے تھے۔ دراصل یہ مکمل کھوپڑی نہیں ہوتی تھی۔ وہ دشمن کو ہلاک کرنے کے بعد اس کی کھوپڑی تن سے جدا کر کے کسی محلول میں ڈال کر محلول کو ابالتے تھے اور اس کے بعد کھوپڑی کی مکمل کھال اس طرح اتار لیتے تھے جیسے ابلے ہوئے چنے پر سے چھلکا۔ پھر اس خول کو کئی قسم کے مراحل سے گزارنے کے بعد چھوٹا کیا جاتا تھا اور اس میں کوئی مادہ بھر کر اسے ٹھوس بنا لیا جاتا تھا۔ انسان کی شناخت جوں کی توں برقرار رہتی تھی۔ حیرانی کی بات یہ تھی کہ دور افتادہ جنگلوں میں جنم لینے والی رسوم اور وحشیانہ طور و طریقے کی جڑیں دنیا میں نہ جانے کہاں کہاں تک پھیلی ہوئی تھیں۔

اس دوران ترکی ٹوپی والے معمر چینی نے ایک شخص کو اشارہ کر دیا اور اس نے اٹھ کر چولہا روشن کر دیا تھا۔ کمرے میں قدرے حرارت کا احساس ہونے لگا تھا۔ میں نے ایک بار پھر غیر محسوس طور پر جسم کو حرکت دینے کی کوشش کی تھی اور اسی نتیجے پر پہنچا تھا کہ ابھی میری حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ تب میں نے بظاہر اسی طرح آنکھیں بند کر لیں جیسے مایوسی کی انتہاء نے مجھے موت سے پہلے ہی مار ڈالا تھا لیکن درحقیقت میں نے یوگا کی

ایک مشق شروع کر دی تھی۔

کچھ دیر بعد میں نے بہت دور ہی سے سوں سوں کی آواز بھی ابھرتی محسوس کی۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ کڑاہی میں کچھ ابلنے لگا تھا لیکن میں نے اب بھی آنکھ نہیں کھولی تھی گو کہ میری مشق مکمل ہو چکی تھی اور مجھے احساس ہو چکا تھا کہ میرا جسم حرکت کرنے کے قابل ہو چکا ہے لیکن میں نے مزید مشق جاری رکھی تاکہ اصل صلاحیتیں پوری طرح عود کر آئیں۔

میں نے اس وقت آنکھیں کھولیں جب مجھے ہاتھ پیروں سے پکڑ کر ڈنڈا ڈولی کر کے اٹھایا جانے لگا۔ میں نے دیکھا کہ میرا ایک ایک پاؤں تو دو دو آدمیوں نے پکڑا ہوا تھا لیکن دونوں ہاتھ اکیلے لی ین نے پکڑے ہوئے تھے اور میرے وزن سے اس کے طاقتور اور کسرتی بازوؤں کی مچھلیاں پوری طرح ابھری ہوئی تھیں۔

میں نے جہازی سائز کی کڑاہی کے زیادہ قریب جانے کا خطرہ مول نہیں لیا اور ٹانگوں سے پوری قوت سے جھٹکا دیا۔ چاروں آدمی دور جا گرے۔ جھٹکے کا یہ انداز ایسا تھا کہ میرے بازو بھی لی ین کی گرفت سے چھوٹ جانے چاہییں تھے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ غالباً میری بے بسی کا یقین رکھنے کے باوجود غیر متوقع صورتحال کے لیے بھی تیار تھا۔ جیسے ہی میرے پاؤں زمین سے مس ہوئے' اس نے میرے بازوؤں کو اس طرح جھٹکا دیا کہ اگر میں نے بروقت اپنے آپ کو سنبھال نہ لیا ہوتا تو میرے کندھے اتر چکے ہوتے۔

میں چت زمین پر گرا۔ لی ین نے میرے بازو چھوڑے بغیر مجھ پر اوندھا گرنے کی کوشش کی لیکن میں نے دہرا ہوتے ہوئے اس کا سر دونوں پیروں میں پھنسایا اور دوسرے ہی لمحے وہ میرے پیروں کی طرف آن گرا۔ اس کا سر بھی پتھر کے ٹھوس گولے کی طرح فرش سے ٹکرایا تھا لیکن اسے جیسے کوئی خاص اثر ہی نہیں ہوا تھا۔ بازو اس کی گرفت سے چھوٹ چکے تھے۔ وہ تیندوے کی طرح تڑپ کر اٹھ کھڑا ہوا اور میرے کھڑے ہوتے ہوتے اس نے ایڑی پر گھوم کر الٹے رخ مجھے چاپ سوئی رسید کرنے کی کوشش کی لیکن میں بچ گیا اور یہ جان کر ضرورت سے زیادہ محتاط بھی ہو گیا کہ وہ نوجوان گینڈے کی طرح مضبوط ہی نہیں تھا بلکہ جوڈو اور شاید کراٹے سے بھی واقف تھا۔

اس دوران باقی سب لوگ ہمارے گرد گھیرا تنگ کر چکے تھے اور غالباً مجھ پر جھپٹنے ہی والے تھے۔ جب میں نے ترکی ٹوپی والے معمر چینی کی آواز سنی۔ اس نے چینی میں غالباً ان سب کو اس لڑائی میں غیر جانبدار رہنے کا حکم دیا تھا کیونکہ وہ سب پیچھے ہٹ گئے تھے اور واپس **بنچوں** پر جا بیٹھے تھے اور معمر چینی خود بھی انہیں میں شامل ہو گیا تھا۔ پھر اس نے جیسے مجھے سنانے کے لیے انگریزی میں کہا۔ "اگر غاصب میں مقابلے کی سکت ہے اور وہ مقابلہ کرنے کا خواہش مند بھی ہے تو لی ین کو اسے شکست دینا ہی پڑے گی ورنہ متنازعہ لڑکی

غاصب ہی کی ملکیت ہو جائے گی۔"

یوں اس نے گویا میرا کام آسان کر دیا۔ لی ین بے شک سانڈ کی طرح مضبوط تھا لیکن
اس اکیلے سے نمٹنا میرے لیے مشکل نہیں تھا۔ میں نے مار مار کر اس کا بھرکس نکال دیا
اور جب وہ فرش پر گر پڑا تو میں نے اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ اس کی کئی پسلیاں ٹوٹ گئیں
حتیٰ کہ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ ٹوٹی ہوئی پسلیاں اس کے **پھیپھڑوں** میں نہ جا گھسیں'
ویسے بھی وہ گوشت کی ایک چھوٹی سی چٹان کی طرح بے حس و حرکت ہو چکا تھا۔ وہ بے
ہوش ہو چکا تھا۔

معمر چینی نے دونوں ہاتھ اٹھا کر گویا مقابلہ ختم کرنے کا اعلان کیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر
برابر والے کمرے میں لے گیا۔ وہاں صاف ستھری چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ ایک طرف گاؤ
تکیے لگے ہوئے تھے اور ایک طرف چھوٹے چھوٹے پایوں والی ویسی ہی تپائی رکھی تھی جس
پر پرانے دور کے پٹواری' فیم یا آڑھتیوں کے منشی بہی کھاتے لکھتے تھے۔
چینی نے مجھے ایک گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں بیٹھ چکا تو چینی بھی تپائی
کے قریب آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور یوں مسکرا کر میری طرف دیکھنے لگا جیسے چند لمحے پہلے
کچھ ہوا ہی نہیں تھا اور میں تو درحقیقت اس کا مہمان ہوں جو ابھی ابھی پہنچا ہے۔
پھر اس نے جھک کر تپائی کا ڈھکن اٹھایا اور دراز سے ایک سفید کاغذ اور قلم دوات
نکالی۔ دراز کا ڈھکن گرا کر وہ کاغذ اور دوات اسی پر رکھ کر نہایت اطمینان سے کاغذ پر کچھ
لکھنے لگا اور تب میں نے دیکھا کہ وہ جس چیز سے لکھ رہا تھا' وہ دراصل قلم نہیں نہایت
باریک سا برش تھا جس سے وہ اوپر سے نیچے کے رخ لکھ رہا تھا۔ اسی طرح تین چار سطر میں
لکھ کر اس نے کاغذ میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "یہ لے جا کر لیو تانگ کو دے دینا۔"
کاغذ پر چینی میں جانے کیا لکھا ہوا تھا۔ "یہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔
"لیو تانگ کے نام خط ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "میں نے اس کے نام حکم لکھ دیا
ہے کہ وہ متنازعہ لڑکی لی چن کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دے دے کیونکہ تم نے لی ین کو
شکست دے دی ہے۔ لی ین نے بھی طاقت ہی کے بل پر لڑکی کو حاصل کیا تھا اور اس کا
دعویٰ تھا کہ جو بھی اسے شکست دے دے گا' وہ لڑکی کو جیت لے گا بشرطیکہ لڑکی بھی
چاہے......اور لڑکی چونکہ تمہارے کمرے میں رات گزار کر نکلی تھی' اس سے ظاہر ہوتا ہے
کہ وہ تمہیں چاہتی ہے۔"
"لیکن مجھے نہیں چاہیے لڑکی!" میں نے اس کا حکم نامہ پرزے پرزے کرکے ایک
طرف پھینک دیا۔ "لی ین کو ہوش آجائے تو اس سے کہہ دینا کہ لڑکی کو اپنی ملکیت میں
رکھے۔ خواہ اس کا اچار بنا کر کھائے یا مربہ لیکن آئندہ دوسروں کے لیے بلاوجہ پریشانیاں
پیدا نہ کرتا پھرے۔ وہ دوسروں سے تو زندگی اور موت کی بازیاں لگاتا پھرتا ہے لیکن اس

نرم و نازک سی لڑکی پر اس کا بس نہیں چلتا کہ اسے اپنے سے وفاداری پر مجبور کر سکے
......اب آپ براہ کرم صرف اتنی تکلیف کریں کہ میرے باقی کپڑے اور ہتھیار اگر یہاں موجود ہیں تو مجھے عنایت فرما دیں۔" معمر چینی چند لمحے بغور میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ترکی ٹوپی اتار کر چندیا کھجائی۔ اس کی چندیا کے وسط میں ہندوؤں کی طرح چوٹی تھی۔ ٹوپی دوبارہ سر پر رکھ کر اس نے لاپروائی سے کندھے اچکائے اور ایک بار پھر تالی بجائی۔ خادم کے آنے پر اس نے چینی میں اسے کوئی حکم دیا اور چند ہی لمحے بعد میری تمام چیزیں میرے سامنے پیش کر دی گئیں۔

کچھ دیر بعد میں اس پراسرار مکان سے ایک ایسی گلی میں نکلا جس میں دن چڑھے بھی نیم تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ میرا حلیہ اب بالکل درست تھا۔ ہاتھوں پر اور ٹھوڑی کے نیچے چند معمولی خراشوں کے سوا بظاہر ایسی کوئی علامت دکھائی نہیں دے رہی تھی جس سے کوئی یہ سمجھتا کہ میں کسی خوفناک معرکے سے گزر کر آرہا ہوں۔

معمر چینی نے مجھے مین روڈ پر پہنچنے کے لیے راستہ سمجھا دیا تھا لیکن ان گلیوں میں کھڑے ہو کر پتا چلتا تھا کہ راستہ سمجھنے کا کوئی عملی فائدہ نہیں۔ میں بہرحال لمبے لمبے ڈگ بھرتا ایک طرف سے آتی ہوئی لڑکی سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ سنبھل کر میں اس کی طرف متوجہ ہوا تو دیکھا وہ پن چی تھی۔

"شکر ہے ......" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "میں تو سخت پریشان تھی کہ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچ گیا ہو۔ تم کسی مصیبت میں نہ پھنس گئے ہو۔ میں نے تقریباً تمہارے پیچھے پیچھے ہی لی ین کو بھی گھر سے نکلتے دیکھا تو میرا ماتھا ٹھنک گیا تھا کہ کوئی گڑبڑ نہ ہو لیکن میں نے فیصلے پر پہنچنے اور گھر سے نکلنے میں دیر کر دی۔ باہر آئی تو مجھے ایک گلی میں تمہاری گھڑی پڑی ملی۔ میں پہلے لی ین کے دو ایک اور ٹھکانوں پر پہنچی لیکن اچانک مجھے خیال آیا کہ کہیں لی ین تمہیں مقدس پیشوا کے ہاں نہ لے گیا ہو......کیا بات ہے تم مجھے اس طرح کیوں گھور رہے ہو۔ تمہارا منہ کیوں پھولا ہوا ہے؟" وہ قدرے شرارت آمیز لہجے میں بولی۔ "لگتا ہے کسی ناخوشگوار تجربے سے گزرے ہو؟"

مجھے اس وقت معلوم نہیں کیوں دنیا کی ہر چیز پر غصہ آرہا تھا۔ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "یہ تو تمہیں لی ین ہی زیادہ بہتر طور پر بتا سکے گا۔ ویسے میرا دوستانہ مشورہ یہی ہے کہ چند ماہ اسپتال میں گزار کر اب جیسے ہی لی ین واپس آئے' اس سے شادی کر ڈالو ورنہ وہ ارنا بھینسا نہ جانے کس کس کا خون کرتا پھرے گا۔"

وہ چند لمحے خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہی پھر سرسراتی ہوئی سی آواز میں بولی۔ "تو تم نے اسے کئی ماہ کے لیے اسپتال جانے کے قابل کر دیا ہے؟ جان سے ہی مار دیا ہوتا۔"



"تمہاری وجہ سے چھوڑ دیا۔" میں نے کہا۔ "اگر وہ تمہیں اتنا ہی ناپسند ہے تو خود ہی مار ڈالنا۔ اتنا مشکل نہیں اسے مارنا۔ عقل نام کی تو کوئی چیز ہے ہی نہیں اس میں۔"

میں اسے وہیں چھوڑ کر آگے بڑھنے لگا تو وہ گویا ہکابکا ہو کر بولی۔ "کہاں جا رہے ہو؟"

"میرا انتظار مت کرنا۔ میں اب ہوٹل میں قیام کروں گا۔" میں نے سرد مہری سے کہا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا آگے چل دیا۔ آخری بار میں نے اس کی آنکھیں دیکھیں تو ان میں حیرت کے سوا کچھ نہیں تھا' لامتناہی حیرت۔

وہاں سے میں سیدھا سٹی اسپتال پہنچا جہاں کیٹی داخل تھی۔ ڈاکٹر مجھے پرائیویٹ وارڈ کے دروازے پر مل گیا۔ اس نے بتایا کہ مکمل چیک اپ اور نہ جانے کتنے قسم کے ایکسرے اور ٹیسٹوں کے بعد کیٹی کی جسمانی حالت کی جو مفصل رپورٹ مرتب ہوئی' اسے پڑھ کر وہ خود بھی لرز اٹھا تھا۔ حالانکہ اس کا کام ہی دن بھر اسی قسم کی یا اس سے بھی زیادہ خوفناک رپورٹیں پڑھنا تھا لیکن کیٹی کے معاملے میں یہ احساس اس کے لیے لرزہ خیز تھا کہ اس کی یہ حالت کسی حادثے یا لڑائی جھگڑے میں نہیں' تشدد برداشت کرتے ہوئے ہوئی تھی۔ اگر اسپتال سرکاری ہوتا تو اس تشدد کی وضاحت ایک الگ مسئلہ ہوتی۔

اس رپورٹ کے مطابق کیٹی کے ہاتھوں کی بیشتر انگلیاں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ کئی نازک مقامات پر گوشت کچلا ہوا تھا۔ کئی جگہوں سے جسم داغا گیا تھا' بال نوچے گئے تھے۔ نوکیلی چیزیں چبھوئی گئی تھیں۔ کئی جگہ سے جلد تیز دھار چاقو سے چیری گئی تھی۔ اس کے باوجود وہ اسپتال تک ہوش و حواس میں پہنچی تھی۔ اس پر ڈاکٹر کو بڑی حیرت تھی۔

میں وارڈ میں پہنچا تو کیٹی کے چہرے اور جسم کے بیشتر حصوں پر پٹیاں لپٹی ہوئی تھیں' تاہم وہ جاگ رہی تھی اور پٹیوں کے درمیان سے مجھے دیکھ سکتی تھی۔ میں اس کے تاثرات نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن جب وہ بولی تو اس کی سرگوشی نما آواز سے بھی مجھے اس کے جذبات کا اندازہ کرنے میں دشواری پیش نہیں آئی۔

"میں تو مایوس ہی ہو چلی تھی منصور کہ شاید تم نہیں آؤ گے۔" وہ گہری سانس لے کر بولی۔ "زندگی میں پہلی بار میں اپنے آپ کو بے حد تنہا اور شکست خوردہ محسوس کر رہی تھی۔"

"میں بہت پہلے پہنچ جاتا کیٹی لیکن ......" میں نے پٹیوں میں لپٹے ہوئے اس کے ہاتھ پر نہایت آہستگی سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا لیکن جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"کوئی نئی افتاد پڑ گئی ہوگی۔" اس نے جملہ مکمل کر دیا۔ "میں تمہاری ٹھوڑی کے نیچے خراشیں دیکھ رہی ہوں اور بایاں رخسار بھی کچھ ابھرا ابھرا سا ہے؟"

میں مسکرا دیا لیکن میں نے اس کی بات کی تائید یا تردید نہیں کی۔ میں شام تک وہاں رہا۔ اس دوران ہم نے ان گنت باتیں کیں۔ ادھر ادھر کی بے مقصد اور لایعنی سی باتیں۔

میں نے اپنے ہاتھوں سے اسے دوا پلائی' کھانا کھلایا۔ پھل چھیل کر دیئے۔ کافی پلائی اور اس سارے عمل میں مجھے ایک عجیب ناقابل بیان سی مسرت محسوس ہوئی۔ اس کی کیفیت بھی شاید یہی تھی۔ خوابناک سے لہجے میں بولی۔

"میری تکلیف گویا آدھی رہ گئی ہے۔"

اسپتال گو کہ پرائیویٹ تھا مگر اس کا معیار نہایت بلند اور ڈسپلن بے حد سخت تھا۔ شام سات بجے کے بعد متعلقہ عملے کے سوا مریض کے قریب کوئی نہیں رہ سکتا تھا' اس لیے بادل نخواستہ مجھے بھی وہاں سے رخصت ہونا پڑا۔

اس شاندار اسپتال میں ڈاکٹروں کی خصوصی توجہ اور نگہداشت سے کیٹی جلد صحت یاب ہو گئی اور ہم بمبئی واپس آگئے۔ واپسی کے سفر میں کوئی خاص قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا اور بمبئی پہنچنے کے بعد کے واقعات میں بھی کوئی ایسا خاص سنسنی خیز پہلو پنہاں نہیں ہے۔

مختصراً بس اتنا جان لیجئے کہ مدن موہن کو شیکھو نے ایک طویل عرصے تک مالتی مندر والے پیلس میں رکھ کر واقعی ایک بن مانس میں تبدیل کر دیا تھا۔ وہ انسانوں کی خصوصیات کھو بیٹھا تھا اور تقریباً حیوان نظر آنے لگا تھا۔ تب ایک رات ہم نے اسے چپکے سے بمبئی کی ایک سڑک پر لا چھوڑا تھا۔

دن میں لوگوں نے دیکھا کہ ایک بن مانس ٹریفک کے درمیان ادھر ادھر بھاگا پھر رہا تھا' تاہم اس میں کسی نہ کسی حد تک انسان کی جھلک نظر آتی تھی اور کبھی کبھی وہ انسانوں جیسی آوازیں بھی نکالتا تھا۔ دو چار الفاظ بھی بولتا تھا لیکن وہ انسانوں کے سائے سے بھی بھڑکتا تھا۔

پولیس اور دوسرے دو تین محکموں کے لوگوں نے اسے پکڑنے اور قابو میں کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ان کے ہاتھ نہ آیا اور ادھر ادھر بھاگتا پھرتا رہا۔ ان کی کوششوں کے دوران ہی ایک بس اسے کچلتی ہوئی گزر گئی۔ اخبارات نے اس پراسرار واقعے پر کئی دن حاشیہ آرائی کی۔

احسان مرزا میری ناقابل یقین کامیابی سے بہت خوش تھا۔ وہ زیادہ عرصے زندہ نہیں رہ سکا۔ اس نے واقعی مجھے بیٹوں کی طرح سمجھا اور مرنے سے پہلے تمام دولت و جائیداد میرے نام کر گیا لیکن بہت سے سرکاری ادارے تادم مرگ اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ اس کی بیشتر دولت و جائیداد پر حکومت نے مختلف حیلے بہانوں سے قبضہ کر لیا اور طویل مقدمے بازی سے بھی مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ احسان مرزا خواہ کیسا بھی تھا لیکن حکومت اس کے ایک احسان سے آج تک لاعلم ہے کہ اس نے انڈیا میں مافیا کا راستہ روکا تھا۔

ماہتاب لندن سے اس دوران واپس آچکی تھی لیکن اس کی کاسمیٹک سرجری کچھ زیادہ



کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ اس کی صورت میں کچھ نقائص برقرار رہے۔ اسے بہرحال خوبصورت لڑکیوں میں شمار نہیں کیا جا سکتا تھا اور اس نے اسی چیز کو آڑ بنا کر مجھ سے شادی سے انکار کر دیا۔ میں کئی برس تک اس سے شادی کے لیے اصرار کرتا رہا لیکن اس کی یہی ضد رہی کہ وہ اپنے آپ کو میرے قابل نہیں سمجھتی۔

شادی اس نے کسی اور سے بھی نہیں کی اور میں بھی اپنے آپ کو کسی اور سے شادی کے لیے آمادہ نہیں کر سکا..... اسی عالم میں کچھ پتا نہ چلا کہ کب بڑھاپے نے ہمارے وجود میں پنجے گاڑ لیے۔ اب ہم دونوں کے بال سفید ہیں۔ وہ اپنے گھر میں رہتی ہے۔ میں اپنے گھر میں......

کچھ لوگوں کا یہ خیال شاید درست ہی ہے کہ آپ پہاڑوں کو اپنی جگہ سے ہلا سکتے ہیں، دریاؤں کا رخ بدل سکتے ہیں، فضاؤں کو مسخر کر سکتے ہیں لیکن اگر عورت کسی بات پر اڑ جائے تو پھر آپ اسے قائل نہیں کر سکتے۔

ختم شد

